زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش
لاہور

افسانہ نمبر

۳۷، ۳۸

جنوری ۱۹۵۳ء

مدیر:- محمد طفیل

قیمت فی پرچہ
6 روپے

سالانہ چندہ
مع رجسٹری فیس
۱۲ روپے

ادارۂ فروغِ اردو ۰ لاہور

فہرس

(۱)

(۲)
خاکے

(۳)
نو وارد

(۴)
سمپوزیم

حصّہ لینے والے:-

سیّد وقار عظیم ، ڈاکٹر عبادت بریلوی ، سعادت حسن منٹو

احمد ندیم قاسمی ، ہاجرہ مسرُور ، خدیجہ مستوُر

انتظار حسین ، حمید اختر ، شوکت تھانوی

ترتیب

(ا)

(۲)

(۳)

خاکے

(۴)

نو وارد

(۵)

سمپوزیم

حصہ لینے والے:-

سید وقار عظیم ڈاکٹر عبادت بریلوی سعادت حسن منٹو احمد ندیم قاسمی

ہاجرہ مسرور خدیجہ مستور انتظار حسین حمید اختر

شوکت تھانوی

طلوع

یوں تو پورا ادب ہی انحطاط پذیر ہے لیکن سب سے زیادہ زوال جس صنفِ ادب پر آیا، وہ افسانہ ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے افسانوی ادب پر نظر دوڑائیے۔ تو آپ کو آج کا افسانوی ادب بڑا بے جان اور بے رُوح نظر آئے گا۔ گو لکھنے والے آج بھی وہی ہیں لیکن اُن سب کے قلم کچھ تھکے تھکے سے ہیں۔ بیشتر لکھنے والوں نے ماحول سے سمجھوتہ کر کے لکھنا ہی ترک کر دیا ہے۔ ایسے ادب کُش ماحول میں ہمارا یہ نمبر ایک معجزہ ہی تو ہے۔ معجزے کے لفظ سے ہم پر تعلّی کا الزام نہ دھریئے گا، جب کہ ہم آج بھی یہ سمجھتے ہوں کہ "ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔"

بہت سے دوستوں کے افسانے روکنے اور تراجم کے حصّے کو بالکل ہی حذف کر دینے کے بعد بھی اس کی ضخامت کا یہ حال ہے۔ اگر ملکی حالات سازگار ہوتے، تو ہم آپ کی خدمت میں اس سے مکمّل پرچہ پیش کرتے۔ اب بھی اگر یہ شمارہ اپنے جلو میں کچھ رنگا رنگیاں سمیٹے ہوئے ہے، تو اسے ہماری شب بیداریوں کی ایک داستان سمجھیے ـــــ وہ داستان جو آج بھی ہمارے لئے تعبیر طلب ہے۔

سنا ہے کہ آج صداقتوں اور اچھائیوں کے اظہار کے لئے بھی ڈھنڈورا پیٹنے کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ کوئی کان تک نہیں دھرتا۔ اب کوئی کان دھرے یا نہ دھرے، ہم سے تو ڈھنڈورا نہیں پٹتا ـــــ اس نمبر میں افسانوں اور خاکوں کے علاوہ ایک اور اہم چیز بھی ہے۔ میری مراد اُردو افسانہ کے متعلق سمپوزیم سے ہے۔ اسے افسانوی ادب کی تاریخ کہہ لیجئے تو بھی بات غلط نہ پڑے گی۔ اس میں پورے افسانوی ادب کے علاوہ افسانہ نگاروں تک کا تجزیہ موجود، اور پھر دلچسپ اتنی کہ افسانوں سے زیادہ جی لگے۔

اب ایک جملہ معترضہ بھی، کہ ہم نے نقوش کی اتنی زیادہ قیمت کیوں رکھی۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم نے اب تک نقوش کے عشق میں جو جو مالی صدمے اُٹھائے، اس کی میزان میں اب تک توازن پیدا نہ کر سکے۔ دوسرے کاغذ کی نایابی بھی سدِّ راہ ـــــ اس پر بھی آپ ہماری طرف سے قیمت کی زیادتی کی وجہ سے بدگمان ہوں تو ہمیں دُکھ ہوگا۔

لیجئے میرا وعدہ پورا ہوا۔ وہ یہ کہ زیرِ نظر شمارہ ہمارے سابقہ افسانہ نمبر سے کسی طرح دبُو نہیں رہا۔ اور میری آپ سے سرخروئی، اس نمبر میں حصّہ لینے والے تمام دوستوں کی بدولت ہے۔

محمد طفیل

عصمت چغتائی

جنہوں نے

اُردو افسانے کے سمپوزیم میں حصّہ لیا
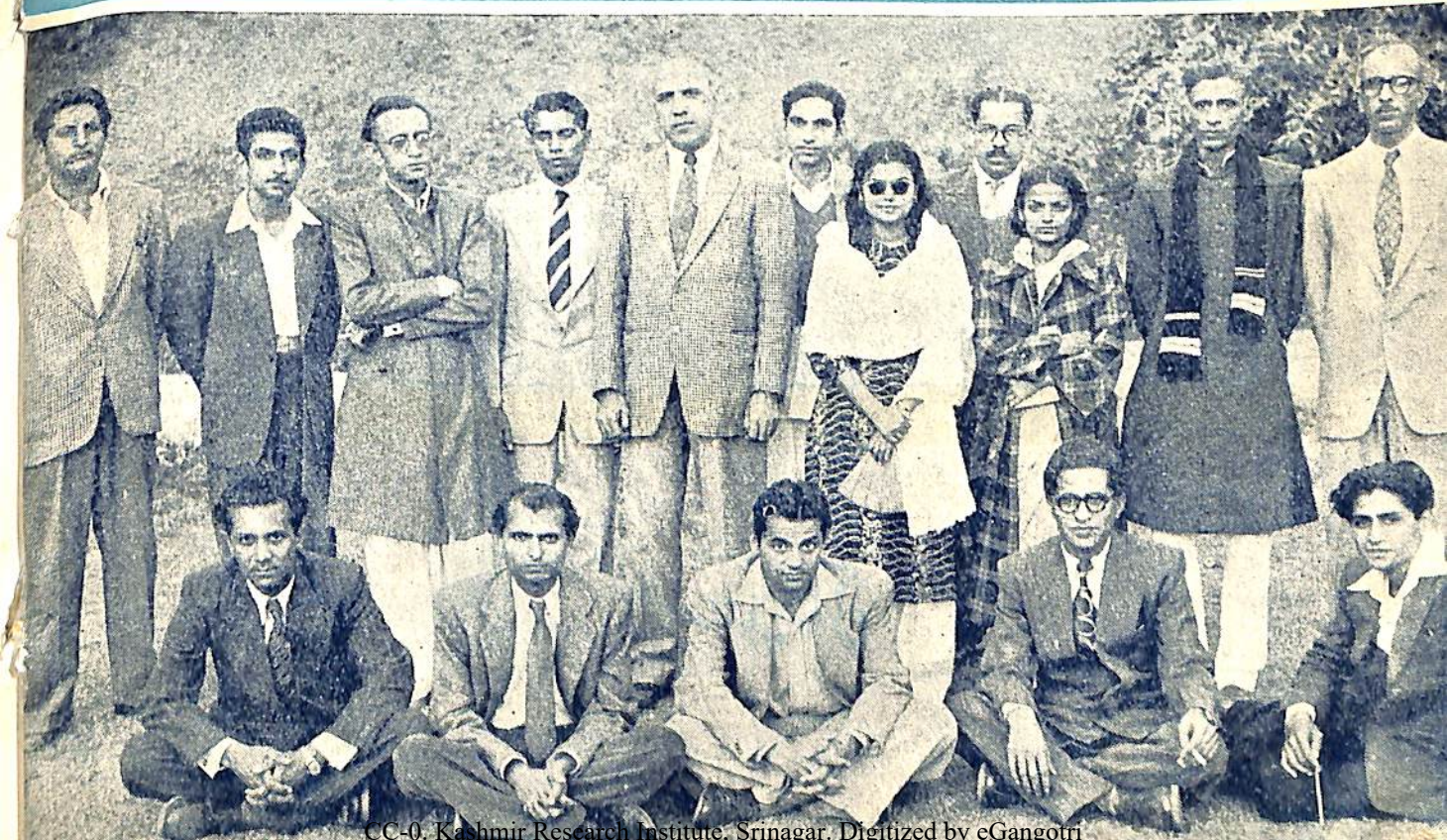
غلام عبّاس
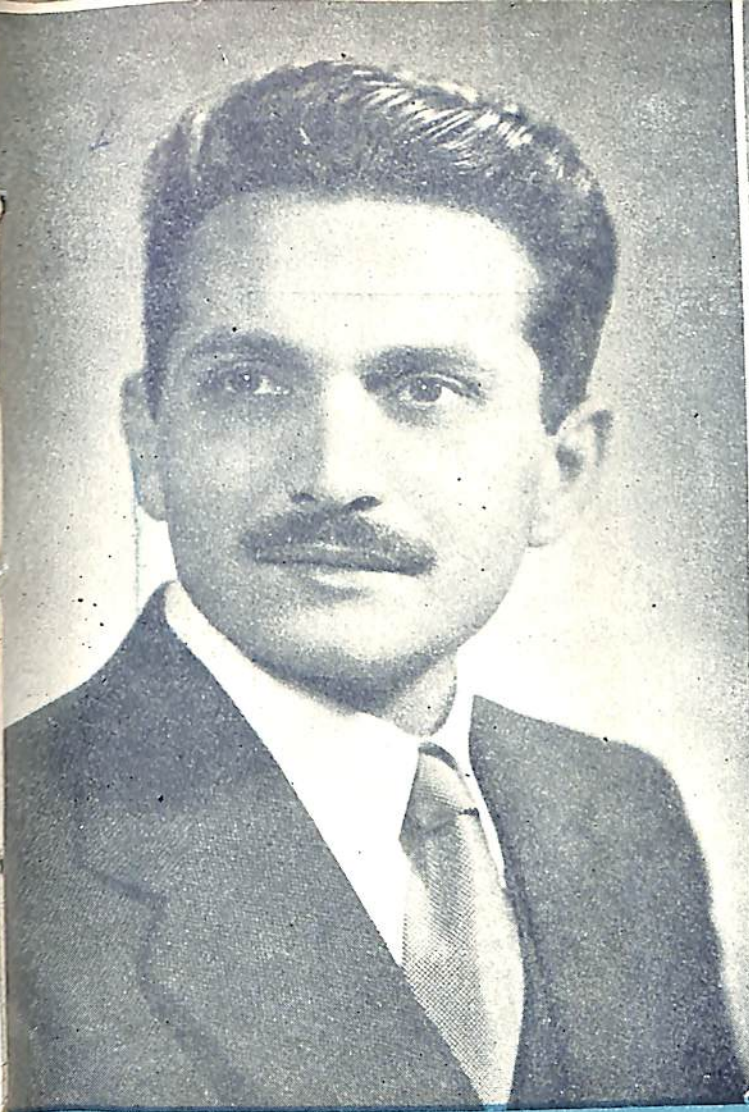
سہیل عظیم آبادی

اشفاق احمد

کشمیری لال ذاکر

دیوندر اسّر

آغا بابر

غلام علی چودھری

ہاجرہ مسرور

خدیجہ مستور

قدرتُ اللہ شہاب
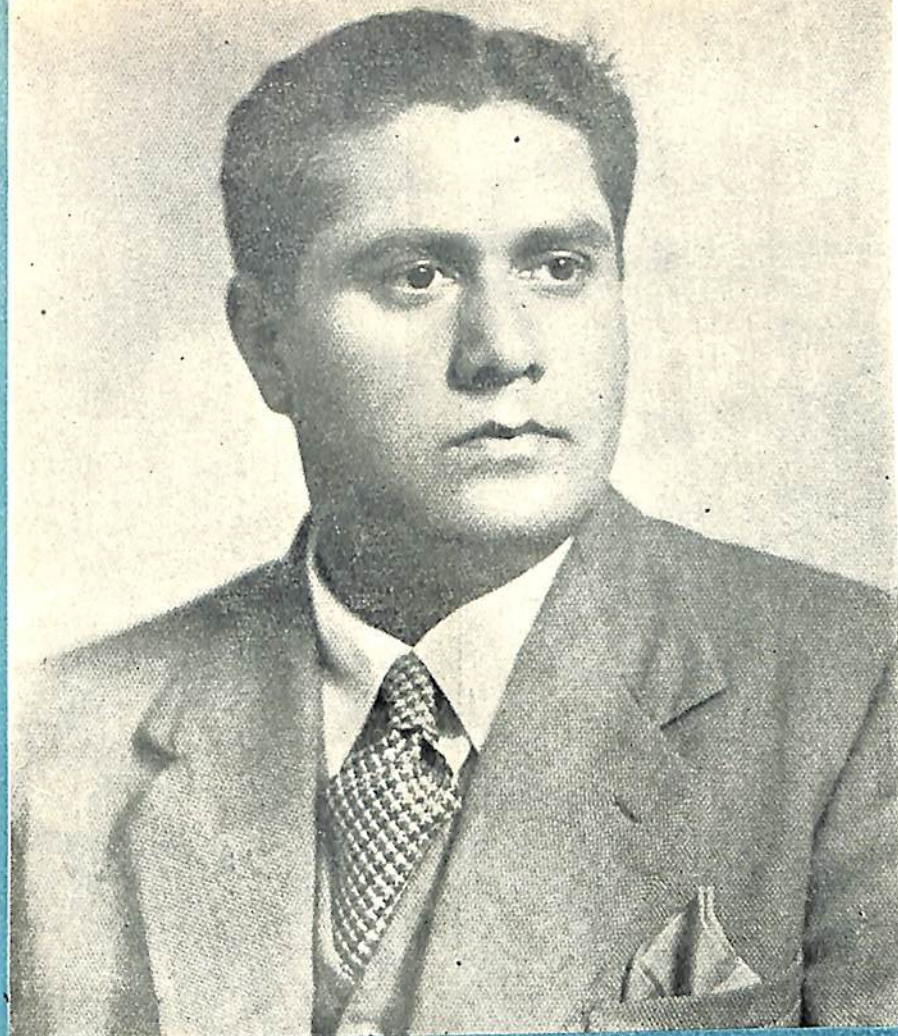
حیاتُ اللہ انصاری

بلونت سنگھ
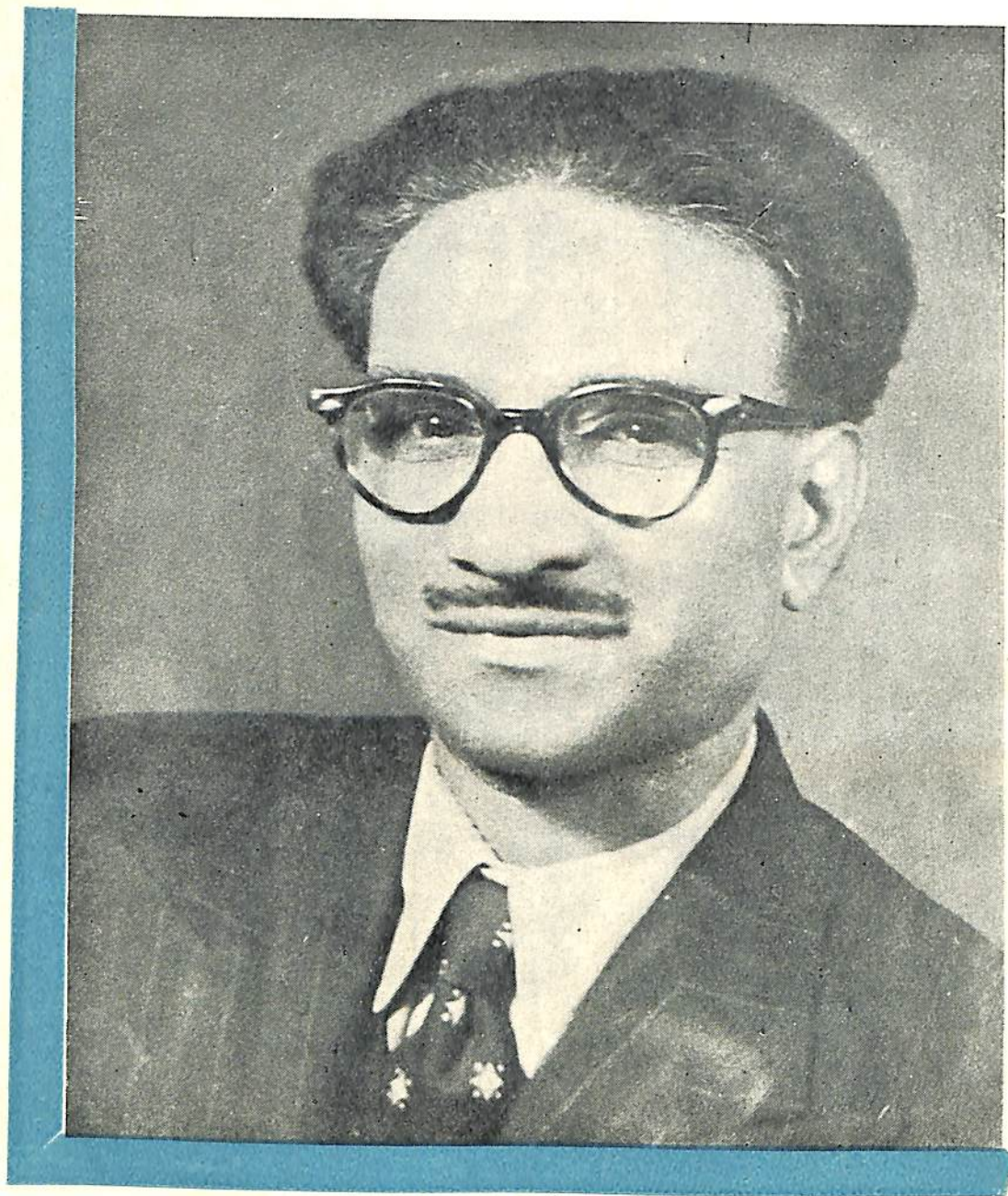
شوکت تھانوی
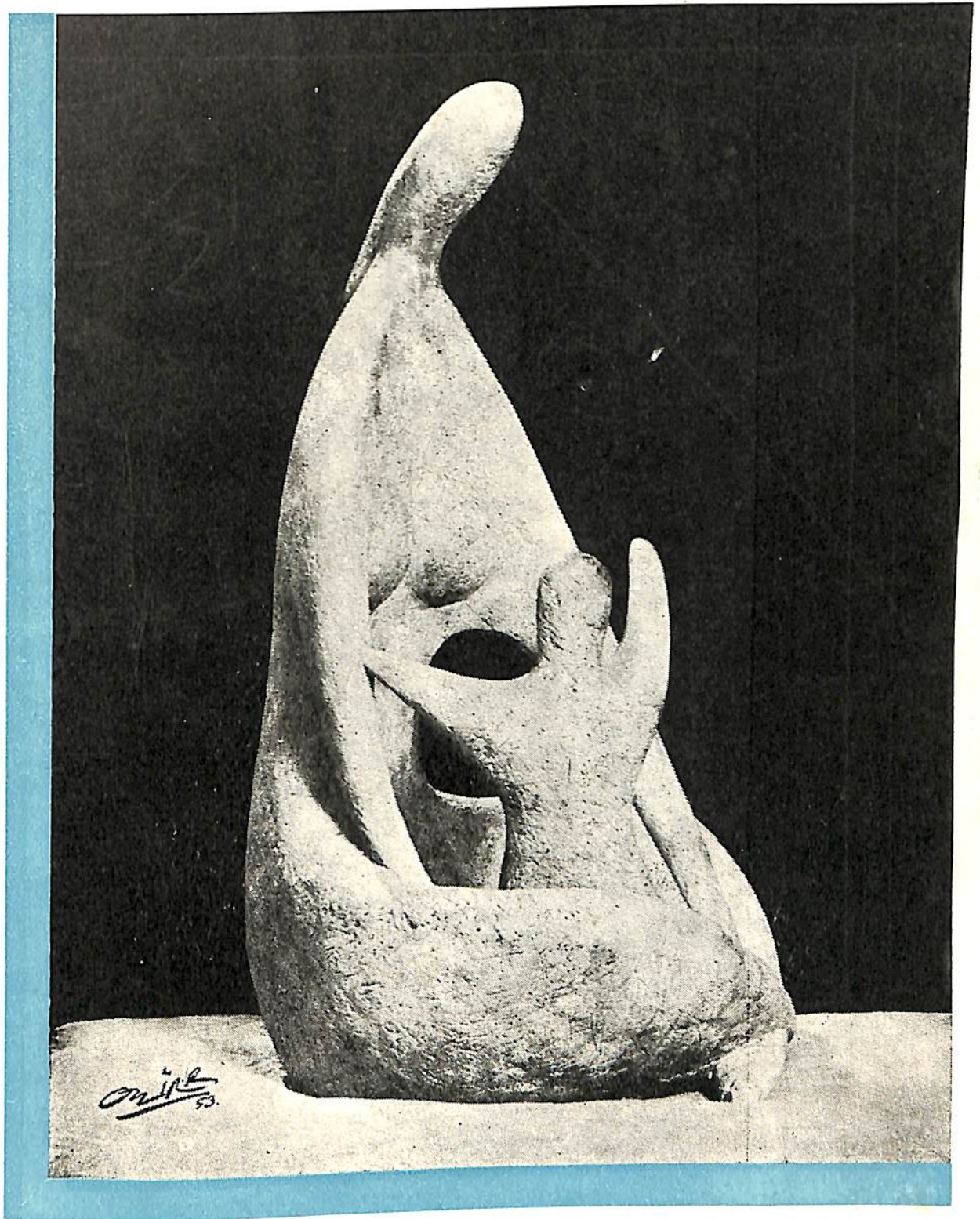
ماں اور بچّہ

(عملِ زوبی)

ننھّی کی نانی

عصمت چغتائی

ننھّی کی نانی کا ماں باپ کا نام تو اللہ جانے کیا تھا۔ لوگوں نے کبھی انہیں اس نام سے یاد نہ کیا۔ جب چھوٹی سی گلیوں میں ناک سڑسڑاتی پھرتی تھیں تو بفاطن کی لونڈیا کے نام سے پکاری گئیں۔ پھر کچھ دن "بشیرے کی بہو" کہلائیں پھر "بسم اللہ کی ماں" کے لقب سے یاد کی جانے لگیں۔ اور جب بسم اللہ جاپے کے اندر ہی ننھّی کو چھوڑ کر چل بسی تو وہ "ننھّی کی نانی" کے نام سے آخری دم تک پہچانی گئیں۔

دنیا کا کوئی ایسا پیشہ نہ تھا جو زندگی میں "ننھّی کی نانی" نے اختیار نہ کیا ہو۔ کٹورا گلاس پکڑنے کی عمر سے وہ تیرے میرے گھر میں دو وقت کی روٹی اور پرانے کپڑوں کے عوض اوپر کے کام پر دھر لی گئیں۔ یہ اوپر کا کام کتنا نیچا ہوتا ہے یہ کچھ کھیلنے کودنے کی عمر سے کام پر جوت دیئے جانے والے ہی جانتے ہیں۔ ننھّے میاں کے آگے جھنجھنا بجانے کی غیر دلچسپ ڈیوٹی سے لے کر بڑے سرکار کے سر کی مالش تک اوپر کے کام کی فہرست میں آجاتی ہے۔

زندگی کی دوڑ بھاگ میں کچھ بھوننا بھلسنا بھی آگیا۔ اور زندگی کے کچھ سال ماماگیری میں بیت گئے۔ پر جب دال میں چھپکلی بگھار دی اور روٹیوں میں مکھیاں پرونے لگیں تو مجبوراً ریٹائر ہونا پڑا۔ اس کے بعد تو ننھّی کی نانی بس لگائی بجھائی کرنے اِدھر کی اُدھر پہنچانے کے سوا اور کسی کام کی نہ رہیں۔ یہ لگائی بجھائی کا پیشہ بھی خاصا منافع بخش ہوتا ہے۔ محلہ میں کھٹ پٹ چلتی ہی رہتی ہے۔ مخالف کیمپ میں جا کر اگر ہوشیاری سے مخبری کی جائے تو خوب خوب خاطر مدارات ہوتی ہے۔ لیکن یہ پیشہ کے دن چلیا، نانی لتری کھانے لگیں اور حال گلتی زبان کر نانی نے آخری اور مفید ترین پیشہ یعنی مہذب طریقہ پر بھیک مانگنا شروع کر دی۔

کھانے کے وقت نانی ناک پھیلا کر سونگھتیں کہ کس گھر میں کیا پک رہا ہے۔ بہترین خوشبو کی ڈور پکڑ کر وہ گھر میں آن بیٹھتیں۔

"اے بیوی گھیاں ڈالی ہیں گوش میں؟" وہ بے تعلقی سے پوچھتیں۔

"نہیں بوا گھیّں نگوڑی آج کل گلیں کہاں ہیں۔ آلو ڈالے ہیں!"

"اے سبحان اللہ۔ کیا خوشبو ہے۔ اللہ رکھے بسم اللہ کے باوا کو آلوؤں سے عشق تھا۔ روز یہی کہ بسم اللہ کی ماں آلو گوش۔ جب دیکھو آلو گوش۔ ...... اب تو مہینوں گذر جاویں آلو گوش جو آنکھوں سے بھی دکھ جاوے ...... اے بیوی کوتھمیر چھوڑ دیا؟" وہ ایکدم فکرمند ہو جاتیں۔

"نہیں بوا کوتھمیر نگوڑا سب مارا گیا مو آسقّے کا گتا کیاری میں لوٹ گیا۔"

"ہے ہے بغیر کوتھمیر کے بھلا آلو گوش کیا خاک مزہ دیگا۔ حکیم جی کے یہاں منوں لگا ہے!"

"اے نہیں نانی حکیم جی کے لونڈے نے کل شبّن میاں کی پتنگ میں کٹکی لگا دی۔ اُس پر میں نے کہا خبردار جو چھجے پہ قدم رکھا۔ تو......"

"اے میں کوئی تمہارے نام سے تھوڑی مانگوں گی۔" اور نانی برقع سنبھال سلیپر پٹپٹاتی حکیم جی کے یہاں جا پہنچتیں۔ دھوپ کھانے کے بہانے

کھسکتی گھسٹتی کباڑی کے پاس منڈیر تک پہنچ جائیں۔ پہلے ایک پتی توڑ کر سونگھنے کے بہانے چٹکی میں مسلتیں۔ حکیم جی کی بہو کی آنکھ بچی اور مارا نانی نے کھمیر پر بکٹا۔ کو کھمیر مہیا کرنے کے بعد ظاہر ہے وہ نولے کی حقدار ہو ہی جاتیں۔

نانی اپنے ہاتھ کی صفائی کے لئے سارے محلہ میں مشہور تھیں۔ کھانے پینے کی چیز دیکھی اور لقمہ مار گئیں۔ بچے کے دودھ کی پتیلی منہ سے لگائی دو گھونٹ غٹ لئے۔ شکر کی پھنکی مار لی۔ گڑ کی ڈلی تالو سے چپکا لی مزے سے دھوپ میں بیٹھی چوس رہی ہیں۔ ڈلی اٹھائی نیفے میں اڑس لی۔ دو چپاتیاں لیں اور آدھی نیفے کے ادھر آدھی ادھر اوپر سے موٹا کرتا آہستہ آہستہ حسب معمول کراہتی کونکتی کھسک گئیں۔ سب جانتے تھے پر کسی کو منہ کھولنے کی ہمت نہ تھی کیونکہ نانی کے بوڑھے ہاتھوں میں بجلی کی سی سرعت تھی اور بے چبائے نگل جانے میں وہ کوئی عیب نہ سمجھتی تھیں۔ دوسرے ذرا سے شبہے پر ہی وہ فیل مچانے پر تل جاتی تھیں اور اتنی قسمیں کھاتی تھیں قرآن اٹھانے کی دھمکیاں دیتی تھیں کہ توبہ بھلی۔ اب کون ان سے جھوٹا قرآن اٹھوا کر اپنی قبر میں بھی کیڑے پڑوائے۔

لتری، اچر اور حکمہ باز ہونے کے علاوہ نانی پورے درجہ کی جھوٹی بھی تھیں۔ سب سے بڑا جھوٹ تو ان کا وہ برقعہ تھا جو ہر دم ان کے اوپر سوار رہتا تھا۔ کبھی اس برقعہ میں نقاب بھی تھی پر جوں جوں محلہ کے بڑے بوڑھے چل بسے یا نیم اندھے ہو گئے تو نانی نے نقاب کو خیر باد کہہ دیا۔ مگر گنگورول دار فیشن ایبل برقعہ کی ٹوپی ان کی کھوپڑی پر چپکی رہتی۔ آگے چاہے جمپر کرتے کے نیچے بنیان نہ ہو پر پیچھے برقعہ بادشاہوں کی جھول کی طرح لہراتا رہے۔ اور یہ برقعہ صرف ستر ڈھانکنے کے لئے ہی نہیں تھا بلکہ دنیا کا ہر ممکن اور ناممکن کام اسی سے لیا جاتا تھا۔ اوڑھنے بچھانے، اور گڑی مڑی کر کے تکیہ بنانے کے علاوہ جب نانی کبھی خیر سے نہاتیں تو اسے تولیہ کے طور پر استعمال کرتیں۔ پنج وقتہ نماز کے لئے جا نماز اور جب محلہ کے کٹنے دانت نکوسیں تو ان سے بچاؤ کے لئے اچھی خاصی ڈھال۔ کتا پنڈلی پر لپکا اور نانی کے برقعہ کا گھیر اس کے منہ پر پھٹکارا۔ نانی کو برقعہ بہت پیارا تھا۔ فرصت میں بیٹھ کر حسرت سے اس کے بڑھاپے پر نسوار کرتیں۔ جہاں کوئی چندی کترنی اور احتیاط سے پیوند چپکا لیا۔ وہ اس دن کے خیال سے ہی لرز اٹھتی تھیں جب یہ برقعہ بھی چل بسے گا۔ آٹھ گز لٹھا کفن کو جڑ جاوے یہی بہت جانو۔

نانی کا کوئی مستقل ہیڈ کوارٹر نہیں۔ سپاہی جیسی زندگی ہے آج اس کے دالان میں تو کل اس کی صحنچی میں جہاں جگہ ملی پڑاؤ ڈال دیا۔ جب دھتکار پڑی کوچ کر کے آگے چل پڑیں۔ آدھا برقعہ اوڑھا آدھا بچھایا لمبی تان لی۔

مگر برقعہ سے بھی زیادہ وہ جس کی فکر میں گھلتی تھیں وہ تھی ان کی اکلوتی نواسی ننھی۔ کڑک مرغی کی طرح نانی پر پھیلائے اسے پوٹے تلے دابے رہتیں۔ کیا مجال جو نظر سے اوجھل ہو جائے۔ مگر جب ہاتھ پیروں نے جواب دے دیا اور محلہ والے چوکنے ہو گئے ان کی جوتیوں کی گھس گھس سنکر ہی چاق چوبند ہو کر مورچہ پر ڈٹ جاتے۔ ڈھٹائی سے نانی کے اشارے کنایہ سے مانگنے کو سنا ان سنا کر جاتے۔ تو نانی کو اس کے سوا کوئی چارا نہ رہا کہ ننھی کو اس کے آبائی پیشے یعنی اوپر کے کام پر لگا دیں۔ بڑے سوچ بچار کے بعد انہوں نے اسے ڈپٹی صاحب کے یہاں روٹی کپڑا اور ڈیڑھ روپیہ مہینہ پر چھوڑ ہی دیا۔ پر وہ ہر دم سائے کی طرح لگی رہتیں۔ ننھی نظر سے اوجھل ہوئی اور وہ بلبلائیں۔ پر نصیب کا لکھا کہیں بوڑھے ہاتھوں سے مٹتا ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ڈپٹیائن اپنے بھائی کے گھر بیٹے کا پیغام لے کر گئی ہوئی تھیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ نانی منڈیر پر جامن کی چھاؤں میں جھپکی لے رہی تھی۔ ڈپٹیائن تو اپنے ماموں کے ہاں بیٹے کی بات لے کر گئی ہوئی تھیں۔ سرکار خس خانے میں قیلولہ فرما رہے تھے۔ ننھی پنکھے کی ڈوری تھامے اونگھ رہی تھی۔ پنکھا رک گیا اور سرکار کی نیند ٹوٹ گئی۔ شیطان جاگ اٹھا اور ننھی کی قسمت سو گئی۔

کہتے ہیں بڑھاپے کے اسباب سے بچنے کے لئے مختلف ادویات اور طلاؤں کے ساتھ حکیم بید چوزوں کی یخنی بھی تجویز فرماتے ہیں۔ نو برس کی

ننھی چوزہ ہی تو تھی۔

مگر جب ننھی کی نانی کی آنکھ کھلی تو ننھی غائب۔ محلہ چھان مارا کوئی سُراغ نہ ملا مگر رات کو جب نانی تھکی ماندی کوٹھری کو لوٹی تو کونے میں دیوار سے لگی ہوئی ننھی زخمی چڑیا کی طرح اپنی پھیکی پھیکی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ نانی کی گھگی بندھ گئی اور اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے وہ اُسے گالیاں دینے لگی۔

"مالزادی اچھا چھکا۔ یہاں آن کے مری ہے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے پنڈلیاں سوجھ گئیں۔ ٹھہر تو جا سرکار سے کسی چار چوٹ کی مار لگواتی ہوں۔"

مگر ننھی کی چوٹ زیادہ دیر نہ چھُپ سکی نانی سر پہ دوہتڑ مار مار کر چنگھاڑنے لگی۔ پڑوسن نے سنا تو سر پکڑ کر رہ گئیں۔ اگر صاحبزادے کی لغزش ہوتی تو شاید کچھ ڈانٹ ڈپٹ ہو جاتی۔ مگر ڈپٹی صاحب...... محلّے کے مکھیا تین نواسوں کے نانا۔ پنج وقتہ نمازی۔ ابھی پچھلے دنوں مسجد میں چٹائیاں اور لوٹے رکھوائے۔ مُنہ سے پھوٹنے والی بات نہیں۔

لوگوں کے رحم و کرم کی عادی نانی نے آنسو پی کر ننھی کی کمر سینکی آٹے گڑ کا حلوا کھلا اور اپنی جان کو صبر کر کے بیٹھ رہی۔ دو چار دن لوٹ پوٹ کر ننھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور چند دنوں ہی میں سب کچھ بھول بھال گئی۔

مگر محلہ کی شریف زادیاں نہ بھولیں۔ چھُپ چھُپ کر ننھی کو بلاتیں۔

"نہیں...... نانی مارے گی۔" ننھی ٹالتی۔

"لے یہ چوڑیاں پہن لیجو۔ نانی کو کیا خبر ہوگی......" بیویاں بے قرار ہو کر پھسلاتیں......

"کیا ہُوا...... کیسے ہوا......" کی تفصیل پوچھی جاتی۔ ننھی کچی کچی معصوم تفصیلیں دیتی۔ بیویاں ناکوں پہ دوپٹے رکھ کر کھلکھلاتیں۔

ننھی بھول گئی...... مگر قدرت نہ بھول سکی۔ کچّی کلی قبل از وقت توڑ کر کھلانے سے پنکھڑیاں جھڑ جاتی ہیں...... مٹھونٹھ رہ جاتا ہے۔ ننھی کے چہرے پر سے بھی نہ جانے کتنی معصوم پنکھڑیاں جھڑ گئیں۔ چہرے پر پھٹکار اور روڑا پن۔ ننھی بچی سے لڑکی نہیں بلکہ چھلانگ مار کر ایکدم عورت بن گئی۔ وہ قدرت کے مشاق ہاتھوں کی سنواری بھرپور عورت نہیں۔ بلکہ ٹیڑھی میڑھی عورت جس پر کسی دیونے دو گز لمبا پاؤں رکھ دیا ہو۔ مٹھنگنی۔ موٹی۔ کچھ راسی جیسے کچّی مٹّی کا کھلونا کمہار کے گھٹنے تلے دب گیا ہو۔

میلی صافی سے کوئی ناک پونچھے چاہے کولھے، کون پوچھتا ہے۔ راہ چلتے اُس کے چٹکیاں بھرتے۔ مٹھائی کے دونے پکڑاتے۔ ننھی کی آنکھوں میں شیطان متحرک اُٹھتا...... مگر اب نانی بجائے اُسے حلوے مانڈے ٹھسانے کے اُس کا دھوبی گھاٹ کرتی، مگر میلی صافی کی دُھول بھی نہ جھڑتی۔ جانو ربڑ کی گیند، ٹپّا کھایا اور اُچھل گئی۔

چند سال ہی میں ننھی کی چوکھی سے محلہ لرز اُٹھا۔ سنا کہ ڈپٹی صاحب اور صاحبزادے میں کچھ تن گئی۔ پھر سُنا مسجد کے مُلّاجی کو رحجوا کہار نے مارتے مارتے چھوڑا۔ پھر سنا صدیق پہلوان کا بھانجہ مستقل ہو گیا۔

آئے دن ننھی کی ناک کٹتے کٹتے بچتی اور گلیوں میں لٹھ پونگا ہوتا۔

اور پھر ننھی کے تلوے جلنے لگے۔ پیر دھرنے کی رتّی بھر جگہ نہ رہی۔ صدیق پہلوان کے بھانجے کی پہلوانی اور ننھی کی جوانی نے محلّہ والوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ سُنتے ہیں دلّی، بمبئی میں اس مال کی تھوک میں کھپت ہے۔ شاید دونوں وہیں چلے گئے۔

جس دن ننھی بھاگی اس دن نانی کے فرشتوں کو بھی شبہ نہ ہوا۔ دو تین دن سے نگوڑی چپ چپ سی تھی۔ نانی سے بدزبانی بھی نہ کی۔ چپ چاپ آپ ہی آپ بیٹھی ہوا میں گھورا کرتی۔

"اے ننھی روٹی کھالے"۔ نانی کہتی۔

"نانی بی بھوک نہیں!"

"اے ننھی اب دیر ہوگئی سو جا"

"نانی بی نیند نہیں آتی"

رات کو نانی کے پیر دبانے لگی۔

"نانی بی ...... اے نانی بی ذری "سبحانک اللّٰھم"، سن لو یاد ہے کہ نہیں۔ نانی نے سنا فرفر یاد!"

"جا بیٹی اب سو جا" نانی نے کروٹ لے لی۔

"اری مرتی کیوں نہیں" نانی نے تھوڑی دیر بعد اُسے صحن میں کھٹ پٹ کرتے سُن کر کہا۔ "سمجھی" خانگی نے اب آنگن بھی پلید کرنا شروع کیا۔ کون حرامی ہے جسے آج گھر میں گھسا لائی ہے۔

پر صحن میں گھور گھور کر دیکھنے پر نانی سہم کر رہ گئی۔ ننھی عشاء کی نماز پڑھ رہی تھی۔ اور صبح ننھی غائب ہوگئی۔

کبھی کوئی دُور دیس سے آتا ہے تو خبر آجاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے ننھی کو ایک بڑے نواب صاحب نے ڈال لیا ہے۔ ٹم ٹم ہے منوں سونا ہے بیگموں کی طرح رہتی ہے۔

کوئی کہتا ہے ہیرا منڈی میں دیکھا تھا۔

کوئی کہتا ہے فارس روڈ پر اور کسی نے اُسے سوناگاچی میں دیکھا۔

مگر نانی کہتی ہے ننھی کو ہیضہ ہوا تھا۔ چار گھڑی لوٹ پوٹ کر مرگئی۔

ننھی کا سوگ منانے کے بعد نانی کچھ خبطن بھی ہوگئیں۔ لوگ راہ چلتے چھیڑ خانی کرتے۔

"اے نانی نکاح کر لو ——" بھابی جان چھیڑتیں۔

"کس سے کرلوں؟ لا اپنے خصم سے کرا دے!" نانی بگڑتیں۔

"اے نانی ملاجی سے کر لو۔ اللہ قسم تم پر جان دیتے ہیں" اور نانی کی مغلظات شروع ہو جاتیں۔ وہ وہ چنندے گالیوں میں نکالتیں کہ لوگ بھونچکے رہ جاتے۔

"مل تو جائے مُھڑوا ...... ڈاڑھی نہ اکھیڑ لوں تو کہنا" مگر جب ملاجی کبھی گلی نکڑ پہ مل جاتے تو نانی سچ مچ شرما سی جاتیں۔

علاوہ محلے کے لڑکوں بالوں کے نانی کے ازلی دشمن تو موئے لنگڑے بندر تھے جو پیڑھیوں سے اسی محلے میں پلتے بڑھتے آئے تھے۔ جو ہر فرد کا کچا چٹھا جانتے تھے۔ مرد خطرناک ہوتے ہیں اور بچے بدذات مگر عورتیں تو صرف ڈرپوک ہوتی ہیں۔ پر نانی بھی انہیں بندروں میں پل کر بڑھیائی تھیں۔ اُنھوں نے بندروں کو ڈرانے کے لئے کسی بچے کی غلیل ہتھیا لی تھی۔ اور سر پہ برقعہ کا پگڑ باندھ کر وہ غلیل تان کر جب اُچکتیں تو بندر تھوڑی دیر کو ششدر ضرور رہ جاتے اور پھر بے توجہی سے ٹہلنے لگتے۔

اور بندروں سے ان کی آئے دن باسی ٹکڑوں پر چخ چلتی رہتی۔ محلّہ میں جہاں کہیں شادی بیاہ چہلّا چالیسواں ہوتا، نانی جوٹھے ٹکڑوں کا ٹھیکہ لے لیتیں۔ لنگر خیرات بٹتی تو بھی چار چار مرتبہ چکمہ دے کر حصّہ لیتیں۔ منوں کھانا بٹور لانے کے بعد وہ اُسے حسرت سے تکتیں، کاش

اُن کے پیٹ میں بھی اللہ پاک نے کچھ اُونٹ جیسا انتظام کیا ہوتا تو کتنے مزے رہتے۔ مزے سے چار دن کی خوراک معدے میں بھر لیتیں چھٹی ہوتی۔ مگر اللہ پاک نے رزق کا اتنا اوٹ پٹانگ انتظام کرنے کے بعد پیٹ کی مشین کیوں اس قدر ناقص بنا ڈالی کہ ایک دو وقت کے کھانے سے زیادہ ذخیرہ جمع کرنے کا ٹھور ٹھکانا نہیں۔ اس لئے نانی ٹاٹ کے بسیروں پر جو میٹھے ٹکڑے پھیلا کر سُکھا لیتیں پھر اُنہیں مٹکیوں میں بھر لیتیں۔ جب بھوک لگی ذرا سے سُوکھے ٹکڑے چُرمُر کئے پانی کا چھینٹا دیا چٹکی بھر لُون مرچ بُرکا اور لذیذ ملغوبہ تیار۔ لیکن گرمیوں اور برسات کے دنوں میں بارہا یہ نسخہ اُن پر ہیضہ طاری کر چکا تھا۔ چنانچہ بس جانے پر طوعاً وکرہاً اُن ٹکڑوں کو اونے پونے بیچ ڈالتیں تاکہ لوگ اپنے گُنّوں اور بکریوں وغیرہ کو کھلا دیں۔ مگر عموماً کتوں اور بکریوں کے معدے نانی کے ڈھیٹ معدے کا مقابلہ نہ کر پاتے اور لوگ مُول تو کیا تحفتہً بھی ان فواکہات کو قبولنے پر تیار نہ ہوتے۔ وہی عزیز از جان جُوٹھے ٹکڑے جنہیں بٹورنے کے لئے نانی کو ہزاروں صلواتیں اور ٹھوکریں سہنا پڑتیں اور جنہیں دُھوپ میں سُکھانے کے لئے اُنہیں پوری بندر جاتی سے جہاد مُول لینا پڑتا۔ جہاں ٹکڑے پھیلائے گئے اور بندروں کے قبیلے کو بے تار برقی خبر پہنچی۔ اب کیا ہے غول در غول دیواروں پر ڈٹے بیٹھے ہیں کھپریلوں پر دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔ چھپّر کھسوٹ رہے ہیں اور آتے جاتے پر خوخیا رہے ہیں۔ نانی بھی اس وقت مردِ میدان بنی سر پر بُرقعہ کا ڈھاٹا باندھے ہاتھ میں غلیل لئے مورچہ پر ڈٹ جاتیں۔ سارا دن "لگے۔ لگے" کر کے شام کو بچا کھچا کوڑا بٹور بندروں کی جان کو کوستی نانی اپنی کوٹھری میں تھک کر سو رہتیں۔

بندروں کو اُن سے کچھ ذاتی قسم کی پرخاش ہو گئی تھی اگر یہ بات نہ ہوتی تو کیوں جہان بھر کی نعمتوں کو چھوڑ کر صرف نانی کے ٹکڑوں پر ہی حملہ آور ہوتے۔ اور کیوں بدذات لال پچھائے والا ان ہی کا عزیز از جان تکیہ لے بھاگتا۔ وہ تکیہ جو تہّتی کے بعد نانی کا واحد عزیز اور پیارا دُنیا میں رہ گیا تھا۔ وہ تکیہ جو بُرقعہ کے ساتھ اُن کی جان پر ہمیشہ سوار رہتا تھا۔ جس کی سیونوں کو وہ ہر وقت پکا ٹانکہ مارتی رہتی تھیں۔ بارہا نانی کسی کونے کھدرے میں بیٹھی تکیہ سے ایسے کھیلا کرتیں جیسے وہ ننھی سی بچی ہوں اور وہ تکیہ اُن کی گڑیا۔ وہ اپنے سارے دُکھ اُس تکیئے ہی سے کہہ کر جی ہلکا کر لیا کرتی تھیں۔ جتنا جتنا انہیں تکیہ پر لاڈ آتا وہ اُس کے ٹانکے پکّے کرتی جاتیں۔

قسمت کے کھیل دیکھئے نانی منڈیر سے لگی بُرقعہ کی آڑ میں نیفہ سے جوئیں چُن رہی تھیں کہ بندر دھم سے کودا اور تکیہ لے یہ جا وہ جا۔ ایسا معلوم ہوا کوئی نانی کا کلیجہ نوچ کر لے گیا۔ وہ دھاڑیں وہ چلّائیں کہ سارا محلّہ اکٹھا ہو گیا۔

بندروں کا قاعدہ ہے کہ آنکھ بچی اور کٹورا گلاس لے بھاگے اور چھجّے پر بیٹھے دونوں دونوں ہاتھوں سے کٹورا دیوار پر گھِس رہے ہیں۔ کٹورے کا مالک نیچے کھڑا احمق کا رہا ہے پیاز دے روٹی دے جب بندر میاں کا پیٹ بھر گیا کٹورا پھینک اپنی راہ لی۔ نانی نے مٹکی بھر ٹکڑے لُٹا دیئے پر حرامی بندر نے تکیہ نہ چھوڑنا تھا نہ چھوڑا۔ سو جتن کئے گئے مگر اُس کا جی نہ پگھلا۔ اور اُس نے مزے سے تکیہ کے غلاف پیاز کے چھلکوں کی طرح اُتارنے شروع کئے۔ وہی غلاف جنہیں نانی نے چندھی آنکھوں سے گھور گھور کر پکّے ٹانکوں سے گونتھا تھا۔ جوں جوں غلاف اُترتے جاتے نانی کی بدحواسی اور بلبلاہٹ میں زیادتی ہوتی جاتی۔ اور آخری غلاف بھی اُتر گیا۔ اور بندر نے ایک ایک کر کے چھجّہ پر سے ٹپکانا شروع کئے۔ روئی کے گالے نہیں ملکہ تشبن کی نتوئی۔ نبّو سقّے کا انگوچھا۔ ..... حسینہ بی کی انگیا۔ ..... مُنّی بی کی گڑیا کا غرارہ۔ رحمت کی اوڑھنی اور خیراتی کا کچھنا ......

خیرن کے لونڈے کا طمنچہ ...... منشی جی کا مفلر اور ابراہیم کی قمیص کی آستین معہ کف!

صدیق کی تہمد کا ٹکڑا۔ آمنہ بی کی سرمہ دانی اور بفاطن کی کجلوٹی۔ سکینہ بی کی افشاں کی ڈبیہ ـــــ ملّا جی کی تسبیح کا امام اور باقر میاں

کی سجدہ گاہ۔

بسم اللہ کا سوکھا ہوا نال اور کلاوہ میں بندھی ہوئی ننھی کی پہلی سالگرہ کی ہلدی کی گانٹھ، دوب اور چاندی کا چھلّا۔ اور بشیر خان کا گلٹ کا تمغہ جو اُسے جنگ سے زندہ لوٹ آنے پر سرکارِ عالیہ سے ملا تھا۔

مگر کسی نے اِن چیزوں کو نہ دیکھا ——— بس دیکھا تو اُس چوری کے مال کو جسے سالہاسال کی چھاپہ ماری کے بعد نانی نے لکھ لوٹ جوڑا تھا۔

" چور ——— بے ایمان ..... کمینی "

" نکالو بڑھیا کو محلے سے "

" پولیس میں دے دو "

" ارے اسکی تو شک بھی کھولو اس میں نہ جانے کیا کیا ہوگا " غرض جو جس کے مُنہ میں آیا کہہ گیا۔

نانی کی چیخیں ایک دم رُک گئیں۔ آنسو خشک۔ سر نیچا۔ اور زبان گنگ! کاٹو تو خون نہیں۔ رات بھی جوں کی توں دونوں گھٹنے مٹھیوں میں وابے ہل ہل کر سُوکھی سُوکھی ہچکیاں لیتی رہیں۔ کبھی اپنے ماں باپ کا نام لے کر کبھی میاں کو یاد کرکے کبھی بسم اللہ اور ننھی کو پکار کر بین کرتیں ..... دم بھر کو اُونگھ جاتی پھر جیسے پُرانے ناسوروں میں چیونٹے چٹکنے لگتے اور وہ بلبلا کر چونک اُٹھتیں۔ کبھی جھکی ہکی رونیں کبھی خود سے باتیں کرنے لگتیں۔ پھر آپ ہی آپ مُسکرا اُٹھتیں اور پھر تاریکی میں سے کوئی پُرانی یاد کا بھالا کھینچ مارتا اور وہ بیمار کتے کی طرح نیم انسانی آواز سے سارے محلّے کو چونکا دیتیں۔ دو دن اسی حال میں بیت گئے۔ محلّہ والوں کو آہستہ آہستہ احساسِ ندامت ہونا شروع ہوا۔ کسی کو بھی تو اُن چیزوں کی اشد ضرورت نہ تھی۔ برسوں کی کھوئی چیزوں کو کبھی کا رو پیٹ کر بھول چکے تھے۔ وہ بیچارے خود کو نسے لکھ پتی تھے۔ تنکے کا بوجھ بھی ایسے موقع پر انسان کو شہتیر کی طرح لگتا ہے۔ لوگ ان چیزوں کے بغیر زندہ تھے۔ شبن کی فتنئی اب سردیوں سے دھینگا مُشتی کرنے کے قابل کہاں تھی، وہ اُس کے ملنے کے انتظار میں اپنی بڑھواری تھوڑی روک بیٹھا تھا۔ حسینہ بی نے انگیا چولی کی اہمیت کو بریکار سمجھ کر اُسے خیر باد کہہ دیا تھا۔ مُنّی کی گڑیا کا غرارہ کس مصرف کا وہ تو کبھی کی گڑیوں کی عمر سے گذر کر ہنڈ کلہیوں کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ محلے والوں کو نانی کی جان لینا تھوڑی منظور تھی۔

پُرانے زمانہ میں ایک دیو تھا۔ اُس دیو کی جان تھی ایک بھونرے میں۔ سات سمندر پار ایک غار میں ایک صندوق تھا، اُس صندوق میں ایک اور صندوق اور اُس صندوق میں ایک ڈبیہ تھی جس میں ایک بھونرا تھا۔ ایک بہادر شہزادہ آیا ...... اور اُس نے پہلے بھونرے کی ایک ٹانگ توڑی، اُدھر دیو کی ایک ٹانگ جادُو کے زور سے ٹوٹ گئی پھر اُس نے دوسری ٹانگ توڑی اور دیو کی دوسری ٹانگ بھی ٹوٹ گئی پھر اُس نے بھونرے کو مَسل ڈالا اور دیو مر گیا۔

نانی کی جان بھی تکیہ میں تھی۔ اور بندر نے وہ جادُو کا تکیہ دانتوں سے چیر ڈالا۔ اور نانی کے کلیجے میں گرم سلاخ اُتر گئی۔

دُنیا کا کوئی دُکھ کوئی ذلّت کوئی بدنامی ایسی نہ تھی جو نصیبے نے نانی کو نہ بخشی ہو۔ جب سُہاگ کی چوڑیوں پر پتھر گرا تھا تو سمجھی تھیں اب کوئی دن کی مہمان ہیں، پر جب بسم اللہ کو کفن پہنانے لگیں تو یقین ہوگیا کہ اونٹ کی پیٹھ پر یہ آخری تنکا ہے۔ اور جب ننھی مُنہ پر کالکھ لگا گئی تو نانی سمجھیں بس یہ آخری گھاؤ ہے۔

زمانہ بھر کی بیماریاں پیدائش کے وقت سے جھیلیں۔ سات بار تو چیچک نے اُن کی صورت پہ جھاڑو پھیری۔ ہر سال تیج تہوار کے موقع پر ہیضہ کا حملہ ہوتا۔

تیرا میرا گو موت دھوتے دھوتے اُنگلیوں کے پورے سڑ گئے۔ برتن مانجھتے مانجھتے ہتھیلیاں چھلنی ہو گئیں۔ ہر سال اندھیرے اُجالے اُونچی نیچی سیڑھیوں سے لڑھک پڑتیں۔ دو چار دن لوٹ پوٹ کر پھر گھسٹنے لگتیں۔ پچھلے جنم میں نانی ضرور کُتّے کی کلّی رہی ہوں گی۔ جبھی تو اتنی سخت جان تھیں۔ موت کا کیا واسطہ جو اُن کے قریب پھٹک جائے۔ لیریاں لگائے پھریں گی مگر مُردہ کا کپڑا تن سے نہ چھُو جائے، کہیں مرنے والا سلوٹوں میں موت نہ چھپا گیا ہو جو نازوں کی پالی نانی کو آن دبوچے! مگر یوں عاقبت بندروں کے ہاتھوں لٹے گی، اِسکی کسے خبر تھی۔

صبح سویرے بہشتی مشک ڈالنے گیا تو دیکھا نانی کھپریل کی سیڑھیوں پہ اُکڑوں بیٹھی ہیں، مُنہ کھلا ہے۔ مکھیاں نیم وا آنکھوں کے کونوں میں گھس رہی ہیں۔ یوں نانی کو سوتا دیکھ کر لوگ اُنھیں مُردہ سمجھ کر ڈر جایا کرتے تھے مگر نانی ہمیشہ ہڑبڑا کر بلغم تھوکتی جاگ پڑتی تھیں اور ہونسنے والے کو ہزار صلواتیں سُنا ڈالتی تھیں۔

مگر اُس دن سیڑھیوں پہ اکڑوں بیٹھی ہوئی نانی دُنیا کو ایک مستقل گالی دے کر چل بسیں! زندگی میں کوئی کل سیدھی نہ تھی کروٹ کروٹ کانٹے تھے۔ مرنے کے بعد کفن میں بھی نانی اکڑوں لٹائی گئیں۔ ہزار کھینچ تان پر بھی اکڑا ہوا جسم سیدھا نہ ہوا۔

حشر کے دن...... صور پھونکا گیا۔ نانی ہڑبڑا کر کھنکارتی ہوئی اُٹھیں۔ جیسے لنگر کی بھنک کان میں پہنچ گئی ہو...... فرشتوں کو صلواتیں سناتی لشتم پشتم پل صراط پر سے اُکڑوں گھسٹتی ہوئی خدائے ذوالجلال والاکرام کے حضور میں پہنچیں! انسانیت کی اتنی بڑی توہین دیکھ کر خدا کا سر شرم سے جھک گیا...... اور وہ خون کے آنسو رونے لگا!

اور خدا کے وہ خون میں ڈوبے ہوئے آنسو نانی کے کچّے ڈھیر پہ ٹپکے جہاں سُرخ سُرخ لالے کے پھول لہلہانے لگے۔

بردہ فروش

غلام عبّاس

پنجاب کے اضلاع میں ایسے کئی چھوٹے چھوٹے قصبے ہیں جن کی آبادی تو چند سو نفوس سے زیادہ نہیں مگر ان کو اپنا ریلوے اسٹیشن رکھنے کا شرف حاصل ہے۔ ان اسٹیشنوں پر بسا اوقات ایک ویرانی اور اُداسی کی سی کیفیت رہتی ہے۔ کیونکہ میل اور ایکسپریس کی قسم کی گاڑیاں تو یہاں ٹھہرنا کسرِ شان سمجھ کر آندھی کے تیز و تند جھکڑ کی طرح گزر جاتی ہیں۔ البتہ سُست رفتار مسافر گاڑیاں چار چار پانچ پانچ گھنٹے کے وقفے کے بعد ان اسٹیشنوں پر آکے رُکتی اور گھڑی دو گھڑی کے لئے ان کی رونق بڑھا جاتی ہیں۔ مگر اُن کے جاتے ہی یہاں پھر اُلّو بولنے لگتا ہے۔

جمال پورہ پنجاب کا ایک ایسا ہی ریلوے اسٹیشن ہے۔ اسوج کا مہینہ۔ سہ پہر کا وقت۔ چار بجے ہیں۔ ٹھیک پینتالیس منٹ کے بعد ایک ڈاؤن پسنجر ٹرین آنے والی ہے۔ اسٹیشن پر چہل پہل شروع ہو گئی ہے۔ اسٹیشن کا بابو جو دیر سے نہ جانے کہاں غائب تھا، اب بار بار اپنی کوٹھری سے نکلتا اور اندر جاتا ہوا دکھائی دینے لگا ہے۔ آس پاس کے گاؤں کے مسافر جو گاڑی سے گھنٹوں پہلے آکے اسٹیشن کی ڈیوڑھی میں یا ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے آس پاس لمبی تانے پڑے تھے، انگڑائیاں لیتے ہوئے اُٹھ بیٹھے ہیں۔ اور اسٹیشن کے نل کے اردگرد بڑی فراغت کے ساتھ جو صرف دیہاتیوں ہی کو نصیب ہوتی ہے، ہاتھ منہ دھونے میں مصروف ہیں۔ ایک خوانچے والا بھی پلیٹ فارم پر ہانک لگاتا ہوا پھرنے لگا ہے۔ ایک سوکھا ہوا خارشتی کتا اُس کی چھلنی کی زد سے دُور دُور رہ کے اُس کا تعاقب کر رہا ہے۔ جس جگہ وہ خوانچہ لگاتا ہے، کُتّا بھی اُس سے گز سوا گز پرے ہٹ کے بیٹھ جاتا ہے۔

اسٹیشن کے بابو کی کوٹھری کے باہر پلیٹ فارم کی واحد بنچ پر دو عورتیں قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک جو ادھیڑ عمر کی ہے، ایک گٹھڑی سر کے نیچے رکھے لیٹی ہوئی ہے۔ اور دوسری جو جوان عورت ہے اُس کے پائنتی بیٹھی ہے۔ ادھیڑ عمر والی اپنی سیدھی سادی وضع اور کپڑوں سے صاف دیہاتن معلوم ہوتی ہے۔ مگر اُس کے ساتھ والی جوان عورت کا لباس نچلے طبقے کی شہری لڑکیوں کی یاد دلاتا ہے جو کسی شادی بیاہ میں آئی ہوں۔ بڑے بڑے پھولوں والی اُودے رنگ کی چھینٹ کی شلوار اور قمیص۔ سر پر ململ کا دوپٹہ سُرخ رنگا ہوا جس کے کناروں پر چھوٹا سنہری گوٹہ ٹکا ہوا۔ ناک میں سونے کی کیل، کان میں چاندی کی بالیاں، ہونٹوں پر دنداسے سے سیاہی مائل گہرا پیازی رنگ چڑھا ہوا، تیکھے نقش، نظر میں حد درجے کی شوخی اور بے باکی، جوانی اُس کے رونگٹے رونگٹے سے اُبلی پڑتی ہے۔ وہ بازو پھیلائے دونوں ہتھیلیوں کو گدّی کے نیچے رکھے بنچ سے ٹیک لگائے بیٹھی ہے، اور ہر آنے جانے کو دلچسپی سے دیکھ رہی ہے لیکن چونکہ پلیٹ فارم پر سواریاں کم ہیں، اس لئے اسٹیشن کے کوّے اور آوارہ کتّے ہی پھر پھر کر اُس کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔

اسٹیشن کا بابو سر پر تیل چپڑے پٹیاں جمائے منہ میں سگرٹ دبائے اپنی کوٹھری سے باہر نکلا۔ اور جوان لڑکی پر ایک چھلچھلی ہوئی نظر ڈال کے پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ لڑکی اُسے دیکھتے ہی بنچ پر سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور گنوارپنے سے مسکراتی ہوئی اُس کے پاس پہنچی۔

"بابو صاحب۔ ایک سگرٹ اور پلا دو۔"

بابو نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا کہ کوئی سُن تو نہیں رہا۔

" بھاگ جاؤ۔ سگرٹ نہیں ہے "۔

" پلا بھی دو بابو صاحب۔ ابھی ابھی سو کے اُٹھی ہوں۔ اللہ کی سوں بڑی طلب لگی ہے "۔

مگر بابو نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہؤا پلیٹ فارم پر دُور نکل گیا۔ لڑکی کھسیانی سی ہو کر کچھ دُور اُس کے پیچھے پیچھے چلی۔ راستے میں اُسے ایک کُتّا لیٹا ہؤا نظر آیا۔ اور اُس نے شرارت سے اُس کی دُم پر پاؤں رکھ دیا۔ کُتّا ہڑبڑا کر بھونک اُٹھا اور لڑکی خوانچے والے پر گرتے گرتے بچی۔ پل بھر کے بعد وہ خوانچے والے سے کہہ رہی تھی:۔

" خوانچے والے کیا ہے تیرے پاس ؟"

" پکوڑے، اگڑ کی ریوڑیاں "

" ہشت "

" جھاڑی بوٹی کے بیر "

" ہشت "

" مونگ پھلی، میٹھے چنے "

" لا ایک آنے کی مونگ پھلی دے "

مونگ پھلی اپنے دوپٹے کے پلّو میں ڈلوا کے وہ واپس چل دی۔

" بی بی پیسے تو دیتی جاؤ "

" کیسے پیسے ؟"

" مونگ پھلی جو دی ہے اکنی کی "

" اکنّی تو میرے پاس نہیں ہے "

" تو لاؤ روپے کا ناتواں دے دوں "

" روپیہ بھی نہیں ہے "

" تو پھر مونگ پھلی واپس کر دو "

" واہ۔ وہ تو میں واپس نہیں کرنے کی "

خوانچے والے کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا اور قریب ہی تھا کہ وہ چلّا اُٹھتا مگر عین اس وقت اس لڑکی کے ساتھ والی عورت آ پہنچی۔ وہ ایک ہی نظر میں معاملے کو تاڑ گئی۔

" گھبراؤ نہیں بھیّا۔ کتنے پیسے ہیں تمہارے ؟"

" چار "

" یہ لو "

اور وہ لڑکی کا بازو پکڑ کر اُسے وہاں سے لے گئی۔

" ریشماں " اُس نے پیار اور ملامت کے ملے جُلے لہجے میں کہا۔

"میں نے بہت دفعہ تمہیں سمجھایا ہے۔ کہ پیسہ پاس نہ ہو تو کوئی چیز نہ خریدا کرو"
"اونہہ"، ریشماں نے الھڑپن سے کہا "دکاندار کو تو پیسے مل ہی جاتے ہیں مائی جمی"

کوئی گھنٹے بھر کے بعد دونوں عورتیں تیسرے درجے کے ایک زنانہ ڈبے میں سفر کر رہی تھیں۔ ڈبہ سواریوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا مگر انہوں نے جیسے تیسے ایک کونے میں جگہ حاصل کر ہی لی تھی۔ دونوں سر جوڑ کر چپکے چپکے باتیں کر رہی تھیں۔ مائی جمی کہہ رہی تھی:۔

"اور پھر ریشماں یہ چودھری بڑا کھاتا پیتا ہے۔ اس کے پاس پہلی بیوی کا بہت سا زیور ہے جو اس نے بیچا نہیں بلکہ کہیں چھپا رکھا ہے تمہیں الھڑپن کی باتیں چھوڑ کر اس کا دل مٹھی میں لینا ہوگا۔ خوب اُس سے پیار محبت کی باتیں کرنا۔ حقہ خوب تازہ کر کے بھرا کرنا۔ رات کو ہاتھ پاؤں داب دبا کرنا۔ یہاں تک کہ اُس کو تم پر پورا پورا بھروسہ ہو جائے۔ اور وہ گھر کی کنجیاں تمہارے حوالے کر دے۔ اس طرح جب دو تین مہینے میں ساری چیزیں تمہارے قبضے میں آجائیں گی تو میں تمہیں وہاں سے نکال لے جاؤں گی"

"اُس بڈھے کھوسٹ کرم دین کے متعلق بھی تو تم یہی کہتی تھیں کہ ہے تو کنجوس مگر بڑا پیسے والا ہے۔ خاک بھی نہ نکلا کمبخت کے گھر سے"

"اُس کے متعلق واقعی سب کو دھوکا ہوا۔ بڑا فریبی تھا دغا باز۔ اچھا ہوا میں نے جلد ہی اُس کے پنجے سے تمہیں چھٹکارا دلا دیا"

"کم بخت میری کیسی نگرانی کرتا تھا۔ محلے والوں سے الگ کر رکھا تھا، اور ایک بڑھیا دیکھ بھال کے لئے الگ رکھ چھوڑی تھی۔ ایک دن اُس کو میری کسی بات پر شک گذرا۔ مجھے کوٹھری کے اندر لے گیا۔ اور چھوی دکھا کے کہنے لگا یاد رکھو تم نے کبھی بھاگنے کی کوشش کی تو اسی چھوی سے دو ٹکڑے کر دوں گا۔ بس اُسی دن سے مجھے اُس سے نفرت ہو گئی"

خیر اُس سے تو خدا نے تمہارا پیچھا چھڑا دیا۔ مگر یہ چودھری ہے بڑا نمازی پرہیزگار۔ جب سے بیوی مری ہے گھر بسانے کے سوا اور کوئی فکر ہی نہیں"

"زیادہ بوڑھا تو نہیں؟"

"نہیں ایسا بوڑھا نہیں"

"کیا عمر ہوگی؟"

"یہی کوئی پچاس پچپن برس"

رات کے کوئی پونے بارہ بجے گاڑی اُس قصبے کے اسٹیشن پر رکی جہاں ان عورتوں کو جانا تھا۔ گاڑی سے اُتر کر اسٹیشن کے مسافر خانے میں پہنچیں۔ اور رات وہیں گزاری۔ صبح کو ابھی اندھیرا ہی تھا کہ مائی جمی نے بانو سے اُس کا سرخ دوپٹہ لے لیا، اور اُسے اوڑھنے کے لئے ایک سفید چادر دے دی تاکہ وہ بھی وہاں نہ معلوم ہو۔ نئے گاؤں کا معاملہ تھا۔ احتیاط شرط تھی۔ جتنے کم لوگوں کی نظران پر پڑے اتنا ہی اچھا تھا۔ دونوں نے لمبے لمبے گھونگٹ نکال لئے، اور پیدل ہی قصبے کی طرف چل دیں۔

ریشماں کو چودھری گلاب کے گھر میں رہتے ہوئے پندرہ بیس روز ہو چکے تھے۔ مگر وہ ابھی تک نہیں سمجھ سکی تھی کہ اُسے اس نئے گھر میں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ پہلے دن جب وہ آئی تھی تو اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ نجانے اُسے کن حالات کا سامنا کرنا ہوگا؟ چودھری کس قماش کا آدمی ہے؟ کرم دین کی طرح ظالم تو نہیں؟ اُس سے زیادہ کام تو نہیں لے گا؟ اُسے مارے پیٹے گا تو نہیں؟ اُس کی رکھوالی کون لوگ کریں گے؟ تایل کی قربتیں کون

ناخوشگوار فرائض کی حامل ہوگی؟ اور کیا زندگی کو ایک مسلسل فریب بنائے رکھنے میں وہ کامیاب ہو سکے گی۔؟

مگر چند ہی روز میں اُس کے یہ سارے اندیشے غلط ثابت ہوئے۔ چودھری گلاب ایک سیدھا سادہ کم گو اور بے آزار انسان تھا۔ اِس میں شک نہیں۔ کہ اُس کی عمر ساٹھ برس سے کم نہ تھی مگر وہ دیہاتی زمینداروں کی طرح لمبا چوڑا تھا۔ اور ابھی اُس کے ہاتھ پاؤں خوب مضبوط تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اُس کی عمر کا وہ دَور شروع ہو گیا تھا۔ جبکہ جوش سرد پڑ جاتا ہے، اور بیداریٔ احساس کے لئے تیز و تند کچوکوں کی ضرورت ہوتی ہے ذہنی آسودگی اور اطمینانِ قلب، عمل کی جگہ لے لیتے ہیں۔ اور لذت کشی میں کوئی کمی رہ جاتی ہے تو تخیّل اُسے پورا کر دیتا ہے۔

پھر چونکہ وہ نمازی اور پرہیزگار تھا اس لئے اُس کی طبیعت بھی صاف سُتھری تھی۔ رشیماں کو نہ تو اُس کے کپڑوں سے اور نہ جسم کے کسی حصّے سے بدبو آتی تھی۔ اُس کی سفید لمبی داڑھی تھی جس میں وہ ہر روز کنگھی کیا کرتا تھا۔ سر پر اِکّا دُکّا ہی بال رہ گئے تھے۔ آنکھوں میں سُرمہ ڈالنے کا بہت شوقین تھا، اس کے عادات و اطوار میں ایک عجیب طرح کا بھولا پن تھا جس نے اُسے ایک پیارا پیارا بڈھا بنا دیا تھا۔ پہلی بیوی سے اُس کی دو بیٹیاں تھیں جو مدّت ہوئی بیاہی جا چکی تھیں۔ اولادِ نرینہ کوئی نہ تھی۔ جس کی اُسے آج بھی حسرت تھی۔

رشیماں کو دو وقت کی ہنڈیا کے علاوہ گھر کا کوئی اور کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اُپلے تھاپنا، گھر اور آنگن میں جھاڑو دینا، گائے بھینسوں کو سانی دینا، دودھ دوہنا یہ سب کام گاؤں کی ایک بڑھیا کیا کرتی تھی جسے چودھری معاوضے میں اجناس اور سبزی ترکاری دیا کرتا تھا۔ اُس کے علاوہ کئی کسان تھے جو چودھری کے کھیتوں میں کام کیا کرتے تھے۔ خود چودھری بھی زیادہ تر کھیتوں ہی پر رہا کرتا۔ چودھری نے پہلے ہی دن سے گھر کا سارا انتظام رشیماں کے حوالے کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ ہنڈیا روٹی سے فارغ ہو کے دن بھر مزے سے پلنگ پر پڑی پڑی بڑھیا پر حکم چلایا کرتی۔

کرم دین کے گھر میں اور اِس گھر میں کتنا فرق تھا۔ وہاں وہ بیچ مچ زرخرید لونڈی تھی اور یہاں گھر کی مالکہ۔ وہاں وہ خود اپنی نظروں میں ذلیل تھی اور یہاں سب لوگ اُس کا ادب کرتے تھے یہاں تک کہ خود چودھری بھی اُس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اُس نے جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ رہ کر جس قسم کی زندگی گزاری تھی، اُس سے وہ زندگی کو ایک خوفناک کھیل سمجھنے لگی تھی جس میں کھلاڑی ہر وقت جان کی بازی لگائے رکھتا ہے اور آخر کار ایک نہ ایک دن اُسے زندگی سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ مگر اب رفتہ رفتہ اُسے زندگی کی قدر و قیمت معلوم ہونے لگی۔ اِس گھر میں کس قدر عافیت تھی اور باہر کیسے کیسے خطرے۔ قدم قدم پہ پولیس کا خوف۔ پھر جن لوگوں کو فریب دیا گیا اُن کے غضب ناک چہروں کا ہر وقت آنکھوں کے سامنے پھرتے رہنا۔ اجنبی شکلوں پر خواہ مخواہ اُن کا دھوکا ہونا، رہ رہ کے چونک پڑنا، سوتے سوتے چیخ اُٹھنا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اُس کی عمر پانچ چھ برس کی ہوگی کہ کوئی شخص شہر کے ایک محلّے سے اُٹھا کر لے بھاگا تھا۔ اُس نے مختلف دیہاتوں میں پرورش پائی تھی یہاں تک کہ اُس کی عمر شادی کے لائق ہو گئی۔ ایک عورت نے اپنے کو اُس کی چچی ظاہر کر کے ایک کھاتے پیتے گھر میں اچھی قیمت پر اُسے بیچ ڈالا۔ پہلے پہل وہ جس شخص کے پلّے پڑی۔ وہ ایک نیم سودائی نوجوان تھا جس سے کوئی باپ اپنی بیٹی کو بیاہنے کے لئے تیار نہ تھا۔ سودائی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ سخت بدمزاج اور ظالم بھی تھا۔ اپنی ناتجربہ کاری اور اُس وسیع خاندان کے افراد کی ہر وقت کی نگرانی کے باعث وہ پُورے پانچ برس تک اُس گھر کی سختیاں سہتی رہی۔ لیکن آخر ایک بڑھیا اُسے بھگا لائی۔ جس نے اُسے مائی جمّی کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

سودائی کے ساتھ پانچ برس گذارنے کے بعد وہ خود بھی نیم دحشتی ہو چکی تھی، اور اُسے اچھے بُرے کی کوئی تمیز نہ رہی تھی۔ مائی جمّی نے تین چار مہینے اپنے ساتھ رکھ کے اُسے خوب خوب کھلایا پلایا۔ اور پیار محبت سے رام کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اُسے اپنے پیشے کی تعلیم بھی دیتی رہی۔

مائی جمّی کا بردہ فروشی کا طریقہ سب سے جُدا نوعیت کا تھا۔ اور ایک فن کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ بڈھوں بڈھوں کو پھانسا کرتی جو ہمیشہ جوان لڑکیوں کے آرزو مند رہتے۔ اور جن سے اُن کی اچھی قیمت مل جاتی۔ پھر جب لڑکی زیور اور روپیہ لے کر بھاگ جاتی تو وہ بدنامی اور جگ ہنسائی کی

وجہ سے اُس کا زیادہ وہ چرچا نہیں کرتے۔ اور بڑھاپے کی وجہ سے دوڑ دھوپ اور پیچھا کرنے کی بھی اُن میں ہمت نہیں ہوتی۔ اس طرح چند ہی ماہ میں یہ واقعہ رفت گزشت ہو جاتا۔ اور پھر کہیں دُور نئے شکار کی تلاش شروع ہو جاتی۔

ریشماں کی مُہم پسند زندگی کو یہ خطرناک کھیل، جس میں ایک طرح سے مردوں سے انتقام لینے کا جذبہ بھی شامل تھا، بھا گیا تھا مگر بدقسمتی سے فضل دین کے پلّے پڑ کر اُس کا پہلا ہی تجربہ بہت تلخ ثابت ہوا تھا۔ جسے وہ کسی قیمت دُہرانا نہیں چاہتی تھی۔

دن گزرنے لگے۔ یہاں تک کہ ریشماں کو چودھری گلاب کے گھر میں بسے تین مہینے ہو گئے۔ اِس دَوران میں وہ آرام اور عافیت کی اور بھی زیادہ عادی ہو گئی۔ اُدھر چودھری روز بروز اُس کا پہلے سے زیادہ گرویدہ ہوتا جا رہا تھا اور آئے دن اُس کے لئے چھوٹے چھوٹے زیور لانے لگا تھا جنہیں وہ ظاہر کرتا کہ خاص اُسی کے لئے بنوائے گئے ہیں۔

ایک دن وہ گھر میں اکیلی تھی کہ ایک بڑھیا بھیک مانگنے آئی۔ جب ریشماں آٹے کی مٹھی فقیرنی کی جھولی میں ڈال رہی تھی تو اُس نے چپکے سے کہا۔

"مجھے مائی جی نے بھیجا ہے۔ کہو کب چلنا ہے؟"

اُس نے بڑھیا کو پہچان لیا۔ وہ یکبارگی کانپ اُٹھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ مگر پھر جلد ہی وہ سنبھل گئی اور بولی:-

"مائی جی سے کہنا ابھی نہیں۔ ابھی مجھے زیوروں کا پتہ نہیں لگا۔ ایک مہینہ اور ٹھہر جائے۔"

فقیرنی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

ایک مہینہ اور گزر گیا۔ اب کے مائی جی خود آئی۔ اور صبح کو ایسے وقت آئی جبکہ چودھری گھر میں موجود تھا۔ وہ اُسے ریشماں کی خالہ سمجھتا تھا جو غربت کی وجہ سے اپنی بہن کی نشانی کو بیچ دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اُس نے مائی جی کو عزت سے گھر میں بٹھایا، اُس کی مزاج پرسی کی۔ پھر دونوں کو تنہا چھوڑ کر کھیتوں پر چلا گیا۔

"کہو زیوروں کا پتہ لگا؟" مائی جی نے پوچھا۔

"مجھے کچھ کہنے سُننے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ وہ ایک ایک کر کے خود ہی مجھے دے رہا ہے۔ لو دیکھو۔"

"ادی ان دو انگوٹھیوں اور کان کے بُندوں کو تُو زیور کہہ رہی ہے۔ پگلی زیور تو ہوتا ہے ست لڑا، مالا، کڑے، جھومر، چمپا کلی۔ لیکن بس اب ہمیں کچھ نہیں چاہیئے۔ میں تجھے لینے آئی ہوں۔ آج رات کو تیار رہیو۔ میں نے گھوڑی کا انتظام کر لیا ہے۔"

"نہیں مائی جی ابھی نہیں۔" اُس نے سہم کر لجاجت سے کہا "مجھے اِس گھر میں بہت آرام مل رہا ہے۔ میں ابھی نہیں جانا چاہتی۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ مجھ سے رجّی نے بھی کہا تھا کہ تیرے طور بدلے ہوئے ہیں۔ مگر میں نے یقین نہیں کیا۔" پھر وہ تحکمانہ لہجے میں کہنے لگی۔ "سُن لڑکی۔ بے وقوفی کی بات نہ کر۔ تجھے میرے ساتھ جانا ہے۔ اور آج ہی رات کو۔ ایک بڑا امیر نمبردار تیرا گاہک پیدا ہوا ہے۔ جو تجھے سونے سے لاد دیگا۔ اور میں اُس سے بات بھی پکی کر آئی ہوں۔"

"مائی جی" ریشماں نے اور بھی گڑگڑا کر کہا "میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے اسی گھر میں رہنے دے۔ میں تجھے یہ سارا زیور دے دونگی۔ اور چودھری اور جو کچھ دیگا، وہ بھی تیرا ہی ہو گا۔ مگر مجھے یہیں چھوڑ دے۔"

مائی جی کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ادی ابھی تُو نے دیکھا ہی کیا ہے۔ بڈھے پر کیا مرنا۔ زندگی کا مزہ لینا ہے تو کسی جوان پر مر۔ اس بڈھے میں کیا رکھا ہے۔"

"نہیں نہیں مجھے کسی مرد کی ضرورت نہیں۔ مجھے یہ بڈھا بھی نہیں چاہیئے۔ میں تو فقط آرام سے زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔"

"دیکھ ریشماں" مائی نے بڑے گنبھیر لہجے میں کہا، "جو تو چاہتی ہے۔ وہ تو ہو نہیں سکتا۔ اور اگر تو سیدھی طرح نہیں مانے گی۔ تو پھر میں دوسرا گُر بھی جانتی ہوں۔ تجھے معلوم ہے کہ کرم دین ابھی تک چھوی سنئے تیری تلاش میں پھر رہا ہے اور تو یہ بھی جانتی ہے۔ کہ اُسے معلوم نہیں۔ کہ میں نے تجھے بھگا یا ہے۔ میں اب بھی اُس کے پاس جا سکتی ہوں۔ اور تیرا پتہ بتا سکتی ہوں۔"

مائی جمی کی زبان سے یہ الفاظ مشکل ہی سے نکلے ہوں گے۔ کہ ایسا معلوم ہوا جیسے یکبارگی بھونچال آگیا ہو۔ ریشماں نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح مائی کو دبوچ لیا، اور ناخنوں سے اُس کا چہرہ لہولہان کر دیا۔ پھر پیٹ پر اس زور کی دو تین لاتیں ماریں۔ کہ تھوڑی دیر کے لئے اُس کا سانس بند ہو گیا۔

"حرامزادی۔ کٹنی۔ بدمعاش۔ ڈائن۔ نکل جا میرے گھر سے ورنہ ابھی خون پی لوں گی۔"

یہ کہتے کہتے اُس نے مارے طیش کے مائی کے مُنہ پر تھوک دیا۔

ریشماں کے چہرے سے اس وقت ایسا وحشی پن ٹپک رہا تھا۔ کہ معلوم ہوتا تھا جو کچھ کہہ رہی ہے واقعی کر گذرے گی۔ اُس کے پہلے ہی جملے نے مائی جمی کی ایسی سٹی گم کر دی تھی۔ کہ وہ اپنی مدافعت بھی نہ کر سکی تھی۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی، کپڑے جھاڑے، چادر سے چہرہ پونچھا۔ اور بغیر ایک لفظ مُنہ سے نکالے چلی گئی۔ اُس کے جاتے ہی ریشماں نے خود کو پلنگ پر پٹخ دیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دوپہر کو جب چودھری گلاب کھانا کھانے آیا۔ تو وہ پہلے کی طرح ہشاش بشاش پلنگ سے اُٹھی۔ اور کھانا نکالنے کے لئے چولھے کی طرف گئی۔

"تمہاری خالہ چلی گئیں؟" چودھری نے پوچھا۔

"ہاں"

"کھانا تو کھلا دیا ہوتا"

"اُنہیں جلدی جانا تھا کسی کُنبے والے سے ملنے۔ میں نے روکا۔ مگر نہیں رُکیں۔ کہا پھر کبھی دیکھا جائے گا۔"

اس واقعے کو ایک ہفتہ گذر گیا۔ مگر اِس عرصے میں ریشماں کے دل کا چین مفقود ہو چکا تھا۔ ہر آہٹ پر اُسے کسی کے قدموں کا گماں ہونے لگا تھا، وہ بار بار دروازے کی طرف جاتی اور واپس آجاتی۔ دو چار ہی دن میں اُس کی آنکھوں کے گرد گڑھے پڑ گئے۔ اور چہرے پر زردی چھا گئی۔ جیسے یکبارگی کسی مُہلک مرض نے آلیا ہو۔ رفتہ رفتہ اُس کی قوتِ گویائی بھی جواب دینے لگی۔ وہ چودھری سے کچھ کہنا چاہتی تو مُنہ سے بات نہ نکلتی۔ چودھری اُس سے کچھ کہتا، تو وہ بے خیالی میں کچھ نہ سُنتی۔ اور چودھری کو ایک ایک بات تین تین چار چار بار دہرانی پڑتی۔ چودھری نے اِس تبدیلی کو محسوس کیا۔ اور کہا:—

"تمہارا جی اچھا نہیں ہے۔ چلو میں تمہیں حکیم کے پاس لے چلوں۔"

"نہیں مجھے کچھ نہیں ہوا" اُس نے کہا۔ "بچپن ہی سے میری حالت کبھی کبھی ایسی ہو جایا کرتی ہے، مگر چند ہی دنوں میں میں آپ ہی آپ ٹھیک ہو جاتی ہوں۔"

دن پر دن گزرتے گئے۔ مگر اُس کی حالت میں فرق نہ آیا۔ اِس دوران میں کئی مرتبہ اُس کا جی چاہا تھا۔ کہ وہ چودھری سے سارا حال کہہ دے۔ اور اپنے کو اُس کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ مگر اُس کا احساسِ خودی جسے خود چودھری ہی کے حسنِ سلوک نے اُس میں پیدا کر دیا تھا اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ کیا وہ چودھری کے سامنے اعتراف کرلے۔ کہ وہ پرلے درجے کی مکار اور جھوٹی ہے۔ اور ان چار ماہ میں جو اُس نے اِس گھر میں گذارے ہیں، اُس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ فریب اور دغا سے پُر تھا۔ اور پھر اس بات کی کیا ضمانت تھی، کہ چودھری پر یہ حقیقت کھُلنے پر کہ وہ ایک جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتی ہے، جو کئی گھروں کو لُوٹ چکا ہے، اور عنقریب اُس کو بھی لُوٹنے والا تھا، اُسے بے عزت کر کے گھر سے نکال نہ دیگا!

وہ مرجانا گوارا کرے گی مگر یہ ذلت کبھی نہ سہے گی۔

اُسے اِس بات کا افسوس نہیں تھا۔ کہ اُس نے مائی جُمّی کے ساتھ ایسا درشت سلوک روا رکھا۔ اگر وہ زمانہ سازی سے کام لیتی، تو شاید مائی کو دو تین مہینے تک اور ٹال سکتی تھی، مگر امید و بیم میں رہ کر جینا اُس کی آزاد سرشت کے لئے موت سے بدتر تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ جو بات بھی ہونی ہو دو ٹوک ہو جائے۔ اور وہ خوش تھی کہ اُس نے مائی جُمّی سے اپنا بدلہ لے لیا تھا۔ اُس نے اپنے کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا، اور صبر کے ساتھ اُس آنے والی گھڑی کا انتظار کرنے لگی۔ اُسے زیادہ زحمت نہ اُٹھانی پڑی۔ اور وہ گھڑی آ ہی گئی۔

شام کا وقت تھا۔ گھروں میں دیئے جل چکے تھے۔ وہ چولھے کے پاس بیٹھی چودھری کو کھانا کھلا رہی تھی۔ کہ ایک کسان کھانستا ہُوا گھر کے آنگن میں داخل ہُوا۔

"چودھری صاحب" اُس نے کہا "کوئی شخص آپ سے ملنے آیا ہے"

"کون ہے؟"

"کوئی بوڑھا زمیندار ہے۔ سفید داڑھی والا۔ نام نہیں بتلایا۔ کہتا ہے بہت ضروری کام ہے۔ بڑی دُور سے آیا ہوں"

"اچھا اُسے باہر چارپائی پر بٹھاؤ۔ اور حقہ بھر کے پلاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں"

ریشماں کا سر چکرا گیا۔ اور اُس نے سہارا لینے کے لئے اپنا ایک ہاتھ زمین پر ٹیک دیا۔ مگر یہ کیفیت لمحہ بھر سے زیادہ نہ رہی۔ وہ سنبھل گئی اور خاموشی سے چودھری کو کھانا کھاتے دیکھنے لگی۔ رفتہ رفتہ اُس میں توانائی آتی جا رہی تھی۔ اُس نے محسوس کیا۔ کہ وہ ہر خطرے کا مقابلہ کر سکے گی۔

کھانا کھا کے چودھری نے کلی کی۔ داڑھی مونچھ پر ہاتھ پھیرا۔ پھر تہمد کے پلّے سے منہ پونچھتا ہُوا باہر نکل گیا۔

ایک منٹ، دو منٹ۔ پانچ منٹ، پندرہ منٹ گزر گئے مگر چودھری نہ آیا۔ ریشماں نے سوچا۔ کہ ابھی وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے ہوں گے اور اصل قصہ ابھی نہیں چھڑا ہوگا۔ کیونکہ وہ برابر حُقّے کی گڑ گڑاہٹ سُن رہی تھی۔

آخر کوئی آدھ گھنٹے کے بعد چودھری واپس آیا۔ اُس کی حالت انتہائی اضطراب کی تھی۔ اُس کی آنکھیں بھنچی ہوئی تھیں۔ ہاتھ کانپ رہے تھے اور داڑھی کف آلود تھی۔

"کیوں ری" اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا "تو کرم دین کو جانتی ہے؟"

ایک ایسی آواز میں جو سرگوشی سے ذرا ہی اُونچی تھی ریشماں نے کہا:-

"ہاں"

"تو پھر وہ سب کچھ سچ ہے جو وہ کہتا ہے؟"

بغیر یہ جاننے کی خواہش کئے کہ وہ کیا کہتا ہے ریشماں نے کہا:-

"ہاں"

اور اس کے ساتھ ہی اُسے ایسا محسوس ہُوا جیسے یکبارگی کوئی بڑا بھاری بوجھ اُس کے سینے سے اُٹھ گیا۔

"بدذات۔ بے حیا عورت"

یہ پہلے سخت الفاظ تھے جو چودھری گلاب کی زبان سے اُس نے اپنے یا کسی اور کے بارے میں سُنے تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ ان الفاظ نے اُس کے احساسِ خودی کو صدمہ نہیں پہنچایا۔ بلکہ ان کے سُننے میں اُسے مزہ آیا۔ اور ایک خفیف سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔

چودھری نے غصے سے ایک دو مرتبہ زمین پر پاؤں پٹکے۔ کوٹھڑی کے اندر گیا۔ آنگن میں گھوما۔ جیسے نہیں جانتا کہ کیا کرے۔ آخر وہ باہر نکل گیا۔

ریشماں اب اپنے کو پہلے کی طرح پھر بے خوف اور آزاد محسوس کر رہی تھی۔ ہر قسم کے بندھنوں سے آزاد۔ جن میں اخلاق، عزتِ نفس اور خودداری کے بندھن بھی شامل تھے۔ ان بندھنوں میں اُس نے اپنے کو خواہ مخواہ جکڑ لیا تھا۔ مگر اب وہ لطف و مسرت کے ساتھ ہر تماشہ دیکھنے کے لئے تیار تھی خواہ وہ انجام کار اُسکی اپنی زندگی کا المیہ ہی کیوں نہ ثابت ہو۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی آنگن میں گئی، اور دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کے اُن کی باتیں سننے لگی۔ وہ دونوں چارپائی پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، چودھری گلاب بڑے جوش میں کہہ رہا تھا۔

"نالش دعوے کرنا یا عدالت میں جانا تو نامردوں کا کام ہے۔ مردوں کا طریقہ دوسرا ہے۔ اگر تمہیں منظور ہے تو ابھی چل کے فیصلہ کئے لیتے ہیں۔"

"مجھے منظور ہے" کرم دین نے تاؤ کھا کے کہا "میں بھی گیدڑ نہیں ہوں۔"

اِس کے تھوڑی ہی دیر بعد چودھری گلاب، کرم دین اور ریشماں تینوں کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے قصبے کے اُس طرف جا رہے تھے، جدھر گھنا جنگل تھا، اور آبادی کے آثار مفقود تھے۔ یہ ماگھ کے آخری دن تھے۔ سردی زوروں پر تھی۔ تیرھویں یا چودھویں کا چاند نکلا ہوا تھا، جوں جوں وہ بلند ہوتا جاتا خنکی بڑھتی جاتی تھی۔ اُنہوں نے گاڑھے کی چادروں میں اپنے کو لپیٹ رکھا تھا۔ دونوں مرد آگے آگے تھے اور ریشماں پیچھے پیچھے۔ چاندنی میں اُن کے لمبے لمبے سائے زمین پر پڑ رہے تھے۔

وہ خاموشی سے چلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ جنگل میں پہنچ گئے۔ مگر اُن کے قدم اب بھی نہیں تھمے۔ وہ چاند کی کرنوں کی روشنی میں جو درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر پگڈنڈی پر پڑ رہی تھیں، برابر چلتے رہے۔ آخر وہ جنگل بھی ختم ہو گیا۔ اور ایک ایسی جگہ آ گئی، جہاں ہر طرف ٹیلے ہی ٹیلے تھے، خاردار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اور مُردہ جانوروں کے پنجر پڑے ہوئے تھے۔ یہ جگہ ایسی اُجاڑ اور سنسان تھی کہ رات تو رات دن کے وقت بھی کسی انسان کا اُدھر گزر نہیں ہوتا تھا۔

ایک اُونچا سا صاف اور ہموار قطعہ زمین دیکھ کے چودھری گلاب ٹھہر گیا۔

"بس یہ جگہ ٹھیک ہے" اُس نے کہا۔ یہ پہلا فقرہ تھا جو پچھلے دو گھنٹے کی مسافت کے دوران میں ان میں سے کسی کی زبان سے سُنائی دیا تھا۔"

"جیسی چودھری صاحب کی مرضی" کرم دین نے جواب دیا۔

دونوں نے اپنی اپنی چادریں، پگڑیاں اور کُرتے اُتار کے زمین پر رکھ دیئے۔ اور تہمد کو لنگوٹ کی طرح کس لیا۔ پھر دو چھوریاں چاندنی میں چمکنے لگیں اور دونوں میدان میں اُتر آئے۔

ریشماں چلتے چلتے تھک گئی تھی، ان سے ذرا فاصلے پر ایک پتھر پر بیٹھ گئی، اور انتہائی دلچسپی سے ان کی لڑائی دیکھنے لگی۔ ایسا نظارہ اُس نے اپنی عمر میں پہلے کاہے کو دیکھا ہو گا۔ اُس کے دل میں اب شمّہ بھر بھی خوف نہیں تھا۔ نہ اس کی فکر کہ ان دونوں میں سے کون فتحیاب ہو کر اُس کی قسمت کا مالک بنتا ہے۔ وہ بڑی مسرت اور چونچالی کے ساتھ ان بڈھوں کی جنگ دیکھ رہی تھی۔ جیسے بچے مداری کے ریچھوں کی کُشتی کا تماشہ دیکھتے ہیں۔

کچھ دیر تو دونوں چھوریاں تانے بے حرکت آمنے سامنے کھڑے رہے۔ اس کے بعد اُنہوں نے پینترے بدلے۔ چاندنی میں اُن کی چاندیں چمک رہی تھیں اور سفید داڑھیاں جو اِس وقت اور بھی سفید دکھائی دیتی تھیں ہل رہی تھیں۔

وہ پاؤ گھنٹے تک اسی طرح برابر پینترے بدلا کئے مگر ابھی تک ایک کی چھوری نے دوسرے کے جسم کو چھُوا نہیں تھا۔ صرف ایک مرتبہ چودھری

گلاب کی چھوی کرم دین کی چھوی سے ٹکرا گئی تھی۔ مگر اس کے بعد وہ دونوں پیچھے ہٹ گئے۔ اسی میں وہ دونوں ہانپنے لگے تھے۔

ریشماں کو اس تماشے سے اُکتاہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ اور اُس نے جمائیاں لینی شروع کر دیں۔ اُسے اب سردی بھی لگنے لگی تھی۔ اُس نے ٹیلوں کے اُس پار دیکھنا شروع کیا۔ شاید دُور کوئی نالہ بہہ رہا تھا جس کا ہلکا ہلکا شور اس ہُو کے عالم میں بڑا سُہانا معلوم ہوتا تھا۔

اچانک کرم دین نے ہاتھ سے اشارہ کیا، کہ ذرا تھم جاؤ۔ اُس کے تہمد کا پلّا جس کو اُس نے لنگوٹ کی طرح پیچھے اُڑس رکھا تھا، باہر نکل آیا تھا۔ اُسے ایک ہاتھ میں چھوی اور دوسرے میں لنگوٹ تھامے دیکھ کر ریشماں ضبط نہ کر سکی، اور اُس نے بے اختیار قہقہہ لگا دیا۔ دونوں مرد پلٹ کر اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

"اگر میں زندہ بچ رہا" کرم دین نے کھسیانا سا ہو کے کہا "تو سب سے پہلے اسی چھنال کے ٹکڑے کر دوں گا۔"

"اس بے حیا کو تو اب میں بھی گھر میں نہیں بساؤں گا" چودھری گلاب نے کہا "بس ناک کاٹ کے چھوڑ دونگا۔"

"تو چودھری آؤ پہلے کیوں نہ اسی کا قصہ پاک کریں۔ ہم بھی کیسے بیوقوف ہیں کہ اس فاحشہ کے پیچھے جان دیئے دیتے ہیں۔ اس کا کیا ہے کل کسی اور کی بغل گرم کر رہی ہو گی۔"

چودھری گلاب نے کچھ جواب نہ دیا۔ کرم دین نے اُس کے جواب کی ضرورت بھی نہ سمجھی اور چھوی لیکر ریشماں کی طرف جھپٹا۔ مگر جلدی میں کپڑوں کے ڈھیر میں اُس کا پاؤں اُلجھ گیا اور ریشماں کو موقع مل گیا کہ وہ بھاگ سکے۔

وہ تیزی سے دوڑ کر ایک ٹیلے پر چڑھ گئی، کرم دین بھی اُس کے پیچھے بھاگا۔ اُسے دیکھ کر وہ پھر دوڑی۔ کرم دین نے بھی اُس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ دونوں ویزنک ٹیلوں پر اِدھر اُدھر بھاگتے دوڑتے رہے۔ کرم دین دوڑتے دوڑتے بے دم ہو گیا تھا، مگر انتقام کی آگ نے اُسے ایسا باؤلا بنا دیا تھا، کہ وہ گرتا پڑتا اُس کا تعاقب کئے جا رہا تھا۔ یہ سلسلہ آدھ گھنٹے تک جاری رہا۔ بالآخر ریشماں کے کپڑے ایک جھاڑی کے کانٹوں میں اُلجھ گئے۔ اور دوسرے لمحے کرم دین نے آکے اُسے چٹیا سے پکڑ لیا۔ اور گھسیٹتا ہوا لے چلا۔ ریشماں نے دانتوں سے اُس کے ہاتھوں کو کاٹ کاٹ کے لہو لہان کر دیا۔ مگر اُس نے چٹیا نہ چھوڑی۔

دونوں اُس جگہ پہنچے جہاں چودھری گلاب اُن کا انتظار کر رہا تھا، اس دوران میں وہ کپڑے پہن چکا تھا۔ اس بلا کی سردی میں ننگے رہنے پر اُس کا جسم اکڑ گیا تھا، مگر اب گاڑھے کی چادر کی گرمائی میں وہ بہت مگن معلوم ہوتا تھا۔

کرم دین نے کہا "بے حیا بھاگنا چاہتی تھی، مگر میں بھی پاتال تک اس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔ کیوں چودھری جی لگاؤں ایک ہاتھ؟"

یہ کہہ کر اُس نے جلدی سے چھوی اُٹھائی۔ چودھری گلاب جواب نہ دینے پایا تھا کہ ایک آواز ٹیلوں میں گونج اُٹھی:-

"او چودھریو۔ ٹھہر جاؤ۔"

یہ مائی جمی تھی۔ جو ان کے پیچھے پیچھے چلتی رہی تھی اور ایک ٹیلے کے کھڈ میں چھپ کے دُور سے سارا تماشا دیکھتی رہی تھی۔

"او بدذات چڑیل تو کہاں سے آگئی!" کرم دین نے غصے میں کہا "یہ سب تیرے ہی کرتوت ہیں۔ آ اِس کے ساتھ تیری زندگی کا بھی قصہ پاک کر دیں!"

ذرا سی دیر میں مائی جمی اُن کے پاس پہنچ گئی۔

"تو مار ڈالو" اُس نے بے خوفی سے اپنا سینہ آگے کرتے ہوئے کہا۔

"مگر یاد رکھو۔ تم بھی پھانسی سے نہیں بچو گے۔ میرے کنبے والے پولس میں فوراً اطلاع کر دیں گے۔ اور سپاہی تمہیں فوراً ہتھ کڑیاں لگا کے لے جائیں گے۔"

"کیا بکتی ہے کُتی" چودھری گلاب نے کہا۔ وہ اب تک اس قصے میں خاموش رہا تھا۔ مگر جُمی کی اس زبان درازی کو برداشت نہ کر سکا۔
کچھ لمحے خاموشی رہی۔ اس کے بعد جُمی نے پھر زبان کھولی۔ مگر اب کے اُس کا لہجہ مصالحت آمیز تھا۔

"سنو!" اُس نے کہا "اگر تمہیں وہ سارا روپیہ مل جائے جو تم نے اس پر خرچ کیا ہے بلکہ اُس سے بھی کچھ زیادہ تو کیا تم اسے مجھے دے دو گے؟"

دونوں شخص کچھ دیر سوچتے رہے۔ اس کے بعد کرم دین نے کہا:-

"اگر میرے چار سو روپے مجھے واپس مل جائیں۔ تو پھر وہ چاہے بھاڑ میں جائے میری بلا سے!"

"تم چار سو چھوڑ پانچ سو لینا۔ اور تم چودھری گلاب کیا کہتے ہو؟"

"اگر کرم دین کو اعتراض نہیں۔ تو مجھے بھی اعتراض نہیں" چودھری نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تمہیں بھی تمہارا سات سو روپیہ مل جائے چودھری گلاب۔ بات یہ ہے کہ یہاں کوئی بیس کوس دور ایک نمبردار رہتا ہے۔ جو رشیماں جیسی لڑکی کے دو ہزار روپے دینے کو تیار ہے۔ تم مجھے صرف ایک دن کی مہلت دو۔ اور رشیماں کو تم اپنے پاس ہی رکھو۔ کل شام کو جب تمہارا روپیہ لوٹا دوں گی۔ تو تم اسے میرے حوالے کر دینا۔"

چودھری گردن جھکائے مائی جُمی کی بات سنتا رہا۔ مگر اُس نے جواب کچھ نہ دیا۔ مائی نے بھی اس کی ضرورت نہ سمجھی۔ وہ اُس کی خاموشی ہی کو کافی سمجھتی تھی۔

اس عرصے میں کرم دین بھی کپڑے پہن چکا تھا۔ اور اب وہ چاروں واپس چل دیئے۔ مرد آگے آگے اور عورتیں پیچھے پیچھے۔ کچھ دیر تک تو وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ اس کے بعد کرم دین نے چودھری گلاب سے کہا:-

"بڑی خشک سردی پڑ رہی ہے اب کے سال۔ ہماری فصلوں کا تو ناس ہی ہو گیا۔ یہاں کیا حال ہے چودھری صاحب؟"

"یہاں بھی بارش کی ایک بُوند نہیں پڑی۔" چودھری گلاب نے جواب دیا۔

"پھر یہ خشک سردی بیماری کا گھر بھی تو ہے خاص کر ڈھور ڈنگر کے لئے۔ میری ایک بھینس پالا کھا کے مر گئی۔"

"اوہو!"

کچھ دیر پھر خاموشی رہی۔

"چاول کا کیا بھاؤ ہے یہاں؟" اچانک کرم دین نے پھر پوچھا۔

"بیگمی سوا دو سیر" چودھری گلاب نے جواب دیا۔

"ہمارے ہاں ڈھائی سیر کا بھاؤ ہے" کرم دین نے کہا۔

رشیماں ایک خواب کے سے عالم میں چلی جا رہی تھی۔ نہ تو اُس کے کان کچھ سُن رہے تھے۔ نہ آنکھیں کچھ دیکھ رہی تھیں اور نہ یہ خبر تھی کہ اُس کے قدم کہاں پڑ رہے ہیں ۞

———

شادی

سعادت حسن منٹو

جمیل کو اپنا شیفر لائف ٹائم قلم مرمت کے لئے دینا تھا۔ اُس نے ٹیلی فون ڈائرکٹری میں شیفر کمپنی کا نمبر تلاش کیا۔ فون کرنے سے معلوم ہوا کہ اُن کے ایجنٹ میسرز ڈی، جے، بسمبوئر ہیں جن کا دفتر گرین ہوٹل کے پاس واقع ہے۔

جمیل نے ٹیکسی لی اور فورٹ کی طرف چل دیا۔ گرین ہوٹل پہنچکر اُسے میسرز ڈی. جے بسمبوئر کا دفتر تلاش کرنے میں دِقّت نہ ہوئی۔ بالکل پاس تھا مگر تیسری منزل پر۔

لفٹ کے ذریعے سے جمیل وہاں پہنچا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی چوبی دیوار کی چھوٹی سی کھڑکی کے پیچھے اُسے ایک خوش شکل اینگلو انڈین لڑکی نظر آئی جس کی چھاتیاں غیر معمولی طور پر نمایاں تھیں۔

جمیل نے قلم اُس کھڑکی کے اندر داخل کر دیا اور مُنہ سے کچھ نہ بولا۔ لڑکی نے قلم اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔ کھول کر ایک نظر دیکھا اور ایک چِٹ پر کچھ لکھ کر جمیل کے حوالے کر دی۔ مُنہ سے وہ بھی کچھ نہ بولی۔

جمیل نے چِٹ دیکھی۔ قلم کی رسید تھی۔ چلنے ہی والا تھا کہ پلٹ کر اُس نے لڑکی سے پوچھا "دس بارہ روز تک تیار ہو جائے گا، میرا خیال ہے؟"

لڑکی بڑے زور سے ہنسی۔ جمیل کچھ کھسیانا سا ہو گیا "میں آپ کی اِس ہنسی کا مطلب نہیں سمجھا؟"

لڑکی نے کھڑکی کے ساتھ مُنہ لگا کر کہا "مسٹر ـــــــ آج کل وار ہے وار ـــــــ یہ قلم امریکہ جائے گا ـــــــ تم نو مہینے کے بعد پتا پاس کرنا"

جمیل بوکھلا گیا "نو مہینے!"

لڑکی نے اپنے بُریدہ بالوں والا سر ہلایا ـــــــ جمیل نے لفٹ کا رُخ کیا۔

یہ نو مہینے کا سلسلہ خوب تھا ـــــــ نو مہینے ـــــــ اتنی مدّت کے بعد تو عورت گُل گوتھنا بچّہ پیدا کر کے ایک طرف رکھ دیتی ہے اور دوسرے کے لئے تیاریاں شروع کر دیتی ہے ـــــــ نو مہینے ـــــــ نو مہینے تک اس چھوٹی سی چِٹ کو سنبھالے رکھو ـــــــ اور یہ بھی کون وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ نو مہینے تک آدمی یاد رکھ سکتا ہے کہ اُس نے ایک قلم مرمت کے لئے دیا تھا ـــــــ ہو سکتا ہے اس دوران میں وہ کم بخت مر کھپ ہی جائے۔

جمیل نے سوچا، یہ سب ڈھکوسلا ہے ـــــــ قلم میں معمولی سی خرابی تھی کہ اُس کا فیڈ ضرورت سے زیادہ روشنائی سپلائی کرتا تھا۔ اس کے لئے اُسے امریکہ کے ہسپتال میں بھیجنا صریحاً چالبازی تھی ـــــــ مگر پھر اُس نے سوچا۔ لعنت بھیجو جی اُس قلم پر ـــــــ امریکہ جائے یا افریقہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس نے یہ بلیک مارکیٹ سے ایک سو پچھتّر روپے میں خریدا تھا ـــــــ مگر اُس نے ایک برس اُسے خوب استعمال بھی تو کیا تھا ـــــــ ہزاروں صفحے کالے کر ڈالے تھے۔ چنانچہ وہ قنوطی سے ایک دم رجائی بن گیا۔ اور رجائی بنتے ہی اُسے خیال آیا کہ وہ فورٹ میں ہے اور فورٹ میں شراب کی بیشمار دکانیں۔

وسکی تو ظاہر ہے، نہیں ملے گی، لیکن فرانس کی بہترین کونک برانڈی تو مل جائے گی، چنانچہ اُس نے قریب والی شراب کی دکان کا رُخ کیا۔
برانڈی کی ایک بوتل خرید کر وہ لوٹ رہا تھا کہ گرین ہوٹل کے پاس آ کے رُک گیا۔ ہوٹل کے نیچے قدِ آدم شیشوں کا بنا ہُوا قالینوں کا شوروم تھا۔

یہ جمیل کے دوست پیر صاحب کا تھا۔

اُس نے سوچا چلو اندر چلیں۔ چنانچہ چند لمحات کے بعد ہی وہ شوروم میں تھا اور اپنے دوست پیر سے جو عمر میں اُس سے کافی بڑا تھا ہنسی مذاق کی گفتگو کر رہا تھا۔

برانڈی کی بوتل باریک کاغذ میں لپٹی دبیز ایرانی قالین پر لیٹی ہوئی تھی۔ پیر صاحب نے اسکی طرف اشارہ کرتے ہوئے جمیل سے کہا "یار، اس دُولہن کا گھونگٹ تو کھولو ——— ذرا اِس سے چھیڑ خانی تو کرو۔"

جمیل مطلب سمجھ گیا۔ "تو پیر صاحب گلاس اور سوڈے منگوایئے ——— پھر دیکھئے کیا رنگ جمتا ہے۔"

فوراً گلاس اور یخ بستہ سوڈے آ گئے۔ پہلا دَور ہُوا۔ دوسرا دَور شروع ہونے ہی والا تھا کہ پیر صاحب کے ایک گجراتی دوست اندر چلے آئے اور بڑی بے تکلفی سے قالین پر بیٹھ گئے۔ اتفاق سے ہوٹل کا چھوکرا دو کے بجائے تین گلاس اُٹھا لایا تھا۔ پیر صاحب کے گجراتی دوست نے بڑی صاف اُردو میں چند اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور گلاس میں یہ بڑا پیگ ڈال کر اُس کو سوڈے سے لبالب بھر دیا۔ تین چار لمبے لمبے گھونٹ لیکر اُنھوں نے رومال سے اپنا منہ صاف کیا "سگریٹ نکالو یار۔"

پیر صاحب میں ساتوں عیب شرعی تھے، مگر وہ سگریٹ نہیں پیتے تھے۔ جمیل نے جیب سے اپنا سگریٹ کیس نکالا اور قالین پر رکھ دیا۔ ساتھ ہی لائٹر۔

اس پر پیر صاحب نے جمیل سے اُس گجراتی کا تعارف کرایا "مسٹر نٹ ورلال ——— آپ موتیوں کی دلالی کرتے ہیں۔"

جمیل نے ایک لحظے کے لئے سوچا، کوئلوں کی دلالی میں تو انسان کا منہ کالا ہوتا ہے ——— موتیوں کی دلالی میں ———

پیر صاحب نے جمیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مسٹر جمیل۔ مشہور سونگ رائٹر۔"

دونوں نے ہاتھ ملایا اور برانڈی کا نیا دَور شروع ہُوا اور ایسا شروع ہُوا کہ بوتل خالی ہو گئی۔

جمیل نے دل میں سوچا یہ کمبخت موتیوں کا دلّال بلا کا پینے والا ہے ——— میری پیاس اور میرے سُرور کی ساری برانڈی چڑھا گیا۔ خدا کرے اِسے موتیا بند ہو۔

مگر جونہی آخری دَور کے پیگ نے جمیل کے پیٹ میں اپنے قدم جمائے، اُس نے نٹورلال کو معاف کر دیا۔ اور آخر میں اُس نے کہا "مسٹر نٹور، اُٹھئے ——— ایک بوتل اور ہو جائے۔"

نٹ ور فوراً اُٹھا۔ اپنے سفید ڈگلے کی شکنیں درُست کیں۔ دھوتی کی لانگ ٹھیک کی اور کہا "چلئے۔"

جمیل، پیر صاحب سے مخاطب ہُوا "ہم ابھی حاضر ہوتے ہیں۔"

جمیل اور نٹور نے باہر نکل کر ٹیکسی لی اور شراب کی دکان پر پہنچے۔ جمیل نے ٹیکسی روکی، مگر نٹور نے کہا "مسٹر جمیل ——— یہ دکان ٹھیک نہیں۔ ساری چیزیں مہنگی بیچتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہُوا "دیکھو۔ کولابہ چلو۔"

کولابہ پہنچ کر نٹور، جمیل کو شراب کی ایک چھوٹی سی دکان میں لے گیا۔ جو برانڈ جمیل نے فورٹ سے لیا، وہ تو مل نہ سکا، ایک دوسرا مل گیا جس کی نٹور نے بہت تعریف کی کہ نمبر وَن چیز ہے۔

یہ ممنوعہ چیز خریدکر دونوں باہر نکلے ——— ساتھ ہی بار تھی۔ نٹور رک گیا "مسٹر جمیل۔ کیا خیال ہے آپ کا۔ ایک دو پیگ یہیں سے پی کر چلتے ہیں"

جمیل کو کوئی اعتراض نہیں تھا اس لئے کہ اُس کا نشہ حالتِ نزع میں تھا۔ چنانچہ دونوں بار کے اندر داخل ہوئے۔ معاً جمیل کو خیال آیا کہ بار والے تو کبھی باہر کی شراب پینے کی اجازت نہیں دیا کرتے "مسٹر نٹور، آپ یہاں کیسے پی سکتے ہیں۔ یہ لوگ اجازت نہیں دیں گے"

نٹور نے زور سے آنکھ ماری "سب چلتا ہے"

اور یہ کہہ کر وہ ایک کیبن کے اندر گھس گیا۔ جمیل بھی اُس کے پیچھے ہو لیا ——— نٹور نے بوتل سنگین تپائی پر رکھی اور بیرے کو آواز دی ——— جب وہ آیا تو اُس کو بھی آنکھ ماری "دیکھو، دو سوڈے روجرز ——— ٹھنڈے ——— اور دو گلاس۔ ایک دم صاف"

بیرا یہ حکم سن کر چلا گیا اور فوراً سوڈے اور گلاس حاضر کر دیئے۔ اس پر نٹور نے اُسے دوسرا حکم دیا "فسٹ کلاس چپس اور ٹومیٹو سوس ——— اور فسٹ کلاس کٹلس!"

بیرا چلا گیا۔ نٹور، جمیل کی طرف دیکھ کر ایسے ہی مسکرایا۔ بوتل کا کارک نکالا، اور جمیل کے گلاس میں اُس سے پوچھے بغیر ایک ڈبل ڈال دیا۔ خود اس سے کچھ زیادہ۔ سوڈا حل ہو گیا تو دونوں نے اپنے گلاس ٹکرائے۔

جمیل پیاسا تھا۔ ایک ہی جرعے میں اُس نے آدھا گلاس ختم کر دیا۔ سوڈا چونکہ بہت ٹھنڈا اور تیز تھا اس لئے پھوں پھوں کرنے لگا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد چپس اور کٹلس آ گئے ——— جمیل صبح گھر سے ناشتہ کر کے نکلا تھا، لیکن برانڈی نے اُسے بھوک لگا دی۔ چپس گرم گرم تھے۔ کٹلس بھی۔ وہ پل پڑا ——— نٹور نے اُس کا ساتھ دیا چنانچہ دو منٹ میں دونوں پلیٹیں صاف۔

دو پلیٹیں اور منگوائی گئیں۔ جمیل نے اپنے لئے چوپس بھی منگوائے۔ دو گھنٹے اِسی طرح گذر گئے۔ بوتل کی تین چوتھائی غائب ہو چکی تھی۔ جمیل نے سوچا کہ اب پیر صاحب کے پاس جانا بیکار ہے۔

نشے خوب جم رہے تھے، سرور خوب گٹھ رہے تھے۔ نٹور اور جمیل دونوں ہوا کے گھوڑوں پر سوار تھے۔ ایسے سواروں کو عام طور پر ایسی وادیوں میں جانے کی بڑی خواہش ہوتی ہے، جہاں انہیں عُریاں بدن حسین عورتیں ملیں۔ وہ اُن کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گھوڑا پہ بٹھا لیں اور یہ جا وہ جا۔

جمیل کا دل و دماغ اُس وقت کسی ایسی ہی وادی کے متعلق سوچ رہا تھا جہاں اُسکی کسی ایسی خوبصورت عورت سے مڈبھیڑ ہو جائے جس کو وہ اپنے تپتے ہوئے سینے کے ساتھ بھینچ لے، اِس زور سے کہ اُسکی ہڈیاں تک چٹخ جائیں۔

جمیل کو اتنا تو معلوم تھا کہ وہ ایسی جگہ پر ہے ——— مطلب ہے ایسے علاقے میں ہے جو اپنے بروتھلز (قحبہ خانے) کی وجہ سے ساری بمبئی میں مشہور ہے۔ جنہیں عیاشی کرنا ہوتی ہے، وہ اِدھر ہی کا رُخ کرتے ہیں۔ شہر سے بھی جس لڑکی کو تنگ چھپ کر پیشہ کرنا ہوتا ہے یہیں آتی ہے۔ اِن معلومات کی بنا پر اُس نے نٹور سے کہا۔

"میں نے کہا ——— وہ ——— وہ ——— میرا مطلب ہے، اِدھر کوئی چھوکری ووکری نہیں ملتی؟"

نٹور نے اپنے گلاس میں ایک بڑا پیگ انڈیلا اور ہنسا "مسٹر جمیل ——— ایک نہیں، ہزاروں ——— ہزاروں ——— ہزاروں ———"

یہ ہزاروں کی گردان جاری رہتی اگر جمیل نے اُسکی بات کاٹی نہ ہوتی "اِن ہزاروں میں سے آج ایک ہی مل جائے تو ہم سمجھیں کہ نٹور بھائی نے کمال کر دیا!"

نٹّور بھائی مزے میں تھے ۔جھوم کر کہا "جمیل بھائی ——— ایک نہیں ہزار دوں ۔ چلیو اس کو ختم کر دو "

دونوں نے بوتل میں جو کچھ بچا تھا آدھے گھنٹے کے اندر اندر ختم کر دیا ۔ بل ادا کرنے اور بیرے کو تگڑی ٹپ دینے کے بعد دونوں باہر نکلے ۔ اندر اندھیرا تھا ۔ باہر دھوپ چمک رہی تھی ۔ جمیل کی آنکھیں چندھیا گئیں ۔ ایک لحظے کے لئے اُسے کچھ نظر نہ آیا ۔ آہستہ آہستہ اُسکی آنکھیں تیز روشنی کی عادی ہوئیں تو اُس نے نٹّور سے کہا "چلیو بھئی "

نٹّور نے تلاشی لینے والی نگاہوں سے جمیل کی طرف دیکھا "مال پانی ہے نا ؟"

جمیل کے ہونٹوں پر نشیلی مُسکراہٹ نمودار ہوئی ۔ نٹّور کی پسلیوں میں کہنی سے ٹھوکا دے کر اُس نے کہا "بہت ۔ نٹّور بھائی ، بہت " اور اُس نے جیب سے پانچ نوٹ سو سو کے نکالے "کیا اتنے کافی نہیں ؟"

نٹّور کی باچھیں کھل گئیں "کافی ؟ ——— بہت زیادہ ہیں ——— چلیو آؤ ، پہلے ایک بوتل لے لیں ۔ وہاں ضرورت پڑیگی "

جمیل نے سوچا ، بات بالکل ٹھیک ہے ۔ وہاں ضرورت نہیں پڑے گی تو کیا کسی مسجد میں پڑیگی ۔ چنانچہ فوراً ایک بوتل خرید لی گئی ۔ ٹیکسی کھڑی تھی ۔ دونوں اُس میں بیٹھ گئے اور اُس وادی کی سیاحی کرنے لگے ۔

سینکڑوں بوتلیں تھے ۔ اِن میں سے بیس پچیس کا جائزہ لیا گیا ، مگر جمیل کو کوئی عورت پسند نہ آئی ۔ سب میک اَپ کی موٹی اور شوخ تہوں کے اندر چھپی ہوئی تھیں ۔ جمیل چاہتا تھا کہ ایسی لڑکی ملے جو مرمت شدہ مکان معلوم نہ ہو جس کو دیکھ کر یہ احساس نہ ہو کہ جگہ جگہ اُکھڑے ہوئے پلستر کے ٹکڑوں پر بڑے اناڑی پن سے سُرخی چونہ لگایا گیا ہے ۔

نٹّور تنگ آگیا ۔ اُس کے سامنے جو بھی عورت آتی تھی ، وہ جمیل کا کندھا پکڑ کر کہتا ہے "جمیل بھائی چلے گی "

مگر جمیل بھائی اُٹھ کھڑا ہوتا "ہاں چلے گی ——— اور ہم بھی چلیں گے !"

دو جگہیں اور دیکھی گئیں مگر جمیل کو مایوسی کا مُنہ دیکھنا پڑا ۔ وہ سوچتا تھا کہ اِن عورتوں کے پاس کون آتا ہے ، جو سُوکھے ہوئے گوشت کے ٹکڑوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں ۔ ان کی ادائیں کتنی مکروہ ہیں ۔ اُٹھنے بیٹھنے کا انداز کتنا فحش ہے اور کہنے کو یہ پرائیویٹ ہیں ، یعنی ایسی عورتیں جو در پردہ پیشہ کراتی ہیں ——— جمیل کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ پردہ ہے کہاں جس کے پیچھے یہ دھندا کرتی ہیں ۔

جمیل سوچ ہی رہا تھا کہ اب پروگرام کیا ہونا چاہیئے کہ نٹّور نے ٹیکسی رُکوائی اور اُتر کر چلا گیا کہ ایک دم اُسے ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا ۔

اب جمیل اکیلا تھا ۔ ٹیکسی تیس میل فی گھنٹہ کے حساب سے چل رہی تھی ——— اُس وقت ساڑھے چار بج چکے تھے ——— اُس نے ڈرائیور سے پُوچھا "یہاں کوئی بھڑوا ملے گا "

ڈرائیور نے جواب دیا "ملے گا جناب "

"تو چلیو اُس کے پاس "

ڈرائیور نے دو تین موڑ گھومے اور ایک پہاڑی بنگلہ نما بلڈنگ کے پاس گاڑی کھڑی کر دی ۔ دو تین مرتبہ ہارن بجایا ۔

جمیل کا سر نشے کے باعث سخت بوجھل ہو رہا تھا ۔ آنکھوں کے سامنے دُھندسی چھائی ہوئی تھی ——— اُسے معلوم نہیں کیسے اور کس طرح ، مگر جب اُس نے ذرا دماغ کو جھٹکا تو اُس نے دیکھا کہ وہ ایک پلنگ پر بیٹھا ہے ۔ اُس کے پاس ہی ایک جوان لڑکی جس کی ناک

کی پھننگ پر ایک چھوٹی سی پھنسی تھی اپنے بُریدہ بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔

جمیل نے اُس کو غور سے دیکھا۔ سوچنے ہی والا تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا مگر اُس کے شعور نے اُس کو مشورہ دیا کہ دیکھو یہ سب عبث ہے۔ جمیل نے سوچا، یہ ٹھیک ہے۔ لیکن پھر بھی اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر نوٹ گن کر اور پاس پڑی ہوئی تپائی پہ برانڈی کی سالم بوتل دیکھ کر اپنی تشفی کر لی کہ سب خیریت ہے۔ اُس کا نشہ کسی قدر نیچے اُتر گیا۔

اُٹھ کر وہ اُس گیسو بُریدہ لڑکی کے پاس گیا اور، اور تو کچھ سمجھ میں نہ آیا مسکرا کر اُس سے کہا "کہئے مزاج کیسا ہے؟"

اُس لڑکی نے کنگھی میز پر رکھی اور کہا "کہئے، آپ کا کیسا ہے؟"

"ٹھیک ہوں" یہ کہہ کر اُس نے اُس لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالا "آپ کا نام؟"

"بتا تو چکی ایک دفعہ ——— آپ کو میرا خیال ہے یہ بھی یاد نہ رہا ہوگا کہ آپ ٹیکسی میں یہاں آئے ——— جانے کہاں کہاں گھومتے رہے ہوں گے کہ بل اڑتیس روپے بنا، جو آپ نے ادا کیا اور ایک شخص جس کا نام شاید نٹور تھا، آپ نے اس کو بیشمار گالیاں دیں"

جمیل اپنے اندر ڈوب کر سارے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے ہی والا تھا کہ اُس نے سوچا کہ فی الحال اسکی ضرورت نہیں۔ "میں بھول جایا کرتا ہوں ——— یا یوں سمجھیئے کہ مجھے بار بار پوچھنے میں مزا آتا ہے ——— وہ صرف اتنا یاد کر سکا کہ اُس نے ٹیکسی والے کا بل جو کہ اڑتیس روپے بنتا تھا ادا کیا تھا۔

لڑکی پلنگ پر بیٹھ گئی "میرا نام تارہ ہے"

جمیل نے اُس کو لٹا دیا اور اُس سے مصنوعی قسم کا پیار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کو پیاس محسوس ہوئی تو اُس نے تارہ سے کہا "دو یخ بستہ سوڈے اور گلاس۔"

تارہ نے یہ دونوں چیزیں فوراً حاضر کر دیں۔ جمیل نے بوتل کھولی، اپنے لئے ایک پیگ ڈال کر اُس نے دوسرا تارہ کے لئے ڈالا ——— پھر دونوں پینے لگے۔

تین پیگ پینے کے بعد جمیل نے محسوس کیا کہ اُس کی حالت بہتر ہو گئی ہے۔ تارہ کو چومنے چاٹنے کے بعد اُس نے سوچا کہ اب قصہ مختصر ہو جانا چاہیئے "کپڑے اُتار دو"

"سارے؟"

"ہاں سارے"

تارہ نے کپڑے اُتار دیئے اور لیٹ گئی۔ جمیل نے اُس کے ننگے جسم کو ایک نظر دیکھا اور یہ رائے قائم کی کہ اچھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی خیالات کا ایک تانتا بندھ گیا۔ جمیل کا نکاح ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنی بیوی کو دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔

اُس کا بدن کیسا ہوگا ——— کیا وہ تارہ کی طرح اُس کے ایک مرتبہ کہنے پر اپنے سارے کپڑے اُتار کر اُس کے ساتھ لیٹ جائیگی؟

کیا وہ اُس کے ساتھ برانڈی پیئے گی؟

کیا اُس کے بال کٹے ہوئے ہیں؟

پھر فوراً اُس کا ضمیر جاگا جس نے اُس کو لعنت ملامت شروع کر دی۔ نکاح کا یہ مطلب تھا کہ اُسکی شادی ہو چکی تھی۔ صرف ایک مرحلہ باقی

تھا کہ وہ اپنی سسرال جائے اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر لے آئے ——— کیا اُس کے لئے یہ واجب تھا کہ ایک بازاری عورت کو اپنے آغوش کی زینت بنائے ——— ٹُم کے ٹُم لنڈھاتا پھرے۔

جمیل بہت خفیف ہوا اور اِسی خفّت میں اُس کی آنکھیں مُندنا شروع ہوئیں اور وہ سو گیا۔ تارہ بھی تھوڑی دیر کے بعد خوابِ غفلت کے مزے لینے لگی۔

جمیل نے کئی بے ربط، اوٹ پٹانگ خواب دیکھے ——— کوئی دو گھنٹے کے بعد جب کہ ایک بہت ہی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا وہ ہڑبڑا کے اُٹھا۔ جب اچھی طرح آنکھیں کھُلیں تو اُس نے دیکھا کہ وہ ایک اجنبی کمرے میں ہے اور اُس کے سامنے ایک الف ننگی لڑکی لیٹی ہے۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد واقعات آہستہ آہستہ اُس کے دماغ کی دھُند چیر کر نمودار ہونے لگے۔

وہ خود بھی الف ننگا تھا۔ بوکھلاہٹ میں اُس نے اُلٹا پائجامہ پہن لیا، مگر اُس کو اس کا احساس نہ ہُوا۔ کُرتہ پہن کر اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ نوٹ سب کے سب موجود تھے۔ اُس نے سوڈا کھولا اور ایک پیگ بنا کر پیا۔ پھر اُس نے تارہ کو ہولے سے جھنجھوڑا "اُٹھو"

تارہ آنکھیں ملتی اُٹھی۔ جمیل نے اُس سے کہا "کپڑے پہن لو"

تارہ نے کپڑے پہن لئے ——— باہر گہری شام رات بننے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ جمیل نے سوچا، اب کوچ کرنا چاہیئے لیکن وہ تارہ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا، کیونکہ بہت سی باتیں اُس کے ذہن سے نکل گئی تھیں "کیوں تارہ، جب ہم لیٹے ——— میرا مطلب ہے، جب میں نے تم سے کپڑے اُتارنے کو کہا تو اُس کے بعد کیا ہُوا؟"

تارہ نے جواب دیا "کچھ نہیں ——— آپ نے اپنے کپڑے اُتارے اور میرے بازو پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے سو گئے"

"بس؟"

"ہاں ——— لیکن سونے سے پہلے آپ دو تین مرتبہ بڑبڑائے اور کہا، میں گناہ گار ہوں ——— میں گناہ گار ہوں" یہ کہہ کر تارہ اُٹھی اور اپنے بال سنوارنے لگی۔

جمیل بھی اُٹھا۔ گناہ کا احساس دبانے کے لئے اُس نے ڈبل پیگ اپنے حلق میں جلدی جلدی انڈیلا۔ بوتل کو کاغذ میں لپیٹا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

تارہ نے پوچھا "چلے؟"

"ہاں، پھر کبھی آؤں گا" یہ کہہ کر وہ لوہے کی سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔ بڑے بازار کی طرف اُس کے کمزور قدم اُٹھنے ہی والے تھے کہ ہارن بجا۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا تو ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ اُس نے کہا، چلو اچھا ہُوا۔ یہیں مل گئی۔ پیدل چلنے کی زحمت سے بچ گئے۔

اُس نے ڈرائیور سے پوچھا "کیوں بھائی خالی ہے؟"

ڈرائیور نے جواب دیا "خالی ہے کا کیا مطلب ——— لگی ہوئی ہے"

"تو پھر ...." یہ کہہ کر جمیل مُڑا، لیکن ڈرائیور نے اُس کو پکارا "کدھر جاتا ہے سیٹھ"

جمیل نے جواب دیا "کوئی اور ٹیکسی دیکھتا ہوں"

ڈرائیور باہر نکل آیا "مستک تو نہیں پھرے لا ——— یہ ٹیکسی تمہیں نے تو لے رکھی ہے"

جمیل بوکھلا گیا "میں نے ؟"

ڈرائیور نے بڑے گنوار لہجے میں اُس سے کہا "ہاں تو نے ——— سالا دارو پی کر سب کچھ بھول گیا۔"

اِس پر تُو تُو مَیں مَیں شروع ہوئی۔ اِدھر اُدھر سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ جمیل نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا "چلو"

ڈرائیور نے ٹیکسی چلائی "کدھر"

جمیل نے کہا "پولیس اسٹیشن!"

ڈرائیور نے اِس پر جانے کیا واہی تباہی بکی ——— جمیل سوچ میں پڑ گیا۔ جو ٹیکسی اُس نے لی تھی، اُس کا بل جو کہ اڑتیس روپے کا تھا اُس نے ادا کر دیا تھا۔ اب یہ نئی ٹیکسی کہاں سے آن ٹپکی۔ گو وہ نشے کی حالت میں تھا مگر وہ یقینی طور پر کہہ سکتا تھا کہ یہ وہ ٹیکسی نہیں تھی اور نہ یہ ڈرائیور وہ ڈرائیور جو اُسے یہاں لایا تھا۔ اور تھا

پولیس اسٹیشن پہنچے۔ جمیل کے قدم بہت بُری طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ سب انسپکٹر جو کہ اُس وقت ڈیوٹی پر تھا فوراً بھانپ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ اُس نے جمیل کو کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ ڈرائیور نے اپنی داستان شروع کر دی جو سر تا پا غلط تھی۔ جمیل یقیناً اُس کی تردید کرتا مگر اُس میں زیادہ بولنے کی ہمّت نہیں تھی۔ سب انسپکٹر سے مخاطب ہو کر اُس نے کہا "جناب، میری سمجھ میں نہیں آتا، یہ کیا قصہ ہے۔ جو ٹیکسی میں نے لی تھی، اُس کا کرایہ میں نے اڑتیس روپے ادا کر دیا تھا۔ اب معلوم نہیں یہ کون ہے اور مجھ سے کیسا کرایہ مانگتا ہے۔"

ڈرائیور نے کہا "حضور انسپکٹر بہادر۔ یہ دارو پئے ہوئے ——— " اور ثبوت کے طور پر اُس نے جمیل کی برانڈی کی بوتل میز پر رکھ دی۔

جمیل جھنجلا گیا "ارے بھئی کون سؤر کہتا ہے کہ اُس نے نہیں پی ——— سوال تو یہ ہے کہ آپ کہاں سے تشریف لے آئے۔"

سب انسپکٹر شریف آدمی تھا۔ کرایہ بوگس ڈرائیور کے حساب سے بیالیس روپے بنتا تھا۔ اُس نے پندرہ روپے میں فیصلہ کر دیا۔ ڈرائیور بہت چیخا چلایا مگر سب انسپکٹر نے اُس کو ڈانٹ ڈپٹ کر تھانے سے نکلوا دیا۔ پھر اُس نے ایک سپاہی سے کہا کہ وہ دوسری ٹیکسی بلائے۔ ٹیکسی آئی تو اُس نے ایک سپاہی جمیل کے ساتھ کر دیا کہ وہ اُسے گھر چھوڑ آئے۔ جمیل نے لکنت بھرے لہجے میں اُس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور پوچھا "جناب کیا یہ گرانٹ روڈ پولیس اسٹیشن ہے؟"

سب انسپکٹر نے زور کا قہقہہ لگایا اور پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "مسٹر، اب ثابت ہو گیا کہ تم نے خوب پی رکھی ہے ——— یہ کولابہ پولیس اسٹیشن ہے ——— جاؤ اب گھر جا کے سو جاؤ۔"

جمیل گھر جا کے کھانا کھائے اور کپڑے اُتارے بغیر سو گیا ——— برانڈی کی بوتل بھی اُس کے ساتھ سوئی رہی۔

دوسرے روز وہ دس بجے کے قریب اُٹھا۔ جوڑ جوڑ میں درد تھا۔ سر میں جیسے بڑے بڑے وزنی پتھر تھے۔ مُنہ کا ذائقہ خراب۔ اُس نے اُٹھ کر دو تین گلاس فروٹ سالٹ کے پئے اور چار پانچ پیالے چائے کے۔ کہیں شام کو جا کر طبیعت کسی قدر بحال ہوئی اور اُس نے خود کو گذشتہ واقعات کے متعلق سوچنے کے قابل محسوس کیا۔

بہت لمبی زنجیر تھی۔ اِن میں سے بعض کڑیاں تو سلامت تھیں مگر بعض غائب۔ واقعات کا تسلسل شروع سے لیکر گرین ہوٹل اور وہاں سے کولابہ تک بالکل صاف تھا۔ اِس کے بعد جب نٹور کے ساتھ خاص وادی کی سیاحی شروع ہوئی تھی معاملہ گڈمڈ ہو جاتا تھا۔ چند جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں، بڑی واضح مگر فوراً مبہم پرچھائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

وُہ کیسے اُس لڑکی کے گھر پہنچا ——— اُس کا نام جمیل کے حافظے سے پھسل کر جانے کس کھڈ میں جا گِرا تھا۔ اُس کی شکل و صورت اُسے البتہ بڑی اچھی طرح یاد تھی۔

وہ اُس کے گھر کیسے پہنچا تھا؟ ——— یہ جاننا بہت اہم تھا۔ اگر جمیل کا حافظہ اُسکی مدد کرتا تو بہت سی چیزیں صاف ہو جاتیں۔ مگر بعد کوشش وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

اور یہ ٹیکسیوں کا کیا سلسلہ تھا۔ اُس نے پہلی کو تو چھوڑ دیا تھا، مگر دوسری کہاں سے ٹپک پڑی تھی؟

سوچ سوچ کے جمیل کا دماغ پاش پاش ہو گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ جتنے وزنی پتھر اُس میں پڑے تھے، سب آپس میں ٹکرا ٹکرا کے چُور چُور ہو گئے ہیں۔

رات کو اُس نے برانڈی کے تین پیگ پیئے، تھوڑا سا ہلکا کھانا کھایا اور گذشتہ واقعات کے متعلق سوچتا سوچتا سو گیا۔

وُہ ٹکڑے جو گُم ہو گئے تھے، اُن کو تلاش کرنا اب جمیل کا شغل ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ اُس روز ہُوا من و عن اُسکی آنکھوں کے سامنے آجائے اور یہ روز روز کی مغز پاشی دُور ہو ——— اس کے علاوہ اُس کو اس بات کا بھی بڑا قلق تھا کہ اُس کا گناہ نامکمّل رہ گیا۔ وہ سوچتا تھا یہ ادھورا گناہ جانے کس کھاتے میں۔ وہ چاہتا تھا کہ بس ایک دفعہ اسکی بھی تکمیل ہو جائے۔

مگر تلاش بسیار کے باوجود وہ پہاڑی بنگلوں جیسا مکان جمیل کی آنکھوں سے اوجھل رہا۔ جب وہ تھک ہار گیا تو اُس نے ایک دن سوچا، کیا یہ سب خواب ہی تو نہیں تھا؟"

مگر خواب کیسے ہو سکتا تھا۔ خواب میں آدمی اتنے روپے تو خرچ نہیں کرتا ——— اُس روز اُس کے کم از کم ڈھائی سو روپے خرچ ہوئے تھے۔

پیر صاحب سے اُس نے نوکر کے متعلق پوچھا تو اُنہوں نے بتایا کہ وہ اُس روز کے بعد دوسرے دن ہی سمندر پار کہیں چلا گیا ہے، غالباً موتیوں کے سلسلے میں۔ جمیل نے اُس پر ہزار لعنتیں بھیجیں اور اپنی تلاش شروع کر دی۔

اُس نے جب اپنے حافظے پر بہت زور دیا تو اُسے بنگلے کی دیوار کے ساتھ پیتل کی ایک پلیٹ نظر آئی ——— اس پر کچھ لکھا تھا ——— غالباً ——— ڈاکٹر ——— ڈاکٹر بیرام جی ——— آگے جانے کیا۔

ایک دن کولابہ کی گلیوں میں پیدل چلتے چلتے آخر وہ ایک ایسی گلی میں پہنچا جو اُس کو جانی پہچانی معلوم ہوئی ——— دو رویہ اُس قسم کی بنگلہ نما عمارتیں تھیں۔ ہر عمارت کے باہر چھوٹے چھوٹے پیتل کے بورڈ لگے تھے۔ کسی پر چار، کسی پر پانچ، کسی پر تین۔

وہ اِدھر اُدھر غور سے دیکھتا چلا جا رہا تھا، مگر اُس کے دماغ میں وہ خط گھوم رہا تھا جو صبح اُس کی ساس کی طرف سے وصول ہُوا تھا کہ اب انتظار کی حد ہو گئی ہے، میں نے تاریخ مقرر کر دی ہے، آؤ اور اپنی دُولہن کو لے جاؤ۔

اور اِدھر ایک نامکمّل گناہ کو مکمّل بنانے کی کوشش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ جمیل نے کہا، ہٹاؤ جی اِس وقت ——— پھر نے دو مارا مارا ——— ایکدم اُس نے اپنے دائیں ہاتھ پیتل کا ایک چھوٹا سا بورڈ دیکھا ——— اس پر لکھا تھا ——— ڈاکٹر ایم بیرام جی۔ ایم ڈی۔

جمیل کانپنے لگا۔ یہ وہی بلڈنگ ——— بالکل وہی ——— وہی رنگ۔ وہی بل کھاتی ہوئی آہنی سیڑھیاں۔ جمیل بے دھڑک اُوپر چلا گیا۔ اُس کے لئے اب ہر چیز جانی پہچانی تھی۔ کوری ڈور سے نکل کر اُس نے سامنے والے دروازے پر دستک دی۔

ایک لڑکے نے دروازہ کھولا ——— اُسی لڑکے نے جو اُس روز سوڈا اور برف لایا تھا۔ جمیل نے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے اُس سے پوچھا "بیٹا، بائی جی ہیں؟"

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا "جی ہاں"۔

"جاؤ، اُن سے کہو، صاحب ملنے آئے ہیں" جمیل کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔

لڑکا دروازہ بھیڑ کر اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھُلا اور تارہ نمودار ہوئی۔ اُس کو دیکھتے ہی جمیل نے پہچان لیا کہ وہی لڑکی ہے، مگر اب اُس کی ناک پر پھنسی نہیں تھی۔ "نمستے"۔

"نمستے ——— کہیئے مزاج کیسے ہیں" یہ کہہ کر اُس نے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

جمیل نے جواب دیا "اچھے ہیں ——— میں پچھلے دنوں بہت مصروف رہا، اِس لئے آنہ سکا ——— کہو، پھر کیا ارادہ ہے؟"

تارہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا "معاف کیجئے، میری شادی ہو چکی ہے"۔

جمیل بوکھلا گیا "شادی؟ ——— کب؟"

تارہ نے اُسی سنجیدگی سے جواب دیا "جی، آج صبح ——— آئیے میں آپ کو اپنے پتی سے ملاؤں"۔

جمیل چکرا گیا اور کچھ کہے سُنے بغیر کھٹا کھٹ نیچے اُتر گیا ——— سامنے ٹیکسی کھڑی تھی ——— جمیل کا دل ایک لمحے کے لئے ساکت سا ہو گیا۔ تیز قدم اُٹھاتا وہ بڑے بازار کی طرف نکل گیا۔

معاً جمیل کو جاتے دیکھ کر ڈرائیور نے زور سے کہا "سیٹھ صاحب ٹیکسی؟"

جمیل نے جھنجلا کر کہا ——— نہیں کمبخت شادی!

کالی تِتّری

کالی تِتّری کِچری وِچ بولے
تے اُڈدی نوں باج پے گیا

بَلونت سِنگھ

بڑے مزے میں مولا نے چلم میں تمباکو اور اس کے اوپر سلگتے ہوئے اُپلے کے دو ٹکڑے جما دیئے اور پھر مارے سردی کے دانت کٹکٹاتا ہوا چارپائی پہ چڑھ، ٹانگوں پر دُھسّہ ڈال مگن ہو گیا۔

روٹی کھانے کے بعد اسے حقّے کی سخت طلب ہوتی تھی۔ چنانچہ اس نے آنکھیں موند کر دو چار کش ہی لئے ہوں گے کہ دروازے پر دستک کی آواز سُنائی دی۔ یہ دستک اسے بڑی ناگوار گزری۔ اس نے کرخت لہجہ میں پوچھا :-

" کون ہے ؟"

جواب میں پھر کھٹ کھٹ کی آواز سُنائی دی ۔

پیرد الھٹّھا ـــــ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ عین اس کے سِرے پر مولا کا کچّا مکان تھا۔ جہاں وہ اپنی بوڑھی ماں اور ایک بیوہ بہن سمیت رہتا تھا۔ گاؤں میں گھُسنے وقت چونکہ اس کا مکان سامنے پڑتا تھا۔ اِس لئے راہ گیر اُسی سے کسی کے مکان کا پتہ یا کسی اگلے گاؤں کا راستہ دریافت کرنے کے لئے دروازہ آن کھٹکھٹاتے تھے۔ لیکن اس وقت آدھی رات ہونے کو تھی اور پھر سردیوں کے موسم میں تو سرِ شام ہی گاؤں پر خاموشی کا تسلّط ہو جاتا تھا۔ نہ جانے بے وقت کون آن دھمکا تھا۔ جب مولا کو یقین ہو گیا کہ اسے اُٹھنا پڑے گا تو اس نے حُقّے کی نے ایک جانب کو ہٹائی اور دُھسّے کو سنبھالتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازہ کھولا تو دیکھا کہ باہر تاریکی میں میانے قد کا ایک سِکّھ کھڑا ہے۔ پگڑی اس کے سر پر موٹے رسّے کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ اور اس کے ایک سِرے سے اس نے اپنے چہرے کا، آنکھوں کے سوا، نچلا حصّہ چھپا رکھا تھا۔ اس کا رنگ سیاہی مائل گندمی تھا۔ بھنویں موٹی گھنی اور لمبی تھیں آنکھیں تیز اور متجسّس۔ اسکی ناک کی جڑ کے قریب آنکھوں کے نیچے باریک اور گہری لکیروں کا جال سا بُنا ہوا تھا۔ . . . . .

مولا بدکلامی کرتے کرتے رُک گیا۔ اس نے بھاری اور خشک لہجے میں پوچھا :-

" تم کون ہو ؟"

نوٹ :- اس کہانی کا پس منظر وہ سنہرا اسلامی پنجاب ہے جس میں ہندو، مسلم اور سکھ ڈاکو مِل جُل کر اپنے بھائی بندوں کے مکانوں میں نقب لگایا کرتے تھے۔

اجنبی نے لمحہ بھر اس کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر غف سے بولا :-

"میں بھنبوڑی گاؤں سے آ رہا ہوں۔"

"بھنبوڑی ؟ وہ تو یہاں سے بیس کوس کی دوری پہ ہے لیکن تم یوں بات کرتے ہو جیسے پڑوس کے گاؤں سے آ رہے ہو......"

اجنبی نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا :-

"میں ڈاچی پہ آیا ہوں۔"

مولا کو اس کے بولنے کا ڈھنگ پسند نہیں آیا۔ اس نے بے پرواہی سے کہا "خیر مجھے اس سے کیا غرض ؟ سوال تو یہ ہے کہ تم میرے پاس کیوں آئے ہو ؟"

"مجھے بگّا سنگھ بھنبوڑی والے نے بھیجا ہے۔"

یہ سُنکر مولا چوکنّا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نووارد کا بازو تھام لیا اور جلدی سے دھیمی آواز میں بولا۔

"...... تو یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اندر چلے آؤ نا ؟"

اجنبی یک جست اندر آ گیا وہ بڑا مضبوط شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بدن پر موٹا کھیس لپیٹ رکھا تھا۔

مولا نے ڈیوڑھی میں سے جھانک کر اندر کی جانب دیکھا اور اس امر کا اطمینان کر لیا کہ اس کی بہن اور ماں سب سے پیچھے والے کمرے میں لحافوں میں گھسی پڑی ہیں تو اس نے صحن والا دروازہ بند کر لیا۔ اور اجنبی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"میں نے دروازہ بند کر دیا ہے تاکہ ہماری باتوں کی آوازیں اندر تک نہ پہنچیں۔"

اجنبی کچھ نہیں بولا۔ مولا نے تیزی سے باہر والے دروازے میں سے جھانک کر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ پھیکی چاندنی میں دُور جوہڑ کا پانی پگھلے ہوئے سیسے کی ٹکلی کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔ ہوا ساکن تھی۔ پیڑ اور دُور دُور تک پھیلی ہوئی جھاڑیاں بے حس و حرکت کھڑی تھیں۔ یہ دیکھ کر مولا نے اپنے دانتوں میں اٹکی ہوئی حُقّے کی نَے کو ہونٹوں میں دبوچ کر بڑے اطمینان سے گُڑگُڑ کی صدا بلند کی اور پھر دروازہ بند کر کے لوٹا تو وارد ڈیوڑھی کے اندر بنی ہوئی کھُرلی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

"بھوک لگی ہو تو بتاؤ کھانے والے کا کچھ بندوبست کروں۔"

"نہیں میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔ قریب کے گاؤں سے...... بس اب کام ہو جانا چاہیئے۔"

"کیوں اِتنی جلدی بھی کیا ہے ؟"

"مجھے پھَورن لوٹنا ہوگا۔"

"کیوں ؟"

"بگّے نے یہی کہا تھا۔ میرا یہاں رہنا مناسب نہیں کسی نے دیکھ لیا تو سک ہوگا۔ کھاہ مکھاہ۔"

"ڈاچی کہاں ہے ؟"

"ڈاچی ساتھ والے گاؤں میں اپنے ایک دوست کے ہاں چھوڑ آیا ہوں۔"

"اور بندوکھ ؟ (بندوق)"

" بندوق میرے پاس ہے "

مولا کو تعجب ہوا کہ اتنی بڑی بندوق اس نے کہاں چھپا رکھی ہے۔

اس پر اجنبی نے فتوئیے جھنجلا کر کمبلی کے نیچے سے دونالی بندوق دکھائی جس کی دونوں نالیاں الگ کر کے اس نے بٹ BUTT سمیت انگوچھے میں لپیٹ رکھی تھیں اور پھر ان پر ایک رسّی کس کر باندھ دی تھی۔

اب مولا سمجھا سر ہلا کر بولا:۔

" اچھا تو کمر کو باندھ رکھی ہے "

" ہاں ویسے چھپ تو نہیں سکتی نا "

" ٹھیک "

" اب جلدی کرو "

" اور کارتوس ؟"

اجنبی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ بگڑ کر کہنے لگا۔

" دیکھو میں بل کل تیار ہو کر آیا ہوں ...... بس اب مجھے موُ کے پرے چلو "

" اچھی بات " یہ کہہ کر مولا نے حقے کے دو تین خوب گہرے گہرے کش لئے پھر دھسّے کو بدن پر خوب اچھی طرح لپیٹا اور مسکرا کر بولا۔

" استاد تمہیں میرے گھر کا پتہ کیسے چلا؟ کسی سے پوچھا تھا ؟"

" میں ایسا کچّا نہیں ہوں کہ کسی سے تمہارے گھر کا پتہ پوچھتا پھروں۔ اس طرح تو تم پر شبہ کیا جا سکتا تھا۔ بگّے نے مکان کا ٹھیک ٹھیک پتہ اور تمہارا حلیہ بتا دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ وہ تمہاری راہ دیکھتا ہوگا "

" ہاں ہاں کیوں نہیں " مولا ہنس کر بولا " بگّو اس کام کو کسی معمولی آدمی کے سپرد نہیں کر سکتا تھا ——— اچھا تو میں چلا ——— ابھی دو تین اور آدمیوں کو بھی بلانا ہے "

" بلاؤ ...... پر میں ان کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا "

" بے شک بے شک ضرورت بھی کیا ہے "

یہ کہہ کر مولا چلنے لگا تو اجنبی بولا " حقّا لیتے جاؤ "

" کیوں ؟"

" حقّا گڑگڑاتے چلو گے تو شک نہیں ہوگا دیکھنے والوں کو "

" یہ تو واقعی کھری بات کہی تم نے "

مولا نے حقّہ اٹھایا، نئے دانتوں میں دبائی اور چلم سے بندھی ہوئی چمٹی جھلاتا اور تہبند لہراتا ڈیوڑھی سے باہر نکل گیا۔

اجنبی نے اس کے رخصت ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا اور سرکنڈوں کا بنا ہوا بالشت بھر اونچا مونڈھا گھسیٹ کر سلگتے ہوئے اپلوں سے بھری ہوئی مٹی کی انگیٹھی دونوں ٹانگوں کے درمیان رکھ کر بیٹھ گیا۔

مولا، کینچوؤں کی طرح بل کھاتی ہوئی سنسان اور تنگ گلیوں میں سے گزرتا ہؤا بالآخر ایک بوسیدہ کچے مکان کے آگے کھڑا ہو کر آوازیں دینے لگا :۔ "سداگرا، اوئے سداگرا!"

کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے پھر ہانک لگائی۔

"اوئے سداگرا! سداگرا ہوئے!"

پھر وہ اطمینان سے حقّہ گڑگڑانے لگا۔ دماغ میں جو طراوت پہنچی تو دل اجنبی کو دعائیں دینے لگا جس نے کہ حقّہ اس کے ہمراہ بھجوا دیا تھا۔

مکان کا دروازہ کھلا اندر سے گھنے اور کالے بالوں والا ایک نوجوان باہر نکلا اس نے پہلے تو مولا کی جانب خوابناک آنکھوں سے دیکھا لیکن جب پہچانا تو اسکی آنکھیں پورے طور سے کھل گئیں۔

مولا نے زرد زرد دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا "واجیں دے دے کر میرا تو گلہ بھی بیٹھ گیا کہاں گھسا پڑا تھا لاں کے موڑے"!

اس پر دونوں ہنسنے لگے۔

سداگر نے پوچھا "ہاں بے بتا"

جواب میں مولا چپ چاپ حقّہ گڑگڑاتا رہا۔ پھر اس نے شرارت اور پُرمعنی انداز سے ابروؤں اوپر اٹھا کر ایک آنکھ اس طرح ماری جیسے ڈھیلا کھینچ کر مار دیا ہو۔

سداگر سمجھ گیا۔

"چلو" مولا نے کہا۔

"ٹھہرو، میں اوڑھنے کے لئے تو کچھ لے آؤں اندر سے"!

وہ بھاگا بھاگا اندر گیا اور کالے رنگ کی ایک لوئی بدن پر لپیٹتا ہؤا فوراً واپس آ گیا۔

دونوں وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ گاؤں پر ہُو کا عالم طاری تھا۔ کہیں کہیں کوئی کھجلی ماری کتیا دانت دکھاتی ہوئی دکان کے ایک تختے سے نکل کر دوسرے تختے تلے دبک جاتی۔ یا گارے کے بنے ہوئے مکانوں کی دیواروں تلے چھچھوندریں جان چھپاتی پھرتی تھیں۔

دبے دبے لہجے میں باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے میلا سنگھ کو اس کے مکان سے اور لبھو کو مویشیوں کے طویلے سے بلا کر اپنے ہمراہ لیا اور واپس مولا کے مکان پر پہنچ گئے۔

اندر سے اجنبی نے دروازہ کھولا۔ اس کا چہرہ اب پگڑی کے شملے میں چھپا ہؤا تھا۔ سداگر، لبھو اور میلا سنگھ ابھی نوجوان تھے ان کاموں میں نئے نئے داخل ہوئے تھے۔ اجنبی کا نقاب کے پیچھے چھپا ہؤا چہرہ اور جن کے مانند گھنی بھنوؤں تلے اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ان کے نوخیز جسموں میں سنسنی کی لہریں دوڑ گئیں۔

اجنبی نے جلدی سے ان کی صورتوں کا جائزہ لیا۔ پھر اس نے کھیس میں سے ہاتھ نکال کر اشارہ کیا۔ کہ اب دیر کس بات کی ہے۔

اس کا ہاتھ بھی کالا تھا اس پر موٹے موٹے بال اُگے ہوئے تھے۔

مولا نے جواب دیا :۔

"دیر کسی بھی بات کی نہیں"!

" تو اب چلیں ؟"

" ضرور "

مولا نے آگے قدم بڑھایا اور باقی سب اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے ۔ اجنبی کے قدم بڑی پھرتی سے اُٹھ رہے تھے اور اسکی پتلیاں دم بھر کو بھی ایک جگہ نہیں رکتی تھیں ۔ تسبیح کے دانوں کی طرح کھٹا کھٹ گھومتی تھیں ۔

دور سے کبھی کبھار پہرے دار کے دفعتہً چلا اٹھنے کی آواز یوں سنائی دے جاتی جیسے وہ کوئی خوفناک خواب دیکھ کر ہڑبڑا اٹھا ہو ۔ اس آواز اور اپنے درمیان کافی فاصلہ رکھتے ہوئے وہ بڑی تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے تھے ۔

گاؤں سے نکل کر تقریباً پون میل کی دوری پر واقع پیراں والے رہٹ پر پہنچ کر وہ رک گئے ۔ مولا کے اشارے پر تسا اگر رہٹ کے قریب والے باڑے میں گھس کر ایک مریل بیل کو باہر نکالا اور پھر وہ اسے ہانکتے ہوئے ذرا پرے لے گئے اور گاؤں کے ایک بڑے سود خور کے کھیت میں اسے چھوڑ دیا ۔ اور وہ خود ببول کے پیڑ کی چھدری چھاؤں تلے جا کھڑے ہوئے ۔

پورا چاند آسمان پر چمک رہا تھا ۔

اجنبی سکھ نے پھرتی سے اپنی بغل میں سے بندوق کا انجر پنجر نکالا ۔ نالیوں کو بٹ سے کٹ کیا اور نیچے کی جانب چوبی کچھی جمائی اور ہتھیلی کی ایک ہی ضرب سے اسے اپنی جگہ پر بٹھا دیا ۔

پھر اس نے دونوں نالیوں میں ٹھوس گولیوں BULLETS والے کارتوس بھرے ۔ اور ایک نظر مریل بیل کی جانب دیکھا جو سر جھکائے کان پھڑ پھڑاتا اور پتلی اور کمزور دم کو نقاہت سے ہلاتا گھاس پر منہ مار رہا تھا ۔ پھر اس نے شست باندھ کر لبلبی دبائی ۔ گولی کھاتے ہی بیل بغیر کسی جدوجہد کے زمین پر ڈھیر ہو گیا ۔ یہ گولی تو شیر کو ٹھنڈا کر دینے کے لئے کافی تھی لیکن اجنبی نے احتیاط کے طور پر دوسری گولی بھی اسکی گردن پر چپکا دی ۔

بیل کا کام تمام ہوتے ہی اجنبی نے اپنی اور بھی تیزی سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے مولا اور اس کے ساتھیوں کی جانب دیکھا پھر بھاری آواز میں بولا ۔

" اچھا اب مجھے چلنا چاہیئے ۔ صبح سے پہلے واپس پہنچنا ضروری ہے "

مولا نے ہاتھ بڑھا کر کہا " اچھی بات "

اجنبی نے چاروں سے ہاتھ ملاتے ہوئے ایک بار پھر بھاری آواز میں کہا : -

" ساب سلامت ! "

" ساب سلامت "

اجنبی نے پھر اپنی بندوق کو توڑ تاڑ کر اس پر کپڑا لپیٹ دیا ۔ اور پھرتی سے قدم اٹھاتا ہوا تندوے پھیکی چاندنی میں غائب ہو گیا ۔

وہ چاروں کچھ دیر تک اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے ۔ پھر وہ بیل کی جانب بڑھے اور دیکھا کہ وہ قطعاً مر چکا ہے ۔

اب وہ جلد جلد گاؤں کی جانب بڑھے اور گاؤں کے قریب پہنچ کر انہوں نے دفعتہً " پکڑو پکڑو " کا شور بلند کیا ۔

لوگوں کو ڈاکوؤں کا ڈر لگا رہتا تھا چنانچہ بہت بڑی تعداد میں لوگ گھروں سے باہر نکل آئے تب انہیں پتہ چلا کہ بچارے مولا کا بیل گولی

سے مار دیا گیا ہے۔

مولا دیر تک گولی مارنے والے کی ماں اور بہنوں سے اپنا رشتہ گانٹھتا رہا اور جب اس کا گلا بیٹھ گیا تو سورج نکلنے سے پہلے پہلے وہ چھ کوس پرے تھانے میں اس امر کی رپٹ درج کروا کر گاؤں لوٹ آیا۔

(۲)

"پیرداٹھٹہ"، گاؤں چھوٹا تھا لیکن یہاں کا سب سے امیر گھرانہ "ماہنہ" دُور دُور تک مشہور تھا۔ اردگرد دیہات میں ان کی اسامیاں موجود تھیں۔ اب ماہنوں کا دبدبہ کچھ کم ہو گیا تھا۔ کیونکہ پیر کے ٹھٹے اور اردگرد کے دیگر گاؤں کے بدمعاشوں نے مل جل کر خواہ مخواہ مقدمہ بازی میں پھنسا کر انہیں کھوکھلا بنا دیا تھا۔ اور ادھر ان کے لئے مولا نے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی تھی۔

سردیوں کا سورج کچھ زیادہ بلند نہیں ہونے پایا تھا کہ علاقے کے تھانے سے ایک لمبا تڑنگا مسلمان تھانیدار گھوڑے پر بیٹھا اور دو سائیکل سوار سپاہی ساتھ لئے پیر کے ٹھٹے میں آن دھمکا۔

گاؤں کے باہر ایک بڑے اور بزرگ پیپل کے پیڑ تلے پہنچ کر تھانیدار گھوڑے پر سے اُترا۔ سنہرے کلاہ پر لپٹی ہوئی اسکی خاکی رنگ کی کلف لگی پگڑی کے لہراتے ہوئے شملے دُور ہی سے دکھائی دینے لگے۔ چناں چہ گاؤں بھر کے چماروں، بھنگیوں اور کسانوں کے بچے اور کتے گاؤں میں گھسنے ہی اس کے پیچھے ہو لئے اور اب وہ ایک بڑا سا حلقہ بنائے کھڑے تھے۔

پیپل کے نیچے بلا کی گرد تھی جس میں سوکھے پتے اور بھوسے کے تنکے ملے ہوئے تھے۔

گھوڑے کی لگام سکھ سپاہی کے ہاتھ میں تھما کر تھانیدار نے دونوں طرف سے وردی کو کھینچ کر اپنے سڈول بدن پر جمایا، اس کا اونچا قد کلاہ دار پگڑی کے باعث اور بھی اُونچا دکھائی دیتا تھا۔ اسکی دمکتی ہوئی پیشانی خوب کشادہ تھی۔ اور اس کی ناک جڑ ہی سے ایک دم اوپر کو اُٹھ گئی تھی۔ اپنی شاندار اونچی ناک کی وجہ سے وہ بڑا با وقار اور بارعب انسان نظر آتا تھا۔ ابھی نوجوانی کی ناتجربے کاری اس کے چہرے سے جھلکتی تھی لیکن وہ ذہین ضرور تھا۔ اس کی سبز رنگ کی پتلیوں کی وجہ سے وہ بقول دیہاتیوں کے "انگریز" جان پڑتا تھا۔

پہلے اس نے کھلی ہوا میں ٹہل ٹہل کر دو تین گہرے سانس لئے اور پھر جیب ٹٹول کر ایک خاکی رنگ کا کاغذ باہر نکالا اور اس پر بغور نظر دوڑانے لگا۔

اسی اثنا میں گاؤں کے لوگ بھی جمع ہونے شروع ہو گئے۔ ادھر سکھ سپاہی نے گھوڑے کی لگام پیپل کی جڑ سے باندھ دی۔

کہیں سے نمبردار کو خبر ملی تو وہ بچارا سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگا۔ جب وہاں پہنچا تو حال یہ کہ دم پھولا ہوا، اور پگڑی ٹانگوں میں اُلجھی ہوئی۔

تھانیدار نے ٹانگیں اکڑا اکڑا کر نظر اوپر اُٹھائی اور حلقے میں کھڑے ہوئے آدمیوں میں سے ایک کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

وہ بچارا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

تھانیدار نے تحکمانہ انداز سے کہا، "میں تمہیں کو بلا رہا ہوں۔"

"جی مجھکو؟" اس آدمی نے اپنے سینے پر اُنگلی جماتے ہوئے پوچھا اور اثبات میں جواب پانے پر اس نے مضحکہ خیز انداز سے آنکھوں کی پتلیاں دائیں بائیں گھما کر ادھر اُدھر دیکھا اور پھر پگڑی سنبھالتا ہوا تھانیدار کی جانب بڑھا۔

"تم مولا کا گھر جانتے ہو؟"

"آہو جی .... اوئے ......"

"جاؤ اسے بلا کر لاؤ"

وہ آدمی سرپٹ بھاگا۔ لیکن مولا حقہ ہاتھ میں لئے پہلے ہی سے تہبند اڑاتا چلا آ رہا تھا۔

تھانیدار سے آنکھیں چار ہوتے ہی اس نے دور ہی سے حقہ زمین پر رکھ دیا اور بڑے غلو سے جھک کر فرشی سلام کیا۔ اور پھر آگے بڑھا۔

"موتیاں والیو! میں نے دور ہی سے آپ کو دیکھ لیا تھا۔ بس حقہ تازہ کرنے میں دیر ہو گئی"

یہ کہہ کر مولا نے بڑے خوشامدانہ انداز سے حقے کی نے اس کے نتھنوں سے بھڑا دی۔

نمبردار نے ہی چارپائی کا انتظام کرنے کے لئے اُلٹے پاؤں لوٹ گیا۔ بیٹھنے کی کوئی مناسب جگہ نہ پا کر تھانیدار ایک نگدر پر بیٹھنے لگا تو مولا نے بڑھ کر اپنا کھیس بچھا دیا اس پر۔ اور پھر للکار کر کہا "اوئے مَیادلیا! بھج کے میرے گھر سے چارپائی اور بستر لے آؤ"

اس کی بات سنتے ہی دو تین آدمی بھاگ نکلے۔

تھانیدار نے پہلے تو چپ چاپ حقے کے خوب گہرے گہرے کش لئے اور پھر مولا کی جانب مخاطب ہوتے ہوئے مسکرا کر بولا "سنا اوئے پھوتنی پلیسترا! بات کیا ہے آج چوروں کے گھر مور پڑ گئے؟"

"توبہ! میری توبہ!" کہتے کہتے مولا وہیں اس کے قدموں میں بیٹھ گیا "حجر جستو! جبھی تو کہتے ہیں کہ بد اچھا بدنام برا"

"ہاں خوب یاد آیا" تھانیدار نے سپاہی کی طرف متوجہ ہو کر کہا "اوئے عجیب سینہا! جا جرا رام لعل ماغنے تے اوہدے لڑکے کو تو بلا کے لیا"

پہلے ہی سے سدھائے ہوئے سوداگر نے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑ دیئے اور مسکین آواز میں بولا "کہاں صاحب! بڑا اندھیر ہو گیا ہے جی۔ بچارے مولا کی تاں کمر ہی ٹٹ گئی۔ کسان کو بیل کا بڑا سہارا ہوتا ہے"

مولا نے ٹھنڈی سانس بھر کر منہ نیچے کو لٹکا دیا۔

ادھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ رام لعل سفید دھوتی اور اس پر سفید کرتہ پہنے آ پہنچا۔ اس کے ساتھ اس کا نرم نازک بیس سالہ لڑکا بھیرا لعل بھی تھا جو پتلون پہنے تھا۔

تھانیدار نے باپ بیٹے کو سر سے پاؤں تک دیکھا، باپ بچارا ادھیڑ عمر کا سنجیدہ انسان تھا لیکن تھانیدار کو لڑکے کے کھڑے ہونے کے انداز سے بغاوت کی بو آئی۔ تاہم اس نے کافی تحمل سے پوچھا۔

"اے لونڈے اپنا نام بتاؤ"

اس پر پڑھے لکھے لڑکے کو کچھ گرمی آ گئی برہم ہو کر انگریزی زبان میں بولا۔

"YOU SHOULD NOT BE SO RUDE!"

تھانیدار کو انگریزی بس واجبی آتی تھی۔ اس لئے وہ تحکمانہ لہجے میں بولا "دیکھ اوئے منڈیا! ہم سے زیادہ گٹ پٹ نہیں کرنا.... جو کہنا ہو سو اپنی بولی میں کہو۔ تاکہ سب لوگ تمہارا بیان سمجھ سکیں"

نوجوان ذرا تیز مزاج تھا بولا "آپ افسر ہیں آپ کو ذرا تمیز سے بات کرنی چاہیئے"

یہ غیر متوقع جواب سُنکر تھانیدار نے سر اُوپر اُٹھایا اسکی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔ اس نے اشارے سے سپاہی کو قریب بُلایا اور ہونٹ کاٹ کر بولا "عجیب سینہا! ایسی منڈے کو تھوڑی تمیز دکھاؤ۔"

عجیب سنگھ کے دو تین جھانپڑ کھا کر نوجوان کے دانت ہل گئے۔ اس کے نتھنوں میں سے خون رسنے لگا۔ تھانیدار نے اس کے چکنے بالوں کے گچھے کو ہاتھ میں دبوچ کر کہا "بیٹا! میں تمہارے ایسے شریف بدمعاشوں کو سیدھے راستے پر لانا خوب جانتا ہوں۔" پھر حاضرین کی جانب متوجہ ہوئے "دیکھو جی ایک غریب کسان کا بیل گولی سے اڑا دیا اور اُوپر سے دھونس جماتے ہیں۔ قانون ہمارے ہاتھ میں ہے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دکھانا ہمارا کام ہے۔"

حاضرین میں سے بیشتر نے اسکی ہاں میں ہاں ملائی۔ تھانیدار غرّا کر بولا "اوئے مولیا!"

"جی موتیاں والیو!"

مولا بغل ہی میں سے نکل کر ہاتھ باندھ تھانیدار کے روبرو کھڑا ہو گیا۔

"بیل کہاں پر مرا پڑا ہے؟"

"شہنشاہ جی وہ تو ماتھوں کے کھیت ہی میں پڑا ہے۔ بچارا قسمت کا مارا باڑے میں سے نکل ان کے کھیتوں میں جا نکلا۔ بس اُٹھا کے گولی داغ دی اُنہوں نے۔ بھلا وہ ڈنڈے مار کر نکال دیتے سالے کو۔ غریب کا بیل تو بچ جاتا۔" یہ کہتے کہتے مولا نے رونی صورت بنالی۔

ماتھا یہ الزام سُنکر سٹپٹا گیا۔ لیکن بیٹے کا حشر دیکھ چکا تھا۔ اس لئے چُپ ہو رہا۔

"ہم مرا ہوا بیل موقعہ پر دیکھیں گے!"

"چلو موتیاں والیو!"

اب آگے آگے موتیاں والا۔ ساتھ ساتھ مولا، سوداگر، تیجو وغیرہ۔ ان کے پیچھے ماتھے۔ اور سب کے آخر میں ناک سڑ سڑاتے بچّے اور دُمیں ہلاتے ہوئے کُتّے۔

یہ لشکر کھیت پر کھیت پھلانگتا ہوا جب ماتھوں کے کھیت میں پہنچا تو دیکھا کہ سردی سے اکڑا ہوا بیل کھیت میں ٹانگیں پسارے پڑا ہے...... مولا نے احتیاطاً ایک لونڈے کو وہاں بٹھا دیا تھا تاکہ گِدھ اور کتّے مردار کے قریب نہ آئیں۔

خاں صاحب (تھانیدار) نے بیل کی اگلی ٹانگوں کے نیچے اور گردن میں لگی ہوئی گولیوں کے نشانات کو بغور دیکھا۔ گاؤں کے تین چار آدمیوں کو بھی دیکھنے کا حکم دیا۔ پھر گاؤں واپس آکر پیپل کی چھاؤں تلے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے...... اس وقت ان کے لئے مکھن اور لسّی کا کٹورا لیا رکھا تھا۔

مکھن کا گولہ نگل کر اور اُوپر سے لسّی چڑھا کر خاں صاحب نے باچھیں جھاڑن نما رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا "ہاں بے مولو! اب بتا سارا قصّہ۔ تیرا بیان لکھا جائے گا اب۔"

مولا نے کھانس کر گلا صاف کرتے ہوئے بتانا شروع کیا کہ کیسے پچھلی رات کو وہ اپنے باڑے تک یہ دیکھنے کے لئے گیا کہ وہ لونڈا جو مال مویشیوں کی رکھوالی کے لئے مقرر تھا وہاں موجود بھی تھا یا نہیں۔ کیونکہ اس کمبخت کا ایک چمارن سے یارانہ تھا۔ موقعہ پا کر راتوں کو اُدھر بھی کھسک جایا کرتا تھا۔"

"تم اکیلے تھے یا اور بھی کوئی ساتھ تھا؟"

"نہیں جی کیلا کیتھے، میرے نال سداگر، میلو اور تبھو بھی تو تھے"

"یہ کب سے تمہارے ساتھ تھے؟"

"بادشاہو یہ تو ہر روز میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ کھانے دانے سے فرصت پا کر کبھی یہ میرے پاس آجاتے ہیں اور کبھی میں ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔ گپ اُڑانے کے لئے"!

"اچھا اچھا پھر کیا ہوا؟"

"پھر شہنشاہو! ابھی ہم باڑے سے دُور ہی تھے کہ دھائیں دھائیں دو بار بندوق چلنے کی آواز سنائی دی۔ ہم تو جی ڈر کے مارے کھیتوں میں چھُپ گئے . . . . . ."

"اچھا تو تم ڈر گئے"؟ خاں صاحب نے پوچھا کیونکہ شکل ہی سے مولا ان آدمیوں میں سے دکھائی دیتا جنہیں ڈر کبھی چھُوتا بھی نہیں۔

"آہو جی ہم ڈر گئے"

"اچھا پھر؟"

"اتنے میں یہ نکا ماہنہ گاؤں کی طرف بھاگتا دکھائی دیا۔ پہلے ہم سمجھے کسی ڈاکو نے اس پر گولی چلائی ہے پر جی اس کے اپنے ہاتھ میں بندوق دیکھکر ہم گھبرا گئے . . . ."

"ہوں . . . ." خاں صاحب نے اثبات میں یوں سر ہلایا جیسے وہ اس معاملے کی تہ تک پہنچ گئے ہوں" پھر؟"

"پھر جی ہم باڑے کی طرف بڑھے راستے میں انہیں کے کھیت پڑتے ہیں۔ وہاں ہمیں سفید سفید چیز دکھائی دی۔ ہم ڈرتے ڈرتے قریب پہنچے تو دیکھا کہ میرا بیل مرا پڑا ہے۔ میں نے تو سر پیٹ لیا۔ اور نزدیک سے دیکھا تو گولیوں کے نشان دکھائی دیئے"

تھانیدار صاحب نے مولو سے متعدد سوالات کئے پھر میلو، سداگر اور تبھو کی جرح کی گئی۔

"اچھا تو سداگر! تم نے اچھی طرح پہچان لیا تھا کہ وہ رام لعل کا بیٹا ہیرا لال ہی تھا"

"ہاؤ جی"

اس طرح سے سب نے الگ الگ اس امر کی تصدیق کی۔ اب خاں صاحب پھر ہیرا لعل کی طرف متوجہ ہوئے "دیکھو ہیرا! سچ سچ بتادو کہ آخر بات کیا ہے۔ ورنہ یاد رکھو میں مجرموں کا سخت دشمن ہوں۔ تھانے پہنچکر دو کانوں میں سر کر دوں گا تمہارا . . . ."

اب تو ہیرا لعل تاؤ میں آنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ابھی پہلی مار ہی سے اس کی ناک جل رہی تھی، اور ہونٹوں پہ سوجن آگئی تھی۔ اس نے مدھم آواز میں کہا "یہ الزام بے بنیاد ہے میں تو کھانا کھا کر گھر سے باہر تک نہیں نکلا"

خاں صاحب نے اس کے باپ کی طرف دیکھ کر کہا "لالہ! تمہارا لونڈا ذرا سخت دانہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہمارا کام بھی بھولے بھٹکوں کو راستے پر لانا ہے۔ سمجھا دو اپنے بیٹے کو۔ ورنہ ایک بار میں نے ہاتھ اُٹھا دیا تو یاد رکھو پہچان نہیں پاؤ گے کہ اس کا سر کدھر کو تھا اور مُنہ کدھر کو"!

رام لال مقدمے بازی سے تنگ آچکا تھا ہاتھ جوڑ کر بولا "خاں صاحب! ابھی لڑکا ہی تو ہے شاید . . . . میں بیل کی قیمت

دینے کو طیار ہوں۔"

"بیل کی قیمت؟" مولا نے چلّا کر کہا "مگر ہیرے کے بیل کی جان ایسی سستی نہیں ہوتی کہ جب جی چاہا مار دیا اور پھر پیسے کی دھونس جمانے لگے۔"

خاں صاحب بولے "چپ رہو جی تم۔ بکواس بند کرو۔"

"نہیں بادشاہو! میری کیا مجال ہے۔" مولا ہاتھ جوڑ کر الگ کھڑا ہو گیا۔

"اچھا لالہ اپنی بندوق تو منگواؤ ذرا۔"

بندوق حاضر کی گئی۔

ہیرا بولا "دیکھئے بندوق کی نالی میں گریز لگا کر میں نے الگ رکھ چھوڑی تھی۔"

خاں صاحب نے ہیرا کی طرف گھور کر دیکھا اور زور زور سے سر ہلا کر بولے "سب سمجھتا ہوں یہ گریز تو آج ہی کی لگی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

تھوڑی دیر تک بندوق کا معائنہ کیا گیا۔ پھر انہوں نے سپاہی سے کہا۔

"عجیب سینہا! کاغذ لاؤ تو بندوق کی رسید لکھ دوں۔"

اس کے بعد سب کے بیانات مکمل کئے گئے۔ اور پھر تھانیدار نے کہا "بندوق تھانے میں داخل ہو گی۔ بیٹا! ہیرا چلو تھانے۔ پھر دیکھو میں ہیرا کا بٹیرا کیسے بناتا ہوں۔"

رام لعل بیٹے کے لئے سخت پریشان تھا۔ ہاتھ باندھ کر بولا۔

"خان صاحب دیا کیجئے۔ میں بیل کی قیمت اور جرمانہ دینے کو طیار ہوں۔"

"یہ تو بعد کی باتیں ہیں .... معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری جیب میں روپے اچھل رہے ہیں لالہ!"

رام لعل نے بمشکل تھوک نگلتے ہوئے پوچھا "کیا ضمانت نہیں ہو سکتی؟"

"یہ سب تھانے پہنچ کر طے ہو گا۔"

یہ کہہ کر خاں صاحب گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ جب وہ ہیرا کو لے کر چلنے لگے تو رام لعل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکے نے جوش میں آ کر گستاخی کی ہے۔ اس لئے اس کی خیر نہیں۔ کچھ سوچ کر آگے بڑھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا:۔

"خاں صاحب ایک بات عرض کروں۔"

خاں صاحب نے گھوڑا روک لیا۔

"بات یہ ہے کہ مولا کے بیل کو گولی میں نے ماری تھی۔"

خاں صاحب نے ہنس کر گھوڑے کو ایڑی دی اور بولے "لالہ! لڑکے کو بچانے کی خاطر جھوٹ بول رہے ہو۔ ذرا گواہوں سے تو پوچھو ہم تو قانون کے بندے ہیں۔"

جب تھانیدار صاحب ان سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے اور بندوق بھی اپنے ساتھ لے گئے تو مولا نے اپنے گھر کی ڈیوڑھی میں پہنچ کر پہلے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر بھاری آواز میں بولا "یا مولا!" اس کے بعد سدا گر سے مخاطب ہو کر اس نے کہا "دیکھ بے سدا گر! تو گھوڑی پر سوار ہو کر سیدھا بھنبوڑی چلا جا اور بگا سنگھ سے کہہ دے کہ دھائیں دھائیں بولنے والی چڑیا پنجرے میں بند ہو گئی ہے۔"

(۳)

ابھی سورج ڈھل ہی رہا تھا کہ دفعتہً اس قدر زور کی آندھی اُٹھی کہ زمین سے آسمان تک دھواں دھار ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کرۂ زمین کا سینہ پھٹ گیا ہے اردگرد کے بادل در بادل فلک بوس پہاڑوں کے مانند جھوم جھوم کر اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اور اردگرد کا یہ سمندر خس وخاشاک کو اُڑاتا، اَنڈاتا چلا آ رہا ہے ——— سورج دفعتہً روپوش ہو گیا۔ ہر چہار جانب دھندلاہٹ اور پھر تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور گدلے آسمان میں آنے والی آندھی کی خبر دینے والے چیلوں کے جھنڈ بھی اس بے پناہ دھندلاہٹ میں خلط ملط ہو گئے۔

ککڑی کے بنے ہوئے بھاری بھاری چھکڑوں والے رہٹ کے اوپر چھائے ہوئے پھلاہ کے بڑوں کے جھنڈ میں سے کپورا سنگھ ٹھٹے والا ایک آتشیں تھوتھنی والی سرتا پا سیاہ مضبوط گھوڑی پر سوار باہر نکلا۔ اس نے پہلے پیر کے ٹھڈے کی جانب دیکھا اور پھر دور دور تک بچھے ہوئے کھیتوں پر نگاہ دوڑائی۔ لیکن اس کی نظر دور تک نہیں جا سکی۔ کیونکہ آندھی دم بدم بڑھتی آ رہی تھی۔ کھیتوں کی فصلیں گرد آلود ہوا کی آمد آمد سے ایک بڑے تالاب کے میلے گدلے پانی کی طرح لہریں لیتے دکھائی دے رہی تھیں۔

کپورا ٹھٹے والا، جسے عام طور سے کالا تیتر کہتے تھے، اپنے گاؤں سے نکال دیا گیا تھا۔ کئی برس سے اس نے گاؤں میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کی تھی۔ لیکن ہفتہ بھر پہلے وہ چوری چھپے اپنی بہن کو ملنے کے لئے گیا صرف ایک رات رہ کر اور یہ معلوم کر کے کہ سسرال سے لائے ہوئے زیورات وہ کہاں پر رکھتی ہے، وہ چپ چاپ لوٹ آیا تھا۔ آج ان زیورات اور اس کے ساتھ اڑوس پڑوس والوں پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ تھا۔

وہ بہت جسیم انسان تھا، کالا بھجنگ۔ حرامی پن نس نس میں رچا ہوا تھا۔ اس کا دل بے حس اور جذبات کند ہو چکے تھے۔

ابھی وہ دور دور تک نگاہ دوڑا ہی رہا تھا کہ کھیتوں میں چند سائے دکھائی دیئے جو پرچھائیوں کی طرح اسکی جانب آئے۔

آندھی کا زور بڑھنے لگا۔

گاؤں کے چاروں طرف پھیلی ہوئی گرد پہلے تو سبک دھول کی چادریں لہلہائیں پھر بھاری گرد تہہ در تہہ اوپر کو اُٹھنے لگی اور جوہڑ کے پانی کی سرسراتے ہوئے سانپوں کی طرح ننھی ننھی لہریں بل کھا کھا کر کروٹیں لینے لگیں۔ طوطے، کوّے و دیگر گھریلو چڑیا پیپل اور دھریک کے پیڑوں میں پناہ گزین ہو گئیں۔

کھیت کھیت چلتے ہوئے وہ آدمی جب قریب پہنچے تو کپورے نے انہیں پہچان لیا۔ آگے آگے مولا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے سدا گرہ، لبھو، اور میلا سنگھ۔

انہیں دیکھتے ہی کپورا کرخت لہجے میں بولا۔

"تم لوگ کہاں تھے؟"

"یہیں تو تھے" سدا گرنے ہنس کر جواب دیا۔

کپورے کو سدا گرہ کی ہنسی پسند نہیں آئی۔ اس نے اس کی جانب کڑی نظروں سے دیکھا۔ وہ خود بہت کم ہنستا تھا۔ ظاہر تو یہ ہوتا تھا کہ وہ سدا گرہ کے منہ پر اُلٹے ہاتھ کا چھانپڑ دے گا۔ لیکن پھر خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اور مولا سے مخاطب ہوا۔

"مولا!"

" ہوں "

" سب ٹھیک ؟"

" ہم تو سب ٹھیک ہی ہیں .... طیاری تو تمہاری ہونی چاہیئے "

اسے مولا کی حاضر جوابی بھی پسند نہیں آئی۔ لیکن اس وقت غصے کا موقعہ نہیں تھا اور کچھ نہیں تو ڈاکے کا معاملہ چوپٹ ہو جانے کا ڈر تھا۔ تاہم اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

" ہماری طیاری سے تمہارا مطلب ؟ تم تو اپنی کہو "

" ہمارا کام تو کبھی کا ہو چکا۔ گاؤں میں ایک بندوق تھی سو اب تھانے میں ہے "

" کسی طرف سے کوئی بات نکلی تو نہیں "

" نہیں "

" کوئی افواہ۔ شک و شبہ "

" کچھ نہیں "

کپورے کی گھوڑی شاید آندھی میں کسی قسم کی بُو پا کر بے چین ہو ہو کر بدکتی اور بے چینی سے زمین پر سُم جھاڑتی تھی۔ لیکن وہ اس پر خوب جم کر بیٹھا تھا۔

تاریکی دم بدم بڑھتی جا رہی تھی۔ کپورے کی لوہے کے تاروں کی طرح سخت ڈاڑھی کے بال لہرانے لگے کھیتوں سے بھاگ کر لوگ باگ اپنے اپنے گھروں میں گھس گئے تھے۔ چور خوش تھے آج پروردگار بھی ان کی مدد کرنے پر تُلا ہوا تھا۔

انہیں کئی ساتھیوں کا انتظار تھا جو دُور دُور یعنی پٹیالے تک سے آنے والے تھے۔ کپورے نے سوچا کہ اگر آندھی کی یہی کیفیت رہی تو انہیں اپنی کارروائی جلد شروع کرنی ہوگی۔

کپورا بولا " اچھا اب میں چلتا ہوں "

" ابھی باقی لوگ تو نہیں آئے ہوں گے "

" آ گئے ہوں گے۔ چل کر دیکھتا ہوں۔ تم لوگوں کو تلاش کرنے میں میرا وقت خراب ہوا "

" ہم تمہیں دیکھتے رہے۔ تم کہیں دکھائی نہیں دیئے "

" رہٹ پر ملنے کا وعدہ تھا۔ میں سیدھا اسی جگہ پہنچ گیا تھا "

" پہلے ہم بھی رہٹ پر گئے تھے۔ پھر ہم کھیتوں میں چلے گئے "

" کیوں ؟"

" ہم نے سوچا کہ کہیں رہٹ پر کوئی ہمیں ساتھ ساتھ دیکھ نہ لے "

یہ اچھی حرکت کی تم نے۔ اس قسم کی حرکتیں کرو گے تو خود پھنسو گے اور ہمیں بھی پھنساؤ گے۔ اگر مجھے کوئی اس جگہ دیکھ لیتا تو ؟"

مولا بولا " اچھا جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ ہم اپنی جگہ سے تمہیں دیکھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن آندھی کی وجہ سے تم دکھائی نہیں دیئے ......

بھئی! آگے کو خیال رکھیں گے۔ ایسی غلطی نہیں ہوگی"

اس پر کپورا خوش ہوگیا۔ بولا۔

"دیکھو ہم آگے پہلے اسی جگہ رکیں گے اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو تو ہمیں خبر کر دینا"

"اچھی بات"

"مولا! تمہارا گھر تو بالکل سامنے پڑتا ہے"

"تو پھر ذرا نظر رکھنا۔ تاکہ جب ہم یہاں پہنچیں تو تم میں سے ایک شخص ہمیں یہاں آن ملے سمجھے"

"لیکن آندھی بڑھتی جا رہی ہے۔ نہ جانے کب تک اس کا جور رہے۔ تھوڑی دیر میں ہاتھ کو ہاتھ تک سجھائی نہیں دیگا۔ تم لوگ اِتی دُور سے کیسے دکھائی دے سکتے ہو"

کپورے نے قدرے تامل کیا۔ پھر بولا "یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن اب کریں کیا؟"

"تم یہ بتاؤ کہ سب کو لے کر کب تک لوٹو گے؟"

کپورے نے قدرے غور کرنے کے بعد جواب دیا "بھئی پٹیالے اور بھنبیز تک سے جوان آ رہے ہیں۔ اگر سب پہنچ گئے تو ہم ایک گھنٹہ تک لوٹ آئیں گے"

"اچھی بات"

"اور کیا۔ اب رات بھیگنے کا انتظار تو کریں گے نہیں ہم۔ آندھی سے تو اس قدر اندھیرا چھا جائے گا کہ بس طبیعت خوش ہو جائے گی"

"ٹھیک ہے"

"لو بھئی اب میں چلا"

یہ کہہ کر کپورے نے گھوڑی کو ایڑ دی اور رنگیلے کی سی تیزی کے ساتھ دم بدم دھندلاتی ہوئی جھاڑیوں میں گم ہوگیا۔

(۴)

ایک گھنٹہ گزرنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ پیر کے ٹھٹے پر ایسی گہری تاریکی چھا گئی کہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ کپورا اور اس کے ساتھی گھوڑوں اور سانڈھنیوں پر سوار اندھا دھند چلے آ رہے تھے۔ تیز و تند ہوا گویا ان کے کپڑے نوچ کر ان کے بدن سے الگ پھینک دینا چاہتی تھی۔ ان کی داڑھیاں اور مونچھیں گرد سے اٹ گئی تھیں۔ آنکھوں کی پلکیں ایک دوسری میں پیوست ہوئی جا رہی تھیں۔ اگر کپورا ان کی رہنمائی نہ کرتا تو وہ کبھی راستہ تلاش نہ کر پاتے۔

ان میں ہندو، مسلمان اور سکھ سبھی ملے جلے لوگ شامل تھے۔ ان کے پاس دو کچی رائفلیں تھیں، جن کی نالیوں کے دہانے انہوں نے کپڑے کی ڈاٹوں سے بند کر رکھے تھے تاکہ گرد اندر نہ جانے پائے۔ لاری کے اسٹیرنگ کی نالی والی ایک بندوق بھی تھی۔ ان کے علاوہ وہ کرپانوں، چھویوں، لاٹھیوں اور صفا جنگوں سے مسلح تھے۔

اس وقت دُور سے پیر کا ٹھٹہ مرے ہوئے بھینسے کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔

گاؤں سے ہٹ کر سنت دتار سنگھ جی کی ٹوٹی ہوئی سمادھ کی اونچی دیواریں الگ تھلگ کھڑے ہوئے دیو کے مانند دکھائی دے رہی

تھی۔ بوسیدہ دیوار کے قریب بڑے ہوئے پانی کی ایک کھائی تھی جس کی سطح پر سبز رنگ کی کائی جمی رہی تھی اور دیوار کی دراڑوں سے جنگلی بیلیں لٹک آئیں تھیں اور ان کی پتیاں پانی کی سطح کو چوما کرتی تھیں۔

مولا نے سداگر کو حسب وعدہ موقعہ پر بھیج دیا تھا۔ سداگر ریت کے ایک ٹیلے کی اوٹ میں سر اور کانوں کو دھسّے میں لپیٹے بیٹھا تھا۔ دیکھنے کے لئے اس نے آنکھوں کے آگے ایک چھوٹا سا سوراخ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ بھلا ایسی تاریکی میں کیا دکھائی دے سکتا تھا۔ نظر نے تو کچھ کام نہیں کیا البتہ کانوں میں گھوڑوں کے سموں کی ٹپا ٹپ اور سانڈھنیوں کے بلبلانے کی آوازیں آئیں تو اس نے چوکنا ہو کر گردن اوپر اٹھائی لیکن ڈاکو چشم زدن میں اس کے سر پر تھے۔ اس تاریکی میں چھویوں کی دھیمی دھیمی چمک اور بھی زیادہ خوفناک دکھائی دے رہی تھی۔

آندھی کے شور میں آواز گونجی۔

" کون ؟"

" سداگر " سداگر نے جلدی سے جواب دیا مبادا جواب دینے میں تاخیر ہو اور اس کا سر چھوی کے ایک ہی وار سے کٹ کر الگ جا گرے۔

" سداگر کون ؟"

اب سداگر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے چلّا کر بولا " اوئے میں ...... میں سداگر مٹھّے والا۔ کپورا کتھے اے "

عین وقت پر کپورے کی گھوڑی مچل کر آگے بڑھی " سداگر "

" ہاؤ کپور ریا "

" اوئے اپنا ہی منڈا اے " کپورے نے ساتھیوں سے کہا۔ پھر سداگر سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

" مولا بھی ہے "

" نہیں —— وہ گھر پہ ہے "

" باقی سب ٹھیک ہے ؟"

" سب ٹھیک ٹھاک ہے "

اس اثنا میں گرد آلود ہوا فرّاٹے بھرتی رہی۔ گھوڑے اور سانڈھنیاں بے چینی سے رقصاں تھیں۔ نو وارد ڈاکوؤں نے چند ے آپس میں تبادلۂ خیالات کیا۔ اور پھر کپورا سداگر سے بولا۔

" سداگر بچّو اب ہمیں رہٹ کی طرف لے چلو۔

سداگر کچھ کہے بغیر اٹھا اور رہٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ سب اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔

کپورے نے رہٹ کے قریب پہنچکر دریافت کیا " سداگرا! طویلہ تو کھالی ہے نا "

" ہاؤ بالکل کھالی ہے "

" ایسا نہ ہو کہ کوئی باہر کا آدمی گھسا ہو "

" ارے نہیں "

رہٹ پہ پہنچ کر وہ گھوڑوں اور سانڈھنیوں سے نیچے اُترے۔ جانوروں کو طویلے میں بند کرکے سَداگرہ کو رکھوالی کے لئے مقرر کیا اور خود سارے ساز وسامان سمیت گاؤں کی طرف بڑھے۔

مولاؔ کے مکان کا دروازہ نیم وا تھا اس نے دروازے میں اینٹیں پھنسا کر تختوں کو ایک جگہ جما دیا تھا۔ اور وہ خود لبھو کے ساتھ بیٹھا حُقّہ پی رہا تھا۔ مہیلا سنگھ الگ بیٹھا واڑھی کر بیہ رہا تھا۔

انہوں نے دروازے میں سے ڈاکوؤں کے گروہ کو پہچان لیا۔ جب وہ قریب آگئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان میں سب کے سب بڑے مضبوط اور تڑچھے تلنگے آدمی شامل تھے۔

مولاؔ تہبند جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور بولا "سات سلامت!"

"سات سلامت اے جی"۔ دبی دبی ملی جلی آوازیں سُنائی دیں۔

مولاؔ بڑھ کر دہلیز تک گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے دروازے کے آگے بھانت بھانت کی صورتیں کھڑی ہیں۔ انہوں نے پگڑیوں کے شملے گھما کر چہرے ڈھانپ رکھے تھے۔ سوا آنکھوں کے ان کے چہروں کا اور کوئی حصّہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بدن سے وہ ننگے تھے۔ ان کے جسم سرسوں کے تیل کی وجہ سے نہ صرف چمک رہے تھے بلکہ تیل کی ہلکی ہلکی بُو بھی پھیل رہی تھی۔

مولاؔ نے گرمی ہوئی لمبی مونچھوں پر چار انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"آج تاں اللہ دا بڑا پھل ہے جی"

"ہاں"

مولاؔ نے کپورے کی ننگی پیٹھ پہ ہاتھ رکھ کر کہا "اچھا! پانی کانجی پی لو سارے"

کپورے نے جٹا جھاڑ ناریل کے مانند اپنے سر کو انکار کے طور پر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں مجھو! بکت گھٹ اے۔ پانی کانجی کی بات چھڈ"

مولاؔ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"جاد و! سواری بنا آگئے او"

"نہیں گھوڑے ڈاچیاں طبیلے میں چھوڑ آئے ہیں"

"پر بھا! گھوڑے کچھ نجیک رکھو۔ بھاگنے وقت جرورت پڑے گی .... اور پھر کپورے یا! تمہیں کسی نے پچھان لیا تو آپھت آجائیگی۔ تو اپنی گھوڑی بہت نجیک رکھنا ...."

کپورے کو مولاؔ کی بات پسند آئی اس نے جُھک کر ایک ساتھی کے کان میں کچھ کہا۔ اور وہ "ہاں" کہہ کر طویلے کی جانب روانہ ہو گیا۔

کپورے نے مولاؔ سے کہا۔

"مولیا! اب دیر مت کرو۔ بس چلو ایسا موقعہ پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا"

"بوت اچھا"

مولاؔ نے پھونک مار کر دیا بجھایا تو اُس کی لمبی لمبی مونچھیں پھڑکیں۔

اب وہ ایک لمبی قطار کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ لگے لگے بڑھنے لگے۔ گوبر کے ڈھیروں، جوہڑ اور اوڑیوں کے قریب سے ہوتے ہوئے وہ گلی میں گھس گئے۔

آندھی کی وجہ سے بے پناہ شور پیدا ہو رہا تھا۔ ایسے موقعہ پر کتے بھی تنوروں میں دبکے ہوئے تھے۔ ایک آدھ نے دبی سی بھوں کی آواز نکالی بھی تو وہ آندھی کے شور میں دب کر رہ گئی۔

ان کی رائفلیں بھری ہوئی تھیں۔ ان سب کے ہتھیار بالکل طیار تھے۔ ہر اہم موڑ پر کپورا ایک آدمی کھڑا کر دیتا۔

مولا کی ابھی تک بگا سنگھ سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ بگا کم گو انسان تھا۔ مولا اس حقیقت سے واقف تھا۔ اس لئے اس نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ وہ بگے کے دوش بدوش چلا جا رہا تھا۔ بگا تاڑ کی طرح لمبا تھا۔ اسکی آنکھیں اندر کی جانب دھنسی ہوئی تھیں لیکن ان میں وحشی جانور کی آنکھوں کی سی چمک اور تجسس تھا۔ وہی ان سب کا سردار تھا۔

ڈاکو طویل کنکھجورے کی طرح دیواروں سے لگے لگے بڑھ رہے تھے۔

بگے نے مولا سے دریافت کیا۔

"مرکان ہے کہاں؟"

"گاؤں کے بیچوں بیچ"

یہ سنکر بگے کے ابرو پر بل پڑ گیا۔ بگو نے دبی زبان میں کہا۔

"اگر لوگ جاگ پڑے تو اس تاریکی اور آندھی میں گاؤں سے باہر نکلنے کے لئے بہت احتیاط اور ہوشیاری کی ضرورت ہے!"

مولا نے قدرے بے پرواہی سے کہا۔

"اوئے بھا! تم لوگوں کے سامنے کون ٹکا رہ سکے گا۔ چاہے سو آدمیوں سے بھی مقابلہ کیوں نہ ہو جائے"

بگے پر مولا کی اس پھبتی کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ گاؤں والوں کا بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ ایک گرگ جہاندیدہ تھا۔ اس وقت سوال مقابلہ کر سکنے یا نہ کر سکنے کا نہیں تھا بلکہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ گروہ کا ہر آدمی بچ کر نکلنا چاہیئے ورنہ ایک آدھ بھی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو سارے گروہ کی آفت آجائے گی۔ اس قدر آندھی، تاریکی اور شور میں یہ سارا کام بخیر و خوبی انجام پا جانا اس قدر آسان نہیں تھا جتنا کہ مولا کو محسوس ہوتا تھا۔

معاً بگو ایک دم رک گیا اور اس کے پیچھے سب کے سب ڈاکو رک گئے۔

تاریکی میں سامنے سے انہیں ایک تاریک سا سایہ دکھائی دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی آدمی جلد جلد قدم اٹھاتا بڑھا چلا آ رہا ہے۔

وہ سب چشم زدن میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔

وہ آدمی بدن پر کالی چادر لپیٹے تیزی سے بڑھتا آ رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ وہ ان کے قریب پہنچ رہا تھا۔

ڈاکو دم سادھے کھڑے تھے۔ اتفاق سے اس دیوار پر ایک چھجا بڑھا ہوا تھا اس لئے وہ مکمل تاریکی میں کھڑے تھے۔ یوں سمجھ سے قریب کھڑا ہوا آدمی بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ تو محض بگو کی متجسس آنکھوں نے ہی اجنبی کو آتے دیکھ پایا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ اجنبی ان کے قریب سے گزرنے لگا۔ اس غریب کو اس امر کا مطلقاً احساس نہیں تھا کہ وہ ہتھیار بند ڈاکوؤں کی چھپویں

کے سائے تلے سے گزر رہا ہے۔ اگر کہیں اس کے منہ سے چوں کی آواز نکل جاتی تو اس کا سر تن سے جدا ہوتا۔

ڈاکوؤں پر موت کی سی خاموشی طاری تھی وہ اس مخنی سے آدمی کے سائے کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھ رہے تھے۔ خدا خدا کر کے وہ ان کی قطار سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد سب نے اطمینان کی سانس لی۔ کیونکہ وہ اس وقت خون خرابہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگر کہیں اس کی بہت تیز چیخ نکل جاتی۔ اور اس چیخ کو سن کر گاؤں میں شور مچ جاتا تو انہیں خالی ہاتھ واپس بھاگنا پڑتا۔

گاؤں کے اندر والے چوراہے پر پہنچے تو دیکھا کہ اونچے چبوترے والے بڑے کنوئیں کی منڈیر پر پانی نکالنے کی اونچی اونچی چرخیاں سر جھکائے غمناک انداز میں کھڑی ہیں۔ اور ان چرخیوں کے قدموں میں ناہموار پلیندوں والے لوہے کے ڈول پچھلے ہوا کے زور سے ہل ہل کر ڈنگاڈنگ کا شور بلند کر رہے ہیں۔ اور چبوترے کے قریب کھڑے لسوڑیوں کے پیڑ گویا انہیں خشمگیں نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

وہ سب فوراً پیڑوں کے جھنڈ تلے چلے گئے۔ تاکہ آپس میں مشورہ کر لیں۔

کپورے نے چھو چھو کر سب کی تعداد معلوم کی۔ مطمئن ہو کر اس نے کہا:۔

"اس جگہ کم سے کم تین جوان کھڑے رہنے چاہئیں"

"وہ کیوں" ان میں سے ایک نے جو لدھیانے کے علاقے کا ذرا ہٹا کٹا جوان تھا، اعتراض کیا۔

کپورے کو اس کا یہ اعتراض پسند نہیں آیا۔ اس نے ابرو پر گہرے بل ڈال کر اس کی جانب دیکھا اور پھر گہری سانس لیکر اس نے اپنے غصے کو دبایا اور اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرنے لگا۔

"اس جگہ سے صرف ایک تنگ گلی آگے کو جاتی ہے۔ جو مکانوں کے اندر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے بھاگ نکلنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے"

"اوئے آپاں نوں پرواہ نہیں سے۔ آپاں نال کون مکابلہ کر سکتا ہے" نوجوان نے بازو ہوا میں لہرا کر بے پرواہی سے بلند آواز میں کہا۔

اب تو کپورے کا جی چاہا کہ اس کی گردن مروڑ کر رکھ دے۔ اس کے یہ تیور دیکھ کر نوجوان بھی بپھرنے لگا۔ نوجوان مضبوط اور جوشیلا ہی سہی لیکن کپورے کے مقابلے میں کھڑا ہونا تو سراسر حماقت تھی اسکی۔

شاید ان کے دو دو ہاتھ ہو بھی جاتے لیکن بگے نے نوجوان کو آنکھ دکھائی تو وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ پھر بگا کپورے سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ہاں تو کیا کہہ رہے تھے تم؟"

"ادھر جو تنگ گلی تم دیکھ رہے ہو اسی کے اندر ہمیں جانا ہے۔ وہ مکانات جن پہ ہماری نظر ہے قلعے کے مانند ہیں ہر آفت سے بچے ہوئے ہیں۔ اول تو وہاں پہنچنے کا کسی ڈاکو کو حوصلہ ہی نہیں ہوا۔ ہماری یہ پہلی کوشش ہے۔ اگر ہم وہیں کہیں گھر گئے۔ تو عجب مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہماری خیریت اسی میں ہے کہ ہم یہاں سے سب کے سب صحیح سلامت نکل جائیں...... صرف یہی ایک کھلی جگہ ہے۔ خطرے کے موقعہ پر ہمارا ایک آدمی فوراً گلی کے اندر آ کر ہمیں خبر کر سکتا ہے۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ اول تو ہمیں مقابلہ کرنا ہی نہ پڑے۔ لیکن ایسا ہو بھی تو یہاں کھلی جگہ میں ہو"

بگے نے اثبات میں سر ہلایا۔

کپورے نے پھر کہنا شروع کیا۔

"یہ آندھی ہماری مدد بھی کر سکتی ہے اور ہمارا نقصان بھی کر سکتی ہے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو اس ہلڑ بازی آندھی اور اندھیرے میں ہم اپنے

ساتھیوں کی گنتی بھی نہیں کر پائیں گے ؛

بگّا کو حرف بحرف اس سے اتفاق تھا۔

چنانچہ تین آدمی وہاں پہ چھوڑ کر وہ لوگ آگے بڑھے۔

تنگ گلی میں پہنچ کر انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ قبر میں ہوں۔ آندھی اور ہوا کا زور کم تھا البتہ قیامت کا شور کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتا تھا۔

دفعتہً بگّا ایک دم رُک گیا۔ اس کے ساتھ ہی سب کے قدم رُک گئے۔ اور وہ اپنی تھوتھنیاں اس کے قریب لے آئے تاکہ اس کی بات سن سکیں۔

بگّے نے ساہنسی کی طرف دیکھ کر پوچھا :

" بانس نہیں لائے ؟ "

" اروہ تو بھول گئے "

" واہ اوئے بھتو .... تو کیا اب .... کے سہارے چڑھو گے چھت پہ ! "

" بانس کون دُور ہے۔ مولا کے گھر ہی سے تو لانا ہے۔ میلو جا، تو بھاگ کے جا اور مولے کی ڈیوڑھی کے اندر صحن کے کونے میں ایک لمبا بانس دھرا ہوگا ...... بس اُٹھا کر پھورن واپس آنا ...... "

میلو نے تھوتھنی گھمائی اور ناک کی سیدھ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چل دیا۔

وہ سب پھر آگے بڑھے۔ کچھ دُور جا کر گلی بائیں ہاتھ کو گھوم گئی تھی۔ موڑ سے چند قدم آگے داہنے ہاتھ کو ایک اُدھورا مکان تھا۔ جس کی بنیادیں بھرنے کے بعد نہ جانے اسے کیوں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اب وہاں پہ بڑے بڑے خشک جھاڑ، اور منجمٹی (کپاس کی چھڑیاں) کے انبار اگلے مکان کی دیوار کے ساتھ ٹکے ہوئے تھے۔ جب کسی کتیا کو بچے جننے ہوتے تو وہ چھپتی کراہتی یہیں آن کر پناہ لیتی۔ ایک کونے میں بھڑبھونجے کا چولھا تھا۔ جس میں اس وقت ریت بھری تھی۔

وہاں رُک کر انہوں نے اس مکان کے پچھواڑے کا جائزہ لیا جس کے اندر انہیں سب سے پہلے داخل ہونا تھا۔

چھت سے پَرے بجلی چمک چمک کر آنکھیں دکھا رہی تھی۔ گھنگور گھٹائیں سیاہ دامن لہراتی بے پناہ دَل کی طرح آسمان کی وسعتوں میں پھیلنے لگیں۔ آندھی کے زور میں کمی تو نہ آئی تھی البتہ ہوا میں پہلی سی گرد باقی نہ رہی تھی۔

کپوتے کے اشارے پہ وہ پھر رُک گئے۔ ان کی داڑھیاں پھر ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ اس نے کہا :-

" سب لوگ یہیں پہ رُکیں میں بگّے کو لیکر مکانوں کو اگلی طرف سے دیکھ لوں ذرا "

وہ دونوں چند ہی قدم پہ پہنچکر ان سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ساہنسی نے مکان کی جانب دیکھا اور پھر دل ہی دل میں اندازہ لگانے لگا کہ اس پہ بانس کی مدد سے چڑھنا ممکن بھی ہے یا نہیں۔ ان میں ایک بولا۔

" بھتو ! مکان ذرا اُونچا معلوم ہوتا ہے "

" ہاں —— ہے تو "

" اگر تم بانس کے زور سے پھلانگ کر اس پہ نہ چڑھ سکے تو اِدھر اُدھر سے اُوپر جانے کا کوئی راستہ یا سہارا بھی دکھائی نہیں دیتا...... پھر تو آگے والے دروازے سے جانا پڑے گا "

ساہنسی چپ چاپ دانتوں تلے مونچھ کا ایک سرا چباتا رہا۔ پھر یوں بولا جیسے اپنے آپ ہی کو مخاطب ہو کر کہہ رہا ہو۔

" میں آگے بڑھ کر دیوار کے نیچے سے ٹھیک انداز لگا سکتا ہوں "

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور دیوار کے قریب پہنچ منجھٹی کے ایک انبار کے عقب میں گم ہو گیا۔ تاریکی کی وجہ سے اندازہ لگانا مشکل سا ہو رہا تھا۔

چند منٹ کے بعد بگّا اور کپورا بھی واپس آ گئے۔ بگّا بولا :۔

" پہلے تو کپورے کی بہن پہ ہاتھ صاف کرنا ہو گا۔ اس کے بعد پڑوس کے چند گھر بھی اچھے ہیں ان پہ بھی جلدی سے ہاتھ پھیر دیا جائے...... اپنا ساہنسی یار کدھر گیا "

" وہ دیوار کی طرف گیا ہے آتا ہی ہو گا۔ اندھیرے میں اسے بھی کچھ سُوجھ نہیں رہا۔

چند ثانیوں کے بعد ساہنسی آ گیا۔

اسے دیکھتے ہی بگّے نے کہا :۔

" مکان تو اُونچا ہے بھئیو "

" ہاں بھا! " ساہنسی نے پھر ایک مکان کی جانب نظر ڈالی۔ اور پھر قدرے بے چینی سے ہاتھ ملنے لگا۔ شاید اس کے ہاتھ بانس پکڑنے کے لئے بے قرار ہو رہے تھے۔

" پھر؟ " بگّے نے سوال کیا۔

ساہنسی نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟ "

بگّے کو اس کے جواب سے اطمینان نہیں ہُوا لیکن سر دست اس کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی تو نہ تھا۔

اتنے میں میلو ہاتھ میں لمبا بانس لئے یوں وارد ہُوا جیسے بڑے مُوذی کو کندھے پہ لادے لا رہا ہو۔

ساہنسی نے بڑھ کر بانس تھام لیا۔ پہلے اسے لچکا لچکا کر اس کی مضبوطی کا جائزہ لیا۔ اور راستہ ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھا۔ اور پھر اس نے مکان کی چھت کی جانب نظر دوڑائی۔ مٹیالے آسمان پہ کالے بادل گدلے دھبّوں کے مانند دکھائی دے رہے تھے۔

اب ساہنسی نے اپنی کمر کے گرد لمبا رسّہ لپیٹا اور زمین پر ہاتھ مار کر دو ڈھیلے کمر بند میں ٹھونس لئے اور سر گھما کر دھیمی آواز میں ساتھیوں سے کہا۔

" اچھا اب میں کوشش کرتا ہوں۔ چھت پہ صحیح و سلامت پہنچ گیا تو یہ دو ڈھیلے تمہاری طرف پھینکوں گا "

بعد ازاں اس نے لمبے بانس کو سنبھالا، اسے دونوں ہاتھوں میں تولا اور پھر دو چار بار پاؤں کے پنجوں پر ناچ کر تیزی سے بھاگ نکلا

...... معاً اس کے قدموں کی آواز بند ہو گئی۔

سب نے اسے پُھر پُھڑاتے ہوئے بڑے چمگادڑ کی طرح ہوا میں اُٹھتے دیکھا، قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ چھت پر پہنچ گیا ہے۔ اگر بجلی چمک جاتی تو وہ اسے دیکھ ہی لیتے۔ ورنہ .... تڑاق سے دو ڈھیلے ان کے قریب گرے ایک تو ھبلو کی ٹانگ پر لگا۔

"اوئے مُبا دیا!" وہ ٹانگ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ لیکن چوٹ بالکل معمولی تھی ڈھیلا کچی مٹی کا تھا۔

اب بگّے نے چند آخری ہدایات دیتے ہوئے کہا:-

"دیکھو! اب ہمیں یہ سارا کام جلد سے جلد ختم کرنا ہے۔ اس گاؤں میں چند اچھے لڑاکا جوان رہتے ہیں۔ جو جان کی بازی لگا سکتے ہیں۔ اس لئے ہمیں چُپ چاپ اور پھُرتی سے اپنا اُلّو سیدھا کر کے نو دو گیارہ ہو جانا ہے۔ سمجھے؟"

"ہاں سمجھ گئے" سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔

کپورے نے ھبلو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیمی آواز میں ہدایت دی کہ وہ سب جوانوں کو لے کے مکان کے دروازے پر پہنچ جائے۔

وہ لوگ اُدھر چلے گئے تو کپورا بگّے کو ساتھ لے پچھواڑے والی دیوار کے قریب پہنچا۔ ابھی ان کے قدم رُکنے بھی نہ پائے تھے کہ چھت پر سے رسّہ لمبے ناگ کی طرح پھنپھناتا اور لہراتا ہؤا نیچے گر کر جھُولنے لگا۔

باری باری دونوں رسّے کی مدد سے چھت پر پہنچ گئے۔

چھت کی منڈیر بمشکل چار چھ اُنگل اُونچی ہو گی۔ تیز و تند آندھی کے زور میں انہیں یوں محسوس ہؤا جیسے ان کے پاؤں اُکھڑ جائیں گے اور وہ پتنگوں میں اُڑ کر گاؤں کے باہر جا گریں گے۔ اس لئے وہ جُھکے جُھکے صحن سے آنے والی سیڑھی پر بنی ہوئی مٹی کی جانب بڑھے۔ یہ اور خوشی کی بات تھی کہ مٹی کا دروازہ ابھی کھُلا تھا ورنہ انہیں کودپھاند کر نیچے جانا پڑتا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ گھر کے لوگ ابھی سوئے نہیں تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ ابھی سونے کا کوئی وقت بھی نہیں تھا۔

کپورے کے ہاتھ میں رائفل تھی، بگّو کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی چھوی اور رسا آہنسی حسب معمولی لمبا سا چھُرا تھامے تھا۔

انہوں نے ایک بار پھر اپنے اپنے چہروں کو پگڑیوں کے شملوں میں چھُپایا۔ صرف آنکھوں اور ابروؤں کو ننگا چھوڑ دیا۔ اور پھر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے سیڑھیاں اُترنے لگے۔

وہ کافی نیچے جا چکے تھے کہ دفعتہً موڑ سے ٹمٹماتی ہوئی روشنی دکھائی دی۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ کوئی شخص ہاتھ میں لالٹین یا چراغ لئے سیڑھیوں پر چڑھتا چلا آ رہا ہے ...... وہ ٹھٹک کر رُک گئے۔ روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔

ابھی وہ کچھ طے بھی نہ کر پائے تھے کہ چراغ کے نیچے دو زنانہ پاؤں دکھائی دیئے اور ان کی آنکھیں ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکی کی آنکھوں سے ملیں جو چراغ کو اپنے دونوں ہاتھ کے حلقے میں لئے ہوئے تھی تاکہ وہ بُجھ نہ جائے۔

انہیں دیکھتے ہی لڑکی کا رنگ فق پڑ گیا۔ اس نے یہ بڑی زبان باہر نکال کر حلق سے ایک دلدوز چیخ نکالنے کی کوشش کی لیکن مارے خوف کے اسکی قوت گویائی سلب ہو گئی۔ مٹی کا چراغ اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔

بگّے نے پھُرتی سے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ انہوں نے اس کے منہ میں اسی کی چُندری کو ٹھونس ٹھانس کر اس کے

ہاتھ پاؤں باندھ کر وہیں کونے میں ڈال دیا۔
صحن میں پہنچے تو دیکھا ایک جانب ڈیوڑھی ہے۔ اور دوسری جانب مکان کا پسارہ۔ معلوم ہوتا تھا کہ جس دروازے سے نکل کر لڑکی آئی تھی اس کا کنڈا اس نے باہر سے چڑھا دیا تھا، تاکہ ہوا کی تیزی کے باعث دروازہ نہ کھلے۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ اور گھر والوں کی باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔
بگا اور ساہنسی دروازے کے دونوں جانب اپنے اپنے ہتھیار سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ اور کپورا باقی ساتھیوں کے لئے گلی کا دروازہ کھولنے کو ڈیوڑھی کی جانب بڑھا۔ ڈیوڑھی میں مویشی بندھے تھے۔ ایک بیل تو اسے اتنا پسند آیا کہ بے اختیار جی چاہا کہ اسے بھی وہ اپنے ہمراہ لیتا جائے۔ لیکن اس رات یہ قطعاً ناممکن تھا۔
ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر اس نے گلی میں جھانکا تو کچھ نظر نہ آیا۔ چنانچہ اس نے بیل ہانکنے کے انداز میں ٹوٹ ٹوٹ کر کے دو تین آوازیں نکالیں تو متعدد سائے اس کی جانب بڑھے جیسے کالی دیواروں نے انہیں جنم دے دیا ہو۔
کپورے نے ایک جوان کو بندوق سمیت گھر کے پچھواڑے مکئی کے انباروں کے پاس کھڑے رہنے کے لئے بھیج دیا۔ اور باقی لوگوں کو اندر لے آیا۔
دو گھڑی بعد وہ سب لوگ دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ بگو نے چھوی بڑھائی اور دروازے کے کنڈے میں اڑس کر جھٹکا جو دیا تو کنڈا بڑی آواز سے کھل کر گرا اور تڑاتڑ بجنے لگا۔ دروازے کے دونوں تختے زور زور سے پنکھا جھلنے لگے۔
گھر کے لوگ سمجھے کہ لڑکی ممٹی کا دروازہ بند کر کے لوٹی ہے۔ وہ کچھ دیر تک اس کے اندر آنے کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن جب کوئی صورت دکھائی نہیں دی تو ایک مرد جلدی سے باہر نکل آیا۔ پہلے وہ دروازے کے دونوں جانب کھڑے ہوئے بگو اور ساہنسی کو نہیں دیکھ پایا۔ جب اس نے لڑکی کو صحن میں نہ پا کر گردن گھمائی تو بگو اور ساہنسی کی صورتیں دکھائی دیں اس نے گھبرا کر پوچھا:-
"آپ کون ہیں ؟"
اسی اثنا میں باقی آدمی بھی ڈیوڑھی میں گھس آئے اور دروازوں میں سے ان کی خبیث صورتیں دکھائی دینے لگیں۔ وہ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ پیچھے سے کپورے نے اس کی گدی پر الٹے ہاتھ کا ایسا دھپ دیا کہ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔
یہ سب کچھ چند ثانیوں میں ہو گیا۔ وہ سب فوراً مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ لالٹین کی روشنی میں ان کے ہتھیار جگمگا اٹھے۔ جان کے خوف سے گھر کے کسی فرد نے شور نہیں مچایا۔ ان کا بھی وہی علاج کیا گیا جو پہلی لڑکی کا کیا گیا تھا۔
کپورا ذرا چھپا چھپا ہی رہا تاکہ اسے کوئی پہچان نہ لے۔ وہ بگے کو اندر والے کمروں میں لے گیا اور ان کی پونجی کی طرف اشارہ کیا۔ دم کے دم میں سب کچھ سمیٹ لیا گیا۔ پھر وہ سب صحن میں آ گئے۔ بگو نے ایک نظر میں ساتھیوں کی تعداد جانچ لی۔ اور پھر وہ دو حصوں میں بٹ کر پڑوس کے مکانوں کی جانب بڑھے جن کے صحن ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔
اتنے میں باہر سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ ان کے قدم رک گئے۔ کان کھڑے ہو گئے۔ پھر دھڑا دھڑ دو گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے ساتھ آندھی کے شور میں مردوں کے للکارنے کی صدائیں بلند ہوئیں۔
موقعہ کی نزاکت سمجھتے ہوئے وہ باہر کی جانب بھاگے۔

جس نوخیز نشانہ باز جوان کی کیو ترے نے بندوق سمیت مکان کے پچھواڑے ڈیوٹی لگائی تھی، اس نے ہڑبڑاہٹ میں یہ گولیاں چلا دی تھیں۔ ہُوا یہ کہ آندھی کے زور سے منجھی اور جھاڑ کے انبار حرکت میں آگئے اور لڑھکتے ہوئے اسکی جانب بڑھے اور اُس نے گھبراہٹ میں نہ جانے کیا سمجھ کر پے در پے تین گولیاں چلا دیں۔

اسی اثنا میں گاؤں کے مختلف حصّوں سے خطرے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ جھ کھڑیوں والے کنوئیں کی جانب سے 'ایلی ایلی' کی آوازیں آنے لگیں جس کا مطلب یہ تھا کہ اُن کے ساتھی انہیں خطرے سے آگاہ کر رہے تھے۔

اب اُنھوں نے میلو کو آگے لگایا اور سرپٹ بھاگے۔

جھ کھڑیوں والے کنوئیں تک پہنچے تو وہاں اندھا دھند لاٹھیاں چل رہی تھیں۔ گاؤں کے منچلے بھی جلدی میں جیسا ہتھیار ملا لیکر مقابلے پر آن ڈٹے تھے۔ لیکن تاریکی اور آندھی نے انہیں کچھ کرنے نہ دیا۔

اُدھر جگّو کے ساتھی ہوئے ساتھی گاؤں والوں کے کندھوں سے کندھے بھڑاتے ہوئے نہایت صفائی سے اِدھر اُدھر منتشر ہو کر صحیح سلامت گاؤں سے نکل گئے۔

اتنے میں کیو ترے کو اپنی کالی گھوڑی دکھائی دی وہ فوراً چھلانگ کر اسکی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔

اس کا خیال تھا کہ جب وہ اپنی منہ زور گھوڑی کو ایڑ دیگا تو وہ گاؤں کے ہجوم کو کائی کی طرح چیرتی ہوئی نکل جائیگی۔ لیکن عین اس وقت بجلی چمکی تو گاؤں والوں میں سے بعض نے اسے پہچان لیا اور آندھی کے بھیانک شور میں "کالا نتّر! کالا نتّر" کی وحشیانہ آوازیں گھل مل گئیں۔

ایڑ دیئے جانے پر گھوڑی سمٹ کر جو اُچھلی تو گاؤں کے ایک منچلے جوان نے اسکی لگام پر جھپٹا مارا۔ اس پر گھوڑی ہنہنا کر پچھلے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔ اسکی انگھڑیاں پھٹ گئیں، کان پھڑپھڑائے اور ایال لہرائی ..... سوار نے ہونٹ کاٹ کر اپنی لمبے دستے والی کلہاڑی اوپر اُٹھائی لیکن گھوڑی کے اگلے پاؤں زمین پر لگنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک چھوی چمکی اور کیوترے کے پیٹ کی آنتیں اُدھیڑتی ہوئی انہیں پیٹ سے باہر لے آئی۔

وہ بڑے مگر مچھ کی طرح بل کھا کر اوندھے منہ زمین پر گرا۔ پیٹ سے خون کا فوارہ چھوٹا اور لمحہ بھر میں زمین اس کے گاڑھے خون سے سُرخ ہو گئی.....

پھر بارش کی موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔

مکڑی کا جال

علی عباس حسینی

"سنگی ساٹن، غلطہ کمخواب، دھوتی جوڑا لے لو!"

"ارے یہ تو نصیر پور والے شیخ جی ہیں" امی کہتی تھیں۔

بس ہم سب لڑکے دوڑ جاتے تھے۔

نصیر پور یو۔پی کے پوربی ضلعوں میں ایک مشہور مقام ہے۔ وہاں کا غلطہ اور وہاں کی سنگی (مشروع) سمندر پار کے باہری ملکوں تک میں بھیجی جاتی ہے۔ یہ سارا کام ہاتھ سے تیار ہوتا تھا۔ تقریباً پانچ سو کر گھے تھے اور اتنے ہی جولاہوں کے خاندان تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ جولاہے ڈھاکہ کے ان جولاہوں کی نسل سے تھے جن کی ململ اور جامدانی کا کبھی دنیا میں ڈنکا بجتا تھا۔ یہ ململ اتنی باریک ہوتی تھی کہ پورا پورا تھان انگوٹھی میں سے آسانی سے نکل جاتا تھا اور اچکنوں کی جیب میں کئی ایک ساتھ رکھ لئے جاتے تھے۔ ان کی باریکی کے بارے میں مشہور ہے کہ کوئی مغل شہزادی اٹھارہ کپڑے پہن کر بادشاہ کے سلام کو گئی۔ پھر بھی بادشاہ نے یہ کہہ کر منہ پھیر لیا کہ میرے سامنے ننگی کیوں چلی آئی۔ یہ ململ جس سوت سے تیار ہوتی تھی اس کا کاتنا ہر شخص کا کام نہ تھا۔ اسے صرف نو دس برس کی کنواری اچھوتی لڑکیاں کاتتی تھیں۔ ان کے ماں باپ انہیں بڑے تڑکے بھور ہی کو جگا دیتے۔ وہ اٹھ کر نہاتیں، نماز پڑھتیں تب سوت تیار کرتیں۔ اس کام کے لئے خاص وقت اور خاص جگہیں مقرر تھیں۔ ان کے بننے میں بھی بڑی ہوشیاری اور محنت کی ضرورت پڑتی۔ مہینہ میں مشکل سے ایک تھان تیار ہوتا۔ مکڑی کے جالے کا سا باریک اور ریشم جیسا نرم کپڑا ہاتھ سے بُن لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔

یہی وجہ تو تھی کہ جب جان کمپنی کا بنگال پر راج ہوا تو انہوں نے ان جولاہوں کی بڑی قدر کی۔ وہ ان کے بڑے بڑے استادوں کو اپنے ہاں بند رکھتے اور اپنے سوا کسی دوسرے کے لئے انہیں مال نہ تیار کرنے دیتے۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ اس خیال سے کہ کہیں کاریگر دوسرے یورپی تاجروں کے لئے ولیسی جیسی چیز نہ بنا دے اس کا انگوٹھا ہی کاٹ لیا جاتا تھا کہ "نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری"۔ کبھی گاؤں کے سارے مرد اس لئے پکڑ لئے جاتے تھے کہ وہ رات دن کام کر کے صاحب لوگوں کے لئے اتنے تھان تیار کر دیں کہ کمپنی کا ہر انگریز نوکر اپنی اپنی جگہ دو دو چار چار ہزار تھان انگلستان بھیج کر اچھی بڑی پونجی اکٹھا کر لے۔ خود وارن ہیسٹنگز کا کہنا ہے کہ جولاہے اس چاہ اور پیار سے اتنا گھبراتے تھے کہ جب انگریزی کشتی کے آنے کی خبر سنتے تو دریا کے کنارے والے گاؤں کے گاؤں خالی ہو جاتے۔ مرد دس پانچ کوس دور چلے جاتے، اور عورتیں آس پاس کے گاؤں میں جا کر چھپ رہتیں۔ لیکن راج سے بھاگ کر پرجا کہاں جائے گی؟ حکومت کے کارندے انہیں دور دور سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے پکڑ لاتے، اور ان سے بیگار لیتے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ انگریزوں کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ ان کی گردن بنگال بھر میں آسانی سے پکڑ لیتے ہیں، تو وہ اپنا گھر اور اپنا دیس چھوڑ کر بھاگ نکلے، اور دوسری نوابیوں میں جا بسے۔ انہیں بھاگنے والوں میں سے دس بیس نے مل کر نصیر پور بسایا تھا اور دو سو برس کے زمانے میں ان کی تعداد اتنی بڑھی کہ وہاں اب پانچسو کرگھے چل رہے تھے۔

ان جولاہوں کی اُونچی اُونچی پکّی حویلیاں نہ تھیں۔ بس چھوٹے چھوٹے کچّے مکان جو کھپریل سے چھائے ہوتے اور جن کے دیکھنے سے نہ کوئی شان ٹپکتی اور نہ کسی کے دل میں انہیں دیکھ کر یہ جلن پیدا ہوتی کہ ہم بھی ایسی ہی بڑی کوٹھی بنوالیں۔ گاؤں کے رہنے والے بھی خوش تھے۔ میاں بیوی بچّے لپٹ کر دن بھر میں ایک تھان بُن لیتے، سارا خرچہ نکال کے روپیہ دھیلی بچ جاتا۔ سستی کا سمے تھا، اتنے میں سب کا پیٹ بھر جاتا۔ شام کو جب مغرب کی نماز کے لئے سب اکٹھا ہوتے تو بازار کے بھاؤ، سوت ریشم کے ملنے کی مشکلیں، کسی گاہک کو بیوقوف بنا کر دونی، چونّی فی تھان زیادہ بیچ لینے کے قصّے بیان کئے جاتے۔ اور تھوڑی دیر وہیں مسجد میں خوش گپیوں اور خیر صلا پوچھنے کے بعد لوگ ٹولیوں میں بٹ کر اپنے اپنے گھر چلے جاتے۔ وہاں بیویاں کھانا تیار کئے بیٹھی رہتیں۔ اور وہ بال بچّوں کے ساتھ رُوکھا پھیکا خوشی خوشی کھاتے اور صبح کے کام کی تیاریاں کر کے عشا پڑھتے اور سویرے ہی سو رہتے۔ اس لئے کہ سویرے اُٹھتے ہی وہی چرخہ شروع ہو جاتا۔ سُوت کا رنگنا، کرگھے میں تانا بانا ٹھیک کرنا، چھوٹوں کو ڈانٹ ڈانٹ کر سکھانا اور غلطہ یا سنگی کا تھان تیار کرنا۔ ان کی یکساں زندگی میں صرف دو بار ادل بدل ہوتا۔ قصبہ میں اتوار اور جمعرات کو بازار لگتا تھا اور بمبئی، مدراس، کلکتہ اور کراچی تک کے بیوپاری اس میں آتے تھے۔ اس دن یہ جولاہے کندھوں پہ تھان لادے، بڑے بڑے دلّالوں کی چھوٹی چھوٹی دکانوں کے ارد گرد منڈلاتے اور دو چار آنے سستا یا دو چار آنے مہنگا تھان بیچ کر سُوت کی خریداری کی فکر کرتے تھے۔ ان کے لئے دو چار روپے کا فائدہ ایک بڑی پونجی ہوتی اور اس دن نماز میں جی لگا کر خدا سے دُعا مانگتے کہ وہ ان پر اسی طرح کی نظر کرم رکھے۔

شہد کی مکھی کے اس چھتّے میں دو بڑی مکھیاں بھی تھیں۔ ایک شیخ جمّن دوسرے شیخ مہنگو۔ شیخ مہنگو کے ایک ہی کرگھا چلتا تھا، لیکن وہ اکیلے میاں بیوی تھے بھی۔ دونوں مل کر کام کرتے اور ہفتہ میں آہستہ آہستہ دو ایک تھان تیار کرتے اور انہیں کی آمدنی پر گزر بسر کرتے۔ کوئی بچّہ تھا نہیں کہ وہ اس کے لئے اپنے کو پریشان کرتے۔ وہ جتنا وقت بچتا اسے گھومنے پھرنے میں صرف کرتے۔ کبھی اس کرگھے میں پہنچے اس کا تانا بانا ٹھیک کرایا، کبھی اُس کرگھے میں چلے گئے، اُس کو سوت کاتنے میں مدد دے دی، کبھی کسی کے ہاں تھان تیار ہو گیا ہے تو کندی کرنے میں ہاتھ بٹا دیا، کبھی کسی بچّے کی بیماری کے لئے کوئی جڑی بوٹی بتا دی، کبھی کسی ہمسن کے ساتھ بیٹھ کر حقّہ پی لیا، دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، گھومے پھرے اپنے گھر چلے آئے۔

شیخ جمّن کے ہاں بارہ کرگھے تھے۔ دس تو لڑکوں کے اور دو دامادوں کے۔ جب سے لڑکوں نے کام سنبھالا انہوں نے خود کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ کبھی سنگی، غلطہ کا گٹھر پیٹھ پر لادتے اور لوہے کا گز ہاتھ میں لے کر پرانے زمینداروں اور رئیسوں کے گھروں کی پھیری کر آتے۔ یہ پھیری دس دس بیس بیس کوس تک پیدل ہی ہوتی۔ زمانہ بھی وہ تھا جب نہ "راشن" تھا، نہ اتنی مہنگی۔ جس گاؤں میں شیخ جی پہنچتے، دس پانچ تھان بیچ لیتے، اور دوپہر اور رات کا کھانا کسی گاہک کے گھر سے مل ہی جاتا۔ کبھی کبھی وہ ریل پر چڑھ کر کلکتہ، بنارس اور کانپور بھی ہو آتے۔ وہ ان بڑے شہروں سے جب بھی پلٹتے تو وہاں سے یورپ، امریکہ اور جاپان کے بنے ہوئے اچھی اچھی ڈیزائن کے کپڑے ساتھ لاتے۔ شیخ جی یہ کپڑے اس لئے لاتے تھے کہ لڑکے انہیں دیکھ کر اسی طرح کی چیزیں اپنے ہاں تیار کرنے کی کوشش کریں، لیکن ہوتا یہی کہ جب بہو یا لڑکی کے ہتھے یہ کپڑا چڑھ جاتا تو وہ اس کا پائجامہ یا کرتہ بنا ڈالتی ——— شیخ جی کو یہ بات ناپسند تھی کہ ان کے گھر میں ان کے کرگھے کے بنے ہوئے کپڑے کی جگہ کہیں باہر کا کپڑا پہنا جائے۔ لیکن وہ ہر بات میں عورتوں سے کہاں تک جھگڑتے اس لئے چُپ ہو رہتے۔ عورتوں میں ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی کپڑوں کا شوق بڑھا اور جیسے جیسے شیخ جی کی عمر بڑھتی گئی، کام بڑھتا گیا، ویسے ہی ویسے بہوؤں، بیٹیوں اور پوتیوں کا شوق بڑھتا گیا اور آہستہ آہستہ وہ دن بھی آ گیا کہ شیخ جی کے کرگھے کا بنا ہوا کپڑا گھر کی مرغی کی طرح ساگ برابر ہو گیا، اور جسے بھی سنگی، غلطہ پہننے کو ملتا وہ ایسا منہ بناتی جیسے کسی نے ٹاٹ پہننے کو دے دیا۔ عورتیں اپنے اپنے میاں کو طعنے دیتیں "واہ، یہ بھی کوئی چاہ پیار ہے کہ جیب سے پیسے نہ نکلیں! دوسرے کی بہوؤں کو دیکھو، طرح طرح کے اچھے کپڑے پہنے پھرتی ہیں۔ کوئی جاپان یا امریکہ کا "سلک" پہنے ہے، کوئی انگریزی جنگل باڑی"

پہنتے ہے اور کوئی اطالیہ کا "جارجٹ"! اور ہم ہیں کہ وہی نگوڑا غلطہ اور ساٹن، وہی موئی سنگی! سچ کہتی ہوں، مجھے تو ان کپڑوں کو دیکھ کر گھن آتی ہے"!

لڑکے تھے تو شیخ جی ہی کے مگر شہروں میں گھومے ہوئے تھے، ان میں وہ چار کچھ پڑھے لکھے بھی تھے، ایک تو "شبلی کالج" سے بھی بڑھ کر علی گڑھ تک ہو آیا تھا۔ اسے اس پرانے چلن کے کرگھے کو بڑھا کر "اپ ٹو ڈیٹ" قسم کا کارخانہ کھولنے کا خیال تھا۔ اتفاق سے اسے کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔

شیخ جی اپنی پرانی ڈیوٹی ادا کرنے کے سلسلے میں ایک دن بری طرح پٹ گئے۔ واقعہ یوں ہوا۔ ماگھ کا مہینہ تھا۔ دن ہی سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور بادل منڈلا رہے تھے۔ پانچ بجتے بجتے اچھا خاصا اندھیرا ہو گیا۔ شیخ جی کو جہاں پہنچنا تھا وہ جگہ تین کوس رہ گئی تھی۔ وہ ساٹھ کے قریب ہونے پر بھی جوانوں جیسی ہمت رکھتے تھے۔ پیٹھ پر سنگی، غلطہ کا گٹھر باندھے، کمر میں کوئی تین سو کی تھیلی گھڑ بیسے اور ہاتھ میں صرف ایک کچّے لوہے کا گز لئے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ راستہ جانا بوجھا تھا۔ اپنی عمر میں وہ نہ جانے کتنی بار دن میں، رات میں، ادھر سے گزرے تھے۔ انہیں کسی قسم کا ڈر نہ تھا۔ اس لئے وہ داہنے بائیں نہیں دیکھتے تھے۔ منہ اٹھائے سیدھے ڈگر پر چلے جا رہے تھے۔ اچانک چار آدمی درختوں کے جھنڈ سے لاٹھیاں لئے، منہ پر کپڑا لپیٹے نکل پڑے اور راستہ روک کر بولے "کہاں جات ہے؟ رکھ دے سب کچھ!" شیخ جی بوکھلائے نہیں، وہ "لکڑی" جانتے تھے۔ انہوں نے جھٹ گٹھر کی گرہ اس طرح کھول دی کہ وہ پیٹھ سے زمین پر آ رہا۔ انہوں نے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو پینترا بدل کر ڈانٹا "لے لو میاں، جس میں ہمت ہو!" ان کے ہاتھ میں گز اس طرح چمک رہا تھا جیسے وہ رستم کا گرز تھا۔ اس دبلے پتلے بڈھے کے تیور دیکھ کر ڈاکو ہنس پڑے۔ ان میں سے ایک نے پوری لاٹھی شیخ جی کے سر پر ماری۔ وہ اسے آسانی سے خالی دے گئے۔ پرانی ٹانگیں ابھی پینترا نہیں بھولی تھیں۔ وہ ہنس کر بولے "یہ لاٹھی تو چھوٹی ہے، پورا بانس کاٹ لائے ہوتے!" اس طعنے نے سب کو گرما دیا۔ سب ایک ساتھ ٹوٹ پڑے۔ کچھ دیر تو شیخ جی پرانے ہاتھ دکھاتے اور نکلتے رہے لیکن پانچ منٹ میں وہ ہانپ گئے۔ گز دوہرا ہو گیا اور وہ زخمی اور بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ ڈاکوؤں نے کمر ٹٹولی، روپیوں کی تھیلی لی اور شیخ جی کو ان کی گٹھری سمیت وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔

شیخ جی مہینوں اسپتال میں پڑے رہے، لڑکوں نے جس طرح دوا علاج میں روپیہ پانی کی طرح بہایا، اسی طرح ان کی بیماری سے فائدہ بھی اٹھایا۔ چھوٹے لڑکوں نے بھائیوں کا جلسہ کیا، ہاتھ کے کام کی برائیاں بیان کیں اور مشین کے کام کی اچھائیاں۔ سال دو سال میں لکھ پتی، کروڑ پتی ہونے کے انہیں سنہری خواب دکھائے اور مدراس جا کر کپڑا بننے کی ایک استعمالی مشین خرید لی۔ شیخ جی نے جب اپنی گاڑھی کمائی کی بربادی کا یہ حال سنا تو بہت بگڑے بنے، لیکن کر بھی کیا سکتے تھے۔ چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں۔ کھاٹ پر لد کر اسپتال سے گھر آئے۔ بیٹوں اور دامادوں کو اکٹھا کیا۔ انہیں سمجھایا۔ مشین خرید لینا آسان ہے، لیکن اس کے لگانے کے لئے زمین چاہیئے، اس کے چلانے کے لئے مزدور چاہئیں۔ مال تیار کرنے کے لئے کچا سامان چاہیئے اور اس مال کی نکاسی کے لئے منڈی چاہیئے۔ ان باتوں کے لئے بہت سی پونجی، بہت سی زمین اور بہت بڑا دماغ چاہیئے۔ بڑا کارخانہ چلانا ایک آدمی اور ایک خاندان کا کام نہیں۔ غرض تدبیریں سوچی گئیں، ساتھی ڈھونڈھے گئے۔ قصبہ کے سب سے بڑے ساہوکار سیٹھ تھوڑل ساجھی بنے۔ زمین خریدی گئی، ٹرک مول لئے گئے، عمارتیں بنوائی گئیں، سڑکیں نکالی گئیں۔ برادری والے جو برابر کے کاریگر، ساتھ کے اٹھنے بیٹھنے والے تھے، اب رعایا پر جا بنے، اور عمارت کے بنانے والے مزدور۔ خدا خدا کر کے ریل پر لاد کر مشین آئی یہ "فٹ" کی گئی۔ ایک دن کلکٹر صاحب اور سارے ڈپٹی بلائے گئے۔ کارخانہ جاری ہوا۔ دور دور سے سمٹ کر کام کرنے والے آئے۔ کوئی کانپور سے، کوئی کلکتہ سے، کوئی احمد آباد سے، کوئی گجرات سے، اور تھوڑے بہت قصبے ہی کے رہنے والے۔

ایک طرف قصبے کی رونق سے چہل پہل بڑھی، کچھ نئی دوکانیں سگریٹ بیڑی کی، کچھ مٹھائی میوے کی، کچھ سوڈا واٹر بسکٹ مکھن کی کھلیں تو

دوسری طرف ایک شراب خانہ اور ایک تاڑی خانہ بھی کھلا۔ قصبہ کی ایسی سڑکیں جو کارخانے تک یا سیٹھ منتھو مل اور شیخ جمّن کے مکانوں تک جاتی تھیں پکّی بن گئیں۔ اور دونوں مالکوں کے گھروں میں بجلی کے قمقمے بھی جگمگانے لگے۔ سال میں دو ایک بار سینما، تھیٹر، سرکس والے بھی گھومتے گھماتے چکر لگانے چلے آتے اور جہاں اب تک سوائے اذان اور سنکھ کی مقدّس صدا کے کوئی دوسری آواز نہ سنائی دیتی تھی، کارخانہ کھلنے پر تانیں بھی لگنے لگیں، ریکارڈ بھی بجنے لگا اور گھنگھرو کی چھن چھن بھی سنائی دینے لگی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دُور دیس کے مزدوروں کی جنسی بھوک مٹانے کے لئے تیسرے درجے کی رنڈیاں بھی آ بسیں۔

پہلے سال گاؤں کے پانچ سو کرگھوں میں سے صرف پچاس چلتے رہے۔ دوسرے سال وہ بھی بند ہو گئے۔ شیخ جمّن کی برادری والے یا تو فاقہ کرتے تھے یا مل کی مزدوری، لیکن مل میں مزدوری کے لئے مشین چلانے کا ڈھنگ جاننا چاہیئے۔ وہ آتا نہ تھا۔ اس پر مشین تھی پرانی۔ خراب پُرزے برابر سُوت کھینچتے، تاگا توڑ دیتے تھے۔ ان کے سلجھانے میں اکثر اناڑی انگلیوں اور ہاتھوں کی بھینٹ چڑھا دیتے تھے۔ گویا ان غریب جولاہوں کے ساتھ شیخ جی کی مشین نے بھی وہی سلوک کیا جو کمپنی کے تاجروں نے ان کے پُرکھوں کے ساتھ کیا تھا۔ تاریخ اپنا سبق دُہراتی رہی۔ لوگ ہاتھ پاؤں کھوتے رہے، اپنی آزادی سے ہاتھ دھوتے رہے، لیکن پیٹ سب کو رینگنے پر مجبور کرتا رہا۔ اگر کوئی اس غلامی سے بچا رہا تو وہ شیخ مہنگو تھے۔ جب لڑکوں کے دباؤ سے شیخ جمّن نے کارخانہ کھولنا طے کیا تو شیخ مہنگو ان کے پاس ایک دن جھگڑنے آئے اور ٹکا سا جواب پا کر پھر کبھی نہ آئے۔

انہوں نے شیخ جمّن سے "سلام علیک" کے بعد کہا تھا "جمّن، کوّا ہنس کی چال چل کر ہمیشہ دھوکا کھاتا ہے۔"

شیخ جمّن نے مہنگو کو ذرا تیکھی چتونوں سے دیکھا۔ جس طرح بڑے آدمی اُن چھوٹے آدمیوں کو دیکھتے ہیں جو ان پر اعتراض کرنے کی ہمّت رکھتے ہیں۔ وہ بولے "تم جانتے نہیں کہ آج کل مشین کا راج ہے۔ جو کام ہم آٹھ دن میں رو رو کر کرتے ہیں۔ وہ مشین منٹوں میں کرتی ہے۔ آخر اتنا وقت کیوں برباد کریں؟"

شیخ مہنگو دبنے والوں میں نہ تھے "یہ سچ ہے مگر آج اس قصبہ میں پانچ سو آدمی کام سے لگے ہیں۔ کل جب تمہاری مل چلے گی تو کتنے رہ جائیں گے؟"

جمّن بولے "اس سے کچھ زیادہ ہی!"

مہنگو نے دُکھتی رگ پکڑ لی "ان میں سے کتنے آزاد ہوں گے اور کتنے تمہارے غلام؟"

جمّن ذرا اکڑ کر ہنس کر بولے "جو عقل سے کام نہ لے گا وہ غلام تو ہو ہی گا!"

مہنگو نے ڈھٹائی سے جواب دیا "یہ عقل سے کام لینا نہیں ہے بلکہ دولت کا زور دکھانا ہے۔"

جمّن جھلّا اُٹھے "میرے پاس تم سے زبان لڑانے کو وقت نہیں۔ تم نے ہمیشہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی، اب بھی وہی کرو!"

شیخ مہنگو جاتے ہوئے بولے "وہ مسجد تو ہے، تمہاری طرح بوچڑ خانہ تو نہیں ہے!"

اس کے بعد مہنگو نے شیخ جمّن کے ہاں آنا جانا ہی نہ چھوڑا بلکہ سلام پیام بھی۔ شیخ جمّن نے اس طرف دھیان بھی نہ دیا۔ وہ بڑے آدمی تھے۔ فرلانگ دو فرلانگ بھی چلتے تھے تو موٹر پر۔ گاؤں کے لوگ ان کے ہاں دوڑ دوڑ کر آتے تھے، وہ کسی کے ہاں نہ جاتے تھے۔ شادی بیاہ میں بھی برادری کا پاس بہت تھوڑا ہی کرتے۔ کھڑے کھڑے آتے، نوید دیتے چلے جاتے۔ سب ان کے مزدور، ان کے نوکر، ان کی رعیت تھے۔ کس میں اتنا دم تھا کہ اُن سے برابری کا دعوے کرتا۔ پھر کارخانے نے بھی کام بہت بڑھا دیا تھا۔ بیٹوں میں جو پڑھے لکھے تھے، کلکتہ، بمبئی، کانپور وغیرہ بڑے شہروں میں کمپنی کے ایجنٹ تھے۔ گھر پر وہی تھے جو خود اپنے ہاتھ سے اچھے سے اچھا سنگی، غلطہ کا تھان تو تیار کر سکتے تھے مگر کارخانہ چلانا نہ جانتے تھے۔ اس لئے سارا بوجھ شیخ جی ہی کے بوڑھے کندھوں پر تھا۔ پھر کمبخت مشین بھی پُرانی تھی۔ آئے دن کوئی نہ کوئی پرزہ ٹوٹ جاتا، کئی کئی دن کارخانہ بند رہتا، مزدوروں کو

مفت ہی مزدوری دینا پڑتی۔ ایسے میں چڑچڑے بھی ہو گئے تھے اور طبیعت میں ضد بھی بہت بڑھ گئی تھی۔

ایک دن کارخانے سے جھلّائے ہوئے واپس ہو رہے تھے کہ دیکھا شیخ مہنگو ایک بیل گاڑی پر سارا سامان لادے، اور اسی پہ بیوی کو بٹھائے، ہاتھ میں ایک لکڑی لئے چلے جا رہے ہیں۔ موٹر رکوا کے پوچھا "کہاں جا رہے ہو مہنگو؟"

مہنگو نے جمّن کو غور سے دیکھا۔ پھر اُن کی طرف سے منہ پھیر کر کہا "جہاں اللہ لے جائے!"

شیخ جمّن نے ہنس کر پوچھا "کیوں ترقی سے بھاگتے ہو؟"

مہنگو نے بیل ہنکاتے ہوئے مڑ کر کہا "اگر اس ترقی سے بھاگوں گا نہیں، تو وہ مجھے بھی اسی طرح کھائے گی جس طرح ہمارے ان بزرگوں کو اس نے ہضم کر ڈالا جنھوں نے کمپنی کے راج میں بنگالی نہیں چھوڑا!"

شیخ جمّن نے بل کھا کر پوچھا "تو ہم اور کمپنی کے تاجر برابر ہیں۔ کیوں؟"

مہنگو ٹخ ٹخ کرتے ہوئے بولے "پونجی پتی سب برابر! کیا کالا، کیا گورا!"

جمّن نے لاجواب ہو کر ڈرائیور سے کہا "چلو جی!" اور موٹر کے بھر میں بیل گاڑی کی ٹخ ٹخ غائب ہو گئی ——"

دس ہی دن پیچھے مل کا پرزہ پھر بگڑا۔ دونوں ساجھی مل کر بیٹھے، دُور دُور سے انجنیئر تار دے کر بلائے گئے۔ آخر میں یہ طے پایا کہ ایک دوسری مشین مول لی جائے تاکہ اگر ایک بگڑے تو دوسری چلتی رہے۔ انگلستان کے ایک بڑے کارخانہ کو تار دیا گیا "سب سے پہلے آنے والے جہاز سے مشین بھیجو۔ وہاں سے جواب آیا "مشین بھیجی جا رہی ہے"۔ بیچ میں کام جاری رکھنے کے لئے ٹوٹی مشین کا پرزہ ٹھیک کرایا جانے لگا۔ ابھی وہ ٹھیک بھی نہ ہوا تھا کہ خبر آئی "انگلستان اور جرمنی میں لڑائی چھڑ گئی" اور سرکار نے دھڑا دھڑ ملوں پر اپنا قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ سرکاری انجنیئر آئے، انھوں نے معائنہ کیا، کہا یہ مشین نہیں چل سکتی، پرزہ بالکل بیکار ہے۔ اس کی عمارتوں اور صحن میں ہم ہوائی اڈّے کا سامان رکھیں گے"۔ شیخ جی کا کارخانہ بالکل بند ہو گیا۔ مزدوروں نے ایک ایک مہینہ کی مزدوری، ملازموں نے تین تین چھ چھ مہینوں کی تنخواہ لی۔ کوئی فوج میں بھرتی ہو گیا، کوئی دوسرے کارخانوں میں چلا گیا اور کوئی وہیں گودام میں کام کرنے لگا۔ رہ گئے شیخ جی اور ان کے دس جاہل اور کاہل لڑکے۔ روپیہ سب کارخانہ کھا گیا تھا۔ تھوڑا بہت نقد جو اُلٹا پلٹا جا رہا تھا حسابات کے صاف کرنے میں لگ گیا۔ اب پھر وہی پونجی تھی جس سے کہ گھے چلتے تھے۔ موٹر بیچ ڈالا، گھوڑا گاڑیاں بیچ ڈالیں، نوکر چاکر الگ کئے۔ لڑکے اتنے ہی دنوں میں آرام کے عادی ہو گئے تھے، اب جو تکلیف اُٹھانا پڑی تو آپس میں لڑنے جھگڑنے اور شیخ جی سے اُلجھنے لگے۔ بوڑھا زمانہ دیکھ چکا تھا۔ اس نے سب کو اکٹھا کیا۔ ساری پونجی آنہ پائی کر کے جوڑی۔ اپنے لئے صرف سو روپے کی رقم نکالی اور سب پر برابر بانٹ دی۔ لڑکے بہو، داماد بیٹیاں شہر چلے گئے۔ شیخ جمّن نے سُوت خریدا اور دھوتی جوڑا تیار کرنا شروع کیا۔

ہفتہ کے دن پاس والے گاؤں میں دھوتی جوڑا کندھے پر رکھے اور سنگی، غالطہ کے تھانوں کا گٹھر پیٹھ پر باندھے، ہاتھ میں کچے لوہے کا گز لئے چلے جا رہے تھے کہ سامنے سے شیخ مہنگو بھی اسی طرح لدے پھندے آتے دکھائی دیئے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے، دونوں کے چہرے اس طرح چمک اُٹھے جس طرح قلعی کی ہوئی پرانی دیواروں کا کونہ دھوپ میں چمک اُٹھتا ہے۔ "سلام علیکم"، "وعلیکم السلام" کہہ کر دونوں نے مصافحہ کیا۔ اور گٹھر زمین پر رکھ کر دونوں اُن پر بیٹھ گئے۔

"کہو یار، موٹر چھوٹنے کا غم تو نہیں ہے!"

"نہیں بھائی معلوم ہوتا ہے، ہمیشہ جیسا پھر جوان ہوں۔ محنت کرتا ہوں، ڈٹ کے کھاتا ہوں اور شام کو ٹانگ پھیلا کر بے کھٹکے سوتا ہوں۔ نہ کارخانہ کی فکر، نہ سیٹھ نتھو مل کے حصّے کی اور نہ مل میں اسٹرائک ہونے کی!"

"چلو بگڑ چلے تھے، اچھے چھوٹے!"

اتنے میں تین اہیرنیں اُپلوں کا خالی ٹوکرا لئے آپس میں ہنسی ٹھٹھول کرتی ادھر سے گزریں۔ شیخ مہنگو نے شیخ جمّن کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔ شیخ جمّن نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آواز لگائی۔

"سنگی ساٹن، غالطہ کمخواب، دھوتی جوڑا لے لو!"

اور تینوں جوانیوں کی سریلی ہنسی میں دو بوڑھوں کا پھٹا پھٹا قہقہہ بھی مل گیا ——

مسوری ۱۹۵۳ء

خواجہ احمد عبّاس

(قرۃ العین حیدر سے معذرت کے ساتھ)

روز کا ٹیچ

مسوری ——— ۱۱ر جون ۱۹۵۳ء

اوشا ڈارلنگ

تم ضرور خفا ہوں گی کہ میں نے اب تک تمہیں خط نہیں لکھا اور شاید یہ بھی سوچتی ہوں گی کہ مسوری جا کر سلمہ نے مجھے بھلا دیا۔ یقین مانو کہتی ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے) جب سے ہم یہاں آئے ہیں ایک دن بھی ایسا نہیں گذرا کہ تمہاری یاد نہ آئی ہو یا تمہیں خط لکھنے کا ارادہ نہ کیا ہو۔ مگر پاپا اور ممی اور بھائی جان کی مشترکہ سازش سے مجھے صبح سے شام تک اتنا مصروف رکھا جاتا ہے کہ ایک منٹ کی بھی فرصت یا تنہائی نصیب نہیں ہوتی۔ صبح ناشتہ نہیں کر پاتی کہ بھائی جان کا حکم ہوتا ہے کہ رائڈنگ کو چلو۔ (پہلے چند روز تو سلیکس میں ہی سواری کی مگر اب میں نے برجیس سلوا لی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ رائڈنگ ڈریس میں میں بُری نہیں لگتی!) ہاں تو کیملز بیک روڈ کا چکر لگا کر آتے ہیں تو گیارہ بج جاتے ہیں اور رمی کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ پاپا تو تم جانو رمی کے پرانے شوقین بلکہ ماہر کھلاڑی ہیں اور بھائی جان کو تو انہوں نے سکھایا ہے۔ مگر میری خاطر ممی نے بھی رمی کھیلنا شروع کر دیا ہے تاکہ ان کی اکلوتی پیاری بیٹی سلمہ کا جی نہ گھبرائے۔ ہاں تو لنچ تک رمی کا سلسلہ رہتا ہے۔ اور لنچ کے بعد ممی کا حکم ہوتا ہے آرام کرو۔ ورنہ تمہاری صحت خراب ہو جائیگی۔ رنگت پھیکی پڑ جائے گی۔ آنکھوں میں حلقے پڑ جائیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ آجکل ممی میرے کمرے ہی میں سوتی ہیں۔ (بیٹی کی خاطر پاپا کا ایثار تو دیکھو) ۔ شاید ان کو خدشہ یہ ہے کہ میں دو منٹ بھی اکیلی رہی تو کہیں انگوٹھی کا ہیرا نہ چبا لوں۔

تو اس طرح چائے کا وقت ہو جاتا ہے اور چائے پیتے ہی باہر نکلنے کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ تم جانتی ہو مسوری میں فیشن ایبل لڑکیوں کی کتنی کثرت ہوتی ہے۔ اگر روز نئی ساڑھی یا شلوار یا غرارے کا نیا سوٹ نہ پہنو اور میک اپ پر آدھ پون گھنٹہ نہ لگاؤ تو لائبریری کی "گرل پریڈ" میں شاید کوئی نوٹس نہ لے۔ اس لئے کافی محنت کرنی پڑتی ہے۔ (ہاں، یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ پاپا نے حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر کتنے ہی نئے کپڑے مجھے سلوا دیئے ہیں۔ کوئی دس تو نئی ساڑھیاں ہیں شیفون کی ایک نیلی ساڑھی لی ہے اور اس کے ساتھ سنہری بروکیڈ کا ایک بہت ہی چست بلاؤز۔ میری جان دیکھو تو ایک بار تم بھی ڈھیر ہو جاؤ۔)

شام کو ہم لوگ لائبریری کی بھیڑ میں زیادہ دیر نہیں ٹھیرتے۔ کیونکہ پاپا کہتے ہیں یہاں اب LOW کلاس کے لوگ زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر بھی لائبریری کو ایک سرے سے "بائی پاس" بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان نچلے درجے کی لڑکیوں میں کوئی کوئی بڑی ہی حسین صورتیں نظر آتی ہیں اور انہیں دیکھنے کے لئے ہائی کلاس

کے لڑکے اِدھر ضرور چکر لگاتے ہیں۔ کمبخت اس بُری طرح گھورتے ہوئے گزرتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے ان کی ایکس رے نگاہیں کپڑوں کو چیرتی ہوئی ننگے بدن کو گدگدا رہی ہیں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہم سب لڑکیاں نہیں ہیں بلکہ گردن کٹی کھال اُتری ہوئی بکریاں ہیں جو قصائی کی دکان پر لٹکی ہوئی ہیں اور ہمارا گوشت خریدنے کو یہ سب لڑکے جمع ہیں اور کوئی کہتا ہے "ران کا گوشت دینا" اور کوئی کہتا ہے "سینے کا"۔ کبھی کبھی تو میرا جی متلانے لگتا ہے اور طبیعت چاہتی ہے کہ اپنے سارے کپڑے پھاڑ ڈالوں، میک اَپ کئے ہوئے منہ پر کیچڑ مل لوں اور کسی بھاڑن کے گندے چیتھڑے پہن کر اس سڑک سے گزرا کروں تاکہ یہ بے شرم، بے رحم نگاہیں گدگدانے، چھیڑنے، کاٹنے کو میری طرف نہ دوڑیں۔

ہاں تو اس طرح لائبریری سے گزرتے ہوئے ہم ہیک مینز کے بال روم پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں پاپا اپنے مقررہ چار پیگ وہسکی کے پیتے ہیں اور بھائی جان ان کی نظر بچا کر کسی دوسری میز پر جا کر اپنے دوستوں کے ساتھ بیئر کا ایک گلاس پی آتے ہیں اور ممی کوئی پندرھویں بار یہ اعلان کرتی ہیں کہ شیری کوئی شراب تھوڑا ہی ہے۔ مگر میرے لئے کافی ہی آرڈر کی جاتی ہے۔

پچھلی بار ہم ۱۹۴۷ء کے سیزن میں مسوری آئے تھے۔ جب تو میں میٹرک میں پڑھتی تھی اور کانونٹ سکول کا نیلا فراک پہنتی تھی اور نہ میک اَپ کرنے کی اجازت تھی نہ ہیک مینز کے بال روم میں آنے کی۔ اسی لئے مجھے تو اس زمانے کی کوئی خاص یاد ہے نہیں مگر پاپا (جنہوں نے فسادات کے بعد پہلی بار مسوری پھر آنے کی ہمت کی ہے) کہتے ہیں اب مسوری میں وہ لائف اور گیٹی GAIETY نہیں رہی جو پہلے تھی۔ ایک تو تم جانو ان کے پیارے انگریز اب یہاں مشکل سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پھر ان کے تعلقہ دار سیٹ کے اکثر مسلمان پاکستان چلے گئے ہیں۔ جو باقی ہیں ان میں سے بہت سے زمینداری ابالیشن کے بعد اب مسوری آنا افورڈ ہی نہیں کر سکتے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو ۴۷ء کے واقعات سے اب تک خوف زدہ ہیں اور اس لئے ادھر کا رُخ نہیں کرتے۔ مگر پاپا کو سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ اب گھٹیا درجے کے لوگ مسوری آنے لگے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں کے وکیل، ڈاکٹر، تحصیلدار، ڈپٹی کلکٹر وغیرہ۔ بھلا ان لوگوں کو پاپا کب خاطر میں لاتے ہیں۔ رہے بزنس کلاس کے سندھی اور پنجابی۔ روپیہ تو ان لوگوں کے پاس بہت ہے اور خرچ بھی کرتے ہیں بُری طرح۔ شراب تو پیتے نہیں لنڈھاتے ہیں۔ مگر پاپا کہتے ہیں یہ سب بد مذاق ہیں۔ ان میں کلچر نہیں ہے۔ ان کی فلم سٹاروں کی تصویروں والی بش شرٹس اور چیختے ہوئے رنگوں کی ٹائیاں دیکھ کر تو پاپا تلملا اُٹھتے ہیں۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ ان سب کو زبردستی مسوری سے باہر کر دیں۔ مشکل یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ ہیک مینز میں بھرے رہتے ہیں، ان کی لڑکیاں بیویاں سب سے بڑھیا کپڑے پہنتی ہیں اور سب سے زیادہ میک اَپ کرتی ہیں۔ ڈانس بھی زور و شور سے کرتی ہیں۔ وہ چار سندھی پنجابی نوجوانوں نے مجھ سے بھی ڈانس کے لئے کہا مگر میں نے پاپا کے ڈر سے انکار کر دیا۔ اور پھر مجھے ڈانس آتا بھی نہیں تھا۔ ممی ایک زمانے میں ڈانس کیا کرتی تھیں اب نہیں کرتیں۔ میں نے پاپا سے کہا پھر کیا حرج ہے۔ میں بھی سیکھ لوں۔ پہلے تو انہوں نے اجازت نہیں دی۔ کہنے لگے۔ اُن دنوں کی بات اور تھی۔ انگریز ڈانس کرنے کا سلیقہ جانتے تھے۔ پھر جو ہندوستانی ہوتے تھے وہ بھی ہائی کلاس کے ہوتے تھے۔ تمہاری ممی نے نواب رام پور اور راجہ صاحب نانپارہ اور سر جے پی کے ساتھ ڈانس کیا ہے۔ اور یہ ...... یہ لوگ تو وحشی ہیں وحشی۔ مگر چند روز بعد جب ڈانس کے شوقین نوجوانوں نے میری طرف رُخ کرنا بھی چھوڑ دیا تو پاپا کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا اور اب اتنی اجازت مل گئی ہے کہ بھائی جان سے ڈانس کرنا سیکھوں۔ اس لئے کبھی کبھی اب میں بھی ڈانس فلور پر نظر آتی ہوں مگر اپنے بھائی کے ساتھ ڈانس کرنے میں وہ بات اور وہ تھرل کہاں جو ......

ہاں تو، جانِ من، اس طرح اپنا وقت صرف ہوتا ہے۔ صرف رات کو جب گیارہ بارہ بجے پلنگ پر لیٹتی ہوں اور ممی "گڈ نائٹ" کہہ کر خراٹے لینا شروع کر دیتی ہیں صرف اُس وقت میں اپنے خیالات کے ساتھ تنہا ہوتی ہوں۔ اور اُس وقت اور یادوں کے ساتھ تمہاری یاد بھی آتی ہے۔

" اور یاد دوں " کا مطلب سمجھ گئیں نا؟ اکنامکس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے گذرو تو اور ایک کالی ورسٹڈ پتلون اور ایک بھورا ٹوئیڈ کا کوٹ (اُس کوٹ کے مونڈھے پر تمہیں شاید میرے ہاتھ کا رفو کیا ہوا حصّہ دکھائی دیگا) تو میری طرف سے ایک نظرِ شوق اُدھر ڈال لینا۔ بس۔ ڈیڈی اور بھائی جان نے مجھے اس سنہرے پنجرے میں بند تو کر رکھا ہے مگر " مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے "۔ اور اس لئے " اکثر شبِ تنہائی میں پہلے نیند سے .... "

اچھا۔ میری جان۔ یہ خط غسلخانے میں بند ہو کر لکھ رہی ہوں۔ اور ممّی دروازہ دھڑ دھڑا رہی ہیں کہ جلدی کرو۔ اس لئے باقی آئندہ کے مفصّل حالات لکھنا۔ روشی اور شمّی اور نورو اور نینا کو بہت بہت پیار۔ دکھو تمہارا چاند باغ والا رومانس کیسا لڑ رہا ہے؟)۔

تمہاری (مگر صرف تمہاری نہیں)

سلمہ

———

روز کاٹیج

مسوری ——— ۱۸ جون

جان سلمہ۔ جیتی رہو۔

تمہارا خط کیا آیا۔ لکھنؤ کی یادوں کا دروازہ کھل گیا۔ اور مسوری کی " جنّت نظیر " بیوٹی پھیکی پڑ گئی۔ تم گرمی اور پسینے کی شکایت کرتی ہو اور میرا جی چاہتا ہے کہ پَر لگا کر وہاں پہنچ جاؤں جہاں تم ہو۔ جہاں وہ ہے .... خواہ وہاں جہنّم جیسی گرمی کیوں نہ پڑ رہی ہو!

بنتی کیوں ہو! جیسے تمہیں احمد کے بارے میں میری جو فیلنگز ہیں ان کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ میں نہیں مان سکتی کہ تم جو اُڑتی چڑیا پہچانتی ہو اس اوپن سیکرٹ سے بے خبر تھیں۔ تم پوچھتی ہو " آخر تم نے اس بے ہنگم، گنوار کے لٹھ لکچرر میں ایسا کو نسا سُرخاب کا پَر لگا دیکھا ہے جو اُس کو دل دے بیٹھی ہو؟ " (اور جو میں یہی بات تمہارے جگر کے ٹکڑے نرمل کے بارے میں کہوں جس کے دودھ کے دانت بھی ابھی نہیں ٹوٹے اور جو ابھی تک محبّت کو دیوداس کا فلم اور مہادیوی ورما کی کویتا ہی سمجھتا ہے)۔ تو میری جان بات یہ ہے کہ ہمیں تو احمد کی ہر آن بھاتی ہے۔ اس گرمی میں اُس کا گرم کوٹ پہننا بھی بھاتا ہے (اس لئے کہ اس کوٹ پر میرا رفو کیا ہوا ہے!) اور اس کے بے کنگھی کئے ہوئے گھنے کالے بال بھلے ہیں اور اس کا اکنامکس پڑھانے کے بہانے سوشلزم پر لکچر جھاڑنا بھاتا ہے، اور جس انداز سے وہ کہتا ہے " ہاں تو مس سلمہ شمشاد علی خاں۔ آپ بھی تو ایک تعلقہ داری خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ آپ کی رائے زمینداری ابالیشن کے بارے میں کیا ہے؟ " وہ بھاتا ہے۔ اور بتاؤں؟ نہیں کیوں مُنہ کھلواتی ہو۔ کسی اور کے ہاتھ خط پڑ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

تمہارا خیال غلط ہے کہ میں اس بچکانہ موڈ میں ہوں جب لڑکیوں کو اپنے ہر پروفیسر سے عشق ہوتا ہے۔ معاف کرنا مجھ پر یہ دَورے کبھی نہیں پڑے اور احمد تو مجھے اس وقت سے بھاتا ہے جب وہ پروفیسر نہیں تھا۔ بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ اور ہم لوگ آئی۔ ٹی میں فرسٹ ایئر میں تھے اور ایک دن ہمّت کر کے تم اور میں اور روشی تینوں کافی ہاؤس گئے تھے اور وہاں ایک شرابی اینگلو انڈین فوجی گھس آیا تھا اور ہم لڑکیوں کو UNESCORTED دیکھ کر اول فول بکنے لگا تھا اور ہم ڈر کے مارے کانپ رہے تھے اور وہ بالکل قریب آ گیا تھا ——— لال لال منہ کا بندر کہیں کا ——— اتنے قریب کہ اُس کے سانس سے شراب کی بُو آتی تھی۔ اور میرا دوپٹہ سر سے اُٹھا کر کہنے لگا تھا " او مائی ڈارلنگ کم دس انڈ دی نائٹ فار لو "۔ اور جتنے بھی لڑکے

کافی ہاؤس میں مجھے ان میں سے کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ اُس کمبخت کو ٹوکے۔ اس لئے کہ اس کی پیٹی میں پستول لگا ہوا تھا۔ اور ہر ایک کو ڈر تھا کہ وہ پستول نکال کر گولی چلانا نہ شروع کر دے۔ اور اس وقت ایک دُبلا سا لمبا سا سانولا سا لڑکا جو اس وقت تک اکیلا بیٹھا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا خاموشی سے اپنی جگہ سے اُٹھا تھا اور میز پر سے کافی پوٹ اُٹھا کر اُس ہٹے کٹے انگریز کے سر پر دے مارا۔ یاد ہے کتنی خوفناک ہاتھا پائی ہوئی تھی ان دونوں میں اور جب ملٹری پولیس والے آکر اسے لے گئے مجھے تو ہم نے دیکھا تھا کہ ہماری جان اور عزت بچانے والے کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا اور وہ اُس خون کو اس طرح پونچھ رہا تھا جیسے کوئی پسینہ پونچھتا ہے۔ اور ہم سے کہہ رہا تھا "معاف کیجئے گا۔ آپ کو تکلیف ہوئی۔ اب وہ موذی آپ کو تنگ کرنے کی کبھی ہمت نہ کریگا"۔ ..... اور پھر اتنا بہت خون نکلتے دیکھ کر میرا سر چکرا گیا تھا اور میں بے ہوش ہو گئی تھی! ...... وہ دن میں اب تک نہیں بھولی۔ اور وہ بھی نہیں بھولا۔ اس لئے کہ اس کی پیشانی پر اب بھی اس زخم کا نشان ہے، ..... اور جب بھی وہ آئینہ دیکھتا ہے اُسے اُس دن کی ——— اور میری ——— یاد دلاتا ہے۔

نہیں، او نشا، میری جان۔ میں سکول گرلش INFAT NATION میں بالکل گرفتار نہیں ہوں۔ میں نے احمد کو ہر ڈھنگ سے دیکھا ہے۔ ہنستے ہوئے بھی، غصہ ہوتے ہوئے بھی، ایک بار روتے ہوئے بھی۔ اُس کی زبان سے میں نے اکنامکس پر لکچر بھی سنے ہیں اور اُسی زبان سے غالب اور اقبال، فراق اور مجاز کی نظمیں اور غزلیں بھی سنی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اُس نے آج تک مجھ سے یہ نہیں کہا کہ "میں تم سے محبت کرتا ہوں" مگر اس کا مطلب یہ نہیں (جیسا تم نے لکھا ہے) کہ "ہو سکتا ہے کہ اُسے تم سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہو ——— یا صرف اتنی ہو جتنی ہر نوجوان پروفیسر کو ہر خوبصورت نوجوان گرل سٹوڈنٹ میں ہوتی ہے"۔ اوّل تو میں سرے سے خوبصورت ہی نہیں ہوں۔ ہماری کلاس ہی میں کتنی ہی لڑکیاں مجھ سے کہیں زیادہ "زُم" ہیں۔ مگر وہ ان میں سے کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ دوسرے یہ کہ میں بھی دودھ پیتی بچی نہیں ہوں۔ اچھے بُرے میں تمیز کر سکتی ہوں۔ نہ پردے میں پلی بڑھی ہوں۔ احمد کے علاوہ اور بھی دو چار اچھے خاصے معقول نوجوانوں سے ملی ہوں۔ خود پسندی کا الزام نہ دو تو کہوں کہ احمد پہلا نوجوان تو نہیں ہے جس نے مجھ میں دلچسپی لی ہے اور اگر بے شرم نہ کہو تو یہ اعتراف بھی کر ڈالوں کہ وہ بھی میری زندگی کا پہلا "درد دل" نہیں ہے۔ اس لئے اگر مجھے وہ اچھا لگتا ہے اور میں اس کی خاطر بہت کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں تو کوئی معقول وجہ ضرور ہوگی۔ سمجھیں ——— یا نہیں سمجھیں؟

خیر اب یہ سنو کہ پاپا اور ممی اور بھائی جان تینوں کی متفقہ رائے یہ ہے کہ مسوری کے سیزن کی دلچسپیوں میں میں احمد کو بالکل بھلا بیٹھی ہوں۔ اس لئے ممی نے میرے کمرے سے اپنا ڈیرہ اُٹھا لیا ہے اور اس لئے اب مجھے اپنے دوستوں کو خط لکھنے کی آزادی ہے۔ کل رات پہلا خط اسے لکھا ہے (اور چھٹیوں میں مسوری آنے کی صلاح دی ہے!) اور دوسرا خط یہ تمہیں لکھ رہی ہوں۔ اس وقت سہ پہر کے چار بجے ہیں اور عام طور سے ہم لوگ ساڑھے چار بجے چائے پیتے ہیں۔ اس لئے تمہیں اور بہت کچھ لکھنے کا ارادہ تھا مگر ممی اپنے کمرے سے چلا چلا کر اعلان کر رہی ہیں کہ ہمیں اپنے پڑوسی مسٹر ماتھر کے ہاں چائے پینے جانا ہے۔ ذکوٹی پی۔ سی۔ ایس۔ قسم کے بوڑھے ہیں جو برابر والے بنگلے میں آکر ٹھہرے ہیں۔ اور ان کے ہاں جانے کے خیال سے ہی مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ لیکن پاپا اور ممی ان سوشل معاملات میں بہت ہی فورمل ہیں اور اگر میں انکار کر دوں تو ایسی ڈانٹ پڑے گی کہ بس)۔ اس لئے فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ باقی آئندہ۔

تمہاری ——— سلمیٰ

P.S. تم کتنی خوش قسمت ہو کہ لکھنؤ میں ہو اور روز یونیورسٹی میں پڑھنے جاتی ہو اور "کسی" کو دیکھ سکتی ہو!

P.P.S کیا تم نے رام کمار کی نئی تصویر "خواب" دیکھی؟ نہ دیکھی ہو تو ضرور دیکھنا۔ یہ لڑکا تو دلیپ اور راج سے بھی زیادہ "زُم" نکلا۔ مسوری میں تو ہر لڑکی اس کی دیوانی ہو رہی ہے۔

مسوری

۲۶ر جون

اوشا۔ مائی ڈیر۔ بہت بہت پیار۔

"ایک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے"۔۔۔۔۔۔ گومتی۔ چاندنی رات میں چھتر منزل کا نقرئی منظر۔ بوٹ کلب کا پکنک۔ اور اس میں "وہ" بھی موجود۔ تم نے اتنی خوبصورت تفصیل سے نقشہ کھینچا ہے کہ واہ واہ۔ میں جل ہی تو گئی۔ "ذکر اُس پری وش کا اور بیان تیرا۔۔۔۔۔۔" کیا وہ سچ مچ میری بابت پوچھ رہا تھا؟ یا یہ سب تم نے مجھے چھیڑنے کے لئے من گھڑت لکھا ہے؟ بھئی اس سیریس معاملے میں تم نے مذاق کیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ تم سے یہ بات اس لئے کرید کر پوچھ رہی ہوں کہ میرے پاس جو خط آیا ہے وہ تو اتنا روکھا پھیکا اور فورمل ہے کہ دُور دُور بھی رومانس کا نام نشان نہیں۔ "امید ہے اب آپ کی طبیعت بہتر ہوگی اور اپنے کالج میں جو لکچر مس کئے ہیں ان کے بدلے میں آپ خود گھر پر پڑھ رہی ہوں گی۔ کمیونزم کی اقتصادیات کو سمجھنا ہے تو ویبز WEBBS کی کتاب پڑھنا ضروری ہے۔ ویسے مخالفین کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے برنہم کی MANAGERIAL-REVOLUTION وغیرہ جیسی کتابیں بھی پڑھ لیجئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اینٹی سوشلسٹ طبقے کی منطق کتنی لچر لوچ ہے ——" وغیرہ وغیرہ۔ اب تم ہی بتاؤ۔ میں نے خواہ مخواہ اتنی احتیاط برتی کہ خط گھر کے پتے کے بجائے مسز ماتھر کی معرفت منگایا۔ وہاں تم بھی آئندہ سب خط "معرفت مسز ردوپ کماری ماتھر۔ پربت لاج۔ مسوری" کے پتے سے مجھے بھیجنا۔

اب ان ماتھر ز کے بارے میں سُنو۔ (شاید پچھلے خط میں مَیں نے ان کا کچھ ذکر لکھا تھا)۔ یہ فیملی دو تین ہفتے سے ہمارے برابر والے بنگلے میں آکر ٹھہری ہے۔ نفسیاتی مطالعے کے لحاظ سے نہایت دلچسپ لوگ ہیں۔ ہر ایک سائیکالوجی کی کتاب کا ایک چیپٹر معلوم ہوتا ہے۔ مسٹر ماتھر پی۔سی۔ایس کے پرانے آدمی ہیں۔ بیس برس سے سروس میں ہیں اور اب کسی ضلع میں کلکٹر ہیں۔ عمر کوئی پینتالیس سال کی ہوگی۔ سر کے بال بالکل غائب ہیں۔ اُن کے بے تکلف دوست اکثر ان پر انڈے کی پھبتی کستے رہتے ہیں۔ رنگ سانولا۔ اور اس پر چیچک کے نشان، کمزور آنکھوں پر بڑے موٹے شیشوں کا چشمہ پہنتے ہیں۔ پان بکثرت کھاتے ہیں۔ خوشبودار تمباکو ڈال کر۔ شاید اس لئے کہ دانتوں میں پائیوریا ہے اور جب پان نہ کھا رہے ہوں تو دُور سے بدبُو کا جھپکا آتا ہے انفیریورٹی کومپلکس کی مثال دیکھنا ہو تو ماتھر صاحب کو دیکھ لو۔ بیچارے شکل سے ہی کمتر ہی نہیں یتیم و مسکین بھی معلوم ہوتے ہیں۔ پی۔سی۔ایس کے ہیں اس لئے آئی۔سی۔ایس والوں سے کمتر محسوس کرتے ہیں۔ گنجے ہیں اس لئے بال والوں سے اپنے آپ کو گھٹیا سمجھتے ہیں۔ بیچارے پستہ قد ہی نہیں ایک درمیانہ توند کے مالک بھی ہیں اس لئے لمبے اور تگڑے، صحت مند اور سمارٹ نوجوانوں کا سامنا کرتے ہوئے کتراتے ہیں۔ باپ کسی وکیل کے منشی تھے اور بیٹے کو سرکاری وظیفوں کی مدد سے تعلیم دلوائی تھی اسی لئے خاندانی رئیسوں، تعلقہ داروں اور لکھ پتی سندھی تاجروں کے مقابلے میں ماتھر صاحب احساسِ کمتری محسوس کرتے ہیں۔ مگر شاید اس کمتری کا سب سے شدید احساس ان کو اپنی نوجوان بیوی کے سامنے ہوتا ہے۔

مسز ماتھر کافی حسین اور شاندار عورت ہیں۔ گو ان کا حُسن شاہانہ اور رعب دار قسم کا ہے نسیم اور روفیا جیسا۔ عمر کوئی اٹھائیس تیس برس کی ہوگی۔ مگر ان کو اپنے سے چھوٹی عمر کی لڑکیوں کی برابری کرنے میں مزا آتا ہے۔ مجھ سے بیچاری بڑی محبت سے پیش آتی ہیں مگر ان کا اصرار ہے کہ مجھے مسز ماتھر

نہیں روپ کماری کہا کرو۔ آخر میں تم سے کوئی زیادہ بڑی تھوڑا ہی ہوں، اور ہاں۔ میری رومانی وارداتوں کے قصے سننے کی برابر فرمائش کرتی رہتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اپنی زندگی میں رومانس مس کرنے کی وجہ سے دوسروں کے رومانوں میں انہیں غیر معمولی اور غیر قدرتی حد تک دلچسپی ہوگئی ہو۔ سُنا ہے کسی زمانے میں وہ روپ کماری کے نام سے ہندی میں بڑے اچھے رومانی افسانے لکھا کرتی تھیں تم نے شاید کبھی "مایا" یا "سربتا" میں ان کی کہانیاں پڑھی ہوں۔ کہتے ہیں ان دنوں ایک نوجوان ادیب سے ان کا کافی گہرا عشق بھی چل رہا تھا۔ (افسانوی اور ادبی عشق ——— کنہیا لال منشی اور لیلاوتی منشی یا امتیاز علی تاج اور حجاب اسمٰعیل کے عشق جیسا) مگر ان کے والدین کو اصرار تھا کہ داماد آئی۔ سی۔ ایس نہ ہو تو کم سے کم پی۔ سی۔ ایس ہو۔ وہ بیچارہ اس پر بھی راضی ہوگیا کہ ادبی کام چھوڑ کر آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان دے ——— مگر مقابلے میں صرف ایک نمبر سے رہ گیا اور روپ کے والد نے بیٹی کو زبردستی مسٹر ماتھر کے ساتھ بیاہ دیا۔ اوشا پیاری۔ ہم نے تم نے بھی بہت سے امتحان دیئے ہیں اور امتحانوں کے سارے سسٹم کو ہی کنڈم کرتے رہتے ہیں مگر کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ ایک نمبر ——— سُنا تم نے صرف ایک نمبر ——— کی کمی سے پوری پوری زندگیاں تباہ ہوسکتی ہیں؟ ہاں تو جب وہ بیچارہ ایک نمبر سے آئی۔ سی۔ ایس میں آنے سے رہ گیا تو روپ کے پتاجی نے زبردستی اس کی شادی ماتھر صاحب سے کر دی (یہ اور بات ہے کہ اب کہ اس شادی کو ہوئے چھ برس گذر چکے ہیں ماتھر صاحب صرف نو سو روپے ماہوار پاتے ہیں اور وہ نوجوان ادیب جو آئی۔ سی۔ ایس میں صرف ایک نمبر سے رہ گیا تھا اس وقت واشنگٹن ایمبیسی میں پریس اٹاچی لگا ہوا ہے اور اٹھارہ سو روپے ماہوار پا رہا ہے)۔

کم عمر بیوی اور بوڑھا یا ادھیڑ شوہر ——— یہ تو کافی پرانی اور جانی پہچانی کہانی ہے۔ مگر ماتھر صاحب پہلے سے شادی شدہ بھی تھے اور ان کی پہلی بیوی سے ایک بچی بھی تھی۔ سُنا ہے کہ ان کی پہلی بیوی کم رو ہی نہیں اَن پڑھ بھی ہے اس لئے ایک سرکاری افسر کی بیوی کی حیثیت سے بیچاری بالکل ناکامیاب ثابت ہوئی۔ راوی (یعنی مسوری کے پروفیشنل سکینڈل منگر) بیان کرتے ہیں کہ کمشنر صاحب کے ڈنر میں ایک دن غریب بوکھلاہٹ میں فنگر بول میں ہاتھ دھونے کے بجائے اس کا پانی پی گئی تھی۔ بس اُسی دن ماتھر صاحب نے اُسے تو واپس میکے بھیج دیا (اور اس وقت سے آج تک اس کو سو روپے ماہوار باقاعدگی سے بھیجتے ہیں) اور اپنی بیٹی کو نینی تال کے ایک کونونٹ سکول میں داخل کرا دیا ہے۔ اور اس کے بعد برسوں کسی خوبصورت اور پڑھی لکھی بیوی کی تلاش کرتے رہے جو ان کی سوشل لائف میں ان کا ہاتھ بٹا سکے اور فنگر بول سے پانی نہ پیتی ہو۔ اور آخر ان کی نظرِ انتخاب روپ کماری پر پڑی۔ نتیجہ کیا ہوا وہ میں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ ماتھر صاحب تو روپ کماری پر جان دیتے ہیں۔ اپنی مُس مُسی آنکھوں سے بیوی کی طرف اس طرح دیکھتے ہیں جیسے من ہی من میں اسکی پوجا کر رہے ہوں۔ اُس کی ادنیٰ سے ادنیٰ خدمت بجا لانے میں عار نہیں سمجھتے۔ میں نے خود روپ کو اطمینان سے پان چباتے اور ماتھر صاحب کو بار بار اُگالدان پیش کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ کپڑے والوں، درزیوں، جیولرز وغیرہ کے بل بے چون وچرا ادا کرتے رہتے ہیں۔ روپ کماری کے پاس کم سے کم ڈیڑھ سو ساڑھیاں تو ضرور ہوں گی۔ اور نہ جانے کتنے غرارے اور قمیض۔ ہر رنگ کی ساڑھیوں کے ساتھ پہننے کے لئے الگ الگ کوٹ۔ جوتوں اور سینڈلوں کی قطار تو کمرے کے چاروں طرف لگی ہوئی ہے۔ ہر مہینے بیوی کے لئے درجنوں رسالے اور اخبار اور کتابیں منگواتے ہیں مگر روپ کماری کہتی ہیں اب ان کی ادبی دلچسپی مرجھا گئی ہے اور وہ صرف فلمی رسالوں اور ہفتہ واروں خصوصاً فلم انڈیا کا بغور مطالعہ کرتی ہیں۔ ہر فلم سٹار کا شجرۂ نسب انہیں زبانی یاد ہے۔ کون کب پیدا ہوا، کب فلمی دنیا میں داخل ہوا، کس کس کمپنی کی کس کس تصویر میں آیا۔ کون سا ہیرو کس ہیروئن کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایسی باتیں تو انہیں پوری تفصیل سے معلوم ہیں۔ پرسوں ہی ہم لوگ راج کمار کی نئی فلم "خواب" دیکھ کر لوٹ رہے تھے تو کہنے لگیں جانتی ہو کہ یہ راج کمار اپنے لکھنؤ ہی کا رہنے والا ہے۔ لا مارٹینیر ہی سے تو سینیئر کیمبرج کیا تھا۔ اس کے بعد انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا تھا کہ رائل فلم کمپنی

کار ستم ایرانی لکھنؤ کسی فلم کی شوٹنگ کرنے آیا اور رام کمار کو کنٹراکٹ کر کے ساتھ لیتا گیا .... پہلی ہی فلم میں رام کمار ملبار رانی کے ساتھ ہیرو کے رول میں آیا۔ ملبار رانی اس پر عاشق ہو گئی اور اس کے بعد تو ہر پروڈیوسر جو ملبار رانی کو لینا چاہتا اس کو ساتھ میں رام کمار سے بھی کنٹراکٹ کرنا پڑتا .... وغیرہ وغیرہ ...... لو میں بھی کہاں سے کہاں بھٹک آئی۔ کہنا یہ چاہتی تھی کہ مانھر صاحب روپ کی اتنی خاطر مدارات کرتے ہیں مگر مگر وہ اس بیچارے کو بالکل منہ نہیں لگاتی ...... اور سنو۔ ہر رات کو ڈنر کے کوئی گھنٹہ بھر بعد انہیں ہنو رلجیا (یعنی آدھے سر کے درد) کا نہایت شدید دورہ پڑتا ہے۔ اسپرین کی درجنوں گولیاں بھی بے اثر ثابت ہوتی ہیں۔ شوہر بے چارہ اگر سر دبانے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر ڈانٹ پڑتی ہے۔ بیچارہ کمرے در کمرے پریشان گھومتا رہتا ہے .... بالکل اسی طرح جس طرح روپ کی پالتو کالی بلی جولیٹ اپنی مالکہ کی خاطر ماری ماری پھرتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ گیارہ بارہ بجے جب روپ سونے کی دوا پی کر لحاف میں سر چھپاتی ہیں تو جولیٹ اُن کے پیروں میں دبک کر سو جاتی ہے اور مانھر صاحب بیچارے دوسرے کمرے میں خود بھی ایک سلیپنگ ڈوز پی کر سوتے ہیں۔

تو یہ بیچاری روپ اور بیچارے مانھر صاحب کی حالت ہے۔ مجھے تو دونوں پر بہت ہی ترس آتا ہے۔ مگر اُن سے بھی زیادہ عجیب اور قابلِ رحم حالت شمّو کی ہے۔ شمّو مانھر صاحب کی بیٹی ہے پہلی بیوی سے۔ پورا نام شیام کماری ہے۔ مگر گھر میں شمّو شمّو کہتے ہیں۔ کوئی اٹھارہ سال کی ہوگی۔ پچھلے سال نینی تال کے ایک کونونٹ سکول سے سینیئر کیمبرج کیا ہے۔ اب آئی۔ٹی۔ کالج میں فرسٹ ایئر میں پڑھتی ہے ......

مگر اب مجھے خط ختم کرنا چاہیئے۔ ممی ڈائننگ روم سے چلّا رہی ہیں کہ چلو کھانے کا وقت ہو گیا۔ اس لئے شمّو کے بارے میں اگلے خط میں لکھوں گی۔ تم تو اپنے آپ کو سائیکالوجی اور سائیکو انالیسس کی توپ سمجھتی ہو۔ مگر اس مانھر خاندان جیسے نمونے تم کو اپنی کتابوں میں بھی نہ ملے ہونگے۔

اچھا خود کو بہت بہت پیار۔ اور موقعہ ملے تو کسی کو میری طرف سے بس ایک نظر دیکھ لینا۔ مگر ایک نظر سے زیادہ نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ "ہو گئی رقیب آخر تھی جو رازداں اپنی" والا مضمون ہو جائے۔

تمہاری

سلمیٰ

مسوری ——— ۲۷ جون

اوشا پیاری

کل ہی تمہیں ایک کافی طویل خط لکھ چکی ہوں۔ جو شاید آج ہی کی ڈاک سے نکلے گا اور اس خط کے ساتھ ہی تمہیں ملے گا۔

یہ مختصر سا خط جلدی میں صرف اس غرض سے لکھ رہی ہوں کہ یونیورسٹی کے رجسٹرار کے دفتر سے یہ پوچھ کر لکھو کہ کوئی لڑکی پرائیویٹ کینڈیڈیٹ کی حیثیت سے انٹر کا امتحان دے سکتی ہے یا نہیں۔ یہ بات شمّو معلوم کرنا چاہتی ہے۔ (شمّو یعنی مانھر صاحب کی بیٹی شیام کماری جس کی صحت اچھی نہیں ہے۔ اور اس لئے اس کے پتاجی اس کی پڑھائی چھڑانا چاہتے ہیں۔ مگر وہ چاہتی ہے کہ جب تک صحت بہتر ہو گھر پہ پڑھ کر امتحان دے سکے)

دوسری بات یہ کہ ڈاکٹر صاحب (یعنی اپنے پاپا) سے پوچھنا کہ اگر کسی لڑکی کو ہر مہینے چوتھے دن پیٹ میں سخت درد ہوتا ہو (کبھی بائیں طرف اور کبھی دائیں طرف) اور ایکس رے میں اپنڈکس نہ نکلے اور نہ سٹول اگزامنیشن میں کیچوؤں یا کیڑوں کا ہونا ثابت ہو تو اور نہ پرانی پیچش ہو تو یہ

کیا بیماری ہو سکتی ہے۔ درجنوں ڈاکٹر شمو بیچاری کا معائنہ اور علاج کر چکے ہیں مگر اب تک کوئی صحیح تشخیص نہیں کر سکا۔

اس خط کا جواب واپسی ڈاک سے دینا۔

بہت ہی جلدی میں

تمہاری ——— سلمہ

P.S. "وہ" "نظر پڑے" تو میرا ذکر بالکل نہ کرنا۔ وہ سمجھتے کیا ہیں اپنے آپ کو؟ دس دن ہو گئے مجھے خط لکھے ہوئے اور اب تک جواب میں ایک سطر بھی نہیں آئی۔

مسوری ——— ۳ جولائی

اوشا ڈارلنگ

تمہارے پاپا کی تشخیص سچ مچ صحیح نکلی۔ شمو کا پیٹ کا درد واقعی ہسٹیریا ہی کی ایک نئی شکل نکلا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کا "سب کونشس" یعنی تحت الشعور اپنے پتاجی کی توجہ سوتیلی ماں کی طرف سے ہٹا کر اپنی طرف مبذول کرانے کے لئے یہ تدبیر اختیار کرتا ہے۔ تم کہو گی مجھے یہ کیسے معلوم ہوا۔ تو سنو۔ پچھلے اتوار کا ذکر ہے کہ روپ تو دن گذارنے اپنی سہیلی بیگم نقشبندی کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ (وہ دونوں ایک ہی درزی سے کپڑے سلواتی ہیں۔ اور ہر ہفتے نئے کپڑے ڈیزائن کرنے کے لئے مشترکہ کانفرنس کرتی ہیں!) ماتھر صاحب دن بھر شمو کے پاس بیٹھے کیرم کھیلتے رہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ہی میں روپ سے اس ہفتے کا "سکرین" مانگنے گئی۔ (اس میں خبر چھپی ہے کہ رام کمار بیچارے کو پلوروسی ہو گئی ہے ——— کئی ہفتے سے بیمار ہے اور اس کی جتنی فلمیں بن رہی تھیں سب کی سب لٹک گئی ہیں)۔ تو دیکھا شمو کی حالت بہت بہتر ہے۔ صبح سے درد کا دورہ بالکل نہیں ہوا۔ شام کو باہر جاتے ہوئے ممی نے کہا چلو ماتھر صاحب کے ہاں ہوتے چلیں۔ وہاں گئے تو ماتھر صاحب اور شمو بیٹھے چائے پی رہے تھے اور شمو بالکل خوش و خرم نظر آتی تھی۔ ماتھر صاحب کہنے لگے آؤ بھئی تم لوگ بھی ایک ایک پیالی چائے پیو۔ پھر ہم بھی ٹہلنے چلیں گے۔ اتنے میں روپ آگئیں۔ اور آتے ہی ماتھر صاحب سے کہنے لگیں "چلو سینما چلیں۔ آج رام کمار کے فلم "کلنک" کا آخری دن ہے"۔ ماتھر صاحب نے فرمانبردارانہ لہجے میں کہا "ہاں ہاں۔ ضرور۔ ضرور۔ میں ابھی سیٹوں کے لئے فون کرتا ہوں۔ آج تو شمو کی طبیعت بھی اچھی ہے۔ اسے بھی لے چلتے ہیں"۔ مگر روپ نے ڈانٹ کر کہا "نہیں ڈاکٹر نے اسے چلنے پھرنے کو منع کیا ہے۔ وہ سینما نہیں جائے گی۔ چلو۔ جلدی کرو۔ اپنا اوورکوٹ اٹھاؤ"۔

ماتھر صاحب تو اس وقت ایسے لگ رہے تھے۔ جیسے ماسٹر کے سامنے سکول کا بچہ۔ چپکے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہیٹ سٹینڈ سے اپنا ہیٹ اور کوٹ اتار ہی رہے تھے کہ شمو کے کمرے سے اتنی خوفناک چیخوں کی آواز آئی کہ ہم سب ادھر دوڑے۔ جا کر دیکھا کہ درد کے مارے بیچاری بستر پر لوٹ رہی ہے اور "ہائے میں مر جاؤں گی۔ ہائے میں مر جاؤں گی، پتاجی" چلا رہی ہے۔ میں نے چھو کر دیکھا۔ ہاتھ پاؤں ایک دم ٹھنڈے برف مگر ماتھے پر پسینہ چھوٹا ہوا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں اوپر کو چڑھی ہوئی۔ اور دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو زور سے دبائے ہوئے۔ "سلمہ بی بی"، ماتھر صاحب چلائے "ذرا ڈاکٹر شرما کو فون تو کرو۔" اور پھر بہت ڈرے ڈرے انداز میں بیوی کی طرف دیکھ کر آہستہ سے "اب سینما تو......"

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ روپ نے ان کی بات کاٹ کر پیر پٹختے ہوئے کہا "وہ تو میں پہلے ہی جانتی تھی۔ تو آپ رہیے اپنی بیٹی کے پاس۔ میں جا رہی ہوں۔ کیوں، سلمہ، چلتی ہو؟"

رام کمار کا فلم دیکھنے کا شوق تو مجھے بھی بہت تھا مگر شمّو کے خیال سے میں نے کہا "جی — میں پھر کبھی دیکھ لوں گی۔ آج تو شمّو کی طبیعت اچھی نہیں ہے ..... مگر ممی نے کہا "کوئی بات نہیں۔ میں یہاں ٹھہرے جاتی ہوں۔ تم پکچر دیکھ آؤ روپ کے ساتھ۔"

سو میں اور روپ "کلنک" دیکھنے گئے۔ رام کمار کے پچھلے فلم "خواب" کے بارے میں تو میں پہلے ہی لکھ چکی ہوں۔ مگر "کلنک" میں تو اس نے کمال ہی کر دیا ہے۔ ایک شرابی شاعر کے کردار کو ایسی خوبی سے نبھایا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ تم تو جانتی ہو کہ مجھے عام طور سے ہندوستانی پکچرز نہیں بھاتیں۔ (ان میں وہ ہالی وڈ کی شان و شوکت اور گلیمر بھلا کہاں؟) مگر رام کمار کی ہر فلم میں اور کچھ ہو یا نہ ہو، اس کا اپنا کام اتنا اچھا ہوتا ہے کہ میری جیسی "سوپر کریٹک" (SUPER CRITIC) بھی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ "کلنک" میں کمزوری ہے تو صرف یہ کہ وہ بھینگی آنکھوں والی نیلما اس میں ہیروئن کا کام کرتی ہے۔ ایک سین میں بھی تو رام کمار کے سامنے آنے کے قابل نہیں ثابت ہوتی۔ نہ جانے اتنا بڑا اور مشہور اور قابل ایکٹر کیسے نیلما جیسی تھرڈ ریٹ ایکٹرسز کے ساتھ کام کرنے کے لئے راضی ہو جاتا ہے۔ فلم کے دوران میں روپ کہنے لگیں "کیوں سلمہ، اگر کسی لڑکی کو رام کمار جیسا خوبصورت اور اچھا شوہر مل جائے تو کیسا ہو؟ کیا اُسے خوشی اور فخر سے شادی مرگ نہ ہو جائے؟" میں نے کہا اس وقت تو خود رام کمار کی جان کی خیر منانی چاہیئے۔ بیچارہ پلوریسی جیسے خطرناک مرض کا شکار ہو رہا ہے۔ اس پر روپ نے چپکے سے میرے کان میں کہا "میں نے تو آج ہی منّت مانی ہے کہ رام اچھا ہو گیا تو ایک دن برت رکھوں گی اور دس روپے دان دونگی"۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ لو بھئی یہ تو پوری طرح "فین کریز" (FAN CRAZE) میں مبتلا ہیں!

میں بھی کتنی عجیب ہوں۔ چلی تھی شمّو کی بیماری کا حال لکھنے اور کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہاں تو اُس رات کو جب سینما سے ہم واپس آئے تو دیکھا کہ شمّو (جسے ہم درد سے کراہتا اور بلبلاتا چھوڑ گئے تھے) پلنگ پر بیٹھی ماسٹر صاحب اور ممی کے ساتھ رمی کھیل رہی ہے۔ بعد میں ممی نے بتایا کہ روپ کے سینما چلے جانے کے بعد چند منٹ تک تو شمّو درد کی شکایت کرتی رہی مگر اس کے بعد آہستہ آہستہ درد غائب ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ جب ڈاکٹر شرما آئے اور دو تین منٹ کا معائنہ کرنے اور اپنی سولہ روپے فیس لینے آئے تو شمّو کا درد بالکل جاتا رہا تھا۔

جب ہی تو میں نے کہا کہ تمہارے پاپا کی تشخیص سولہ آنے ٹھیک نکلی۔ ان کو یہ سب سُنا دینا۔

یہاں بارشوں کے بعد موسم میں کافی خنکی آچلی ہے۔ اس سیزن یہاں بڑی رونق ہے۔ بمبئی سے بڑے سمارٹ لڑکوں کی ایک ٹولی کی ٹولی آئی ہوئی ہے۔ جن سے سکیٹنگ رنک SKATING RINK میں اکثر ملاقات کیا سچ مچ مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ ہاں۔ میں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ تین چار بار دھڑام سے گرنے کے بعد میں رولر سکیٹنگ کی ماہر ہو گئی ہوں۔ سکیٹنگ ہے مزیدار مشغلہ۔ ڈانسنگ کا بھی مزا آتا ہے اور ورزش کی ورزش ہو جاتی ہے۔ تم بھی اس سال یہاں آجاتیں تو بڑا مزا آتا۔ اکیلی تو میں کسی سے بات کرتے بھی ڈرتی ہوں۔ مگر تم نہ جانے کیوں اس غضب کی گرمی سے لکھنؤ چپکی ہوئی ہو۔ اور وہ جناب۔ ان کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ ایک نہایت روکھے اور غیر شاعرانہ قسم کے اکھڑ خط میں لکھتے ہیں "تمہیں مسوری کی بورژوا ٹھنڈک مبارک ہو۔ ہم تو لکھنؤ کی پرولتاری گرمی ہی میں خوش ہیں"۔ یہ میرے تین خطوں کا جواب ملا ہے۔ جن میں میں نے مسوری آنے کے لئے اصرار کیا تھا۔ آئے بڑے پرولتاری بن کے! جل ہی تو گئی میں یہ پڑھ کر۔

باقی آئندہ۔ اور کچھ لکھا تو خط کے بجائے پورا ناول نہ بن جائے اور خواہ مخواہ تمہیں پندرہ فیصدی رائلٹی دینی پڑے۔

تمہاری —— سلمہ

P.S. تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا کہ اچھی خاصی فلاسفی اور سائیکالوجی چھوڑ کر (جو تمہارے محبوب مضامین تھے) تم اب اکنامکس میں ایم۔ اے کرنا چاہتی ہو۔ جب "وہ" تمہیں بھی مارکسزم پر لکچر دے دیکر پاگل کر دیگا تب تمہیں اپنی حماقت کا احساس ہو گا۔ خیر تمہاری مرضی "ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں"۔

مسوری ـــــــ ۱۱ر جولائی

اُوشا

یہ سپیشل براڈ کاسٹ مسوری سے کیا جا رہا ہے۔ ایک اہم خبر بلکہ عماً اہم سماچار سنئیے۔

روپ کا بنور لجیا ایک بیک جا رہا ہے۔

شمی کا پُر اسرار پیٹ کا درد بھی غائب ہو گیا ہے۔

روپ اور مسز نقشبندی نے آدھی آدھی درجن نئے ڈیزائن کے چولی بلاؤز سِلنے کے لئے دے دیئے ہیں۔

میں بھی مسوری کی بورڈم میں اب کسی قدر دلچسپی پیدا ہونے کی امید کر رہی ہوں۔

یہ کایا پلٹ کیوں بھلا؟ اس لئے کہ رام کمار آنے والا ہے۔ رام کمار۔ فلمی دنیا کا محبوب ترین ہیرو۔ مسوری آ رہا ہے۔ تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے۔ اور جانتی ہو کہاں ٹھہرے گا۔ نہیں سیوائے میں نہیں۔ نہ ہیک مینرز میں۔ ہوٹل میں تو اس کے متوالے (اور متوالیاں!) اُس کا تِکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ اس لئے وہ ماتھر صاحب کے ہاں ٹھہرے گا۔ یہ کیسے، یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ ماتھر صاحب کے چچا زاد بھائی ایک اور ماتھر بمبئی میں سنٹرل گورنمنٹ کے سپلائی کے دفتر میں کنٹرولر یا ڈائرکٹر یا کوئی چیز ہیں۔ وہ جس بلڈنگ میں رہتے ہیں اسی میں رام کمار بھی رہتا ہے۔ اس لئے ان کی کافی ملاقات بلکہ دوستی ہے۔ جب رام کمار کو ڈاکٹروں نے تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے چند روز مسوری جانے کو کہا تو ان بمبئی والے ماتھر نے اپنے کزن یعنی ہمارے والے ماتھر صاحب کو لکھا۔ وہ تو بیچارے پہلے کافی نروس ہوئے۔ بولے "ارے بھئی یہ فلم والے کافی بد دماغ ہوتے ہیں۔ لاکھوں روپے کماتے ہیں نا۔ نہ جانے یہ مسٹر رام کمار کس قسم کے آدمی ہیں۔ ہمارے گھریلو ماحول میں فٹ اِن ہوں یا نہ ہوں" مگر روپ نے ڈانٹ کر کہا "آپنے بھی دونا بیچارے کو۔ بیماری سے حال ہی میں اُٹھا ہے۔ ہوٹل میں ٹھہریگا تو ایک منٹ چین نہیں ملے گا۔ یہاں ہم سب مل کر اچھی طرح سے اس کی دیکھ بھال کر سکتے ہیں" اور ماتھر صاحب نے فوراً بات بدل کر کہا "ہاں۔ ہاں۔ میں خود بھی کہتا ہوں کہ ضرور بلانا چاہیئے۔ اور پھر رام کمار تو اپنے یو۔ پی ہی کا رہنے والا ہے۔ اور سکرین پر دیکھنے سے کافی شریف نظر آتا ہے۔"

اور سو رام کمار اگلے ہفتے آ رہا ہے اور مسوری کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی ہے .... اور مجھے روپ کے ہاں ایک امپورٹنٹ کانفرنس کے لئے جانا ہے جو انٹیریر ڈیکوریشن INTERIOR DECORATION کے سلسلے میں ہو رہی ہے ...... اس لئے باقی آئندہ۔ رام کمار کے آنے پر۔

تمہاری ـــــــ سلمہ

P.S. تمہارے اکنامکس کے پروفیسر صاحب" ملیں اور میرے بارے میں پوچھیں تو کہنا میں کافی مصروف رہی اس لئے ان کے خط کا جواب نہ دے سکی۔ اگلے ہفتے فرصت ملی تو خط لکھونگی۔

۲۳ر جولائی

اوشا پیاری۔

معاف کرنا اتنے دن سے تمہارے خط کا جواب نہ دے سکی۔ کیا کروں پچھلے دس دن سے اتنا اکسائٹمنٹ رہا ہے کہ تو بہ ہی بھلی۔ رام کمار کیا آیا ہے سارے مسوری اور خصوصاً ہمارے پڑوس میں ایک ہلچل مچ گئی ہے۔ آج ماتھر صاحب کے ہاں ڈنر تو کل مسز نقشبندی

کے ہاں لنچ تو پرسوں ہمارے ہاں چلئے۔ روز پکنک۔ کبھی کیمپٹی فال تو کبھی موسی فال۔ کبھی چنڈال چوٹی تو کبھی سنی بینک۔ غرض ایک گڈبڑ مچی ہوئی ہے۔

تم نے رام کمار کے بارے میں پوچھا ہے کہ سچ مچ زندگی میں کیسا لگتا ہے۔ تو ایمان کی بات یہ ہے کہ پہلے پہلے اسے دیکھ کر مجھے تو کافی ڈس اپائنٹمنٹ DISAPPOINTMENT ہوا۔ خاصا سانولا رنگ (فلموں میں تو میک اپ ہوتا ہے نا)۔ سر پہ بال غائب ہونا شروع ہوگئے ہیں (فلموں میں نقلی بالوں کی وگ پہنتا ہے)۔ اور آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کا بڑا انٹیلکچول INTELLECTUAL قسم کا چشمہ۔ نیفسی سوٹوں کے بجائے اکثر ایک نہایت موٹی ٹویڈ کا کوٹ پہنے رہتا ہے۔ اور دن میں تو پتلون پہ صرف ایک کالی جواہر جیکٹ۔ (اس کی دیکھا دیکھی مسوری کے تمام فیشن ایبل نوجوانوں نے کالی جواہر جیکٹیں سلوا لی ہیں)۔ ایکٹر کے بجائے ادیب یا چھوٹا موٹا پروفیسر (وہ بھی اکنامکس کا) معلوم ہوتا ہے۔ باتیں بھی کبھی کبھی اسی قسم کی کرتا ہے۔ ہاں اس کی آنکھوں میں وہی مقناطیسی چمک ہے جو سکرین پہ اس کے کلوزاپ میں نظر آتی ہے اور اس کی آواز میں وہی رومانی گہرائی ہے جو سکرین پہ سنائی دیتی ہے (یاد ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی آواز حلق سے نہیں دل سے نکلتی ہے) اور اس کے ہونٹوں پہ وہی مسکراہٹ ہے جو لاکھوں لڑکیوں کے دل کی دھڑکنوں کو تیز کر دیتی ہے۔

ایک دن روپ نے بڑے رومانی انداز میں پوچھا "کیوں، رام، (پہلے دن وہ مسٹر رام کمار کہتی تھیں، دوسرے دن رام جی۔ اور تیسرے دن سے صرف رام)۔ تمہیں تو بچپن ہی سے ایکٹنگ کا شوق رہا ہوگا؟"

اور اس نے نہایت غیر رومانی انداز میں کہا "نہیں، مسز ماتھر۔ (روپ اسے لاکھ کہتی ہیں کہ میں تم سے اتنی بڑی تھوڑا ہی ہوں تم مجھے صرف روپ کہا کرو۔ مگر وہ برابر انہیں مسز ماتھر ہی کہتا ہے) بچپن میں تو میں ریل کے انجن کا ڈرائیور بننا چاہتا تھا۔ اور اس کے بعد اپنے پتا جی کی طرح وکیل۔ مگر کالج میں مجھے اکنامکس میں دلچسپی ہوگئی۔ اسی لئے اکنامکس میں ایم اے کر رہا تھا جب پڑھائی چھوڑ کر بمبئی جانا پڑا۔ اب تک تو میں مارکسزم پہ تھیسس لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی بھی ہو جاتا۔"

اکنامکس! مارکسزم! سچ کہتی ہوں ایک ایکٹر کی زبان سے یہ باتیں سن کر میں جل ہی تو گئی۔ (شاید اس لئے اور بھی کہ یہ باتیں پہلے کی سنی ہوئی ہیں۔) میں نے کسی قدر طنز بھرے لہجے میں پوچھا "تو، مسٹر رام کمار (وہ برابر مجھ سے کہتا ہے کہ مانا میرے بال غائب ہو رہے ہیں مگر میں تم سے عمر میں اتنا بڑا نہیں ہوں تم مجھے صرف رام کہا کرو۔ مگر میں مسٹر رام کمار ہی کہتی ہوں)۔ پھر آپ نے مارکسزم پہ ریسرچ چھوڑ کر فلم لائن کیسے اختیار کر لی؟ آرٹ کی خدمت کا جذبہ ایک دم کیسے پیدا ہو گیا؟"

"آرٹ کی خدمت؟" میرے الفاظ دہرا کر وہ بڑے زور سے ہنسا "فلم لائن میں آرٹ کی خدمت کون بیوقوف کرتا ہے؟ اور سچ پوچھو تو تمہارے کالجوں یونیورسٹیوں میں بھی تعلیم کی خدمت کون کرتا ہے؟ ہم سب...... ایکٹر ہوں یا پروفیسر...... صرف اپنے پیٹ کی خدمت کرتے ہیں۔ میں ایکٹر اس لئے بنا کہ پتا جی سورگباش ہوگئے اور ماتا جی میری یونیورسٹی کی پڑھائی کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ ان دنوں میں نے ایک سرکاری دفتر میں کلرکی کے لئے درخواست دے رکھی تھی اور اپنا زیادہ تر وقت کافی ہاؤس میں گذارا کرتا تھا۔ وہاں ایک دن رستم ایرانی سے ملاقات ہوگئی۔ وہ نئے چہروں کی تلاش میں لکھنؤ آیا ہوا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ کہو ایکٹر بنوگے؟ میں نے کہا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہوار سے کم نہ لونگا۔ کیونکہ ڈیڑھ سو کی نوکری تو مجھے یہاں بھی مل سکتی ہے۔ اس نے کہا۔ منظور ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پانچسو روپے ماہوار تک دینے کو تیار تھا...... خیر اگلے کنٹراکٹ میں میں نے کسر پوری کر لی...... اور اس طرح میں انسان سے ایکٹر بن گیا۔" یہ کہہ کر وہ خوب زور سے ہنسا۔ اتنے زور سے کہ مجھے اس ہنسی میں ایک عجیب کھوکھلاہٹ معلوم ہوئی جیسے وہ اصلی نہ ہو، نقلی ہو، فلمی ہو......

جیسے اس ہنسی کی تہہ میں ایک گہری مایوسی چھپی ہوئی ہو۔

اور شمی جواب تک خاموش بیٹھی اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے رام کمار کو تک رہی تھی بولی " کیوں، رام جی۔ کیا ایکٹر انسان نہیں ہوتا؟"

" نہیں " کچھ دیر کے توقف کے بعد وہ بولا " ایکٹر انسان نہیں ہوتا۔ یا یہ کہنا چاہیئے۔ صرف آدھا انسان ہوتا ہے۔ آدھا انسان اور آدھا مشین ......" اور پھر جیسے خود اپنے آپ سے بات کہہ رہا ہو یا بہ آوازِ بلند سوچ رہا ہو " آدھا انسان اور آدھا مشین ؟ یہی ایکٹر کی ٹریجڈی ہے۔ وہ بھی دل اور دماغ رکھنے والا گوشت پوست کا انسان ہوتا ہے مگر اس سے کام لیا جاتا ہے ایک جذباتی مشین کا۔ بٹن دبایا وہ بملا سے محبت کرنے لگا۔ بٹن دبایا وہ کملا پر مرنے لگا۔ بٹن دبایا وہ نیلما پر فریفتہ ہو گیا۔ بٹن دبایا وہ آوارہ شہزادہ بن گیا۔ بٹن دبایا وہ رنگیلا شاعر بن گیا۔ بٹن دبایا وہ بھکاری گویّا بن گیا۔ بٹن دبایا وہ سنت گیانیشور بن گیا۔ بٹن دبایا وہ دیوداس بن گیا۔ بٹن دبایا وہ پورن بھگت بن گیا۔ بٹن دبایا وہ گانے لگا۔ بٹن دبایا وہ ہنسنے لگا۔ بٹن دبایا وہ رونے لگا...... اور پھر اس سے امید کی جاتی ہے کہ اس کی آوارگی میں بھی اصلیت ہو اور اس کی پارسائی میں بھی۔ اُس کی ہنسی بھی قدرتی ہو اور اس کا رونا بھی۔ وہ شراب بھی سچ مچ کی پیئے اور زہر بھی سچ مچ کا کھائے۔ اُس سے اُمید کی جاتی ہے کہ جب سکرین پر عشق کرے تو جذبات کی گہرائی میں ڈوب جائے مگر سٹوڈیو سے نکلتے ہی پاکباز برہمچاری اور مہاتما بن جائے۔ یہ سب جذباتی قلابازیاں کھانا یا تو کوئی سوپر مین SUPER MAN کر سکتا ہے جو معمولی جذبات و محسوسات سے اُونچی سطح پر رہتا ہو یا آدھا انسان یعنی ایکٹر..... وہ بدقسمت مشین جس کی ایکٹنگ میں زندگی گھلی ہوئی ہوتی ہے اور جس کی زندگی میں ایکٹنگ شامل ہو جاتی ہے "

بڑی ہی دلچسپ ہوتی ہیں اس کی باتیں۔ فلموں میں جو ڈائلاگ اس سے بلوائے جاتے ہیں اُن سے کہیں زیادہ دلچسپ، بس جی چاہتا ہے بیٹھی سُنتی رہوں۔ روز رات کو روپ کے ڈرائنگ روم میں بارہ ایک بجے رات تک بیٹھک ہوتی ہے۔ تب ہم لوگ اپنے گھر لوٹتے ہیں۔ سویرے ہی ناشتے کے فوراً بعد یہ سلسلہ پھر چل پڑتا ہے۔

ہاں۔ ایک بات لکھنا تو بھول ہی گئی۔ شمّی کا پیٹ کا درد اور روپ کا سر کا درد دونوں جاتے رہے ہیں۔ پچھلے دو ہفتے سے ایک بار بھی دورہ نہیں پڑا۔ جانتی ہو کس کے علاج سے؟ رام کمار کے۔ وہ اچھا ایکٹر ہونے کے علاوہ امیچور ڈاکٹر بھی تو ہے۔ ہومیو پیتھی کا بہت ہی قائل ہے۔ کہتا ہے اس کی بلڈ رسی کو صرف ہومیو پیتھی کی دواؤں نے دُور کیا ورنہ ایلوپیتھک ڈاکٹروں نے انجکشن دیتے دیتے اس کا بُرا حال کر دیا تھا۔ بڑے مزے سے ایک دن کہنے لگا " اگر دو چار اور انجکشن لگ جاتے تو مجھ میں اور چھلنی میں کوئی فرق نہ رہتا " ہاں تو اب وہ ہومیو پیتھی کا نہ صرف زبانی پروپگنڈا کرتا ہے بلکہ ہومیو پیتھی کی کتابیں پڑھتا ہے اور دوائیں تقسیم کرتا ہے۔ اس کے سامان میں ایک کالا چمڑے کا بکس ہے جو ہومیو پیتھی کی ننّھی ننّھی شیشیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہم لوگ اسے اکثر ان دواؤں کے بارے میں چھیڑتے رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے " ارے بھئی آج کھانے پر کوئی میٹھی چیز نہیں ملی لاؤ ہومیو پیتھی دوا کی ایک پڑیا کھالیں ——— " کوئی کہتا ہے " یہ تو رام کے ہاتھ کا اعجاز ہے ورنہ ان پڑیوں میں پسی ہوئی شکر ہی تو ہے " مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی دی ہوئی پڑیوں سے روپ کا بخور لجیا جاتا رہا ہے اور شمّی کو بھی اب درد کے دورے نہیں پڑتے۔ مگر تم یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ رام کی موجودگی ہی ان دونوں کے لئے دوا ثابت ہوئی ہے۔ اور اِس مسرّت آمیز ہنگامہ خیزی میں وہ اپنی پُرانی تکلیفوں کو بھول گئی ہیں۔

اور تو اور ماتھر صاحب بھی تو رام کے سخت گرویدہ ہو گئے ہیں۔ اس لئے کہ اُس کے پاس ان کے انفیریورٹی کومپلکس کا علاج بھی ہے۔ کئی کئی گھنٹے وہ اُن سے اُن کے ساتھ شطرنج کھیلتا رہتا ہے۔ اور ماتھر صاحب ٹھہرے شطرنج کے دھنی۔ رام کا بیان ہے کہ وہ بمبئی کے دس بارہ بہترین شطرنج کے کھلاڑیوں میں سے ہے مگر ماتھر صاحب اس سے بھی اچھا کھیلتے ہیں۔ شطرنج کھیلتے وقت ان کا احساس کمتری بالکل جاتا رہتا ہے۔ اس

میدان میں وہ کسی سے نہیں ڈرتے، کسی سے نہیں دبتے۔ بلکہ شطرنج کھیلتے وقت ان میں ایک نئی اور عجیب فاتحانہ شان پیدا ہوجاتی ہے۔ جب وہ اپنے مہروں کو آگے بڑھاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی جرنیل اپنی فوجوں کو مورچوں پر لگا رہا ہے۔ اُس وقت وہ اپنی اوجیڑ عمر، گنجے سر، چیچک کے داغ، پائیوریا کی بو، سب کو بھول جاتے ہیں۔ شاید اسی لئے انہوں نے روپ کو شطرنج سکھانے کی بہت کوشش کی اور شاید اسی لئے روپ نے شطرنج میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی۔

ہاں تو یہ ہے آج کل اپنا لائف پیٹرن LIFE PATTERN دور سیوائے ہوٹل کا گھڑیال بارہ بجا رہا ہے ...... اور سویرے ہی ہمیں پکنک پر جانا ہے۔ اس لئے اب یہ قصہ ختم ہی کرنا چاہیئے۔

تمہاری ——— سلمہ

مسوری ——— ۸ اگست

ڈیر اوشا

معاف کرنا تمہارے خط کا جواب اتنے دنوں بعد دے رہی ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں بہت پریشان ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں اور کس کو اپنی پریشانی سناؤں۔ تم مسوری ہوتیں تو پرانے دنوں کی طرح تمہارے سامنے اپنا رونا رو کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی۔ اب سوچتی ہوں خط ہی لکھ کر بھڑاس نکالوں۔

یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ پاپا لکھنؤ سے مجھے اس لئے لائے تھے کہ میں احمد کو بھول جاؤں۔ مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میری قسمت پھوڑنے کے لئے اس کے علاوہ دوسری سازشیں بھی ہو رہی ہیں۔

کل ہمارے ہاں پاکستان سے ایک مہمان آئے ہیں۔ چودھری حنیف اللہ۔ پاپا اُن کو ریٹر ڈ نائزنگ طریقے سے "ہیلو مائی بائے" ہی کہہ کر پکارتے ہیں مگر عمر ڈیڑھ تیس چالیس سے کم نہ ہوگی۔ انگریزی میں دستخط کر لیتے ہیں اور اخبار ہاتھ میں اُلٹا نہیں پکڑتے۔ بس تعلیم اتنی ہی ہے۔ پہلے کانپور میں چمڑے اور کھالوں کی تجارت کرتے تھے۔ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ایک ایک سال میں ان کی فرم کئی کئی لاکھ کی کھالیں ولایت اور امریکہ بھیجتی تھی۔ (کھالوں کی تجارت کرتے کرتے ان حضرت کی اپنی کھال بھی کافی موٹی ہوگئی ہے۔ کوئی مذاق کرو تو نشانہ پہنچتا ہی نہیں اور چھوٹی موٹی سنب (SNUB) کو تو شربت کی طرح پی جاتے ہیں) جون ۴۷ء میں جیسے ہی ملک کی تقسیم کا اعلان ہوا انہوں نے چپکے سے اپنی فرم اور جائداد بیچ ڈالی اور اگست تک سارا روپیہ پاکستان پہنچا دیا۔ اب لاہور میں سرکاری ٹھیکوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ پاپا ان کے باپ کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لئے ان کے بلانے سے یہ حضرت ہندوستان بلکہ مسوری تک تو آگئے ہیں مگر ہر وقت جان اور مال کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ (مال کا خطرہ اس لئے کہ ۴۸ء تک کا کئی لاکھ انکم ٹیکس دینا ہے اور اگر انکم ٹیکس والوں کو معلوم ہوگیا تو ڈر ہے کہ کہیں گرفتار نہ کر لئے جائیں جان کا خطرہ تو ہر وقت ہی لگا رہتا ہے۔ ہندوستان میں ہمارے جیسے جو مسلمان رہ گئے ہیں اُن کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے ہم قربانی کے بکرے ہیں جن کو آج یا کل ہندو اکثریت کے ہاتھوں ذبح ہونا ہے۔ کافی بیوقوف آدمی ہیں۔ اور ان کی حرکتیں اور باتیں دلچسپی کا سامان بن سکتی تھیں مگر وہ یہاں "امیدوار" کی حیثیت سے بلائے گئے ہیں۔ یعنی پاپا مجھے ان کے ہاتھ بیچنا چاہتے ہیں۔ (اُن کو اُمید ہے کہ حنیف صاحب کے اثر سے وہ بھی پاکستان پہنچ کر جائداد یا بزنس وغیرہ کچھ حاصل کرلیں گے)۔ اور مجھے غصہ تو اس بات پر آتا ہے کہ ان حنیف صاحب کا GENERAL ATTITUDE ہماری طرف ایسا ہے جیسے ہم پہ بڑا احسان کر رہے ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ کبھی سوچتی ہوں کہ گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ کہیں نوکری کر کے گذارہ کروں۔ مگر اس قصائی کے ہاتھوں بکنے سے تو بچ جاؤں۔ مگر ایسی باتیں کہانیوں اور ناولوں میں تو آسان معلوم ہوتی ہیں۔ اصل زندگی میں مشکل نظر آتی ہیں۔ گھر چھوڑ کر جاؤں تو کہاں جاؤں۔ کہاں ٹھہروں۔ نوکری کیسی اور کہاں تلاش کروں۔ بی۔ اے

پاس لڑکیاں تو سینکڑوں کی تعداد میں آج کل ماری ماری پھرتی ہیں۔ کسی سکول میں اُستانی ہو بھی گئی تو ساٹھ ستّر روپے پر گزارہ کیسے ہوگا؟ اور پھر ماں باپ کو ناراض اور DEFY کروں بھی تو کس کے سہارے پر؟ دنیا میں میرا ہے کون؟ احمد کو اپنی اکنامکس اور مارکسزم سے کب فرصت ملتی ہے جو کسی کے جذبات کا خیال کریں۔ اور میں اتنی CHEAP تو نہیں بننا چاہتی کہ زبردستی کسی کے سر پڑ جاؤں۔ غرض رات دن اسی اُدھیڑ بن میں گزرتے ہیں۔ دن بھر حنیف صاحب کی بکواس سُننی پڑتی ہے۔ جو زیادہ تر کھالوں اور جُوتوں کے بارے میں ہوتی ہے۔ (کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ وہ ہر ایک کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس کی چمڑی ادھیڑ لی جائے تو اس میں سے کتنے جُوتے بن سکتے ہیں)۔ اس کے بعد ممی اور بھائی جان کے لیکچر سُننے پڑتے ہیں کہ ہندوستان میں تو مسلمان لڑکیوں کو اب اچھے لڑکے مل ہی نہیں سکتے کیونکہ جتنے مالدار، تعلیم یافتہ، عہدے دار مسلمان نوجوان تھے وہ سب پاکستان چلے گئے ہیں۔ اور پھر پاپا INDIRECTLY ہر وقت حنیف کی تعریف کے پل باندھتے رہتے ہیں۔ لاکھوں کی بزنس ہے۔ کروڑوں کی جائداد ہے۔ لاہور میں ایک جج کا دو منزلہ بنگلہ الاٹ ہو گیا ہے۔ ایک سینما مل گیا ہے۔ ایک جُوتوں کا کارخانہ ہے۔ گورنمنٹ سے ٹھیکے ملتے رہتے ہیں۔ مری میں ایک خوبصورت کاٹیج ہے۔ تین موٹریں ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرض، میری جان، قیمت اچھی مل رہی ہے۔ اس کو کیا کیا جائے کہ "پر طبیعت اِدھر نہیں آتی"۔ حنیف صاحب تاجر چرم کے ہاتھوں اپنی چمڑی اُدھڑوانا منظور نہیں۔

دو دن سے ناظر صاحب کے ہاں گئی ہوں نہ رام کمار سے ملاقات ہوئی ہے۔ وہ لوگ بھی کیا کہتے ہوں گے کہ سلمہ کو کیا ہو گیا ہے۔ مگر پاپا اور ممی کی خوشنودی کے لئے ہر وقت حنیف صاحب کی خاطر داری کرنی پڑتی ہے نا۔ کیا کیا جائے۔

اتنا کچھ تمہیں لکھنے کے بعد دل کسی قدر ہلکا ہوا ہے۔ دیکھو، شاید کوئی صورت نکل آئے۔ جواب جلد دینا۔ اس گھٹن اور جلن میں تمہارے خطوں ہی سے کسی قدر سکون ملتا ہے۔

تمہاری پریشان اور دل شکستہ

سلمہ

مسوری ——— ۱۷ اگست

اوشا پیاری

سب سے پہلے تو خوشخبری سُن لو۔ چودھری حنیف اللہ صاحب تاجر چرم و ٹھیکیدار گورنمنٹ پاکستان کل لاہور واپس جانے کے لئے سامان باندھ رہے ہیں۔ پاپا اور ممی اور بھائی جان تینوں از حد ملول اور دل شکستہ ہیں اس لئے کہ حنیف صاحب نے مجھ سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ اور میں خوش ہوں...... اتنی خوش کہ خوشی سے پھٹی جا رہی ہوں......

یہ ساری کایا پلٹ ہفتے بھر میں کیسے ہوئی یہ بڑی دلچسپ کہانی بلکہ فلمی سینیریو ہے۔ اور اس کا ہیرو ——— رام کمار!

سنو۔ ہوا یہ کہ جب دو دن تک میں ناظر صاحب کے ہاں نہیں گئی تو تیسرے دن کیا دیکھتی ہوں کہ رام کمار صاحب ہمارے ہاں چلے آ رہے ہیں۔ اُس وقت پاپا اور ممی اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے اور بھائی جان حنیف صاحب کو لے کر ڈاک خانے گئے ہوئے تھے۔ (حنیف صاحب کو اپنی بزنس کے سلسلے میں کوئی اہم تار دینا تھا اور ایسے کام وہ کبھی نوکروں پر نہیں چھوڑتے)۔ میں گول کمرے میں بیٹھی ریڈیو کا ڈائل گھما رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور رام کمار صاحب "ہیلو، سلمہ" کہہ کر داخل ہوئے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے "کہو طبیعت تو اچھی ہے۔ تم تو ایسی لگتی ہو جیسے برسوں کی بیمار ہو۔ کہو تو اپنے کالے بکس میں سے ایک شکر کی پڑیا دے دوں...... یا کوئی ایموشنل بخار چڑھا ہوا ہے۔ سنا ہے کوئی پاکستانی ڈان جوان آئے ہوئے ہیں۔" یہ باتیں اس نے کچھ ایسی ملائمت، ایسی ہمدردی اور ایسے پُر مذاق طریقے سے کیں کہ بے اختیار میں رو پڑی۔

"ارے ارے۔ یہ کیا۔ تم تو بالکل بچّی نکلیں۔ کہو تو پریشانی کیا ہے؟ پھر تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے اُس کو حنیف اللہ کی شانِ نزول بتا ہی دی۔

"ہوں" اُس نے سوچتے ہوئے کہا "یہ تو بڑی گڑبڑ ہے۔ پھر کیا کیا جائے؟"

اور اُس وقت نہ جانے کہاں سے ایک DARING خیال میرے دل میں آیا اور میں نے بک دیا "اس مشکل کو آپ ہی آسان کر سکتے ہیں، رام صاحب؟"

"میں؟" وہ گھبرا کر بولا "وہ کیسے؟"

پہلے تو میں ہچکچائی مگر پھر میں نے ہمّت کر کے کہہ ہی دیا "اگر آپ .... جھوٹ موٹ .... چند روز کے لئے .... میرا مطلب ہے ——— کہ ——— مجھ میں دلچسپی لینے لگیں .... تو حنیف صاحب SHOCK ہو کر بھاگ جائیں گے"۔

"اوہ!" اور اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں جیسے کسی بچّے کو کوئی بڑا دلچسپ کھلونا کھیلنے کو مل جائے "یہ تو آسان بات ہے۔ اور جھوٹ موٹ کیا تم میں سچ مچ دلچسپی لینا بھی کوئی مشکل نہیں ہے"۔ یہ کہہ کر وہ ہنس پڑا اور میں نے سوچا وہ مذاق کر رہا ہے ورنہ جس پر ہندوستان کی خوبصورت سے خوبصورت لڑکیاں جان دیتی ہیں وہ بھلا مجھ میں دلچسپی کیسے لینے لگا۔ مگر اس نے کہا "اب تم فکر نہ کرو۔ تاجر جرم کو مسوری سے بھگانا میرے ذمّے ہے"۔

"تو پھر کب سے آپ ......؟ میں پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ ناٹک کب سے شروع ہوگا۔

میری ہکلاہٹ اور ہچکچاہٹ کے باوجود وہ میرا سوال سمجھ گیا اور بولا "کب سے کیا۔ آج سے۔ ابھی سے"۔

اُسی وقت باہر سے باغ کا دروازہ کھُلنے اور بند ہونے کی آواز آئی اور پھر حنیف اور بھائی جان کے جوتوں کی چرمراہٹ۔ رام کمار اپنی کرسی سے اُٹھا اور میری کُرسی کے ہتھے پر بیٹھ گیا اور بڑی محبّت سے میرے بالوں پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔

دروازہ کھُلا اور حنیف صاحب اور بھائی جان داخل ہوئے۔ میرا رنگ تو فق ہو ہی گیا کہ اب کیا ہوگا؟ مگر رام بھی گھبرا گیا اور گڑبڑا کر میرے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے چور چوری کرتے ہوئے پکڑا جائے۔ (بعد میں معلوم ہُوا کہ یہ سب اس کی ایکٹنگ تھی۔) اور کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بھائی جان کی طرف ہاتھ بڑھایا "اوہ ہیلو سلیم۔ کہو کیسے ہو۔ کئی دن سے ملے نہیں"۔ اور پھر حنیف کی طرف دیکھ کر "بھئی اپنے دوست سے تو ملاؤ"۔

بھائی جان نے اپنے غصّے اور خفّت کو کنٹرول کرتے ہوئے ان دونوں کا تعارف کرایا "آپ ہیں ہمارے دوست حنیف اللہ صاحب۔ پاکستان سے آئے ہیں۔ اور یہ ہیں مسٹر رام کمار۔ بڑے مشہور فلم سٹار۔ ان کو تو سکرین پر آپ نے دیکھا ہی ہوگا"۔

حنیف نے بددلی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "اوہ ایکٹر؟ اور جس طرح اس نے "ایکٹر" کا لفظ ادا کیا اس میں حقارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی "نہیں میں نے نہیں دیکھا۔ میرا اپنا سینما ہے۔ مگر میں فلمیں نہیں دیکھتا۔ اول تو فرصت نہیں ملتی اور پھر ...... کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے"۔

"اچھا ہی کرتے ہیں آپ فلموں میں دھرا ہی کیا ہے۔ فلم بنانے سے جوتا بنانا کہیں زیادہ دلچسپ کام ہے"۔ اور پھر فوراً ہی بھائی جان سے مخاطب ہو کر "کہو سلیم سکیٹنگ رنک چلتے ہو؟"

بھائی جان نے منہ بنا کر کہا "نہیں۔ تم جاؤ۔ مجھے حنیف صاحب کے ساتھ کچھ باتیں کرنی ہیں"۔

"اچھا تو بائی بائی۔ آداب عرض، حنیف صاحب۔ آؤ سلمہ ہم چلتے ہیں"۔ یہ کہہ کر اُس نے بڑی بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑا اور اُن دونوں کو مبہوت چھوڑ کر مجھے کھینچتا ہُوا باہر لے آیا۔

باغ میں پہنچکر اُس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا " بے فکر رہو - اب حنیف صاحب تم سے کبھی شادی نہ کریں گے - مگر اس کام کے انعام میں میرے ساتھ اس وقت سکیٹنگ کو چلنا ہوگا "

اُس شام کو ہم لوگ دو گھنٹے تک سکیٹنگ کرتے رہے - سارے مجمع کی نظریں ہم پر تھیں - تمام لڑکیاں مجھے رشک سے دیکھ رہی تھیں - پانچ بجے کے قریب بھائی جان اور حنیف وہاں آئے ، ہم لوگوں کو سکیٹنگ کرتے ہوئے دیکھا اور واپس جانے لگے - مگر رام نے (جو رولر سکیٹوں پر بجلی کی رفتار سے چل سکتا ہے) انہیں دروازے کے قریب پکڑ لیا " ارے بھائی سلیم - کہاں چلے ؟ آئیے نا حنیف صاحب - آپ کو سکیٹنگ کرائیں "

" شکریہ - مگر ہم ہیک مینز جا رہے ہیں " حنیف صاحب نے کہا اور وہ دونوں چلے گئے -

چند منٹ بعد رام نے کہا " اب سکیٹنگ سے جی گھبرا گیا ہے - چلو ہیک مینز میں ڈانس کریں گے - تمہیں ڈانس کرنا آتا ہے نا ؟"

" ہاں آتا تو ہے تھوڑا تھوڑا مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ بھی ڈانس کرتے ہیں ؟ " میں نے کہا -

کسی زمانے میں سیکھا تھا ، کوئی خاص پسند نہیں - اس لئے مدت سے چھوڑ رکھا ہے - مگر آج تو ڈانس کرنا ہی پڑیگا - ڈیوٹی از ڈیوٹی "

اور سو ہم ہیک مینز پہنچے - پاپا اور ممی اب تک نہیں آئے تھے - حنیف اللہ صاحب اور بھائی جان ایک کونے میں بیٹھے وہسکی پی رہے تھے اور ان کے قریب سے ہم گزرے تو حنیف کو کہتے سنا کہ " پاکستان میں تو شریعت والوں کے ڈر سے چھپ کر پینی پڑتی ہے - یہاں تو پی لیں " رام سیدھا مجھے ڈانس فلور پر لے گیا - بینڈ " بلو ڈینیوب " BLUE DANUBE کا والٹز بجا رہا تھا - روشنیاں دھیمی ہوتی گئیں - اور ہم ڈانس کرتے رہے - اور موسیقی کی لہروں پر بہتے بہتے نہ جانے کہاں پہنچ گئے - مگر اس نے ایک بار بھی دھیمی روشنیوں سے فائدہ اُٹھا کر چومنے کی کوشش نہیں کی اور نہ غیر ضروری حد تک سینے سے چمٹایا - ایسا لگتا تھا کہ اُس نے اپنے اوپر بعض حدیں عائد کر لی ہیں اور ان کے بارے میں بڑی احتیاط برت رہا ہے - ہاں جب بھائی جان اور حنیف صاحب کی میز کے قریب سے ہم ڈانس کرتے ہوئے گزرتے تو اس کا منہ میرے اور قریب آ جاتا یہاں تک میں اُس کا گرم سانس اپنے گال پر محسوس کرتی ...... اور میرے لئے یہ یاد رکھنا مشکل ہو جاتا کہ ہم صرف ایک ناٹک رچا رہے ہیں - سچ مچ کا معاشقہ نہیں ہو رہا -

جب والٹز ختم ہوا اور روشنیاں اُبھر آئیں تو ہم نے دیکھا کہ حنیف صاحب ، اور بھائی جان اپنی میز سے غائب ہیں مگر پاپا اور ممی ایک اور میز پر بیٹھے ہوئے ہیں -

" ہیلو کنور صاحب " رام پاپا سے بڑے تپاک سے ملا اور ممی کو بڑے ادب سے نمستے کیا - " آپ کی لڑکی نے تھوڑی سی پریکٹس اور کی تو اچھا ڈانس کرنے لگے گی "

پاپا تو تم جانو سوشل ایٹیکیٹ کے بڑے قائل ہیں - انہوں نے غصے کی جھلک بھی چہرے پر نہ آنے دی - رام سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے -

جب گھڑی نے سات بجائے تو پاپا نے کہا " چلو سلمہ - گھر چلیں - حنیف صاحب انتظار کر رہے ہوں گے "

مگر رام نے فوراً بات کاٹ کر کہا " معاف کیجئے گا کنور صاحب - مگر سلمہ تو آج ہمارے ساتھ ماتھر صاحب کے ہاں کھانا کھا رہی ہے ...... بات یہ ہے ..... کہ آج میری سالگرہ ہے ...... اس لئے آج تو اسے آنا ہی پڑیگا - (ارادہ آپ سب کو بھی بلانے کا تھا مگر معلوم ہوا کہ آپ کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں "

پاپا نے زہر کا گھونٹ پیتے ہوئے اجازت دے دی -

راستے میں رکشا میں میں نے پوچھا "مجھے نہیں معلوم تھا کہ آج آپ کی سالگرہ ہے۔ ورنہ میں کوئی تحفہ لاتی۔"

"اوہ سالگرہ؟" اس نے کہا جیسے اس کے بارے میں بالکل بھول گیا ہو "ہاں سالگرہ ...... ایکٹر کی سالگرہ کیا۔ وہ تو روز پیدا ہوتا ہے اور روز مر جاتا ہے۔" اور ایک ٹھنڈی سانس ایک کھوکھلے قہقہے میں کھو گئی۔

ماتھر کے ہاں پہنچے تو ڈرائنگ روم کو خالی اور ویران پایا اور صرف ماتھر صاحب اکیلے بیٹھے شطرنج کے مہروں کو الٹ پلٹ رہے تھے۔

"ارے بھائی رام۔ کوئی دوا دو" انہوں نے پریشان نظروں سے ہمیں دیکھ کر کہا "روپ کو آج پھر نیورلجیا کا دورہ پڑ رہا ہے۔"

رام نے کالا بکس کھولا ہی تھا کہ شمو کے کمرے سے چیخوں کی آواز آئی۔ میں اور ماتھر صاحب ادھر دوڑے، کیا دیکھتے ہیں کہ شمو اپنے پلنگ پر پڑی درد کے مارے کراہ رہی ہے۔ ماتھر صاحب نے بیٹی کو سنبھالتے ہوئے مجھ سے کہا "جانا ہے تو ذرا شمو کے لئے بھی دوا لانا۔"

رام نے ایک شیشی نکالی۔ اس میں سے دوا نکال کر دو پڑیاں بنائیں۔ شمو کے کمرے میں جا کر ایک پڑیا اسے اپنے ہاتھ سے کھلائی۔ تھوڑی دیر اس کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور پھر بڑے نرم لہجے میں کہا "بس اب تمہارا درد جاتا رہے گا۔" اور سچ مچ اسی دم شمو کے کرب میں کمی ہو گئی اور چند منٹ کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اور کمزور سی آواز میں کہا "تھینک یو، رام جی۔" پھر وہ روپ کے کمرے میں گیا۔ اسی دوا کی دوسری پڑیا ان کو دی۔ ان کے سر کو ہلکے ہلکے دبایا۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کا نیورلجیا کا دورہ بھی دھیما پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا "دیکھئے مسز ماتھر آدھے گھنٹے میں آپ کا درد دور ہو جانا چاہیئے۔ آج میری سالگرہ ہے۔ اس لئے کھانے کے بعد میں آپ سب کو سینما لے چل رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر کمرے میں آ گیا۔

میں نے پوچھا "مگر مسز ماتھر کو نیورلجیا ہے اور شمو کے پیٹ میں درد۔ یہ کونسی دوا ہے جو آپ نے دونوں کو دیدی ہے؟"

اس نے کہا "اگنیشیا IGNATIA ہسٹیریا کی ہر شکل میں فائدہ کرتی ہے۔"

بیلیو اِٹ اور ناٹ۔ (BELIEVE IT OR NOT) آدھ گھنٹے میں روپ اور شمو دونوں کو اتنا افاقہ ہو گیا کہ نہ صرف کھانے کی میز پر آئیں بلکہ سینما بھی گئیں۔ جب رام نے مجھے سینما چلنے کی دعوت دی تو میں نے کہا "آپ چاہتے ہیں کہ آج مجھے گھر سے بالکل ہی نکال دیا جائے؟" اور اس کے جواب سے لاجواب ہو گئی۔ اس نے کہا "شاید آپ کی مشکلات کا یہی حل ہے۔ آپ اپنے گھر کے دروازے تک آگئی ہیں۔ اندر آپ واپس جانا نہیں چاہتیں۔ باہر آنے کی آپ میں ہمت نہیں ہے۔ ایسی حالت میں اگر آپ کے والدین آپ کو گھر سے نکال دیں تب ہی باہر کی دنیا میں آ سکتی ہیں۔ ورنہ ہمیشہ آپ دہلیز پر اسی طرح کھڑی رہیں گی کہ ایک قدم اندر اور ایک باہر۔"

سینما کے بعد گھر پہنچی تو دیکھا پاپا ڈرائنگ روم میں انگیٹھی کے پاس بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی گرج کر بولے "اب آئی ہو؟" میں کچھ کہنے والی ہی تھی کہ حفیظ صاحب ایک لبادہ نما ڈریسنگ گاؤن پہنے اپنے کمرے سے نکل آئے۔ میری طرف ایک نظر دیکھا مگر کچھ بولے نہیں۔ پاپا کے قریب جا کر مجھے سنانے کے لئے کہنے لگے "پاکستان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بے پردہ لڑکیوں کی چوٹیاں کاٹ دیتے ہیں۔" یہ سن کر میں جل ہی تو گئی مگر میں نے خاموش رہنے ہی میں خیریت سمجھی۔ میں جانتی تھی کہ ایک مہمان کے سامنے پاپا کبھی مجھے کچھ نہیں کہیں گے! اس لئے غڑاپ سے میں اپنے کمرے میں اور دروازہ بند کرتے ہی سوچ آف (SWITCH OFF) اور میں اپنے بستر کے اندر۔

اگلے دن سے تو میں نے ڈھٹائی پر کمر باندھ لی کیونکہ حفیظ سے چھٹکارا پانے کی یہی ایک صورت تھی کہ میں رام کمار کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاروں۔ شام کو ہم لوگ اکٹھے ٹہلنے نکلتے۔ لائبریری کے سامنے سے گزرتے تو سارے مجمع کی نگاہیں ہم پر ہوتیں۔ لڑکیاں

تو رشک اور حسد سے دیکھتی ہی تھیں لڑکے بھی مجھے ایک نئے ڈھنگ سے دیکھنے لگے۔ گویا افسوس کر رہے ہوں کہ انہوں نے میرا نوٹس لینے میں پہل کیوں نہ کی۔ سکیٹنگ رنک، ہیک مینز بال روم، سینما ۔ ہر جگہ ہم ساتھ نظر آتے۔ ایک مقامی اخبار نے تو ہماری منگنی کی خبر بھی شائع کر دی اور کل جب "سکرین" کا پرچہ آیا تو اس کے پہلے صفحہ پر ہی ہماری تصویر جو ڈانس کرتے وقت کسی نے فلیش لائٹ سے لی تھی (تم نے بھی یہ تصویر شاید دیکھی ہو گی)۔ اس تصویر کا چھپنا تھا کہ حنیف صاحب نے مجھ سے فورمل بات چیت بھی بند کر دی اور سامان باندھنا شروع کر دیا......

پاپا خفا ہیں۔ ممی خفا ہیں۔ بھائی جان سے بات کرتی ہوں تو وہ کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ حنیف صاحب کے جاتے ہی مجھ پر وہ ڈانٹ پڑ یگی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا مگر فی الحال تو صرف یہ اطمینان ہے کہ حنیف صاحب جا رہے ہیں اور میری کھال کے جوتے نہیں بنیں گے۔ آگے جو ہوگا وہ بھگت لیا جائے گا۔

تمہاری —— سلمہ

P.S میری جان۔ مہربانی کر کے ان سب باتوں کو اپنے تک ہی رکھنا۔

---

۲۹ اگست

اوشا۔ مائی ڈیر۔

تمہارے دونوں خط ملے۔ تم نے اکنامکس پڑھنی شروع کر دی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خواہ مخواہ اپنے پروفیسر صاحب کی طرفداری کرو۔ میں ان کو ہرگز خط نہیں لکھوں گی۔ وہ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں کہ مجھے خط میں لکھتے ہیں: "سنا ہے وہ اُلو رام کمار آجکل مسوری آیا ہوا ہے اور رئیسوں کی بیٹیاں پروانوں کی طرح اس پر فدا ہو رہی ہیں۔" اُن سے کہنا ذرا شیشے میں اپنی صورت تو دیکھیں اور پھر رام کمار پر فقرے کسیں اور اگر وہ اسے مذاق سمجھتے ہیں تو مجھے ایسے مذاق نہیں پسند۔

لگتا ہے تم بھی فلم ایکٹروں کو تعصب کی عینک سے دیکھتی ہو۔ بھلا یہ تم کو کیسے خیال ہو گیا کہ رام کمار SHALLOW اور اوچھا ہے۔ تم اسکی باتیں سنو تو دم ہو جاؤ۔ دنیا کے معاملات پر اس کی نظر تمہارے بہت سے پروفیسروں (خصوصاً اکنامکس کے بعض پروفیسروں) سے کہیں زیادہ گہری ہے۔ پرسوں ہم دونوں تک ٹہلنے گئے تھے۔ راستے میں میں نے کہا: "اتنے دن آپ کو یہاں آئے ہوئے ہو گئے ہیں مگر آپ نے فلمی دنیا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

رام نے کہا: "دیکھو بھئی۔ میں فلمی دنیا سے بھاگ کر یہاں آیا ہوں اور تم اپنے سوالات سے مجھے پھر اسی دلدل میں دھکیلنا چاہتی ہو۔" اور پھر تھوڑی سی دیر کی خاموشی کے بعد: "سوچتا ہوں تمہیں فلمی دنیا کے کس پہلو کے بارے میں بتاؤں۔ اُن فلم سٹاروں کے بارے میں جو حسین ہیں مگر جن کو سچی محبت کبھی نصیب نہیں ہوئی؟ اُن ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ روپے فی پکچر لینے والی ہیروئنوں کے بارے میں جو دن اور رات شوٹنگ کے کولھو میں پلتی ہیں تاکہ ان کے بھائی یا باپ یا ماموں یا نام نہاد گارڈین ان کی کمائی سے شرابیں پئیں، رنڈی بازی کریں، جوا اور سٹہ کھیلیں، شارک سکن کے سوٹ پہن کر بیوک اور پیکارڈ کاروں میں گھومیں؟ یا اُن کے بارے میں جن کے نام سے بنکوں میں کئی لاکھ روپے جمع ہیں مگر جن کو پانچ پانچ برس تک ایک ہفتے کی چھٹی نصیب نہیں ہوتی؟ اُن کے بارے میں جو امریکن فلموں کی کہانیاں چرا کر بیس بیس ہزار میں بیچتے ہیں یا اُن کے بارے میں جن کو چند سو روپے اُن فلموں کی کہانیوں، مکالموں اور گانوں کے ملتے ہیں جن کے ٹائیٹلز پر کسی اور کا نام آتا ہے؟ اُن ایکسٹراز کے بارے میں جو برسوں تین چار روپے روز پر CROWD SCENES میں کام کرتے ہیں اس اُمید موہوم میں کہ کسی دن اُن کی قسمت بھی چمکے گی اور وہ اشوک کمار اور موتی لال اور

راج کپور کی جگہ لیں گے؟ یا اُن قلیوں کے بارے میں جو ڈیڑھ روپے روز پر بندروں کی طرح رسّیوں پر چڑھتے ہیں اور بھاری بھاری لائٹوں کو سٹوڈیو کی چھت سے لٹکے ہوئے تختوں پر لگاتے ہیں اور ہر گھڑی اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے ہیں؟ اُن شریف زادیوں کے بارے میں جن کا کردار کوٹھے والیوں سے بدتر ہے یا اُن طوائف زادیوں کے بارے میں جو سنجیدہ اور شریف ہیں؟ اُن بیوقوفوں کے بارے میں جو اپنے آپ کو GENIUS سمجھتے ہیں یا اُن GENIUSES کے بارے میں جن کو سب بیوقوف اور اُلّو سمجھتے ہیں؟ فلمی دنیا بھی دنیا کی طرح سب رنگ ہے سلمہ!"

جو آدمی ایسا فلسفیانہ نظریہ رکھتا ہو کیا اُس کو چھچھورا کہا جا سکتا ہے؟

تمہارے اس فقرے کو پڑھ کر کہ "رام کمار فلم ایکٹر ہے فلم ایکٹر۔ بچ کے رہنا" مجھے غصّہ بھی آیا اور ہنسی بھی۔ غصّہ اس لئے کہ لگتا ہے تم بھی عام لوگوں کی طرح سے یہ سمجھتی ہو کہ ہر فلم ایکٹر آوارہ، بدمعاش بلکہ حُسن کا ڈاکو اور بھولی بھالی لڑکیوں کی عصمت کا لٹیرا ہوتا ہے۔ اور اس گروہ میں تم رام کمار کو بھی شامل کرتی ہو۔ اور ہنسی اس لئے کہ تمہارا خدشہ کتنا غلط ہے۔ پچھلے تین چار ہفتے میں درجنوں بار ہم اکیلے ملے ہیں، اُجالے میں بھی اور اندھیرے میں بھی، ساتھ ڈانس بھی کیا ہے اور دور تک واک کو بھی گئے ہیں۔ مگر اب تک ایک بار بھی اُس نے کوئی غیر شریفانہ اقدام نہیں کیا۔ بلکہ میں تو کہوں گی کہ بور ہونے کی حد تک شریف ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ مزا یہ ہے کہ دوسروں کی موجودگی میں وہ مجھ سے زیادہ بے تکلفی سے بات کرتا ہے FLIRTATIOUS انداز میں مذاق بھی کرتا ہے لیکن جب صرف ہم دونوں ہوتے ہیں" اور کوئی تیسرا نہیں ہوتا، تو وہ بڑی احتیاط سے اپنے اور میرے درمیان شریفانہ فاصلہ رکھتا ہے۔

بات یہ ہے، اوشا، کہ تم نے "رام کمار دی ایکٹر" کو سکرین پر دیکھا ہے اور مجھے ان دنوں میں "رام کمار دی مین" کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ اور تم سے یہ کہنے میں مجھے کوئی پردہ نہیں کہ میں اسے بہت پسند کرنے لگی ہوں۔ اور شاید وہ بھی ...... پرسوں وہ مجھ سے کہنے لگا: "جانتی ہو، سلمہ، میری زندگی میں تم پہلی لڑکی ہو جس سے میں دل کھول کر دوستوں کی طرح بات کر سکتا ہوں۔"

کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ باوجود اپنی تمام کامیابی اور شہرت کے اُس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی ہے۔ شاید محبّت کی۔ لگتا یہ عجیب ہے کہ وہ نوجوان جس پر ہزاروں لڑکیاں جان دیتی ہیں اور جو سکرین کی ہر حسینہ کے ساتھ فلموں میں عشق کر چکا ہے اپنی پرائیویٹ زندگی میں محبت کی کمی محسوس کرے۔ مگر واقعہ یہی معلوم ہوتا ہے۔ "بات یہ ہے، سلمہ" وہ ایک دن کہنے لگا، "کہ بغیر UNDER STANDING کے محبّت مکمل اور پائیدار نہیں ہو سکتی۔ اور ہم میں سے کتنے ہیں جو دوسروں کو تو کیا اپنے آپ کو سمجھنے کی بھی اہلیت رکھتے ہیں۔" اور پھر یکایک میری نظروں سے اپنی نظریں بچا کر دوسری طرف دیکھتے ہوئے "کیوں، سلمہ، تم نے کبھی کسی سے محبّت کی ہے؟ معمولی فلرٹیشن نہیں جو مسوری اور نینی تال کی رومانی فضاؤں میں ہر روز ہوتے رہتے ہیں بلکہ اصلی، سچّی، گہری محبّت جو انسان کی زندگی کو رنگینی اور موسیقی اور خوشی سے بھر دیتی ہے اور ساتھ ہی اُس کو پہلی بار دُکھ اور غم سے آشنا کرتی ہے۔ یہ محبّت بھی بہت عجیب بیماری ہے!"

اور نہ جانے کیوں ...... نہ جانے کیسے ...... میرے جی میں آیا کہ اُسے سب کچھ بتا دوں۔ وہ بھی جو اُس وقت تک میں اپنے آپ سے بھی چھپائے ہوئے تھی۔ شاید اس لئے کہ میرا خیال تھا اور ہے کہ وہ میرے (یا کسی اور کے) دل کا حال مجھ سے بہتر جان سکتا ہے اور میری جذباتی PROBLEMS کو مجھ سے بہتر سمجھ سکتا ہے۔ میں نے اس کو احمد کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ کیسے ہماری پہلی ملاقات ہوئی۔ کیسے آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ کون کون سی باتوں میں ہم ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ اور کن باتوں میں ہمارے اختلافات ہیں۔ پھر احمد کی نفسیاتی خصوصیات کے بارے میں۔ اس کی ضرورت سے زیادہ شدید خودداری کے احساس کے بارے میں۔ "کیونکہ میرے والد تعلقہ دار ہیں اور وہ

ڈھائی سو روپے ماہوار پانے والا لیکچرار ہے وہ مجھ سے شادی کے لئے نہیں کہتا۔ یہاں تک کبھی اس نے محبت کا اقرار تک نہیں کیا......" ایسے آدمی سے کب تک کوئی محبت کر سکتا ہے؟ کب تک کوئی انتظار کر سکتا ہے؟"

اور اس نے مسکرا کر کہا: "محبت منطق کو نہیں مانتی، سلمہ۔ اور انتظار........ اگر چیز انتظار کے قابل ہو تو آدمی عمر بھر انتظار کر سکتا ہے۔"

اور نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: "ہاں، سلمہ، عمر بھر انتظار کر سکتا ہے۔" اور پھر جیسے اس نے دفعتاً اپنے جذبات کی عریانی پر مذاق کا پردہ ڈالنا چاہا وہ ہنس کر بولا: "مگر یہ خوش قسمت نکھٹو پرنجیا پروفیسر ہے کون؟"

میں نے کہا: "آپ نہیں جانتے شاید۔ اس کا نام ہے....... احمد!"

"احمد؟ اکنامکس والا احمد حسین تو نہیں؟"

میں نے کہا: "ہاں۔ وہی۔ کیوں کیا آپ احمد کو جانتے ہیں؟"

"ہاں۔ کسی قدر۔ میں بھی اکنامکس کا سٹوڈنٹ تھا نا؟" اور اس کے بعد نہ جانے کیوں اس نے گفتگو کا رُخ ایکدم بدل دیا اور ہم ماتھر خاندان کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے گھر لوٹ آئے۔

تو، اوشا جانی، یہ ہے میری جذباتی زندگی کا دوراہہ۔ دنیا میں تم ہی تو ہو جس سے میں یہ سب کچھ کہہ سکتی ہوں۔ اور جس سے میں مشورہ کر سکتی ہوں۔ خدا کے لئے ان باتوں کا ذکر نہ کرنا کسی سے۔ مگر اپنی رائے ضرور لکھنا۔

سلمہ

---

۱۴ ر ستمبر

اوشا

سوچتی ہوں یہ زندگی کامیڈی ہے یا ٹریجیڈی۔ ایک کامک ٹریجیڈی یا ایک ٹریجک کامیڈی۔ یا کٹھ پتلیوں کا ایک بے معنی ناٹک اور بھگوان یا خدا یا کرم یا قسمت کے ہاتھوں میں دو ڈوریاں ہیں جن سے ہم انسانوں کو اُٹھایا بٹھایا، ہنسایا رلایا جاتا ہے۔ یا جیسا ہم نے مارکسیسٹ اکنامکس کی کتابوں میں پڑھا ہے، سماجی اور سیاسی اور معاشرتی حالات ہماری ذاتی زندگیوں یہاں تک ہمارے جذبات و محسوسات کی بھی تشکیل کرتے ہیں۔

پچھلے چند دنوں میں میری اپنی زندگی نے جو پلٹے کھائے ہیں اُن کے بارے میں سوچ کر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔

اپنی اور رام کمار کی جس گفتگو کے بارے میں میں نے تمہیں لکھا تھا نا اس کے چار روز بعد ایک دن سویرے جو میں ماتھر ز کے ہاں پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ روپ کو صبح صبح ہی نیورلجیا کا سخت دورہ پڑ رہا ہے اور شمو کو پیٹ کے درد کا۔ مجھے دیکھتے ہی ماتھر صاحب بولے "سلمہ بیٹی۔ نہیں معلوم ہے رام کونسی دوائیں ان کو دیا کرتا تھا۔ ذرا دینا نکال کے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ وہ جلدی میں اپنا یہ کالا دواؤں کا بکس بھُول گیا ہے۔"

"بھُول گیا ہے؟ کیا رام صاحب چلے گئے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ کل رات کو ایک بجے بمبئی سے تار آیا کہ اسے فوراً واپس آجانا چاہیئے۔ اس کی نئی فلم "اُدھورے سپنے" کی مہورت ہے اس لئے وہ آج بہت سویرے ہی چلا گیا...... ہاں۔ ذرا جلدی کرنا۔ وہ دوا نکالنا۔"

میں بھونچکا سی رہ گئی۔ مگر کونے میں رکھا ہُوا دواؤں کا بکس کھولا تو دیکھا کہ اس میں ساری شیشیاں غائب ہیں۔ صرف ایک دوا کی شیشی رکھی ہے۔

"اگنیشیا" اور اس پر نام کے نیچے رام کے ہاتھ سے لکھا ہُوا تھا "ہسٹیریا کی ہر شکل کے لئے اکسیر ہے۔ رام کا نام لے کر کھائی جائے تو ضرور فائدہ ہوگا"

"سُنا تم نے ؟" میں نے شمّو کو دوا کھلاتے ہوئے کہا "رام لکھ گیا ہے کہ رام کا نام لے کر یہ دوا کھائی جائے تو تمہیں ضرور فائدہ ہوگا"

اور یہ سُن کر شمّو کو باوجود شدید درد کے ہنسی آگئی۔ کہنے لگی "رام جی بڑے مذاقیہ ہیں۔ دیکھا۔ میری آٹو گراف بُک میں کیا لکھ گئے ہیں" تکئے کے نیچے سے کتاب نکال کر دکھائی۔ رام کے جنّاتی ہینڈ رائیٹنگ میں لکھا تھا "پیٹ کے درد میں ہنسی بہت فائدہ دیتی ہے ـــ بشرطیکہ مریض اپنے آپ پر ہنسنے کی صلاحیت پیدا کرے"

"بڑا شریر ہے رام"۔ روپ بولیں اور دوا کی خوراک کھاتے ہوئے بولیں "مجھے ایک پُرانے سینما ٹکٹ پر آٹو گراف دے کر گیا ہے اور اس پر لکھا ہے "آدھے سر کا درد پورے سر کے درد سے بہتر ہے کیونکہ آدھا سر تو سوچنے کے قابل رہتا ہے۔ اگر کوئی اپنے سر سے محسوس کرنے کے بجائے سوچنے کی تکلیف گوارا کر سکے" اور یہ سُنا کہ وہ بھی ہنس پڑیں اور مجھے ایسا لگا کہ رام کی ہومیو پیتھی اس کی غیر حاضری میں بھی کام کر رہی ہے۔

میں نے ماسٹر صاحب سے پوچھا "کیا میرے لئے کوئی خط ـــ کوئی پیغام ـــ نہیں دے گئے"

"اوں ہوں۔ کچھ نہیں" اور پھر کچھ سوچ کر "ہاں تمہاری آٹو گراف بُک دے گیا ہے۔ یہ لو"

میں نے جلدی جلدی ورق اُلٹے۔ لکھا تھا "زندگی کی حقیقت سینما کی پرچھائیوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ اور پُورا انسان آدھے انسان سے بہتر ہوتا ہے"

"آدھا انسان!" اور میں رام کی زبانی ایکٹر کی تعریف یاد کر کے بے اختیار مسکرا دی گو میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے "مگر پورے انسان سے اس کا کیا مطلب ہے ؟" ابھی یہ سوال میرے دماغ میں کوند ہی رہا تھا کہ ایک ہلکی سی آواز کان میں آئی "سلمہ"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے میں وہی پُرانا لوڈبڈ کا کوٹ پہنے (جس کے مونڈھے پر میرے ہاتھ سے رفو کیا ہُوا ہے) احمد کھڑا مسکرا رہا ہے۔

"احمد!" میں چلّائی "تم یہاں کیسے اور کب آئے ؟"

"ابھی ابھی سیدھا چلا آرہا ہوں۔ کہو تمہاری طبیعت کیسی ہے ؟"

"میری طبیعت ؟ کیوں میری طبیعت کو کیا ہُوا ؟"

"مگر اس نے تو لکھا تھا ایک بڑے مشہور ہومیو پیتھی کے ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ تمہیں دل کی بیماری ہونے کا خدشہ ہے"

"کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو ؟ اور کس نامعقول نے تمہیں یہ سب بکواس لکھی ہے ؟"

"اسی اُلّو رام کمار نے اور کس نے۔ اور وہ نالائق ہے کہاں ؟"

"رام کمار نے ؟" میرا دماغ اس عجیب و غریب گورکھ دھندے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا "رام کمار سے تمہارا کیا تعلق ؟ تم اسے کیسے جانتے ہو ؟"

احمد نے ایک کُرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "اس بدمعاش کو میں نہیں جانتا تو اور کون جانتا ہے۔ کم سے کم پندرہ برس تو سکول اور کالج میں ہم نے ساتھ پڑھا ہے۔ چھ سال ہاسٹل میں اکٹھے ایک کمرے میں رہے ہیں۔ اُسی کی وجہ سے میں نے اکنامکس میں ایم اے لیا۔ دونوں مل کر ریسرچ کرنے والے تھے۔ اور تم کہتی ہو میں اسے کیسے جانتا ہوں۔ تمہارے لئے وہ توپ ایکٹر ہوگا۔ میں تو اسے اب بھی ویسا ہی اُلّو سمجھتا ہوں

وہ ہے کہاں ؟

"وہ تو چلا گیا ؟" ناظر صاحب نے کہا۔

"دیکھئے نا۔ یہ ہیں اس نالائق کی حرکتیں۔ مجھے اتنی دور سے بلایا اور خود غائب ؟"

ناظر کے ہاں سے اپنے گھر لوٹتے ہوئے راستے میں میں نے احمد سے کہا "پھر اب کیا ارادہ ہے ؟"

"ارادہ کیا ہے ؟" ایک نئے لہجے میں اس نے میرے الفاظ دہرائے اور راہ گیروں کی پروا نہ کرتے ہوئے عین سڑک پر مجھے روک کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "ارادہ یہ ہے، سلمہ، کہ ابھی جا کر تمہارے پاپا کنور صاحب سے کہنے والا ہوں کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کل شادی ہو جائے گی۔ اور......"

"اور...... ؟" میں اتنی حیران تھی کہ غصہ کا اظہار کرنا بھی بھول گئی کہ اسے میری طرف سے یہ سب فیصلہ کرنے کا اختیار کس نے دیا ہے۔

"اور پھر پرسوں ہم ہنی مون کے لئے بمبئی روانہ ہو جائیں گے۔ وہاں میں فیکٹری کے مزدوروں کی حالت پر ریسرچ کرنے والا ہوں۔ رام نے لکھا ہے کہ ہم اس کے ہاں ٹھہر سکتے ہیں"

"میں بمبئی ومبئی نہیں جاؤں گی" میں غصے سے چلائی۔

اس کا مطلب ہے کہ اور سب باتیں تمہیں منظور ہیں۔ اپنا کیا ہے۔ بمبئی نہ سہی کلکتے سہی۔ کانپور سہی۔ ہاں بمبئی میں اپنا دوست ہے"

"مجھے تمہارا دوست نہیں پسند"

"اوہ رام۔ اسے پسند کرنے کے لئے ذرا زیادہ عقل کی ضرورت ہے" اور یہ کہہ کر احمد خوب ہنسا اور نہایت بے شرمی سے میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگا۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اپنا ہاتھ جھٹک کر اسے ماروں، اسے نوچوں کھسوٹوں یا اس سے لپٹ کر خوب روؤں.... خوب روؤں.....

اور پھر ؟...... BELIEVE IT OR NOT احمد نے پاپا سے اس قطعی انداز میں بات کی کہ انہوں نے شادی کی اجازت دے دی ہے مگر تیاریوں کے لئے کچھ دن کی مہلت مانگی ہے۔ سو اگلے ہفتے ۲۴ ستمبر کو ہماری شادی ہے۔ یہیں مسوری میں۔ اور اسی لئے تمہیں یہ خط لکھ رہی ہوں۔ تمہاری موجودگی نہایت ضروری نہیں بالکل لازمی ہے۔ تم نہ آئیں تو میں بہت بہت خفا ہوں گی۔ سمجھیں۔ لہٰذا اس خط کو تار سمجھو اور فوراً سے پیشتر یہاں آجاؤ۔ باقی ملاقات پر۔

تمہاری حیران پریشان مگر خوش

سلمہ

---

۲۳ ستمبر

اوشا پیاری

خط اور مبارکباد کا شکریہ۔ تمہاری طبیعت کی خرابی کی خبر کافی پریشان کن ہے۔ افسوس ہے کہ تم کل یہاں موجود نہ ہوں گی۔ خیر۔ اپنا علاج باقاعدہ کراؤ۔ تمہارے پتاجی تو خود ڈاکٹر ہیں۔ پیٹ کا ایکس رے فوراً ہونا چاہیئے۔ اگر اپنڈکس نکلے اور آپریشن کی صلاح ہو تو مجھے فوراً اطلاع دینا تاکہ میں وہاں تمہاری تیمارداری کو آسکوں۔

یہ خط جلدی میں لکھ رہی ہوں۔ اس وقت گھر کی کیا حالت اور میرا کیا موڈ ہے وہ تم اندازہ لگا سکتی ہو۔

تمہاری ——— سلمہ

P.S. اگر ایکس رے میں اپنڈکس نہ نکلے اور اس پیٹ کے درد کی وجہ نہ معلوم ہو سکے تو مجھے لکھنا، "اگنیشیا" کی ایک پڑیا بھیجدونگی۔ رام کا نام لے کر کھانا۔ ضرور فائدہ ہوگا۔

اور ہاں یہ تم نے کیا حماقت کی کہ ایک بار فلاسفی اور سائیکالوجی چھوڑ کر اکنامکس لی اور اب پھر اکنامکس چھوڑ کر انگلش لٹریچر لے رہی ہو۔

P.P.S. ایک بات لکھنا بھول گئی کل شام ہم آخری بار مسوری کی سیر کو گئے۔ لائبریری پہ وہی بے فکرے نوجوانوں اور رنگین تتلیوں کی بھیڑ تھی۔ مگر نہ جانے کیوں اس بار بے فکروں کی مسکراہٹیں کافی فکرمند نظر آئیں اور تتلیوں کے رنگ ایسے لگے جیسے پھیکے پڑ گئے ہوں۔ احمد کی موجودگی مجھے ان بے ہودہ ایکس رے نگاہوں سے محفوظ کئے ہوئے تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے ہیک مینز بھی گئے اور سکیٹنگ رنک بھی۔ مگر دونوں جگہ کوئی رونق نظر نہیں آئی۔ ایک تو بھیڑ کم تھی دوسرے جو لوگ تھے وہ بھی تھکے ہوئے مرجھائے چہروں کو لئے وہسکی کے گھونٹ اس طرح پی رہے تھے، جیسے زہر پی رہے ہوں۔ بینڈ ایک نہایت روتی ہوئی بلکہ سسکتی ہوئی ٹیون بجا رہا تھا جس پہ انسان تو نہیں موت ہی رقص کر سکتی ہے۔ لوٹے تو دیکھا کہ مسوری کی روشنیاں کہرے کی گہری چادر میں سے ٹمٹما رہی ہیں۔ کوئی رکشا چلتی بھی نظر نہ آئی۔ (اس لئے کہ رکشا والوں نے دو دن سے ہڑتال کر رکھی ہے)۔ راستہ چلنے سردی کے مارے اپنے کوٹ کے کالروں میں سر چھپائے جلدی جلدی قدم اُٹھائے جا رہے تھے۔ میں نے کہا: "ایسا لگتا ہے مسوری اس ٹھٹھری ہوئی سردی میں کمبل لپیٹ کر سو گیا ہے۔" احمد نے کہا، "سو رہا ہے؟ ——— یا دم توڑ رہا ہے؟" اس پہ بھائی جان بولے: "اکتوبر کی آمد آمد ہے۔ سیزن بھی تو ختم ہو گیا۔" اور احمد نہ جانے کیا سوچ کر بولا: "ہاں مسوری کا سیزن ختم ہو گیا ہے ——— ہمیشہ کے لئے۔"

چچا جان

حیات اللہ انصاری

ابھی سورج نے منہ نکالا ہی تھا کہ ہماری لاری مہاکوسی ڈیم کے پاس پہنچ گئی۔ اور جو دو چار مسافر اس میں رہ گئے تھے وہ میرے سمیت اُتر پڑے۔ مہاکوسی ندی شمال کی طرف بلند و بالا اور بے حد شاداب درختوں کے جھنڈ میں ہوتی ہوئی اُوپر جا کر غائب ہو گئی تھی۔ اس کے پیچھے بہت دُور بادلوں کے بیچ میں شوالک پہاڑیوں کی دو چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

جب میں دو فرلانگ چل کر ٹوٹے ہوئے بند کے پاس پہنچا تو اک دم سے جنوب کی طرف کا منظر بھی آنکھوں کے سامنے آگیا جو ابھی تک درختوں سے چھپا ہوا تھا۔

اس منظر کو بیس سال پہلے میں گھنٹوں دیکھتا رہتا تھا اور جی نہیں بھرتا تھا۔ مہاکوسی ندی نیچے کی طرف بہت دُور تک جنگلی جھاڑیوں، کھیتوں اور باغوں میں بل کھاتی ہوئی جاتی نظر آتی تھی۔ اس کے کنارے پر چھوٹے چھوٹے دیہات آباد تھے جن سے قدرتی حسن میں انسانی چہل پہل شامل ہو گئی تھی۔ میں یہاں سے دیکھ سکتا تھا کہ ندی کے کنارے جگہ جگہ پر دھوبی کپڑے دھو رہے ہیں اور چرواہے مویشیوں کو چرا رہے ہیں۔ کبھی کبھار کسی کے پکارنے کی صدا یا کسی چرواہے کی تان بھی کانوں میں آجاتی تھی، مگر جنگل کی صداؤں میں گھل مل کر۔

چچا جان صرف اپنوں ہی میں نہیں غیروں میں بھی بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ کیونکہ ان کا مزاج ہی کچھ عجیب و غریب تھا۔ ایک دن وہ اسٹیشن پر کسی کو لینے گئے تھے کہ ایک لڑکے کو دیکھا جو پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ انہوں نے ملازم سے کہا کہ اس کو بُلا لاؤ۔

وہ کا آگیا۔ جو اس اچانک بلاوے سے گھبرا گیا تھا۔

چچا جان۔ "بیٹا تم کس کے لڑکے ہو"؟

"سیٹھ رام داس جی کا بیٹا ہوں"۔

"میں مطابق سمجھا تھا۔ کہاں جا رہے ہو؟"

"کلکتے"۔

"کیوں؟"

لڑکا بظاہر ایسے سوالات کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ جواب دینے میں ذرا جھجکا۔ چچا جان کہنے لگے۔

" میرا اس طرح پوچھنا نئی تہذیب کے خلاف ہے۔ مگر میں تو پرانے زمانے کا آدمی ہوں ہاں بیٹا بتلاؤ۔"

چچا جان کے لہجے میں کچھ ایسی شفقت تھی کہ لڑکا پگھل گیا اور بولا۔

" نوکری ڈھونڈھنے۔"

خدا کرے کامیابی ہو۔ کتنے پیسے لے کر چلے ہو۔؟

لڑکے کے چہرے پر کچھ بے چینی اور کچھ جھینپ کے آثار پیدا ہوئے۔ لیکن اس نے بتا دیا "بیس روپیہ"۔

" چل بے۔ بیس روپلی لے کے چلا ہے کلکتہ!"

چچا جان نے جیب سے سو روپیہ نکال کر لڑکے کے ہاتھ میں دے دیئے اور کہنے لگے تمہارے باپ سے میرا بڑا یارانہ ہے۔ اس لئے تم میرے بیٹے ہو۔ میں نے تم کو اس وقت دیکھا تھا جب تمہارے پتاجی کا کاروبار چلتا تھا اور تم آٹھ سال کے تھے۔ اور اب ماشاءاللہ سترہ اٹھارہ سال کے ہو گئے۔ لیکن میری یادداشت نے ساتھ دیا اور میں نے پہچان لیا۔"

پھر چچا جان نے وہیں کھڑے کھڑے دو تعارفی خط اپنے دو دوستوں کے نام لکھ کر لڑکے کو دیئے اور کہا یہ تمہارے ٹھہرنے کا بندوبست کر دینگے اور نوکری کی بھی کوشش کریں گے۔ انہوں نے لڑکے کو ریل پر سوار کیا اور چلتے وقت کہا۔

" اگر کوئی ضرورت ہو تو اپنے پتاجی کے بجائے مجھے لکھنا۔"

چچا جان کا گھر، گھر نہیں مسافر خانہ معلوم ہوتا تھا۔ کچھ نہ ہوں گے تو چھوٹے بڑے ملا کر ڈیڑھ درجن تو بچے ہی ہوں گے۔ ان باشندوں میں چچا جان کا خاندان صرف ان کی بیوی اور دو لڑکیوں پر مشتمل تھا جن میں سے ایک بیوہ تھی اور دوسرے کا شوہر نکھٹو تھا۔ باقی ساری آبادی ان عزیزوں سے مرکب تھی جن کا معزز پیشہ بھکاری پن تھا۔ ایسے لوگ کسی تقریب میں شرکت کے لئے دو چار روز کے لئے آتے اور رہ پڑتے۔ اگر بیوی بچے ساتھ نہ ہوتے تو سال چھ مہینے کے بعد ان کو بھی لے آتے۔

میں بھی اسی طرح چچا جان کے گھر کا ممبر بنا تھا۔ میرے ابا چچا جان کے سگے بڑے بھائی تھے۔ کچہری میں عرائض نویسی کرتے تھے۔ معمولی سی آمدنی تھی اور کنبہ کافی بڑا تھا۔ جب انہوں نے ہائی اسکول میں میری کامیابی کی خبر سنی تو سجدے میں گر پڑے۔ اور پھر اٹھ کر میرا ہاتھ پکڑا اور ریل کا ٹکٹ لیکر سیدھے چچا جان کے پاس آئے اور کہنے لگے۔

" لو تمہارے بھتیجے نے ماشاءاللہ ہائی اسکول سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا ہے۔ اب تمہارا جی چاہے تو اس کو آگے پڑھاؤ اور جی چاہے تو کہیں نوکر رکھا دو۔ مجھ سے اب کوئی مطلب نہیں۔

چچا جان نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولے۔

" میرا دسترخوان غیروں کے لئے کھلا ہوا ہے۔ اور یہ تو اپنا ہے۔ کیوں بیٹا تمہارا کیا سن ہے۔؟"

میں " سولہ برس"

چچا جان " تب تو ابھی چھوٹے ہو۔ شرارت کے دن ہیں۔ دیکھو گھر کو اپنا ہی گھر سمجھنا اور جتنی جی چاہے شرارتیں کرنا۔ اور جب جی چاہے اپنی چچی سے چار آنے آٹھ آنے اڑانے کو مانگ لینا۔"

آپ ہی بتلایئے کہ اس ملاقات کا میرے اوپر کیا اثر پڑا ہوگا۔ اس دن سے میں چچا جان کا بیٹا ہو گیا۔ اور انہوں نے رکھا بھی مجھے بیٹوں

ہی کی طرح۔

چچا جان جس زمانے میں ڈسٹرکٹ انجینیئر تھے ایک مرتبہ معائنہ کو جا رہے تھے۔ برسات کا خوشگوار زمانہ تھا اس لئے تفریح کی غرض سے میں بھی کار پر بیٹھ گیا تھا۔ راستے میں ایک جگہ سڑک خراب تھی اور پانی بہت بھرا ہوا تھا اس لئے کار دھیمی ہو گئی۔ اس وقت ہم ایک گاؤں سے گزر رہے تھے۔ جب اس کے کنارے پر پہنچے تو دیکھا کہ کچھ لوگ کھڑے ہوئے ہیں اور ایک بڑھیا چلا چلا کر رو رہی ہے۔ ایک جوان عورت سرنیوائے کھڑی ہے اور اس سے لگا ہوا دس بارہ سال کا ایک بچہ رو رہا ہے۔

چچا جان نے اس مجمعے کو دیکھ کر ڈرائیور کو حکم دیا کہ کار روک لو۔ پھر وہ نیچے اُتر پڑے ان کے جُوتے اور ریشمی موزے اور پتلون کی مہریاں گندے پانی میں لت پت ہو گئیں۔ لیکن انہوں نے اسکی کوئی پرواہ نہ کی اور بھیڑ کے اندر گھس کر پوچھا کہ کیا بات ہے۔

معلوم ہوا کہ بڑھیا اور اسکی بہو دونوں بیوہ ہیں۔ بڑھیا کا ایک بارہ سال کا پوتا بھی ہے جو ورناکیولر اسکول میں پڑھتا ہے۔ بڑھیا کا بیٹا قانونگو تھا جو ایک سال ہوا جوانی میں گزر گیا۔ اس کی موت سے یہ گھرانہ بے سہارا ہو گیا۔ صرف ایک کچّا گھر تھا جس میں یہ رہتے تھے اور ایک بھینس تھی جس کا دودھ بیچ کر یہ لوگ گزارہ کرتے تھے۔ لیکن ابھی ابھی ایک گھنٹہ ہوا گھر گر گیا جس سے دب کر بھینس بھی مر گئی۔

چچا جان وہیں ایک چارپائی پر بیٹھ گئے اور کار بھیجکر نہر کے اوورسیر کو بلا بھیجا۔ اس کو انہوں نے اسی وقت ایک چیک لکھ کر دیا اور کہا کہ پندرہ دن کے اندر اندر بڑھیا کا مکان بن جانا چاہیئے اور ایک بہت عمدہ جمنا پاری بھینس آ جانا چاہیئے۔ اگلے دورے پر جب میں آؤنگا تو ان دونوں چیزوں کا بھی معائنہ کر دونگا۔

پھر چچا جان بڑھیا کے پوتے کو کار پر لے کر اس علاقے کے تعلقے دار کے پاس گئے، جو ان کو اچھی طرح جانتا تھا اور ان سے کہا کہ اس لڑکے کی پڑھائی کا مناسب بندوبست کر دیجئے۔ اس واقعہ کی شہرت دُور دُور پہنچی اور لوگ چچا جان کا دیوتا کی طرح احترام کرنے لگے۔

۲

یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ چچا جان کی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی تھی، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ نماز کے بڑے پابند تھے۔ بلکہ کبھی تو مہینوں تک مسلسل تہجد بھی ادا کرتے رہتے تھے۔ تہجد کا شوق عام طور سے ان کو چلّے کے جاڑوں میں ہو جاتا تھا جبکہ بڑے بڑے تہجد گزار ٹال مٹول کرنے لگتے ہیں۔ اور وہ بھی عجب انداز سے۔ کبھی تو تہجد کا اتنا اہتمام ہوتا کہ اس کے لئے رات بھر کئی من لکڑیاں جلا کر حمام اور کمرہ گرم کیا جاتا۔ چچا جان تین بجے اُٹھ کر حمام میں جاتے۔ وہاں غسل کرتے اور پھر گرم کمرے میں آتے اور ساڑھے چار بجے تک نماز ادا کرتے اور گا گا کر مثنوی مولانا روم پڑھتے۔ اور کبھی الٹا ہوتا کہ اک دم سے سب سامان آسائش چھوڑ دیتے اور کڑکڑاتے جاڑوں میں تین بجے رات کو اُٹھ کر صحن میں رکھے ہوئے ٹھنڈے گھڑوں سے غسل کرتے اور کمبل اوڑھ کر برآمدے میں تہجد کی نماز ادا کرتے۔

چچا جان حج کو تو ریٹائر ہونے کے بعد گئے۔ لیکن اجمیر شریف ہر سال پابندی سے جایا کرتے تھے۔ اس کا بھی بڑا اہتمام ہوتا تھا۔ کھانے پینے کا ساز و سامان۔ غذا کے درجنوں ڈبے۔ پھل۔ بڑے بڑے تھرماسوں میں برف اور چائے۔ ساتھ دو تین ملازم، اس ٹھاٹھ سے چچا جان اجمیر شریف جاتے تھے۔ یہ سفر کبھی کبھار ریل پر اور عام طور پر دو یا تین کاروں پر کیا جاتا تھا۔ اکثر ان کے ساتھ بیوی اور بیٹیاں بھی ہوتی تھیں۔

ایک بار اس سفر میں مَیں بھی ساتھ تھا۔ دو کاروں پر سفر ہو رہا تھا اور طے یہ پایا تھا کہ دہلی گھومتے ہوئے جائیں گے۔ جس کار پر چچا جان تھے

وہ دہلی پہنچ کر کچھ خراب ہو گئی۔ جب مرمت کے لئے گیراج بھیجی گئی تو معلوم ہوا کہ تیاری میں تین دن صرف ہوں گے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر عرس کے خاص دنوں میں شرکت کرنا ہو تو ریل سے جانا چاہیئے۔ چچا جان یہ خبر سُن کر اُٹھے اور نئی دہلی سے گیارہ ہزار میں ایک نئی کار خرید لائے اور سفر بلا کسی رکاوٹ کے جاری رہا۔

چچا جان جب اجمیر شریف کے قُل یا قوالی میں شرکت کرتے تھے تو ان پر عجب محویت کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ وہ سر جھکائے بے حس و حرکت گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے۔ کبھی کبھی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی جو دیر تک جاری رہتی تھی اور ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے مزار کے سامنے سر اس زور سے پٹکا کہ گُلم پڑ گیا۔

ان باتوں کی وجہ سے چچا جان کی ہر جگہ عزت ہوتی تھی اور خدا بھی ان پر ایسا مہربان تھا کہ وہ مٹی کو بھی ہاتھ لگاتے تھے تو سونا بن جاتی تھی۔

۳

جہاں تک میرا اندازہ ہے چچا جان جتنا بھی کماتے ان کے پاس کبھی روپیہ رہتا نہیں تھا۔ بقول چچی جان کے ان کے ہاتھ میں چھید تھا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی رقم آتی تھی اور ہفتوں میں غائب ہو جاتی تھی۔

جب میں یونیورسٹی میں داخلہ لینے جانے لگا تو ایک ہزار روپوں کی ضرورت پڑی۔ میں نے چچا جان سے ایک مہینہ پہلے کہا۔ وہ بولے اچھا۔ پھر ایک ہفتہ پہلے کہا پھر انہوں نے جواب دیا اچھا۔ پھر دو دن پہلے کہا۔ انہوں نے جواب دیا "انتظام کر دیا جائے گا"۔ آخر جب آخری ریل کے چھوٹنے میں صرف چھ گھنٹے رہ گئے تو میں نے پھر کہا۔ وہ ذرا متفکر ہو گئے۔ پھر کہنے لگے۔

"سیٹھ رام داس کو ٹیلیفون کر کے بلا لو۔ اور آدمی کو خزانچی اور اوورسیر کو بلانے بھیج دو۔"

ایک گھنٹے میں یہ تینوں اکٹھا ہو گئے اور میرے سامنے اس طرح کارروائی شروع ہوئی۔

چچا جان۔ خزانچی صاحب فوری ضرورت کی مد میں آپ کی تحویل میں کتنا روپیہ ہے؟

خزانچی۔ ساڑھے سولہ سو۔

چچا جان۔ ہوں — (ذرا سوچ کر) کیوں اوورسیر صاحب بیلی گاؤں کی نہر کے پاس کچھ ملبہ اکٹھا ہو گیا ہے جس سے پل بند ہو گیا ہے، اور اس کو سخت خطرہ ہے۔ اس ملبے کی صفائی کی فوری ضرورت ہے۔

اوورسیر۔ جی ہاں حضور۔

چچا جان۔ پھر اس کی رپورٹ اور تخمینہ پیش کیجئے۔

اوورسیر نے خوشی خوشی پانچ منٹ میں یہ دونوں چیزیں تیار کر دیں۔

چچا جان۔ (سیٹھ صاحب سے) کیوں ٹھیکیدار صاحب آپ یہ کام کتنے میں کر سکتے ہیں۔

سیٹھ صاحب۔ (سب کی طرف دیکھ کر) ساڑھے سولہ سو میں۔

چچا جان۔ ٹنڈر لائیے۔

سیٹھ جی نے اسی وقت ٹنڈر لکھ کر دے دیا۔ چچا جان نے اس پر منظور لکھ کر دستخط کر دیئے۔ پھر کہنے لگے۔

"اوورسیر صاحب۔ نہر کی جانچ کیجئے کہ وہ صاف ہو گئی ہے یا نہیں۔ اور پھر رپورٹ پیش کیجئے!"

اوورسیر نے رپورٹ پیش کر دی۔ چچا جان نے اس پر منظور لکھ کر دستخط کر دیئے۔ پھر سیٹھ صاحب نے ساڑھے سولہ سو کا بل پیش کیا۔ چچا جان نے "فوراً ادا کر دیا جائے" لکھ کر اس پر دستخط کر دیئے۔ خزانچی نے کل روپیہ چچا جان کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ انہوں نے اس میں ایک ہزار نکال کر مجھے دے دیا اور پھر اُٹھ کر کمرے سے چلے گئے۔ جو روپیہ بچ رہا تھا اس کو تینوں نے کسی خاص قاعدے کے مطابق آپس میں بانٹ لیا اور چچا جان کو دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے۔

۴

ایک مرتبہ چچا جان پر بڑا سخت وقت پڑا۔ مگر کیا ہمت تھی کہ انہوں نے آخر وقت تک امید اور کوشش کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ کامیاب ہو گئے۔

جب ان کی چھوٹی لڑکی کی شادی ہونے والی تھی، اس وقت بھی روپیہ کی حسب دستور سخت کمی تھی۔ چچا جان ایک ہفتہ سے فکر مند تھے۔ ایک دن انہوں نے دو تین سیٹھوں، نہر کے انجنیئر، خزانچی اور کچھ اور معززین کو بند کمرے میں اکٹھا کیا۔ دن بھر بڑی سخت مصروفیت رہی۔ نقشے بنائے گئے۔ فارم چھپوائے گئے اور پھر ان کے خلنے بھرے گئے۔ ملازم اور چپراسی دوڑ دھوپ کرتے رہے۔ شام کے قریب یہ جلسہ برخاست ہوا اور چچا جان خوش خوش گھر کے اندر آئے اور چچی جان سے کہنے لگے اب پرسوں تمہارا گھر روپوں سے بھر جائے گا۔

شادی تو تھی ہی۔ روزانہ گانا بجانا ہوتا ہی تھا۔ لیکن اس دن بہت زور و شور سے گانا بجانا ہوا اور چچا جان نے بھی خلاف دستور اس میں دلچسپی لی اور رات گئے تک جاگتے رہے۔

دوسرے دن سہ پہر کو چچا جان کو ایک تار ملا۔ اس کو پڑھتے ہی ان کے مُنہ سے نکلا۔

"اے خدا رحم"

پھر سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا۔ میں اور منشی جی جو ان کے پاس بیٹھے تھے گھبرا گئے۔ دس منٹ کے بعد چچا جان عزم و ارادے کے پتلے بن کر اُٹھے اور مجھ سے کہنے لگے۔

"بیٹا فوراً کار لے کر جاؤ اور سیٹھ مکھن لال کو اپنے ساتھ لے آؤ۔ کہنا بے حد ضروری کام ہے"

پھر منشی جی کو حکم دیا کہ تم جا کر فلاں فلاں کو بلا لاؤ۔

میں نے سیٹھ جی سے کہا تو وہ جس حالت میں بیٹھے تھے ویسے ہی چلے آئے۔

چچا جان ان کی صورت دیکھتے ہی کہنے لگے۔

"سیٹھ جی غضب ہو گیا۔ کل صبح چیف انجنیئر معائنہ کے لئے آ رہا ہے"

سیٹھ جی یہ سُنکر گھبرا گئے۔ اور کہنے لگے۔

"یہ تو بُرا ہوا۔ کسی بدمعاش نے چغلی کھا دی"

چچا جان "میرا بھی ایسا ہی خیال ہے۔ اس وقت مجھے ساٹھ ہزار روپوں کی فوری ضرورت ہے۔ جس طرح بنے اور جتنے سُود اور جن شرائط پر بھی ممکن ہو آپ فوراً مہیا کر دیجئے۔ اس کی ضمانت میں میری کوٹھیوں اور کاروں میں سے جو چاہے رہن رکھ لیجئے۔ یا خرید لیجئے۔ یا مجھ سے پرونوٹ لکھوا لیجئے۔ بہر حال میں ہر چیز کے لئے تیار ہوں۔ مجھے روپیہ چاہیئے۔"

سیٹھ جی نے معاملے پر ذرا غور کیا پھر بہت شرافت دکھلائی اور کہنے لگے ۔

" مجھے آپ کی بدولت بہت کچھ مل چکا ہے ۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آج آپ کی حالت سے فائدہ اُٹھا کر آپ کی کوٹھیوں یا کاروں پر قبضہ کر لوں آپ دو سطریں لکھ دیجئے ۔ روپیہ حاضر ہے ۔"

چچا جان نے اپنے ذہن میں کام کا پورا نقشہ تیار کر لیا تھا ۔ روپیہ پاتے ہی انہوں نے سب سے پہلے مجھے حکم دیا کہ اجمیر شریف کے فلاں بزرگ کو تار دے دوں کہ " بُرا وقت پڑا ہے ۔ مزار پر جا کر دستگیری کی درخواست کیجئے ۔" پھر وہ خود کار پر بیٹھ کر مزاروں کی حاضری کے لئے نکل گئے ۔

شام کے قریب جب وہ گھر واپس آئے تو وہ سب لوگ جن کو انہوں نے بلوایا تھا وہاں موجود تھے ۔ چچا جان نے ان سب پر نظر ڈالی اور کہنے لگے " بہت ضروری اور فوری کام ہے ۔ دُگنی مزدوری اور کرایہ ۔۔۔ انعام الگ سے ۔"

پھر انہوں نے ٹھیکے داروں سے کہا کہ جتنے مزدور اور جتنے ٹرک ممکن ہوں ان کو فلاں جگہ نہر پر فوراً بھجوا دیجئے ۔ اوورسیروں کو حکم دیا کہ وہ فوراً موقع پر پہنچ جائیں ۔

چچا جان دستور کے مطابق صرف حکم دے کر بیٹھ نہیں رہے ۔ بلکہ ان کی تعمیل کرانے کار پر خود باری باری ہر ایک کے یہاں پہنچ گئے ۔ ایک ٹھیکیدار کے مزدور کام پر جانے میں پس و پیش کر رہے تھے ۔ چچا جان نے فوراً دو دو روپیہ ان میں تقسیم کر دیئے اور کہا کہ یہ مزدوری کے علاوہ ہیں ۔ بس پھر کیا تھا سب فوراً روانہ ہو گئے ۔

گیس کے ہنڈے والے کے یہاں گئے تو وہ ٹھیکیدار سے عذر کر رہا تھا کہ مَنٹل سب ٹوٹے ہوئے ہیں اور رات زیادہ آ گئی ہے ، بازار بند ہو چکا ہے ۔ اس لئے مَنٹل خریدے بھی نہیں جا سکتے ہیں ۔ چچا جان نے فوراً جا کر ایک دکان کھلوائی اور ایک گُرس مَنٹل دس گنے داموں پر خرید لئے ۔

تقریباً گیارہ بجے رات تک مزدور مع ساز و سامان کے ٹرکوں پر لد لد کر نہر پر پہنچ گئے ۔ ان مزدوروں کو چار میل میں پھیلا دیا گیا ۔ گیس کے ہنڈے مسلسل نصب کر دیئے گئے اور حکم دیا گیا کہ ٹرک مٹی بھر بھر کر لائیں گے ۔ مزدور ان کو ڈلیا میں لے جا کر نہر میں جس میں پانی نہیں تھا ڈالیں گے ۔

کام شروع ہو گیا ۔ ٹرکوں پر مٹی آنے لگی اور نہر میں ڈالی جانے لگی ۔ چچا جان کار پر دوڑے دوڑے پھر رہے تھے ، جہاں کام میں خامی نظر آتی اس کو دُور کرتے اور جو ٹھیکیدار یا مزدور اچھا کام کرتا نظر آتا اس کو کبھی پانچ کا اور کبھی دس کا نوٹ تھما دیتے ۔ اس طرح انہوں نے نہ تقسیم کئے ہوں گے تو دس ہزار کے نوٹ تو تقسیم ہی کر دیئے ہوں گے ۔

صبح پانچ بجتے بجتے کام ختم ہو گیا ۔ مزدور سب سامان لیکر ٹرکوں پر چلے گئے ۔ بہت دبادہ ریزی سے تمام نشانات مٹا دیئے گئے ۔ ساڑھے پانچ بجے تک نہر میں پانی آ گیا ۔

چچا جان نے رات کو گیارہ بجے اپنی کار پر ایک ہرکارے کو نہر کے بند پر جو نوّے میل پر تھا یہ حکم دے کر بھیجا تھا کہ نہر کا پانی ٹھیک ۴ بجے کھول دیا جائے ۔ ہرکارے کو یہ بھی حکم دیا تھا کہ بند سے آدھ میل پہلے کار سے اُتر جانا اور بند کے اوورسیر سے کہنا کہ میں ریل سے آ رہا ہوں ۔

صبح چھ بجے چچا جان گرد و غبار میں اَٹے ہوئے گھر آ گئے اور غسل خانے چلے گئے ۔ اِدھر وہ غسل خانے گئے ہیں اور اُدھر چیف انجنیئر صاحب مع اپنے اسٹاف کے آن پہنچے ۔ میں نے ان لوگوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھلایا ۔

چیف انجنیئر کے چہرے پر جو ولایت پلٹ نوجوان تھا عجیب شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔ اور میں اس مسکراہٹ پر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ کیونکہ مجھے اپنی جگہ یقین تھا کہ چچا جان کی جیت ہو چکی ہے۔

چچا جان آئے۔ پھر چائے آئی۔ چائے کے بعد چچا جان نے کہا۔

"حضور۔ آپ کا تار مجھے کل چار بجے ملا اور میں دو بجے کی گاڑی سے ہرکارے کو یہ حکم دے کر بھیج چکا تھا کہ نہر کا پانی کھول دیا جائے۔ تار پانے کے بعد اس حکم کو نہ روکا جا سکا، کیونکہ ٹیلی فون کی لائن خراب تھی"۔

چیف انجنیئر نے لاپروائی سے کہا۔

کوئی بات نہیں۔ ہم لنگڑ ڈالکہ سطح کو ناپ لیں گے۔

ڈیڑھ بجے چیف انجنیئر مع چچا جان کے نہر سے واپس آیا تو اس کے چہرے پر کچھ حیرت اور کچھ شرمندگی تھی۔ کھانے کی میز پر کہنے لگا۔

"آپ بڑے ہوشیار ہیں"۔

میں اندازہ نہ کر سکا کہ اس جملہ میں طنز تھا یا تعریف۔

چچا جان نے ادب سے جواب دیا۔

"جی میں کس لائق ہوں۔ آپ لوگوں کی صحبت کا اثر ہے"۔

پھر ذرا دیر کے بعد چیف انجنیئر نے کہا۔

"کہیں کہیں تو مٹی آپ کے تخمینے سے بھی زیادہ نکلی"۔

"غالباً پانی آجانے سے ایسا ہو گیا"۔

چیف انجنیئر کے جانے کے بعد چچا جان نے نہ صرف بڑی دھوم دھام سے بزرگوں کی نذر نیاز کی۔ بلکہ سینکڑوں روپیہ کی خیرات بانٹی۔ شہر والوں کو پوری بات تو معلوم نہیں ہوئی تھی لیکن کچھ سُن گُن لگ گئی تھی کہ اُوپر کی آمدنی کے سلسلے میں انجنیئر صاحب کو کچھ پریشانی ہو گئی ہے۔ جب ان کو نذر نیاز کی خبر ملی تو مبارک باد دینے آئے۔ آنے والوں میں سرکاری افسران، شرفائ، اور مذہبی پیشوا سب ہی طرح کے لوگ تھے۔

۵

چچا جان کا آخری اور سب سے شاندار کارنامہ مہاکوسی ڈیم تھا۔ جس کی تعمیر میں انہوں نے پانچ سال صرف کئے تھے۔ اور جس کے سلسلے میں انہوں نے تین انگریزوں کو ایک مہینہ ہمالیہ کی وادیوں میں شکار کھلایا تھا۔ اور اس طرح شکار کھلایا تھا کہ جنگل میں منگل کر دیا تھا۔ کیمپ پر شہر سے برف میں لگی ہوئی شراب اور سوڈے کی بوتلیں روزانہ جاتی تھیں اور ہر دوسرے تیسرے وہاں محفلِ رقص و سرود بھی گرم ہوتی تھی۔

اس بند کا بنیادی پتھر سرکاری طور پر تو گورنر نے رکھا تھا۔ لیکن حقیقی طور پر چار شاہ صاحبوں نے رکھا تھا جن کو چچا جان نے اجمیر شریف اور دوسرے متبرک مقاموں سے بلوایا تھا۔ کیونکہ چچا جان کو اس بات کی بڑی فکر تھی کہ اس بند کو اس کے منصوبے کے مطابق دو سو برس تک چلنا چاہیئے۔ اور ان کا خیال تھا کہ یہ طاقت سیمنٹ میں نہیں صرف بزرگوں کی دعاؤں میں ہے جو بند کو اتنے زمانے تک برقرار رکھ سکتی ہے۔

چچا جان نے مضبوطی کے خیال سے سیمنٹ ایک خاص انگریزی کارخانے کی منظور کی تھی۔ ایک مرتبہ چچا جان معائنہ کر رہے تھے کہ اوورسیروں کے سامنے ایک ٹھیکیدار کہنے لگا۔

"حضور جو سیمنٹ آرہی ہے اس میں میل ہے"

چچا جان نے ڈانٹ کر کہا۔

"کیا بکتا ہے۔ یہ سیمنٹ خاص انگلستان کی کارخانے کی ہے۔"

پھر ادور سیروں نے اس گدھے کی خوب خبر لی۔

چچا جان کو مہاکوسی ڈیم کی تعمیر کے سلسلے میں جو اس جگہ پانچ سال رہنا پڑا تو ان کو اس جگہ سے محبت ہو گئی۔ ایک دن وہ مجھ سے اور اپنے چھوٹے بھائی سے کہنے لگے۔

"مرنے کے بعد مجھے یہیں دفن کرنا۔"

پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولے۔

"وہ ٹیلا مناسب رہے گا۔"

ہم لوگ چچا جان کے جذبات کو سمجھ گئے۔ ایک تو مقام پُر فضا تھا اور دوسرے چچا جان کا شاہکار مہاکوسی ڈیم وہیں واقع تھا۔ اگر وہاں قبر بنے گی تو آنے جانے والے ڈیم کے ساتھ اس کے بنانے والے کی قبر کی بھی زیارت کر سکیں گے۔ لیکن جس ٹیلے کی طرف انہوں نے اشارہ کیا تھا وہ آس پاس کی جگہوں کو دیکھتے ہوئے دیرانہ تھا۔ اس انتخاب پر ہم دونوں کو بہت حیرت ہوئی۔ لیکن دفن کی بات تھی اس لئے کچھ کہتے نہ بنا۔

آج میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ کتنے دُور نظر تھے اور کتنے پتے کی بات کہی تھی!! اگر آج ان کی قبر اس ٹیلے پر بنی ہوتی تو ڈیم کے ٹوٹ جانے سے جو سیلاب آیا تھا اس کی شکار نہ ہوتی۔

۶

مہاکوسی ڈیم کے ٹوٹنے کی خبر میں نے جب اخبار میں پڑھی تو اک دم سے چچا جان یاد آگئے اور دل نے کہا کہ پندرہ سال ہوئے جب میں نے ان کو نذرِ خاک کیا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن۔ ایک بار بھی تو قبر پر فاتحہ پڑھنے نہیں گیا۔ اب تو بلا چلے قرار نہ آئے گا۔ اب تو یہ بھی دیکھنا ہے کہ ان کی قبر کو کوئی صدمہ تو نہیں پہنچا۔

جب میں ڈیڑھ دن ریل اور لاری کا سفر کر کے یہاں پہنچا تو یہ افسوسناک نظارہ دیکھا کہ بند کے ساتھ بنانے والے کا بھی نام و نشان غائب ہو گیا ہے۔

آج مہاکوسی ندی کے نیچے کا نظارہ کتنا مختلف ہے!! باغوں کے درخت اُکھڑ گئے ہیں۔ کھیت بہہ گئے ہیں۔ دیہات ٹوٹی ہوئی دیواروں اور سڑے گلے چھپروں کے ڈھیر بن گئے ہیں۔ نہ کہیں دھواں نظر آتے ہیں۔ نہ چرچا ہے۔ نہ صدائیں ہیں اور نہ نالہیں۔ انسانوں کے بجائے گدھوں کی ٹولیاں جگہ جگہ نظر آرہی ہیں جو غالباً ان مویشیوں کی لاشوں کو کھا رہی ہیں جو سیلاب میں ڈوب مرے تھے۔ یا ہو سکتا ہے وہ لاشیں انسانوں ہی کی ہوں جن کو ابھی تک ریلیف والے کارکن ہٹا نہ سکے ہوں۔

ڈیم کے دو دور ٹوٹے ہوئے ہیں اور ندی کا پانی ان سے کچھ ایسے شور سے نکل رہا ہے جو پہلے کی طرح خوشی کی چیخوں سے نہیں بلکہ گریہ و زاری اور بین سے زیادہ مشابہ ہے۔

ندی کے نیچے ایک فرلانگ پر . . . . ایک جھاڑی سے بہت سا آخور اور کسی جانور کی لاش اُلجھی ہوئی نظر آرہی ہے۔ میرا دل کہتا ہے ہو نہ ہو اسی جگہ چچا جان کی قبر ہے۔

گٹاری کے انڈے

دیوندر ستیارتھی

منہ میں کوئی کیڑا یا کوئی ننھا کوڑا یا ٹڈا اٹھائے گٹاری اپنے گھونسلے میں گھس جاتی۔ گھونسلے کا دروازہ ایک معمولی سوراخ ہی تو تھا۔ اوپر کی منزل میں کوکڑو والے غسل خانہ کی چھت پر جہاں ٹین کی چادر کا سرا کاریگر نے باہر کو بڑھا رکھا تھا، بس وہیں اس ٹین کے نیچے دیوار کے آخری سرے میں یہ سوراخ تھا جو گٹاری کے گھونسلے کا دروازہ تھا۔ نیچے رسوئی کے دروازے پر کھڑے کھڑے بدھ سنگھ گٹاری کو اپنے گھونسلے میں داخل ہوتے دیکھتا اور سوچتا کہ ماں کی محبت دنیا میں سب سے بڑی چیز ہے اور دنیا کی کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

جب گگی کی ماں آیا پر ڈانٹ ڈپٹ کرتی کہ آج اس نے گگی کو وقت پر کھانا کیوں نہیں کھلایا، بدھ سنگھ کی نگاہ میں گٹاری کی شخصیت ابھر کر اونچی اٹھ جاتی۔ جب کوئی خوفناک بات ہوتی گٹاری کا جوڑا رسوئی کے بغل والے پیڑ پر بیٹھ کر ایسی ایسی آوازیں نکالتا کہ بدھ سنگھ بڑی چوکسی سے ادھر ادھر دیکھتا۔ وہ کہتا "یہ گٹاری سے بڑا انسان کا دوسرا دوست نہیں ہو سکتا۔ سانپ کو دیکھ کر سب سے پہلے گٹاری ہی شور کرتی ہے"

اس مکان میں ہمیشہ نہیں تو کبھی کبھار سانپ نظر آ جاتا تھا۔ گٹاری کی چیخ پکار ہی سانپ کی موجودگی کا پتہ دیتی۔ اس وقت بدھ سنگھ ہاتھ میں لٹھ اٹھائے سانپ کی تلاش میں نکل پڑتا۔ جب سے وہ اس گھر میں آیا تھا، چنار کے نیچے تین چار سانپ مار چکا تھا۔

بدھ سنگھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا۔ بات کرتے وقت یوں سامنے آتا جیسے مداری کے سامنے جمورا۔ سامنے والے شخص کا جائزہ لیتا اور پھر پنسے تلے انداز میں اپنا فلسفہ بگھارنے لگتا ——— "ہاتھوں سے دی ہوئی گانٹھیں انسان کو منہ سے کھولنی پڑتی ہیں۔ ہمارے گورو مہاراج کا کہنا ہے کہ سوچ کر بولو، سوچ کر کام کرو۔" گھر والے اس سے خوش تھے۔ کیونکہ اپنے کام کے علاوہ وہ دوسروں کا کام بھی بخوشی کر دیتا۔ فرش پر بکھری ہوئی کتابیں کو ٹھیک کر دیتا۔ سانپ کا ذکر آنے پر تو وہ غصہ میں آ جاتا۔ کہتا "میں اس پر جھپٹ پڑوں گا، ایک ہی ڈنڈے سے اس کی سری توڑ دوں گا"۔ اس کی آواز میں اتنی گرمجوشی تھی کہ اس کی بات پر یقین کرنا پڑتا۔ ضروری اور غیر ضروری بات میں وہ بہت فرق نہیں کر سکتا تھا۔ وہی گرمجوشی، وہی ہلچل پیدا کرنے والی آواز۔ جب وہ بات کرتا تو اس کے ابھرے ہوئے گالوں کی ہڈیاں ابھرتی نظر آتیں۔ اس وقت اوپر کھڑکی کے دروازے پر بیٹھا گٹاری کا جوڑا انکھی سی آوازیں بولنے لگتا۔ بدھ سنگھ سوچتا کہ گٹاری اس کی داد دے رہی ہے۔

کوئی بدھ سنگھ سے بات کرے نہ کرے کبھی کبھی وہ رسوئی کے برانڈے میں اونچی آواز میں خود ہی باتیں کرتا رہتا۔ ابھی گھر کی کسی بات پر تبصرہ کیا جا رہا ہے۔ ابھی ریڈیو پر سنی ہوئی کسی خبر کو لے کر نمک مرچ لگایا جا رہا ہے۔ بات کرتے وقت وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتا۔ اسے اس بات کا سب سے بڑا اطمینان تھا کہ گھر میں اس کا اعتبار ہے اور وہ اپنا کام ایمانداری سے کرتا ہے۔ جتنے مہمان آتے ان کے ساتھ بدھ سنگھ کا سلوک ہمیشہ خوشگوار رہتا۔ بچوں سے اسے بے حد محبت تھی۔ گگی کی ماں اس پر اس لئے بھی خوش تھی کہ گگی کا جتنا خیال وہ رکھتا ہے، آیا بھی نہیں رکھتی۔ چنار کی ٹہنی پر بیٹھ کر گٹاری اپنی زبان میں

کچھ کہنے لگتی تو بدھ سنگھ پاس کھڑے ہوکر اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا۔ اُسے محسوس ہوتا کہ گٹاری کہہ رہی ہے ——— بدھ سنگھ! میں جانتی ہوں کہ تم اکیلے تین آدمیوں کا کام کرتے ہو! وہ دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ بڑی معصومیت سے وہ گٹاری کی طرف دیکھتا۔ جیسے کہہ رہا ہو ——— میں تو تمہارا بھی اُتنا ہی نوکر ہوں، گٹاری، جتنا گلّی کی ماں کا!

بجلی کے تار پر لٹکتا ہوا کوّا بھی بدھ سنگھ کو جانتا ہے۔ کم سے کم بدھ سنگھ کا یہی خیال تھا۔ کوّے کی کائیں کائیں سے بدھ سنگھ کو پتہ چل جاتا کہ کوّا بھوک سے چلا رہا ہے یا خوشی کا سُر بھر رہا ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ کوّا غصّہ میں ہوتا۔ اُس وقت چنار کے پیڑ پر بیٹھی گٹاری چلّا کر بدھ سنگھ سے شکایت کرتی۔ بدھ سنگھ لاٹھی گھما کر کوّے کو اُڑا دیتا۔ کیونکہ بدھ سنگھ کو معلوم تھا کہ گٹاری اور کوّے کا پُرانا بیر چلا آتا ہے اور کوّے کی موجودگی میں گٹاری کو یہ محسوس نہیں ہو سکتا کہ اُس کا گھونسلا سلامت ہے۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ کوّے اور گٹاری کا بیر ختم کیوں نہیں ہو سکتا۔ کوّے اور گٹاری کی غیر موجودگی میں وہ اپنے دل سے باتیں کرتے ہوئے اِسی موضوع پر سوچنے لگتا اور پھر جیسے کچن کی دیواروں کو سنانے کے لئے اُونچی آواز میں کہنے لگتا "گٹاری تو بہت معصوم پنچھی ہے۔ وہ بیچاری تو کوّے کو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کوّا ہی اُس کے بچّوں کا دشمن ہے۔ کمبخت کو کسی کا گھونسلا اُجاڑنے میں نہ جانے کیا ملتا ہے! اپنے آپ کو گٹاری کی خدمت کے قابل بنانے کے لئے وہ کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتا۔ ساتھ ہی اُس کی یہ خواہش نہ تھی کہ گٹاری اُس کا شکریہ ادا کرے۔ کوّے پر اُسے غصّہ آنے لگتا۔ شیطان کو گٹاری پر ذرا رحم نہیں آتا۔ آخر گٹاری اُس کا کیا بگاڑتی ہے؟

صبح کو جاگنے پر بدھ سنگھ کی نگاہ گٹاری کے گھونسلے پر پڑتی۔ گٹاری کو گھونسلے کے قریب بیٹھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا۔ اُس کی سب سے بڑی دلچسپی تھی گلّی کو مسکراتے اور مچل مچل کر باغیچے کی روش پر اُچھلتے کودتے دیکھنا، گلّی کی ماں کے مُنہ سے ایک آدھ تعریف کا بول سن لینا، یا پھر کسی مہمان کے مُنہ سے زمانے کے حالات پر ہلکا پھلکا سا تبصرہ سُن کر اُس کے بارے میں رائے قائم کرنا۔ لیکن اس سے اُتر کر اگر اُسکی کوئی دلچسپی تھی تو وہ تھا گٹاری کا گھونسلا۔ جب بھی گٹاری انڈے دیتی بدھ سنگھ سوچتا کہ گٹاری کی نئی نسل شروع ہونے والی ہے۔ انڈوں سے بچّے نکلنے کا اُسے بے حد انتظار رہتا۔ اُن دنوں وہ خاص طور پر گٹاری کے گھونسلے کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے اُوپر لے لیتا۔ اُس کی نگاہ سیدھی گٹاری کے گھونسلے پر پہنچتی۔ حالانکہ زمین پر کھڑے کھڑے یہ ناممکن تھا کہ کوٹھی کی اُوپر کی منزل میں نکڑ والے غسلخانہ کی چھت پر ٹین کی چادر کے بڑھے ہوئے سِرے کے نیچے دیوار کے آخری سِرے کے گول سوراخ کے اندر کی دُنیا کے بارے میں کوئی بات دریافت کی جا سکے۔ کھڑکی پر بیٹھی گٹاری کی آواز میں چہل اور لوری کی آمیزش دیکھ کر بدھ سنگھ اندازہ لگا لیتا کہ گٹاری کے انڈوں سے بچّے نکل آئے ہیں۔

گٹاری انسان کی سب سے بڑی دوست ہے! ——— یہ بدھ سنگھ کا تکیہ کلام تھا۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ آیا سے بات کرتے وقت وہ عورت کو گٹاری سے تشبیہ دیتا۔ لیکن اس کے باوجود عورت کا صحیح تصوّر بدھ سنگھ کے ذہن کو کبھی نہ گدگداتا۔ اسی لئے تو اُس نے کبھی بھُول کر بھی بیاہ کی بات نہ سوچی تھی۔ اُس کے ہاتھ کام کرتے کرتے بہت کھردرے ہو گئے تھے۔ بیوی ہوتی تو کبھی اُس کے ہاتھوں پر تیل ہی چُپڑ دیا کرتی۔ لیکن اُس نے تو قسم کھا رکھی تھی کہ بیاہ کے جھگڑے میں نہ پڑیگا۔ بیوی کی غیر موجودگی کا تصوّر اُسے کبھی تنگ نہ کرتا۔ آیا کے چوڑے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اکثر سوچتا کہ بُڑھیا اپنے بیٹوں کی سعادت مندی حاصل نہ کر سکی۔ ورنہ اس عمر میں اُسے آیا کا کام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اُس نے ایسے باپ بھی دیکھے تھے جن کے بیٹے اُن پر بھُوکے ریچھوں کی طرح جھپٹتے تھے۔ ایسی مائیں بھی دیکھی تھیں جن کے بیٹے بیویوں کے غلام ہو کر اپنی ماؤں کو ایسی جلی کٹی سُنا ڈالتے تھے کہ سننے والے کو مُنہ میں اُنگلی دبا کر رہ جانا پڑتا تھا۔ ایسے بیٹے پیدا کرنے سے کیا حاصل۔ بس یہی سوچ کر اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اکیلا رہے گا۔ دم کا دم، نہ دھوکا نہ غم ——— یہی اُس کا فلسفہ تھا۔ پھر بھی گٹاری کے لئے اُس کی محبت اُمڈی پڑتی تھی۔

بُدھ سنگھ کا چہرہ کبھی اُداس نہ ہوتا۔ اُس کی آواز میں کبھی تکان کا گمان نہ ہوتا۔ یہ وہ خود بھی جانتا تھا کہ وہ دوسرے نوکروں سے کتنا مختلف ہے۔ ایک طرح سے وہ چوبیس گھنٹے کام کرتا تھا۔ نوکری میں ناغے کا تو سوال ہی نہ اُٹھ سکتا تھا۔ گُلّی کی ماں کو کبھی اُس پر جُرمانہ کرنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ بلکہ وہ تو اس بات کے انتظار میں رہتی کہ کبھی تو بُدھ سنگھ بھی چھُٹّی مانگے "کبھی تو چھُٹّی بھی منانی چاہیئے" گُلّی کی ماں اُس سے کہا کرتی "مہینے میں ایک بھی چھُٹّی نہ منائے تو انسان کی زندگی میں گھُن لگ جائے!" لیکن بُدھ سنگھ تھا کہ اُسے گھُن کا ڈر نہ تھا۔

گُلّی کی ماں کی ساس بھی تو اِسی کوٹھی میں رہتی تھی۔ صحیح معنوں میں بُدھ سنگھ گُلّی کی ماں کی ساس کا نوکر تھا جنہیں ہر کوئی احترام سے بھابوجی کہہ کر پکارتا۔ بھابوجی پر تو بُدھ سنگھ جان دیتا تھا۔ جب بھابوجی کبھی بیمار پڑتیں تو بُدھ سنگھ آدھی رات کو اُٹھ اُٹھ کر پوچھتا "بھابوجی! کچھ چاہیئے تو نہیں؟" بھابوجی اُسے بیٹے سے بڑھ کر سمجھتی تھیں۔ اسی لئے کبھی بُدھ سنگھ کسی بات سے جھنجلا کر تھوڑا ناراض بھی ہو جاتا تو بھابوجی بُرا نہ مناتیں۔ اُن کا خیال تھا کہ بُدھ سنگھ دل کا سچا ہے۔ اُس کی بات چیت کا کھُردرا پن بھابوجی کو ذرا بھی تو نہ اکھرتا۔ کیونکہ بُدھ سنگھ نے اپنے منہ سے یہ بھی تو نہ کہا تھا کہ اُسکی تنخواہ بڑھا دی جائے۔ گُلّی کی ماں بُدھ سنگھ پر اس لئے بھی خوش تھی کہ جہاں وہ بھابوجی کا پورا خیال رکھتا ہے وہاں ضرورت پڑنے پر خاص خاص مہمانوں کے آنے پر وہ سب چیزیں تیار کر دیتا ہے جن پر کشمیری رسوئیے کا ہاتھ ٹھیک نہیں چلتا۔

بھابوجی ذرا پُرانے خیالات کی تھیں۔ اس لئے وہ گُلّی کی ماں کے کچن سے الگ اپنی رسوئی بنواتی تھیں۔ بُدھ سنگھ اُن کا رسوئیا بھی تھا اور پرائیویٹ اسسٹنٹ بھی۔ کیونکہ وہ ہر کام میں بُدھ سنگھ کی صلاح لیتیں۔ گُلّی کی ماں کے بارے میں اُن کی رائے بہت اچھی تھی اکثر وہ یہ کہا کرتی تھیں کہ اگر کوئی اُن کی سگی بیٹی بھی ہوتی تو شاید اُن کی اتنی سیوا نہ کرتی۔ بھابوجی بھابوجی کہتے گُلّی کی ماں کی زبان سُوکھتی تھی۔ بھابوجی کو سب سے بڑی حیرت تو اس بات پر تھی کہ گُلّی کی ماں کا جنم اس قوم میں ہوا جس کی اِس دیس پر حکومت رہی۔ لیکن کس طرح اُن کے بیٹے کے ساتھ انگلینڈ سے یہاں آنے پر اُس نے اپنی طبیعت کو اِس دیس کے مطابق ڈھال لیا تھا، کس طرح وہ یہاں کے تمدّن میں رچ بچ گئی تھی، یہ بات سچ مچ بہت بڑی تھی۔ اِس دیس میں آنے کے بعد بھابوجی کے بہو بیٹے کو کچھ کم کشمکش کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ لیکن کیا مجال کہ بھابوجی نے اپنی بہو کے ماتھے پر تیوری دیکھی ہو۔ خیر اب تو اُن کی زندگی ایک ڈھب پر آگئی تھی۔ گُلّی کی ماں لڑکیوں کے کالج میں پروفیسر تھی۔ اور گُلّی کے پتاجی پھر سے وہ میگزین نکالنے جا رہے تھے جس کے ذریعہ اُنہوں نے انگلینڈ سے لوٹنے پر اِس دیس کی بہت بڑی خدمت سرانجام دی تھی اور جسے اقتصادی وجوہات کے باعث بند کر دینا پڑا تھا۔ بُدھ سنگھ پر گُلّی کے پتاجی بھی بہت خوش تھے اور بھابوجی کے کمرے میں بیٹھ کر وہ اکثر کہا کرتے "دیکھ بُدھ سنگھ! تیری بڑی برخورداری ہے کہ بھابوجی کا سارا کام اپنے ذمّے لے رکھا ہے" اور بھابوجی کہتیں "بیٹا! جیسے تم میرے بیٹے ہو ویسا ہی بُدھ سنگھ بیٹا ہے۔ میری بس ایک ہی اِچھا ہے کہ بُدھ سنگھ بیاہ کر لے۔ اُسکی بھی ایک بیٹی ہو گُلّی جیسی!" گُلّی کے پتاجی کہتے "واہ بھابوجی، ڈگری کرا دو بُدھ سنگھ کی ڈھائی ہزار کی۔ اتنا تو بیچارے نے جوڑا بھی نہ ہوگا!" بُدھ سنگھ یہ سُنتا تو کچن کی طرف چلا جاتا۔ اور اُس وقت اگر گُلّی کی کھڑکی سے بول اُٹھتی تو اُسے محسوس ہوتا کہ گُلّا ری پوچھ رہی ہے۔ "تم کب بیاہ کراؤ گے، بُدھ سنگھ؟" وہ کچن سے باغیچہ کی طرف چلا جاتا۔ جیسے بیاہ کی بات کو اَن سُنا کرنے کے لئے وہ بڑی سے بڑی جدوجہد کر سکتا ہو۔

وہ کئی بار رات کو دبے پاؤں بھابوجی کے کمرے میں جاتا اور سوتے میں اُن کا گمبھیر چہرہ دیکھ کر اُسے بڑی خوشی ہوتی۔ دبے پاؤں وہ اُس کمرے سے چلا آتا۔ بھابوجی کا رعب دیر تک اُس کی آنکھوں میں تیرتا رہتا۔ اُن کی گہری اور ہمدرد آواز جیسے اس وقت اُس کے کانوں میں برابر گونج رہی ہو۔ اُسے خیال آتا کہ سوتے سے ایک لمحہ کے لئے جاگ کر بھابوجی اُس سے یہی کہیں گی "بُدھ سنگھ! اب تو تمہیں بیاہ کرانے میں دیر نہ کرنی چاہیئے۔"

وہ جواب کے لئے تیار رہتا " نہیں بھابو جی! یہ نہیں ہو سکتا۔ جس نے ہمیشہ کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالنا ہو وہ بیاہ کرلیتے، میں تو آزاد ہوں!"

کچن کے برانڈے میں کھڑے کھڑے کبھی کبھی بدھ سنگھ اپنے دل سے باتیں کرتے کرتے اونچی آواز میں کہنے لگتا "گٹاری دوانڈے دیتی ہے ایک ساتھ، دوانڈے۔ بیس پچیس دن اِن انڈوں کو سینا ہوتا ہے، آدھے دن گٹاری سیتی ہے، آدھے دن گٹارا سیتا ہے۔ لیکن عورت اور مرد کبھی اپنے کام بانٹ بانٹ کر نہیں کرتے۔ اسی لئے تو بیاہ مصیبت بن جاتا ہے۔ نہیں بھابوجی نہیں۔ بدھ سنگھ بیاہ نہیں کرے گا۔ بدھ سنگھ اتنا بدھو نہیں ہے کہ اپنے پیروں میں ایک زنجیر ڈال لے۔ بھابوجی! پھر بدھ سنگھ آپ کی سیوا بھی نہیں کر سکے گا بدھ سنگھ۔ اُسے بیاہ کرنے کو نہ کہنا بھابوجی!"

گٹاری کی زرد چونچ بدھ سنگھ کو بہت پیاری لگتی تھی۔ گٹاری کے پیر بھی تو زرد تھے۔ اِن کے بارے میں بدھ سنگھ مزے لے کر وہ قصّہ چھیڑ دیتا۔ "گٹاری کے پیر اپنے نہیں ہیں۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے جب گٹاری کے پیر اپنے ہوتے تھے۔ وہ مور کے سامنے ناچنے لگی۔ مور نے خوش ہو کر کہا، مانگ لے گٹاری جو تیری اِچھا ہو، گٹاری نے مور سے کہا۔ تم میرے ساتھ اپنے پیر بدل لو۔ مور نے سوچا وچن دیا ہے تو پورا کرنا چاہیئے۔ بس جی مور نے اپنے پیر گٹاری کو دے دیئے اور گٹاری کے پیر خود لے لئے۔ آج تک مور کو اس بات کا افسوس ہے۔ یہ سودا بڑا خسارے کا رہا۔ گٹاری تو مور کے پیر لے کر پہلے سے کہیں زیادہ سندر ہو گئی اور مور اب تک روتا ہے۔ جب بھی مور ناچتا ہے اپنے پیروں کو دیکھے بنا نہیں رہ سکتا۔ کہتا ہے۔ میں اتنا سندر ہوں لیکن میرے پیر کتنے بھونڈے ہیں" اور اگر اُسے اوپر کھڑکی پر بیٹھی ہوئی گٹاری نظر آجاتی تو وہ پکار کر کہتا "تو بڑی چالاک نکلی۔ تو نے مور کے پیر اُڑا لئے بات بات میں۔ واہ ری میری چلبلی گٹاری! واہ ری چھنال!" گٹاری کے پر سیاہی مائل بھورے نہ ہوتے تو زرد چونچ اور زرد پیر اتنے خوبصورت نہ لگتے، یہ سوچ کر بدھ سنگھ ٹکٹکی باندھے گٹاری کی طرف دیکھتا رہتا۔

بھابوجی اکثر بدھ سنگھ کو اپنے آپ سے باتیں کرتے سُنتیں اور سمجھاتیں "اس طرح تو تیرا دماغ پھر جائے گا بدھ سنگھ! تو اپنے آپ سے باتیں نہ کیا کر" لیکن بدھ سنگھ کہتا "میرے گرو مہاراج کا کہنا ہے بھابوجی، کہ اچھا جینا ایسے ہی ہے جیسے کھیرے کا کھانا۔ جیسے کھیرے کو ایک سرے سے تھوڑا سا کاٹ کر اور اس ٹکڑے کو باقی کھیرے پر اُسی جگہ جہاں سے وہ کاٹا گیا ہے گھسا کر کھیرے کا کڑوا پانی نکال دیا جاتا ہے ایسے ہی آدمی کو ایکانت میں اپنے مَن سے باتیں کرنے کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ ایسا کرنے سے جینے کا کڑوا پانی اور مفات زہر نکالا جا سکتا ہے" بھابوجی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتیں۔ بدھ سنگھ یہ نہ سمجھ سکتا کہ بھابوجی کیوں ہنس رہی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد بھابوجی دُور سے بدھ سنگھ کو اپنے آپ سے باتیں کرتے سُنتیں "گرو مہاراج کا کہنا ہے کہ کئی باتوں میں انسانوں سے پرندے اچھے ہیں۔ اور کئی باتوں میں پرندوں میں بھی وہی بیماری پھیلی ہوئی ہے جو انسانوں میں۔ اب کوئی کوّوں سے پوچھے کہ وہ گٹاریوں کے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہیں تو وہ کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کوّوں اور گٹاریوں کی دوستی ہو جائے۔ یہ دو دشمنی کیسے ہو اس کا اُپائے گرو مہاراج کے پاس ضرور ہو گا۔"

گگی کی ماں چائے کی میز پر اپنے خاوند سے بحث میں اُلجھ کر گم ہو جاتی یا جب ایسے موقعوں پر گگی کے پتاجی کسی بات پر جھنجھلا اٹھتے تو بدھ سنگھ بھابوجی سے بات کرتے ہوئے کہتا "گورو مہاراج کا کہنا ہے بھابوجی کہ کھارے کوئیں کا پانی کبھی میٹھا نہیں ہو سکتا۔ چاہے کوئیں میں من بھر کھانڈ ڈال دیں" بھابوجی کہتیں "تو کہنا کیا چاہتا ہے بدھ سنگھ؟" وہ بات کو ٹالتے ہوئے کہتا "بھابوجی، میں پوچھتا ہوں کیا گٹاری اور گٹارا میں بھی اَن بَن رہتی ہو گی؟" بھابوجی ہنس کر کہتیں "تو پاگل ہو جائے گا، بدھ سنگھ! جب دیکھو گٹاری کی بات۔ گٹاری تیرے دماغ پر بیٹھ گئی ہے۔ تجھے کیا ہو گیا ہے؟" اس کے جواب میں اُلٹی سیدھی ہانکتے ہوئے وہ کہتا "بھابوجی، سانپ کے بچے کبھی انسان کے دوست نہیں ہو سکتے چاہے انہیں من بھر دودھ پلا یا جائے" بھابوجی حیرت سے بدھ سنگھ کی طرف دیکھتیں۔ بدھ سنگھ کی آواز سیٹی کی طرح گونجتی۔ بھابوجی سوچتیں کہ بدھ سنگھ میں ایک ہی کمی رہ گئی۔ وہ پڑھا لکھا ہوتا تو بڑوں بڑوں کے کان کترتا۔

جب سے بھابو جی نے چار پانچ مرتبہ بدھ سنگھ کو گٹاری کا ذکر کرنے سے ٹوک دیا تھا وہ اُن کے سامنے گٹاری کا ذکر کرتے جھجکنے لگا تھا۔ وہ اُوپر کھڑکی پر بیٹھی ہوئی گٹاری سے پکار کر کہنا چاہتا کہ اب اُسے کہیں دوسری جگہ گھونسلا بنا لینا چاہیئے۔ جب کوئی کسی کو دیکھنا تک گوارا نہ کرے تو اُس شخص کو چاہیئے کہ اُس گھر سے الگ ہو جائے۔ بس گٹاری کو بھی اپنا گھونسلا بدل لینا چاہیئے۔

لیکن گٹاری اپنا گھونسلا بدلنے کو تیار نہ ہوئی۔ گٹاری کی آواز اُسے پیاری نہ لگے، بدھ سنگھ اُس کے لئے بھی اپنے دل کو سمجھانے لگا۔ جب بھابو جی ناراض ہوتی ہیں تو اُنہیں ناراض کرنے سے کیا حاصل۔ گٹاری کی آواز میں کونسے لڈّو رکھے ہیں؟ آخر کسی پرندے کی آواز انسان کے دماغ پر کیوں چھا جائے؟ ویسے تو انسان اور پرندے بھائی بھائی ہیں۔ دونوں پر ایک ہی سورج چمکتا ہے۔ لیکن بھابو جی کی بات بھی ٹھیک ہے۔ ہر وقت ایک ہی بات کے پیچھے پڑے رہنے سے انسان پاگل پن کو دعوت دیتا ہے۔ ہر وقت گٹاری کی غمگین آواز کو دماغ پر دستک دینے کی اجازت کیوں دی جائے؟ انسان کا دماغ جتنا ہلکا رہتا ہے اُتنا ہی فائدہ مند ہے۔ بدھ سنگھ نے فیصلہ کر لیا کہ بھابو جی کے کہنے کے مطابق چلے اور اپنے دماغ کو ہر خطرے سے بچا کر رکھے۔

اب گٹاری اُوپر کھڑکی پر بیٹھی رہتی۔ بدھ سنگھ بھول کر بھی اُس کی طرف نہ دیکھتا۔ گٹاری کی آواز سے اب اُسے کوئی لگاؤ نہیں رہ گیا تھا۔ اب وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت بھی کم کر رہا تھا۔ کیونکہ بھابو جی کی صاف اور واضح رائے یہی تھی کہ ایسا کرتے رہنے سے بدھ سنگھ پاگل ہو جائے گا۔ وہ پاگل نہیں ہونا چاہتا تھا۔

صبح کی چائے کی میز پر بیٹھے بیٹھے گگی کی ماں گھاس پر بیٹھی گٹاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گگی سے کہتی: ”وہ رہی گٹاری۔ تیری بہن“ گگی گٹاری کے پیچھے بھاگتی اور اُسے پکڑنے کی کوشش کرتی۔ گٹاری ہاتھ نہ آتی، لیکن وہ بار بار چائے کی میز کے قریب آ بیٹھتی اور اپنی مخصوص آواز میں بولتی۔ گگی کی ماں خوش ہو کر گگی کو گدگداتی۔ گگی دوبارہ گٹاری کو پکڑنے کے لئے اُس کے پیچھے دوڑتی۔ بچّی کو اپنی کوشش میں ناکامیاب پاکر گگی کی ماں کہتی: ”بدھ سنگھ، گگی کی مدد کرو۔“

بدھ سنگھ زور سے ہنستا۔ لیکن وہ آگے بڑھ کر گگی کی مدد نہ کرتا۔ گگی گٹاری کے پیچھے دوڑ دوڑ کر اُچھلتی کودتی۔ گٹاری ہاتھ نہ آتی۔ بدھ سنگھ کچن کی طرف چلا جاتا۔ گگی کی ماں آیا کو بلا کر کہتی ”گگی کی مدد کرو آیا!“

”ہم کیا مدد کرنے سکتا، بی بی جی؟“ آیا ہنسکر کہتی۔

ایک دن گگی کے پتا جی نے بدھ سنگھ سے کہا ”دیکھو بدھ سنگھ! ایک بار گٹاری کو پکڑ کر گگی کے ہاتھ میں تھما دو۔ پھر چاہے گٹاری اُڑ ہی جائے۔ گگی بہت للچاتی ہے۔ وہ ایک دو منٹ تک گٹاری کو چھو چھو کر دیکھ لے گی۔ پھر وہ خود ہی کہے گی۔ گٹاری کو چھوڑ دو بدھ سنگھ۔“

بدھ سنگھ مالک کا حکم نہ ٹال سکا۔ وہ گٹاری کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن گٹاری اُس کے ہاتھ نہ آئی۔ گگی کے پتا جی ہنس ہنس کر اُسے بڑھاوا دیتے رہے ”پکڑو پکڑو۔ وہ گئی گٹاری۔“

گگی کی ماں کو یہ کھیل پسند نہ آیا۔ ڈانٹ کر بولی: ”رہنے دو بدھ سنگھ! یہ ٹھیک نہیں۔“

”کیوں ٹھیک نہیں؟“ گگی کے پتا جی کہہ اُٹھے۔

”اس میں بحث کی تو جگہ نہیں۔“

”میں کب کہتا ہوں کہ بحث کی جگہ ہے؟“

”گٹاری کو تنگ کرنے سے کیا حاصل؟“

"تنگ کون کرتا ہے؟"

"تو یہ گیا ہے؟"

"یہ تو دوستی کی جا رہی ہے۔"

بُدھ سنگھ میز کے پاس آ گیا تھا۔ وہ حکم کے انتظار میں کھڑا رہا۔ گُلی اُٹھ کر گھاس پر لیٹ گئی تھی اور روئے جا رہی تھی۔ گُلی کے پتا جی نے اُسے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ بولے "گٹاری ہاتھ نہیں آتی تو نہ سہی، بُدھ سنگھ! ایک کام کرو۔ بانس کا لمبا زینہ لگا کر گٹاری کے گھونسلے میں جھانک کر دیکھو۔ اگر گٹاری کے انڈوں سے بچے نکل آئے ہوں تو گٹاری کا بچّہ نکال لاؤ اور ایک منٹ کے لئے اُسے گُلی کے ہاتھ پر رکھ دو۔ وہ اتنے سے ہی خوش ہو جائے گی۔ پھر تم گٹاری کے بچّے کو واپس گھونسلے میں رکھ آنا۔"

بُدھ سنگھ لپک کر بانس کا زینہ اُٹھا لایا اور اُسے اُوپر کی منزل کے کونے والے غسل خانہ کی دیوار سے لگا کر اُوپر چڑھنے لگا۔ گُلی کی ماں نے چلّا کر کہا۔ "پہلے میرے پاس آؤ بُدھ سنگھ!"

بُدھ سنگھ زینے سے اُتر کر گُلی کی ماں کے پاس کھڑا ہو گیا۔

گُلی کی ماں نے آواز دی۔ "آیا!"

آیا دوڑ کر آئی۔ گُلی کی ماں نے کہا "گُلی کو اندر لے جاؤ۔"

گُلی نے پتا جی کی گود سے آیا کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ اِتنے میں بھابوجی باہر آئیں۔ شور سُن کر وہ گھبرا گئی تھیں۔ بولیں "کیا جھگڑا ہے؟"

"جھگڑا کچھ نہیں بھابوجی!" گُلی کی ماں نے اپنے خیال کی تائید چاہتے ہوئے کہا "بُدھ سنگھ گٹاری کا بچّہ لانے جا رہا ہے۔ میں کہتی ہوں گٹاری ناراض ہو جائے گی۔"

"ہاں، یہ تو ٹھیک ہے، گٹاری کا بچّہ اُٹھانے سے گٹاری تو ناراض ہو گی ہی۔" بھابوجی نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

بُدھ سنگھ خاموش کھڑا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس کا حکم مانے، بھابوجی اور گُلی کی ماں کا یا گُلی کے پتا جی کا۔ اُس نے تو گٹاری کا ذکر تک کرنا چھوڑ رکھا تھا اور پچھلے تین چار روز سے اُوپر کھڑکی میں بیٹھی گٹاری کی طرف دیکھنے تک کی کوشش نہ کی تھی۔ کیونکہ وہ پاگل پن کو دعوت نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ سیدھی اور سُتھری زندگی گزارنے کا قائل تھا۔ وہ کسی طرح کی اُلجھن میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ عورت کے لئے اُس کے ذہن میں کوئی جگہ نہ تھی تو یہ گٹاری کدھر کی جادوگرنی تھی۔ بھابوجی نے پہلے بتا دیا ہوتا تو وہ گٹاری سے آشنائی نہ بڑھاتا۔ خیر اب تو اُسے گٹاری کی آواز میں کسی طرح کی نغمگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اب گٹاری کی صورت اُس کے تصوّر کو سہلانے کی اہلیت نہ رکھتی تھی، اُس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اُس کے سپنوں کو چھُو تک نہ سکتی تھی۔ اور بھی تو پرندے تھے۔ بلبل تھی، مینا تھی، گرُڑ تھا اور وہ پہاڑی پرندہ بھی تھا جو بہار کے شروع میں پہاڑوں کی طرف جانے سے پہلے سری نگر کے باغوں میں چہکنے کے لئے آ جاتا تھا، جس کی دُم بہت لمبی اور خوبصورت ہوتی ہے۔ ایسے ہی اور بھی بہت سے پرندے تھے۔ ایک گٹاری ہی تو نہ تھی۔

کچھ لمحوں کے لئے چائے کی میز پر خاموشی رہی۔ گُلی کے پتا جی نے کڑک کر کہا "بُدھ سنگھ! تم یہ کام نہیں کر سکتے تو مجھے دوسرا انتظام کرنا ہو گا!"

"جی صاحب!" بُدھ سنگھ چونک کر زینے کی طرف بڑھا۔

گلی کی ماں خاموش تھی۔ بھابو جی بھی کچھ نہ بولیں۔ بدھ سنگھ زینے پر چڑھ گیا۔ کچھ لمحوں کے بعد اُس نے واپس آکر کہا "جی صاحب! مَیں نے اچھی طرح دیکھ لیا۔ میرا پہلے بھی یہی خیال تھا۔ گٹاری کو انڈے دیئے بیس دن ہی ہوئے ہیں۔ ابھی پانچ دن اور لگیں گے۔ پھر جاکر انڈوں سے دو ننھے ننھے بچے باہر نکلیں گے۔"

"اچھا تو پندرہ دن اور انتظار کرنے ہیں" گلی کے پتا جی نے بڑی سنجیدگی سے کہا "ہماری گلی اچھی لڑکی ہے۔ وہ گٹاری کے بچے سے ضرور دوستی کرے گی۔"

بھابو جی کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آئی۔ گلی کی ماں نے بھی سُکھ کا سانس لیا۔ گلی کے پتا جی نے اُن کی طرف دیکھا اور ہنس کر کہا "ہم زبردستی کرنے کے قائل نہیں۔ پانچ دن بعد گٹاری کے انڈوں سے دو بچے باہر نکلیں گے۔ جب وہ دس روز کے ہو جائیں گے ہم گٹاری کے بچے سے گلی کی ملاقات کرائیں گے۔"

"بہت اچھی بات ہے!" بھابو جی نے ٹنکار لگائی۔

"مجھے بھی اعتراض نہیں ہے" گلی کی ماں نے کالج میں پڑھنے والی کسی لڑکی کی درخواست قبول کرنے کے انداز میں کہا۔

گلی اپنے پتاجی کی گود سے اُتر کر آیا کی طرف بھاگ گئی۔

بدھ سنگھ نے پُرانی عادت سے بے قابو ہو کر کہا "جی صاحب! میرا حساب کبھی غلط نہیں ہوتا۔ گٹاری ہمیشہ دو ہی انڈے دیتی ہے۔ سال میں ایک بار۔ پورے پچیس دن وہ اپنے انڈے سیتی ہے۔ آدھا وقت گٹاری سیتی ہے اور آدھا وقت گٹارا، یہ نہیں کہ اکیلی گٹاری پر ہی سارا بوجھ ڈال دیا جائے۔"

"ہاں ہاں، بدھ سنگھ! تمہارا حساب کبھی غلط نہیں ہو سکتا" گلی کے پتا جی نے مذاق کرتے ہوئے کہا "اس جھگڑے میں چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ اب یہ چائے نہیں لسّی ہے۔ پھر سے چائے لاؤ۔ ایک دم گرم۔"

دوبارہ چائے آئی تو گلی کی ماں بولی "گٹاری نے کتنی اُونچی جگہ گھونسلا بنایا ہے!"

"اب ذرا گٹاری کو بیچ میں نہ لاؤ" گلی کے پتا جی بولے "ورنہ چائے پھر ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

گلی کی ماں نے مسکراتے ہوئے چائے کا کپ تیار کر کے اپنے شوہر کے ہاتھ میں تھمایا۔ پھر اُس نے اپنا کپ ہونٹوں سے لگانے کے بعد سنجیدگی سے کہا "جس کمرے میں مَیں لڑکیوں کے کالج میں انگریزی پڑھاتی ہوں وہاں روشندان میں گٹاری نے گھونسلا بنایا تھا پچھلے سال۔ ایک دن میں لڑکیوں کو پڑھا رہی تھی۔ اچانک اوپر سے دونوں انڈے ایک لڑکی کے سر پر گرے اور ٹوٹ گئے۔ رطوبت سے بیچاری لڑکی کا چہرہ خراب ہو گیا۔ سب لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ میری طبیعت پر بہت زبردست دھچکا لگا۔ مَیں اُس دن پیریڈ نہ لے سکی۔ اُس لڑکی نے غسل خانہ میں جاکر اپنا چہرہ صاف کر لیا تھا۔ اور باقی لڑکیاں سنجیدہ ہو کر پڑھنے کے لئے تیار تھیں۔ لیکن میرے دل پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔"

"تم بہت حسّاس ہو، یہ مجھے معلوم ہے۔"

"وہ واقعہ مجھے اب تک غمگین بنائے ہوئے ہے۔"

"اب یہ تو غلط بات ہے کہ ایک برس پہلے کے واقعہ پر آنسو بہائے جائیں۔"

"انڈے گر کر ٹوٹ گئے تو گٹاری کا جوڑا کمرے میں دیوانہ وار منڈلانے لگا تھا۔ اُن کی چیخ و پکار کئی دن تک سُنائی دیتی رہی تھی۔ جیسے اُن کے

انڈے توڑنے کا گناہ ہم سے سرزد ہوا ہو"۔

"اب اُس غم کو دفنا دینا ہی ٹھیک ہوگا"۔

"اُس غم کا دھماکا سا ہوتا ہے میرے دماغ میں۔ اُس وقت میں بے چین ہو جاتی ہوں"۔

یہ تو وہی بات ہوئی جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ——— سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!

کچھ لمحوں کے لئے سکوت طاری ہو گیا۔ بدھ سنگھ بھابوجی کے پلنگ کے قریب کھڑا سہمی سہمی سی نگاہوں سے چائے کے میز کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کاش وہ گلّی کی ماں کو دلاسا دے کر کہہ سکتا کہ پچھلے غم بھول جاؤ، آنے والے غم کی فکر کرو۔ وہ حیران تھا کہ بھابوجی کیوں چپ بیٹھی ہیں۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ جب انسان بھی اپنی زندگی کا مالک نہیں رہا، پرندے اپنی زندگی کے مالک بننے کی اہلیت کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ زندگی ہے تو ایک نہ ایک غم لگا رہے گا، ایک نہ ایک ظلم، ایک نہ ایک ناانصافی۔ زندگی سپیرے کی بین نہیں ہے نہ جادوگر کا تھیلا۔ زندگی ایک سڑک ہے جس پر پیدل چلنا ہوتا ہے۔ جیسا کہ گورو مہاراج نے کہا ہے، زندگی کا مطلب ہے چلتی کا نام گاڑی۔ اور گورو مہاراج کا یہ بھی تو کہنا ہے ——— سوا لاکھ کی بس سب پر بنی۔ انسان نے کوئی چیز گم کر دی ہے۔ وہ چیز ہے انسانیت۔ گورو مہاراج کا کہنا ہے کہ انسانیت بہت زیادہ دیر گم نہیں رہ سکتی۔ انسان صداقت کو ڈھونڈھ رہا ہے، انصاف کو آواز دے رہا ہے۔ صداقت کسی دوسرے کی جیب کا سکّہ نہیں ہے۔ انصاف کسی پہیلی کا نام نہیں ہے۔ صداقت کے بنا انسان سانس نہیں لے سکتا۔ انصاف کے بنا ظلم اور لوٹ کھسوٹ کی جڑ نہیں اکھڑ سکتی...... اور اُسے محسوس ہوا کہ گلّی کی ماں معمولی عورت نہیں ہے جسے گٹاری کے برس بھر پہلے کے درد و غم کا تصوّر آج بھی غمگین بنائے ہوئے ہے۔

ایک ایک کر کے تین دن گذر گئے۔ گلّی کے پتاجی ہر روز صبح کی چائے پر بدھ سنگھ کو یاد دلاتے کہ زینہ لگا کر گٹاری کے گھونسلے پر جھانک کر دیکھے کہ انڈوں سے بچّے نکل آئے یا نہیں۔

"جی صاحب! میرا حساب غلط نہیں ہو سکتا ہے۔ گورو مہاراج کا پرتاپ ہے"، بدھ سنگھ جواب دیتا "بھگوان نے چاہا تو پانچویں دن گٹاری کے انڈوں سے بچّے باہر آجائیں گے۔ اور پھر دس روز کی کوئی شرط نہیں دو تین دن بعد بھی گٹاری کے بچّوں سے گلّی کی دوستی کرائی جا سکتی ہے"۔

"ٹھیک ہے"، گلّی کے پتاجی کہہ اُٹھتے۔

گلّی کی ماں خاموش رہتی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بھابوجی سے تائید چاہتے ہوئے کہتی "میں کہتی ہوں کہ یہ خیال چھوڑ دیا جائے، ایسی کیا مصیبت پڑی ہے کہ اتنی اونچائی سے گٹاری کے بچّے نکال کر گلّی کو دکھائے جائیں۔ تھوڑا وقت بیتنے پر گٹاری کے بچّے خود بخود اڑ کر چائے کی میز کے قریب پھدکتے نظر آئیں گے"۔

"اب یوں روڑا مت اٹکاؤ ڈارلنگ!" گلّی کے پتاجی نے گردن گھماتے ہوئے کہا "بدھ سنگھ گٹاری کے انڈوں سے بچّے نکلنے کے بعد اُن کا پورا خیال رکھا کرے گا۔ اپنے کام کے ساتھ وہ یہ کام بھی کرے گا۔ آخر گٹاری نے ہمارے گھر میں گھونسلا بنایا ہے تو ہم اُسے غیر نہیں سمجھتے۔ اُس میں بھی وہی زندگی تڑپتی ہے جو ہمارے اندر سانس لیتی ہے۔ کیوں یہ کچھ جھوٹ ہے"؟

پانچواں اور چھٹا دن بھی گذر گیا یعنی بیس اور پانچ پچیسواں اور چھ اور بیس یعنی چھبیسواں دن۔ ابھی تک گٹاری کے انڈے اُسی طرح پڑے تھے۔ ستائیسویں دن بدھ سنگھ نے کسی قدر شرمندہ ہو کر کہا "گورو مہاراج کا کہنا جھوٹ تو نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن انسان کا حساب غلط بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن گورو مہاراج کی لاج رہ جائے اگر آج گٹاری کے انڈوں سے بچّے نکل آئیں"۔

گگی کی ماں کالج چلی گئی۔ گگی کے پتا جی کسی ملاقاتی سے گفتگو کر رہے تھے۔ بدھ سنگھ دوڑا دوڑا آیا۔ اُس کے ہاتھ میں لٹھ تھا۔ بولا۔ "جی صاحب! ابھی ابھی سانپ اِدھر سے نکل کر گیا ہے۔"

گٹاری کا جوڑا رسوئی کے بغل والے پیڑ پر بیٹھا چیخ و پکار کر رہا تھا۔ "اِن پرندوں پر کیا مصیبت آ گئی؟" ملاقاتی نے جھنجھلا کر کہا۔ "یہ کیسا نغمہ ہے؟ کتنے رومانٹک ہیں وہ لوگ جو پرندوں کی بولی میں نغمگی کی جھلکی ڈھونڈا کرتے ہیں۔"

"یوں شاعروں پر نشتر زنی تو نہ کیجئے،" گگی کے پتا جی ہنس کر بولے "زندگی کا نغمہ خالی ایک سُر سے نہیں بنتا۔ غم و الم بھی زندگی کی راگ وادی کے واضح اور ضروری سُروں کو ترتیب دیتے ہیں۔ کچھ سُر مسرت آگیں ہوتے ہیں تو کچھ غم انگیز۔ کچھ سُر جانی پہچانی آواز کی داغ بیل ڈالتے ہیں تو کچھ سُر اجنبی کی طرح دروازے پر دستک دیتے ہیں، مستقبل کے چہرے سے نقاب اُلٹنے والے سُر ہمیشہ دوستانہ ہمدردی لیئے رہتے ہیں۔ صبر و استقلال کے سُر۔ زندگی کے بارے میں فرمائش پوری کرنے والے سُر، شیطنت پر طنز کسنے والے سُر! ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنگیت کی ابتدا پرندوں کی بولیوں کی نقل اُتارنے کی جستجو سے ہوئی، آپ کا کیا خیال ہے؟"

"اس کے بارے میں تو دو رائیں نہیں ہو سکتیں،" ملاقاتی نے ہنس کر کہا۔

گٹاریوں کا جوڑا چلّا رہا تھا۔ جیسے اُن پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔ بدھ سنگھ پرے سے لٹھ اُٹھائے آیا۔ بولا "گٹاریوں کا بدلا میں نے لے لیا۔ آخر گورو مہاراج کے آشیرباد سے میں نے سانپ کی سری توڑ ڈالی ہے۔ گورو مہاراج کا کہنا ہے کہ جب سانپ سویرے جاگتا ہے وہ کہتا ہے کہ ہے بھگوان مجھے ایسے انسان کی شکل دکھا جو مجھ پر ہاتھ اُٹھائے تو میری سری ضرور توڑ ڈالے تاکہ مجھے زخمی ہو کر اِدھر اُدھر نہ بھٹکنا پڑے۔ سری ٹوٹنے سے مرنے پر سانپ دوسرے جنم میں انسان بنتا ہے۔"

"اِسی لئے شاید کچھ انسان سانپوں کے بھائی ہوتے ہیں،" ملاقاتی نے طنز کی۔

"یہ سانپ گٹاریوں کے گھونسلے میں گھس کر اُن کے انڈے کھا گیا،" بدھ سنگھ بولا "گٹاریاں چلّاتی رہ گئیں۔ چاہے وہ بھی نہ بچ سکا۔"

گگی کی ماں کالج سے آئی تو گٹاریوں کی بے بسی کی کہانی سُن کر افسوس سے ہاتھ ملتی رہ گئی۔ گٹاریوں کے دو انڈے پچھلے سال لڑکیوں کے کالج میں انگریزی کے پیریڈ میں روشندان سے گر کر ٹوٹ گئے تھے، دو انڈے یہ تھے جنہیں آج سانپ کھا گیا تھا۔ "ہمارے گورو مہاراج کا کہنا ہے کہ گٹاری پہلے عورت ہوتی تھی۔" بدھ سنگھ نے اپنے مخصوص انداز میں کہنا شروع کیا: "گٹاری کی مصیبت اب بھی کچھ کم نہیں، وہ لاکھ گردن بلند کرے، لاکھ چہکنے کا جتن کرے، زندگی کا غم اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اِس پر بھی گٹاری انڈے دینے سے باز نہیں آتی۔"

کنہیا لال کپور

بابوجی! یہ میری سہیلی یاسمین ہے " آشا نے اپنی سہیلی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ میں نے اخبار سے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ ایک چھوٹی سی خوبصورت لڑکی۔ آشا کی ہم عمر۔ سبز رنگ کی شلوار اور قمیص پہنے میرے سامنے کھڑی مُسکرا رہی تھی۔

" بڑی پیاری بچی ہے " میں نے کہا " یہ کس کی لڑکی ہے آشا؟"

" وہ جو نئے مسلمان بابو ہمارے پڑوس میں آئے ہیں نا۔ اُن کی۔ یہ بھی تیسری جماعت میں پڑھتی ہے "

" شاباش! " میں نے لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

" بابوجی۔ یہ بہت اچھا گاتی ہے "

" واقعی؟"

" اس نے مجھے ایک گانا سکھایا ہے "

" بہت خوب "

" بابوجی۔ آپ میرے لئے گڑیا کب لائیں گے "

" کل "

" کل نہیں آج۔ آج شام "

" اچھا۔ اچھا۔ لادونگا۔ اب جاؤ۔ یاسمین اور تم کھیلو۔ مجھے اخبار پڑھنے دو " بڑی وحشت ناک خبریں آ رہی تھیں۔ کلکتہ میں ہندو مسلم فساد ہو گیا تھا۔ چھُرے گھونپے جا رہے تھے۔ مکانوں کو آگ لگائی جا رہی تھی۔ عورتیں اغوا کی جا رہی تھیں۔ میں یہ خبریں پڑھ کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا۔ یہ کیا ہو گیا ہے ہندوؤں اور مسلمانوں کو؟ شریفوں کی طرح کیوں نہیں رہ سکتے۔ عورتوں پر حملے! عورتوں کا اغوا، خیر کلکتہ ہے۔ اپنے لاہور میں ایسی باتیں نہیں ہو سکتیں۔ پنجابی زیادہ سمجھدار واقع ہوئے ہیں۔ وہ اِن باتوں کی نوبت نہیں آنے دیں گے۔ یہاں ہندو اور مسلمان شیر و شکر ہو کر رہتے ہیں۔ کلکتہ پاگل ہو گیا ہے۔ کاش وہ لاہور سے کچھ سیکھتا!

" بابوجی! اس اتوار کو میں اور یاسمین گڑیا کا بیاہ کر رہی ہیں۔ آپ دیکھنے آئیں گے نا۔ میری گڑیا دُلھن بنے گی۔ یاسمین کا گڈا دولھا! "

" ہاں۔ ہاں ضرور دیکھنے آؤنگا "

یہ فساد کیوں ہو رہا ہے۔ یہ فساد کون کراتا ہے۔ دراصل ہم سب مجرم ہیں۔ ہمارے دلوں میں کھوٹ ہے۔ کہنے کو ہم ایک دوسرے کو بھائی

کہتے ہیں۔ لیکن اصل میں دشمن سمجھتے ہیں۔ سینکڑوں سال اکٹھا رہنے کے باوجود ہم ایک دوسرے کو نہیں سمجھ سکے۔ صدیوں سے گنگا بہہ رہی ہے۔ لیکن اس میں کوثر کی دھارا کبھی نہیں مل سکی۔ شاید کوثر اور گنگا الگ الگ بہنا چاہتے ہیں۔ شاید گنگا نے کوثر کو نزدیک نہیں آنے دیا۔ شاید یہ کبھی نہیں مل سکتے۔ مگر کیوں نہیں مل سکتے۔ دونوں میں صاف شفاف اور پاکیزہ پانی ہے۔ پھر؟

شاہی محلے میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ہندوؤں کے صرف چند گھر تھے۔ اس محلے میں رہنے والے ہندو اور مسلمان بہت کم ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ اُن کا اصول تھا۔ اپنے کام سے کام رکھو۔ یہی وجہ تھی۔ کہ میں سید قربان علی قریشی سے جو میرے پڑوس میں تین مہینے سے رہ رہا تھا۔ ایک بار بھی ملنے نہیں گیا تھا۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا۔ کہ وہ میری طرح ملازم ہے۔ لیکن اُس کے ساتھ میری بات چیت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ عجیب بات تھی۔ میں اُس کا پڑوسی تھا۔ وہ شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ پھر میں اُسے کبھی ملنے کیوں نہیں گیا۔ لیکن وہ بھی تو مجھے کبھی ملنے نہیں آیا۔ شاید وہ بہت مصروف رہتا ہے۔ ممکن ہے اُسے میرے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنے میں اعتراض ہو۔ مگر کیوں؟

" بابوجی! آپ بہت بُرے ہیں "

" کیوں آشا؟ "

" میری سہیلی یاسمین بیمار ہے۔ اور آپ اُسے پوچھنے تک نہیں گئے "

" یاسمین بیمار ہے؟ کب سے؟ "

" پرسوں سے۔ اُسے سخت بخار ہے۔ بیچاری بُری طرح تڑپ رہی ہے "

" چلو میں ابھی چلتا ہوں "

اور آشا مجھے سید قربان علی قریشی کے گھر لے گئی۔ " میرا نام کرشن لال کھنہ ہے " میں نے اپنا تعارف آپ ہی کراتے ہوئے کہا " میں نیشنل کالج کا پروفیسر ہوں "

" آئیے آئیے۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ مجھے قربان علی قریشی کہتے ہیں میں سیکرٹریٹ میں ملازم ہوں۔ تشریف رکھیے "

" یاسمین کا کیا حال ہے " میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

" بہتر ہے۔ لیکن ابھی بخار گیا نہیں "

" کیا میں اُسے دیکھ سکتا ہوں؟ "

" ضرور ضرور۔ آئیے "

آنگن میں یاسمین ایک پلنگڑی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کی ماں اُسے پنکھا کر رہی تھی۔ یاسمین نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ پھر شرم سے اپنا منہ تکیہ میں چھپا لیا۔

" انہیں سلام کرو بیٹی۔ یہ تمہیں پوچھنے آئے ہیں ..... اور ہاں۔ میں ان کا تعارف آپ سے کرانا تو بھول ہی گیا۔ زینب۔ یہ پروفیسر کرشن لال کھنہ ہیں "

" آداب عرض! بھائی صاحب "

" آداب عرض "

"نہیں ان کی مسز کو تو جانتی ہوں۔ دراصل ہم عورتیں آپ مردوں کی بہ نسبت زیادہ سوشل واقع ہوئی ہیں۔ آپ تو مہینوں ایک دوسرے سے کلام نہیں کرتے۔ مگر ہم پہلے دن ہی کچھ اس طرح گھُل مل جاتی ہیں۔ کہ جب تک ہر روز نہ ملیں۔ چین نہیں آتا۔"

"اچھا۔ تو آپ مسز کھنہ کو جانتی ہیں؟"

"بہت اچھی طرح۔ ابھی کل اُن سے سویٹر کا ایک نیا نمونہ سیکھنے گئی تھی۔"

"اوہ۔ پھر تو گاڑھی چھنتی ہے۔"

"زینب بھئی"، سید قربان علی نے کہا "بھائی صاحب کو پان تو پیش کرو۔"

"نہیں نہیں رہنے دیجئے۔ آپ تو خواہ مخواہ تکلف......"

"اجی پان کا کیا ہے۔ بیٹھیئے نا۔ زینب پان لگاؤ۔"

"نہیں رہنے دیجئے۔"

"شاید بھائی صاحب کو ہمارا پان کھانے میں اعتراض ہے۔" زینب نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ سید قربان علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں۔ یہ بات نہیں۔ اچھا لائیے پان۔"

زینب پان لگانے لگی۔ میں نے سید قربان علی سے کہا "بہت دنوں سے سوچ رہا تھا۔ کہ آپ سے شرفِ نیاز حاصل کیا جائے۔ لیکن کالج کے کام نے......"

"جی ہاں۔ دل تو میرا بھی چاہ رہا تھا۔ کہ آپ سے ملا جائے۔ لیکن آپ جانتے ہیں سیکرٹریٹ میں کتنا کام رہتا ہے۔"

"اچھا آپ اور مسز قریشی اس اتوار ہمارے ہاں چائے پیجئے۔"

"جی لیں گے صاحب لیکن اتنی کیا جلدی ہے۔ یاسمین اچھی ہو جائے تو کسی دن ضرور آئیں گے۔"

"یاسمین اتوار تک ضرور اچھی ہو جائے گی۔ "کیوں یاسمین" میں نے پیار سے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اچھی ہو جاؤ گی نا!"

"جی خیال تو ہے۔"

"اتوار کو ضرور اچھی ہو جانا" آشا نے بہت سنجیدہ بنتے ہوئے کہا "نہیں تو گڈیا کا بیاہ کیسے ہوگا۔"

"ہاہاہا" سید قربان علی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "ہاں بھئی۔ مہورت تو اتوار کا ہی نکلا ہے۔"

"پان لیجئے بھائی صاحب۔"

"شکریہ۔"

اتوار کو یاسمین واقعی اچھی ہو گئی۔ مسٹر اور مسز قریشی میرے ہاں چائے پینے آئے۔ بڑی دلچسپ باتیں ہوئیں۔ پتہ چلا کہ مسٹر قریشی شاعر بھی ہیں۔ وائلن بجانے کا جنون ہے۔ دفتر سے آکر گھنٹوں وائلن کا ریاض کرتے ہیں۔ مسز قریشی افسانے لکھتی ہیں۔ یاسمین کو گھر پہ قرآن مجید پڑھاتی ہیں۔ نماز کی حد سے زیادہ پابند ہیں۔ تھوڑا سا باغبانی کا بھی شوق ہے۔

اس کے بعد میں سید قربان علی قریشی سے کئی بار ملا۔ عام طور پہ اتوار کے دن ہم مل کر پروگرام بناتے۔ کبھی راوی کے کنارے مجلس منعقد کی جاتی۔ کبھی جہانگیر کے مقبرے میں۔ قریشی صاحب کو شعر کہنے کا واقعی سلیقہ آتا تھا۔ اپنے اشعار ترنم سے پڑھتے۔ کبھی کبھی جب موج میں ہوتے

وائلن پر کوئی دھن چھیڑ دیتے۔ اُن کے پاس متعدد اُردو کے اخبارات اور رسائل ہوتے۔ جو وہ مجھے اکثر پڑھنے کے لئے دے جاتے۔ جب کسی رسالے میں اُن کی غزل چھپتی۔ اُس دن خوشی سے پھولا نہ سماتے۔ رسالہ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہتے "سب سے پہلے صفحہ بتیس ملاحظہ فرمایئے۔ خاکسار کی ایک تازہ غزل چھپی ہے"

میں غزل پڑھنے لگتا۔ وہ میرے ردِ عمل کا انتظار کرنے لگتے۔

"کیسی لگی آپ کو؟"

"خوب ہے۔ مطلع کا تو جواب نہیں"

"مجھے بھی مطلع ہی پسند ہے"

چھ مہینے کے عرصہ میں مسز کھنہ اور مسز قریشی ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئی تھیں۔ جب میں کالج اور قریشی صاحب دفتر چلے جاتے۔ وہ عموماً ایک ہی جگہ بیٹھ کر سویٹر بُنتیں۔ رسائل کی ورق گردانی کرتیں۔ یا سودا سلف خریدنے کے لئے ڈپی بازار جاتیں۔ اکثر جب میں کالج سے لوٹتا۔ مسز کھنہ کوئی اُردو کا ناول پڑھ رہی ہوتیں جو وہ زینب سے مانگ کر لائی تھیں۔ یاسمین اور آشا کا یہ حال تھا۔ کہ سکول سے آنے کے بعد ایک منٹ علیحدہ نہ ہوتیں۔ کبھی گڑیا کا گھر بنا رہی ہیں۔ کبھی مل کر سوال نکال رہی ہیں۔ اور کبھی منٹو پارک میں کھیلنے کے لئے جا رہی ہیں۔

ایک دن یاسمین نے مجھ سے کہا "چاچا جی! کل عید ہے۔ کل آپ چاچی جی اور آشا ضرور ہمارے گھر آئیں۔ اور ہاں چاچا جی آشا شلوار پہن کر آئے۔ نہیں تو میں اُس سے کبھی نہیں بولوں گی"

عید کی پارٹی بہت اچھی رہی۔ آشا اُسی کپڑے کی شلوار پہن کر گئی جس کپڑے کی یاسمین نے پہن رکھی تھی۔ سویاں پھل اور پان کھانے کے بعد یاسمین نے بتایا۔ کہ اب وہ اور آشا مل کر ایک قوالی گائیں گی"

"اچھا بھئی سناؤ قوالی۔ دیکھیں تم کیسا گاتی ہو"

یاسمین فوراً اندر سے ایک چھوٹی سی ڈھولک اُٹھا لائی۔ اور اپنی ماں کے ہاتھ میں اسے تھماتے ہوئے کہنے لگی "امّی اسے آپ بجایئے۔ ہمیں قوالی کے ساتھ تالی بجانی ہے"

اور دونوں نے مل کر گانا شروع کیا۔

زمانے میں چمکا ہے نامِ محمدؐ
محمدؐ محمدؐ محمدؐ محمدؐ

وہ دونوں بڑی اچھی لے میں گا رہی تھیں۔ ہم سب پورے انہماک سے سُن رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا سماں بندھ گیا ہے۔ قوالی کے اختتام پر دونوں کی آنکھوں میں مسرت و خوشی کی غیر معمولی چمک تھی۔

"کیسی رہی ہماری قوالی" یاسمین نے پوچھا۔

"بہت اچھی۔ واقعی بہت اچھی۔ بھئی تم دونوں تو خوب گاتی ہو"

ستمبر ——— دسمبر ——— مارچ ——— مئی۔

اور پھر یکلخت ایک دن لاہور میں قیامت آ گئی۔ پُر اشتعال تقریریں ہونے لگیں۔ بڑے بڑے جلوس نکلنے لگے۔ "اللہ اکبر" اور "ہر ہر مہا دیو" کے

نعرے فضا میں دہشت پھیلانے لگے۔ اخباروں کی سُرخیاں پڑھ پڑھ کر لوگ بدحواس ہونے لگے۔

"بھاٹی گیٹ کے باہر تین ہندوؤں کے چھُرا گھونپ دیا گیا۔"

"کراؤن سینما میں بم پھٹا۔ پانچ مسلمان مارے گئے۔"

"ڈبی بازار میں زبردست فساد۔ پولیس نے گولی چلادی۔"

"آج شام سے کرفیو لگا دیا گیا۔"

ہرطرف خوف وہراس چھایا ہُوا تھا۔ خون سفید ہو گیا تھا۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے تھے۔ خون ہی خون اندھیرا ہی اندھیرا۔ انسانیت دم توڑ رہی تھی۔

مئی کی ایک دوپہر کو وہ میرے ہاں آیا۔ لمبا تڑنگا نوجوان۔ عجیب سا نام تھا اُس کا۔ وہ ایک ایسے گروہ سے تعلق رکھتا تھا جس کا کام ہندو دھرم کی حفاظت کرنا تھا۔

"مجھے حفاظت کی ضرورت نہیں،" میں نے کہا "میں کافی محفوظ ہوں۔"

"آپ چاروں طرف سے مسلمانوں میں گھرے ہوئے ہیں۔"

"پھر کیا ہُوا؟"

"مسلمان کا اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔"

"مجھے اُن سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔"

"میں جانتا ہوں۔ قربان علی آپ کا دوست ہے۔ لیکن وہ آپ کو دھوکا دیگا۔"

دوسرے دن وہ پھر آیا "کچھ سُنا آپ نے۔ وہ جو اِس محلے میں شام لال کلرک رہا کرتا تھا۔ اُسے کسی مسلمان نے چھُرا مار کر ہلاک کر دیا۔"

تیسرے دن اُس نے کہا "اگر آپ کو چھُرے یا پستول کی ضرورت ہو۔ تو آپ مجھ سے لے سکتے ہیں۔"

"کس لئے؟"

"یہی۔ میرا مطلب ہے یہی......مسلمانوں کو مارنے کے لئے۔"

"لیکن کیوں۔ اُنھوں نے میرا کیا بگاڑا ہے۔"

"آپ بھی عجیب سادہ لوح ہیں۔ وہ آپکے بھائی بندوں کو مار رہے ہیں۔ اور آپ کہتے ہیں کہ اُنھوں......"

"میں کسی بے گناہ کو مارنا پاپ سمجھتا ہوں۔"

"پاپ تو میں بھی سمجھتا ہوں۔ لیکن....."

"لیکن؟"

"پاپی کو مارنا پاپ نہیں۔ دیکھئے آپ کی طرح میں بھی "اہنسا" میں یقین رکھتا ہوں۔ کسی بے گناہ کو مارنا گئو ہتیا سمجھتا ہوں۔ لیکن پاپی کو نہ مارنا اہنسا نہیں بزدلی ہے۔"

"آپ سب مسلمانوں کو پاپی سمجھتے ہیں۔"

"بے شک"

"آپ عجیب آدمی ہیں"

وہ چلا گیا۔ اُس سے بات چیت کر کے مجھے کوفت ہوئی۔ شام کو حسبِ معمول میں قربان علی کے گھر گیا۔ وہ ابھی دفتر سے واپس نہیں آیا تھا۔ زینب کچھ پریشان نظر آتی تھی۔ وقت کاٹنے کے لئے میں ایک رسالہ اُٹھا کر پڑھنے لگا۔ سات بجے کے قریب قربان علی آیا۔ وہ کچھ تھکا ہُوا سا تھا۔ "کیا بات ہے بھئی۔ آج بہت دیر سے آئے"

"کچھ نہ پوچھو۔ اُس نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے جواب دیا "لوگ تو پاگل ہوگئے ہیں۔ اب اِس شہر کا خدا ہی حافظ ہے"

"معاملہ کیا ہُوا"

ہمارے دفتر میں ایک بابو ہزاری لال ہیں۔ وہ دفتر سے واپس گھر جا رہے تھے۔ کہ گول باغ کے نزدیک اُنہیں کسی نے چھُرا گھونپ دیا۔ اُنہیں تانگے میں بٹھا کر ہسپتال پہنچایا۔ اُس کے گھر والوں کو خبر کی۔ ابھی سیدھا ہسپتال سے آ رہا ہوں۔

"کیسی حالت ہے اب اُسکی" زینب نے پوچھا۔

"خیال تو ہے۔ بچ جائے گا۔ ڈاکٹر کہتا تھا۔ اُسے خون کی ضرورت ہے۔ آٹھ اونس اپنا خون دیا۔ آٹھ اونس اور کا انتظام کر آیا ہوں"

"یا اللہ! وہ بے چارہ تو بچ جائے۔ ابھی ابھی شادی ہوئی تھی"

میں قربان علی کے گھر سے واپس آکر ضروری خطوط کا جواب لکھ رہا تھا۔ کہ آشا کمرے میں داخل ہوئی۔

"بابو جی! ایک بات کہوں۔ ناراض نہ ہونا"

"کیا بات ہے بیٹی؟"

"آپ یاسمین کے گھر نہ جایا کیجئے"

"کیوں"

"اُس کا ابّا آپ کو مار ڈالے گا"

"تمہیں کیسے پتہ ہے؟"

"مجھے پتہ ہے۔ اور بابو جی اگر وہ آپ کو پینے کے لئے پانی دے۔ تو مت پیجئے گا"

"کیوں؟"

"یہ مسلمان پانی میں زہر ملا دیتے ہیں"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"سکول میں میری ہندو سہیلیوں نے"

"نہیں آشا۔ یہ غلط ہے۔ تمہاری سہیلیاں جھوٹ بولتی ہیں"

آشا کو یقین نہ آیا۔ وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں سوچنے لگا۔ یہ زہر جو چھوٹی چھوٹی بچیوں کے دل و دماغ میں سرایت کر رہا ہے۔ خدا جانے اس کا اثر کتنی پشتوں تک رہے گا۔

آشا اب یاسمین سے کچھ کھنچی کھنچی رہنے لگی۔ وہ اس کے ساتھ کھیلنے سے انکار کر دیتی۔ بڑی بے رُخی سے پیش آتی۔ میں اور اس کی ماں اُسے لاکھ سمجھاتے۔ لیکن اس کی تسلی نہ ہوتی۔ ایک دن میں اُسے زینب کے پاس لے گیا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "بہن ذرا پانی پلانا۔ لیکن دیکھنا اُس میں کہیں زہر نہ ملا دینا۔"

وہ حیران ہو کر میرے منہ کی طرف دیکھنے لگی "ہائے اللہ! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔"

"بات یہ ہے بھئی۔ کہ آشا سمجھتی ہے۔ کہ تم پانی میں زہر ملا دو گی۔"

زینب کھلکھلا کر ہنس پڑی اور آشا کو اپنی گود میں لیتے ہوئے کہنے لگی "میں اپنی بیٹی کو زہر پلاؤں گی؟ اس سے پہلے میں یاسمین کا گلا کیوں نہ گھونٹ دوں گی۔ جیسی یاسمین ویسی آشا!"

سولہ جولائی کی شام تھی۔ آسمان پر گہرے کالے رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ لاہور میں اب حالات پہلے سے بہتر ہو گئے تھے۔ چھرا گھونپنے کی وارداتیں کم ہوتی تھیں۔ کرفیو کے اوقات میں بھی کافی تبدیلی کر دی گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔ کہ قربان علی کو ساتھ لے کر آج لمبی سیر کی جائے۔ کہ زینب گھبرائی ہوئی ہمارے گھر آئی۔

"بہن جی! آپ نے یاسمین کو تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں۔"

"کہاں گئی وہ پھر۔ دو گھنٹے سے غائب ہے۔"

"یہیں کہیں ہو گی۔ چلو ذرا دیکھتے ہیں۔"

یاسمین کی سارے محلے میں تلاش کی گئی۔ لیکن وہ کہیں نہ ملی۔ زینب بہت گھبرا گئی۔ اُس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اُٹھ رہے تھے۔ قربان علی اُسے تسلی دے رہا تھا۔ کہ یاسمین ضرور مل جائیگی۔ لیکن اُسے یقین نہیں آتا تھا۔ آٹھ بجے تک یاسمین کا کوئی سُراغ نہ ملا۔ میں اور قربان علی بھی گھبرا گئے۔ میں نے کہا ابھی کرفیو لگنے میں ایک گھنٹہ ہے۔ چلو منٹو پارک میں دیکھ آئیں۔"

منٹو پارک میں بالکل اندھیرا تھا۔ تھوڑی تھوڑی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اِدھر اُدھر کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں ہم نے سارا منٹو پارک چھان مارا۔ لیکن یاسمین کا کہیں پتہ نہ چلا۔ ہم راوی روڈ کی طرف گئے۔ بڈھے نالے کے پل کے پاس یکلخت ٹارچ کی روشنی میں زمین پر پڑی کوئی چیز دکھائی دی۔

یہ یاسمین تھی۔ خون میں نہائی ہوئی۔ اُس کے پھول سے جسم میں کسی بے درد نے چھرا بھونک دیا تھا۔ اور پھر نکالا نہیں تھا۔ وہ زمین پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ قربان علی کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ اور سناٹے کو چیر گئی "ہائے میری بچی! ہائے میری یاسمین" ہم اُسے اُٹھا کر گھر لائے۔ مسز قریشی نے ہمیں دُور سے دیکھا۔ وہ چھاتی پر دوہتڑ مار کر بین کرنے لگی۔ قربان علی بیوی کو دیکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

ساری رات ہم نعش کے پاس بیٹھے رہے۔ آدھی رات کے قریب میں نے بڑی مشکل سے زینب کو چپ کرایا۔ اور کہا "صبر کرو بہن۔ خدا کو یہی منظور تھا۔ روؤ نہیں۔ قرآن مجید کی تلاوت کرو۔" دُور کونے میں بیٹھی آشا سسکیاں بھر بھر کر رو رہی تھی۔ زینب قرآن پڑھتی اور آنسو بہاتی رہی۔

یہ ڈی۔ اے۔ وی کالج کا ہوسٹل تھا۔ ہزاروں سہمے اور گھبرائے ہوئے ہندو اِس میں پناہ لے رہے تھے۔ اِدھر اُدھر اُن کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ میزیں۔ کرسیاں۔ کپڑا سینے کی مشینیں۔ ریڈیو سیٹ۔ ہر شخص تباہ حال نظر آتا تھا۔ ہر انسان فریادی تھا۔ آسمان میں ساون کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔

زمین پہ آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی۔ ہوسٹل کے کمرے۔ لان۔ کاری ڈور بناہ گزینوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اور ابھی مشترکہ فوج کے جوان فوجی لاریوں میں شہر کے اندرونی حصّوں سے ہندوؤں کو نکال کر لا رہے تھے۔ ہر شخص ایک نئی مصیبت کی داستان کا عنوان بن کر آتا تھا۔ کسی کا گھر جل گیا تھا۔ کسی کے خاوند کو چھُرا گھونپ دیا گیا تھا۔

آشا اور اُس کی ماما کو ایک چھوٹے سے کمرے میں چھوڑ کر میں ہوسٹل میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ اب کیا ہوگا۔ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے ہوئے طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ اِن میں سے کافی لوگ ایسے بھی تھے۔ جن کے ساتھ اُن کے مسلمان ہمسائیوں نے بھائیوں جیسا سلوک کیا تھا۔ لان میں گھومتے ہوئے معاً مجھے قربان علی یاد آیا۔ گھر سے چلتے وقت اُس نے مجھ سے بغلگیر ہو کر کہا تھا "کھنہ صاحب ملک تقسیم ہو گیا۔ لیکن محبّت تو تقسیم نہیں ہو سکتی۔ خدا را ہمیں بھُول نہ جائیے گا۔"

مسنز قریشی مسنز کھنہ کے گلے لگ کر پھُوٹ پھُوٹ کر روئی تھی۔ رخصت ہوتے وقت اُس نے آشا کو دو ریشمی فراک دیتے ہوئے کہا تھا "میں نے یہ فراک یاسمین کے لئے سلوائے تھے۔ یاسمین نہ رہی۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔ بیٹی یہ فراک تم پہن لینا۔"

میں انہی خیالات میں کھویا ہُوا گم سُم ایک ٹولی کے نزدیک گذر رہا تھا۔ کہ یک لخت میری نظر اُس پہ پڑی۔ وُہ ایک مجمع کے درمیان کھڑا ایک ایک کر باتیں کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے نہیں دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا "صاحب۔ یہ بات غلط ہے۔ کہ مسلمان ہی چھُرا گھونپ سکتے ہیں۔ ہمارا داؤ چل جائے تو کسر ہم بھی نہیں چھوڑتے۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ جولائی کی ایک شام کو میں راوی روڈ سے سائیکل پہ جا رہا تھا۔ دراصل میں گھر سے شکار کی تلاش میں نکلا تھا۔ چھُرا میں نے تھیلے میں چھُپا رکھا تھا۔ ایک پُل کے نزدیک میں نے کچھ لڑکیوں کو کھیلتے ہوئے دیکھا۔ میں اُن کی جانب چھُرا لے کر لپکا۔ ایک لڑکی کے سوا باقی سب بھاگ گئیں۔ میں نے اُسے پکڑ لیا۔ اور اِس زور سے اُس کے پیٹ میں چھُرا گھونپا۔ کہ اُسکی چیخ بھی نہ نکل سکی!"

"لیکن تمہیں یہ کیا معلوم۔ کہ وہ لڑکی مسلمان تھی"۔ مجمع میں سے کسی نے پوچھا۔

"مجھے پورا یقین ہے۔ کہ وہ مسلمان ہی تھی۔ اُس کے بازو پہ اُس کا نام لکھا ہُوا تھا۔ یاسمین"!

مجمع میں کھڑے ہوئے لوگوں کے چہروں پہ رونق آ گئی۔ ایک لحظہ کے لئے وہ اپنا غم و غصّہ بھُول گئے۔ اور تحسین آمیز نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ لیکن میں وہاں زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکا۔ مجھے یوں محسوس ہُوا۔ کہ اہنسا میں یقین رکھنے کے باوجود اُن سب نے مل کر ایک چھوٹی سی معصوم بچیا کی ہتیا کر ڈالی!

”اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا!“

تسنیم سلیم چھتاری

بیگم اکبر نے کمرہ میں قدم رکھتے ہی اُسے یوں کرسی پر نڈھال پڑے دیکھا اور اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں پر نظر گئی تو چند لمحوں کو اُن کا اپنا چہرہ ت[illegible] ہو گیا اور زبان گنگ ہونے لگی ...... پھر ایک ساتھ اُن کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی اور بڑھ کر اُنھوں نے بیٹی کی گردن میں بازو ڈال دیے۔

”ارے یہ سہیلی کی جدائی کا غم ہے اتنا؟ ارے سب ہی لڑکیاں ایک دن اسی طرح چلی جاتی ہیں ...... تو بھی تو جائے گی نا؟“ بیگم اکبر نے رُوبی کے بکھرے بال اپنے ہاتھوں سے سنوارتے ہوئے اسکی پیشانی چوم لی۔

ماں کے بازوؤں میں آتے ہی ضبط کا وہ بندھ ٹوٹ گیا جسے ”مس رابعہ اکبر“ کی خود اعتمادی اور پندار نے جانے کیا کیا جتن کر کے لگایا تھا...... بیگم اکبر کے سینے سے لگ کر وہ ننھے بچے کی طرح سسکیاں لینے لگی......

”ارے ارے!“ بیگم اکبر نے اُسے اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا ”اس میں بھلا رنج کی کیا بات ہے؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے، تمہاری سہیلی بڑی خوش قسمت ہے، حیات بڑا قدردان لڑکا ہے...... دونوں بہت خوش رہیں گے...... کیوں ہے نا؟“

رُوبی نے روتے روتے ماں کے سوال پر اثبات میں سر ہلایا۔

”بس تو پھر؟“ بیگم اکبر نے اپنی سفید ساری کے پلّے سے رُوبی کی آنکھیں خشک کر دیں،

”اب بھلا یہ غم کیسا؟...... آج تو نوری کو سنورتا دیکھ کر میرا جی نہیں بھی دلھن بنانے کو مچلنے لگا...... سچ مچ کیسی پیاری لگ رہی تھی، خدا خوش رکھے بڑی نیک طینت بچّی ہے......“

رُوبی نے دفعتہً ماں کے سینے سے سر اُٹھا کر اُنہیں شاکی اور معترض نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ”ممی آپ تو ہمیشہ سے یہی کہتی آئی ہیں کہ نوری بڑی نیک طینت ہے اس کا دل کس قدر وسیع ہے...... وہ کسی کا جی نہیں توڑتی...... مگر آپ کو کیا پتہ کہ نوری نے میری کوئی شرارت نہیں بھلائی تھی میری کسی زیادتی کو دل سے معاف نہیں کیا تھا اور آج اس نے مجھ سے جی بھر کے سب کا بدلہ لے لیا ہے ایسی معصومیت اور خاموشی سے اس نے پچھلے پندرہ سال کے واقعات کا حساب چکایا ہے کہ جیسے خود اُسے بھی اپنے کاری حربہ کی خوں ریزی کا احساس نہ ہو......

ہاں وہ اپنے سُرخ جوڑے میں بہت اچھی لگ رہی تھی اور میرے ہاتھ سے جو اُس کے ماتھے پر چوٹ آئی تھی وہ زخم کا نشان بھی ٹیکے سے چھپ گیا تھا...... پر ممی آپ کو خبر نہیں کہ نوری کے ہاتھوں جو چوٹ مجھے لگی ہے وہ شادی کے ٹیکے سے نہیں مٹ سکتی، اب میں سُرخ جوڑا پہن کر کبھی نوری کی طرح نہیں سنور سکوں گی......“ اس نے لب نہیں کھولے اور بیگم اکبر کی ساری سے منہ چھپا کر پھر سسکنے لگی......

اُس نے پندرہ سال کے بکھرے دنوں میں کتنی مرتبہ نوری کو رُلایا تھا اور بے دردی سے ہنستی رہی تھی یہ اب اُسے اچھی طرح یاد نہ تھا مگر ہاں نوری کا

کی وہ کامراں اور شرمگیں مسکراہٹ جو سُرخ جالی کے دوپٹہ سے جھلک رہی تھی اُسے زندگی بھر رُلانے کو کافی تھی .... "کیسی سنگدل ہے نوری، آخر اس نے اپنی ساری بے بسی اور لاچاری کا انتقام لے ہی لیا اور سب کہہ رہے ہیں، نوری کس قدر صلح جو ہے، کیسی نیک طبیعت ہے ...... اور میں تو ہمیشہ سے ظالم اور سنگدل ہوں .... ممی بھی یہی کہتی ہیں اور ...... حبات بھی تو یہی کہہ رہا تھا ......"

سنگدل اور ظالم کا خطاب اُسے پہلی مرتبہ اسی دن ملا کہ جب اس نے پہلی بار نوری کو دیکھا تھا ...... یہ آج سے بہت برس پہلے کی بات ہے جب نوری نے اسکول آکر بے بی کلاس میں داخلہ لیا تھا، اُسے ایک سے دس تک گنتی بھی نہ آتی تھی مگر شاید اُسی دن سے وہ روبی کی ساری زیادتیوں اور شرارتوں کا حساب رکھ رہی تھی حالانکہ سارے اسکول کی اُستانیاں اور ساتھ پڑھنے والی بچیاں ہی نہیں خود بیگم اکبر نے ہمیشہ یہی کہا کہ نوری کا دل کس قدر شفاف ہے وہ کسی کا کھوٹ نہیں رکھتی۔

وہ کیت کا درخت آج بھی اسکول کے احاطہ میں پھاٹک سے چند قدم کے فاصلہ پر جیسے کا تیسا موجود ہے اور اب بھی اُس میں ہر سال اسی طرح لد کر کیت آتے ہیں جیسے اس سال آئے تھے جبکہ بڑکی ایک اُونچی ڈالی پر بیٹھ کے نوری کو سہمگیں انداز میں اِدھر اُدھر تکتے اور جھجک جھجک کر قدم بڑھاتے دیکھ کر وہ نوری کو مخاطب کر کے استفسار کرنے سے باز نہ رہ سکی تھی اور نوری کو مخاطب کرنے کا روبی کے پاس اور ذریعہ بھی کیا تھا، اُسے اِس ننھی مُنّی گول مٹول لڑکی کا نام بھی معلوم نہ تھا، اور پھر اس میں شک نہیں کہ اپنا نشانہ آزمانے کے ایسے موقعے بھی زندگی میں کم آتے ہیں۔

اور سب لڑکیاں تو اُسے اچھی طرح جانتی تھیں، اسکی نشانہ بازی اور زبان درازی سے بھی واقف تھیں پھر آئے دن خواہ مخواہ بھی اُستانیوں تک اسکی شکایت پہنچانا سب کا دلچسپ مشغلہ تھا، مگر یہ نئی لڑکی ...... اور اس سے یہ عجیب و غریب تعارف کس قدر ڈرامائی اور مرعوب کرنے والا ہوگا۔ روبی نے ہاتھ میں پکڑے کیت کو ایک مرتبہ ہوا میں اُچھال کر تولا پھر بازو پھیلا کر نوری کے سر کا نشانہ لگایا اور کلائی کے خفیف جھٹکے سے ہوا میں تیر کی طرح سنسناتا ہوا کیت پلک جھپکتے روبی کے ہاتھ اور نوری کی پیشانی کا درمیانی فاصلہ طے کر گیا ...... نوری ایک دلدوز چیخ مار کے وہیں زمین پر ڈھیر ہو گئی اور روبی نے کسمسا کر اپنی نشست پر پہلو بدلا "کمبخت کا حلق ہے کہ یونیورسٹی کا سائرن!" روبی نے سوچا "اب ضرور یہ چیخ سُنکر اِدھر اُدھر سے کوئی نہ کوئی نازل ہو جائے گا" اور اُس کا ڈر بے جا نہ تھا لمحوں میں اچھا خاصا مجمع ہو گیا، پھاٹک سے آنے والی لڑکیاں ہی نہیں بلکہ آس پاس کے کمروں سے وہ اُستانیاں بھی نکل آئیں جو ابھی کلاس لینے نہیں گئی تھیں، پھر برابر کے دفتر سے منشی، چوکیدار اور چپراسی کو آتے دیر ہی کیا لگتی تھی ...... "ہائے ہائے بچی کا سر پھٹ گیا" "ارے کس غضب کا خون بہہ رہا ہے" ...... "آخر یہ ایسی سخت چوٹ کیسے لگی؟" اور اَن گنت مستفسرانہ نظروں میں سے چند نظریں اُس کیت پر بھی جا پڑیں جو غریب بچی کا سر پھاڑ کر بھی ٹس سے مس نہ ہوئی تھی ...... اب معاملہ کی تہہ تک پہنچنا کیا مشکل تھا، یکبارگی سب نے سر اُٹھا کر درخت کی سرسبز شاخوں میں بازوؤں سے منہ چھپائے اور گھٹنوں میں سر دبیے روبی کو بھی دیکھ لیا۔

"کون ہے یہ؟" روبی کے کانوں میں اَن گنت آوازیں سوئیوں کی طرح چُبھیں ....

"ہوتا کون! وہی رابعہ ہے" رضیہ آپا کی آواز کو روبی خوب پہچانتی تھی "سب اسی کمبخت کے کرتوت ہیں"

"افوہ یہ چڑیل اپنی حرکتوں سے حشر تک باز نہیں آئے گی" کسی اور اُستانی نے پیشین گوئی کی۔

روبی کو سخت حیرت ہوئی اور بے حد غصّہ آیا، حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ اس نے فراک کے دامن میں اچھی طرح ہاتھ منہ چھپا لیا تھا پھر بھی اس

کی جھلک دیکھتے ہی یہ کہنا کسی کے لئے بھی مشکل نہ ہوتا کہ "یہ رابعہ اکبر ہے" رابعہ اکبر جو اسکول کی حدود میں شیطان کی خالہ کہی جاتی تھی۔ اور غضب کی بات یہ تھی کہ نیاز آپا اُسے جب نہ تب "چڑیل" ہی کہتی تھیں حالانکہ صورت شکل رنگ روغن سبھی اعتبار سے نیاز آپا خود قطعی چڑیل تھیں اور روبی.....؟ وہ تو بقول "ممی" "کہانیوں والی" "پریوں کی شہزادی" تھی۔

بہرحال وہ لڑکی جسے روبی نے اس قدر اچھوتے طریقے سے مخاطب کر کے نام پتہ پوچھنا چاہا تھا اب ہاتھوں ہاتھ لیڈی ریڈنگ کے ہسپتال میں مرہم پٹی کے لئے پہنچائی جا چکی تھی مگر پیڑ کے نیچے جوں کے توں لڑکیوں اُستانیوں اور تماش بینوں کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ اب "روبی" سے نیچے اُترنے کے لئے استدعا کی جا رہی تھی

"اب نیچے اُترو، نامراد!" رضیہ آپا نے ہاتھ نچا کر کہا، "یا وہیں ٹنگی رہیگی؟

روبی کو رضیہ آپا کے ہاتھ نچانے کی عادت سے انتہائی نفرت تھی۔ اور یہی ہاتھ نچانے کی عادت کا سبب تھا کہ خود رضیہ آپا کو روبی سے قلبی نفرت ہوگئی۔ رضیہ آپا پہلی سے پانچویں کلاس تک حساب پڑھاتی تھیں، جب تک روبی پہلی کلاس میں رہی وہ سنجیدگی سے رضیہ آپا کی ہاتھ چلانے والی قبیح عادت کو دور کرنے کی تجاویز پر غور کرتی رہی اور جیسے ہی گرمیوں کی تعطیل کے بعد وہ دوسری میں آئی اس نے رضیہ آپا کے گستاخ ہاتھوں کا بندوبست کر دیا، جب حساب میں غلطی ہوتی رضیہ آپا لڑکی کو بلا کر اپنی کرسی کے پاس کھڑا کر لیتیں اور پھر چیخ چیخ کر اپنی لمبی لمبی سخت انگلیاں اس لڑکی کی آنکھوں، گالوں اور ناک پر نچاتیں، "کیوں سترہ میں سے آٹھ گھٹے تو کیا بچا؟" یا "تیرہ اور پانچ بیس کیسے ہوئے؟" جیسے مہمل سوالات کی تکرار کے ساتھ وہ غریب بچی کا سارا منہ کھسوٹ لیتی تھیں...... روبی اکثر رضیہ آپا کی مشق ستم کا نشانہ بنتی، تقریباً روز ہی اس کا حساب غلط سلط ہوتا تھا اور پانچ دس منٹ اس کو رضیہ آپا کی کرسی سے لگ کر دل ہی دل میں اُن کی انگلیوں پر فالج گرنے کی دعا مانگنی پڑتی تھی، وہ روبی کی حرکتوں سے خصوصیت سے بیزار تھیں اور روبی کو یقین تھا کہ وہ بغیر خطا بھی سزا کے بہانے ڈھونڈا کرتی ہیں۔ بس ایک دن یونہی دستور کے مطابق رضیہ آپا اس کی کاپی دیکھتے ہی بھڑک گئیں اور روبی کو پاس بلا کر کھڑا کر لیا...... رضیہ آپا کی نگاہیں تو کاپی پر تھیں مگر ہاتھ روبی کے رخساروں ناک اور ہونٹوں پر ناچ رہا تھا، وہ اس وقت بالکل ہی آپے سے باہر ہو رہی تھیں" او ناشدنی پھر وہی حرکت! بتا یہ سوال جمع کا تھا یا گھٹانے کا؟" اور پھر اُنھوں نے اپنی لمبوتری انگلیاں چلا چلا کر" بتا؟" کی اس قدر تکرار کی کہ جواب دینے کے لئے روبی کو منہ کھولنا ہی پڑا...... اب رضیہ آپا خواہ کچھ کہیں مگر روبی تو ہمیشہ یہی کہتی رہی کہ اس نے بولنے کو منہ کھولا تھا اور رضیہ آپا کی انگلی کاٹنے کا مقصد ہرگز نہ تھا...... اصلیت جو بھی ہو مگر اس میں شک نہیں کہ رضیہ آپا تڑپ گئیں اور روبی کے دانتوں سے اپنی انگلی آزاد کرانے کو انہیں کافی زور لگانا پڑا...... اس کے بعد جو ہوا وہ تو قابلِ ذکر نہیں مگر ہاں رضیہ آپا اور روبی کی درمیانی عداوت اور بھی ترقی پذیر ہوگئی اور رضیہ آپا بقول روبی اس کے خون کی پیاسی رہنے لگیں......

روبی کو معلوم تھا کہ بس پیڑ کی شاخوں تک ہی خیریت ہے اس کا زمین پر قدم پڑا تو شامت آئی...... نیچے اُترنے کی بات اَن سُنی کر کے وہ اور سنبھل کر بیٹھ گئی......

"ارے دیکھا اس حرافہ کو؟" فیروزہ باجی گالیوں کی ڈکشنری تھیں، "کیا اطمینان سے بیٹھی ہے"

پھر سب نے ایک ساتھ مل کر سخت خون کھولانے والے جملوں کے ساتھ اُسے پیڑ سے اُترنے کی ہدایات دینی شروع کیں...... روبی نے دانت کچکچا کر چاروں طرف دیکھا اور دفعتاً اس کے دماغ میں یہ لاجواب تجویز آ گئی کہ کہیں نہ دس پانچ کیت توڑ کر ان سب زبان درازوں

کی چاند پر ایک ایک جمایا جائے ......!!!

ابھی وہ نظر گھما کر آس پاس لگے ہوئے کیتوں کو دیکھ ہی رہی تھی کہ نیاز آپا نے ایک نیا حکم صادر کیا "ادے یہ کمبخت اس طرح نہیں اُترے گی۔ بندو چوکیدار سے کہو اوپر چڑھ کے اس منحوس کو گھسیٹ لائے۔"

بندو چوکیدار موقع پر موجود تھے اور پاجامہ اُڑس کر چلے روبی کو گھسیٹنے، روبی کو بندو چوکیدار ہمیشہ سے لپ سنار تھا وہ کچے آموں کے پیانمہ کھانے کو پسا ہوا نمک بھی مہیا کرتا تھا اور پھر جو دلچسپ چیزیں اسکول کے احاطے میں دستیاب نہ ہوتیں۔ مثلاً کمرغیں، کٹارے اور جھڑبیری کے بیر وغیرہ وہ بھی کہیں نہ کہیں سے کھوج لانا اسی کے ذمّہ تھا۔ سبھی لڑکیاں بندو چوکیدار کو پسند کرتیں اور روبی کی بہت سی شرارتوں پر وہ پردہ پوشی کر چکا تھا۔ ایک لمحہ کو روبی نے سب سے پہلے کیت سے بندو چوکیدار کے گنجے سر کو آزمانے کی ٹھانی .... پھر ارادہ بدل دیا...... بندو اچھا آدمی ہے.... اور رازدار بھی ہے۔"

"ہم خود اُتر آئیں گے" اس نے خفگی آواز میں بندو چوکیدار کو مخاطب کیا۔

"اچھا، اُتر آئیے ...... بندو رُک گیا۔

روبی نے اول سر اُٹھا کر گردوپیش پر ناقدانہ نظریں ڈالیں...... حالات انتہائی خطرناک تھے...... مگر اب چارہ کیا ہے...... پھر وہ بزدل نہ تھی..... "آخر اوکھلی میں سر دیا ہے تو پھر موسلوں سے کیا ڈر......"

دوسرے لمحے پیڑ کا گھیرا ڈال کر کھڑی ہوئی اُستانیوں اور لڑکیوں کی متحیر نگاہوں کے سامنے روبی نے ایک شاخ سے دوسری پر چھلانگ لگائی اور لچکیلی ڈالیوں کا سہارا لیتی ہوئی اس پھرتی سے نیچے آئی کہ آس پاس کھڑی ہونے والیاں بھی پٹپٹا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔

زمین پر قدم رکھتے ہی روبی نے سب سے بے نیاز ہو کر پہلے داد طلب نظروں سے حمیدہ اور صالحہ کی طرف دیکھا...... وہ دونوں سب سے الگ الگ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کھڑی تھیں اور کچھ بوکھلائی نظر آ رہی تھیں...... دونوں نے اس وقت کوئی اظہارِ خیال نہ کیا۔

اس سے قبل کہ روبی پھاٹک سے نکل کر سڑک پر پہنچنے کے ارادہ پر عمل پیرا ہو سکے اس کا ایک کان فیروزہ باجی نے پکڑا تو دوسرا نیاز آپا کے ہاتھ میں آیا۔ ...... رضیہ آپا اس جلوس کو اپنی رہنمائی میں لے کر ہیڈ مسٹرس کے دفتر کی طرف چلیں......

ہیڈ مسٹرس کو نوری کے زخمی ہونے کی اطلاع ہو چکی تھی اور ملازم کی بیٹی کا وہ غالباً انتظار ہی کر رہی تھی..... "یہ لڑکی پیڑ پر کیسے چڑھی؟" اُنھوں نے رضیہ آپا کو جلوس کا لیڈر دیکھ کر اُنہی سے پوچھا.....

"جی مجھے کیا معلوم؟" اور وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

نیاز آپا آگے بڑھ آئیں "اجی یہ چڑیل تو سارا دن اُسی پیڑ پر چڑھی رہتی ہے آپ ذرا پوچھئے تو سب سے، اس نے لنگوروں کو مات کر دیا ہے، اس کا بس چلے تو آسمان میں تھگلی لگا دے..... آپ کے پاس تو اب تک کوئی شکایت نہیں لایا...... کئی بار اس نے سقّے، مہترانی اور مالی کو انہی کیتوں سے مارا ہے، آج اس غریب بچّی کا خون ہی کر دیا...... اس چڑیل سے کوئی پھل تو اسکول کے احاطے میں بچا نہیں۔"

"یہ لڑکی اُس پیڑ پر کیوں چڑھتی ہے؟" ہیڈ مسٹرس کو سب ہی سنکی سمجھتے تھے اور ایسے موقعہ پر سب کو اُن کی کم فہمی پر انتہائی رحم آتا...... اب بھلا اسکول کی اُستانیاں بچوں کی شرارت کا "انسائیکلوپیڈیا" تو نہیں ہوتیں جو کھٹ سے ایسے سوالات کا جواب دے سکیں......

فیروزہ باجی کی عقل کام دے گئی، وہ روبی سے ہی مخاطب ہو گئیں "جلد جواب دو، بیگم خیری پوچھتی ہیں کہ تم اس پیڑ پر کیوں چڑھتی ہو؟"

روبی نے تعجب اور خفگی سے باری باری فیروز باجی اور ہیڈ مسٹرس کی طرف دیکھا، ملاحظہ ہو کہ یہ اُستانیاں کلاس میں بچوں سے ایسے عجیب العقول سوالات پوچھتی ہیں کہ جن میں سے اکثر کے تو در اصل جوابات ہی نہیں ہوتے اور ہوتے بھی ہیں تو سخت نامعقول ہوتے ہیں .... اس پر قیامت ہے کہ اِن بہ خود غلط سمجھ دار خواتین کو اس قدر پتہ نہیں کہ آخر کیت کے پیڑ پر کیوں چڑھا جاتا ہے ؟ "کیت توڑنے کے لئے" ؟ اس نے فوراً بتا دیا۔

" کیوں ؟ " بیگم نجیری نے زور سے میز پہ ہاتھ مارا " تمہیں معلوم ہے کہ پیڑ پر چڑھنا منع ہے اور اسکول کے احاطے میں پھل توڑنے کی سخت ممانعت ہے ...... جواب دو ...... ! "

روبی نے جواب دینے کو مُنہ کھولا تھا مگر دفعتہً اسکی نگاہیں برآمدے کی طرف گئیں ...... دروازہ کے قریب، حمیدہ اور صالحہ اسی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کھڑی تھیں ...... اور اب ان کی نگاہوں میں کس قدر وحشت، کتنا خوف، اور کیسی التجا تھی ...... وہ خاموش رہی۔

پھر " بولو " اور " جواب دو " کا جواب اسکی خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا ......

آخر روبی کے لئے سزا تجویز کر کے بیگم نجیری مسز اکبر کے نام روبی کی شکایت کا خط لکھوانے بیٹھ گئیں اور روبی کو سب اُستانیوں کی معیت میں قتل گاہ پہنچا دیا گیا۔

شام کو اسکول کا وقت ختم ہُوا تو وہ بھی آزاد ہو کے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی پھاٹک کی طرف چلی۔ گھنٹوں بنچ پر کھڑا رہنے سے اُس کے پیر سُن ہو گئے تھے، رول کی مار سے دونوں ہاتھ پھوڑے کی طرح دُکھ رہے تھے اور دن بھر قسم قسم کی گالیوں نے خون علیحدہ کھولا رکھا تھا ...... آئندہ اسکول نہ آنے کے منصوبے باندھتی وہ بورڈنگ ہاؤس کے نزدیک پہنچی ہی تھی جو حمیدہ اور صالحہ دوڑ کر اُس کے پاس آگئیں ...... اپنا سارا دُکھ بھُول کر اس کے ہونٹ مسکراہٹ سے کِھل گئے۔

" میری اچھی گڑیا " صالحہ نے اُسے بازوؤں میں گھیر لیا " ظالموں نے تجھ پہ کیا ستم ڈھائے " ؟

" ہائے تیری ستاروں جیسی آنکھیں رو رو کر سُوجھ گئی ہیں " حمیدہ نے بڑے درد سے کہا، روبی کو معلوم تھا کہ یہ بات جھُوٹ ہے رونا کیا معنی اس کی آنکھوں میں نمی تک تو آئی نہ تھی وہ رونے کی بالکل قائل نہ تھی " نہیں تو حمیدہ آپا ...... ہم تو بالکل نہیں روئے ...... " اس نے فخر سے سر ہلا کہ کہا۔

" تو غالباً یہ غصہّ کا اثر ہوگا " حمیدہ نے جلدی سے بات درست کی، اور اس میں شک نہیں کہ اُسے انتہائی غصّہ آرہا تھا اس کا بس چلتا تو ......

" آج واقعی تونے ثابت کر دیا کہ تو اِن اسکول میں پڑھنے والی عام لڑکیوں سے کس قدر بلند و بالا ہے ...... تو کس قدر بہادر اور نڈر رہے ..... میرا تو خون خشک ہو گیا تھا کہ ...... "

" ارے تو آپ سمجھیں کہ ہم آپ دونوں کا نام لیں گے ...... " وہ زور سے ہنسی۔

" نہیں نہیں " صالحہ نے گھبرا کہ کہا " مجھے معلوم تھا کہ روبی حشر تک ایسی بات نہیں کہے گی ...... بھلا ہماری روبی کہیں اور بزدل لڑکیوں جیسی ہو سکتی ہے " !

" ہاں " اب روبی ذرا اٹھلائی " پہلے بھی تو ہم نے اس خط والے قصے پہ آپ کا نام نہیں بتایا تھا " !

" ہاں ہاں " دونوں نے تائید میں سر ہلائے " ہمیں کیا یاد نہیں ہے " !

روبی سے باتیں کرتیں وہ دونوں پھاٹک کے نزدیک آ گئیں، باہر روبی کی موٹر کھڑی تھی ......

"میں کل سے اسکول نہیں آؤں گی " روبی کو اپنا عہد یاد آ گیا " اب میں پڑھنا چھوڑ دونگی "

" ارے نہیں " صالحہ اور حمیدہ کو جیسے عمر میں اس سے بڑا صدمہ کبھی نہ پہنچا تھا " پھر ہم لوگ یہاں کیسے رہیں گے .... اچھی روبی ہماری خاطر تم اسکول مت چھوڑنا ...... ہمیں معلوم ہے کہ تم جیسی لڑکی کے لئے یہ اسکول بالکل بیکار ہے، دراصل تمہیں خدا نے پڑھنے کے لئے بنایا ہی نہیں ہے تم تو جنگل کی شاہزادی ہو، تم جیسی بہادر لڑکی کے لئے تو کچھ اور ہی زندگی ہوتی ہے، جہاں تم ان لال پیلے فراکوں کی جگہ چیتے کی کھال والا خوبصورت لباس پہن سکو ...... "

" جیسا سینما میں دیکھا تھا ؟ " روبی نے ایک ٹانگ پر اچھلتے ہوئے شوق سے پوچھا ۔

" ہاں ہاں بالکل ایسا ہی ...... اور ایسا ضرور ہوگا ...... " تم مت گھبرا پیاری روبی، ایک دن وہ وقت ضرور آئے گا ...... ہم تیری قسمت جانتے ہیں، ایک دن انہی پیپل، نیم اور جامن کے پیڑوں پر چھلانگیں لگاتا ہوا تیرا ٹارزن کیرٹ کے اس درخت تک آ پہنچے گا اور اپنی شہزادی کو جنگلوں کا راج کرانے لے جائیگا ...... کیوں روبی تو اسکول آنا تو نہیں چھوڑ دیگی "

" نہیں " اس نے کسی دور دراز کی فکر میں کھوئے ہوئے آہستہ سے جواب دیا اور موٹر کی طرف بڑھنے لگی ...... صالحہ نے دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے کان پر منہ رکھ کر سرگوشی کی " اچھی روبی اگر آج بھی چپراسی پر تجھے اچھن صاحب ملیں تو کہہ دینا کہ مجھے سینما جانے کی اجازت نہیں ملی ہے اور ...... اور انہوں نے اس بارے میں گھر لکھا ہے یا ابھی نہیں لکھا ؟ "

" اچھا اچھا " کہہ کر وہ بھاگی اور اس سے قبل کہ ڈرائیور موٹر کا دروازہ کھول سکے وہ کھلے ہوئے شیشے میں سے کود کر موٹر میں داخل ہو گئی اور بڑے فخر سے ہاتھ ہلاتی ہوئی صالحہ اور حمیدہ کا منہ چڑاکر سڑک کے موڑ پر اوجھل ہو گئی ......

روبی کو یقین تھا کہ " ممی " آج بھی ہمیشہ کی طرح کچھ نہیں کہیں گی، بلکہ جب وہ ممی کو بتائے گی کہ اسے مختلف قسم کی خوفناک سزاؤں کے علاوہ پورے دقت سنگدل، بے رحم اور فاتلہ جیسے عجیب و غریب خطابوں سے نوازا گیا ہے تو کیا پتہ کہ وہ ہیڈ مسٹرس کو فون کر کے استانیوں کی شکایت کر دیں ......

ممی لان میں گلاب کے پودوں کی روش پر ٹہل رہی تھیں، حالانکہ یہ وقت ان کے چائے پینے کا تھا ...... روبی کو دیکھ کر وہ بڑے نپے تلے قدموں سے پلٹیں اور روز کی طرح اسے گلے لگا کر چومنے کے بجائے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے نشستگاہ میں چلی گئیں۔ روبی کا دل بیٹھنے لگا ...... آج نئی بات کیا ہے ؟ ...... اسکول سے کوئی پہلی رپورٹ تو اس کے خلاف نہیں آئی تھی، ایسا تو اکثر ہوتا تھا ! مگر ممی کے تیور اس طرح کبھی نہیں بدلتے تھے۔ ڈرتی ڈرتی وہ کمرے میں پہنچی ...... چائے ابھی یونہی رکھی تھی ...... ممی کھڑکی کے سامنے کھڑی باہر خلا میں کچھ دیکھ رہی تھیں ...... ان کی سفید ساری کا پلہ شانے سے پھسل کر قالین پر لہرا رہا تھا، بالوں کا جوڑا گردن پر ڈھلکا ہوا تھا، ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے اور ممی کا گورا رنگ آج ان کی ساری سے بھی زیادہ سفید تھا ...... روبی کو آج پھر وہ باغ میں رکھے ہوئے سنگ مرمر کے مجسمے جیسی لگ رہی تھیں۔ روبی جانتی تھی کہ جب کبھی وہ غمگین ہوتیں تو اسی طرح سنگ مرمر کے مجسمے جیسی سفید، بے حس اور سرد ہو جاتیں ...... اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ایسے موقعہ پر ممی کو واپس لوٹانے کی ترکیب کیا ہے۔ اگر وہ ممی سے لپٹ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کا چہرہ تھام لے اور " میری ممی، میری اچھی ممی " کہتے ہوئے انہیں چوم لے تو ان کی آنکھوں کے بجھے ہوئے چراغ جل جاتے، سفید رخساروں میں خون کی سرخی جھلکنے لگتی اور بھنچے

ہوئے لب مسکرا اٹھتے ...... روبی نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور مسز اکبر کی طرف دوڑی اس سے قبل کہ وہ ممی کی کمر کے گرد اپنی بانہوں کا گھیرا ڈ
مسز اکبر نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا "روبی مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے"۔

روبی کے قدم زمین پر جم گئے، ممی کی آواز کس قدر اجنبی لگ رہی تھی۔

"تمہارے اسکول سے اطلاع ملی ہے کہ تم نے آج ایک لڑکی کو کیبٹ مار کے زخمی کر دیا، سنا ہے تمہاری اس حرکت سے اس بچی کے ماتھ
پر گہرا زخم آیا ہے اور بہت خون نکلا ہے"۔

بیگم اکبر نے دفعتاً مڑ کر روبی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، آج ان کی نگاہوں میں ایک انجانا دکھ تھا "تم شریر ہو اور مجھے تمہاری ہر شرارت سے
پیار ہے مگر مجھے ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ تم اس قدر بے رحم اور سنگدل بھی ہو سکتی ہو"!

"ممی" روبی زور سے چیخی .... یہ آج ممی کیا کہہ رہی ہیں!

"مجھے بتاؤ تم نے اس بچی سے کس بات کا بدلہ لیا ہے؟ اگر اس کی کسی بات سے تمہیں غصہ آیا تھا تو کیا تم نے ایسی بیدردی سے اس ک
سزا دی ...."

"نہیں ممی" روبی نے احتجاج کے طور پر دونوں ہاتھ اٹھا دیئے "میں اس لڑکی کو نہیں جانتی"۔

"تو کیا تم کہنا چاہتی ہو کہ تم نے اس بچی کو نہیں مارا؟" بیگم اکبر کو خوف ہوا کہ آج ان کی بچی جھوٹ بولنے پر آمادہ ہے، ان کے ہونٹ اور بھ
سکڑ گئے اور آنکھوں میں دکھ کی تہہ گہری ہو گئی۔

"مارا تو میں نے ضرور ہے" روبی نے ملزمانہ انداز میں گردن جھکا لی "مگر میں اسے جانتی نہیں"۔

"تو پھر تم نے اسے کیوں مارا؟" حیرت سے مسز اکبر کی پتلیاں پھیلنے لگیں .....

"ممی، میں تو پیڑ پر بیٹھی تھی ...... پہلے میں نے اس لڑکی کو دیکھ کر سوچا کہ اسے آواز دوں، پر اس کا نام تو مجھے معلوم نہیں تھا .....
پھر ...... پھر میں نے سوچا کہ میں کیبٹ سے نشانہ لگاؤں اگر نشانہ اس کے لگا تو وہ میری طرف ضرور دیکھے گی ...... مجھے کیا خبر تھی کہ اس
سر پھٹ جائے گا"۔

"اوہ تو کیا تم نے محض اس کو مخاطب کرنے کے لئے کیبٹ سے نشانہ لگایا تھا؟ مارنے کا مقصد نہ تھا"

روبی نے سر ہلا کر اقرار کیا کہ یہی بات ہے۔

"حد کر دی" مسز اکبر، پتھر کے مجسمے سے نکل کر ماں کے روپ میں آگئیں، ساری کا گرا ہوا پلّہ سنبھال کر انہوں نے روبی کو پیار سے
قریب کھینچ لیا "میری جان تم کتنی ناسمجھ ہو، مجھے بڑی مسرت ہے کہ تم نے جان بوجھ کر کسی پر ظلم نہیں کیا ..... کل ہم اس لڑکی کے گھر
جا کر اس سے اس غلطی کی معافی مانگیں گے ...... اور سنو روبی کیا تمہیں نشانہ بازی کا شوق ہے"؟

"بہت شوق ہے" روبی نے جلدی اثبات میں گردن ہلائی۔

"اچھا تو میں آئندہ ماہ تمہاری سالگرہ پر تمہیں ہوائی بندوق خرید دونگی ......"

"جیسی حیات کے پاس ہے؟" روبی فرطِ مسرت سے اچک کر ماں کے گلے سے لٹک گئی۔

"ہاں جیسی حیات کے پاس ہے ..... مگر سنو، انسانوں پر نشانہ نہیں آزماتے، تم باغ میں چڑیاں مارنا ...... میں چاہتی ہوں ک

تم بندوق چلانا سیکھو...... تمہارے ڈیڈی کا نشانہ کس قدر اچھا تھا...... وہ ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ...... یہ مسز اکبر کی آواز رندھ گئی اور انہوں نے سر جھکا کر اپنا چہرہ روبی کے بکھرے بالوں میں چھپا لیا۔

جان پہچان والوں میں سبھی جگہ یہ مشہور تھا کہ مسز اکبر روبی کو تباہ کر رہی ہیں، اُن کے بے جا لاڈ پیار نے بچی کو انتہائی بدتمیز اور ڈھیٹ بنا دیا ہے، اسکول کی استانیاں تو روز ہی اس بات پر تبادلۂ خیال کیا کرتی تھیں، کبھی اگر کسی نے یہ کہہ دیا کہ "غریب بیوہ کا تنہا سہارا ہے"، تو نیاز آپا اور رضیہ آپا جیسی دشمن جاں استانیاں جاموں سے باہر ہونے لگتیں "واہ بیوی، اکلوتی ہے تو کیا اُسے ڈاکو بنائیں گی؟ اکبر صاحب زندہ ہوتے تو کیا بیٹی کو بے نکیل کا اونٹ دیکھ کر خوش ہوتے......"

خیر مرنے والوں کی خوشی اور خفگی کا پتہ کس کو چلتا ہے مگر مسز اکبر کو پورا یقین تھا کہ اُنھوں نے مرحوم شوہر کی روح کو سکون پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی، جب سے اکبر صاحب نے انہیں اس بیگانوں کی دنیا میں تنہا چھوڑا؛ انہوں نے خود کو جیتے جی مُردہ تصوّر کر لیا تھا، اگر یہ ننھی روبی اُن کو اس طرح پکڑ کر نہ رکھتی تو جانے وہ کب کی اکبر صاحب کے پہلو میں جا سوئی ہوتیں، انہوں نے سہاگ کے پانچ سال دیکھے تھے اور اب چھ سال سے وہ باغ میں رکھے ہوئے سنگِ مرمر کے مجسّمے کی طرح سرد اور بے جان ہو کر زندگی گزار رہی تھیں، روبی اکثر اُن کے سینے سے لگ کر اُن کے مُردہ وجود میں زندگی اور احساس لے آتی، اُن کی آنکھوں میں چمک آجاتی اور ہونٹوں پر کھوئی مسکراہٹ کی پرچھائیں ناچنے لگتیں۔ اکبر صاحب کو اپنی بچی سے دیوانہ وار عشق تھا، جب کبھی مسز اکبر بچی کی کسی شرارت سے جھنجھلا کر اُسے ڈانٹنے یا مارنے اُٹھتیں تو اکبر صاحب دوڑ کر آگے جاتے، وہ کہتے تھے "خدا کے لئے اس کو شرارت اور شوخی سے روک کر اس کی رُوح کو نہ کچلو، تم اسے ہر وقت کی سختی سے بزدل بنا دو گی...... دیکھو تم نے اُسے رُلا دیا...... اگر ہمارے جیتے جی اس کی آنکھوں میں آنسو آئیں تو ہمارے ہونے کا کیا فائدہ......"

اکبر صاحب زندہ نہ تھے مگر مسز اکبر بچی کو اس کمی کا احساس دلانا نہیں چاہتی تھیں...... چھ سال میں جانے کتنی راتیں اُنھوں نے خود آنسو بہا کر بتائی تھیں مگر روبی کی آنکھوں میں ایک دن بھی نمی نہ آنے دی۔ اُن کے جسم پر ہمیشہ سادی اور سفید ساری ہی نظر آتی مگر ہر برسات کے بعد وہ الماریوں میں سے اپنی اَن گنت رنگ برنگی ساڑھیوں کو نکال کر دھوپ لگانا نہیں بھولتی تھیں، اُن کی ویران سنگار میز پر اب صرف کنگھا برش ہی باقی رہ گیا تھا مگر وہ مقفّل درازوں میں زیبائش کا سارا سامان خوب سینت سینت کر رکھ رہی تھیں، روز رات کو سونے سے پہلے وہ روبی کو کہانیاں سُناتیں، طرح طرح کی کہانیاں اور قصّے ہوتے مگر اُن سب میں ایک ہی طرح کے آدمی کا ذکر آتا...... ایک بلند و بالا نوجوان کا، جو شہسوار تھا اور جس کی بندوق کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا تھا...... ایک بہادر نوجوان جس نے کسی کے آگے سر نہیں جھکایا اور زندگی میں موت کے سوا کسی سے شکست نہیں کھائی......

"ڈیڈی" کے دونوں گھوڑے اصطبل میں بڑی دیکھ بھال سے رکھے جاتے تھے اُن کے دانہ پانی پر بھی خود نظر رکھتی تھیں اور نوکر کو حکم تھا کہ چاہے جو کام پڑا رہ جائے مگر ہر مہینہ صاحب کی بندوق رائفل نکال کر اُن کی صفائی ضرور ہوتی رہے، وہ روبی سے کہتیں "میں نے ان ہتھیاروں کا لائسنس اپنے نام کرا لیا ہے تم بڑی ہو جاؤ تو مجھ سے لے لینا"!

اکبر صاحب کی جانشینی کا احساس مسز اکبر نے روبی کی رگ رگ میں اس طرح بھر دیا تھا کہ اب وہ کسی سے ڈرنے، جھکنے یا ہار ماننے کو انتہائی ذلیل سمجھتی تھی، اور اسی لئے ڈھیٹ مشہور تھی۔

دوسرے دن ہی شام کو مسز اکبر روبی کو اپنے ساتھ ریاض صاحب کے ہاں لے گئیں اور بیگم ریاض سے اس کا یہ کہہ کر تعارف کرایا "بیگم ریاض یہی وہ لڑکی ہے جس کے ہاتھوں آپ کی بچی کو چوٹ آئی، اب یہ آپ سے اور بچی سے معافی کی خواستگار ہے۔"

کچھ دیر بعد روبی کو نوری کے کمرے میں پہنچا دیا گیا، پلنگ پر پڑی ہوئی نوری کا سفید پٹیوں میں جکڑا ہوا چہرہ ایسا عجیب لگ رہا تھا کہ روبی جھجک گئی مگر روبی نے دیکھا کہ اُسے دیکھتے ہی نوری کے لبوں پر خوش آمدید کی مسکراہٹ آگئی ہے، اس کا ہراس جاتا رہا۔

مسز اکبر نے کہا نوری سے کہا "بیٹی یہ شریر لڑکی تم سے اپنی غلطی کی معافی چاہتی ہے۔"

نوری کی مسکراہٹ گہری ہوگئی اور اس کے سفید دانت جھلکنے لگے، وہ روبی سے مطلق خفا نہ تھی۔

مسز اکبر نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "نوری تم بہت اعلیٰ کردار اور بہادر ہو، مجھے اُمید ہے کہ تم اور روبی آئندہ بہترین دوست ثابت ہوگی......"

مسز اکبر بیگم ریاض کے ساتھ باہر چلی گئیں تو نوری نے اشارہ کرکے روبی کو اپنے پاس پلنگ پر بٹھا لیا "تم ہمارے گھر پہلے کیوں نہیں آئیں؟"

"ارے واہ!" روبی نے تعجب سے سر ہلایا "چوٹ تمہارے کل لگی ہے اور میں پہلے سے افسوس کرنے آجاتی؟...... یہ کیسی بات ہوئی؟"

نوری کو خاموش ہونا پڑا، پھر اس نے پوچھا "تم نے ہمارا کتا دیکھا ہے؟ اس کا نام "پرنس" ہے۔"

"ہوگا" روبی نے لاپرواہی سے کہا "مجھے کتے پسند نہیں ہیں، میں نے تو بلّی پالی ہے۔"

"تمہیں کتے اچھے نہیں لگتے؟" نوری کو حیرت ہوئی۔

"نہیں...... بالکل بیکار ہوتے ہیں، پیڑ پر بھی نہیں چڑھ سکتے...... اور بلّی پیڑ پر خوب چڑھتی ہے۔"

نوری کو پھر خاموش رہنا پڑا۔

غریب نوری کو ماتھے کی چوٹ بہت زیادہ بھگتنا پڑی، زخم پک گیا اور کئی دن بخار بھی آیا، روبی کئی مرتبہ مسز اکبر کے ساتھ مزاج پُرسی کو آئی اور ہر مرتبہ اس کے آنے سے نوری کا آدھا دکھ دُور ہو جاتا تھا نوری بہت ہی صُلح جو تھی اور روبی کی توقع کے مطابق کریٹ کے ذریعہ جو تعارف ہوا تھا وہ حد درجہ مرعوبانہ ثابت ہو رہا تھا۔

خدا خدا کرکے نوری اچھی ہوئی مگر اس کا سانولا رنگ بالکل پیلا پڑ گیا تھا اور بہت دُبلی بھی ہوگئی تھی، سب سے بڑا دُکھ یہ تھا کہ ماتھے کی چوٹ ہمیشہ کے لئے زخم کا نشان چھوڑ گئی تھی۔

روبی کی سالگرہ پر نوری پہلی مرتبہ اس کے گھر آئی، دروازہ سے اُس کا ہاتھ پکڑ کر روبی کمرے میں گھسیٹ لائی اور زور سے چیخی۔

"حیات دیکھو یہی وہ لڑکی ہے جسے میں نے زخمی کر دیا تھا!"

نوری نے حیات کو دیکھا وہ روبی سے بھی کچھ بڑا تھا، قالین پر دونوں پاؤں پھیلائے وہ روبی کی ہوائی بندوق کا معائنہ کر رہا تھا جو "ممی" نے سالگرہ کے تحفے پر دی تھی۔

"اچھا" کہہ کر اس نے بہت غور سے نوری کو دیکھا، پھر بندوق ایک طرف رکھ کر اُن دونوں کے پاس آگیا۔

"دکھانا" کہتے ہوئے اس نے نوری کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں اُٹھایا اور چوٹ کا نشان دیکھنے لگا۔

"کیوں جی ڈاکٹر نے تمہارے ٹانکے تو لگائے ہوں گے؟ مطلب یہ کہ زخم کو سیا تو ہوگا؟"

نوری نے حیات کے سوال پر بوکھلا کر نفی میں سر ہلا دیا۔

" اوہ " وہ نوری کو چھوڑ کر کھڑکی کی طرف مڑ گیا " تب تو یہ گہرا زخم نہیں ہو سکتا ، بڑے وثوق سے حیات نے اظہار خیال کیا ، پھر دفعتہً واپس مڑا اور اپنا کان نوری کے سامنے کر دیا۔

" یہ کنپٹی پر نشان دیکھتی ہو ؟" نوری کو پلک جھپکنے کے باوجود کچھ نظر نہ آیا " یہاں چار ٹانکے آئے تھے " پھر اُس نے پاجامہ اُونچا کر کے گھٹنا دکھایا " اور سات ٹانکے یہاں لگے تھے "، نوری کی متحیر آنکھوں کے سامنے حیات نے اپنے سیدھے بازو سے آستین چڑھائی " اور ایک مرتبہ پیڑ سے گر کر میرا یہ ہاتھ بھی ٹوٹ چکا ہے "۔

نوری پلک جھپکائے بغیر اپنی ننھی مُنّی آنکھیں حیرت سے پھاڑے حیات کو دیکھ رہی تھی۔

اب روبی آگے آئی " اور یہ میری اُنگلی ، بجلی کے چلتے پنکھے کو روکنے سے کٹ گئی تھی ! اور مجھے تو یاد نہیں " ممی " بتاتی ہیں کہ ایک دفعہ میں کھڑکی سے کودی تو میرے ٹخنے کی ہڈی اُتر گئی ...... بہت دن پلنگ پر لیٹنا پڑا .... "

نوری نے ان دونوں کے درمیان اپنی کم مائگی کا احساس کیا اور لاجواب ہو کے اپنے ہاتھ میں پڑی ہوئی کانچ کی چوڑیوں سے کھیلنے لگی۔

" ارے تم چوڑیاں پہنتی ہو ؟ " روبی نے حیرت سے کہا " میں نے پہلے تو نہیں دیکھا تھا "

" ہاں امّی نے آج صبح پہنا دی ہیں " نوری نے کسی قدر خائف ہو کر جواب دیا۔

روبی نے حقارت سے منہ بنایا " میں کبھی چوڑی نہیں پہنتی ہوں ، میری امّی بھی نہیں پہنتی ہیں ...... تم بھی مت پہنا کرو ...... "

نوری نے فوراً اس مشورہ کو تسلیم کر لیا۔

مسز اکبر کی خواہش کے مطابق روبی اور نوری بہترین دوست ثابت ہو رہی تھیں ، کم از کم نوری نے تو اپنی طرف سے کوئی گنجائش نہیں اُٹھا رکھی تھی ، روبی کو یوں تو نوری سے کچھ دیر کو سخت نفرت ہو گئی تھی جب اس نے ماتھے پر کیت لگتے ہی دھاڑ مار کے زمین پر پچھاڑ کھائی تھی مگر دوسرے دن ہی روبی کو دیکھ کر نوری نے اپنی حد درجہ معصوم مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا تو وہ نفرت عجیب سے تکبر آمیز پیار سے بدل گئی ہر چند کہ روبی کے معیار پر نوری کسی عنوان پوری نہ اُترتی تھی مگر اس میں شک نہیں کہ اگر روبی سے کسی کی دوستی ہو سکی تو نوری سے ...... اس میں روبی کے سلوک سے کہیں زیادہ نوری کے مصمم ارادہ کو دخل تھا وہ پہلے دن ہی روبی کی نشانہ بازی دیکھ کر اس کی برتری مان چکی تھی ..... اور روبی ...... وہ اگر کسی سے متاثر ہوئی تو حیات سے ...... جس کے ہاتھ پیروں پہ چوٹوں اور زخموں کے متعدد نشان تھے اور پیڑوں پہ گلہری کی پھرتی سے چڑھتا تھا۔

روبی نے اپنی اکلوتی سہیلی کو سنوارنے کی لاکھ کوشش کی ...... اول اول اس کو باغ میں چھوٹے چھوٹے پیڑوں پہ چڑھنے کی مشق کرائی گئی ، نوری نے لاکھ کوشش کی مگر یہ فن اس کو کسی طرح نہ آتا تھا۔ ایک آدھ مرتبہ سیڑھی کی مدد سے اس کو پیڑ پہ چڑھایا بھی گیا تو اوپر پہنچتے ہی نیچے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو جاتے اور وہ رونے پہ آمادہ ہو جاتی تھی .... روبی نے " بزدل " اور " نکمّی " کہہ کر اُسے بخش دیا۔

پھر اُسے نشانہ بازی سکھائی گئی ، پھاٹک کے ستونوں سے چھپ کر راہ گیروں پہ کنکر مارنے سے شروعات ہوئی مگر یہ بات مسز اکبر تک پہنچی اور انہوں نے اس خیال کی سخت مخالفت کی ...... اس مقصد کے لئے چمن کے بیچ میں خاص طور سے ایک تختہ لگایا گیا مگر اس فٹ بھر چوڑے تختے پر کیا معنی نوری کا نشانہ اس تختے کے گزوں آس پاس نہ پڑتا تھا ، روبی نے اُسے " بے کار " اور " کوڑھ مغز " کہا نوری نے اس حقیقت

کو مان لیا مگر مشکل حل نہ ہو سکی۔

آخر کار روبی اور نوری کی منشا کہ دلچسپی بڑھ گئی کہ روبی اس کو عجیب و غریب نئی نئی باتیں سناتی اور نوری منہ پھاڑے پتلیاں پھیلائے چپ چاپ سنا کرتی، روبی نے اس کو افریقہ کے جنگلوں، ہاتھیوں اور ریچھوں کے قصے سنائے بڑے بڑے عیال والے خونخوار شیروں کی باتیں بتائیں اور پھر اس کا تعارف سینما والے ٹارزن سے کرایا، جب نوری یہ سب حالات سمجھ گئی تو روبی نے اس کو اپنی زندگی کے سب سے اہم راز سے آگاہ کر دیا۔

"نوری تم صالحہ اور حمیدہ کو جانتی ہو نا؟ ارے وہی جو اپنے اسکول کے بورڈنگ میں رہتی ہیں۔ اری پگلی میری کلاس میں نہیں، وہ تو بہت بڑی ہیں بی اے میں پڑھتی ہیں!

ہاں ہاں وہی، جنھوں نے مجھے چاکلیٹ دیئے تھے، تو سنو، وہ دونوں قسمت کا سب حال جانتی ہیں۔ ہاتھ دیکھ کر سب بتاتی ہیں کہ اب کیا ہوگا...... انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ رضیہ آپا اسکول میں دو سال سے زیادہ نہیں رہیں گی اُن کو نکال دیا جائے گا، اور یہ بھی پتہ ہے کہ عابدہ بیگم ہیڈ مسٹرس ہو جائیں گی، اری ابھی نہیں، جب بیگم خیری مر جائیں گی تب...... خیر تو حمیدہ اور صالحہ نے میرا ہاتھ بھی دیکھا تھا اور مجھے سب بتا دیا...... سب......"

"کیا؟؟ نوری فرطِ اشتیاق سے کھسک کر روبی کے اور قریب آ گئی "کیا بتایا ہے؟"

"اوہ، بہت سی باتیں ہیں...... بڑی اچھی باتیں......" روبی اٹھلائی تو نوری کا اصرار اور بھی بڑھ گیا۔

"اچھا اچھا...... بتاتی ہوں...... مگر دیکھ کسی سے کہنا نہیں...... صالحہ اور حمیدہ نے منع کر دیا ہے...... سن وہ کہہ رہی تھیں کہ میں فرشتوں کی غلطی سے یہاں آ گئی ورنہ میری قسمت میں تو جنگل کی شہزادی ہونا لکھا ہے...... دیکھ یہ اس ہاتھ کی لکیریں...... ہاں مگر تو کیا سمجھے گی!"

"شہزادی!؟" نوری کا منہ گول دائرہ کی شکل میں کھل گیا۔

"ہاں ہاں شہزادی...... وہ کہانی والی شہزادی نہیں جو دن بھر گوٹے کے کپڑے پہن کر پان کھایا کرتی تھی...... جنگل کی شہزادی...... ممی تو مجھے پریوں کی شہزادی کہتی ہیں۔ مگر یہ بات غلط ہے، بھلا کہیں میرے پر ہیں؟ میں تو جنگل کی شہزادی بنوں گی...... جیسی میں نے سینما میں دیکھی تھی...... ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پہ یوں چلی جاتی تھی......"

"پھر......؟ پھر کیا ہوگا؟" نوری کا سانس رکا جا رہا تھا۔

"پھر میں جنگل میں چلی جاؤں گی...... بہت دور...... پہاڑوں کے پرلی طرف......"

"ارے نہیں" نوری نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا "جنگل میں کیوں چلی جاؤ گی؟"

"واہ پگلی...... اور کیا جنگل کی شہزادی یہاں رہے گی، ان کمروں میں؟ ایسے کپڑے پہن کر؟ میں وہاں چلی جاؤں گی جہاں بڑے بڑے ہاتھی رہتے ہیں...... اور شیر اور ریچھ"

"ہائے" نوری اس سے لپٹ گئی "وہ تجھے کھا جائیں گے!!"

روبی نے سر پیٹ لیا" اری تو بالکل دیوانی ہے...... بھلا وہ اپنی شہزادی کو کھا سکتے ہیں؟ کاش تو نے وہ فلم دیکھی ہوتی......

وہ سب تو مجھ سے ڈر بیں گے ...... اور میں ڈیڈی کی بندوق بھی تو لے جاؤں گی ..... اگر کسی نے گڑبڑ کی تو بس .....“

” اور تجھے اکیلے ڈر نہیں لگے گا؟“

” ڈر! ؟ لاحول ولا قوۃ ...... میں شہزادی ہو کر ڈر جاؤں گی اور میں اکیلی نہیں ہونگی وہ شہزادہ بھی تو ہوگا ..... جنگل کا شہزادہ .....“

” شہزادہ!؟“

” اور نہیں تو کیا ...... تم نے کوئی ایسی کہانی سنی ہے جس میں شہزادی تو ہو مگر شہزادہ نہ ہو۔ حمیدہ اور صالحہ کہہ رہی تھیں کہ پڑھنا لکھنا میرے لئے بالکل بیکار ہے۔ مجھے تو بس نشانہ لگانا اور پیڑ پر چڑھنا سیکھنا چاہیئے ...... اور ایک دن زمیں اونچے اونچے پیڑوں اور ہوسٹل کی چھتوں پر کودتا پھلانگتا ہوا جنگل کا شہزادہ مجھے بلانے کو آجائیگا ...... میں تو اپنے ساتھ تجھے بھی لے جاتی مگر تجھے تو کچھ کام نہیں آتا..... بس بالکل بیکار ہے ..... خیر میں کبھی کبھی ممی سے اور تجھ سے ملنے ضرور آیا کروں گی ..... ہائے تو ایسا منہ کیوں بناتی ہے؟“

نوری نے روبی کی ہدایت کے مطابق اس کا راز اپنے دل میں چھپا کر تو رکھ لیا مگر ہول کے مارے اس کا خون خشک ہونے لگا۔ اگر روبی کو کبھی اسکول آنے میں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو نوری بوکھلائی پھرتی ...... ایسا نہ ہو جو کہیں جنگل کا شہزادہ اُسے لے گیا ہو“

جنگل کا شہزادہ نہ جانے کب اپنا تیر کمان سنبھالے، فرشتوں کی غلطی سے کھوئی ہوئی شہزادی کو کھوجنے آئیگا ..... دن گزرتے گئے ..... چار سال بیت گئے ..... بیگم خیری زندہ تھیں اور ہیڈ مسٹرس کے فرائض بخوبی ادا کر رہی تھیں ..... رضیہ آپا بدستور اسکول میں حساب پڑھاتی تھیں اور پانچویں کلاس میں آجانے کے باوجود روبی کا اُن کی نوکیلی اُنگلیوں سے چھٹکارا نہ ہو سکا تھا ..... ایک بات البتہ ایسی ضرور تھی کہ جس نے روبی اور اسکول کا رہا سہا واسطہ بھی ختم کر دیا ..... حمیدہ اور صالحہ کالج سے جا چکی تھیں ..... اُنہوں نے رخصت ہوتے وقت پھر ایک بار اس کا ہاتھ دیکھ کر اپنی پیشین گوئی کا یقین دلایا تھا اور مایوس نہ ہونے کی ہدایت کی تھی ..... مگر اب گیٹ پر چڑھ کر راستہ تکنا کس قدر مشکل اور بے کیف تھا ......

اپنی بچی کی بے کیفی کا احساس سب سے پہلے مسز اکبر کو ہوا ..... اسکول سے شکایت کی اطلاع آنا ایک مستقل سلسلہ تھا جسے مسز اکبر صبر سے سن لیتی تھیں مگر روبی کی پڑھائی سے بے فکری اُن کو پریشان کرتی تھی ..... اکبر صاحب کی خواہش تھی کہ ..... اُنہوں نے بڑی سنجیدگی سے بیٹی کو مرحوم باپ کی خواہش سے آگاہ کیا .....

” ممی میں یہاں نہیں پڑھ سکتی ...... سب اُستانیاں میری دشمن ہیں مجھے خواہ مخواہ بُرا بھلا کہتی ہیں، نوری کے سوا سب لڑکیاں مجھے گلہری کہتی ہیں ......“

” اچھا تو پھر کہاں پڑھوگی؟ کسی اور اسکول میں بھجوا دوں؟“

” کسی اور اسکول میں؟“ روبی چکرائی۔

” ہاں کہیں پہاڑ پر؟ نینی تال یا مسوری؟ ......“

” نینی تال ..... وہی نینی تال ممی جہاں ایک دفعہ گرمیوں میں حیات بھی گیا تھا ..... اور بتا رہا تھا کہ اونچے اونچے پہاڑ اور لمبے لمبے سرو کے درخت ہوتے ہیں ......“

” ہاں وہی نینی تال ......“

"بھجوا دیجئے ...... اچھی ممی ضرور بھجوا دیجئے ...... بس میں وہیں جانا چاہتی ہوں۔"
روبی سے جدائی کا خیال مسز اکبر کے لئے موت سے بڑھ کر جانکاہ تھا مگر اپنی زندگی مسرت اور ہنسی سب انہوں نے روبی کی خوشی پر سرو
تھیں ...... پھر ایک بار انہیں زندگی اور تنہا زندگی کا بوجھ سہارنا پڑا ......

روبی کا داخلہ "سینٹ میری کونونٹ" میں ہوگیا، وہ یہاں سے پانچویں کر کے گئی تھی اور وہاں تیسری میں لی گئی، مسز اکبر اس سے
بہت گھبرائی مگر وہ تو اب کسی طرح بھی علی گڑھ رہنے پر رضامند نہ تھی ...... اونچے اونچے پہاڑ اور تناور سرو کے درخت اسے زندگی کا
نیا موڑ دکھا رہے تھے اور وہ چلی گئی ......

اسکول کی جن استانیوں کا اس نے ناطقہ بند کر رکھا تھا انہوں نے روبی کے جانے پر شکر ادا کیا، جو لڑکیاں اس سے پٹ پٹ کر عا
ہوگئی تھیں انہوں نے خوشیاں منائیں اور اسکول کے سقے مہتر اور مالی نے استعفیٰ دینے کا خیال ترک کر دیا ...... جہاں یہ سب تھ
وہیں مسز اکبر کا کھانا پینا بھی چھوٹ گیا ...... راتوں کو روبی کے پلنگ کا طواف کرنے لگیں اور دن بھر ان کی ویران آنکھوں میں آنس
امڈے رہتے، اور روبی کی اکلوتی سہیلی جسے روبی نے ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا اور کبھی بیکار کے سوا کسی مصرف کی چیز نہ سمجھا
لگتا تھا کہ روبی کی جدائی ہی جان دے دیگی، روبی کی بے حد خواہش تھی کہ نوری بھی اس کے ساتھ نینی تال چلی جائے مگر نوری کے گھر والوں
کسی طرح نہ مانا، وہ اسکول میں اچھی طرح پڑھ رہی تھی، ساری لڑکیاں اس کی صلح جوئی سے خوش تھیں اور سب استانیاں اسکی سعادت مندی
کی مثال دیتی تھیں ...... پھر کیا کسی کا سر پھرا تھا کہ اسے کالے کوسوں بھیجا ہے۔

"میں تم سے اور ممی سے ملنے آیا کرونگی نا" روبی نے پھر اسے یقین دلایا۔ سوگواروں میں "حیات" بھی شامل تھا، اس لئے نہیں کہ رو
اس کی چچا زاد بہن تھی۔ ایسی تو چچا تایا کی ان گنت لڑکیاں خاندان میں بھری پڑی تھیں اور وہ لڑکیوں سے خاصا بیزار رہتا تھا مگر روبی سے
اسے ایک خاص لگاؤ تھا ...... اس نے نوری کی موجودگی میں ہزار بار روبی سے کہا تھا "میں جانتا ہوں تم اور لڑکیوں جیسی مرکھچڑی اور ڈرپو
نہیں ہو" اور اسی لئے چھٹی کے دنوں میں وہ اپنی ہوائی بندوق، نئی سائیکل، مختلف سائز کی گیندیں اور تاش کے پتے لے کر روبی کے گھ
آجاتا تھا۔ باغ میں گھنٹوں وہ نوری اور روبی کو نت نئے کرتب دکھاتا اور روبی یقیناً اس کی ہونہار شاگرد ہی نہیں بلکہ کبھی کبھار
استاد بھی ثابت ہوتی تھی ...... نوری کو البتہ دونوں نے "بدھو" قرار دیا تھا مگر اس نے کبھی اس بات کا برا نہیں مانا ...... یہی کیا کم ہے
روبی اور حیات اسے اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔

روبی چلی گئی اور اس نے پہلا خط نوری کو یہ لکھا "نینی تال بڑی پیاری جگہ ہے، بالکل ایسی جیسے کہ ٹارزن کی فلموں میں نظر آتی ہے
...... مگر میں یہاں بھی پابند ہوں، یہاں کی سب استانیاں "سسٹر" کہلاتی ہیں، یہ سب نن ہیں (نن کیا چیز ہوتی ہے یہ نہ تمہیں معلوم
ہوگا نہ ابھی مجھے پتہ چلا ہے) اور ایسے عجیب لباس پہنتی ہیں جن کا حلیہ اس کفن کی تفصیل سے ملتا ہے جو ہم نے دینیات کی کتاب میں پڑھا
تھی ...... ان استانیوں کو دیکھ کر مجھے فوراً ہی اس دن کا خیال آیا جب تمہاری مزاج پرسی کو میں پہلے دن تمہارے گھر گئی تھی اور ان
سفید پٹیوں میں تم بالکل ایسی لگتی تھیں جیسی یہ "نن" لگتی ہیں۔
دوسرے خط میں قابلِ ذکر بات یہ تھی "یہاں ایسے عجیب لمبے اور چکنے درخت ہوتے ہیں کہ ٹارزن صاحب بھی آئیں تو پچاس
لگیں ...... میری ساری مشق یہاں بیکار ثابت ہوئی۔ ان پیڑوں پر چڑھنے کے لئے سب از سرِ نو سیکھنا ہے ...... خوبانی او

ناشپاتی کے پیڑ البتہ اچھے خاصے ہیں اور کیت کے درخت تو بالکل نہیں ہوتے ...... پیڑ پر چڑھنا یہاں بھی منع ہے مگر جو اُصولوں کو مان لے وہ نوری ہو سکتی ہے ...... روبی نہیں ......!"

نوری کے لئے اب یہ خطوط ہی مایہ تسکین تھے ...... جب کبھی خط آنے میں دیر ہو جاتی تو نوری کو طرح طرح کے ہول اُٹھتے ...... کہیں ایسا نہ ہوا ہو کہ وہ جنگل کا شہزادہ اُسے کسی چکنے اور لمبے سرو کی نوک سے اُٹھا لے گیا ہو! ...... پھر خط آ جاتا کہ یہاں کی پابندی نے تو اپنے چار دیواری والے قید خانہ جیسے اسکول کو بھی مات کر دیا، جنگل کا شہزادہ تو پھر بھی آدمی ہو گا یہاں تو پریوں کے شہزادے کا بھی گزر نہیں۔

نو مہینے کے بعد روبی جاڑوں کی چھٹیوں میں گھر آئی تو نوری نے محسوس کیا کہ اس کی رہی سہی آدمیت بھی ختم ہو چکی تھی۔ اسکرٹ اور بلاؤز پہنے وہ جنگلی بلّی کی طرح دن بھر ادھر اُدھر قلانچیں لگایا کرتی، امریکن لہجے میں انگریزی بولتی اور نوری کو اب "کوڑھ مغز"، اور "کاہل" کے بجائے "ڈل" اور "ایڈیٹ" کہا کرتی ......

پھر یہ آنے جانے کا چکّر چلتا رہا ...... روبی ہر نو ماہ کے بعد نیا روپ دھارتی رہی اور بقول نوری بد سے بدتر ہوتی گئی جوں جوں وہ بڑی ہو رہی تھی اس کی نسائیت اور ختم ہوتی جا رہی تھی، اسکرٹ میں سے نکلی ہوئی ٹانگیں، گردن تک کٹے ہوئے بال دیکھ کر بیگم اکبر کو خفقان ہونے لگتا اور نوری بڑے ترس سے کہتی "اری کمبخت تجھے خبر بھی ہے تو نے اپنے حُسن کی کیا گت بنائی ہے ...... اگر تو ایک دن بھی سلیقے سے پہن اوڑھ کر آئینہ میں اپنا منہ دیکھے تو ......"

"تو میں سمجھوں کہ میں روبی کے بجائے نوری ہوں اور پھر میں فوراً خودکشی کر لوں ......!"

اب بھی روبی گھر آتی تو حیات اُن کے یہاں آ جاتا تھا ...... ہر نیا سال اُن سب کے لئے تبدیلیاں لاتا، حیات کتنا سنجیدہ ہو گیا تھا اور ہوائی بندوق کے بجائے اس کے پاس بارہ بور کی دونالی تھی، اکثر اس کا روبی سے نشانہ کا مقابلہ ہوتا اور ہر مرتبہ روبی کو ہار کے اسکول رہ کر "آؤٹ آف پریکٹس" ہونے کا غم کرنا پڑتا، نوری یوں تو روبی کے خیال میں ہمیشہ کی طرح "ایڈیٹ" تھی مگر اب اسکول کی دستکاری کی نمائش میں وہ پہلا انعام حاصل کر چکی تھی اور ہر سال اطمینان سے اپنی کلاس میں اوّل آتی تھی ...... روبی بھی بہت کچھ بدل گئی تھی ...... ایک مرتبہ اس نے اپنے طویل خط میں نوری کو لکھا۔

"لو اور مزے کی بات سنو، کل علی گڑھ ہوتا ہوا صالحہ کا خط یہاں پہنچا (بھئی وہی صالحہ جس نے میرے ہاتھ کی لکیریں دیکھی تھیں) جانتی ہو یہ خط کہاں سے آیا ہے؟ ٹرکی سے! صالحہ کی انہی اچھن صاحب سے شادی ہو گئی جن کے ہول دل کا علاج صالحہ پڑیوں میں باندھ کر میرے ہاتھ بھیجا کرتی تھی۔ اب وہ ستاروں کی گردش کا حال جاننے والی صالحہ اچھن صاحب کی قمیضوں میں بٹن ٹانکتی اور اپنے تین چار بچوں کو پیٹتی رہتی ہو گی! مجھ سے پوچھتی ہے "مجھے یقین ہے کہ اب تک میری پیشین گوئیاں پوری ہونے لگی ہوں گی، کیا پتہ یہ خط تم کو ملے یا نہیں ...... غالباً اب تک تم اپنے ٹارزن کے ساتھ گھنے جنگلوں اور خونخوار درندوں پر راج کرنے جا چکی ہو گی۔"

"نوری صالحہ کا خط پڑھ کر میں کل سے کھوسی رہی ہوں ...... اب اپنے بچپن کی باتوں کا خیال آتا ہے، یہ تو میں جانتی ہوں کہ صالحہ اور حمیدہ مجھ سے اپنا اُلّو سیدھا کرتی تھیں مگر شاید اُن کو خود بھی پتہ نہ ہو کہ میرے مستقبل پر ان باتوں سے کیا اثر پڑے گا۔ صالحہ کی پیشین گوئیوں کا حال تم جانتی ہو عابدہ بیگم مر گئیں اور بیگم خیری اسی طرح ہیڈ مسٹرس کا عہدہ سنبھالے بیٹھی ہیں۔ مجھے اسکول چھوڑنا پڑا مگر رضیہ آپا اسی طرح لڑکیوں کی جان پہ عذاب بن کے مسلّط ہیں ...... رہا میرا ٹارزن، تو اب میں نہیں جانتی مجھے کب تک اس کا انتظار کرنا ہے، جنگل کی شاہزادی کو ابھی تک قواعد اور اُصولوں کی بیڑیوں نے جکڑ رکھا ہے مگر یہ زندگی میری نہیں، یہ منزل میری نہیں ...... جوں جوں دن گزرتے ہیں مجھے اس ماحول سے بیگانگی کا احساس

بڑھتا جاتا ہے...... مجھے ایسا لگتا ہے کہ اگر جنگل کا شہزادہ مجھے لینے نہ آیا تو کہیں میں اکیلی ہی اپنی راہ نہ چل پڑوں......"

اس خط کو پڑھ کر نوری بھی کھو گئی...... ہائے یہ لڑکی پاگل ہوتی جا رہی ہے، اللہ مسز اکبر پہ رحم کر...... بھلا کہیں جنگل میں کوئی شہزادہ یا شہزادی ہوتے ہوں گے......

کونونٹ میں روبی کا آخری سال تھا تو مسز اکبر اپنے معمول کے مطابق گرمیاں گذارنے نینی تال جانے لگیں۔ روبی نے انہیں بڑے اصرار سے لکھا تھا کہ نوری کو ضرور ساتھ لے آئیں، نوری کا دل تڑپ کر رہ گیا، یہ کمبخت امتحان بھی عجیب بلا ہے ایف اے کا آخری سال تھا اور امتحان سر پہ آ چکے تھے، بیچاری صبر کر کے رہ گئی، حیات ایل ایل بی کا امتحان دے کر یونہی موٹر سائیکل پہ من من بھر کی کتابیں لادے کورٹ کے چکر لگایا کرتا تھا مسز اکبر اُسے اپنے ساتھ پکڑ کر لے گئیں......

رات گئے جب نوری اپنی خشک اور پیچیدہ کتابوں سے اُکتا جاتی تو کرسی پر نیم دراز ہو کے وہ تکیہ کے نیچے سے روبی کا تازہ خط نکال لیتی اور کچھ دیر کو اُسے اپنے یکساں ماحول سے فرار مل جاتا، روبی نے لکھا۔

اس سے زیادہ تکلیف وہ کیا بات ہو گی کہ تم میرے پاس نہیں آ سکیں، یہاں دس سال رہ کر بھی میں اپنے گرد و پیش کے انسانوں سے اس قدر انجان رہی ہوں کہ اس وقت مجھے تمہاری حد سے زیادہ ضرورت تھی...... تم، جو مجھے نہیں سمجھ سکیں مگر میرے اُن جذبات سے آگاہ ہو جنہیں تم نے "دیوانگی" کا نام دے رکھا ہے...... میری یہ دیوانگی اب آخری بیرے چھو رہی ہے...... کسی ایسے انسان سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے جو میری ایک نہ سمجھے اور بیوقوفوں کی طرح منہ کھولے سُنتا جائے...... نوری وہ تمہارے سوا کون ہو سکتا ہے۔

"ممی" نے کمال کیا جو حیات کو گھسیٹ لائیں، مجھے حیات ہمیشہ سے اچھا لگتا ہے اور اب وہ دیکھنے میں بھی کس قدر شاندار انسان ہو گیا ہے، اُس کی جسامت دیکھ کر تو اُس کہانیوں والے دیو کا خیال آتا ہے جو کسی پری کو اپنی مٹھی میں دبا کر لے بھاگا تھا...... بچپن ہی سے میں یہ سمجھتی تھی کہ حیات عام انسانوں سے مختلف ثابت ہو گا مگر میرے یہ خیالات سچے نہ تھے، ذہنیت اس کی بھی وہی ہے جو تمہاری، اور اُن بہت سے انسانوں کی جو اس دنیا میں رہتے بستے ہیں...... تمہیں میں نے اپنی راہ لانا چاہا مگر تمہاری دلچسپی اپنے سُوئی دھاگے اور ہنڈیا ڈوئی سے اُلجھ کر رہ گئی...... حیات سے کچھ توقعات تھیں تو وہ بھی ایل ایل۔بی کر کے اب وکالت کرنے کی باتیں سوچتا ہے...... نہیں تم میں سے کوئی بھی میرا ہمسفر نہیں ہو سکتا...... مجھے شاید اپنی راہ اکیلے ہی جانا ہو گا......"

کچھ دن بعد روبی نے لکھا:۔

"نوری بار بار سوچتی ہوں کہ کاش تم یہاں ہوتیں تو ہم اُن دنوں کی یادگار مناتے جو ہم تینوں نے ساتھ مل کر بتائے تھے...... یہ پہلا موقعہ ہے کہ میں کچھ دن کے لئے اپنی زندگی سے اس قدر بیزار نہیں جیسی گذشتہ نو دس سال سے ہو گئی تھی...... مجھے یقین ہے کہ اگر میں یہاں نہ آ جاتی تو حیات اس طرح "غلط ملط" سا انسان نہ بنتا! یہ غلط ملط کا لفظ میں نے بہت سوچ کر استعمال کیا ہے، ہر لمحہ وہ ذہن و دماغ کی عجیب کشمکش میں مبتلا رہتا ہے، غالباً یہ "ہم" ایک دوسرے کی برعکس لڑکیوں کے ساتھ رہنے کا نتیجہ ہے کہ وہ نہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا!

پرسوں اور کل، سنیچر اتوار کا دن میں نے ممی اور حیات کے ساتھ گذارا، ممی نے بڑی محنت سے مجھے ایک ساڑھی پہنائی پھر (اُن کے خیال میں جب میں بن سنور کے) زینہ سے اُترنے لگی تو خیرت ہوئی کہ حیات میرے ساتھ تھا اور اُس کے فولادی بازوؤں میں اتنی طاقت ہے کہ اُس نے مجھے ناگاہ موت سے بچا لیا اور میں ابھی تک صحیح سالم ہوں ورنہ یقینی میں آخری سیڑھی تک پہنچتے پہنچتے کھیل کی طرح بکھر گئی ہوتی۔

حیاتؔ اور میں گھنٹوں تال میں کشتی کھیلتے رہے، اس سے قبل کئی مرتبہ مجھے اسکول والوں کے ساتھ کشتی کی سیر کو جانا پڑا مگر اللہ توبہ کیا "بوریت" ہوتی ہے، سسٹرز کے کفن نما سرسراتے ہوئے لباس اور لڑکیوں کی مسلسل بے معنی باتیں، "کیڈٹس" اور "لپ سٹک" کے شیڈ، بلاؤز اور فراک کے ڈیزائن، پھر اُن کے وہ لچر عشق جن میں ایک خودکشی پہ آمادہ ہوتی ہے تو دوسری رات بھر رویا کرتی ہے میرا دل چاہتا کہ "نہ کہیں جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا" کے مصداق پانی میں چھلانگ لگا دوں۔ حیاتؔ کے ساتھ یہی کشتی رانی بڑی کیف آور بن گئی، ڈوبتے سورج کی شعاعوں نے تال کے نیلے پانی میں سنہرا روپہلا تانا بانا بُن رکھا تھا، پہاڑوں کی چوٹیاں مندر کے طلائی کلسوں کی طرح جگمگا رہی تھیں اور نینی تال کے مئی کی عطر بیز ہوا لہروں کے ساتھ دھیمی دھیمی بہہ رہی تھی (آہ نوری علی گڑھ میں رہ کر تم مئی کے مہینہ میں یا تو پسینہ کی بات سمجھو گی یا خس کی ٹٹیوں کی!) مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں اتنے برسوں سے نینی تال میں نہیں تھی اور حیاتؔ ایسی اچھی باتیں سُنا رہا تھا، کشمیر کی باتیں، جہاں وہ گذشتہ کئی سال سے گرمیاں گزارنے جایا کرتا ہے اُسے کشمیر کی سرزمین سے عشق ہے، زعفران زاروں سے اور سرسبز وادیوں سے ......

پھر جانتی ہو نوری آخر میں کیا ہوا؟ سنو! حیاتؔ کا وہ ہمزاد جاگ اُٹھا جسے تمہاری اور تم جیسے اور سب انسانوں کی قربت نے جنم دیا ہے ...... اس نے کشمیر جا کر وکالت کرنے کا "زرّیں" خیال ظاہر کیا، مسلوں اور فائلوں کی باتیں کرنے لگا میری کوفت کا عالم نہ پوچھو...... گھر آتے آتے میری اُس سے لڑائی ہو گئی اور میں نے اس سے کہدیا کہ تم قطعی نامعقول ہو"

کچھ دن بعد نوری کو اپنی بعید از فہم سہیلی کا یہ خط ملا :-

"مجھے لگتا ہے کہ آخر مجھے اپنی راہ مل گئی ہے اور ایک دن منزل بھی مل جائے گی، یہی کیا کم ہے کہ اب میں اُن بھول بھلیوں میں نہیں بھٹک رہی جن میں اب تک میری زندگی کا بیشتر حصّہ گزرا تھا...... اتنے برس کے بعد بھی نینی تال میرے لئے ایک نئی اور پُر کشش جگہ بن گیا ہے، جو چیزیں پہلے مُردہ اور بے جان لگتی تھیں اب اُن میں ایک اچھوتا حُسن نظر آتا ہے۔ پچھلے دنوں اسکول میں چھٹیاں تھیں اور میں کئی دن تک ممی کے ساتھ رہی، ممی تو جانتی ہو کہیں آتی جاتی نہیں، میں اور حیاتؔ صبح سے شام تک نینی تال کی دلکش راہوں پر چلتے رہے...... ایک دن ہم دونوں "چینا پیک" گئے، راستہ کے اُتار چڑھاؤ کس قدر سحر آمیز ہیں ہم کچھ دیر تک اُن قدم قدم پہ آنے والے موڑوں پہ ایک دوسرے کو کھوتے اور پاتے رہے اور پھر سڑک چھوڑ کر خار دار جھاڑیوں اور نوکیلی چٹانوں والے پہاڑ پر چڑھنے لگے، اُوہ کس قدر لُطف آیا ہے، میں نے حیاتؔ کو سچ مچ دِکھلا دیا وہ ہر بار مجھ سے پیچھے رہ جاتا تھا، غریب کا سانس پھُول گیا، پسینہ بہنے لگا اور قدم قدم پہ بیٹھنا شروع کر دیا، تمہیں یاد ہوگا بچپن میں وہ کس قدر تیز طرار تھا، اس وکالت کی بیٹھکوں نے اُسے تمہارے جیسا کاہل وجود کر دیا ہے جب ہم چوٹی پر پہنچے تو حیاتؔ کا پسینہ سے تر بتر سُرخ چہرہ دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی لگتا تھا مونٹ ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھا ہے، لیٹ کر ہانپنے لگا، چینا پیک سے گرد و پیش کا منظر اتنا حسین اور پُر کیف تھا کہ میں کچھ دیر کو بالکل کھو گئی، لگتا تھا بچپن کے اُن خوابوں کی تعبیر سامنے آگئی ہے جنہیں میں نے اپنے علی گڑھ والے اسکول میں کیبٹ کے درخت پہ بیٹھ کے دیکھنا شروع کیا تھا...... سامنے حدِّ نظر تک وہی دُنیا پھیلی ہوئی تھی جس کی کھوج میں پندرہ سولہ سال گزار کے میں اس اُونچائی تک پہنچی ہوں...... وہ میرے تصوّرات کے گھنے جنگل، غار اور چٹانیں ...... مجھے یقین ہے وہاں بدمست ہاتھی، جنگلی ریچھ اور خونخوار بھیڑیے بھی ضرور ہوں گے اور اُن کا شہزادہ ......

خیر مجھے تو تمہیں یہ بتانا ہے کہ حیاتؔ پر اس ماحول کا ردِّعمل کیونکر ہُوا، جب کچھ تھکن دُور ہوئی تو اوّل اس نے کچھ دیر تک اپنے کشمیر کی باتیں کیں، ...... وہی نقرئی جھیل، مخملیں سبزہ، گنگناتے آبشار اور کیسر کے کھیت ...... اس نے مجھے دعوت دی کہ آئندہ سال رجب میں

اسکول کے زنداں سے آزاد ہوں گی) تو اس کے ساتھ کشمیر چلیں ...... پھر یکلخت اس پر دورہ پڑا اسگرٹ پی پی کر اس نے واہی تباہی شروع کی "ہاؤس بوٹ میں رہیں گے، جب میں کام پر چلا جاؤں تو تم میرے لئے ڈک چیر پہ بیٹھ کر اونی موزے اور پل اوور بننا اور جب میں دن بھر کے کام سے تھک کر لوٹوں تو مجھے کشمیری چائے بنا کر دینا" ...... وغیرہ وغیرہ ...... میں نے کہا "جناب مرزا حیات احمد بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی" نہ مجھے کشمیری چائے بنانا آتی ہے اور نہ حسن تک سویٹر موزے بننا آئیں گے اس کام کے لئے تو ہم نوری کو ساتھ لے چلیں گے ..... کہاں ہیں کہاں یہ بوربت! حیات نے مجھے "جنگلی" کے خطاب سے نوازا ...... میں اسکی شکر گذار ہوں ......"

دوسرے ہفتہ روبی نے لکھا:-

"تم امتحان سے فارغ ہو گئیں، چلو اچھا ہوا مگر سب کے لئے کیا جب تم ابھی تک یہاں آنے سے مجبور ہو، تم کہتی ہو کہ تمہارے گھر والے تمہاری بابت بڑی سنجیدہ باتیں سوچنے لگے ہیں، وہ اب اس پہ آمادہ نہیں کہ تمہیں بی۔اے کرنے کو دو سال کی مہلت دیں اور تم پریشان ہو.... تمہیں رات کو نیند نہیں آتی، دن بھر تمہارا جی ڈوبا رہتا ہے ..... مجھ سے مل کر کچھ دل کی باتیں کہنا چاہتی ہو ..... ایسی باتیں جو تم کسی اور سے نہیں کہہ سکتیں ......"

نوری تم سنکر خفا ہو جاؤ گی مگر حقیقت یہ کہ تمہارا غم پڑھ کر مجھے ہنسی آگئی اور مجھے تم سے مطلق ہمدردی نہیں ہے۔ بھلا بتاؤ اب بی۔اے کر کے کیا کرو گی؟ اپنی زندگی کا لائحہ عمل تم نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ جب تمہیں اپنے نزدیک زندگی اور متعلقاتِ زندگی کو سمجھنے کا شعور آیا تھا ...... تمہارے پروگرام میں بی اے اور ایم۔اے کی یکساں وقعت ہے (بشرطیکہ تم رضیہ آپا یا فیروزہ باجی جیسی قابلِ رشک زندگی گذارنے پر آمادہ نہ ہو) مگر تمہاری فطرت ایسی نہیں کہ تم سخت گیر اُستانی بن کر ہی رہ سکو، تم تو ایک فرمانبردار بیوی، کفایت شعار گھر والی اور رحمان شار امی بننے کے خواب دیکھ رہی ہو گی ...... پھر کیا بی اے اور کیا ایم اے؟ مجھے یقین ہے تم اپنا عہدہ ضرور بڑی خوشی سے سنبھالو گی لہذا بسم اللہ کر کے سبلنہ سپر ہو جاؤ ابھی سے کیوں راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کرتی ہو، جب تم اپنے آدھی درجن بچوں کو بھگتو گی اور اپنے خداوند مجازی کے نخرے اُٹھاؤ گی تو یہ چیزیں خود ہی تمہارے پاس نہ پھٹکیں گی ...... خوب راتوں کو جی بھر کے سو لو اور دن بھر قہقہے لگاؤ کہ یہ دن پھر نصیب نہیں ہوتے ...... اور ہاں تم نے جو لکھا ہے کہ تم مجھ سے کچھ دل کی باتیں کہنا چاہتی ہو تو وہ بات تمہارے عشق کی داستان نہیں ہو سکتی، بھلا ایسی جرأتِ رندانہ تم میں کہاں سے آئی ...... تم شاید یہی کہو گی کہ جہیز کے جوڑوں پہ کامدانی سے کارچوبی بہتر رہیگا ...... بنارسی ساڑھیوں سے زری بن جاد جٹ کی ساڑھیاں دیرپا ہوتی ہیں اور کانوں میں کرن پھول، جھمکوں سے زیادہ خوشنما ہوتے ہیں (اگر یہ دونوں چیزیں ایک ہی نہیں ہوتیں تو ......)

اچھی نوری بھلا یہ سب خرافات مجھ سے کہنے کی کیا ضرورت ہے، میرا تو خیال ہے کہ میرے گھر آنے تک تم سب تیاریاں کر دو تاکہ میں گھر آ کے تمہارے اس شاندار انجام پہ خوب تالیاں بجا سکوں، بتاؤ تمہاری شادی کے لئے کیا تحفہ لاؤں؟

اب تم میری سنو، کل حیات اور میں "لینڈز اینڈ" گئے، یہ بڑی عجیب اور خواب آگیں جگہ ہے پہلو بہ پہلو اور یکے بعد دیگرے چلنے والے پہاڑوں کا سلسلہ جو چند قدم پہلے لامتناہی لگتا ہے ایک مخصوص مقام پر آ کے یوں دفعتہً ختم ہو جاتا ہے جیسے ...... جیسے اب مجھے کوئی ڈھنگ کی مثال نہیں سوجھتی، بس یوں سمجھ لو کہ جیسے کوئی عجیب سا خواب دیکھتے دیکھتے ایک ساتھ آنکھ کھل جائے!)

نیچے ہزاروں فٹ نیچے ایک وسیع اور سر سبز میدان ہے اور اس سے پرے گھنے درختوں کے جنگل ...... سر سبز و شاداب، زندگی

اور حسن سے بھرپور ...... میں سوچ رہی تھی کہ وہاں زندگی کیسی ہوگی رنگین اور دلفریب ...... ان فلک بوس پہاڑوں سے پرے دنیا میں کیا کیا ہوگا میرے اچھوتے خوابوں کی طرح سحر آمیز پرکشش اور جاوداں ...... میں ان پہاڑوں کے پرلی طرف جانا چاہتی ہوں - میں "لینڈ اینڈ" سے نظر آنے والے اس طویل و عریض سرسبز میدان سے گزر کر ان گھنے جنگلوں میں جانا چاہتی ہوں جہاں فطرت کی ہر معصوم ادا سے مجھے پیار ہوگا ...... اور جہاں کا ہر ذرہ میرے جذبات کو سمجھے گا میں اس فضا، اس ماحول میں سچ مچ مدغم ہو جاؤں گی ......

میں نے حیات سے کہا کہ میرے ساتھ اس ڈھلوان سے اتر کر نیچے میدان میں چلو ..... میرے اس خیال کو اس نے "مجذوب کی بڑ" قرار دیا، غور کرو اس قابل انسان نے میری حسرت کے لئے کیسا دلچسپ نام تجویز کیا ہے ...... میں نے اس سے کہہ دیا کہ اگر تم میرا ساتھ نہیں دے سکتے تو تمہاری مرضی، تنہا سفر کٹھن سہی مگر ناممکن نہیں ہوتا ...... میں چکنے اور نوکیلے پتھروں پہ قدم رکھتی اس ہزاروں فٹ نیچے والے میدان کی سمت اترنے لگی تو حیات نے اودھم مچا دیا، اول وہ مجھے منع کرتا رہا، پھر اس نے قسمیں اور واسطے شروع کئے، آخر کار وہ میرے پیچھے دوڑا ..... کس قیامت سے اس نے یہ چند گز کا فاصلہ طے کیا ہے! اس کے بعد وہ مجھے باقاعدہ گھسیٹ کر لوٹا لایا، اس کا چہرہ سفید تھا اور ہاتھ پیر سرد ہو رہے تھے بزدل کہیں کا!

حیات کہتا ہے کشمیر میں اس سے کہیں بڑھ کر دلکش اور جانفزا مناظر ہیں، میں نے اس سے وعدہ کر لیا ہے کہ اس کے ساتھ کشمیر جاؤں گی مگر شرط وہی ہے، اس کی طے کردہ (بقول اس کے "مہذب") دنیا میں ایک لمحے بھی زندہ نہیں رہ سکتی ...... جس تمنا کو اتنے سال اپنے خون سے پروان چڑھایا ہو اسکی تجاں مرگی مجھ سے برداشت نہ ہوگی"

کچھ ہی دن بعد روبی نے اپنے تازہ خط میں نوری کو لکھا :-

پرسوں عجب قصہ ہوا، میں ہر بات کو زندگی میں اہمیت دینے کی قائل نہیں، مگر یہ معمولی سی بات خاصی اہم بن گئی حیات مجھ سے سخت نالاں ہے ......

بات یہ ہوئی کہ میری کچھ ڈرائنگ تھیں جو میں حیات کو دکھانا چاہتی تھی میں نے اس سے کہا کہ تمہیں فرصت ملے تو جمعہ کی شام کو اسکول آجانا میں تمہیں ٹینس گراونڈ کے پاس جو پہاڑی ہے وہاں ملوں گی، ہیڈ مسٹرس کو معلوم ہے کہ حیات میرا رشتہ دار ہے اور مجھے اجازت تھی کہ چھٹی کے اوقات میں اس سے مل لوں، وہ پہلے بھی کئی بار اسکول آیا تھا اور گھنٹوں ہم نے اس پہاڑی پہ بیٹھ کے باتیں کی تھیں، اتفاق کہو یا حماقت کہ اس دن شام کو میں یہ بات بالکل بھول گئی کہ میں نے حیات سے کیا وعدہ کیا تھا اور لائبریری میں بیٹھ کر شیر کے شکار سے متعلق ایک کتاب پڑھتی رہی!

حیات چار بجے آیا اور آٹھ بجے تک میرا انتظار کرتا رہا! پھر وہ اندھیری رات میں بھٹکتا ہوا واپس پہنچا تو ممی سے ایک ایک کی چار چار لگا دیں، صبح کو ممی نے فون پہ مجھے خوب لتاڑا اور کہا کہ شام کو سنیچر اتوار کی چھٹی میں گھر آؤں تو حیات سے معافی چاہوں ...... یہ "معافی" کا معاملہ گڑبڑ تھا، معذرت کے لئے میں آمادہ تھی مگر اس سے نہ ممی کی تشفی ہوئی نہ حیات کی چڑھی ہوئی ناک اتری!

اگر میں اس سے جھوٹ موٹ کہہ دیتی کہ مجھے جاڑے سے بخار چڑھا تھا، ہیضہ ہو گیا تھا یا ٹانگ ٹوٹ گئی تھی تو وہ تہذیب اور اخلاق کا متوالا مان جاتا مگر میں نے اصلی بات بتا دی، وہ جنگل کی کتاب بڑی دلچسپ تھی، یہ سنکر حیات اور بھی بھڑک اٹھا، مجھے وہ وہ سنائیں کہ میرا پیمانۂ صبر چھلک گیا، جنگ کی نوبت آگئی، اس نے مجھ سے کہا کہ میں بے رحم اور سنگدل ہوں، میں نے کہا تم خوشامد پسند اور خود فریبی کے عادی ہو، معاملہ بڑھنے لگا تو ممی نے دخل دیا، وہ حیات کو پچکار کے ساتھ لے گئیں اور مجھ سے کہا کہ میں زندگی میں کسی کی محبت کی قدر نہیں کر سکتی ......

سوچو، نوری، محبت کا مطلب یہ ہے کہ ہر لمحہ ہر قدم پہ اس کا دکھاوا کیا جائے، محبت کی قدر اس طرح ہوتی ہے کہ انسان اپنی وقعت، خودداری اور آزادیٔ نفس کو تباہ کر دے ...... حیات بھی اور مردوں کی طرح پرستش کا شائق ہے ...... مجھے یہ ڈھنگ نہیں آتا، اب مجھے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بدل سکتی، اگر حیات خود میری راہ پر نہیں چل سکتا تو مجھ سے یہ توقع کیوں کرتا ہے۔"

کچھ دن کی خاموشی کے بعد حیات کے بارے میں روبی نے آخری خط لکھا:-

"نوری میں اپنے اوپر حیران ہوں، معمولی سی بات نے مجھے کس قدر خلجان میں مبتلا کر دیا ہے، میں تمہیں یہ ساری کہانی نہ لکھتی اگر مجھے اس کا خیال نہ ہوتا کہ جب حیات تم سے ملے گا تو میری شکایت ضرور کرے گا اور میں نہیں چاہتی کہ تم ...... جو اس دنیا میں میری تنہا دوست اور رازدار ہو مجھ سے بدگمان ہو جاؤ۔

ممکن ہے حیات کی باتیں تمہیں بالکل مناسب اور فطری معلوم ہوں مگر میری بات کو میرے ہی زاویۂ نظر سے پرکھنا اور پھر کہنا کہ جس نے ہوش سنبھال کر اب تک صرف دو ہی انسانوں کے ساتھ خیال و عمل کی آزادی محسوس کی ہو، انہیں اپنا ہمنوا نہ سہی اپنی فریاد سننے والا تصور کیا ہو اور اُن کے ساتھ رہ کر اپنے بے رنگ ماحول سے نجات پائی ہو وہ ...... اُن دونوں میں سے کسی ایک کی تکلیف وہ خود غرضی کس طرح برداشت کر سکتا ہے ...... مجھے یقین ہے اگر حیات کی جگہ یہی سلوک تم نے کیا ہوتا تو میرے جذبات بالکل یہی ہوتے جواب ہیں!

بات بالکل ذرا سی تھی مگر حیات غالباً اُسی دن سے بددل ہو گیا تھا جب اُسے ایک شام تنہا بیٹھ کر میرا انتظار کرنا پڑا اور میں آنا بھول گئی، یوں بظاہر وہ خوش ہو گیا تھا اور کئی مرتبہ ہم دونوں کشتی کی سیر کو گئے اس نے مجھے اپنے کشمیر جنت نظیر کی کہانیاں سنائیں، مجھ سے آئندہ سال کشمیر چلنے کے وعدے لئے اور پھر مجھے اپنے لئے سوئیٹر موزے بُننے اور کشمیری چائے بنانے کا مشورہ دیا، جس کی بابت میں نے مکرر تمہاری خدمات کو تجویز کیا۔ اب سنو، ممی کی یہاں سے واپسی کا وقت آ گیا، میں سوچ رہی تھی کہ اب دسمبر تک یہاں دن کس طرح گزر رہیں گے، دل تھا کہ پڑھائی پر لعنت بھیجکر ممی اور حیات کے ساتھ گھر چلی جاؤں مگر ممی کہاں چلنے دیتیں، انہوں نے حیات سے بازار جا کر کچھ سامان لانے کو کہا میں بھی ساتھ گئی، وہ بڑا بشاش تھا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا مگر مجھے یقین ہے کہ وہ کسی دماغی کمزوری کا شکار ہے۔ دفعتہً اُسے پھر کچھ دورہ پڑا اس نے ایک دکان سے کانچ کی سُرخ سبز چوڑیاں خریدیں اور مجھ سے پہننے کی فرمائش کی۔ تم جانتی ہو میں نے کبھی چوڑیاں نہیں پہنیں، میں نے کبھی ممی کو چوڑیاں پہنے نہیں دیکھا، مجھے اُن کے ہاتھ یونہی اچھے لگتے ہیں اور اپنے ہاتھ بھی یونہی پسند ہیں، میں نے انکار کر دیا، اس نے اوّل مجھے مجبور کرنا چاہا اور پھر بگڑ بیٹھا، دیکھنے کے قابل طرز تھا کہ وہ کس طرح منہ پھلائے پتلون کی جیبوں میں وہ سُرخ سبز چوڑیاں اور اپنے ہاتھ ٹھونسے بڑبڑاتا جا رہا تھا" تم بداخلاق ہو تمہیں دوسرے کا دل توڑنا آتا ہے تم نے میرا تحفہ ٹھکرا دیا ......"

میں نے کہا بھئی حیات میں ایسے بے کار تحفے کا کیا کروں جو میرے مصرف کی چیز نہیں"

" کہنے لگا" تم بلا سے انہیں نال میں پھینک دیتیں مگر اس طرح تو میرا تحفہ رد نہ کیا ہوتا۔

میں نے کہا" اچھا لاؤ کہاں ہیں چوڑیاں، میں لئے لیتی ہوں"

اس نے خوش ہو کر جلدی سے چوڑیاں نکالیں اور مجھے تھما دیں، مجھے اس کی رائے سے اتفاق ہو گیا تھا لہٰذا اس کا شکریہ ادا کر کے وہ چوڑیاں میں نے ریلنگ کے پار نال کے نیلے پانی کی نذر کر دیں۔ حیات کی شکل قابلِ دید تھی۔ اُس نے اِس طرح منہ پھاڑ کر مجھے دیکھا جیسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ ہو، کچھ دیر گم سُم کھڑا رہا پھر خالص رضیہ آپا کے لہجے میں بولا" تم کتنی سنگدل اور ظالم ہو" مجھے رضیہ آپا کا خیال آتے ہی ہنسی آئی، میری ہنسی نے اُسے

اور بھی مشتعل کر دیا، مجھ سے بولا "کوئی اس طرح تمہارا دل توڑ دے تو پتہ چلے" میں نے جواب دیا حیاتؔ صاحب میں ایسی کم ظرف نہیں جو کسی کا شکوہ زبان پر لاؤں یہ نمائش آپ ہی کو مبارک ہو ......

پھر دو دن ہم لوگ ساتھ رہے اور وہ منہ لپیٹے پڑا رہا، شاید اُسے گمان تھا کہ میں اپنے عمل پر شرمندگی کا اظہار کروںگی مگر میں نے یہ سیکھا ہی نہیں، اگر وہ خود اپنے رویہ پر متاسف ہوجاتا تو کیا ہرج تھا۔ زیادتی اُسی کی تھی آخر جب میں اسکول جانے لگی تو میں نے بھی اُسے خدا حافظ نہیں کہا، حمی سے مل کر آگئی اُس میں اس قدر دماغ ہے تو میں کیوں اپنا جی جلاؤں، میں جانتی ہوں ایک دن وہ احساس کریگا کہ غلطی اسی کی تھی اور پھر متاسف بھی ہوگا۔ انتظار میں کیا حرج ہے؟ تم سے بھی کہنا تھا کہ اگر وہ میری بُرائی کرے تو اس کی باتوں میں نہ آنا اور کہہ دینا کہ میں روبی کو تم سے بہتر جانتی ہوں ......

ہاں یہ بتاؤ تمہاری شادی کی بابت کیا طے پایا؟ بھئی میری واپسی کا انتظار تو کرو گی نا؟ ...... تم نے اپنے گذشتہ خط میں مجھ سے کیا پوچھا تھا؟ مجھے تو ابھی تک اپنے ٹارزن کا انتظار ہے میری بات یونہی رہنے دو ......"

پھر روبی نے بہت دن تک نوری کو خط نہیں لکھا، وہ سینیئر کیمبرج کے امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ صبح شام کر کے دن اور مہینے بھاگے جارہے تھے نومبر آگیا اور سینٹ میری کونونٹ کے در و دیوار پر امتحان کے خوفناک سائے لرزنے لگے ...... روبی کے تھکے ہوئے پژمردہ دماغ نے نوری کے ہاتھ کا لکھا ہوا سبز لفافہ دیکھ کر جسم میں نئی جان محسوس کی مگر ...... مگر وہ خط یوں تھا:-

روبی بہت دن سے تمہیں ایک مفصل خط لکھنے کو تڑپ رہی ہوں، مگر تمہیں تو معلوم ہے میں کتنی بزدل ہوں۔ بیسیوں بار قلم لے کر بیٹھی ہوں مگر دو چار سطر نہیں لکھ پاتی کہ ہاتھ رُک جاتا ہے ...... رات میں سوچتی رہی کہ میری خاموشی میرے اُن انتھاہ جذبات پر داغ ہے جو تمہارے لئے میرے دل میں جاگزیں ہیں۔ ہم دونوں نے کبھی ایک دوسرے سے کوئی بات راز نہیں رکھی پھر میری یہ جھجک کیا معنی! روبی آج اس خط کو پڑھ کر تمہیں میری ہمت کی داد دینی پڑیگی ...... کہ یہ میں نے لکھا ہے!

سُنو روبی میری شادی ہو رہی ہے ...... مگر ٹھہرو مجھے تو شروع سے تمہیں سب کچھ بتانا پڑیگا ...... میں نے تمہیں کئی بار لکھا کہ یہاں گھر والے اس موضوع پر بہت سنجیدہ ہو رہے ہیں اور اس سے قبل کہ میری زندگی کا فیصلہ ہوجائے میں تم سے کچھ اپنے دل کی بات کہنا چاہتی ہوں، مجھے یقین تھا کہ تم ...... صرف تم ہی میری مدد کر کے مجھے درد کے ایک دائمی دَور میں مبتلا ہونے سے بچا سکتی ہو، مگر تم! ہمیشہ کی طرح شریر اور ہر چیز کو ہنسی میں اُڑانے والی یہ کہاں سمجھتیں کہ نوری کے ہاتھ کی لکیروں میں جنگل کی شاہزادی ہونا نہیں لکھا اور اُسے کوئی شہزادہ لینے نہیں آئیگا! تاہم نوری کے پہلو میں بھی ایک دل ہے اور اُس میں کسی کا خیال بھی ہوسکتا ہے ......!

تم نے بات مذاق میں ٹال دی اور تمہاری قسم میں ایسی پریشان رہی کہ اب تم سے کیا کہوں، یہ خط پڑھ کر یونہی تم کو شرارت سوجھ رہی ہوگی۔

خیر تم نے میری مدد نہیں کی اور اچھا ہوا کہ میں نے تم سے کچھ نہیں کہا، تم نہیں کیا کیا فقرے کستیں ...... اُلجھن اس سے بہتر طریقہ سے حل ہوگئی۔

ہوا یوں کہ خالہ کو انفلوئنزا سے حرارت ہوگئی، میں اُنہیں دیکھنے تمہارے یہاں پہنچی تو حیاتؔ وہاں موجود تھے، ہم دونوں ساتھ ہی لوٹے، باغ میں پہنچ کر گلاب کے اس کنج میں جہاں ہم نے آنکھ مچولیاں کھیل کر بچپن کے حسین لمحے بتائے ہیں ...... حیاتؔ دفعتہً رُک گئے اور کہنے لگے

"روبی مجھے تم سے کچھ کہنا ہے ..... مگر شرط یہ ہے کہ تم اپنی عادت کے مطابق رحم اور ایثار نہ برتو بلکہ اُس آزادیٔ خیال سے کام لو جو روبی نے تمہیں بچپن سے سکھائی ہے، یقین کرو اب میں کبھی کسی سے خفا نہیں ہو سکتا ......"

اُف وہ روبی، میں کس بُری طرح سٹپٹائی ہوں، حیات اس قدر سنجیدہ لگ رہے تھے کہ میرا جی بیٹھنے لگا اُن کا چہرہ زرد تھا اور آنکھیں پُرنم تھیں ......

تم نے ایک دفعہ اُن کی یہی حالت دیکھ کر نینی تال میں انہیں "بزدل" سمجھا تھا مگر میرا خیال ہے کہ وہ بزدل نہیں .... حسّاس کا لفظ بہتر رہیگا مگر تم سنگدل بھلا کسی کے نازک احساس کو کیا سمجھو ......

خیر وہ تو کہنے لگے "میری زندگی میں صرف دو لڑکیاں ایسی آئیں کہ جن کے روبرو میں نے خود اجنبی محسوس نہیں کیا .... جنہیں میرے دل نے ساتھ کہہ کر پکارنا چاہا، روبی اور تم ..... روبی مجھ سے نفرت کرتی ہے، میں اُس کے ساتھ چلنے کا اہل نہیں؛ اب تم کہو .... زندگی کے سفر میں میرا ساتھ دو ..... یا میں اکیلا ہی اپنی راہ چلا جاؤں؟"

بتاؤ روبی میں کیا کہتی؟

میں نے بچپن سے ..... ہمیشہ سے دُنیا میں جن دو انسانوں کو چاہا (تم اسے پرستش کہہ لو) اُن میں سے ایک اور پہلی تم ہو .... دوسرے کے بارے میں غالباً اب کہنے کی ضرورت نہیں،

حیات بہت غمگین اور ملول نظر آ رہے تھے، اگر تم نے اپنے خطوط میں نینی تال کے سارے واقعات نہ لکھ دیئے ہوتے تو یہ بات میرے لئے بھی پریشانی کا سبب بنتی مگر بھلا ہو تمہارا تم نے اپنی ساری شرارت مجھے لکھ بھیجی تھی اور سب مجھے اُن کے غم کا حال معلوم تھا۔

میں نے پوچھا "کیا آپ روبی کے نینی تال والے رویہ سے دل برداشتہ ہیں؟"

کہنے لگے "ہاں ..... اور مجھے یقین تھا کہ روبی نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا"

میں بولی "تو میں بھی آپ کو بتا دوں، روبی کی بات کا بُرا ماننا ایسا ہے جیسے آپ نے روبی کو ابھی تک نہ دیکھا ہو، اگر آپ اُسے جانتے ہیں تو اُسکی باتوں سے رنجیدہ نہیں ہو سکتے، مجھ سے پوچھئے لاکھ بار اُس نے اسی طرح مجھے جو جی میں آیا کہا ہے، میرے جذبات کا مذاق اُڑایا ہے میرے خیالات کی ہنسی کی ہے اور مجھے وہ سب کہا ہے جو وہ آپ کو یقیناً نہیں کہہ سکتی ..... مگر میں اُس سے ایک لمحے کو ناراض نہیں ہوتی۔ میں اُسے پہچان گئی ہوں نا! روبی کو یقین ہوگا کہ آپ بھی اُسے میری طرح جانتے پہچانتے ہیں"

حیات کچھ حیران سے کھڑے مجھے دیکھتے رہے، اُن کا خیال تھا "روبی مجھ سے نفرت کرتی ہے" میں نے کہا "نہیں نہیں، میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ روبی ہم دونوں کو اسی قدر چاہتی ہے جتنا ہم دونوں اُسے چاہتے ہیں" روبی تم نے مجھے لکھا تھا کہ تم حیات سے کہدینا میں روبی کو سمجھ گئی ہوں اور میں نے یہ بات اُن سے کہدی اور پھر اُن کی پریشانی دُور کرنے کو میں نے حیات کو تمہارے اس خیالی رومان کا بھی کچھ حصہ سُنا دیا جو ابھی تک صرف مجھے معلوم تھا ..... حیات سے میں نے یہ بات اس لئے کہی تاکہ تمہاری طرف سے اُن کی کدورت دُور ہو جائے ..... اور اس لئے بھی کہ اب حیات سے کیا پردہ؟ اب تو وہ ہم سے اور بھی نزدیک ہوتے جا رہے ہیں ..... میں نے حیات کو بتا دیا کہ تم بچپن سے ہی اپنے اس ٹارزن کی منتظر ہو جو ایک دن تمہیں کھوجتا ہوا ضرور یہاں آ نکلے گا ..... حیات اور بھی حیران تھے، کہنے لگے "مجھے یہ سب کیا معلوم تھا ..... روبی کی باتوں نے مجھے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا" خیر روبی اب تم بے فکر رہو حیات کو تم سے کوئی غلط فہمی نہیں

تمہاری اس ملاقات کے بعد تمہاری تائی ہمارے گھر اس سلسلہ میں آئیں اور یہاں سے فوراً منظور ہو گیا ..... حیات کو شادی کی بہت جلدی ہے مگر میں نے صاف کہہ دیا کہ جب تک روبی نہ آجائے یہ ناممکن ہے لہٰذا اب تاریخیں تمہاری واپسی کے لحاظ سے طے ہوں گی ..... ہاں بھئی ہمارے لئے تحفے کی اُلجھن میں نہ پڑنا، تمہاری آمد سے بڑھ کر ہم دونوں کے لئے کیا تحفہ ہو سکتا ہے ..... "

دبیز لفافے میں نوری کے ہاتھ سے لکھے ہوئے یہ الفاظ خزاں رسیدہ پتیوں کی طرح روبی کے گرد اُڑنے لگے ..... سینٹ مبری کا ہنگامہ خیز اور زندگی سے بھرپور ماحول ایک گھنا تاریک جنگل بن گیا جہاں خونخوار درندوں کی دہشت ناک آوازیں سنائی دینے لگیں، چاروں طرف خاردار جھاڑیاں اُگ آئیں اور خونی بھیڑیئے اپنا جبڑا پھیلائے اس کی طرف بڑھے ..... وہ ایک چٹان پر تنہا اور بے سہارا کھڑی تھی آس کا ساتھی ..... اس کے اچھوتے خوابوں کا شہزادہ اس کے انتظار سے اُکتا کر شہر کی مہذب دنیا میں پہنچ گیا تھا ..... اب یہاں کوئی نہیں ..... کوئی نہیں آئے گا ..... "

مسز اکبر کی زندگی میں ایک ایسا وقت آیا تھا کہ جب انہیں اپنا سارا سکون موت کی آغوش میں سویا نظر آتا تھا ..... روبی کے کمسن ہاتھوں نے انہیں زندگی کی طرف کھینچ لیا ..... اب روبی کربناک زندگی سے فرار چاہتی تھی ..... تال کا نیلا پانی اُسے مدعو کر رہا تھا اور "لینڈز اینڈ" کے موڑ پر دفعتہً پہاڑوں کے ختم ہو جانے پر جو حسین وادی تھی اس کا حسن بھی کم پُرکشش نہ تھا مگر مسز اکبر کے عمر رسیدہ بازو بڑھے اور جب اسکول بند ہوا تو روبی گھر آگئی .....

مسز اکبر نے اسٹیشن پر اُسے دیکھا تو دیکھتی رہ گئیں ..... روبی تجھے کیا ہو گیا؟

"میں بہت دن سے بیمار ہوں ممی"

نوری مایوں بیٹھ چکی تھی اور آنے جانے سے مجبور تھی ..... حیات دو مرتبہ آیا اور دونوں دفعہ روبی کو پلنگ پر آنکھیں بند کئے پڑا دیکھ کر مسز اکبر کو کہنا پڑا کہ "سو رہی ہے!"

حیات اور نوری کی شادی کا دن آگیا ..... مسز اکبر نے کہا "روبی تم حیات اور نوری کی شادی میں شرکت نہیں کرو گی؟ حیات تمہارا تایا زاد بھائی ہے اور نوری تمہاری بچپن کی سہیلی ہے ..... تم نہ گئیں تو انہیں کتنا دکھ ہو گا ..... "

ہاں ہاں ممی میں ضرور جاؤں گی ..... مگر میرے پاس تو شادی میں شرکت کو اچھے کپڑے بھی نہیں"

بیگم اکبر نے بیس سال بعد بڑی اُمنگ سے اپنی مقفل الماریاں اور درازیں کھولیں جب وہ نوری کے پاس پہنچی تو سہاگ کے عطر میں بسی ہوئی اور گوٹے کے سرخ لباس میں لپٹی ہوئی نوری دونوں بازو پھیلا کر اس سے لپٹ گئی "تم آگئیں روبی ..... اچھی تم آگئیں"۔ پھر اُس نے روبی کے سراپا کا جائزہ لیا اور فرطِ مسرت سے تڑپ گئی "اللہ تم کتنی اچھی لگ رہی ہو ..... تم اور یہ زربفت کا غرارہ! یہ آنچل پلّو کا دوپٹہ، یہ موتیوں کے ہار اور یہ ..... یہ بھر بھر ہاتھ کانچ کی چوڑیاں ..... یہ سب کیا قصّہ ہے؟"

"میں ہار گئی نوری" اس نے رُک رُک کر مدھم آواز میں کہا۔

"اوہ حیات تمہیں دیکھیں تو کس قدر خوش ہوں اسی بات پر تو اُن سے تم روٹھ گئی تھیں"

پھر نوری کو کچھ یاد آگیا اس نے روبی کے لرزتے ہاتھ اپنے مہندی رچے ہاتھوں میں تھام لئے۔

"تمہاری صحت خراب ہو گئی، بہت کمزور لگ رہی ہو ..... تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی ..... بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی ..... میری

ایک بات مان لو...... بولو انکار تو نہیں کرو گی؟"

"کیا بات ہے؟" روبی نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔

نوری نے اس کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا اور خوشی سے کانپتی آواز میں سرگوشی کی...... بات یہ ہے روبی کہ تمہیں معلوم ہے حیات کشمیر جانا چاہتے ہیں، انہیں کشمیر کی وادیوں سے عشق ہے، مجھے یقین ہے وہ بڑی خوبصورت جگہ ہو گی اور تمہیں حسین نظاروں سے پیار ہے...... تم نے حیات سے وعدہ کیا تھا کہ تم اُن کے ساتھ کشمیر چلو گی...... تو اب چلو گی نا؟ دیکھو تم جانتی ہو مجھے ڈھنگ کی باتیں کرنا نہیں آتا، تمہاری باتیں انہیں کیسی اچھی لگتی ہیں، مجھے تو کمبخت باتوں کے لئے موضوع بھی نہیں سوجھتے...... تمہیں نہ حیات کے لئے سویٹر موزے بُننے کی ضرورت ہو گی نہ چائے بنانی پڑے گی، یہ سب میں خوشی سے کر لوں گی تم بس ہمیشہ کی طرح ہم سے باتیں کرنا...... کیوں روبی بتاؤ...... چلو گی؟

روبی کے سینے میں سانس گھٹنے لگا...... کچھ دیر کو ایسا لگا جیسے وہ اس کاری ضرب سے کبھی نہ سنبھل پائے گی...... اُسے معلوم نہ تھا کہ نوری کا نشانہ بھی اس قدر بے خطا ہو سکتا ہے...... پھر جیسے اس نے اپنے آپ سے کہا "میں بزدل نہیں ہوں" اور مسکرائی۔

نوری تم حیات کے ساتھ اس کے تصورات کی سرزمین پر چلی جاؤ...... ہاں میں نے حیات سے اس کے ساتھ جانے کا وعدہ کیا تھا مگر جب اور بات تھی...... تمہیں ایک راز بتا دوں جلد ہی تمہیں پتہ چلے گا کہ میں امتحان میں فیل ہو گئی میں نے امتحان کے پرچوں پر ایک نقطہ نہیں لکھا...... ایک سوال نہیں کیا......"

نوری نے سہم کر روبی پر اپنی سوالیہ نگاہیں جما دیں......

وہ رُک رُک کر کہتی گئی "بات یہ ہے نوری کہ میں پھر بینی تال جانا چاہتی ہوں...... میں نے تمہیں لکھا تھا کہ مجھے وہاں کے راستوں پر اپنی منزل کے نشان ملنے لگے ہیں...... میں اُنھی راستوں پر چلوں گی...... میں پہاڑوں کے پرلی طرف اُس ڈھلان پر اُتر جاؤں گی جہاں جانے سے حیات نے مجھے روک لیا تھا اور پھر میں اُس گھنے جنگل میں پہنچ جاؤں گی جہاں مجھے یقین ہے کوئی مجھے ڈھونڈنا آتا نکلے گا......

نوری کی پریشان نگاہوں سے بچنے کو اس نے مڑ کر گاؤ تکیہ پر سر رکھ دیا...... اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے خاردار جھاڑیوں کے درمیان وہ ایک چٹان پر تنہا اور بے سہارا کھڑی ہے...... شہنائیوں کے ساتھ مل کر اس کے کانوں میں خونی درندوں کے غرّانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں......

بھابی جان

سہیل عظیم آبادی

جب رقیہ بھابی یاد آتی ہیں، تو میرا سر خود بخود جذبۂ احترام سے جھک جاتا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اُن کی ذات سراپا روشنی ہے۔ اُن کی یاد کے ساتھ ساتھ مجھے وہ شمع یاد آجاتی ہے، جو کلیسا کی اُونچی قربانگاہ پہ جلتی اور پگھلتی رہتی ہے۔ اور جب پادری عبادت ختم کر کے قربان گاہ سے اُتر جاتا ہے، تو بھی وہ خاموش زبان سے خداوند یسوع کا پیغام سُناتی رہتی ہے۔ جو دوسروں کا گناہ بخشوانے کے لئے صلیب پر چڑھایا گیا۔ مگر وہ جو اب تک زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا۔ اور سب کو نجات دلائے گا۔

رقیہ بھابی کی ذات مجھے ایسی ہی شمع معلوم ہوتی ہے۔ جو جلتی اور پگھلتی رہتی ہے۔ لیکن روشنی پھیلاتی اور کچھ کہے بغیر بھی ہر وقت ایک پیغام سُناتی رہتی ہے۔ ایسا پیغام جو امر ہے۔

بھابی نے صبح سویرے آواز دی۔

"خیر تو ہے شہزادے، گھوڑے بیچ کر سوئے ہو۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

بھابی کی آواز سُنکر میں اُٹھ بیٹھا۔ وہ مسکرا دیں اور بولیں۔

"بھئی بات یہ ہے کہ ٹھنڈی چائے مجھ سے نہیں پی جاتی۔ اور بچوں کو اسکول بھیجنا بھی ہے۔"

"بھابی یہی تو مصیبت ہے آپ کے ساتھ۔ صبح ہوئی اور اُٹھا کر بٹھا دیا۔ ہم لوگوں کو بھی آپ طالب علم سمجھتی ہیں۔"

بھابی بولیں۔

"تو آج تم کون بوڑھے ہو چکے ہو۔ بھئی اُٹھو جلدی کرو۔"

بھابی نے ہاتھ پکڑا، اور بستر سے کھینچ لیا۔ میں زمین پہ کھڑا ہو گیا۔ وہ ہنسنے لگیں۔ میں بولا۔

"شکر ہے۔ میں آپ کا اسٹوڈنٹ نہیں ہوا۔"

"باتیں نہ بناؤ۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ بچے بیٹھے ہیں۔"

"لیکن مجھے نیند آ رہی ہے بھابی۔ رات بھر نہیں سو سکا ہوں ....." میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"چائے کے بعد دوسری قسط سو لینا۔"

قسط کا لفظ سُنکر میں ہنس پڑا۔ اور وہ بولیں۔

" شاعر ہو کر داد نہیں دیتے۔ کیا لفظ میں نے استعمال کیا ہے۔ اگر نواب ان اودھ باقی ہوتے تو اس ایک لفظ کے استعمال پر ایک جاگیر تو ضرور بخش دیتے۔ چلو بھئی تم ذرا جاری کر دو۔ اتنا ہی سہی "

اور بھابی کھانے کے کمرے میں چلی گئیں۔ اور جب تھوڑی دیر میں میں میز پر پہنچا تو بچے چائے ختم کر رہے تھے۔ ننھی ریحانہ بولی۔

" چچا جان ہم لوگ چائے ختم کر چکے۔ اب آپ ہماری جھوٹی چائے پیجیے "

اسکول کی لاری نے ہارن بجایا اور بچیاں تالی بجاتی ہوئی باہر چل دیں۔ بھابی نے چائے ڈھال کر میری طرف بڑھائی۔ اور بولیں۔

" اگر تم نوجوان اتنی دیر تک سوتے رہو گے تو کیا کرو گے "

" شعر کہوں گا۔ اور کیا کروں گا "

" اور کچھ نہیں ؟ "

بھابی معنی خیز انداز میں مسکرائیں — میں کچھ جھینپ سا گیا۔ بھابی کی مسکراہٹ بہت دور تک اشارے کر رہی تھی۔ پھر وہ آہستہ سے بولیں۔

" تمہارے بھائی جان ٹھیک چار بجے اُٹھ بیٹھتے تھے۔ اور چائے پی کر کام شروع کر دیتے تھے۔ شروع میں تو مجھے بھی بڑا جبر ہوتا تھا۔ لیکن آج صبح اُٹھنے کی عادت کام آ رہی ہے "

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بھابی کی سنگار میز پر ننھے بھائی کی خوبصورت سی رنگین تصویر رکھی ہوئی تھی۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ اس تصویر کے پاس بھابی اور بچوں کی تصویریں تھیں۔ اب سنگار میز نام کا تھا۔ اس پر بچوں کی کتابوں کا ڈھیر تھا۔ اور شاید ایک کنگھی کے علاوہ میز پر سنگار کی کوئی دوسری چیز بھی نہ تھی۔ رقیہ بھابی اُداس ہو گئیں اور بولیں :-

" اختر۔ نہ جانے تمہارے بھائی جان آج کس حال میں ہیں۔ دیکھو اُن کے مقدمے کا کیا ہوتا ہے۔ ہزار میل کی دوری پر میں اُن کے کوئی کام بھی نہیں آ سکتی۔ چند ہی دنوں میں اُن کے مقدمے کا فیصلہ ہونے والا ہے "

بھابی جو ہمیشہ پھول کی طرح ہنسنے اور بلبل کی طرح چہکتے رہنے کی عادی تھیں، بالکل اُداس اور چپ تھیں۔ لیکن یکایک کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ پھر آواز آئی۔

" میں آ سکتی ہوں — "

" آ جاؤ — " بھابی نے کہا۔

اور ایک جوان سی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ بھابی نے دیکھتے ہی کہا۔

" آؤ شمی چائے پیو۔ میں آج شام کو تمہارے گھر جانے والی ہی تھی۔ بُن دیئے تم نے سوئیٹر ؟ "

" وہی لے کر آئی ہوں۔ اُون بچ گیا تھا۔ تو میں نے ٹوپی اور موزے بھی بُن دیئے "

" بہت اچھا کیا تم نے۔ لو چائے پیو "

اور چائے کی پیالی لڑکی کے سامنے بڑھا دی۔ لڑکی میری موجودگی میں کچھ شرما رہی تھی۔ بولی۔

" میں چائے پی چکی ہوں "

" پھر بھی پی لو۔ شرماتی کیوں ہو۔ یہ ہیں مشہور شاعر اختر۔ تمہارے بڑے بھائی ہیں "

میں ناشتہ ختم کر چکا تھا۔ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"بھابی میں بھی ذرا شہر سے ہو آؤں"

"جاؤ۔ مجھے بھی ذرا ہسپتال جانا ہے۔ چلو شمی تم بھی ساتھ"

میں نے کمرے کی کھڑکی سے بھابی کو بنگلے کے احاطے سے باہر جاتے دیکھا۔ اُن کے ہاتھ میں دودھ کی وہ بوتل تھی، جو بہت دیر سے میز پر رکھی ہوئی تھی۔
یہ تو مجھے دو دن کے بعد معلوم ہوا کہ بھابی کے ایک پرانے ملازم کی بیٹی ہسپتال میں ہے۔ دو مہینے پہلے اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور اس کے بچہ
پیدا ہوا ہے۔ اس کا کوئی بھی دیکھنے والا نہیں۔ بھابی خود ہی دونوں وقت دودھ کی بوتل لے کر دو فرلانگ پیدل جاتی اور دودھ پہنچاتی ہیں۔ اور سوئیٹر اور
موزے اسی بچے کے لئے بنوائے تھے۔ کیونکہ سردی کا موسم شروع ہو رہا تھا۔ اور شمی اُن کے کالج کی ایک غریب طالب علم تھی، جو صرف اُن کی مدد کے سہارے
پڑھ رہی تھی۔

بھابی سے میری صرف دوسری یا تیسری ملاقات تھی۔ البتہ خط و کتابت بہت زیادہ تھی۔ لیکن تین دن ساتھ رہ کر معلوم ہوا کہ وہ آدمی نہیں، مشین
تھیں۔ صبح اُٹھ کر کام شروع کر دیتیں۔ اُن کا زمانہ بھی بالکل بدل چکا تھا۔ کبھی چار پانچ نوکر اور مامائیں ہوتی تھیں۔ اب اُن کے پاس صرف ایک نوکر تھا۔ جو
بازار سے سودا لاتا، اور کھانا بھی پکاتا تھا۔ پھر روپوں کی بھی بڑی تنگی تھی۔ پہلے وہ ہزاروں روپے ماہوار اپنے شوق پر خرچ کر دیا کرتی تھیں۔ اب چار سو روپے
ماہوار پر ایک کالج میں لکچرر تھیں اور پچاس روپے ماہوار ایک لڑکی کو پڑھانے کے ملتے تھے۔ لے دے کر یہی اُن کی آمدنی تھی۔ اور خرچ اپنی جگہ پر بلکہ کچھ
زیادہ ہی۔ اپنے اور بچوں کا خرچ ہوتا تو کسی طرح پورا ہو جاتا۔ لیکن وہ بھی بڑھ گیا تھا۔ بچوں اور اپنی ضرورتوں کے علاوہ ایک مستقل رقم انہیں ہر مہینہ مزدوروں
اور طالب علموں کی انجمنوں کو دینا پڑتی تھی۔ کانفرنسوں اور جلسوں میں شرکت کے لئے کرایہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ کئی غریب لڑکیاں صرف اُن کی مدد سے
پڑھ رہی تھیں۔

بھائی جان کی جب شادی رقیہ بھابی سے ہوئی تھی۔ تو ہم لوگوں کا عام خیال تھا کہ یہ شادی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف بھائی جان تھے، جنہیں
ایسی سیاست سے شوق تھا، جو بار بار اُنہیں جیل بھجوایا کرتی تھی۔ اور دوسری طرف بھابی جان تھیں۔ جو نازوں کی پالی تھیں، اور ایسے ماحول میں بڑھ کر جوان
ہوئی تھیں، جس میں اپنی ہی ذات سب کچھ ہوتی ہے۔ اور ہم لوگوں نے شادی کی خبر سنتے ہی سوچ لیا تھا کہ بھابی جس طرح ابھی میکے میں شان کے ساتھ رہتی
ہیں، رہا کریں گی۔ اور بھائی جان جیل جاتے رہیں گے۔ بعضوں کا تو یہ بھی خیال تھا کہ بھائی جان بھی سیاست کے چکر سے نکل کر بیرسٹری کریں گے۔ اور اپنی
عالیشان کوٹھی میں شان کی زندگی گذاریں گے۔ یا پھر آرام کرسی والی سیاست چلے گی۔ اور کتابوں کی باتیں دہرائیں گے۔ لیکن سب کا خیال غلط نکلا۔ بھائی جان
نے رقیہ بھابی کو اپنے رنگ میں جلد ہی رنگ دیا۔ اور وہ اُن کے قدم بقدم ساتھ چلنے لگیں۔ اور شادی کے بعد جیسے ہی بھائی جان گرفتار ہوئے اور انہیں
دو سال کی سزا ہو گئی۔ بھابی جان نے اپنے لئے راہ تلاش کر لی۔ بی اے وہ پہلے ہی کر چکی تھیں۔ جلد ہی تیاری کر کے ایم اے کر لیا۔ اور ایک کالج میں لکچرر ہو گئیں
——— اور اکلوتی بچی کی دیکھ بھال میں لگ گئیں۔

دو سال کے بعد جب پھر بھائی جان جیل سے آئے تو اپنی سرگرمیوں میں رہے۔ اور بھابی جان کام کرتی رہیں۔ پھر دو بچے اور ہوئے اور وہ اُنہیں
پالتی رہیں۔ اب بھائی جان تین سال سے نظر بند تھے۔ اور اُن پر مقدمہ چل رہا تھا تو بھابی جان بے شمار ذمہ داریوں اور غم کا بوجھ اُٹھائے پھرتی تھیں۔ لیکن
اُن کا چہرہ کبھی میلا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے غم کو اپنے لئے مسرّت سمجھنے لگی ہیں۔ اور غم میں بھی خوشی کا پہلو نکال ہی لیتی ہیں۔
وہ صبح سویرے اُٹھتیں، بچوں کو نہلاتیں، اُن کے کپڑے بدلتیں۔ خود نہا دھو کر تیار ہو جاتیں۔ بچوں کو کھلا پلا کر سات بجے اسکول بھیج دیتیں۔ پھر

ملنے والوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ طرح طرح کے لوگ اُن سے ملنے آتے اور طرح طرح کی فرمائشیں کرتے، کوئی اُن سے ملازمت کے لئے سفارش کرنے کو کہتا، کوئی کسی اور کام کے لئے۔ سب آدمی انہیں بڑے آدمی کی بیوی اور بہو سمجھتے تھے۔ کوئی یہ نہیں سمجھتا تھا کہ بھابی جان کا تعلق اب بڑے لوگوں سے صرف چھوٹے لوگوں کی وجہ سے رہ گیا ہے۔ وہ بڑے لوگوں کے پاس صرف سفارشیں لے کر جاتی ہیں۔ ورنہ بڑے لوگوں سے اب انہیں دُور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔ بھابی کالج جاتیں۔ اور وہاں بھی پڑھانے کے علاوہ ہر لڑکی کے معاملات میں دلچسپی لیا کرتیں۔ کالج سے آکر پابندی کے ساتھ کئی کئی خط ہر روز لکھتیں۔ اور انہیں ڈاک میں ڈلوا دیتیں۔ عام طور پر یہ خط نئے لکھنے والوں کے نام ہوتے تھے۔ جو ہر روز انہیں خط لکھا کرتے تھے۔ بھابی نے محض دل بہلانے اور وقت کاٹنے کے لئے لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر وہ بہت اچھا لکھنے لگی تھیں۔ اور نئے لکھنے والے اُن سے مشورے طلب کرتے اور وہ بڑی محبت کے ساتھ اُن کے خطوں کا جواب دیا کرتیں۔ اس طرح کہ نئے لکھنے والے نہ تو غلط فہمیوں کا شکار ہو کر بہک جائیں اور نہ اُن کی دلشکنی ہو۔ پھر وہ شام کو ایک جگہ ٹیوشن پڑھانے چلی جایا کرتی تھیں۔

یعنی صبح جاگنے کے بعد سے سوتے وقت تک کام۔ آدمی کاہے مشین معلوم ہوتی تھیں ——— اُن کے خط لکھنے کے شوق سے تنگ آکر میں نے کہا۔

" بھابی آپ نے کیا علّت پال رکھی ہے۔ کالج میں تو سر کھپاتی ہی ہیں۔ گھر پر بھی ایک کالج بنا رکھا ہے "

بھابی بڑے باوقار انداز میں مسکرائیں۔ اور بولیں۔

" اختر۔ اِن نئے لکھنے والوں کو کیسے بھول سکتی ہوں۔ یہ تو ہمارے مستقبل کی اُمیدیں ہیں ——— اگر میں ان پودوں پر روز چھڑکاؤ نہیں کر سکتی۔ اُن کی خدمت نہیں کر سکتی کہ اُن میں پھول لگیں اور سارا باغ مہک اُٹھے، تو کم سے کم جو کچھ کر سکتی ہوں، وہ تو کرنا ہی چاہیئے ——— "

اس جواب کے بعد کچھ اور بولنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ میں چپ ہو رہا۔

ایک دن شام کے وقت وہی لڑکی شمی اُن کے پاس آئی۔ وہ بہت اُداس تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن پھر بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ بار بار اس کے ہونٹ کانپ کر رہ جاتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ رو دے گی۔ بھابی نے حسب عادت اُسے بٹھایا اور باتیں کیں۔ پھر آنے کی وجہ پوچھی تو وہ کچھ بھی نہ بولی۔ بھابی جتنے اصرار کے ساتھ پوچھتیں معلوم ہوتا کہ اس کے ہونٹ اتنی ہی شدت کے ساتھ آپس میں چپکتے جاتے تھے۔ آخر وہ کچھ نہ بول سکی۔ تو بھابی نے اُسے پکڑا اور سونے کے کمرے میں لے گئیں۔ دروازہ اندر سے بند کیا اور پوچھا کہ کیا بات ہے۔

لیکن شمی کچھ بتانے کے بدلے رونے لگی۔ اور بھابی کے چپ کرانے پر بھی روتی گئی۔ اور بڑی دیر کے بعد بھابی کے ڈانٹنے پر، اُس نے بتایا کہ دوسرے ہی دن اس کے بھائی کو ایم۔ اے کی فیس داخل کرنی ہے۔ اور روپے کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا ہے۔ وہ اس بات پر شرمندہ تھی کہ بھابی اس کے کالج کا خرچ دیتی ہیں۔ اب وہ بھائی کے لئے بھی فیس مانگے۔ لیکن دوسرا کوئی اور ایسا ہمدرد بھی نہ تھا جس کے سامنے وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی۔ اور وہ صرف اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اُن کے پاس آئی تھی۔

بھابی نے بڑی محبت سے شمی کے گال پر ایک چپت لگائی۔ اور بولیں۔

" پگلی! اس میں رونے کی کیا بات تھی۔ آخر اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ ہم لوگ اسی طرح تو ایک دوسرے سے کہہ کر اپنا دُکھ درد ہلکا کر سکتے ہیں۔ اتنا کہہ کر اُنھوں نے الماری کھولی۔ اور چھوٹی چھوٹی سونے کی دو چوڑیاں لا کر شمی کے ہاتھ پر رکھ کر بولیں۔

" لے جاؤ اسے بیچ کر تمہارا بھائی فیس ادا کر سکے گا "

شمی شاید گر جاتی۔ لیکن بھابی نے اُسے سنبھال لیا۔ اور اس کی پیشانی چوم لی۔ اور بولیں۔

" شمی۔ سدا ایسا ہی زمانہ نہیں رہے گا۔ دن بدلیں گے۔ جاؤ، سویرے چلی جاؤ، پھر اندھیرا ہو جائے گا "

شمی چوڑیوں کو لے کر چلی گئی۔ یہ چوڑیاں وہ تھیں، جو دو دن پہلے بھابی جان نے ننھی ریحانہ کے لئے بڑی مشکل سے پیسے بچا کر بنوائی تھیں۔ اور جسے ریحانہ نے صرف ایک بار پہنا تھا۔

چوڑیاں دے کر بھابی بہت خوش تھیں۔ جیسے اُن کے دل سے پہاڑ جیسا کوئی بوجھ اُتر گیا تھا۔

میں چار دنوں سے اُن کے پاس تھا۔ اور ایک ضروری کام کے سلسلے میں اُن سے مشورہ کرنے آیا تھا۔ لیکن اُن کی مصروفیتیں اور پریشانیاں دیکھکر نہ موقع ملا۔ اور نہ ہمت ہو سکی۔ اور میں نے سوچ لیا۔ کہ بھابی سے بغیر کوئی مشورہ کئے اور مدد مانگے واپس جاؤنگا۔ حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ صرف وہی ایسی آدمی تھیں جو اس سلسلے میں میری مدد کر سکتی تھیں۔ لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ اُن سے ہرگز نہیں کہونگا۔

آخر بھابی نے خود ہی کہا۔

" تم چار دنوں سے آئے ہو، لیکن کوئی بات تک نہیں کی "

میں نے کہہ دیا۔

" میں صرف ٹہلنے اور آپ سے ملنے آ گیا تھا بھابی "

پھر وہ بولیں۔

" اور تمہاری شادی کا کیا ہوا۔ سُنا ہے تم میں اور تمہارے گھر والوں میں شادی کے مسئلے پر سخت اختلاف ہو گیا ہے "

" جی ہاں ——— شادی کرنے کا مطلب ہے کہ یا تو میں امی کی پسند کے مطابق ایک احمق لڑکی سے شادی کر لوں، یا پھر چُپ بیٹھا رہوں ——— "

" اور وہ جمیلہ! تم تو جمیلہ سے شادی کرنا چاہتے تھے نا ——— " بھابی بولیں۔

" اب بھی چاہتا ہوں۔ لیکن امّی نے کہدیا ہے کہ جمیلہ اس گھر میں بہو بن کر داخل نہیں ہو سکتی " میں نے کہا۔

" یہ تو بڑا ظلم ہے "

" ہے تو لیکن کیا کیا جائے۔ بہت سے ظلم برداشت کرنے پڑتے ہیں ——— "

" تو اپنی امی کی پسند سے شادی کر لو پھر "

" یہ بھی نہیں کر سکتا بھابی ——— "

" پھر کیا سوچا؟ "

" شادی تو جمیلہ سے ہی کرونگا۔ اور گھر چھوڑ دونگا " میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

" تو پھر بسم اللہ۔ بیاہ کر لے آؤ۔ یہاں میرے ساتھ رہے گی۔ میں بھی اکیلی ہوں ——— "

اُف ——— بھابی کے یہ جملے سُنکر میرا سر جھک گیا۔ یہ عورت ہے یا عزم و ہمت کا ستون۔ ہر روز ایک نیا بوجھ اپنے لئے بڑھائے جاتی ہیں۔ خود اپنی ضرورتیں اور ذمہ داریاں کیا کم ہیں۔ مگر ہمت ہے ——— اور صرف ہمت کے سہارے شوہر کی دوری اور نظر بندی کا غم ہنس ہنس کر بھلائے

جاتی ہیں ——— میں نے سوچ سمجھ کر جواب دیا۔

" میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ لیکن ابھی دیر ہو گی بھابی۔ جمیلہ بیمار ہے ابھی ——— "

جمیلہ بیمار نہیں تھی۔ بالکل اچھی تھی۔ لیکن اگر میں یہ نہیں کہتا تو وہ پھر ضد پر آجاتیں۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ میں نے فیصلہ یہ کیا تھا کہ بھابی سے مشورہ کرنے کے بعد ہی جمیلہ سے شادی کر لوں گا۔ اور اسے اُن کے پاس رکھ کر کہیں تلاشِ روزگار میں نکلوں گا ——— "

بھابی جمیلہ کی بیماری کی خبر سُنکر بہت افسوس کرنے لگیں۔ اور بولیں۔

" سچ مچ جمیلہ بڑی پیاری لڑکی ہے ——— "

پھر میں باہر چلا گیا۔ اور سوچا کہ رات کی گاڑی سے واپس چلا جاؤں گا۔

چار بجے واپس آیا۔ تو دیکھا بھابی جان بہت اُداس بیٹھی ہیں۔ اُن کے ہاتھ میں ایک تار ہے۔ جس کو وہ ہاتھ میں لئے ہوئے بس دیکھتی جا رہی ہیں۔ اُن کے چہرے کا گورا رنگ بالکل سنولایا ہوا تھا ——— میں چُپ چاپ اُن کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اور پوچھا۔

" تار کیسا ہے بھابی جان "

" اختر ——— "

بھابی جان نے تار میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اور میز پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگیں ——— میں نے تار پڑھا۔ بھائی جان کو چار سال کی سزا ہو گئی تھی۔ میں نے کچھ دیر کے بعد بمشکل کہا۔

" بھابی جان۔ صبر کیجئے۔ ابھی تو آپ کو ایسے امتحانوں کی منزل سے اور بھی گذرنا باقی ہے ——— "

اور بھابی کو جیسے سکون آ گیا۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔ اور بولیں۔

" ٹھیک کہتے ہو اختر ——— میں اگر پریشان ہوئی تو بچے اور پریشان ہوں گے ——— "

اتنا کہہ کر وہ اُٹھیں اور مُنہ ہاتھ دھونے چلی گئیں۔ جب واپس آئیں۔ تو معلوم ہوتا تھا۔ بس ایک لہر تھی، جو آئی اور گذر گئی۔ لیکن ہم لوگ جتنی دیر تک چائے پیتے رہے، بھابی کی نظر بار بار پُرانے سنگار میز پر رکھی بھائی جان کی تصویر کا طواف کرتی رہی۔ اُسی وقت اُنھوں نے بتایا۔ کہ اُن کے پاسپورٹ کی درخواست نامنظور ہو گئی ہے۔ اور اسی رات اُنہیں دہلی جانا بہت ضروری ہے۔

اسی رات بھابی جان دہلی چلی گئیں۔ اور میں بھی واپس ہو گیا۔ رات کے سناٹے میں ریل گذرتی جا رہی تھی۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اندھیری رات میں بھابی جان مجھے روشنی دکھا رہی تھیں ——— ریل تیزی کے ساتھ گذرتی جا رہی تھی۔ اور میرے دل میں نئے ارادے، نئے حوصلے پیدا ہو رہے تھے نئی اُمیدیں اور نئی اُمنگیں جاگ رہی تھیں۔

———

زرد گلاب

کونسی وادی میں ہے، کونسی منزل میں ہے،
عشقِ بلاخیز کا، قافلۂ سخت جاں

اقبالؔ

اے حمید

شروع نومبر کی ایک ابر آلود شام،

قصبہ ہری ناگ میں بارش ہو رہی ہے۔ ہلکی ہلکی، سرد، ویران اور اداس بارش میں قصبے کی اونچی نیچی تنگ و تاریک پتھریلی گلیاں سنسان دکھائی دے رہی ہیں۔ ان گلیوں کے کونوں پر جلنے والے پُراسرار لیمپ کچھ بجھ گئے ہیں، اور کچھ جلتے ہوئے ٹھٹھرتی ہواؤں میں کانپ رہے ہیں۔ بڑے بازار کی تمام دکانیں بند ہیں۔ اور اُن کے جھکے ہوئے زنگ آلود سائبان جگہ جگہ سے ٹپک رہے ہیں۔ منڈی کا صحن بارش اور کیچڑ میں دلدل بنا ہوا ہے۔ صحن کے اردگرد چھوٹی چھوٹی کچی کوٹھریوں میں کہیں دن بھر کے تھکے ماندے مزدور پھٹے ہوئے کھردرے کمبل اوڑھے سو رہے ہیں اور کہیں گیس کی روشنی میں زرد چہروں والے بیوپاری تجوریوں کے سامنے کھاتہ کھولے حساب کتاب میں مصروف ہیں۔ نیچی چھت والی پرانی غلام گردش میں ایک خستہ جان گھوڑی، دو بیل اور ایک بھینس بندھی ہے، ان کے پاس ہی اُدھیڑ عمر کا چوکیدار آگ جلائے بیٹھا سُرخ کنالی میں آٹا گوندھ رہا ہے۔ تیز ہوا میں چیڑ کی مرطوب کھپچیاں صرف کڑوا کڑوا دھواں دے رہی ہیں۔ چوکیدار کی ناک سردی میں ٹھٹھر رہی ہے اور اسکی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ صحن والے نیم کے پیڑ تلے ایک ریڑا اپنے دونوں بازو اوپر اُٹھائے نومبر کی بارش میں بھیگ رہا ہے۔ بستی کے جنوب میں مغلیہ عہد کی یادگار اُجڑی ہوئی، پرانی خستہ حال حویلیوں کا ایک سلسلہ چلا گیا ہے۔ کچھ حویلیاں ڈھے چکی ہیں اور ملبے کے ڈھیروں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ جو باقی بچی ہیں ان کے گھٹے ہوئے بدبودار تاریک دیوان خانوں میں ضلع رہتک اور ریاست الور کے مہاجرین آباد ہیں۔ حویلیوں کی سیلی سیلی کمزور چھتیں جگہ جگہ سے ٹپک رہی ہیں اور ضلع رہتک اور ریاست الور کے مہاجرین اپنی گدڑیاں اُٹھائے کبھی یہاں بیٹھ رہے ہیں اور کبھی وہاں اُٹھ رہے ہیں، ان کے کملے کالے بچے روئی کی پھٹی ہوئی صدریوں میں زور زور سے رو رہے ہیں اور اُن کی زرد آنکھوں والی مائیں انہیں مار پیٹ رہی ہیں اور ان کے دُبلی پتلی ٹانگوں والے خاوند انہیں گالیاں دے رہے ہیں۔ اور بکریاں ممیا رہی ہیں اور کہیں کانسی کی لوٹیا لڑھک کر نیچے گر پڑی ہے اور کہیں گرم گرم ملدے میں سوئی ننھی روکلیا پر پھر بارش کا پانی ٹپکنے لگا ہے اور وہ روتی ہوئی ماں کو پکار رہی ہے۔ اور کونے میں بیٹھا ہوا ایک ہڈیوں کا ڈھیر اونٹ یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے، سُن رہا ہے اور بڑے اطمینان سے جگالی کر رہا ہے۔

ان حویلیوں سے پرے جوار کے کھیتوں کے پار، نہر کے سُنسان پُل پر سیٹیاں بجاتی ٹھنڈی ہوا شیشم کی جھکی ہوئی ٹہنیوں کو جھولا جھلا

رہی ہیں۔ نہر لبالب بھری ہوئی ہے اور اُس کا گیرے رنگ کا پانی کناروں سے اُچھل کر باہر آ رہا ہے، آسمان گہرے سرمئی بادلوں میں چھپا ہوا ہے۔ نہر کی پرلی جانب ٹوٹی پھوٹی پرانی چار دیواری کے اندر آم کے درختوں میں گھری ہوئی ایک بارہ دری ہے۔ اس بارہ دری میں مغل دربار کی کوئی گمنام کنیز دفن ہے۔ بارہ دری میں چاروں طرف سے مینہ کی پھوار اندر آ رہی ہے۔ آم کی لٹکتی ہوئی ٹہنیاں بارہ دری کے ستونوں سے اپنا آپ جھاڑ رہی ہیں۔ قبر کے پتھروں پر کائی جم رہی ہے۔ اور کہیں کہیں گھاس اُگ آئی ہے ابھی ابھی بجلی چمکی تھی۔ اور اسکی نیلی روشنی میں ہری ناگ کے قصباتی سٹیشن کو جانے والی کیچڑ سے بھری ہوئی دلدلی سڑک دُور تک روشن ہو گئی تھی۔ یہاں سے سٹیشن سات کوس کے فاصلے پر ہے۔ ہری ناگ سٹیشن کے اُکھڑے اُکھڑے فرش والے چپٹے پلیٹ فارم پر دن میں صرف دو ریل گاڑیاں رُکتی ہیں۔ یہاں کا سٹیشن ماسٹر ٹکٹ چیک بھی کرتا ہے۔ اور بانٹتا بھی ہے۔ وہ صرف گاڑی کے وقت پلیٹ فارم پر نیلی ٹوپی پہنے موجود ہوتا ہے۔ باقی سارا وقت وہ اپنے کوارٹر میں بیوی کی ران پر سر رکھے فلمی گانوں کے پلاٹ پڑھتا رہتا ہے۔ اور مدھو بالا کو یاد کرتے ہوئے اپنی بیوی کی چھاتیوں پہ ہاتھ پھیرتا رہتا ہے۔ اور پلیٹ فارم کے دُھندلے لیمپ تمام رات ٹمٹماتے رہتے ہیں۔

قصبہ ہری ناگ بڑی پرانی بستی ہے۔ کہتے ہیں مغل شہنشاہوں کا شاہی قافلہ کشمیر جاتے ہوئے یہیں سے گذرا کرتا تھا۔ جموں کی طرف جانے والی اس پرانی سڑک کے آثار آج بھی کہیں کہیں دکھائی دیتے ہیں۔ ہری ناگ کے مشرق میں پرانے کھال پر جھکا ہوا نیچی چھت والا بوسیدہ پل، ذرا آگے جاکر نانک شاہی اینٹوں والا پرانا کنواں اور آدھا گرا ہوا مینار، اور دُور تک سڑک کے ساتھ ساتھ جاتی ہوئی ٹوٹی پھوٹی دیوار، اور ادھر اُدھر کھیتوں میں پھیلے ہوئے اگلے وقتوں کے محرابی کھنڈرات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ کبھی یہاں سے بھی وہ رنگ اور خوشبو اُڑاتے قافلے گذرا کرتے تھے، جن میں شہزادے آسام کے دیو پیکر ہاتھیوں پر سوار ہوتے تھے اور لمبی آنکھوں اور پتلے ہونٹوں والی شہزادیوں کے ابریشمی محمل پھٹے ہوئے سیاہ پاؤں والے حبشیوں نے اُٹھا رکھے ہوتے تھے۔ آج اس سڑک پر سوائے کھنڈرات اور ویران حویلیوں کے اور کچھ باقی نہیں رہا۔ لیکن اس سڑک سے ہٹ کر یہ شاہی قافلے اُسی طرح رواں دواں ہیں۔ شہزادے دیو پیکر ہاتھیوں پر سوار گلاب کے پھولوں کو بار بار سونگھ رہے ہیں۔ اور سیاہ فام ننگے حبشی برستی چابکوں میں نازک اندام شہزادیوں کے محمل اُٹھائے پتھریلی شاہراہوں پر دوڑتے چلے جا رہے ہیں، ہانپتے چلے جا رہے ہیں۔ صرف سڑکیں بدلی ہیں۔ صرف راستے تبدیل ہوئے ہیں۔ باقی وہی ہے۔ سب کچھ وہی ہے۔ ہر روز ایک انار کلی زندہ دفن کی جاتی ہے اور ہر رات شاہی محلوں میں جشن ہوتا ہے، اور ہر صبح ایک مسیح سولی پہ لٹکا دیا جاتا ہے۔

بادلوں میں دھیمی دھیمی گرج پیدا ہوئی ہے۔

بارش کچھ تیز ہو گئی ہے۔ جموں کی پہاڑیوں کے دامن میں ہونے کی وجہ سے ہری ناگ میں بارشیں بہت ہوتی ہیں اور سردی بھی بہت پہلے آجاتی ہے۔ حالانکہ یہاں کوئی پہاڑ نہیں۔ صرف میدان ہیں۔ بے رنگ چپٹے میدان اور کھیت، کچی سڑکیں، ٹیڑھی ٹیڑھی پگ ڈنڈیاں اور گندے پُر سکون سبز جوہڑوں میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے بوسیدہ چھجوں والے مکان، کائی زدہ گنبدوں اور میناروں والی دو ایک پرانی مسجدیں، قصبے سے باہر ٹیلے کے پاس نہر کنارے کی پن چکی، چھوٹی سی منڈی، ایک بازار، کچھ اونچی نیچی پتھریلی گلیاں، چند ایک مزار، گرے ہوئے چھجے والا چونگی کا دفتر، پرانے بنچوں اور دیمک لگی میز کرسی والا تھانہ اور نعل ساز کی دُکان اور پرانی بارہ دری کے پاس پرانی طرز کا ایک چائے خانہ اور دھوپ، بارش، سردی اور بس۔ قصبہ ہری ناگ میں گھومتے ہوئے آدمی کو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اُنیسویں صدی کے کسی مغلئی گاؤں میں آگیا ہے۔ یہاں کشمیریوں کے کئی ایک گھرانے آباد ہیں۔ یہ لوگ کہیں پندرھویں سولھویں صدی میں کشمیر کی وادیوں سے ہجرت کر کے قصبہ ہری ناگ میں آباد ہو گئے

تھے۔ اور تب سے اِسی جگہ آباد ہیں۔ تقسیم سے پہلے یہ لوگ رفوگری، شال بافی، زر دوزی، شالوں کی رنگائی اور پشمینے کی خرید و فروخت کا دھندا کرتے تھے اور سال میں چھ ماہ گھر سے باہر بنگال، بنارس اور لکھنؤ میں گذارتے تھے۔ لیکن تقسیم کے بعد اِن کا کاروبار بالکل تباہ ہو گیا۔ چنانچہ کسی نے کوئی چکی الاٹ کروالی، کسی نے ڈپو کھول لیا۔ کسی نے شہر میں کٹ پیس کی دُکان کھول لی اور کوئی محض پُرانے دنوں کی یاد میں آہیں بھرنے کے لئے گھر میں بیٹھ گیا۔

لیکن ان لوگوں نے اپنی روایات اور وضع داری ہاتھ سے نہ چھوڑی تھی۔ اِن کے گھروں میں آج بھی رات کو چاول اُبلتے تھے اور صبح کو نمکین چائے پکتی تھی۔ اور چولہے میں سارا دن آگ جلتی رہتی تھی۔ تہواروں پہ اُسی طرح پکوان پکتے تھے۔ اور سردیوں میں ہر تیسرے روز شب دیگ چڑھتی تھی اور ریشِ مالو کا دن منایا جاتا تھا۔ ان کے گھروں میں آنے والے مہمان کے سامنے آج بھی سبز چائے کا سماوار، باقرخانیاں اور شیرمال اسی طرح رکھا جاتا اور میزبان عورتیں مہمان کو بار بار کہتیں۔ ہائے آپ کھاؤ نا! یہ بھی لو، وہ بھی ذرا چکھو نا!

مگر یہ باتیں بیشتر کشمیری گھرانوں میں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ اور پہاڑ کی چوٹی پر سے لڑھکتے ہوئے پتھر کی طرح ہر ٹھوکر کے ساتھ روایات کی کرچیں ہوا میں اُڑتی جا رہی تھیں۔ اس کے باوجود کچھ گھرانے اِن روایات کو بحال رکھنا مذہبی فرض سمجھتے تھے، اور وہ ہر قیمت پر اپنی وضعداری نبھائے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ صرف اپنے کلچر کے لئے زندہ ہیں اور اپنے کلچر کے لئے مر جائیں گے۔ اِن ہی میں ایک گھرانہ میر غلام حسن شاہ ہائی کورٹی کا بھی تھا۔ اس خاندان کو ہائی کورٹی اس لئے کہتے تھے کہ میر غلام حسن شاہ کا پردادا کلکتہ ہائی کورٹ کا سب جج رہ چکا تھا۔ وہ اپنے سوداگر باپ کے ساتھ بنگال کاروبار سیکھنے گیا تھا۔ کہ اس نے قانون پڑھنا شروع کر دیا اور وہیں پریکٹس شروع کر دی اور اپنی طبع زاد ذہانت اور خداداد صلاحیت کے باعث ترقی کرتے کرتے سب جج کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ اُس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا بھی باپ کے نقشِ قدم پر چلا لیکن بیرسٹری سے آگے نہ پہنچ سکا۔ اب یہ خاندان پشمینے کی سوداگری چھوڑ قانون پڑھنے لگا۔ میر غلام حسن شاہ کے والد وکالت میں بُری طرح ناکام رہے اور آپ نے پھر وہی پُرانا دھندا شروع کر دیا۔ میر غلام حسن کلکتہ میں پڑھا کرتے تھے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد آپ نے ایل۔ ایل۔ بی کیا اور باپ کی طرح آپ بھی وکالت میں ناکام رہے لیکن ناکامی کے بعد آپ نے کاروبار میں پھنسنا گوارا نہ کیا اور آئی سی ایس کے مقابلہ کی تیاری شروع کر دی۔ آپ نے اس امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور آپ کو بنگال ریمیمبر بنس میں ایک شایانِ شان عہدے پہ فائز کر دیا گیا۔ آپ نے اپنی ملازمت کا پورا عرصہ کلکتہ، کان پور، الہ آباد، لکھنؤ اور مدراس میں گذارا اور ریٹائر ہو کر قصبہ ہری ناگ پہنچے ہی تھے کہ ملک میں آزادی کی تحریک نے زور پکڑ لیا اور ایک سال بعد فسادات شروع ہو گئے اور پھر ملک تقسیم ہو گیا۔ اب پنشن کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ پرویڈنٹ فنڈ کا جھگڑا چار سال تک چلتا رہا۔ ادھر پُرانے خاندان کے رکھ رکھاؤ میں فرق آ گیا تھا۔ دونوں بڑی لڑکیاں سعیدہ اور زبیدہ بی۔ اے کرنے کے بعد گھر آن بیٹھی تھیں۔ چھوٹی لڑکی رضیہ کو ایف۔ اے کے دوسرے سال میں ہی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑ گیا تھا۔ ادھیڑ عمر باپ کے دو جوان بیٹے فوت ہو گئے تھے۔ اور وہ جوان بیٹیوں کی شادی کی فکر میں تھا۔ بنک میں جو جمع پونجی تھی ختم ہو رہی تھی۔ قصبے کی میونسپلٹی کی خالی خولی عمارت ملی ہوئی تھی۔ کپڑے کے ایک کارخانے میں معمولی سا حصہ بھی تھا۔ لیکن سُوت نہ ملنے سے کارخانہ ایک دن چلتا تھا اور تین دن بند رہتا تھا۔ اور کچھ میر غلام حسن شاہ ہائی کورٹی ویسے بھی لوگوں کو اپنی آن بان دکھانا چاہتے تھے۔ پرویڈنٹ فنڈ کا روپیہ دُور کی بات تھی۔ آپ نے اپنی بیگم کو پُرانا قدیمی مکان گروی رکھنے کا مشورہ دیا۔ پُرانی طرز کی نجیب الطرفین کشمیری عورت نے مکان گروی رکھنے سے منع کیا۔ لیکن میر صاحب راضی نہ ہوئے۔ مکان گروی رکھ کر کاغذات پر دستخط کر کے آپ گھر لوٹے ہی تھے کہ پرویڈنٹ فنڈ کے پاکستان پہنچنے کی چٹھی آ گئی۔ بیگم نے کہا۔

مکان چھڑا لائیے، میر صاحب نے فوراً جواب دیا۔

ضرور چھپڑا لائیں گے ۔ میں کل ہی شہر جاؤں گا ،

لیکن رات نے کچھ ایسے خواب دکھلائے کہ مکان چھوڑنے کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔ چنانچہ نومبر کے یہ بھیگے ہوئے ٹھٹھرتے وہ دن تھے جب میر غلام حسن شاہ ہائی کورٹی کے قصبہ ہری ناگ والے پرانے حویلی نما گھر میں زبیدہ اور سعیدہ کے بیاہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں —————— اور آسمان کو سیاہ بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا اور بوندیں پڑ رہی تھیں۔

یہ پرانا حویلی نما مکان آبادی سے ہٹ کر واقع تھا۔

اس کے سامنے سے چھوٹی سی ندی گذرتی تھی اور عقب میں زنگ آلود دیواروں پر عشق پیچاں اور گلاب کی جنگلی بیلیں جھکی ہوئی تھیں اور لیموں کا ایک پرانا باغ تھا۔ مکان کے صدر دروازے کی دہلیز گھاس میں چھپ گئی تھی اور دوسری منزل کے تمام کمرے بند تھے۔ ان پُراسرار بند کمروں میں دیواروں اور روشندانوں پر گرد کی تہیں جم رہی تھیں۔ قد آدم آئینوں پر جالی دار پردے لٹک رہے تھے اٹھارویں صدی کا کرم خوردہ فرنیچر بھورے رنگ کی موٹی چادروں میں ڈھکا ہوا تھا ——

کونوں میں ڈھیر لکڑی کے بوجھل صندوق الم غلم سامان سے بھرے ہوئے تھے اور ان کے اوپر جالا اٹک رہا تھا۔ لمبے چوڑے گرد آلود پلنگوں پر خاندان کے بڑے بوڑھوں کی تصاویر اوندھے منہ پڑی تھیں اور اُن کے نیچے ٹڈیوں نے انڈے ونڈے دے رکھے تھے۔ اندھیری راتوں کو جب تیز زمستانی ہوا کے جھونکے روشندانوں اور بند کھڑکیوں کی درزوں میں سے اندر داخل ہوتے تو دیواروں پر گرے ہوئے پردے آہستہ سے پھڑپھڑاتے اور محسوس ہوتا گویا ان ویران کمروں میں عہدِ پارینہ کی گم شدہ روحیں سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ یہ کمرے مدّتوں سے بند پڑے تھے اور ان میں کبھی کوئی داخل نہ ہوا تھا۔ وقت کا سیلاب ان گمنام قبروں کو اپنے ساتھ بہا کرلے گیا تھا۔ پہلی منزل کی اونچی چھتوں بھدّی دیواروں اور موٹے گرم قالینوں سے ڈھکے ہوئے فرشوں والے کمروں میں زندگی اور صفائی اور روشنی تھی۔ یہ کمرے صاف ستھرے، قیمتی اور بوجھل سامان سے بھرے ہوئے تھے۔ یہاں دروازوں پر گہرے قرمزی رنگ کے بھاری پردے لٹک رہے تھے اور اُن کے پٹ کھلتے وقت کوئی آواز نہ دیتے تھے۔ وہ یوں نرمی سے کھل جاتے جیسے آنے والے کو خاموشی سے اندر داخل ہونے کا مشورہ دے رہے ہوں۔ یہاں کی فضا میں خواب ایسی پُراسرار تن آسانی رچی ہوئی تھی اور ان کمروں میں داخل ہو کر آدمی کو محسوس ہوتا تھا جیسے وہ برفباری کی رات میں گرم گرم خوشبودار قہوے کا خواب دیکھ رہا ہو۔ جیسے وہ ٹھٹھرتی یخ بستہ تیز ہواؤں میں سے گذر رہا ہو اور کسی نے اسے نیم گرم ٹی کوزی میں چھپا لیا ہو۔ جیسے وہ سماوار میں داخل ہو گیا ہو۔ اس پرانے حویلی نما مکان کا ہر کمرہ سماوار کی طرح پُرسکون، نیم گرم اور معتدل تھا۔ اور ایسی فضا میں پرورش پانے سے گھر کے ہر فرد میں جذبات کا اعتدال اور آہنگ پایا جاتا تھا۔ یہاں کبھی کوئی آپس میں رشتہ داریوں کے موضوع پر نہیں جھگڑا تھا۔ یہاں کبھی کسی نے غصّہ میں سُرخ ہو کر دوسرے پر کفگیر یا جلتی ہوئی لکڑی سے حملہ نہیں کیا تھا۔ یہاں کبھی کسی بچے کے ایک دم تیز تیز رو پڑنے کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ یہاں کے مکین سرِ شام کھانا کھا کر اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تھے اور لیمپ بجھا دیئے جاتے تھے۔ صرف مکان کی پُشت پر باورچی خانے کا لیمپ جل رہا ہوتا تھا۔ جہاں بوڑھی خادمہ اپنی بیٹی لالی کی مدد سے برتن صاف کر رہی ہوتی تھی۔ پَو پھٹے جب بستی کی طرف سے مرغوں کے اذانیں دینے کی صدائیں آتیں تو اس حویلی نما مکان کے ویران آنگن سے کوئی مرغ جواب میں اذان نہ دیتا۔ بند کھڑکیوں کے اندر اور باہر ٹوٹتی رات کے آخری سائے چپ چاپ مدھم ہوتے رہتے اور لیموں کے باغ میں پیڑوں کی ٹہنیوں پر سے شبنم ٹپکتی رہتی اور پھر باورچی خانے کی چھت سے لٹکتے ہوئے لیمپ کو دیا سلائی

دکھائی جاتی۔ تیل کے لیمپ کی دھیمی دھیمی نرم روشنی میں خادمہ کی بیٹی لاکی آگ جلاتی۔ چائے کے لئے پانی رکھتی اور الماری میں سے چینی کے برتنوں کو نکالکر صاف کرنا شروع کر دیتی۔ بستی کی مسجدوں کے میناروں پر دن کی روشنی کا پھیکا اجالا چھلکتا تو بوڑھی خادمہ سعیدہ، عبیر، زبیدہ عبیر اور رضیہ عبیر کے کمروں میں جاکر انہیں بڑی نرمی اور پیار سے باری باری جگاتی۔

' اُٹھیئے آپی۔ صبح ہوگئی '

سب سے آخر میں وہ گھر کی مالکہ بڑی آپو کی خواب گاہ کا دروازہ آہستہ سے کھٹکھٹاتی۔

' آپو جی اذان ہوگئی '

چالیس پینتالیس سال کی ادھیڑ عمر، سرخ وسپید مالکہ بڑے وقار سے اپنا مہارانیوں ایسا بوجھل جسم لئے ریشمی، نرم اور گرم لحاف میں سے باہر نکلتیں۔ غسل خانے میں وضو کے لئے پانی گرم ہوتا۔ وضو کرنے کے بعد وہ نماز پڑھتیں اور نماز کے بعد وہیں مصلے پر تلاوتِ قرآن پاک میں مصروف ہو جاتیں۔ تلاوت کے وقت ان کے چوڑے اور بارعب چہرے پر طلوعِ صبح ایسی مقدس روشنی پھیل جاتی۔ ان کے سیاہ و سپید بال پیشانی تک سفید شال میں ڈھکے ہوتے اور ان کے لب بند ہوتے اور جسم بے معلوم انداز میں جھول رہا ہوتا۔ اتنی دیر میں میر غلام حسن شاہ بھی نماز سے فارغ ہو جاتے اور لمبا گرم کوٹ پہن، سرخ ترکی ٹوپی سر پر رکھ، چھڑی ہاتھ میں لے سیر کے لئے باہر نکل جاتے۔

سب سے بڑی بہن زبیدہ نماز سے فارغ ہو کر اپنی ماں کے پہلو میں بیٹھ کر تلاوت میں مصروف ہو جاتی۔ لیکن سعیدہ بار بار جگانے پر بھی نہ اٹھتی، اس کے سرخ وسپید خواب آلود چہرے پر بالوں کی لٹ بکھری ہوتی اور وہ ایک ٹانگ لحاف سے باہر نکالے ریشمی تکیے کو پیٹ کے ساتھ بھینچے ایک آدھ بار کچھ بڑبڑاتی اور ٹانگ لحاف کے اندر لے جاکر پھر سو جاتی۔

جب بادلِ نخواستہ اُسے اُٹھنا ہی پڑتا تو وہ پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھ جاتی اور لحاف میں سے گرم شال کھینچتے ہوئے بار بار جمائیاں لینے لگتی۔ وہاں سے اُٹھ کر لڑکھڑاتے، بے ربط قدم اٹھاتی سنگار دان کے سامنے جاکر بیٹھ جاتی اور آئینے پر جھک کر چہرے پر پھیلے ہوئے مہاسوں اور کیلوں کا جائزہ لینا شروع کر دیتی۔ وہ ہر رات بے شمار کریمیں لگا کر سوتی تھی اور ہر صبح گالوں پر کوئی نہ کوئی نیا کیل نکلا ہوتا تھا۔ اسے اپنے اچھے بھلے چہرے کی اس بدنمائی کا شدید احساس تھا اور وہ بہت کم آئینے کے سامنے ہوا کرتی تھی۔

بوڑھی خادمہ جب رضیہ کے کمرے میں داخل ہو کر اس پر آہستہ سے جھک کر سرگوشی ایسی آواز میں کہتی۔

' چھوٹی آپی! اُٹھو بیٹی......'

تو رضیہ اپنی نیند بھری بھیگی بھیگی سیاہ آنکھیں کھول دیتی۔ جیسے وہ پہلے ہی سے جاگ رہی ہو۔ اور وہ سوچتی کیا وہ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی؟ کبھی کبھی خادمہ کے جگانے پر اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ پہلے ہی سے جاگ رہی ہو۔ جب سے پیدا ہوئی ہو تب سے جاگ رہی ہو اور کبھی نہ سوئی ہو۔ بوڑھی خادمہ لحاف اچھی طرح تہہ کرتے ہوئے کہتی۔

' میری بچی رضیہ تو سوتی ہی نہیں '

لیکن رضیہ ضرور سوتی تھی۔ دن کے وقت سوتی تھی۔ جاگتے ہوئے، باتیں کرتے، کھاتے، سوچتے، چائے پیتے، کتاب پڑھتے اور کھلی کھڑکی میں سے باہر باغ میں دیکھتے ہوئے سوتی تھی۔ ہمیشہ سوئی رہتی تھی۔ اُسے کبھی کبھی شبہ ہونے لگتا کہ وہ کبھی جاگی بھی ہو۔ بچپن ہی سے اس کا جسم کمزور، دبلا اور نازک تھا۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ہمیشہ بیمار رہی تھی۔ اور ڈاکٹروں کی کڑوی دوائیاں پیتی رہی تھی۔ مسلسل بخار میں مبتلا رہنے سے اسے موت سے ڈر آنے لگا

تھا اور زندگی سے محبت ہو گئی تھی اور وہ خواب کے عالم میں رہنے لگی تھی۔ وہ قدرتی طور پر تنہائی پسند تھی اور اسکول میں اپنی ہم عمر سہیلیوں سے بہت کم ملتی تھی۔ اُسے ہر سہیلی صحت مند، خوبصورت اپنے سے زیادہ خوش قسمت معلوم ہوتی تھی اور وہ کسی سے گھُل مل نہ سکی تھی۔ اس نے خیال ہی خیال میں اپنی چند ایک سہیلیاں بنا رکھی تھیں، جن سے وہ تنہائی میں باتیں کیا کرتی۔ اسکول سے گھر آ کر وہ اپنے کمرے میں جا کر چُپ چاپ کھڑکی کے پاس کورس کی کتاب کھول کر بیٹھ جاتی اور خواب دیکھنے شروع کر دیتی۔ پھر ایکا ایکی وہ چونک کر فیل ہو جانے کے ڈر سے کتاب پڑھنے لگتی۔ رات کو ان کی پُرانی خادمہ اسے باورچی خانے میں لیمپ کی دھیمی روشنی میں پریوں اور بھوتوں کی کہانیاں سُنایا کرتی۔ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹتے ہی رضیہ کو کہانی کی پریوں کا خیال بھول جاتا اور وہ بھُوتوں کے خوفناک تصوّر سے ڈرنے لگتی اور جلدی سے لحاف مُنہ کے اُوپر کر لیتی۔ پھر اسے اپنے پُرانے حویلی نما مکان کے گرد آلود ویران کمروں کا خیال آتا اور وہ دیکھتی کہ ان کمروں میں ایسی بدصورت چہروں والی کبڑی عورتیں چکّر لگا رہی ہیں جن کے چہروں پر مکڑیوں نے جالے بُن رکھے ہیں اور اس کا جسم خوف سے ٹھنڈا ہو جاتا۔ وہ بھاگ کر اپنی خیالی سہیلیوں کے پاس پہنچ جاتی اور ان کی باتوں میں خود کو بھلا دیتی۔ بچپن ہی سے رضیہ ذہنی طور پر اُلجھی ہوئی تھی۔ دن بھر وہ اسکول اور گھر میں خود فراموشی کے عالم میں وقت گذارتی۔ وہ بات کرتے کرتے فقرہ بھُول جاتی اور غسل خانے میں ٹونٹی کھول کر نہانا بھُول جاتی۔ جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی اسکی یہ تمام ذہنی اُلجھنیں ترقی کرتی گئیں اور گھر کی خاموش، جامد اور پُر اسرار فضا نے ان اُلجھنوں کی زیادہ سے زیادہ پرورش کی۔ اب وہ کالج میں آ گئی اور یہاں بھی منجمد، سہمی ہوئی ویران تنہائی اس کے ساتھ آ ئی۔ پڑھائی ختم کر کے وہ سیدھا ہوسٹل کے کمرے میں آ جاتی اور دروازہ بند کر کے کتابوں میں کھو جاتی۔ اس کا ادب کا مطالعہ ہر وقت کتابیں پڑھتے رہنے سے کافی وسیع ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں اُسے ایڈگر ایلن پو بہت پسند تھا۔ لیکن بہت جلد وہ اس کی کتابوں سے خوف کھانے لگی اور اُسے پو کے نام کے ساتھ ہی اُس کالی بلّی کا خیال آ جاتا جس کی لاش آتشدان میں دفن ہو۔ پہلے پہل اُسے ناولوں کی انگریزی پڑھتے ہوئے بڑی دِقّت کا سامنا کرنا پڑتا۔ ہر دوسری سطر پر اسے ڈکشنری کھولنا پڑتی۔ مگر اُس نے ہمت نہ ہاری۔ کتابوں نے اسے بڑی تسکین دی تھی۔ چنانچہ اس نے بڑی محنت سے ادبی انگریزی پر کافی عبور حاصل کر لیا اور ایف اے میں ہی وہ ایم اے کی لڑکیوں کا مقابلہ کرنے لگی۔ اس نے انگریزی ادب کے وکٹورین عہد کے تمام ناول پڑھ ڈالے۔ ان ناولوں کی پُرسکون، پُر امن اور گھری تن آسان فضا نے گویا رضیہ کے کھولتے ذہن پر ٹھنڈا میٹھا ہاتھ رکھ دیا۔

یہاں سے گذر کر اس نے تاریخ کی طرف رُخ کیا۔ تاریخ میں اس نے قبل از تاریخ کے دَور کو چھوڑ کر مصر اور ہند سے مطالعہ شروع کیا اور یونان اور روم سے ہو کر ہسپانیہ میں آ کر رُک گئی۔ غرناطہ کے آخری مُور شہنشاہ کے زوال کے ساتھ ہی اس نے تاریخ کی کتاب بند کر دی اور اپنے آپ کو قدیم ایتھنیز، ممفس، روم اور غرناطہ کا شہری سمجھنا شروع کر دیا۔ یورپ کی پندرھویں، سولھویں اور سترھویں صدی میں اُسے سوائے درباری سازشوں اور خانہ جنگیوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیا تھا۔ اُسے قدیم یورپ کے کسی شہر میں زیتون کے سایوں میں بیٹھ کر ادب اور فلسفہ اور موسیقی پر گفتگو کرنے والے رومی اور یونانی فلسفی دکھائی نہ دیئے۔ روسی ادب میں سے اس نے تورگنیف اور چیخوف کو چن لیا۔ ٹالسٹائی کی متضاد باتیں اور عظیم اظہار بیان اسکی سمجھ سے باہر تھا۔ گورکی اسے خشک لگا اور دستوئیفسکی کی دو کتابیں پڑھنے کے بعد اُسے اِس خوفناک مصنّف سے ڈر آنے لگا۔ اس کی کتابیں رضیہ کے ذہن میں اُن تمام اُلجھنوں کو بیدار کر دیتیں جنھیں اس نے قدیم یونانی کھنڈروں کے عظیم الشان ستونوں میں دفن کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک عرصہ تک وہ جبران سے بھی متاثّر رہی لیکن پھر اس سے اُکتا گئی۔ اس کے ذہن کو سب سے زیادہ تسکین فرانسیسی ادب نے دی۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ ایک دم درختوں کی گھنی گھنی، گہری گہری، سوئی سوئی چھاؤں میں کسی ساکن پانی والے پُر اسرار چشمے کے کنارے آ نکلی ہو اور ہر طرف نیلے پھُول اور بھیگی بھیگی پُر اسرار دُھند پھیلی ہوئی ہو۔ اپنے ملک کے اُسے تمام ایسے ادیب پسند تھے جن کی کہانیوں اور ناولوں میں پُر اسرار دھند اور

درختوں کی خواب آلود چھاؤں موجود تھی۔ مذہب پر اس نے پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ اس کا عقیدہ متزلزل ہونے لگا۔ چنانچہ اس نے فوراً کتاب پھینکی اور موم بتی جلا کر خدا سے دُعا مانگنا شروع کر دی کہ وہ اسے گمراہ ہونے سے بچائے رکھے۔ مذہب میں بھی اُسے ایک خاص قسم کی کلاسیکی رومانیت سے پیار تھا۔ نماز پڑھنے کی بجائے وہ پیغمبروں کو نیلی نیلی دھند میں ہاتھ اُٹھائے پہاڑیوں پر کھڑے ہو کر عبادت کی تلقین کرتے دیکھنا زیادہ پسند کرتی تھی۔ وہ تصوّر ہی تصوّر میں اِن مقدّس نورانی چہرے والوں کو فرشتوں کے جُھرمٹ میں سنہری ستاروں کے درمیان دیکھتی اور اس کے ہونٹ وفورِ جذبات سے کانپنے لگتے۔

پلنگ پر نیم دراز کتاب پڑھتے پڑھتے جب رضیہ تھک جاتی تو اپنی روز کی ڈائری لکھنا شروع کر دیتی۔ وہ بڑی گرمجوشی سے سارے دن کی بے رنگ کارروائی درج کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ اسکی ڈائری کبھی کوئی نہ پڑھے گا۔ بلکہ وہ بیشتر خود بھی کبھی نہ پڑھتی تھی۔ اس کے باوجود وہ ہر رات اپنی ڈائری لکھا کرتی تھی۔ اور اب تک وہ کئی کاپیاں سیاہ کر چکی تھی۔ رات کا کھانا دوسری لڑکیوں کے ساتھ خاموشی سے کھانے کے بعد وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی آتی اور سونے سے پہلے بستر پر دو زانو ہو کر بیٹھ جاتی اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی۔ رضیہ کو اُس چھپی ہوئی مہربان ہستی سے بڑی محبت تھی۔ جو ہمیشہ اسے باہنیں پھیلا کر اپنی پُر امن محبت کی آغوش میں لے لیتی تھی اور جو اسکی ہر خطا خندہ پیشانی سے معاف کر دیتی تھی۔ کبھی کبھی اُسے عجیب عجیب قسم کے شکوک و شبہات گھیر لیتے۔ کتابوں میں پڑھی ہوئی سنگدل، بے رحم باتیں کتابوں سے نکل کر نیزوں اور برچھیوں سے اس کے عقیدہ کی دلہن پر حملہ آور ہوتیں اور وہ سہم کر سکڑ جاتی اور غیر شعوری طور پر قرآن کی کوئی آیت پڑھنا شروع کر دیتی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی کہ پلک جھپکنے میں ہر طرف روشنی اور گہرا امن طاری ہے اور کتابوں سے نکلی ہوئی بے رحم فوج کے خونخوار سپاہی غائب ہو چکے ہیں۔ دُعا مانگنے کے بعد وہ پہلے معدہ صاف کرنے والی دوائی پیتی۔ پانچ منٹ بعد سا رپڈون کی خواب آور گولی پانی سے نگلتی اور بتی بُجھا کر نیند کی راہ دیکھنے لگتی۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی جب نیند نہ آتی تو وہ ایک گولی اور نگل لیتی۔

کالج چھوڑنے کے بعد رضیہ اپنے قصبہ والے قدیم مکان میں آگئی تھی اور اس نے اپنے آپ کو باقی دنیا سے الگ کر کے تاریخ ادب، فلسفہ اور موسیقی کی ضخیم کتابوں کی چار دیواری میں بند کر لیا تھا۔ اُسے اپنے پُرانے مکان اور اپنی بارُعب، شفیق آنکھوں والی ماں اور باپ سے محبت تھی۔ اُسے سعیدہ اور زبیدہ سے بھی پیار تھا۔ لیکن وہ اِن لوگوں سے بہت کم بولتی تھی اور اپنے ہی خیالات میں گم رہتی تھی۔ اِن سے باتیں کرتے ہوئے بھی وہ اُن اجنبی جزیروں کے تصوّرات میں گم ہوتی جہاں اُس کے خیال میں آج تک کسی انسان نے قدم نہیں رکھا تھا۔ اُسے اپنی دوسری بہنوں کی طرح نہ تو اچھے اچھے کھانوں کا شوق تھا اور نہ قسم قسم کے بیش قیمت کپڑے پہننے کی ہوس تھی۔ اسے صرف ایک ہی شوق تھا۔ پڑھنا اور خواب دیکھنا، پھر پڑھنا اور پھر خواب دیکھنا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سوفوکلیس کے کسی المیّہ ڈرامے کا کوئی کردار ہے جو اپنے کرم خوردہ مسوّدے سے باہر آگیا ہے اور پھر وہاں جانے کو بے قرار ہے۔

رات زیادہ گہری ہو گئی ہے۔ بارش بدستور ہو رہی ہے۔ آسمان اور زمین کو ایک تاریک بادل نے ڈھانپ رکھا ہے۔ بھیگی ہوئی سرما کی تیز ہوا اُسی طرح چل رہی ہے۔ قصبے کی گلیاں سنسان ہیں اور مکانوں کے پرنالوں سے بارش کا پانی مسلسل شور کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ پرانے

حویلی نما مکان کی پہلی منزل کے تمام لیمپ بجھ چکے ہیں۔ باورچی خانے کی کھڑکی بند ہے اور روشندان پر اندھیرا ہے صرف رضیہ کے کمرے کا لیمپ جل رہا ہے۔ اور اُس کے روشندان میں سے ہلکی بارش کا عکس باہر بارش میں ٹپکتے ہوئے لیموں کے پُرانے درختوں پر پڑ رہا ہے کمرے کی کھڑکی بند ہے۔ اندر کی طرف گہرے قرمزی رنگ کا بھاری پردہ گرا ہے اور اس کے سامنے ہی رضیہ سیاہ آبنوسی میز پر جُھکی کوئی کتاب پڑھ رہی ہے۔ اُس کا لباس ہلکے زرد اور فاختائی رنگ کا ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ بھی ہلکا زردی مائل سفید ہے۔ جسم دُبلا اور کھُلی کتاب کی ایک طرف سمٹی ہوئی اُنگلیاں نازک اور لمبی لمبی ہیں۔ لمبے سیاہ بال دوپٹے میں چھپے ہوئے ہیں۔ یہ دوپٹہ کچھ اس طرح اوڑھا گیا ہے کہ کشادہ پیشانی کا نصف حصّہ بھی چھپ گیا ہے۔ کانوں میں سنہری رنگ کی دو چھوٹی چھوٹی بالیاں ہیں۔ بڑی بڑی سوگوار آنکھیں کتاب پر جُھکی ہوئی ہیں اور مختصر، باریک، سیدھی کشمیری ناک کے ملائم بہاؤ میں ایک عجیب قسم کا کلاسیکی اسلوب ہے۔ دُبلے چہرے پر زرد گلاب کی افسردگی اور پت جھڑ کی دھوپ کی ملول چمک ہے۔ یہ چہرہ ایک ایسی ویران جھیل سے مشابہ ہے جس کی سطح پر کہیں کہیں زرد پتے بکھرے ہوئے ہوں، اور جس کی تہہ میں گھنی جھاڑیوں کی اُلجھی ہوئی پیچیدہ ٹہنیاں صاف دکھائی دے رہی ہوں۔ میز کی ایک جانب کتابوں کی چھوٹی سی ڈھیری لگی ہے اور کچھ کاپیاں پڑی ہیں اور دوسری جانب اخروٹ کی لکڑی کے بنے ہوئے چنار کے ایک چوڑے پتے میں سار بیڈ دن کی کچھ گولیاں رکھی ہیں۔ کانسی کے ایک لمبوترے گلدان میں گلاب کی بیل کے دو بن پھول مُرجھا رہے ہیں۔ پاس ہی تپائی پر چھوٹی چھوٹی نیلی پنیوں والی چینی کی ایک خوبصورت چائے دانی اور اُسی طرز کا ایک پیالہ رکھا ہوا ہے۔ ذرا پرے گہرے سُرخ گرم قالین پر سعیدہ اور زبیدہ، دونوں بہنیں بیٹھیں لالٹین کے ساتھ مل کر اپنے عروسی جوڑوں پر سچا دٹی ستارے ٹانک رہی ہیں۔ بھرے بھرے جسم والی گوری چٹی سعیدہ پاس رکھی پلیٹ میں سے مربّہ لگے بسکٹ بھی کھا رہی ہے۔ کام بھی کر رہی ہے۔ اور باتیں بھی کر رہی ہے۔ زبیدہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے اور صرف ہوں یا ہاں میں سعیدہ کی باتوں کا جواب دے رہی ہے۔

"بھئی باجی یہ کیا ہوا؟ تم کوئی بات کیوں نہیں کرتیں؟"

زبیدہ ہونٹوں پر اُنگلی رکھے اسے آہستہ سے کہہ رہی ہے۔

"رضیہ پڑھ رہی ہے۔"

اور سعیدہ بڑبڑانے لگتی ہے۔

"وہ تو ہر وقت پڑھتی رہتی ہے!"

اور کالی کالی بلّی ایسی آنکھوں والی لالٹین دبے دبے ہنس رہی ہے۔ رضیہ کے گول کندھوں پر سے سرمئی رنگ کی گرم شال نیچے کھسک آئی ہے۔ وہ اُسے اُوپر کھینچ رہی ہے اور سعیدہ نچلے ہونٹ پر سے مربّہ پونچھتے ہوئے کہتی ہے۔

"رضیہ! بھئی ذرا ہمارا ہاتھ بھی بٹا دُنا"

رضیہ اپنی بڑی بہن کی بات کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ جیسے اس نے کچھ سُنا ہی نہیں۔ زبیدہ جلدی سے بول اُٹھتی ہے۔

سعیدہ تم چُپ بھی رہو گی یا نہیں؟

سعیدہ فوراً کہتی ہے "نہیں"

اور بسکٹ چبانے لگتی ہے اور باہر بجلی ایک بار پھر چمکتی ہے اور بادلوں کی دھیمی دھیمی گرج سُنائی دیتی ہے اور رضیہ O' Shanghnessy کی یہ سطریں پڑھ رہی ہوتی ہے۔

We are the music-makers

And we are the dreamers of dreams,

Wandering by lone sea-breakers,

And sitting by desolate streams.

World-losers and world forsakers.

زبیدہ اور سعیدہ کی شادیاں بڑی دھوم دھام سے ہوئیں۔ دونوں شادیاں ایک ہی روز ہوئیں اور لاہور سے دونوں کی باراتیں ایک ہی وقت میں آئیں۔ قصبے کے سٹیشن سے ہائی کورٹیوں کے حویلی نما پرانے مکان تک کچی سڑک پر کاروں کی قطار بندھ گئی۔ میر غلام حسن شاہ ہائی کورٹی نے جی کھول کر روپیہ خرچ کیا۔ اور یوں ثابت کر دیا کہ ہائی کورٹیوں کا خاندان لاہور کے کسی بڑے کشمیری خاندان سے پیچھے نہیں ہے۔ دونوں بہنوں کو جہیز میں اس قدر سامان ملا کہ اُسے بُک کرتے ہوئے طرحدار سٹیشن ماسٹر کو تین بار پنسل بنانا پڑی اور قصبے کے گھروں میں کئی روز تک اس کے چرچے رہے۔

اُسی رات بوسیدہ حویلیوں کی گھٹی ہوئی چھت کے نیچے ضلع رہتک کے پناہ گیر گوالے کے پہلو میں لیٹی ہوئی اُس کی بیوی نے اپنے خاوند سے لپٹتے ہوئے کہا۔

”کلوا رے! ہماری سادی ایسی نا ہئیں ہوئی رے“

اور کلوا اسے پرے دھکیلتے ہوئے بولا۔

”گھانس چر گئی ہے کیا؟“

قدیم کشمیری روایات کے مطابق دُلہنوں کو پَو پھٹنے سے پہلے رخصت کر دیا گیا۔ رات بھر صدیوں بوڑھے فلسفی ایسے مکان کی پہلی منزل میں دبی دبی ڈھولک دھمکتی رہی۔ لیمپوں، موم بتیوں اور شمعدانوں کی بھرپور چمکیلی روشنی میں کراچی، پشاور، لاہور اور پنڈی سے آئی ہوئی رشتہ دار عورتوں، بھڑکیلے کپڑوں والی بچیوں اور بے باک چہروں اور مضبوط جسموں والی جوان لڑکیوں نے بند کمروں میں کشمیری، پشتو، پنجابی اور فلمی گیت گائے اور جی بھر کر شور مچایا۔ رقص کیا۔ باتیں کیں اور کھایا اور پھر ٹانگیں پسار کر سو گئیں اور خرّاٹے بھرنے لگیں۔ جب رات ڈھل رہی تھی۔ اور ستاروں کا نور ٹھٹھرتی رات کی تنہائیوں میں زرد غبار بن کر اُڑا جا رہا تھا تو سفید بالوں والی ایک بوڑھی عورت نے کانپتے ہونٹوں سے ڈھولک کی بے ربط تال پر ایک پُرانا کشمیری گیت گایا۔ جس میں بچپن کے گمشدہ دنوں کا سوگ منایا گیا تھا اور جب وہ اس بند پر پہنچی تو اس کی عمر رسیدہ پلکوں میں آنسو تیرنے لگے۔

ہم تو جنگل میں زعفران چُننے نکلی تھیں،

کہ راستہ بھول گئیں،

ہمارے سروں پر سفید برف ہے

اور برف میں پھول دفن ہیں،

سارے پھول دفن ہیں،

یہ بوڑھی عورت دوسری عورتوں کے ساتھ آتشدان کے پاس قالین پر بیٹھی تھی۔ گیت ختم ہو گیا۔ کسی عورت نے کوئی بات نہ کی۔ سب چپ ہو گئیں اور پرانی یادوں میں کھو گئیں۔ دو جوان لڑکیاں ریشمی کمبل اوڑھے قالین پر ایک دوسری سے لپٹی سو رہی تھیں۔ کونے والے پلنگ پر سر تکیے پر رکھے۔ آنکھیں بند کئے رضیہ نے اس بوڑھی عورت کا پورا گیت سنا تھا جو جنگل میں زعفران چننے نکلی تھی اور راستہ بھول گئی تھی۔ اس گیت نے رضیہ پر بڑا اثر کیا تھا۔ اسکی گرم پلکوں میں بھی آنسوؤں کی نمی کپکپانے لگی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اٹھ کر اس بوڑھی عورت کے پاس جا کر بیٹھ جائے اور اس کا جھرّیوں بھرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آہستہ سے پوچھے، بڑی آپا! مجھے بھی اس جنگل کی راہ بتاؤ جہاں زعفران اُگتا ہے۔ اور جہاں پہنچکر کنواریاں گھر کا راستہ بھول جاتی ہیں۔ لیکن وہ گرم لحاف میں چپ چاپ لیٹی رہی اور زرد گیت کی زعفرانی مہک نے اسے اپنے خشک پتوں میں سمیٹ لیا۔ ساتھ والے کمرے میں اسکی دونوں بڑی بہنیں دلہنیں بنی بیٹھی تھیں اور اسے اُن کی سہیلیوں کی ہنسی، قہقہوں اور باتوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایکا ایکی رضیہ کے ذہن میں ایک عجیب سا خیال پیدا ہوا۔ کیا ایک روز اُسے بھی اسی طرح دلہن بنا کر سجایا جائیگا اور وہ بھی کسی اجنبی کے ساتھ روانہ کر دی جائے گی؟ رضیہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک وقت آئیگا جب وہ اپنی ساری انفرادیت کو کتابوں کے پرانے جزدانوں میں بند کر کے رکھ دے گی۔ اور کسی دوسرے کے نقشِ قدم پر چلنا شروع کر دے گی۔ اُس نے اپنی شادی کے بارے میں کبھی اتنی سنجیدگی سے غور نہ کیا تھا۔ وہ چونکّی سی ہو گئی۔ یہ شادی تو اُسکی موت ہو گی۔ لیکن اس گھر میں رہتے ہوئے وہ اس موت سے نہیں بچ سکے گی۔ پھر کیا ہو؟ کیا وہ چپ چاپ مر جائے؟ رضیہ کے جسم میں شادی کے خیال سے نا امیدی کے باوجود ایک کیف آور کپکپی سی دوڑ گئی۔ اس نے سوچا کہیں اس کے اندر عورت مر تو نہیں گئی؟ لیکن اُسے یقین تھا کہ یہ عورت زندہ ہے۔ کبھی کبھی غسل خانے میں نہاتے ہوئے وہ اپنے دبلے لیکن سڈول اور کنوارے بدن کے خم و پیچ کو بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتی تھی۔ اس کے جسم کے خطوط میں بڑا بہاؤ اور ردھم تھا۔ گول شانوں پر سے نیچے کو پھسلتی ہوئی قوسیں کمر پر آ کر مل گئی تھیں اور یہاں سے پھر دو نصف دائرے کولھوں پر سے ابھرتے ہوئے پنڈلیوں تک چلے گئے تھے۔ وہ اپنے جسم پر یونانی شہزادیوں کی طرح بڑے وقار سے آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتی اور جب اس کا ہاتھ اپنی چھوٹی چھوٹی کچے اناروں ایسی چھاتیوں پر پہنچتا تو اس کے سارے بدن میں سنسنی سی پھیل جاتی اور وہ کانپنے لگتی اور جیسے کچے انار بھی اپنی نازک ٹہنیوں پر کانپنے لگتے۔ اس لمحے رضیہ کا دل گہری، انجیر فانی اور لطیف مسرت سے لبریز ہو جاتا اور اُسے یقین ہو جاتا کہ ابھی اس کے اندر وہ شئے زندہ ہے، جس کے مر جانے سے اس کا سارا علم، سارا آرٹ اور سارا فلسفہ راکھ کی بجھی ہوئی ڈھیری بن کر رہ جائے گا۔ وہ اپنے جسم کے معبد میں اس آگ کو ہمیشہ جلائے رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ اس آگ میں اپنی کتابوں کا ایک ورق جلتے دیکھنا نہ چاہتی تھی۔ کسی وقت رات کو، لیمپ کی روشنی میں پڑھتے ہوئے اُسے یوں لگتا جیسے کوئی بڑا ہی خوبصورت چمکیلی آنکھوں والا بچہ کرسی کا سہارا لئے کھڑا ہے۔ اور اپنے ننھے ہاتھ سے اسکی شال کھینچ رہا ہے۔ وہ چونک کر دائیں بائیں دیکھتی اور وہ خوبصورت بچہ غائب ہو جاتا لیکن ایسے لمحات بہت کم آتے تھے۔ اسے ہر کتاب سے اپنے بچوں ایسی محبت تھی اور قدیم یونان کا ہر دلیر جرنیل اس کا محبوب تھا۔ جس کے ساتھ رتھ میں سوار ہو کر اس نے فرات کی وادی کو کئی بار عبور کیا تھا اور بابل کے شاہی مندروں میں دیوتاؤں کے قدموں پر اپنے خون کے چھینٹے پھینکے تھے اور حبشی غلاموں کے کندھوں پر رکھی ہوئی زر فشاں عماری میں بیٹھ کر نینوا کے زندگی خیز بازاروں کی سیر کی تھی۔ چنانچہ آج بھی اپنی شادی اور بچوں کے تصور سے اُسے ہنسی آ گئی۔ فلابیر کی طرح اُس نے بھی آرٹ کے ساتھ بیاہ رچا رکھا تھا اور جس کی شادی ہو چکی ہو، اُسے شادی کی کیا ضرورت! رضیہ نے آنکھیں کھول کر کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ آتشدان میں آگ مدھم پڑ گئی تھی اور بوڑھی عورتیں سماوار میں سے نمکین چائے پیالیوں میں انڈیل رہی تھیں۔

شادی بیاہ کا ہنگامہ ختم ہو گیا اور پرانے گھر کو ایک بار پھر پر اسرار خاموشی اور سرد تنہائیوں نے گھیر لیا۔ رضیہ ایک بار پھر اپنے خیالی اجنبی جزیروں میں نکل گئی۔ لیکن اب اس مکان کی مسلسل متانت اور خاموشیوں میں فرق آگیا تھا۔ زبیدہ کا خاوند ہر ہفتہ کی شام کو اپنی کار میں بیٹھ کر قصبے میں آدھمکتا اور ہفتہ کی رات اور اتوار کا پورا دن اپنی بیگم کے ساتھ وہیں بسر کرتا۔ رضیہ کی تنہائی مجروح ہو رہی تھی۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ کم سخن اور گھر بلو رکھ رکھاؤ کی پابند زبیدہ کا موٹا، بھدا ہٹا کٹا خاوند لاہور کے بڑے ہسپتال میں نائب سرجن تھا اور سوائے اپنے کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ وہ پھٹی ہوئی بلند آواز میں بات کرتا، وحشیوں کی طرح کھاتا اور کھانے کھاتے پاگلوں کی مانند پورے جبڑے کھول کر قہقہے لگاتا اور آنکھیں پونچھتا ہوا پھر کھانے پر ٹوٹ پڑتا۔ اُس کے سارے جسم پر چھوٹے چھوٹے سیاہ گھنگھریالے بالوں کا ایک جنگل اُگا ہوا تھا۔ وہ بے تحاشہ سگریٹ پیتا تھا۔ اُس کے گھٹے ہوئے ماتھے اور بھدی ناک پر ہر وقت پسینہ آیا رہتا۔ جسے وہ بائیں ہاتھ سے پونچھ کر دوسری طرف چھڑک دیا کرتا۔ محفل میں بیٹھے اُسے صرف اپنا خیال ہوتا۔ چنانچہ کئی بار اُس نے بڑی آپا اور میر صاحب کی موجودگی میں ہی اپنے یورپ کے قیام کی شراب اور آوارہ عورتوں کے قصے سنانے شروع کر دیئے اور زبیدہ نے ہر بار انتہائی دور اندیشی سے باتوں ہی باتوں میں موضوع بدل دیا۔

رضیہ کو زبیدہ کا ڈاکٹر خاوند انتہائی ناپسند تھا۔ لیکن وہ اپنی بڑی بہن کی خاطر اس کی ہر بات تحمل سے سُنتی اور خندہ پیشانی سے اُس کا جواب دیتی۔

بات بات پر بھڑک اُٹھنے والی، مزاج کی گرم اور طبیعت کی تیز سعیدہ کا خاوند لاہور کے ایک مشہور کالج میں انگریزی ادبیات کا پروفیسر تھا۔ وہ لمبے چوڑے مگر پتلے دُبلے جسم کا ایک شرمیلا نوجوان تھا۔ جو بہت کم بات کرتا تھا اور بات کرتے ہوئے کنواری لڑکیوں کی طرح شرما جاتا تھا۔ جب وہ چُپ ہوتا تو معلوم ہوتا اس کے سینے میں جذبات کا ایک سمندر سو رہا ہے۔ لیکن جب بات کرتا تو اس کا لہجہ اس قدر پُر محبت اور پُر خلوص ہوتا کہ محسوس ہوتا اس کے دل میں سوائے اس بات کے اور کچھ نہیں تھا۔ رضیہ نے اُسے قہقہہ لگا کر ہنستے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کسی وقت وہ صرف پتلے ہونٹ کھول کر مُسکرا دیتا تھا اور یہ مسکراہٹ آبشار کی طرح اس کے چہرے سے گر کر ہر شئے کو اپنی لپیٹ میں لیتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے گندمی چہرے کے نقوش باریک تھے اور ان میں دل کو گرم رکھنے والی بڑی وبگ سی اُداسی رچی ہوئی تھی۔ اس اداسی میں چٹانوں سے ٹکراتی سمندری موجوں کا ہیبت ناک شور بھی تھا اور پُر سکون جھیل کی تہہ میں سوئے ہوئے زرد پتھر کی آسودگی بھی تھی۔ اس کے جسم کا سب سے زیادہ پرکشش حصہ اسکی آنکھیں تھیں شربتی رنگ کی دو پژمردہ سی آنکھیں، جن میں ہر وقت کسی شئے کا خمار سُلگتا رہتا تھا۔ وہ اِن آنکھوں کو ذرا سکیڑ کر باتیں کرنے کا عادی تھا اور رضیہ کو ہر بار بات کرتے ہوئے اپنے چہرے پر طلوع ہوتے سُورج کی پہلی نیم گرم کرنوں کی حدت محسوس ہوتی۔ اُس کے پاس بیٹھ کر باتیں سُنتے ہوئے رضیہ کو محسوس ہوتا جیسے گوگول اس کے سامنے بیٹھا اپنی کتاب "ڈیڈ سولز" کا کوئی حصہ پڑھ کر سُنا رہا ہو۔ رضیہ کا دل کانوں کے پاس آکر دھڑک رہا ہوتا اور وہ افسردہ آنکھوں والے پروفیسر کی دھیمی پُرسکون آواز میں ڈوب جاتی۔ لیکن اُسے بہت کم قصبے والے پُرانے مکان میں آنے کا اتفاق ہوتا۔ مہینے میں دو ایک بار کسی شام اچانک اسکی چھوٹی سی نسواری کار پُرانے مکان کے بڑے دروازے میں داخل ہو کر لیموں کے پیڑوں تلے رُک جاتی۔ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی رضیہ کا دل دھڑکنے لگتا۔ وہ جلدی سے بھاگ کر نیچے آتی اور سعیدہ سے لپٹ کر ملتی اور دیکھتی کہ پروفیسر زرد سوٹ میں ملبوس اسکی طرف شرمیلی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مُسکرا رہا ہے۔ رضیہ کو یوں لگتا گویا خزاں کے پتوں پر کہانیاں لکھنے والا چیخوف اپنے دیہاتی مکان سے اُٹھ کر اُسے ملنے آیا ہو۔ جیسے اس کے خوابی جزیروں کا سفیر اس کے سامنے کھڑا ہو۔ اور جیسے اُس کے شیلف میں رکھی ہوئی ساری کتا

کتابوں میں زندگی کا گرم خون دوڑ گیا ہو اور وہ زرد سوٹ پہن کر اُسے ملنے آئی ہو ۔ وہ اُسے آداب کرتی اور پروفیسر اس کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر پوچھتا۔

" اچھی ہو بے بی !"

رضیہ صرف شرما کر نظریں جھکا لیتی۔ پروفیسر کی دونوں کنپٹیوں پر پیچھے کو گئی ہوئی سفید بالوں کی لٹوں کا خیال کر کے رضیہ کو محسوس ہوتا کہ وہ محض بے بی ہے۔ ناسمجھ بچی ہے۔ اور اتنا کچھ پڑھنے اور سوچنے کے باوجود اُس کا ذہن ابھی نابالغ ہے، غیر پختہ ہے۔ رضیہ کی امی اور ابا ان کا استقبال بڑی گرمجوشی سے کرتے اور صدیوں کے افسردہ مکان میں خوشی اور زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔ شادی کے بعد سعیدہ کا رنگ زیادہ نکھر گیا تھا۔ اور اسکی طبیعت میں شوخی اور شگفتگی زیادہ آگئی تھی۔ کسی وقت وہ اپنے خاوند سے ایکدم بگڑ جاتی لیکن وہ کچھ اس طرح مسکرا کر اسکی طرف دیکھتا کہ سعیدہ ایکدم ٹھنڈی پڑ جاتی۔

شام کی چائے پروفیسر ہمیشہ رضیہ کے کمرے میں پیتا۔ کبھی سعیدہ اور اس کی بڑی آپا بھی اس کے ساتھ ہوتیں اور کبھی وہ دونوں بالکل تنہا ہوتے۔ ایسے لمحوں میں رضیہ بے حد خوش ہوتی اور پروفیسر کے لئے بڑے اشتیاق سے چائے بناتی۔ پروفیسر سگرٹ بنا کر سلگاتا اور پُرانے پردوں اور قالینوں والے بھرپور دیہاتی کمرے میں نکھری نسرین کی مہک اور رچ پیکو کی خوشبو سے بغلگیر ہو جاتی اور لیمپ کی ملائم روشنی میں پروفیسر کے چہرے پر کسی انجانی گہری مسرت کی چمک سی پھیل جاتی۔ رضیہ نیلی پتیوں والی پیالی ہاتھ میں لئے ہمہ تن گوش ہو جاتی اور پروفیسر آہستہ آہستہ باتیں شروع کر دیتا۔ باتیں ——— پُرانے اور نئے ادب کی باتیں۔ ٹالسٹائی کے 'وار اینڈ پیس' کی باتیں، ٹھیکری کے 'وینیٹی فیئر' کی باتیں، ہنری ایمیل کے 'جرنل'، اور 'رولاں کے 'ژاں کرسٹوف'، اور گورکی کی دیہاتی کہانیوں اور رومی کی مثنوی اور آرنلڈ کی نظم 'لائٹ آف ایشیا' کی باتیں ...... اور پھر کنول کے پھول ایسی کنواری دیو داسی نے دنیا پر ایک گیت گایا۔

So sigh we, passing over the silver strings,

We are the voices of the wandering winds :

Wander thou, too, O prince, they rest to find ;

Leave love for love of lovers, for woe's sake

Quit state for sorrow, and deliverance make.

رضیہ پر عجیب خود فراموشی کا عالم طاری ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو کنول کے پھول ایسی کنواری دیو داسی کے روپ میں دیکھتی۔ اس کی سیاہ زلفیں سانپ کی طرح اس کے ننگے خوشبودار شانوں پر بکھری ہوئی ہیں اور ماتھے پر چندن کی لَو کانپ رہی ہے اور انگلیوں پر حنا کی سُرخی ہے اور وہ گوتم کی مرمریں خواب گاہ میں قالین پر بیٹھی دیچتر دنیا پر ہندی شہزادے کو جدائی کا پیغام سُنا رہی ہے۔ پروفیسر کے گہرے پُرسکون اور اداس چہرے پر وہ گوتم کے عظیم غم کا عکس دیکھتی اور پیالی بڑے آہستگی سے میز پر رکھ کر وہ ایک گہرا سانس لیتی اور اپنا خوبصورت

پیشانی والا سر کرسی کی پُشت سے لگا دیتی۔ پروفیسر خاموش ہو جاتا اور بجھا ہوا سگریٹ سلگانے لگتا۔

اور جب سردی کی روشن دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوتی اور گلاب کی بیلوں میں چڑیاں شور مچا رہی ہوتیں تو وہ دونوں مکان کے عقبی باغ میں لیموں کے پیڑوں تلے بیٹھ کر چائے پیتے۔ رضیہ لیموں کی سفید کلیاں چن کر لاتی اور انہیں سعیدہ کے بالوں میں سجانا شروع کر دیتی اور پروفیسر سگریٹ پیتے ہوئے ان دونوں کو بہار کی روشنی میں مسرور دیکھ کر خوشی کے شدید احساس میں ڈوب جاتا۔ کسی وقت پروفیسر گلاب کی جھاڑیوں میں چھپی ہوئی کوئی چڑیا پکڑ لاتا۔ سب مل کر اس کے جسم پر سُرخ اور چونچ پر سنہرا رنگ بھرتے۔ اِسے دُلھن کی طرح سجا کر ہتھیلی کھول دیتے۔ چڑیا کا ننھا سا دل دھک دھک کر رہا ہوتا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ یونہی دم سادھے پڑی رہتی۔ جیسے مر گئی ہو۔ پھر ننھی سی آنکھ کے کونے سے بڑی مکاری سے دیکھتی اور ہیدان صاف پا کر پھُر سے اُڑ جاتی اور سعیدہ، رضیہ اور پروفیسر تالیاں بجاتے ہوئے اُسے رخصت کرتے۔ ایسے روشن اور خوشیوں بھرے دن بڑی جلدی گزر جاتے۔ سعیدہ اور اُس کا خاوند واپس شہر چلے جاتے اور رضیہ پھر اپنے ویران کمرے کی تنہائیوں میں کتابوں کے زرد اوراق کھول کر بیٹھ جاتی۔ پھر بھیگی ہوئی کسی سرد رات کو جب باہر گھرے اندھیرے میں ہوا گلاب اور لیموں کی شاخوں میں محبت کا سحر پھونک رہی ہوتی، لحاف میں لپٹی ہوئی رضیہ کا انگ انگ دُکھنے لگتا اور اس کے سینے میں سوئی ہوئی، دبی ہوئی، کھوئی ہوئی عورت ناگن کی طرح ہوا کے پہلے جھونکے پر ایک لمبی پھنکار کے ساتھ بیدار ہو جاتی اور رضیہ کی گرم چھاتیوں پر سے پھسلتی ہوئی نیچے اُترتی اور غسل خانے میں جا کر آئینے کے سامنے برہنہ ہو جاتی اور اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ پھٹے ہوئے، پکے ہوئے، دہکے ہوئے، سخت اور کھُردرے جسم پر پھیرنے لگتی۔ پھر آندھی اور بارش کا ایک مہیب طوفان اُٹھتا ــــــ دریاؤں میں جھاگ اُڑاتے، غصیلے، کف آلود سیلاب اُمڈ آتے اور ان کی بپھرتی ہوئی موجیں چٹانی پتھروں کے سنگین بند اُڑا کر لے جاتیں اور کھوکھلی جڑوں والے تن آور، تنومند درخت اُکھڑ اُکھڑ کر گرنے لگتے، اور رضیہ ایک چیخ مار کر جاگ اُٹھتی اور دیکھتی کہ طوفان گزر چکا ہے۔ اور پانی کی پُرسکون سطح پر درختوں کی ٹہنیاں اور کشتیوں کے تختے تیر رہے ہیں۔ اس کے چہرے پر خوف، دہشت اور اذیت کے نشان ہوتے۔ جیسے رات بھر کوئی اُسے وحشیوں کی طرح چابکوں سے مارتا رہا ہو۔ اِس سے پہلے اُس کے ساتھ کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ اِس سے پہلے کبھی اُسے ایسے کرب انگیز خواب نہ آئے تھے۔ اب ایسا کیوں ہونے لگا تھا؟ رضیہ بستر پر ہی خدا کے حضور میں گڑگڑاتی اور روتی ہوئی آنکھوں اور سسکتے ہونٹوں سے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتی اور گڑگڑا کر ان کی معافی مانگتی۔ پھر دن نکل آتا اور وہ نہا دھو کر بڑے مطمئن چہرے کے ساتھ بوڑھی خادمہ کے ساتھ مل کر اپنی آپو کے لئے پانی گرم کرتی۔ اپنے ابا جی کے کپڑے نکالتی۔ اُن کے لئے دلیا خود پکاتی اور ان کاموں سے اُسے اس قدر تسکین ہوتی کہ وہ اپنے سارے دُکھ بھُول جاتی۔ اس کا ذہن بادلوں سے یوں چھٹ کر صاف ہو جاتا جیسے وہ کسی غریب کسان کی بیٹی ہو۔

مگر رات نئے خیالوں کا پُر اسرار اندھیرا اور نئی اُمنگوں کے سُرخ پھُول لے کر آتی اور رضیہ کو اندھیرے میں اپنے گورے بدن پر جا بجا خون کے سُرخ دھبے ہی دھبے دکھائی دیتے۔ وہ ریشمی کمبل پرے پھینک کر اُٹھتی۔ روشندانوں میں سے اندر داخل ہوتی ہوئی ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں سنگار دان کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے جسم پر خوشبو چھڑکتی۔ میز پر بیٹھ کر لیمپ جلاتی، اور سنہرے حاشیئے والا پیڈ نکال کر اپنے محبوب کے نام دہکتی ہوئی آتشیں محبت میں ڈوبے ہوئے طویل خط لکھنے بیٹھ جاتی۔ کئی خطوط پھاڑنے کے بعد وہ ایک خط کو بڑے پیار سے لفافے میں بند کرتی۔ لفافے پر اپنے محبوب کا نام لکھ کر اُسے چومتی۔ اس کے بعد اُسے دراز میں بند کرتی اور لیمپ بجھا کر سو جاتی۔

صبح اُٹھ کر جب وہ بے خیالی میں دراز کھولتی تو بند لفافے پر لکھا ہوا کسی مرد کا نام دیکھ کر حیران رہ جاتی۔ لفافہ کھول کر جب خط پڑھتی

تو شرم سے اُس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا۔ اُسے کسی طرح یقین نہ آتا کہ وہ خط اُسی نے لکھا ہو۔ وہ جلدی سے اس خط کو لفافے سمیت پھاڑ کر آتشدان میں پھینک کر جلا ڈالتی ———

گرمیوں کی چھٹیوں میں سعیدہ اپنے خاوند کے ساتھ مری گئی ہوئی تھی۔ واپسی پر یہ لوگ ایک روز کے لئے ہری ناگ ٹھہر گئے۔ اگلے دن لاہور آتے ہوئے پروفیسر نے رضیہ کو بھی ساتھ لے لیا۔ جب سے سعیدہ کی شادی ہوئی تھی رضیہ اس کے گھر کبھی نہ گئی تھی۔ ویسے بھی وہ ایک لمبے عرصے کے بعد لاہور جا رہی تھی۔ جب ان کی کار رضیہ کے کالج اور ہوسٹل کے قریب سے گذری تو رضیہ کو کالج کے پرانے دن یاد آ گئے۔ سعیدہ کا گھر شہر سے باہر کنال بینک پر واقع تھا۔ یہ گھر بڑا خوبصورت اور صاف ستھرا تھا۔ ہر کمرے میں روشنی، گرمی، زندگی اور سورج کی دھوپ تھی۔ رضیہ یہاں پہنچکر اپنے اندر ایک نئی زندگی محسوس کرنے لگی۔ سعیدہ کا خاوند اس کا بہت خیال رکھتا۔ اسے ہر روز صبح شام نہر کنارے سیر کرواتا۔ شہر سے واپس آتے ہوئے اس کے لئے نئے نئے رنگین انگریزی رسالے خرید کر لاتا۔ تقریباً ہر روز ہی ان کا سینما جانے کا پروگرام بن جاتا۔ سعیدہ کو کبھی کبھی اپنے خاوند کی طرف سے رضیہ کی یہ ناز برداریاں کچھ ناگوار سی گذرتیں۔ مگر وہ ان باتوں پر زیادہ سوچ بچار نہ کرتی۔ ایک روز یہ لوگ زبیدہ کے ہاں بھی گئے ——— زبیدہ کی صحت پہلے کی نسبت کافی کمزور ہو گئی تھی اور اسکی بڑی بڑی آنکھوں کے گرد حلقے سے نمودار ہو گئے تھے۔ زبیدہ کی ساس اور نندوں نے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی۔ رضیہ کو فوراً احساس ہو گیا کہ اس گھر میں زبیدہ سے اچھا سلوک نہیں ہوتا۔ اور وہ وہاں خوش نہیں ہے۔ اس کے باوجود زبیدہ نے رضیہ سے کچھ نہ کہا۔ رضیہ نے اکیلے میں جا کر اپنی بڑی بہن سے بہت کچھ پوچھنا چاہا مگر زبیدہ نے کوئی بات نہ کی۔

"تو پھر باجی یہ حالت کیا بنا رکھی ہے؟"

زبیدہ نے رضیہ کو آہستہ سے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"کوئی حالت خراب نہیں۔ وعدہ کرو کہ کسی سے کوئی بات نہ کرو گی"

دونوں بہنوں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور زرد چہروں پر مسکراہٹ تھی اور دونوں نے ایک دوسری سے وعدہ کیا کہ وہ کسی سے کچھ نہ کہیں گی۔ سب کچھ سہیں گی اور خاموش رہیں گی۔

سہ پہر کو ڈاکٹر صاحب بھی ہسپتال سے آ گئے۔ انہوں نے مہمانوں کو دیکھ کر ریچھ کی طرح بازو ہلاتے ہوئے پروفیسر سے مصافحہ کیا اور سعیدہ اور رضیہ کو وہاں دیکھ کر خوشی سے اچھلنے لگے۔

"میں تو آج فارغ ہی تھا۔ فون کر دیا ہوتا۔ چلو اچھا ہوا۔ زبیدہ! انہیں کچھ کھلایا پلایا بھی ہے یا نہیں؟ مگر تو ہاتھ پاؤں کہاں ہلائے گی۔ تو تو پوری ہڈ حرام ہے"

زبیدہ نظریں جھکائے مسکراتی رہی اور اسکی ساس بھی ہنستی رہی اور اسکی نندیں اپنے بھائی کی جیب سے چاکلیٹ نکال کر کھانے لگیں اور رضیہ پر یہ بات واضح ہو گئی کہ زبیدہ کی صحت کیوں خراب ہے۔ چائے پر ڈاکٹر نے رضیہ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی مگر رضیہ نے اُسے کوئی لفٹ نہ دی۔ اسے ڈاکٹر کی وہ نظریں سخت ناپسند تھیں جن سے وہ اسے گھورا کرتا تھا۔ یہ نظریں مکروہ چھپکلیوں کی طرح اسے اپنے کپڑوں کے اندر رینگتی محسوس ہوتی تھیں۔ چائے کے بعد رضیہ، سعیدہ اور پروفیسر کنال بینک اپنے گھر آ گئے۔ اگلے روز آسمان پر بادل چھائے ہوئے

تھے اور برسات کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ـــــــ سعیدہ کے خاوند نے رضیہ کو ساتھ لیا اور سعیدہ سے یہ کہہ کر کہ وہ ذرا گھومنے جا رہے ہیں شبیزان میں آ گئے۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور مال پہ اندھیرا سا ہو رہا تھا۔ شبیزان میں بتیاں جلا دی گئی تھیں وہ دونوں گیلری میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں اور کوئی نہ تھا۔ رضیہ پروفیسر کے ساتھ، ایسے پُرسکون ماحول میں بیٹھی بے حد خوش تھی اور اس کے زردی مائل گندمی چہرے پر مسرت کا بھرپور احساس تھا۔ پروفیسر نے چائے کے ساتھ بہت کچھ منگوا لیا۔ رضیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مگر بھائی جان یہ اتنی ساری چیزیں کھائے گا کون؟"

"ہم کھائیں گے"

اور اتنا کہہ کر اس نے ایک کریم لیف خود اٹھایا اور دوسرا رضیہ کے منہ میں ڈال دیا۔ وہ دونوں ہنس پڑے اور باہر ایک دم مینہ برسنا شروع ہو گیا۔ رضیہ کو اپنے پرانے گھر والے کمرے کا خیال آ گیا۔ کیا خبر وہاں بھی بارش ہو رہی ہو! رضیہ کو اپنے پرانے گھر اور اس کمرے سے کچھ ایسا لگاؤ ہو گیا تھا کہ وہ قریب رہ کر اسی سے بھاگتی تھی اور دور جا کر اسے بہت یاد کیا کرتی تھی۔ وہ کچھ اداس سی ہو گئی۔ اسے اپنی پرانی اور حالیہ زندگی کا خیال آ گیا۔ وہ کہاں جا رہی ہے؟ وہ کہاں جائے گی؟ وہ زندگی سے کیا چاہتی ہے؟ اسے کیا ملے گا؟ خدا جانے وہ کیا کھوئے، کیا پائے۔ کیا چاہے اور اسے کیا ملے ـــــــ!

پروفیسر نے سگریٹ سلگا کر رضیہ کو غور سے دیکھا۔

"چپ کیوں ہو گئیں؟"

"کچھ نہیں"

پروفیسر نے اسی طرح منہ بنا کر کہا "کچھ نہیں"

دونوں ہنسنے لگے۔ رضیہ نے چائے کی پیالی میز پہ رکھ کر باہر کھڑکی میں سے نظر آنے والی بارش کی جھالر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان ایک بات بتائیں گے؟"

"کیا؟"

"آپ شادی کر کے خوش ہیں؟"

پروفیسر خاموش ہو گیا۔ اس کے دبلے چہرے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اس سوال کا جواب کبھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے سلگتی ہوئی پژمردہ آنکھیں سکیڑ کر رضیہ کو دیکھا اور خشک سی آواز میں بولا:۔

"شادی کر کے ہم لوگ نہ سکھی ہوتے ہیں نہ دکھی، صرف شادی شدہ ہوتے ہیں"

"نہیں مجھے سچ سچ بتائیے"

رضیہ بچوں ایسی ضد کرنے لگی اور پروفیسر کچھ پریشان سا ہو گیا۔

"ہاں ہاں بھئی، میں خوش ہوں، بہت خوش"

رضیہ خاموش ہو گئی۔ پروفیسر بھی خاموش ہو گیا۔ باہر بارش ہلکی ہو گئی۔

پروفیسر نے کہا:۔

"تم بھی شادی کر لو رضیہ! تمہارا علم اور پختہ ہو جائے گا۔"

رضیہ شرما گئی۔ وہ کچھ نہ بولی۔

"میں چاہتا ہوں تمہاری شادی خود کراؤں۔ سب کچھ اپنے ہاتھوں کروں، تم، جو اتنی پیاری، اتنی ذہین، اتنی قیمتی لڑکی ہو۔ تمہیں بیاہنے تو کسی شہزادے کو آنا چاہیئے۔ سوچتا ہوں کسی روز چپکے سے ہسپانیہ کے سبزہ زاروں میں نکل جاؤں اور شہر کے جھنڈوں تلے سوئے ہوئے کسی اندلسی شہزادے پر جھک کر کہوں، میرے ساتھ آؤ میں نے تمہارے لئے شہزادی ڈھونڈ لی ہے، اور پھر میں اسے لیکر تمہارے پاس آجاؤں اور بڑی دھوم دھام سے تم دونوں کا بیاہ رچاؤں اور ......"

پروفیسر نے چونک کر رضیہ کو دیکھا۔ وہ ہتھیلیوں میں چہرہ چھپائے رو رہی تھی۔ اس کا کمزور جسم کانپ رہا تھا۔ اور سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔ پروفیسر گھبرا گیا۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے رضیہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے کہا۔

"آنسو روک لو اندلسی شہزادی! تیرا شہزادہ برق رفتار گھوڑے پر اُڑا چلا آرہا ہے۔ آنسو پونچھ لو......"

اندلسی شہزادہ ابھی کافی دور تھا۔ لیکن سعیدہ شیزان کی گیلری میں ضرور پہنچ گئی تھی۔ پروفیسر نے گھبرا کر اپنا ہاتھ اُٹھا لیا اور بناوٹی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے بولا۔

"پاگل لڑکی! یونہی رونے لگ پڑی۔ کہنے لگی گھر یاد آرہا ہے۔"

سعیدہ نے کوئی جواب نہ دیا اس کا چہرہ کبھی زرد ہو رہا تھا اور کبھی سُرخ۔ بدگمانیوں کی نیند بڑی کچی ہوتی ہے۔ وہ ذرا سی آہٹ پر چونک اُٹھتی ہیں۔ سعیدہ کا شک یقین میں بدل چکا تھا۔ رضیہ آنسو پونچھ رہی تھی۔ دل اس کا بھی دھڑک رہا تھا۔ لیکن وہ طبعاً ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑی بلند لڑکی تھی۔ اُس نے سعیدہ سے کوئی بات نہ کی۔ سعیدہ نے پانی کا ایک گلاس پینے کے بعد اپنے خاوند کو بتایا کہ وہ کچھ سامان خریدنے آئی تھی اور یونہی شیزان میں آگئی کہ شاید اس کا خاوند یہاں ہو۔ اس کے بعد یہ لوگ وہاں سے اُٹھے اور گھر آگئے۔ سعیدہ نے راہ میں رضیہ سے کوئی بات نہ کی۔ گھر پہنچکر بھی کوئی بات نہ کی۔ وہ جیسے گم سُم سی ہو گئی۔ بھڑکیلی طبیعت رکھنے کے باوجود اُسے کچھ ایسا دھکا لگا کہ وہ ایکدم بجھ سی گئی۔ رضیہ کو ایسی حالت میں وہاں رہنا بڑا ناگوار لگا اُس نے سعیدہ کے خاوند سے کہا کہ وہ گھر جانا چاہتی ہے۔ سعیدہ کا خاوند رضیہ کو بالکل نہ روک سکا۔ اُس نے رضیہ کو کار میں بٹھلایا۔ بوڑھا ملازم ساتھ لیا اور سٹیشن پر آگیا۔ ریل کی روانگی میں آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ وہ دونوں ریفریشمنٹ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ پروفیسر نے کولڈ ڈرنکس منگوالیں۔ اور وہ اُنہیں خاموشی سے پینے لگے۔ دونوں کے غمزدہ دل اُداس تھے دونوں کی آنکھوں میں نظر نہ آنے والے آنسو تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے کچھ کہنا چاہتے تھے اور کہہ نہ سکتے تھے۔ آخر پروفیسر نے اپنے مخصوص لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"جو کچھ ہُوا ہے مجھے اس کا بہت دُکھ ہے۔ میں جانتا ہوں تمہیں صدمہ پہنچا ہے۔ میں تمہارے لئے بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن کچھ نہیں کر سکتا۔ میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مگر ایک بات بھی نہیں کہہ سکتا۔ اور شاید کبھی نہ کہہ سکوں۔ تم ذہین اور پڑھی لکھی لڑکی ہو، میری ذہنی کیفیت کو اچھی طرح پرکھ سکتی ہو۔ سوچتا ہوں اس گھڑی دو گھڑی کی دوستی میں ہم نے کیا پایا ہے۔ تم اپنے گھر جا رہی ہو۔ میں پھر کالج کی پُرانی لکیر پیٹوں گا۔ شاید اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہو۔ دونوں خاندانوں کی بھلائی ہو۔ تم اپنے خاندان کے لئے زندہ ہو اور میں اپنی بیوی کے لئے۔ ہم میں کوئی بھی اپنے لئے زندہ نہیں ہے۔ ہم یہاں اپنے لئے زندہ نہیں رہ سکتے ہاں اپنے لئے مر ضرور سکتے ہیں۔ اُداس نہ ہونا۔

آرزو وہ نہ ہوتا، شاید ہم کسی دوسرے جنم میں، کسی نئے روپ میں ملیں "

رضیہ پر موت ایسی خاموشی طاری تھی۔ وہ صرف سن رہی تھی۔ وہ ہمیشہ صرف سننا چاہتی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے زخموں پر ٹھنڈے مرہم کے پھاہے رکھ رہا ہے۔ پلیٹ فارم پر گاڑی کے انجن اور ڈبوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔

" گاڑی آگئی ہے۔ چلو چلیں "

رضیہ آہستہ سے اٹھی اور پروفیسر کے ساتھ باہر پلیٹ فارم پر آگئی۔ پروفیسر نے اسے سیکنڈ کلاس کے زنانہ ڈبے میں سوار کر دیا کر ملازم کو ساتھ والے ڈبے میں بٹھلا دیا۔ ریل کے انجن نے آخری سیٹی دی۔ پروفیسر نے رضیہ کو دیکھا۔ وہ کھڑکی کے ساتھ سر لگائے اداس نگاہوں سے پلیٹ فارم کے فرش کو دیکھ رہی تھی۔ گاڑی کھسکنے لگی تو رضیہ نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ دھواں، شور، گرد، دھند، آوازیں ـــــــ تیز، بلند چیخوں سے ملتی جلتی آوازیں، روک لو، روک لو، گاڑی روک لو، رضیہ کا سر کھڑکی کی چوکھٹ سے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور گاڑی بڑی تیزی سے شور مچاتی ہری ناگ کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

. . . .

تیسرے ہی روز سعیدہ نے شیراز میں پیش آئے ہوئے حادثے اور اس سے پہلے کے کئی ایک واقعات کی پوری تفصیل بڑی آپا کو لکھ بھیجی۔ رضیہ کی والدہ سن ہو کر رہ گئیں۔ ایک لمحہ کے لئے انہیں کچھ سجھائی نہ دیا۔ خط کے آخر میں سعیدہ نے لکھا تھا کہ اگر اب رضیہ کو اس کے گھر آنے کی اجازت دی گئی تو اس کے گھر کی چاروں دیواریں گر پڑیں گی۔ بڑی آپا نے خط بند کر کے بڑی الماری کے نچلے دراز میں مقفّل کر دیا۔ انہوں نے رضیہ کے والد کو اس حادثہ سے آگاہ کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ دو تین دن گذر جانے پر انہوں نے رضیہ کو بلایا اور بڑی تدبیر اور دانشمندی کے ساتھ اسے پیار کرتے ہوئے سمجھانے لگیں۔

" اگر سعیدہ کے سسرال والے تمہیں اچھا نہیں سمجھتے میری بیٹی، تو پھر ان کے ہاں جانے کا فائدہ؟ بہنیں جب اپنے گھروں میں جا بسیں تو وہ دور کی رشتہ دار سمجھی جاتی ہیں۔ میں جانتی ہوں، تم پہلی بار ان کے ہاں گئی تھیں اور تمہارے ساتھ انہوں نے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ لیکن خیر تمہارے ایسی پڑھی لکھی لڑکی کو ایسی باتوں کا برا نہیں ماننا چاہیئے۔ بہتر یہی ہے کہ ادھر کا راستہ ہی بھول جاؤ اب جاؤ اور خادمہ سے کہو کہ میرے لئے دلیا اور سبز چائے تیار کر کے لے آئے "

رضیہ کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی ذلّت نہ تھی کہ جو کچھ ہوا ہے، اس کا علم بڑی آپا کو بھی ہو جائے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ سعیدہ نے امّی کو خط لکھا ہے۔ اسے اپنی اس قدر بے عزّتی محسوس ہوئی کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر پڑی اور تکیوں میں سر دے کر جی بھر کر روئی، ان دکھوں کو بھی روئی جو اس پر بیت چکے تھے ان غموں پر بھی روئی جنہیں وہ اٹھا رہی تھی اور ان پر بھی روئی جو اسے اٹھانے تھے۔ تین دن تک کمرے میں بند رہنے اور کسی کے بلائے پر بھی باہر نہ نکلنے کے بعد اس نے چوتھے روز شام کو اٹھ کر غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ سر پر اپنے مخصوص انداز میں دوپٹہ اوڑھا، لیمپ جلایا اور " یاں کرستوف " کھول کر بیٹھ گئی۔ جوں جوں وہ اسے پڑھ رہی تھی۔ اس کے اندر طاقت، ہمت، دلیری اور توانائی کا شدید احساس ہو رہا تھا۔

کھلی کھڑکی میں سے باغ کی طرف سے لیموں کے پھولوں کی خوشبو اندر داخل ہو رہی تھی اور رو لاں کہہ رہا تھا۔

"O, Life, I sought thee in myself, in my own empty shut-in-soul. My soul is broken. The sweet air pours in through the windows of my wounds. I breathe again. I have found thee once more. O, Life! Hold thy peace, and listen . . . ."

اگست کی آخری تاریخیں تھیں کہ زبیدہ اپنے خاوند کے ساتھ ہری ناگ آگئی۔ وہ پورے دنوں سے تھی۔ اور پرانی روایات کے مطابق اپنے پہلے بچے کو ماں باپ کے گھر جنم دینا چاہتی تھی۔ اس کا خاوند پورے ساز و سامان کے ساتھ لیس ہو کر آیا تھا۔ زبیدہ آتے ہی بستر پہ پڑ گئی۔ وہ بڑی کمزور ہو گئی تھی۔ پہلے سے بے حد دبلی اور نحیف دکھائی دے رہی تھی۔ پانچویں دن، رات کے کسی لمحے جبکہ رضیہ اپنے کمرے میں افسردہ گال تکیئے پہ رکھے سو رہی تھی، زبیدہ کے ہاں پھول سی لڑکی پیدا ہوئی۔ رضیہ کو صبح خبر ملی۔ اس نے بچی کو اٹھا کر بڑا پیار کیا۔ بچی کا باپ بھی پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ بھی بچی پر جھک کر اسے پیار کرنے لگا اور رضیہ کو کچھ اس قسم کی بو محسوس ہوئی جیسے وہ تانگوں کے اڈے پر بہت سے گھوڑوں کے درمیان کھڑی ہو۔ اور اس نے جلدی سے یونہی مسکراتے ہوئے بچی کو ماں کے پہلو میں لٹا دیا۔

ڈاکٹر ایک ماہ کی رخصت لے کر وہاں آیا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے گھر پر ہی رہتا تھا۔ صرف صبح شام سیر کو جاتا اور کئی کئی میل کا چکر لگا کر پسینے میں تر بتر ہانپتا کانپتا بڑے کمرے میں داخل ہوتا اور بوٹ کھول کر صوفے پر اوندھے منہ لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے شروع کر دیتا۔ وہ سعیدہ کے کمرے میں سوتا تھا۔ اور سعیدہ کا کمرہ رضیہ کے کمرے سے ملحق تھا۔ رات بھر ڈاکٹر کے بے ہنگم خراٹے رضیہ کو بے آرام رکھتے۔ دن میں وہ کسی بھی وقت رضیہ کے کمرے میں آن دھمکتا اور کبھی میز پہ رکھی ہوئی کتابوں کو الٹنے پلٹنے لگتا اور کبھی صوفے میں دھنس کر سگریٹ پر سگریٹ پیئے جاتا۔ اور ادھر ادھر کی بے مقصد باتیں شروع کر دیتا۔ رضیہ کو یہ بے جا مداخلت بڑی ناگوار گزرتی لیکن اپنی بڑی بہن کے منہ کو چپ ہو کر رہ جاتی۔ وہ جانتی تھی، کہ زبیدہ کی زندگی سسرال میں پہلے ہی کوئی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ ایک دو بار اس نے دروازہ اندر سے بند کر کے بھی دیکھ لیا۔ اس طرح اور قیامت برپا ہو جاتی۔ دروازہ باہر سے زور زور سے بجایا جاتا۔ اور رضیہ کو مجبوراً چٹخنی کھول دینی پڑتی، اندر آتے ہی ڈاکٹر بڑے تعجب سے ادھر ادھر دیکھتا اور کہتا ———

"بھئی دروازہ تو کھول رکھا کرو۔ اور نہیں تو کم از کم تازہ ہوا تو اندر آتی رہے تمہاری صحت پہلے ہی کمزور ہے"

رضیہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر بات ٹال دیتی۔ پھر وہ رضیہ کے پاس آ کر میز پہ جھک کر پوچھتا۔

"کہیں میں تمہارے مطالعے میں مخل تو نہیں ہوتا؟"

"جی نہیں بھائی جان! بالکل نہیں"

"ٹھیک ہے۔ اور تمہیں اتنا پڑھنا بھی نہیں چاہیئے۔ تمہاری آئی سائیٹ بالکل خراب ہو کر رہ جائیگی۔"

رضیہ کتاب پر نظریں جمائے سوچتی رہتی کہ وہ کیا کرے؟ کتاب بند کر دے یا پڑھتی رہے؟ اگر وہ پڑھتی رہے تو ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکے گی اور اگر کتاب بند کر دے تو اس بھدّے بے ڈھب سے بات کیا کرے؟ وہ اسی گومگو کے عالم میں مبتلا رہتی اور ڈاکٹر باتیں کرتا، سگریٹ پہ سگریٹ پیتا

صوفے میں دھنسا قالین پہ ٹانگیں پسارے اونگھنے لگتا۔ اُسے اُونگھتا دیکھ کر رضیہ فوراً کتاب بند کرتی اور دبے پاؤں وہاں سے نکل زبیدہ کے پاس جا کر بیٹھ جاتی اور اس کی بچی سے کھیلنے لگتی۔ ابھی وہ آن کر بیٹھی ہی ہوتی کہ زور سے ہنہنانے کی آواز آتی اور ڈاکٹر اندر داخل ہوتے ہی ہوں، ہوں، ہوں، کرتا بچی کو بے تحاشہ چومنا شروع کر دیتا۔

رضیہ زندگی میں کبھی کسی شئے سے اتنی عاجز نہ آئی تھی۔ وہ کبھی اس قسم کی گھٹیا ذہنی اُلجھن میں گرفتار نہ ہوئی تھی، جس قسم کی اُلجھن میں وہ اِن دنوں گرفتار تھی۔ وہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ ایسی باتوں سے ڈاکٹر کا مطلب کیا ہے۔ لیکن ایک دن یہ مطلب اُسکی سمجھ میں آگیا۔

ایک رات پڑھنے کے بعد اس نے کاپی نکال کر اپنی ڈائری لکھنا شروع کر دی۔ بڑی دیر سے اس نے ڈائری کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ اور اِس دوران میں حادثات کا ایک ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ لکھنے بیٹھی تو لکھتی ہی چلی گئی۔ دس، گیارہ، بارہ، رات کے ساڑھے بارہ بج گئے اور رضیہ کا تیز قلم اسی طرح چل رہا تھا۔ لیمپ میں نیل ختم ہونا شروع ہو گیا۔ وہ پہلے ٹمٹمانے اور پھر کانپنے لگا۔ رضیہ نے قلم رکھ کر دراز میں سے دو بڑی موم بتیاں نکالیں، انہیں جلا کر لکڑی کے بنے ہوئے چنار کے پتے میں جمایا اور لیمپ بجھا دیا۔ لیمپ بجھا کر ابھی اُس نے موم بتی کی نرم روشنی میں لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ اُسے اپنے عقب میں قالین پر کسی کے بوجھل قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر کھڑا تھا۔ سگریٹ اُس کے منہ میں سُلگ رہا تھا اور اسکی نیم وا آنکھیں سُرخ تھیں۔ رضیہ غیر شعوری طور پہ چونکی ہو گئی اور اس کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ لیکن اس نے اپنا اضطراب بڑی مشکل سے دباتے ہوئے بڑے نارمل انداز میں مسکرا کر پوچھا۔

” آپ اِس وقت بھائی جان؟ نیند نہیں آئی ہو گی۔ سارہ بڈون دوں؟“

لیکن ڈاکٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ اِدھر اُدھر دیکھا اور رضیہ پہ جُھک کر آہستہ سے بولا۔

” کوئی نہیں ہے۔ سب سو گئے ہیں۔ سب سو رہے ہیں“

اور اس کے ساتھ ہی رضیہ کے شانے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ رضیہ کے لئے یہ بڑی نازک گھڑی تھی۔ اب سب بہروپ بیکار تھے۔ وہ جلدی سے کرسی چھوڑ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور ڈاکٹر کا بھدّا ہاتھ پرے جھٹک دیا۔

” آپ کیا چاہتے ہیں؟“

ڈاکٹر نے للچائی ہوئی ہوسناک نگاہوں سے رضیہ کو سر سے لیکر پاؤں تک گھورا اور پاگلوں کی طرح جھپٹ کر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ پہلے تو رضیہ ایک دم سُن ہو کر رہ گئی اور ڈاکٹر کی باہوں میں مُردہ لاش کی مانند لٹک گئی۔ مگر فوراً ہی جیسے اس کے اندر ایک شعلہ بھڑکا جس نے اس کے سارے جسم میں آگ لگا دی۔ اس کے ہونٹوں، کانوں اور آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ کر ٹوٹنے لگیں۔ اُس نے ایک ہاتھ باہر نکال کر ڈاکٹر کے منہ پر اس قدر بھرپور طمانچہ مارا کہ وہ لڑکھڑا کر پیچھے جا گرا اور ششدر ہو کر رہ گیا۔

” نکل جاؤ۔ نکل جاؤ —— ورنہ میں شور مچا دوں گی“

رضیہ کی آواز لرز رہی تھی اور اس کے خشک ہونٹوں پہ جھاگ آ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے ایک گہری غضب آلود نگاہ سے دیکھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ رضیہ نے جلدی سے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھائی اور اپنے آپ کو بمشکل سنبھالے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا سارا جسم ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اور ٹانگیں اب پہلے سے زیادہ کانپ رہی تھیں۔ اس نے پلنگ تک جانا چاہا لیکن دو قدم اُٹھانے پر ہی اسکی ہمّت جواب دے گئی اور وہ گر پڑی اور قالین پہ اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے بچّوں کی مانند پھوٹ پڑی۔ اس شرمناک گھناؤنے منظر کا تصوّر اس نے کبھی

خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے اُسے گندے بدرو کے دلدل میں گرا دیا ہو۔ جہاں سے نکلنے کے لئے وہ ہاتھ پاؤں مار رہی ہو مگر باہر آنے کی بجائے اور نیچے دھنستی چلی جا رہی ہو۔ ساری رات وہ قالین پر پڑی روتی رہی۔ پچھلے وقت کہیں روتے روتے اُسے نیند آگئی۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ سنہری دھوپ کھڑکی میں سے اندر داخل ہو رہی ہے۔ وہ قالین پر اوندھے مُنہ پڑی ہے اور اُس کے گال کے نیچے قالین کا بور نمدار ہو رہا ہے۔ اُس کا سارا بدن دُکھ رہا تھا۔ کھلی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو کر اُس نے باہر باغ میں پھیلی ہوئی روشن دھوپ میں چڑیوں کی چہکاریں سُنیں اور رات کے واقعات پہ غور کرنے لگی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے رات اُس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔

دوپہر تک رضیہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی۔ بوڑھی خادمہ نے اُسے کھانا بھی وہیں لاکر دیا۔ جو اس نے تھوڑا سا کھا کر ویسے ہی چھوڑ دیا۔ آخر اُسکی پیاری امّی اور زبیدہ خود اس کے کمرے میں آئیں۔

" کیا بات ہے میری بیٹی ؟ آج ہمارے پاس نہ آؤ گی ؟"

کہیں اُنہیں سب کچھ معلوم تو نہیں ہو گیا ؟ رضیہ کا دل شرم اور ندامت سے ڈوبنے لگا۔

زبیدہ نے بڑے پیار سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

" چلو رضیہ باہر بیٹھتے ہیں، آؤ نا ؟"

رضیہ کو معاً یوں محسوس ہوا جیسے اس کے گلے میں ڈاکٹر نے اپنی بھدّی بانہیں ڈال رکھی ہوں۔ وہ سہم سی گئی۔

" آتی ہوں باجی، ابھی آتی ہوں آپ جی، یونہی ذرا پڑھنے بیٹھ گئی تھی "

" اتنا مت پڑھا کرو میری بیٹی۔ پہلے ہی بڑی کمزور ہو "۔

رضیہ نے مسکرا کر کہا۔

اب نہیں پڑھوں گی آپ جی۔ اب نہیں پڑھوں گی "

زبیدہ نے پوچھا۔

" کیوں ؟"

اور رضیہ نے چونک کر کہا۔

" اوہاں ——— ساری کتابیں ختم ہو گئی ہیں "

زبیدہ اور امّی باہر چلی گئیں۔ رضیہ تنہا رہ گئی۔ وہ باہر جاتے ہوئے گھبراتی تھی۔ وہ ضرور باہر کھڑا ہو گا۔ وہ اُس کا انتظار کر رہا ہو گا۔ جانے باہر کیا ہو جائے! تیسرے پہر وہ زبیدہ کے کمرے میں گئی۔ ڈاکٹر وہیں بیٹھا تھا دونوں میں سے کسی نے ایک دوسرے کو دیکھنے کی جرأت نہ کی۔ رضیہ بچی سے کھیلتی رہی اور ڈاکٹر زبیدہ سے باتیں کرتا رہا۔

....

دوسری صبح رضیہ نے بستر پہ سے اُٹھتے ہی سُنا کہ ڈاکٹر اپنی بچی اور زبیدہ کو لے کر واپس چلا گیا ہے۔ اِسے یوں لگا گویا کسی نے اس پہ سے بہت بڑا بوجھ اُٹھا لیا ہو۔ اُس نے امّی سے زبیدہ باجی کے ایکدم چلے جانے کی وجہ پوچھی ـــ

"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ ایکا ایکی تیار ہو گئے تھے اور چلے گئے"۔

رضیہ نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور غسل خانے میں نہانے کے لئے چل دی۔

موسم سرما شروع ہوا تھا کہ ہرمی ناگ میں ہائی کورٹیوں کے پرانے۔ بہت پرانے بوسیدہ حویلی نما مکان کی خستہ دیواروں کے نیچے کھوکھلی زمین میں سوئے ہوئے سرد لاوے میں کہیں سے ایک چنگاری پھوٹی اور دیکھتے دیکھتے لاؤ گھلتی، کھولتی، سسکارتی سیال آگ بن کر بنجر بنیادوں سے ٹکرانے لگی۔ اوپر ایک زلزلہ سا آگیا۔ اور بوڑھی، جھرّیوں بھری دیواریں کانپنے لگیں۔ یہ وہ زلزلہ تھا جو ہر اس پرانے گھرانے کی دیواروں کو ملبے کا ڈھیر بناتا ہوا گزر جاتا ہے۔ جو صدیوں سے ایک ہی جگہ آباد زمین سے زندگی کا عرق کھینچ رہا ہو۔ آخر زمین کا سینہ خشک ہو جاتا ہے۔ اور درختوں کی جڑیں سوکھ جاتی ہیں۔ وہ بظاہر تن آور اور تنومند ہوتے ہیں۔ لیکن اندر ہی اندر ان کا سارا گودا دیمک زدہ ہوتا ہے۔ اور وہ طوفان کے پہلے ہی حملے میں لڑکھڑا کر گر پڑتے ہیں۔ پھر اس حادثے کو آسمانی طاقتوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اور یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ ان کے جسم کھوکھلے اور بنیادیں خستہ ہو چکی ہیں۔

میر غلام حسن شاہ بڑے وضعدار بزرگ تھے۔ انہیں اپنی حیثیت سے بڑھ کر خاندان کے اِن افراد کی عزت کا خیال رہتا تھا جو مر کھپ گئے تھے اور جنھوں نے اپنے وقتوں میں آئندہ نسل کا خیال کئے بغیر بے نیازی اور تن آسانی میں اچھی زندگی گزاری تھی۔ آپ اپنے خاندان کی تعریف سننے کے لئے دوسرے اعلیٰ خاندانوں کی تعریف میں رطب اللّسان رہتے تھے۔ اپنے رکھ رکھاؤ کے لئے دوسروں کے رکھ رکھاؤ کا احترام کرتے تھے۔ چنانچہ آپ قدرتاً ہاتھ کے کھلے تھے۔ جہاں ایک روپیہ سے کام نکل سکتا وہاں بلا دریغ پانچ روپے خرچ کر دیتے اور اُنہیں اس خیال سے بڑی تسکین ہوتی کہ لوگ اُن کی دریا دلی کو ہائی کورٹی خاندان کا طرّہ امتیاز سمجھ کر تعریف کر رہے ہوں گے۔ جو کوئی اُن کے پاس سوال لے کر آتا خالی ہاتھ واپس نہ جاتا۔ کئی بار جب میر غلام حسن شاہ سے کسی نے قرض کا سوال کیا تو آپ نے کسی دوسرے سے قرض لے کر اُس کا سوال وعدہ کے مطابق پورا کر دیا۔ انہیں دوسرے کی غرض سے کوئی نسبت نہ تھی۔ وہ صرف اپنا وقار اور خاندان کی وضعداری نبھاہ رہے تھے۔ کمیٹی کے تمام ممبر آپ کے مقروض تھے اور آپ نے کبھی قرض کی واپسی کا تقاضہ نہ کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ بھی مقروض ہو گئے۔ بنک میں جو تھوڑا بہت روپیہ جمع تھا اسکی ساکھ پر دوگنا نکلوایا جا چکا تھا۔ کپڑے کے ایک کارخانے کا حصّہ خریدا لیکن سوت نہ ملنے سے کارخانہ تقریباً بند ہو کر رہ گیا۔ پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ پرانا خاندانی مکان رہن رکھ کر حاصل کی گئی رقم کے ساتھ ہی دونوں بیٹیوں کی شادی پر خرچ ہو گیا تھا۔ اب سوائے خواب گاہ کی تجوری میں رکھے ہوئے چند سو روپوں اور زیورات کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ زیورات بھی ڈیڑھ ایک ہزار سے زیادہ کی مالیت کے نہ تھے۔ کچھ آپ کے والد گروی رکھ کر ہضم کر گئے تھے۔ اور کچھ سعیدہ اور زبیدہ کو پہنا دیا گیا تھا۔ اِس وقت ہائی کورٹی خاندان ——— پرانے اعلیٰ کشمیری خاندان پر پچیس ہزار کے قریب قرض چڑھا ہوا تھا اور محلاتی دیواروں، بھاری پردوں اور موٹے افغانی قالینوں والے تاریخی مکان میں سوائے چند سو روپوں کے اور کچھ نہ تھا۔ میر صاحب نے یہ تاریک راز اپنی رفیقہ حیات پر بھی منکشف نہ کیا تھا۔ اس خوفناک راز کو وہ اپنے ہی سینے میں چھپائے قرضخواہوں کی نگاہوں سے بچتے پھرتے تھے۔ کسی قرض خواہ کا اُن سے اپنی رقم کا مطالبہ کرنا میر صاحب کے نزدیک نہ صرف ان کی بلکہ سارے خاندان کی موت تھی۔ چنانچہ وہ زیادہ وقت گھر پر اپنے کمرے میں ہی گزارتے تھے۔ مسلسل غم فکر اور پریشانی کی وجہ سے انہیں بلڈ پریشر

کی شکایت رہنے لگی تھی۔ جوں جوں بنک میں روپے کا حساب دینے اور رہن شدہ مکان کی آخری تاریخیں قریب آرہی تھیں آپ کا بلڈ پریشر بڑھ رہا تھا اور بال سفید ہونا شروع ہوگئے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کرسی پر نیم وا آنکھوں کے سامنے اس صدیوں پُرانے مکان کو لڑکھڑا کر زمین پر گرتے اور خاندان کے اعلیٰ افراد کو گلیوں میں در بدر پھرتے دیکھ رہے تھے۔ وہ کسی سے کچھ نہ مانگ سکتے تھے۔ وہ کسی کے سامنے اپنا باغیرت ہاتھ نہیں پھیلا سکتے تھے۔ ہاں خاندان کے باقی لوگوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چُپ چاپ مر سکتے تھے۔ یہ عظیم خود غرضی ایک عظیم خاندان کے شایانِ شان ہی ہو سکتی تھی۔ کچھ بھی ہو عظیم ذلّت اور عظیم بدنصیبی کے دن قریب آرہے تھے اور میر صاحب ان کے مقابلے کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ وہ چھُپ جانے کی فکر میں تھے۔ میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کی فکر میں تھے۔ چنانچہ ایک صبح جب کافی دیر تک اِن کی خواب گاہ کا دروازہ بند رہا تو خادمہ نے اندر جا کر دیکھا۔ میر صاحب اپنے بستر پر مُردہ پڑے تھے۔ خادمہ بدحواس ہو کر بڑی آپو کی خواب گاہ کی طرف بھاگی اور ان کو خبر سُنتے ہی غش آگیا بوڑھی خادمہ نے روتے ہوئے اُنہیں سنبھالا اور لالی چیختی چلاّتی چھوٹی آپی کے کمرے کی طرف دوڑی۔ رضیہ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ وہ بغیر دوپٹہ کے کھُلے بالوں سمیت اپنی امّی کی طرف بھاگی۔ دیکھتے دیکھتے وہاں ایک کہرام مچ گیا۔ پنڈی، لاہور، کراچی، پشاور، ہر طرف تاریں دوڑ گئیں۔ دوسرے ہی روز قصبہ ہری ناگ کا پُرانا حویلی نما مکان ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ رضیہ کو بار بار غش آرہا تھا۔ بڑی آپو عورتوں کے درمیان بیٹھی دو بال چہرے پر رکھے مسلسل روئے جا رہی تھیں۔ سعیدہ اور زبیدہ کی آنکھیں رونے سے بُری طرح سُوج رہی تھیں۔ زبیدہ کا خاوند قبرستان میں گورکنوں کے سر پر کھڑا قبر کھُدوا رہا تھا۔ اور سعیدہ کا خاوند باہر برآمدے میں کرسی پر چُپ چاپ بیٹھا کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا۔

کسی کو معلوم نہ ہو سکا تھا کہ موت کیسے اور کیونکر واقع ہوئی۔ میر صاحب رات کو اچھے بھلے سوئے تھے۔ اور اس رات اُنھوں نے خلافِ معمول رضیہ کو اپنے کمرے میں بُلا کر بڑا پیار کیا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ موت ہارٹ فیل ہو جانے سے ہوئی ہے اور ڈاکٹروں نے بھی اس کی تصدیق کر دی تھی۔ لاش کے جسم پر کسی قسم کا کوئی نشان نہ تھا۔ صرف اُوپر کے دانتوں میں ایک جگہ ذرا سا خون نکل کر وہیں جم گیا تھا شاید وہ مرنے سے پہلے کہیں گر پڑے ہوں اور پھر پلنگ پر دراز ہو گئے ہوں اور موت نے اِن کے ذہن سے تمام اُلجھنوں اور پریشانیوں کو سمیٹ کر واپس لے لیا ہو اور ان کی زندگی پر جمود کی سرد مہر لگا دی ہو۔

او بدنصیب رضیہ اور اُس کی سفید بالوں والی شفیق ماں!

تم لوگوں کی موت کب آئے گی؟

......

سرِ شام کے دھُندلکے میں جبکہ قصبے کے کھُلے کھیتوں پر دھُند چھا رہی تھی۔ میر غلام حسن شاہ کو ان کے آبائی قبرستان میں دفنا دیا گیا تھا۔ ایک ایک کرکے سب رشتہ دار کھسکنے لگے۔ تیسرے ہی روز پُرانے گھر میں سوائے سعیدہ، زبیدہ، اور پروفیسر کے اور کوئی نہ تھا۔ ڈاکٹر بھی لاہور جا چکا تھا۔ اس اعلیٰ خاندان کے باقی ماندہ بدنصیب افراد پر اس بھید کا اب انکشاف ہوا تھا کہ ان پر پچیس ہزار روپے کا قرضہ ہے اور بڑا مکان بھی شہر کی ایک کمپنی کے پاس گروی پڑا ہے۔ اُن لوگوں کے رہے سہے ہوش بھی اُڑ گئے۔ اب کیا ہوگا؟ اب تو سر چھُپانے کو بھی کوئی جگہ نہ رہے گی۔ بڑی آپو نے سعیدہ، زبیدہ اور پروفیسر سے مشورہ کیا۔ پچیس ہزار کی رقم کوئی معمولی رقم نہ تھی۔ سعیدہ کے پاس بنک میں صرف اڑھائی ہزار روپیہ جمع تھا۔ اور ڈیڑھ ہزار قرضہ چڑھا ہوا تھا۔ زبیدہ بیچاری کی تو خیر گھر میں اتنی حیثیت ہی نہیں تھی کہ وہ کسی سے کچھ مانگ سکے۔ سعیدہ کا خاوند سب سے زیادہ پریشان تھا۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے

ایک انتہائی شریف خاندان کو محض ایک فرد کی کھوکھلی وضعداریوں کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھتے دیکھ رہا تھا۔ اور اُسے کسی طرح بھی نہ بچا سکتا تھا۔ آخر بڑی آپو نے تجویز پیش کی کہ رضیہ کے لئے قاضی اصغر علی ملٹری کنٹریکٹر کا رشتہ منظور کر لیا جائے۔ یہ رشتہ پہلے سعیدہ کے لئے آیا تھا۔ لیکن محض اس لئے نامنظور کر دیا گیا تھا کہ قاضی اصغر علی کی عمر زیادہ تھی اور اُس کی دو بیویاں فوت ہو چکی تھیں۔ قاضی اصغر علی مالدار آدمی ہے۔ اگر وہ رضیہ کا رشتہ منظور کرے تو یہ خاندان تباہی کے غار میں گرنے سے بچ سکتا ہے۔ اس تجویز کی سب سے زیادہ مخالفت پروفیسر نے کی۔

"خدا کے لئے آپو جی ایسا نہ کریں۔ اس سے تو بہتر ہوگا کہ آپ اپنے ہاتھوں رضیہ کو کنوئیں میں دھکا دے دیں"

سعیدہ فوراً بول اُٹھی۔

"آپ تو اس کی طرفداری کریں گے ہی۔ ہمارے گھر کی اینٹ سے اینٹ بج جائے آپ کی بلا سے۔ آپ تو رضیہ کو بچانے کی فکر میں رہتے ہیں ـــ"

دھیمی طبیعت کا سوگ پسند پروفیسر خاموش ہو گیا۔

زبیدہ نے بھی با دل نخواستہ اس تجویز کی حمایت کی۔ اُسی وقت قاضی اصغر علی کے نام بڑی آپو کی طرف سے ایک خط لکھ کر آدمی شہر کی طرف دوڑایا گیا۔ دوسرے روز اس کا جواب آگیا۔ قاضی اصغر علی کو معلوم ہو چکا تھا کہ ہائی کورٹی خاندان بُری طرح قرضے میں پھنسا ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے بعض باتوں کا بہانہ بنا کر رشتہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ سب پر اوس پڑ گئی۔ انہیں اس بات کا خیال ہی نہ رہا تھا کہ اگر وہ اپنی بیٹی کا سودا کر رہے ہیں تو دوسرا بھی مال دیکھ کر قیمت ڈالتا ہے۔ بھلا ایسی دُلہن کو کون اپنے گھر بسائے گا جس کے پیچھے پچیس ہزار قرض خواہوں کی ایک طویل قطار کھڑی ہو۔ دوسرے دن سعیدہ اور زبیدہ بھی یہ کہہ کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیں کہ وہ فی الحال آرام سے رہیں اگر کوئی غیر خوشگوار بات ہوئی تو انہیں فوراً اطلاع کر دی جائے۔ گھر پہلے سے زیادہ خالی اور سنسان دکھائی دینے لگا۔ رضیہ اپنا کمبل لے کر اپنی امی کے پاس آگئی اور اس کے گھٹنوں پر سر رکھ کر دیر تک روتی رہی۔

"یہ کیا ہو گیا ہے آپو جی! اباجی ہمیں اس طرح کیوں چھوڑ گئے ہیں"

اور بوڑھی مدبّر ماں آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پی کر بیٹی کو حوصلہ دینے لگی۔

"ہماری یہی تقدیر تھی میری بیٹی! آؤ خدا سے دعا کریں کہ وہ ہمارے گناہ معاف کر دے"

خدا نے ان کے سارے گناہ معاف کر دیئے تھے۔ بلکہ خدا کو تو ان کے گناہ یاد بھی نہیں تھے۔ ہاں دُنیا میں رہنے والوں نے ان کی چھوٹی سی چھوٹی خطا بھی معاف نہ کی تھی۔ چنانچہ گھر کے مالک کو فوت ہوئے بمشکل تین ماہ ہی گذرے ہوں گے کہ شہر کے بنک، جائیداد گروی رکھنے والی کمپنی اور کپڑے کے کارخانے کی جانب سے اپنی اپنی رقم کی واپسی کے تقاضے شروع ہو گئے۔ کپڑے کے کارخانے کا حصّہ میر صاحب اپنی زندگی میں ہی فروخت کر چکے تھے۔ بلکہ اُلٹا کارخانے والوں سے چار ہزار قرض لے رکھا تھا۔ مکان سترہ ہزار میں گروی پڑا تھا اور بنک کا مطالبہ کٹ کٹا کر چھ ہزار روپے کا تھا۔ آہستہ آہستہ تقاضے شدید ہوتے گئے۔ بنک کی طرف سے ہر تیسرے روز ایک آدھ یادداشتی خط آجاتا۔ رہن کمپنی نے جائیداد خالی کر دینے کا سرکاری نوٹس دلوا دیا۔ کارخانے والوں کا ایک آدمی ہر روز آکر مکان کے بڑے دروازے کے باہر بیٹھ جاتا۔

رضیہ کی والدہ نے صورتِ حال سے زبیدہ اور سعیدہ کو آگاہ کر دیا تھا۔ پہلا خط پروفیسر نے لکھا اور دوسرا زبیدہ کی طرف سے آیا۔ اُنہوں نے رضیہ اور بڑی آپو کو تھوڑا بہت ضروری اور قیمتی سامان ساتھ لے کر اپنے اپنے ہاں آجانے کی دعوت دی۔ بڑی آپو نے زبیدہ کے ہاں جانے کا فیصلہ کیا اور ضروری سامان کی پیکنگ شروع ہو گئی۔ رضیہ کے لئے اپنا قدیمی گھر چھوڑنا اور پھر ایسی مجبوری اور بے بسی کی حالت میں چھوڑنا ایک عظیم صدمہ تھا جسے وہ

دوسرے صدموں کے ساتھ اپنے سینے میں چھپائے تھی۔

بوڑھی خادمہ اور اس کی بیٹی لالی کے ساتھ مل کر چمڑے کے بڑے صندوقوں میں ریشمی اور گرم کپڑے تہہ کر کے رکھ رہی تھی۔ بوڑھی خادمہ سے بھی اس گھر کی تباہی نہ دیکھی جا رہی تھی۔ اسکی آنکھوں میں بھی آنسو تھے اور آدھی رات کے وقت قالینوں، پردوں اور آبنوسی فرنیچر سے سجے ہوئے اس پرانے مکان میں صدیوں کے بوڑھے امن کے سفید بال پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر اُڑ رہے تھے۔ رات کے تین بجے تمام قیمتی اور ساتھ لے جانے والا سامان صندوقوں میں بند ہو کر تیار ہو گیا۔ تین بڑے صندوق، دو سوٹ کیس اور دو بستر تیار کئے گئے تھے۔ بڑی آپو آتشدان کے پاس سرمئی گرم شال اپنے جھکے ہوئے بوڑھے کندھوں پر پھیلائے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ انہیں وہ دن یاد آ رہے تھے جب وہ پہلے روز اس گھر میں دلہن کی حیثیت سے آئی تھیں۔ کتنے روشن، پُر امن اور ہمدرد دن تھے۔ وہ بنارسی کامدار عروسی جوڑے میں ملبوس بڑے کمرے کے وسط میں گہری سُرخ سوزنی پر شہزادیوں کی طرح بیٹھی تھیں اور انہیں خوبصورت آنکھوں اور سُرخ چہرے والی لڑکیوں نے گھیر رکھا تھا۔ وہ کس طرح ان پر دیوانہ وار فدا ہو رہی تھیں!۔ آج ان میں سے کوئی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ سب خوبصورت آنکھوں والی سہیلیاں کہاں چلی گئی تھیں؟ دُکھ اور مصیبت کی اُس بھیانک گھڑی میں انہیں اپنے خاوند کا خیال آ گیا جو آج کے دن سے بچنے کے لئے ان لوگوں کو اس دن کے مقابلے کے لئے تنہا اور بے یار و مددگار چھوڑ گیا تھا۔ بڑی آپو نے سفید رومال والا کمزور بوڑھا ہاتھ شال سے نکالا اور اُسے آنکھوں پر رکھ کر آہستہ آہستہ رونے لگیں۔

رضیہ اپنے کمرے میں ایک طرف ہو کر کھڑی دیواروں، الماریوں، میزوں، صوفوں اور پلنگ اور سنگار دان اور قالینوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے اپنا کمرہ سانس لیتا محسوس ہو رہا تھا اور اس کے در و دیوار گویا اس کے دُکھی دل کے ساتھ ساتھ دھڑک رہے تھے۔ کمرے کی الماریاں اور شیلف کتابوں سے خالی تھیں۔ میزوں کے درازوں میں کوئی ضروری کاغذ نہ تھا۔ پلنگ پر صرف موٹا گدّا پڑا تھا۔ کارنس پر چینی کی دو لمبی منقّش صراحیاں پڑی تھیں اور ان کے اوپر بڑا سا کلاک لیمپ کی دھندلی روشنی میں رات کے ساڑھے تین بجا رہا تھا۔ کھڑکی بند تھی اور اس کے آگے قرمزی پردہ تنا ہوا تھا۔ کمرے کی ہر شئے پریشان اور ویران دکھائی دے رہی تھی۔ رضیہ کو کبھی خیال نہ آیا تھا کہ محض میز پر سے کتابیں اُٹھا دینے اور پلنگ پر سے بستر اُٹھا دینے سے کمرہ اُجڑ جائے گا۔ اس کمرے نے رضیہ کو ہر رنگ، ہر موڈ، ہر حالت میں دیکھا تھا۔ اُس کی دیواریں اور پردے اس کے ہمراز اور محرم تھے۔ اُنہوں نے رضیہ کو روتے، آپ ہی مسکراتے، باتیں کرتے، چپ ہوتے، غمگین اور اُداس ہوتے دیکھا تھا۔ اُنہوں نے اُسے پُر اسرار راتوں کی نیلی خاموشیوں میں اُٹھ کر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر جسم پر عطر چھڑکتے اور سنہری کاغذ پر اَن دیکھے اجنبی محبوبوں کو محبت بھرے خطوط لکھ کر دراز میں سنبھالتے اور صبح اِن خطوں کو ندامت سے پھاڑتے دیکھا تھا۔ رضیہ نے پردہ ایک طرف کر کے لیمپ دھیما کر دیا اور کھڑکی کھول دی۔

باہر سردیوں کے گہرے نیلے آسمان پر نکھرے ہوئے ستاروں کی لَویں بھڑک رہی تھیں۔ باغ میں سردی اور اندھیرا تھا اور گہری خاموشی میں لیموں کے پیڑوں سے شبنم کے ٹپکنے کی پُر اسرار آواز آ رہی تھی۔ باغ کے اُوپر درختوں پر تاروں کی دھیمی دھیمی دھندلی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ تازہ اور سرد ہوا رضیہ کی پیشانی کو چھو کر اندر داخل ہونے لگی۔ رضیہ کے کمزور سے جسم نے جھرجھری سی لی اور اس نے گرم شال درست کرتے ہوئے کھڑکی بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ الوداع! لیموں کے پُرانے باغ اور اسکی شاخوں پر سے ٹپکتی ہوئی شبنم! شاید تمہیں دیکھنا پھر کبھی نصیب نہ ہو۔ کھڑکی بند کرتے ہوئے رضیہ نے سوچا۔ جانے اس کھڑکی کو اب کون کھولے گا۔ رات کی خاموشی میں پُرانی وفادار خادمہ کے بڑے بیٹے نے سارا سامان اپنے چھکڑے پر لادا اور سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلی منزل کے تمام کمرے مقفّل کر دیئے گئے۔ دوسری منزل کے کمرے پہلے ہی سے بند تھے اور اندر ٹوٹا پھوٹا بوسیدہ سامان گرد و غبار کی دبیز تہوں میں اٹا ہوا تھا۔ اور اب نچلی منزل کی باری تھی۔ اب اس منزل میں

مکڑیاں جالے بُنیں گی۔ ٹڈیاں انڈے دیں گی اور چوہے قالینوں پہ دوڑیں گے اور بلّی کھلے روشندان میں سے بڑی الماری اور بڑی الماری پر سے میز پر کود کر ان کے شکار کو آیا کرے گی۔ اب دیواروں کا چونا گرنا شروع ہو جائے گا۔ اور دہلیزوں، چوکھٹوں، دروازوں اور کرسیوں کو دیمک لگے گی اور ریشمی گدیلوں والے پلنگوں میں چھپکلیاں آباد ہوں گی۔ بند کمروں کی گھٹی ہوئی فضا میں ایک نئی فضا پیدا ہو گی اور اس نئی فضا کے کیڑے مکوڑے پیدا ہوں گے۔ اب یہ پرانا مکان کبھی آباد نہ ہو گا۔ اس میں جو بھی رہنے آئے گا۔ اسے ایک نہ ایک دن رات کے اندھیرے میں سامان باندھ کر چوروں کی طرح بھاگ جانا پڑے گا۔ اس لئے کہ اس مکان کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں، بنیادوں کو دیمک چاٹ چکی ہے۔ اور اس کے نیچے کھولتا ہوا آتشیں لاوا گردش کر رہا ہے۔ ایسا پرانا مکان جہاں کہیں ہو گا آخر ویران ہو گا اور اس پہ آسیب اپنا قبضہ جمائیں گے۔ نکل جاؤ، نکل جاؤ، ایسے تمام بوسیدہ مکانوں کی چھتوں سے نکل جاؤ۔ یہ لڑکھڑا کر گرنے کو ہیں، ان کے تلے زمین کے بنجر سینے میں بپھرا لاوا دہک رہا ہے۔ یہ بھڑکنے کو ہے، اور پھر بھیانک آواز کے ساتھ زلزلہ آئے گا اور ان حویلی نما کرم خوردہ مکانوں کے ستون تنکوں کی طرح ہواؤں میں اُڑتے نظر آئیں گے۔ بھاگ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ اے پہلی منزل والو! اور دوسری منزل والو......

اور اب میر گھرانے کے یہ آخری دو بدنصیب افراد اپنے آبائی مکان سے بے دخل ہو رہے ہیں۔ دونوں ماں بیٹیاں گرم کپڑوں، گرم چادروں اور اونی شالوں میں اپنا آپ چھپائے، سر جھکائے مکان کے پہلے دروازے میں سے نکل کر سرد دیوان بر آمدے میں سے ہوتی ہوئی بڑے گیٹ کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ ان کے آگے بوڑھی خادمہ ٹوکری اور اٹیچی کیس اٹھائے چلی جا رہی ہے۔ باہر درختوں کے نیچے ایک تانگہ ان کا انتظار کر رہا ہے۔ جب وہ دونوں صدر دروازے میں سے باہر نکلنے لگیں تو دہلیز میں اُگی ہوئی گھاس نے ان کے پاؤں پکڑ لئے۔ ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہی ہو بڑی آپا! چھوٹی آپی؟ پھر کب آؤ گی؟ ہم سردیوں کی ٹھٹھرتی تنہائیوں میں یاد کیا کریں گے۔ شاید اگلی بہار تک ہم زندہ نہ رہیں۔ ہمیں بھی یاد کر لیا کرنا۔ ہم آنے والوں کے قدم چوما کرتے تھے اور جانے والے کے پاؤں پکڑ لیتے تھے۔ اب ہم کس کی راہ دیکھیں گے۔؟ رضیہ کی امی نے ہاتھ سے صدر دروازے کے ٹھنڈے ستون کو چھوا اور جیسے کسی نے ان کے دل کو اپنی مٹھی میں لے لیا۔ رضیہ نے اپنی روتی ہوئی والدہ کے کندھوں پہ ہاتھ رکھا اور قدم قدم چلتی تانگے کی طرف آگئی۔ تانگے میں بیٹھ کر انہوں نے آخری بار مکان پہ نگاہ ڈالی۔ تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ کسی کھڑکی میں کوئی لیمپ نہ جل رہا تھا۔ پچھلے پہر کی افسردہ، پھیکی اور بیمار روشنی اور اندھیرے میں اونگھتے ہوئے مکان پہ ایک ایسے مجرم کا گمان ہو رہا تھا، جسے پھانسی ملنے والی ہو، اور جو اپنی کوٹھڑی میں بیٹھا سر جھکائے گذرے ہوئے دنوں کو یاد کر رہا ہو۔

تانگہ آہستہ آہستہ کھیتوں میں سے گذرنے لگا۔ قصبے کے کھُلے کھیتوں میں جوار اور مکا کی فصل تیار کھڑی تھی اور سرد ہواؤں میں ان کی سوندھی سوندھی مہک رچی ہوئی تھی۔ کھیتوں پہ دُور دُور تک کہرا چھا رہا تھا اور اوپر وسیع آسمان پہ رات کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اور صبح کے خوف سے ستارے کانپ رہے تھے۔ پرانا حویلی نما مکان رضیہ اور اسکی والدہ کی نگاہوں سے آہستہ آہستہ دُور ہو رہا تھا اور اب کھلے پھیکے نیلے آسمان کے پس منظر میں وہ درختوں کے اوپر ایک بڑا سا سیاہ دھبہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس تاریک دھبے میں ان کے پورے خاندان کی تاریخ دفن تھی۔

سٹیشن پہ کہیں کہیں دو ایک لیمپ روشن تھے۔ اونچے نیچے فرش والا پلیٹ فارم دُور تک سنسان تھا۔ پچھلے پہر کی یخ بستہ سردی میں لوہے کے بنچ اوس میں بھیگے ٹھٹھر رہے تھے۔ رضیہ اپنی والدہ اور بوڑھی ملازمہ کے ساتھ بر آمدے میں لکڑی کے بنچ پر بیٹھ گئی۔ اس کا خیال

تھا شاید وہ سعیدہ کے ہاں جا رہے تھے لیکن سٹیشن پر آکر پتہ چلا کہ وہ زبیدہ کے گھر جا رہے ہیں۔ رضیہ کا دل بجھ گیا تھا اور اداس میں بھیگے ہوئے آہنی بنچ کی طرح سردی میں پڑا ٹھٹھر رہا تھا۔ تانگے میں، کھلے کھیتوں کی سردی کھانے سے اس کا کمزور بدن دُکھ رہا تھا۔ اور اس کے پریشان خیالات خلا میں گم شدہ ستاروں کی طرح بے مقصد چکّر لگا رہے تھے۔ ریل کے ڈبّے میں سوار ہوتے ہوئے بڑی آپو نے مکان کی چابیاں بوڑھی خادمہ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"اب سب کچھ تمہارے حوالے ہے"

خادمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بڑی آپو نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ گاڑی چلی تو رضیہ نے آخری بار قصبے کی طرف دیکھا۔ مشرقی آسمان پر رات کے آخری بیمار اور زرد سائے مدھم ہو رہے تھے اور ستاروں کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا سر والدہ کے سینے سے لگا دیا اور دونوں ماں بیٹیاں دُور تک روتی چلی گئیں۔

ڈیڑھ ماہ بعد ہری ناگ والے پُرانے مکان کا سارا سامان نیلام کر دیا گیا۔ یہ بہار کے آغاز کا موسم تھا۔ نہر کنارے کیکر کے درختوں پر بسنتی پھول آ رہے تھے اور ہوا میں ان کا زرد بُور اُڑ اُڑ کر ندی کے پانی اور پکی ڈنڈی پر گر رہا تھا۔ پُرانے مکان کے عقب میں خستہ حال محراب پر چڑھی ہوئی عشق پیچاں اور گلاب کی بیلوں میں ننھی ننھی کلیاں آنکھیں کھولے پتوں کے جھروکوں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ لیموں کے پیڑ بھی سفید پھولوں سے لد گئے تھے اور ان پر شہد کی مکھیاں چکّر لگا رہی تھیں۔ دوسری طرف، مکان کے صدر دروازے کے باہر پہلی اور دوسری منزل کا گرد آلود بڑا ناگم قیمتی سامان نیلام ہو رہا تھا۔ مکان کی بوڑھی ملازمہ اپنی بیٹی لالی کے ساتھ باورچی خانے کے باہر برآمدے کے ستون کے ساتھ لگی کھڑی غمزدہ چہرے اُٹھائے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ دوسری جانب زبیدہ کا خاوند ڈاکٹر اور سعیدہ کا خاوند پروفیسر شہر کی ایک کمپنی اور بنک کے نمائندوں کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

سیاہ لمبے کوٹ والا آدمی چبوترے پر کھڑا چھڑی اُٹھاتے نیلامی بول رہا تھا۔ سامنے قصبے کے زمینداروں جاگیرداروں اور امیر بیوپاریوں کے کارندے کھڑے مال کا جائزہ لے رہے تھے۔ کسی وجہ سے وہ لوگ خود نہیں آئے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے کارندے بھیج دیئے تھے اس مجمع میں قصبے کا ایک بھی دکاندار، گاڑیبان، حجام، نعل ساز، کوچوان اور حلوائی موجود نہ تھا۔ وہ لوگ ایک بھرے گھر کا یوں راج اُلٹا دیکھ گھروں میں بیٹھے افسوسناک انداز میں اُس پر تبصرہ کر رہے تھے اور خدا سے دُعا مانگ رہے تھے کہ وہ ہر گھر کی لاج رکھے۔ دو سپاہی پُرانی وردیوں میں ملبوس سامان کی ڈھیریوں کے درمیان اصیل مُرغوں کی طرح گردن اکڑائے پھر رہے تھے اور یہاں وہاں کسی نہ کسی میز، صوفہ، الماری یا پلنگ کو ڈنڈے سے بجا کر دیکھ لیتے تھے۔

نیلام بڑی تیزی سے شروع تھا۔ سو کا مال دس روپوں میں اور دس روپے کی شئے ایک روپے میں اُٹھ رہی تھی۔ قرض خواہ فوراً رجسٹروں میں اندراج کرتے جاتے تھے اور روپیہ بنک کے ادھیڑ عمر نمائندے کے پاس میز پر جمع ہوتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر سگریٹ سے سگریٹ سلگا رہا تھا اور نیلام کرنے والی کمپنی کے ایک افسر سے کہہ رہا تھا۔

"لندن میں نیلام کرانے والوں کو کمیشن کے ساتھ آنے جانے کا الاؤنس اور دو وقت کا کھانا بھی ملتا ہے اور یہاں ......"

کمپنی کا گنجہ نمائندہ گولڈ فلیک کے سگریٹ کو بگلے کے سگریٹ کی مانند پینے ہوئے سر ہلاتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائے جا رہا تھا۔ اور لمبے سیاہ کوٹ والا دبلا پتلا چار لی سا آدمی کانسی کا پھول کی پتی ایسا بڑا اور منقش تھال ہوا میں لہراتے ہوئے بولا۔

" بولئے حضرات اس کے لئے۔ اس ماسٹر پیس انٹیک کے لئے۔ ہاں ہاں ......"

مجمع میں ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔

" اوئے غلام علی! اسے گھر لے جاؤ اوئے، اماں پان لگائے گی۔"

اور مجمع میں لوگ قہقہے لگا کر ہنس پڑے۔ ڈاکٹر بھی ریچھ کی طرح ہنسنے لگا۔ گنجے نمائندے نے ڈاکٹر کی طرف جھک کر کہا۔

" ویسے یہ تھال پان سگریٹ کی دکان ہی کا ہے۔"

جب سیاہ رنگ کے ایک خوبصورت آبنوسی رائٹنگ ٹیبل کی نیلامی ہونے لگی تو پروفیسر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے بڑے مجمع میں صرف وہی جانتا تھا کہ اس میز پر جھک کر رضیہ ——— وہ یونانی المیہ کی ہیروئن اپنی ڈائری لکھا کرتی تھی۔ اور نہ جنیف، ٹالسٹائی، ژید، ہکسلے، تھارو اور ہیوگو کو پڑھا کرتی تھی۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔

" آپ کہاں چلے؟"

" میں یہ میز خریدنا چاہتا ہوں۔"

نیلامی بولنے والے نے آبنوسی میز کو چھڑی سے بجاتے ہوئے کہا۔

" اور اب اس کالے میز کے لئے ——— سائبان اس کے سیاہ رنگ پر نہ جائیں۔ اس کے گن دیکھیں۔ دیکھئے اس کے چھ دراز ہیں اور اس کا ایک ڈھکنا بھی ہے۔ موٹر گاڑی کی طرح بارش ہو تو ڈھکنا چڑھایا جا سکتا ہے۔ اب بولئے اس کالے نگر ول کے گورے میز کے لئے......"

ایک طرف سے آواز آئی۔

" پانچ روپے۔"

پروفیسر نے فوراً بیس روپے کہہ دیئے۔ سب لوگ اسے تعجب سے دیکھنے لگے۔ نیلامی بولنے والا گنتی دیتا" بیس روپے ایک، بیس روپے دو،" چلاتا رہا لیکن مجمع میں کوئی نہ بولا۔ آخر اس نے "بیس روپے تین،" کہہ کر چھڑی میز پر ماری اور میز پروفیسر کے حوالے کر دی گئی۔ پروفیسر نے روپے دیئے اور بوڑھی خادمہ کی مدد سے میز برآمدے میں ایک طرف رکھ کے کھڑی کر دی پروفیسر نے لالی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

" اچھی ہو بیٹی۔"

لالی نے سر جھکا لیا۔ اسکی ماں نے دوپٹے سے آنسو خشک کرتے ہوئے پوچھا۔

" یہ کیسا راج الٹ گیا بڑے بابو؟"

پروفیسر نے ایک گہرا سانس بھرا اور خاموش رہا۔

....

رضیہ کو اپنی امی کے ساتھ زبیدہ باجی کے ہاں رہتے ہوئے تیسرا مہینہ گذر رہا ہے۔ زبیدہ کے سسرال والوں کی یہ کوٹھی اولڈ کلب روڈ

پر واقع ہے۔ یہ کوٹھی کافی لمبی چوڑی ہے۔ اس کے لان میں کنارے کنارے نصف دائرے کی صورت میں یوکلپٹس کے اونچے اونچے درخت ستونوں کی طرح کھڑے ہیں۔ برآمدے کی محرابوں میں کانٹے دار گھاس کے روغنی گملے لٹک رہے ہیں۔ اس کے دو دروازے ہیں۔ پورٹیکو سے اِن دروازوں کی طرف جاتی ہوئی کمان ایسی کچی سڑک پر حنائی رنگ کی بجری بچھی ہوئی ہے۔ جب کوئی کار اندر داخل ہوتی ہے، تو اس کے پچھلے پہیوں کے ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی گرد اڑا کرتی ہے۔ سڑک کی جانب جھاڑیوں کی دس گیارہ فٹ اونچی دیوار کھڑی ہے۔ اس دیوار کے ساتھ لان میں لالہ اور سورج مکھی کے سُرخ اور زرد پھول مارچ کی دھوپ میں مسکرایا کرتے ہیں۔ رضیہ اور اُس کی امی کو اس کوٹھی کے دو مختصر سے کمرے دے دیئے گئے ہیں۔ ایک کمرے میں سامان اور دو پلنگ بچھے ہیں اور دوسرے کمرے میں دو تین کرسیاں، ایک میز اور کارنس پر چینی کا تھوڑا بہت سامان پڑا ہے۔ اس کمرے کی ایک چھوٹی سی کھڑکی لان کی طرف کھلتی ہے۔ اس وقت رضیہ اس کھڑکی کے ساتھ لگی کھڑی ہے اس کا چہرہ اس قدر ڈھل گیا ہے کہ وہ عُمر رسیدہ عورت معلوم ہو رہی ہے۔ چہرے کا رنگ بھوسلا ہو رہا ہے اور ہاتھوں پر سبز رگیں اُبھر آئی ہیں۔ بھورے حلقوں میں آنکھیں جب کسی شئے کو غور سے دیکھتی ہیں تو پتھر کی معلوم ہوتی ہیں۔ گالوں پر ایک بے رنگ سی مُردنی چھا رہی ہے وہ کتنی دیر سے یہاں کھڑی باہر لان میں ایک طرف ڈھلتے سورج کی نارنجی دھوپ میں اپنی بوڑھی امّی کو دیکھ رہی ہے۔ اُسکی امّی جھاڑیوں کے پھولوں کے پاس سبز کرسی پر بیٹھی کانپتے ہاتھوں میں پلیٹ تھامے چمچ سے دلیہ کھا رہی ہے۔ اس کے سر کے تمام بال سفید ہو چکے ہیں اور بھاری جسم ڈھلک کر نذر ہو گیا ہے۔ گالوں کی ہڈیاں اُبھر آئی ہیں اور چہرے پر گردن تک جھرّیوں اور لکیروں کا ایک جال سا بچھ گیا ہے۔ اس کے پاس ہی زبیدہ کی شوخ و شنگ نندیں ٹینس کھیل رہی ہیں۔ اُنہوں نے رنگین دوپٹے کمر کے ساتھ کس کر باندھ رکھے ہیں اور وہ اُچھل اُچھل کر کھیل رہی ہیں اور شور مچا رہی ہیں اور ان کے کٹے ہوئے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ بڑی نند کا کمسن لڑکا نیلی نکرّ پہنے رضیہ کی والدہ کے پاس جا کر اُسے جھک کر غور سے دیکھتا ہے اور پھر ٹینس کھیلتی ہوئی امّی سے پوچھتا ہے۔

"امّی ...... دادی ...... کیا کھا رہی ہے؟"

رضیہ یہ سب کچھ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے اور جیسے اُسے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ ساتھ والی کوٹھی میں کوئی ریڈیو پر شہنائی بجا رہا ہے۔ شہنائی کی پُر درد آواز میں ایک زخمی فریاد اور لپک ہے۔ جیسے کوئی کھویا ہوا بچہ خواب میں ہمک کر اپنی ماں کی گود میں جانے کی کوشش کر رہا ہو۔ رضیہ کے لئے یہ سنگین افسردگی کوئی نئی نہیں تھی۔ وہ جب سے اس گھر میں آئی تھی اسی طرح تھی۔ اس نے کبھی کسی سے بات نہ کی تھی۔ وہ سارا دن اپنے مختصر سے کمرے میں بیٹھی پڑھتی رہتی، لکھتی رہتی اور اپنی غم نصیب بوڑھی امّی کے پاؤں دبانی رہتی۔ اُس سے اپنی امّی کی روز بروز گرتی ہوئی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ ان کی نظر بے حد کمزور ہو گئی تھی اور سورج کی روشنی میں بھی انہیں دو تین گز کے فاصلے پر سوائے دھند کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ نمکین چائے دن میں کئی بار پیا کرتی تھیں لیکن یہاں انہیں یہ کشمیری چائے صرف دن میں ایک بار صبح کو ملتی تھی۔ کبھی کبھی زبیدہ سب کی نظریں بچا کر اُن کے لئے سبز چائے کا پیالہ بنا کر لے آتی تھی۔ وہ چوری چھُپے انہیں اور بھی بہت کچھ لا دیا کرتی تھی۔ لیکن اپنے تخت سے گری ہوئی شکست خوردہ بوڑھی آپو نے اپنی زبان سے کبھی کچھ نہ مانگا تھا۔ بلکہ وہ زبیدہ کو بھی وہاں زیادہ دیر بیٹھنے سے منع کیا کرتی تھیں سعیدہ شروع شروع میں تقریباً روزانہ ان سے ملنے آیا کرتی۔ مگر کچھ دن گذرنے پر اس نے بھی آنا کم کر دیا۔ کسی نے اس سے گلہ نہ کیا کہ وہ اب ملنے کیوں نہیں آتی۔ پروفیسر نے اپنی بیوی سے چھُپ کر بڑی آپو کو ہر ماہ اپنی تنخواہ کا کچھ حصّہ پیش کرنا چاہا جسے غیور عورت نے قبول نہ کیا۔ بلکہ پروفیسر کے ساتھ کچھ ایسی سرد مہری سے پیش آئی کہ وہ چپکے سے اُٹھ کر چلا گیا اور پھر کبھی نہ آیا ——

ہری ناگ سے جو چند سو روپے بچا کر لائے گئے تھے وہ ختم ہو چکے تھے، زیور ——— پرانے خاندانی زیورات فروخت کرنا بڑی آپا نے گوارا نہ کیا تھا، علاوہ ازیں ان کا خیال تھا کہ یہ زیور وہ رضیہ کو دیں گی۔ رضیہ کے لئے تو کچھ بھی نہیں بچا تھا ——— ہاں! رضیہ کے لئے تو کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ وہ تو خالی ہاتھ اور خالی دامن ہی رہ گئی تھی ——— اس کی پھلواری میں تو بہار میں بھی درختوں کے زرد پتے ہی گرے تھے۔ آج اسکی محبت، اسکی جوانی، اسکی زندگی سلسلہ در سلسلہ تباہ حال کھنڈروں میں برہنہ سر کھڑی تھی اور اسکی ہر اُمنگ، ہر آرزو کا مرثیہ میں پڑ رہا ہوا اسکی نعش پر نوحہ کناں تھا۔ وہ لاشعور کے تاریک جنگلوں میں بھٹکتی پھر رہی تھی اور اُسکی سنگین یادوں کے تمام گیت وقت کی خاک اُڑاتی، ویران صحراؤں میں سجدہ ریز تھے۔ ہائے رضیہ! تیرے سارے بیج گرم ریت میں بوئے گئے تھے۔ تو پھول کہاں سے چنتی! تیرے سارے جگنوؤں کو اندھیوں نے اپنی گدڑیوں میں قید کر رکھا ہے۔ تجھے روشنی کہاں سے آئے گی! یونانی المیوں کی ہیروئن! اپنے کھوئے ہوئے ایتھینز، مائی سینی اور غرناطہ کی تلاش میں نکل جا! شاید تیرا محبوب تجھے شام اور فرات کے نخلستانوں میں کسی چشمے پر مل جائے اور تجھے شمالی افریقہ کے ساحل سے ہوتا ہوا ہسپانیہ کی اُن پتھریلی سڑکوں پر لے جائے جو زیتون اور انجیر کے باغوں کو جا رہی ہوں۔ اور جہاں انگور کی بیلوں تلے مراقشی قالینوں پر تیونسی کنیزیں رقص کر رہی ہوں اور اندلسی مفکر یورپی تہذیب کا خاکہ مرتب کر رہے ہوں ——— !

لیکن رضیہ جس طرف بھی جاتی زبیدہ کا خاوند ڈاکٹر اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا اور وہ بے بس ہو جاتی۔ اب تو بالکل ہی بے بس تھی۔ یہاں اُسکی آہ و زاری سننے والا کون تھا۔ ایک امی تھیں۔ سو ان کی حالت رضیہ سے زیادہ قابل رحم تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے آپ کو ڈاکٹر کے شیطانی حملوں سے بچائے رکھا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے باہر بالکل نہ نکلتی تھی۔ دن بھر کتابوں میں کھوئی رہتی اور رات کو دروازہ اندر سے بند کر کے امی کے پاس سوتی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ کسی طرح اپنی شادی کر لے اور آپا جی کو اپنے ساتھ ہی لے جائے۔ مگر وہ اکیلی کیسے اور کیونکر شادی کرے؟ یونہی اسے کون گھر میں گھسنے دے گا اور اگر وہ کسی گھر میں آباد بھی ہو گئی تو وہاں اسکی کوئی بھی عزت نہ ہو گی۔ وہ بڑے باعزت طریق سے اپنے سسرال جانا چاہتی تھی۔ جہاں کا ہر فرد اس کا اور اس کی امی کا احترام کرے۔ لیکن وہ ہر بار ایسا سوچ کر ہی رہ جاتی پھر اُسے یقین ہو جاتا کہ اُس کا بیاہ کبھی نہیں ہو گا اور کسی ہسپانوی پہاڑ سے نکل کر کوئی اُندلسی شہزادہ اُسے لینے نہیں آئے گا، کوئی سفوکلیس اُسے اپنے ڈراموں کی ہیروئن بنانا گوارا نہ کرے گا اور فرات کی وادی میں کوئی محبوب چشمے پر اس کا انتظار نہ کرے گا، اور وہ یونہی مر جائیگی، اس لمحے اُسے موت بڑی خوفناک دکھائی دیتی۔ مگر جب وہ اپنے نیلے راستوں پہ ڈاکٹر کے بالوں بھرے بھدے جسم کو اپنی طرف بڑھتے دیکھتی تو چیخ مار کر جاگ اُٹھتی اور خدا سے موت کی دعا مانگتی۔ موت ——— تاریک اندھیروں کا اندھیرا، سناٹوں کا سناٹا، تنہائیوں کی تنہائی اور راتوں کی رات!

ایک بار اس نے اپنی امی کے پاؤں دباتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"میرا یہاں دل گھبراتا ہے آپا جی! بہت گھبراتا ہے۔ کیوں نہ ہم ایک آدھ ماہ باجی سعیدہ کے ہاں رہ آئیں"

رضیہ کا خیال تھا کہ باجی سعیدہ کے ہاں اس بہانے جا کر وہ کبھی زبیدہ کے گھر واپس نہ آئیگی۔ مگر اُسکی امی نے وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا اور تنبیہہ کی کہ آئندہ اس گھر کا نام نہ لے۔

"اب ہمارا مرنا جینا اسی جگہ ہے"

اور رضیہ بے بس ہو کر رہ گئی۔ پنجرے میں پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔

باہر لان میں دھوپ یوکلپٹس کے درختوں کی آخری ٹہنیوں کو چوم کر رخصت ہو رہی تھی زبیدہ کی نندیں بدستور ٹینس کھیل رہی تھیں۔ رضیہ کھڑکی کے

ساتھ لگی اسی طرح کھڑی تھی اور بے خیالی میں کبھی اُنہیں کھیلتے دیکھنے لگتی اور کبھی اپنی کمزور و ناتواں ماں کو آہستہ آہستہ دلیہ کھاتے دیکھ رہی تھی۔ اچانک ایک طرف سے گیند اُچھلتی ہوئی آئی اور دلیہ کھاتی بوڑھی عورت کے سر سے ٹکرا کر جھاڑیوں میں جا گری۔ رضیہ کا دل ایک دم ڈوب سا گیا۔ زبیدہ کی پہلی نند نے بلند آواز میں رسمی طور پر معافی مانگی اور دوسری نند جھاڑیوں میں گیند تلاش کرنے لگی۔ کمزور بوڑھی عورت نے کچھ نہ کہا۔ صرف عاجزی سے ان کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر آہستہ آہستہ دلیہ کھانے لگی۔ اور اب اس کے دلیے میں اس کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسو بھی شامل تھے۔ رضیہ کے دل پر برچھیاں سی چلنے لگیں۔ اس نے کھڑکی بند کر دی اور اس کے بند پٹ کے ساتھ سر لگا کر سسکیاں بھرتے ہوئے بچوں کی طرح رونا شروع کر دیا اور باہر دھوپ رخصت ہو گئی۔

بہار گذر گئی تھی اور درختوں پر سے پتے گرنا شروع ہو گئے تھے کہ سعیدہ کے ہاں چاند ایسا لڑکا پیدا ہوا۔ سعیدہ کی ساس، بہو کے اصرار پر زبیدہ کے ہاں آئی تو ساتھ اُن کی بوڑھی آپو کو بھی کنال بینک لیتی آئی۔ اس نے رضیہ کو بھی چلنے کے لئے کہا لیکن وہ راضی نہ ہوئی۔ سعیدہ نے رضیہ کی عدم موجودگی کو ایک لمحہ کے لئے محسوس کیا لیکن دوسرے ہی لمحے اُسے بھول گئی۔ سعیدہ نے زبیدہ، اپنی بوڑھی ماں، زبیدہ کی دونوں نندوں اور اسکی ساس، سبھوں کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دی تھی۔ کھانے پر سب نے بڑی خوش دلی اور سرگرمی کا اظہار کیا۔ زبیدہ کا ڈاکٹر خاوند تو اس قدر کھا گیا کہ اس کا پیٹ ابھر گیا اور وہ کافی پر کافی چڑھانے لگا۔ پروفیسر نے بہت کم کھایا اور سب سے جُدا ہو کر درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر سگریٹ بنانے لگا۔ اس کے اِرد گرد سلیے ہیں درختوں سے گرے ہوئے زرد پتے بکھرے ہوئے تھے۔ سگریٹ سُلگاتے ہوئے اچانک اُسے خیال آیا کہ رضیہ گھر میں تنہا ہو گی۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے چُپکے سے گیرج میں جا کر موٹر نکالی۔ نوکر سے کہا کہ وہ ذرا اسٹیشن تک جا رہا ہے۔ اور سیدھا زبیدہ کی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔

رضیہ اتنی بڑی خالی کوٹھی میں تنہا تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کرسی پر نیم دراز اپنی ڈائری کے پُرانے اوراق پڑھ رہی تھی کہ کوٹھی میں کسی کار کے داخل ہونے کی آواز سُنائی دی۔ وہ چونک پڑی۔ کار کے دھیمے دھیمے ہارن کی آواز بڑی مانوس تھی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے اُٹھ کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ باہر پورٹیکو میں پروفیسر کار کا دروازہ بند کر رہا تھا۔ رضیہ گُم سُم سی ہو کر وہیں کی وہیں کھڑی رہی۔ یہ کیوں آئے ہیں؟ کیا اُسے لینے آئے ہیں؟ وہ کبھی نہیں جائے گی۔ کہیں نہیں جائے گی۔ اب یہاں اس کا کون ہے؟ کسی نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ رضیہ جیسے کسی سحر کے زور سے دروازے کی طرف لپکی اور فوراً چٹخنی کھول دی۔ پروفیسر نے بھورے رنگ کے سرج کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ افسردہ تھا۔

رضیہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"بیٹھئے"

پروفیسر کرسی پر بیٹھ گیا اور کمرے میں بڑی معنی خیز چُپ چاپ طاری ہو گئی۔ رضیہ کو پہلی بار اس کمرے کی خاموشی بڑی مانوس محسوس ہو رہی تھی۔ اس خموشی میں آنے والے دنوں کی غمگین اُمیدیں اور پُرانے دنوں کے سوگوار نوحے تھے۔ وہ خاموش تھی لیکن اُسے اُس خموشی کی پُر محبت سرگوشیاں سُنائی دے رہی تھیں۔ سعیدہ کے خاوند نے اپنے مخصوص انداز میں فکر آمیز آنکھوں کو ذرا اسکیڑ کر کہا۔

"میں ——— میں تمہیں بہت کچھ کہنے آیا تھا رضیہ۔ مگر کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ تم میری باتوں سے بہت بلند ہو۔ میں نے تمہارے سامنے ہمیشہ لفظوں کے پانسے پھینکے ہیں اور تم زندگی کے بھنور میں آتی ہوئی ہو۔ اب صرف اتنا ہی کہوں گا کہ تم شادی کر لو۔ سعیدہ نے آپو جی کے مشورے سے ایک رشتہ تلاش کر لیا ہے۔ لڑکا مجھے بھی پسند ہے۔ کوشش کرنا کہ اس کے ساتھ زندگی کے دو روز ہنس کھیل کر گذار سکو۔"

رضیہ آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ آپ کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں رضیہ۔ اس لئے کہ تمہارے دکھوں کا بھی ایک علاج ہے۔"

"اگر زندگی گذارنا ایک مرض ہے تو مجھے اس کا علاج نہیں چاہیئے۔"

پروفیسر کو اس جواب کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔ وہ ہر قیمت پر رضیہ کو بچانا چاہتا تھا۔ وہ اس بدنصیب روح کو برف کے گہرے شگاف میں گرتے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ رضیہ کو اس تباہی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

"میرا مطلب یہ نہیں رضیہ۔ میں چاہتا ہوں تم اپنے گھر آباد رہو۔ تمہارا بھی ایک خوبصورت گھر ہو۔ تمہارے بھی خوبصورت بچے ہوں۔ تمہاری نگہداری کرنے والا بھی کوئی ہو۔ ذرا آئینے میں اپنی صورت دیکھو۔ تم کیا تھیں۔ تم کیا بن گئی ہو۔"

رضیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اگر خوبصورتی کی تلاش میں نکلا ہوا انسان بدصورت ہو جاتا ہے تو میں دنیا کی سب سے بدصورت عورت ہوں۔ اور اگر نیکی کرنے سے انسان برا ہو جاتا ہے تو مجھ سے زیادہ برا اور کون ہوگا۔"

پروفیسر نے سگریٹ سلگا لیا اور اٹھ کر پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ رضیہ کھڑکی سے باہر درختوں پر دھوپ میں چمکتے زرد پتوں کو دیکھ رہی تھی۔

"مجھے زندگی سے محبت ہے اور جب سے یہ معلوم ہوا ہے کہ مرنا بھی زندگی میں شامل ہے مجھے موت سے بھی محبت ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں مرنے کے بعد بھی زندہ رہوں گی۔ ہو سکتا ہے میں کل سورج کو طلوع ہوتے نہ دیکھ سکوں۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ کل طلوع ہونے والا سورج مجھے نہ دیکھے۔ جہاں میں دفن ہوں گی وہاں زرد گلاب کا پھول اگے گا۔ بھلا جس کی موت پر تر و تازہ پھول اگیں وہ کیسے مر سکتا ہے؟........"

"لیکن رضیہ........"

"زندگی گذارنا ایک آرٹ ہے پروفیسر صاحب بڑا سیدھا اور نیچرل آرٹ، اور جو لوگ اس آرٹ سے واقف ہیں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ زندگی کا تعلق انسٹنکٹ سے ہے لیکن زندگی گذارنے کا تعلق انٹلیکٹ سے ہے۔ میں جانتی ہوں آپ کو مجھ سے دلی ہمدردی ہے۔ اس کے لئے میرا دل خوشی سے لبریز ہے۔ لیکن میں اپنے بنائے ہوئے راستے پر چلنا چاہتی ہوں۔ اگر یہ راستہ پرسکون جھیلوں پر جا نکلا تو میں وہاں چاندنی راتوں میں نیلے کنول چن کر آپ کی ہمدردیوں کے تہوار منایا کروں گی اور اگر تپتے صحراؤں میں جا کر ختم ہو گیا تو میں اپنا صحیح راستہ تلاش کرنے ایک بار پھر آؤں گی ——— ہاں ایک بات آپ سے ضرور کہوں گی۔ اگر میں مر جاؤں تو میرے لئے غم نہ کریں۔ میری قبر پر کسی کو آنسو نہ بہانے دیں۔ بڑی دلبری سے زندہ رہیں۔ زندگی کے الاؤ کو روشن اور بھڑکتا رکھیں۔ اگر یہ الاؤ مدھم ہونے لگے اور لکڑیاں ختم ہو جائیں تو بےشک میری لاش کو بھی اس میں جھونک دیں۔ میں مرنے کے بعد بھی زندگی کی بھٹی میں جلنا پسند کروں گی۔"

رضیہ خاموش ہو گئی۔ اس کا سر کرسی کی پشت سے لگا تھا اور زرد چہرے پر ایک عجیب قسم کی گرم روشنی جھلک رہی تھی۔ پروفیسر میز کے ساتھ ٹیک لگائے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر وہ ایکا ایکی آگے بڑھا۔ اس نے جھک کر رضیہ کے نازک ہاتھ کو بڑے احترام سے چوما اور دروازہ کھول کر

باہر نکل گیا۔ رضیہ ایک عالمِ خود فراموشی میں ڈوبی مجسمے کی طرح پڑی رہی۔ باہر کار کے سٹارٹ ہونے اور دوسرے دروازے سے باہر نکلنے کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دور جاکر یہ آواز خلا میں کھو گئی۔ رضیہ اپنے ہاتھ کو بڑی افسردہ مسرت کے ساتھ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اس مقدس ہاتھ کو اپنے سینے پر رکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔

. . . .

شام ہو رہی تھی۔ لیکن ابھی تک سعیدہ کے ہاں سے کوئی واپس نہ آیا تھا۔ نوکر بھی کہیں سینما وغیرہ دیکھنے چلا گیا تھا۔ اتنی بڑی خالی کوٹھی میں رضیہ کو اکیلے میں کچھ مبہم سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ کچھ دیر وہ لان میں ٹہلتی رہی۔ پھر برآمدے میں بیٹھی پڑھتی رہی اور اس کے بعد اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی اور پلنگ پر لیٹ کر سعیدہ کے خاوند سے اپنی آج کی ملاقات، اسکی خاموشی، اپنی باتوں اور پھر اس کے جھک کر ہاتھ چومنے کے متعلق سوچنے لگی۔ کمرے میں شام کے پہلے مرطوب سائے پھیلنے شروع ہوگئے تھے۔ اس کے دل میں بتی جلانے کا خیال آیا۔ وہ ابھی بتی جلانے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی۔ کہ دروازہ کھلا اور ایک بار پھر وہی بھاری جسم والا سرخ آنکھوں والا ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن آج اس کے پاؤں میں خوفزدہ لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔ وہ یوں کمرے کے وسط میں کھڑا تھا جیسے اپنے جہاز کے عرشے پر کھڑا قیدیوں کو چابکیں لگوانے کا حکم دینے والا ہو۔

رضیہ دھک سے رہ گئی۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

"آپ ...... آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"تم جانتی ہو"۔

ڈاکٹر کی آواز میں کسی قسم کی گھبراہٹ نہ تھی۔ اندھیرے میں اچانک ایک خیال چمکا۔ رضیہ تیزی سے کھلی کھڑکی کی طرف لپکی اور ڈاکٹر نے فوراً اسے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

"اگر تم نے شور مچایا تو یاد رکھو کل تم اور تمہاری سفید بالوں والی ماں سڑک کے کنارے پڑی ہوگی"۔

رضیہ کا جسم برف کی سِل بن چکا تھا۔ سرد اور بےجان۔ اس نے ڈاکٹر کے بازوؤں سے نکلنے کی آخری کوشش کی اور اس کے بعد اسے غش آگیا۔ ڈاکٹر نے اسے اٹھا کر کندھے پر رکھا اور دروازے سے باہر نکل کر کوٹھی کے دوسرے خالی کمروں کی تاریکی میں گم ہوگیا۔

. . . .

رات کو جب سب لوگ کار میں بیٹھے واپس آئے تو رضیہ کی بوڑھی امی نے دیکھا کہ رضیہ پلنگ پر بےہوش پڑی ہے اور کمرے کی فضا میں خون کی بو پھیلی ہوئی ہے۔ اس نے بدحواس ہوکر رضیہ کو ہلایا جلایا اور پھر چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔ امی کی چیخ کی آواز سن کر سبھی اس کمرے کی طرف دوڑے۔ زبیدہ نے فوراً رضیہ کے نصف حصے پر چادر پھیلا دی اور اپنے خاوند کو آواز دی۔ اس کا خاوند بھاگتا ہوا اندر آیا اور اپنی بہن کو دواؤں کا بکس لانے کو کہہ کر مریضہ پر جھک گیا۔

"فکر نہ کریں نبض ٹھیک چل رہی ہے"۔

رضیہ کو فوراً دو ٹیکے لگا دیئے گئے۔ لیکن اسے ہوش نہ آیا۔ رات بھر اس کی بڑی بہن اور بوڑھی ماں اس کے پاس بیٹھی رہیں۔ درمیان میں دو ایک بار رضیہ نے آہستہ سے کراہتے ہوئے کچھ کہا اور پھر بےہوش رہی۔ صبح کینال بینک والی کوٹھی سے بھی سعیدہ کے سوا باقی سب لوگ اولڈ کلب روڈ کی جانب دوڑے۔ سعیدہ کے خاوند نے غور سے رضیہ کا مرجھایا ہوا نیلا چہرہ دیکھا اور باہر نکل گیا۔ رضیہ کا چہرہ نیلا پڑ کر سیاہی مائل

ہو گیا تھا اور ناخنوں کا رنگ بھی نیلاہٹ مائل ہو رہا تھا۔

کلائیوں اور ہتھیلی کی پشت پر اُبھری ہوئی سبز رگیں کھچ گئی تھیں۔ اور بند آنکھیں سیاہ حلقوں میں ڈوب چکی تھیں۔ اور اگر اسکی آنکھیں کھلی ہوتیں تو شاید وہ ڈاکٹر کو اپنے روبرو دیکھ کر پھر کبھی نہ کھلنے کے لئے بند ہو جاتیں۔ رضیہ کی بوڑھی امّی ڈاکٹر کو دیکھتے ہوئے سہمی ہوئی تھی جیسے وہ اپنی بیٹی کے اوپر موت کے بازوؤں کو جھکے ہوئے دیکھ رہی ہو۔ تین روز تک رضیہ حیات و موت کی کشمکش میں لٹکی بے ہوش پڑی رہی۔ بلیڈنگ کسی طرح بند نہ ہو رہی تھی۔ تین روز سے اس کے معدے میں سوائے گلوکوز اور طاقت کی دوائیوں کے اور کچھ نہ گیا تھا۔

چوتھے روز رات کے کسی لمحے اُس نے موت کے تاریک غار میں ڈوبی ہوئی آنکھیں کھولیں۔ ایک بار ——— صرف ایک بار کسی کی تلاش میں، کسی کی جستجو میں، اِردگرد دیکھا اور اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ بوڑھی ناتواں ماں نے اپنی بیٹی کا چہرہ اپنے کانپتے ہاتھوں میں تھام کر محبّت سے پکارا۔

"میری بیٹی، میری بیٹی، میری رضیہ ....!"

رضیہ نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے اور وہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ زبیدہ اور بوڑھی ماں چیخ مار کر لاش سے لپٹ گئیں۔ جاگو! جاگو! میری بیٹی، میری بہن، تم نے تو کہا تھا تم کبھی نہیں مرو گی۔ دیکھو! صندوق میں تیرے بیاہ کے زیور پڑے ہیں اور الماری میں تیری کتابیں تجھے بلا رہی ہیں۔ جاگو! جاگو! آدھی آدھی رات تک پڑھنے والی! تجھے بیاہنے والا اُندلسی شہزادہ آگیا ہے وہ دیکھو اس کا سنہری گھوڑا انجیر کے درختوں میں کھڑا ہے۔ لیکن رضیہ جا چکی تھی۔ نیلی دھند میں ڈوبی ہوئی گمنام پہاڑیوں کی طرف۔ تاریک کہرے میں لپٹے ہوئے اجنبی جزیروں کی طرف ——— او زندگی اور موت سے پیار کرنے والی! ذرا کھڑکی سے باہر دیکھ۔ رات نے تیرے سوگ میں اپنے تمام ستاروں پر سیاہ چادر پھیلا دی ہے اور ہوا درختوں کی لٹکتی ہوئی ٹہنیوں سے گلے لگ کر سسکیاں بھر رہی ہے۔ ہمیں بھی اُس جنگل کا راستہ بتاتی جاؤ جہاں زعفران اُگتا ہے اور جہاں پہنچکر غمزدہ کنواریاں گھر واپس آنا بھول جاتی ہیں۔ اور پھر کھلی کھڑکی میں سے آدھی رات کو چلنے والی ہوا کا جھونکا اندر آیا اور جیسے کسی نے آہ بھر کر خشک آواز میں کہا۔

So sigh we passing over the silver strings

We are the voices of the wandering winds

. . . . wander thou too, O, Prince !

دوسرے دن رضیہ کو ہری ناگ کے آبائی قبرستان میں اپنے باپ کے پہلو میں دفنا دیا گیا۔

دسمبر کی کہر آلود سرد رات ہے۔ بارش ابھی ابھی رُکی ہے۔ کینال بینک کی تمام کوٹھیوں میں اندھیرا ہے۔ صرف ایک کوٹھی کے عقبی کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی ہے اور اندر ادھیڑ عمر کا ایک اُداس چہرے والا آدمی سیاہ آبنوسی میز پر جھکا کسی عورت کے ہاتھ کی لکھی ہوئی پرانی ڈائری پڑھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ والے کمرے میں ایک انتہائی لاغر بوڑھی عورت لحاف میں لپٹی اپنی بیٹی کی یاد میں آنسو بہا رہی ہے۔

اور کینال بینک سے دور ——— باغوں، کھیتوں، میدانوں کے اُس پار قصبہ ہری ناگ کے حویلی نما پرانے مکان کو تاریکی نے اپنی بھیگی ہوئی سرد چادر میں لپیٹ رکھا ہے کسی کھڑکی میں لیمپ نہیں جل رہا۔ اُسکی دیواروں پر گھاس اُگ آئی ہے اور گلاب کی بیل نیچے گر پڑی ہے۔ اور یہاں سے جنوب کی طرف نہر کے پار مغل دربار کی گمنام کنیز کی تربت پر آم کی ٹہنیاں جھکی ہوئی ہیں اور قریب ہی پرانے قبرستان میں ایک جگہ رضیہ دفن ہے۔ اسکی پختہ قبر پر کائی جمی ہے اور اوپر درختوں کی ٹہنیوں میں رُکا ہوا بارش کا پانی ٹپک رہا ہے، رو رہا ہے۔

گوری عورت کا مرد

ابراہیم جلیس

ہوائی جہاز میں سوائے میرے اور ایک نوجوان برمی لڑکی کے سارے مسافر انگریز امریکی اور یورپی باشندے تھے۔ اس لئے ہوائی جہاز بھی آسمانوں میں اُڑنے کے باوجود زمین کی مخصوص ملکی اور قومی تفریقات میں بٹا ہُوا تھا۔ انگریز صرف انگریز مسافروں سے باتیں کر رہے تھے۔ امریکی عورتیں صرف امریکی مردوں کے لئے مُسکرا رہی تھیں اور یورپی باشندے صرف یورپی باشندوں سے ہم کلام تھے۔ جیسے یہ لوگ نہ انسان ہیں اور نہ مسافر ——— یا پھر وہ زندگی کا سفر ہو یا آسمانوں کا سفر۔ ہر جگہ امریکی زیادہ اور انسان کم یا پھر پہلے انگریز اور یورپی اور بعد میں مسافر ہیں یہ میری خوش قسمتی تھی یا ہوائی جہاز کمپنی والوں کا مخصوص رنگی و نسلی تنفر کہ انہوں نے میرے ساتھ والی نشست کسی امریکی انگریز یا یورپی باشندے کو دینے کے بجائے اس نوجوان برمی لڑکی کو دے دی تھی جس کے جسم کا رنگ بھی میری طرح گندمی تھا اور جو میری طرح ایک ایشیائی باشندہ تھی۔

ہوائی جہاز میں ۵۸ مسافروں اور انسانوں کی موجودگی کے باوجود میں اور شاید وہ نوجوان برمی لڑکی بھی انسان سے یوں اجنبیت محسوس کر رہے تھے جیسے ہم ہوائی جہاز میں نہیں بیٹھے ہیں بلکہ رابن سن کروسو کے جزیرے میں پہنچ گئے ہیں۔ یہ شاید ۵۸ انسانوں کے ہجوم میں گھرے رہنے کے باوجود تنہائی کی شکایت یا واضح طور پر محسوس ہوتا ہُوا رنگی و نسلی تنفر ہی تھا جس نے مجھے اور اس نوجوان برمی لڑکی کو بغیر کسی رسمی تعارف کے متعارف کرا دیا تھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کے ایسے دوست بن گئے تھے کہ ہمارا سامنے والا امریکی جوڑا غالباً ہمیں میاں بیوی سمجھ رہا تھا۔

اس نوجوان برمی لڑکی کی رفاقت میں کراچی سے رنگون تک میرا سفر مزے سے کٹ گیا۔ یوں بھی ایک نوجوان لڑکی کا قُرب اور اس سے بات چیت ایک نوجوان مرد کے لئے سب سے اچھا پاسٹ ٹائم ہوتا ہے لیکن اس لڑکی کا قُرب، اس سے دوستی اور اس سے بات چیت اس لئے بھی یادگار رہے کہ وہ لڑکی برما کی ایک ترقی پسند عورت تھی۔ برما کے ایک ترقی پسند اخبار کی رپورٹر۔ جو برطانیہ اور یورپ کے ایک طویل دَورے کے بعد برما لوٹ رہی تھی ——— وہ لڑکی بجائے خود ایک نیا برما تھی۔

رنگون کے منگلاڈون ہوائی اڈے پر وہ لڑکی مجھ سے جُدا ہوگئی۔ مجھے اس لڑکی سے جُدا ہونے کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ البتہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ ابھی مجھے دو ہزار چار سو میل کا سفر طے کرنا ہے میں بالکل تنہا ہوں اور ہوائی جہاز میں نسلی برتری کی آنکھوں کے شرارے ہیں اور رنگی تنفر کا سانپ پھنکار رہا ہے۔

رنگون سے ہانگ کانگ تک اپنی تنہائی کو دُور کرنے کے لئے میں نے میکسم گورکی کے کرداروں کو اپنے گرد جمع کر لیا اور بیئر پیتے اور اپنی نشست پر اُونگھتے ہانگ کانگ پہنچ گیا۔

لیکن ہانگ کانگ پہنچنے اور ہانگ کانگ کے سب سے بڑے اور شاندار ہوٹل ،، کاؤلون پینینشولا ہوٹل میں ٹھہرنے کے باوجود میرا سیاہ فام جسم

سفید رنگ انسانوں کے ہجوم میں تنہا تھا۔ اور نگاہِ لالہ رُخاں میری سیاہ پتلیوں سے ٹکراتی ہی نہ تھیں۔

ایک رات اور ایک دن گذر گیا تھا۔ تنہائی اور ارد گرد سارے کے سارے اجنبی لوگوں کے ہجوم نے میرا جی بولا دیا تھا۔ جدھر نظر اُٹھتی اُدھر چینی جاپانی، انگریز، امریکی، فرانسیسی اور دوسرے یورپی باشندے تھے۔ ایک بھی پاکستانی یا کم از کم ہندوستانی باشندہ نظر نہ آتا تھا کہ اسے پکڑ کر زبردستی دوست بناؤں تاکہ اس بھیانک اجنبیت اور تنہائی سے نجات ملے ———— شہر کے راستے بھی نہیں معلوم تھے کہ باہر گھوم سکتا۔ پہلا سارا دن اور ساری رات ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے جھانکتے لاونج اور ڈانس ہال میں تنہا بیٹھے بیئر اور سگریٹیں پیتے گذر گئی تھی۔ اور دوسرے دن تو کمرے لاونج اور ڈانس ہال سے بھی جی اُکتا گیا تھا۔ اگرچہ ڈانس ہال بڑی دلچسپ جگہ تھی۔ شام اور رات گئے تک اس میں بڑی رونق ہوتی تھی۔ انگریز امریکی اور یورپی تجربہ کے سپاہی شرابوں کے نشے میں دُھت اپنی اپنی "پلیژر گرل" کو جسموں سے لپٹائے ناچتے ناچتے ایسے اوٹ پٹانگ انگریزی گیت گاتے تھے کہ کل آدھی رات تک اُس شور کے باعث میں سو ہی نہ سکا تھا باوجود اس کے کہ میرا کمرہ ہوٹل کے چوتھے فلور پر تھا۔

ہانگ کانگ میں میری دوسری رات شروع ہوئی۔ اور حد سے زیادہ بور ہو کر میں نے طے کیا کہ ہرچہ بادا باد...... میں آج اکیلا ہی ہانگ کانگ کی سیر کروں گا۔ اگر راستہ بھٹک بھی جاؤں تو کیا ڈر ہے۔ کسی ٹیکسی کار میں واپس آجاؤں گا۔ آخر کاؤلون پیننسولا ہوٹل تو یہاں کا سب سے بڑا ہوٹل ہے۔ سارے ٹیکسی ڈرائیور جانتے ہوں گے کیونکہ ہوٹل کے سامنے ہی کتنا بڑا ٹیکسی اسٹینڈ ہے۔ اور یوں بھی تو میری ساری زندگی مہماتی طرز کی رہی ہے۔ ایک اور مہم سہی! ایک اور حادثہ اور ایک اور تجربہ سہی! کم از کم زندگی میں ایسی کوئی بات تو ہوگی جو ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس کے علاوہ میری جیب میں پورے آٹھ سو پچاس ہانگ کانگ ڈالر تھے ———— جب جیب میں پیسہ ہو تو پریشانی پردیس میں بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ہاں اگر جیب میں پیسہ نہ ہو تو اپنے وطن کی اپنی میکلوڈ روڈ پر بھی رُسوا کر دیتی ہے۔

ابھی رات کی بتیاں جلنے میں بڑی دیر تھی۔ نہا دھو کر میں نے اپنا رات کا سوٹ پہنا اور شام نیچے ہوٹل کی لابی میں آیا۔ لابی میں گوروں اور تفریحی عورتوں کا اژدہام تھا۔ میں بھی تفریحاً تھوڑی دیر کے لئے ایک میز پر بیٹھ گیا کہ ایک بوتل بیئر پی کر باہر نکلوں گا تو رات اور بھی سندر نظر آئیگی۔

ایک چینی ویٹرس قریب آئی اور میں نے اُسے آرڈر دے دیا۔

ایک بڑی ٹیوبرگ بیئر اور بلیک اینڈ وہائٹ سگریٹوں کا ایک ڈبہ!

ابھی میں نے بیئر کا پہلا گھونٹ بھی ختم نہ کیا تھا کہ ایک افرنگی حسینہ، ایک دم بھرپور جوانی، ارغوانی رنگ، شانے اور بالائی نصف چھاتیاں عریاں، بال سنہرے، آنکھیں نیلی، جسم بڑا چست اور بھرپور اور سرو قد ———— میرے میز کے قریب آئی اور انگریزی میں مجھ سے کہا۔

"معاف کیجئے۔ کیا آپ نے مسٹر پرکاش چندر کو یہاں کہیں دیکھا ہے؟

پرکاش چندر ————!! میں نے حیرت سے اُسے دیکھا اور انگریزی میں جواب دیا۔

"ویل مادام! میں نہیں جانتا پرکاش چندر کون ہے؟

اس نے کچھ "عجیب" نظروں سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

"کیا تم ہندوستانی نہیں ہو؟

میں نے جواب دیا۔

نہیں۔ میں تو پاکستانی ہوں۔ اور یہ کوئی ضروری بھی تو نہیں کہ ہر ہندوستانی دوسرے ہندوستانی سے واقف ہو جب کہ ہندوستان کی آبادی

۳۲٬۳۰ لاکھ ہے۔

یہ کوئی مسکرانے والی بات تو نہیں تھی لیکن وہ مسکرائی۔ کچھ ایسی پُراسرار مسکراہٹ کہ بیئر کا مگ مُنہ کو لگاتے لگاتے میں نے میز پر رکھ دیا۔ اور غور سے دیکھا کہ مسکراہٹ میں اس کے سُرخ سُرخ ہونٹ کچھ اس طرح کھُلے ہیں جیسے کوئی دعوتی رُقعہ کھُلتا ہے ——— میں اس مسکراہٹ کا مفہوم کچھ کچھ سمجھ گیا اور سوچا کہ دعوت ضرور قبول کرلینی چاہیئے۔ تاکہ پچھلے تین چار روز سے چھٹی ہوئی تنہائی مجھ سے اُلگ ہو جائے۔ دعوت قبول کرنے میں قطعاً دیر نہیں کرنی چاہیئے جبکہ نام نہاد اعلیٰ نسل ادنیٰ نسل کے اتنے قریب آگئی ہے اور سرخ و سفید رنگ سیاہ رنگ میں گھُلنے ہی والا ہے اسی لئے میں نے ذرا سے شوخ لہجے میں کہا۔

"مادام ——— چلو تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لو کہ میں ہی پرکاش چندر ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ کچھ تمہاری خاطر مدارات کروں۔

وہ پھر مُسکرائی جیسے اس نے تھوڑی دیر کے لئے مجھے پرکاش چندر فرض لیا ہو۔ اور شکریہ ادا کر کے سامنے والی کُرسی پر بیٹھ گئی۔ اور بولی۔

"اچھا خیر! میں تھوڑی دیر یہیں بیٹھ کر پرکاش چندر کا انتظار کرونگی"

پھر پرکاش چندر!! مجھے ذرا سا غصّہ آیا لیکن میں نے مسکراتے ہوئے شرارتاً کہا۔

یہ عجیب بات ہے مادام۔ تم اس شخص کا انتظار کر رہی ہو جو بالکل تمہارے سامنے بیٹھا ہے ——— ! اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ تم کیا پیو گی؟ بیئر یا وسکی، برانڈی، شمپئن، پورٹ وائن، شیری ——— کیا پیو گی؟

میں نے اس کے سامنے اتنی بہت سی شرابوں کے نام اس لئے گنا ڈالے کہ اس پر رعب پڑے کہ اس کا میزبان بہت امیر آدمی ہے جو اس کو یہ ساری شرابیں پلا سکتا ہے! وہ ہنس مکھ عورت پھر مُسکرائی اور اپنے ہاتھ پر اپنی بلوریں ٹھوڑی کو ٹکا کر دھیرے سے بولی۔

"شکریہ۔ میں بیئر پی لوں گی"

میں نے ویٹرس کو بُلایا اور پہلا بل ادا کرتے ہوئے میں نے جان بوجھ کر اپنے پرس سے پورے نو سو پچاس ہانگ کانگ ڈالر نکالے تاکہ وہ مجھ سے میرے کالے رنگ سے نہ سہی تو کم از کم ان نو سو پچاس ڈالروں سے مرعوب ہو جائے۔ اور میری دوست بن جائے تاکہ ہانگ کانگ میں میرے اگلے آٹھ دنوں پر اجنبیت اور تنہائی کے بادل نہ چھا سکیں۔

میں نے دیکھا۔ اتنے بہت سے ڈالروں کو دیکھ کر اسکی آنکھوں میں عجیب چمک آئی اور اس نے کہا۔

"تم تو بڑے مالدار آدمی معلوم ہوتے ہو"

میں نے زبردستی بے تکلّف بنتے ہوئے اپنا پرس اسکی طرف بڑھا دیا۔

"لو ——— یہ تمہارا ہے ڈارلنگ۔ تمہاری نذر"

وہ ہلکے سے کھِلکھلا کر ہنس پڑی اور شرما گئی۔ پتہ نہیں کہ وہ اس کے گالوں میں شرم کی لالی تھی یا صرف میکس فیکٹر کا رنگ ——— بہر حال میرا مذاق یا میرے ڈالر اسے بہت پسند آ گئے تھے اور میں اپنے دل ہی دل میں اپنے سابق ہموطن لیکن اجنبی رقیب مسٹر پرکاش چندر سے کہہ رہا تھا۔

اب آؤ نا سامنے مسٹر پرکاش چندر! ذرا تم سے دو دو ہاتھ ہو جائیں"

لیکن دل پھر ڈرا کہ کہیں سچ مچ پرکاش چندر نہ آ دھمکے اور سارا مزہ کرکرا ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ پرکاش چندر کی جیب میں نو سو پچاس سے بھی زیادہ ڈالر ہوں کیونکہ میں نے سُنا تھا کہ ہندوستان کے جو تاجر ہانگ کانگ میں مستقل طور پر آباد ہو گئے ہیں وہ بہت مالدار ہیں۔ بڑے لکھ پتی اور

کروڑپتی ہیں۔ اس ڈر سے میں نے سوچا مجھے ابھی فوراً اپنا تعارف کروا کر اسے بے حد مرعوب کر لینا چاہیئے تاکہ پرکاش چندر ابھی جائے تو وہ میری میز سے نہ اُٹھ سکے۔ اس لئے میں نے اس سے کہا۔

"عجیب بات ہے مادام۔ ہم دونوں بغیر ایک دوسرے سے متعارف ہوئے باتیں کر رہے ہیں حالانکہ اخلاقاً یہ رسم پہلے ہی ادا ہو جانی چاہیئے تھی لیکن میں تمہارے حسن سے کچھ ایسا مسحور ہو گیا تھا کہ سب کچھ بھول گیا۔

اپنے حسن کی تعریف سُنکر اسکی آنکھیں پھر چمک اُٹھیں۔ اور گال لال ہو گئے۔ میں نے کہا:۔

اچھا چلو۔ پہلے میں اپنا تعارف کراتا ہوں۔

تعارف کے دوران میں میں نے اپنے بارے میں ساری باتیں غلط اور مبالغہ آمیز بتائیں۔ یعنی میں نے اس سے کہا کہ میں پاکستان کا ایک کروڑپتی تاجر ہوں اور میری دوکانوں کی شاخیں دُنیا کے سارے بڑے شہروں میں قائم ہیں۔ اب ہانگ کانگ میں بھی ایک شاخ قائم کرنے آیا ہوں، میرا نام حمید خان ہے ——— لیکن سب سے زیادہ زور میں نے جس بات پر دیا تھا وہ یہ ہے کہ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ اور کسی عورت کی محبت میں بھی نہیں مبتلا ہؤا۔

میرے جھوٹ اور مبالغے کے علاوہ میری آخری بات کا شاید اس پر سچا اثر پڑا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی:۔

میرا نام مس سیلیو یا پیڑس ہے۔ اور میں ہانگ کانگ کے مشہور نائیٹ کلب "تھری زیبرو نائیٹ کلب" کی ڈانسر ہوں۔

یہ سُنکر مجھے یک گونہ اطمینان ہؤا لیکن پھر بھی پرکاش چندر کانٹے کی طرح دل میں کھٹک رہا تھا۔ اس لئے میں نے پرکاش چندر کے بارے میں بھی تھوڑی سی معلومات حاصل کرنا ضروری سمجھا تاکہ کانٹا ہٹانے میں زیادہ آسانی ہو۔

مس سیلیو یا پرکاش چندر کے بارے میں بتانے لگی۔

"پرکاش چندر ادھیڑ عمر کا شادی شدہ آدمی ہے"

میں بڑا خوش ہؤا کیونکہ میں تو ابھی نوجوان ہوں۔ اور شادی شدہ ہونے کے باوجود بھی ہر رات عجیب قسم کا غیر شادی شدہ ہو جاتا ہوں۔

"پرکاش چندر کا رنگ گندمی ہے اور اسکی توند بہت بڑی ہے۔"

میرا رنگ بھی گندمی ہے لیکن جوانی کے باعث وہ شاید پرکاش چندر کے رنگ سے زیادہ ہی صاف ہو۔ اور میری توند بھی تو نہیں ہے۔ ایک سلیم اور اسمارٹ نوجوان ہوں جس نے ٹینس کھیل کھیل کر ایسا متناسب جسم تیار کیا ہے میں نے خوش ہو کر مس سیلیو یا کو بیئر کا چوتھا گ پیش کیا۔ تین گ پی جانے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں نشے کے ہلکے ہلکے سے سُرخ دوڑے آ گئے تھے۔ اس کی آنکھیں جو پینے سے پہلے بھی نشیلی تھیں اور زیادہ نشیلی ہو گئی تھیں۔ خوبصورت ہو گئی تھیں۔ دلآویز ہو گئی تھیں بلکہ ہیجان انگیز ہو گئی تھیں۔ اور وہ کچھ کچھ بہکنے لگی تھی اور زیادہ بے تکلف ہو گئی تھی۔ اور اپنی کرسی سے اُٹھ کر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی اور مجھ سے اتنے قریب آ گئی تھی کہ میرے اور اس کے درمیان اتنا فاصلہ بھی باقی نہ رہا تھا کہ پرکاش چندر یا کوئی اور رقیب روسیاہ یا رقیب سُرخ رو (جو میرے سامنے ایک جاپانی لڑکی کو گلے سے لگائے ناچ رہا تھا) وہاں سما سکتا۔ پھر بھی ایک اندیشہ تھا کہ میری اور اس کی دوستی کی مدت صرف چند لمحوں کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پرکاش چندر کی اور اسکی بڑی لمبی اور بڑی پرانی دوستی ہو۔ اور وہ لمبی اور پرانی دوستی اس کو مجھ سے نوچ لینے میں کامیاب ہو جائے۔ اگرچہ میری جیب میں بہت سے ڈالر تھے اور بہت سے ڈالر تو بڑی لمبی اور پرانی

پرانی دوستیوں اور محبتوں کو خرید سکتے ہیں۔ انسان تو کیا بڑے بڑے ملک اور بڑی بڑی قومیں خرید لیتے ہیں ——— ایک اور اندیشہ چپکے سے میرے کان میں یہ بھی کہہ رہا تھا کہ دیکھو دیکھو لابی میں بیٹھے ہوئے سارے سفید رنگ مرد اور عورتیں تھیں اور مس سیلیویا کو ناک بھویں چڑھا کر دیکھ رہے ہیں ——— یہاں سے کہیں چلے جاؤ۔ باہر صرف اسٹریٹ لیمپوں اور ستاروں کی آنکھیں تمہیں دیکھیں گے جن میں نفرت کے بجائے خوشی ہوگی کیونکہ ستارے اور اسٹریٹ لیمپ ہر صبح اور ہر شام اسی طرح اُجالے اور اندھیرے کو اس طرح گڈ مڈ دیکھتے ہیں جس طرح تم اور مس سیلیویا پیرٹس !

میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ باہر چلا جائے۔ سیر کی جائے مس سیلیویا پیرٹس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر سڑکوں پہ آوارہ گھوما جائے۔ ورنہ کہیں پرکاش چندر یا پھر کوئی امریکی راک فلر آ دھمکا تو رات بڑی سنسان اور بہت لمبی ہو جائیگی۔ باہر چلنے پر سیلیویا کو آمادہ کرنے کے لئے میں نے ایک تمہید باندھی۔ میں نے بڑے ڈرامائی انداز میں اپنی تنہائی اور بیچارگی سے اسے متاثر کرنے کی کوشش کی۔ پہلے تو میں نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی جیسے میں بڑا اُداس ہوں اور بولا :۔

" ڈیر مس پیرٹس کتنی عجیب بات ہے کہ تمہارا شہر اتنا پُرشور، اتنا آباد اور اتنا خوبصورت ہونے کے باوجود اتنا ویران ہے کہ مجھ جیسا اجنبی اس میں داخل ہو کر بے حد اداس ہو جاتا ہے۔ میں تو ایک دن اور ایک ہی رات میں تمہارے شہر سے اتنا اُکتا گیا ہوں کہ جی چاہتا ہے کہ آج ہی اسی وقت یہاں سے بھاگ جاؤں۔ بتاؤ۔ مجھے رائے دو۔ کیا میں کل صبح کے ہوائی جہاز سے واپس چلا جاؤں ؟"

مس سیلیویا پیرٹس ایک نائیٹ کلب ڈانسر تھی۔ ایک تفریحی عورت تھی۔ میرے سیاہی مائل رنگ اور میری آریائی نسل سے دل ہی دل میں نفرت کرنے والی ایک سفید نسل تھی لیکن پھر بھی وہ ایک عورت تھی جس کا دل اس کے جسم کی طرح نرم اور گداز تھا۔ اور اس کے علاوہ اس کی آنکھوں میں نشے کی لالی بھی آ گئی تھی۔ اور اس کے بھی علاوہ میری جیب میں پورے نو سو پچاس ہانگ کانگ ڈالر تھے ——— وہ بھلا ایک مسافر کو اپنے نو سو پچاس ڈالر بچا کر کس طرح ہانگ کانگ سے باہر چلے جانے دیتی !! اس نے شاید اداکاری کرتے ہوئے یا پھر سچ مچ متاثر ہو کر میرے ہاتھ پہ اپنا سرخ و سفید ہاتھ رکھ دیا اور عجیب آزردہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

" دیکھیے ——— میں ایک پلیژر گرل ہوں۔ میرا پیشہ اب یہی ہے کہ اجنبیوں کے دل بہلاؤں۔ میں پہلے پہلے امریکی فوج کے ایک دستے کے ساتھ ٹوکیو اور پھر وہاں سے کوریا بھیجی گئی تھی تاکہ میری موجودگی میں امریکی سپاہیوں کو ان کا وطن، ان کی بیویاں یا ان کی محبوبائیں یاد نہ آئیں۔ میں اور میری طرح سینکڑوں لڑکیوں نے اپنی نوجوانی کا آغاز فوجی سپاہیوں کے آغوش میں کیا جب دُنیا میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تھی۔ لیکن اب مجھے ایک سپاہی کی آغوش سے نفرت ہو گئی ہے۔ کوریا سے میں ایک سپاہی کے عشق میں مبتلا ہو کر اس سے بیاہ کرنے اور اس کے بچّوں کی ماں بننے کے خوش آگیں تصوّر کے ساتھ میں سیول سے ہانگ کانگ آ گئی۔ لیکن ہماری شادی سے چار روز پہلے میرے ہونے والے شوہر کو ٹوکیو سے حکم ملا کہ وہ ایک امریکی مرد ہے اس لئے غیر امریکی عورت سے شادی نہیں کر سکتا۔ میرا محبوب میری خاطر امریکی قومیت کو بھی ٹھوکر لگانے والا تھا لیکن ایک رات ایک ہوائی جہاز اسے ہانگ کانگ سے ٹوکیو اور اس کے بعد نہ جانے کہاں اُڑا لے گیا۔ ——— ؟ اب تک میں اُڑتے ہوئے ہوائی جہازوں کو بڑی حسرت سے تاکا کرتی ہوں۔ لیکن ہوائی جہاز بہت بلندیوں پر اُڑتے ہیں اور امریکہ بہت دُور ہے ——— ایک عورت اور ایک مرد کے دھڑکتے ہوئے دلوں کے درمیان پھیلا ہوا ہے ——— "

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں ننّھے ننّھے سے آنسو آ گئے۔ اس نے اپنے بیگ سے رومال نکالا اور آنسو پونچھتے ہوئے زبردستی ہنس پڑی اور بولی :۔

ہاؤ نونسں ایم آئی ——— ! میں کتنی جذباتی ہوگئی تھی۔ معاف کرنا میں تمہیں دراصل یہ بتا رہی تھی کہ مجھے سپاہی کی آغوش سے نفرت ہے۔ کیونکہ سپاہی کی آغوش ایک عارضی آغوش ہے اور اس کی آغوش اتنی لچکدار ہوتی ہے کہ اس میں ہر جسامت کی عورت سما سکتی ہے۔ ایک دُبلی پتلی عورت کے لئے اس کی آغوش سکڑ جاتی ہے اور ایک موٹی بھاری بھرکم عورت کے جسم کے لئے اس کی آغوش یا تو بہت زیادہ ڈھیلی ہے یا بہت زیادہ تنگ ——— اس کی آغوش میں ایک اور صرف ایک عورت ہمیشہ کے لئے کبھی فٹ نہیں آسکتی ——— اور پھر اس آغوش کی گرمی کی مدت ہی کیا ہے؟ صرف ملٹری پولیس کے بوٹوں کی آواز یا میدانِ جنگ کا بگل ——— پھر اس کے بعد سپاہی چلا جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد عورت مہیب تنہائی کے آغوش میں گر پڑتی ہے۔ پھر اس کے بعد سپاہی کبھی واپس نہیں آتا۔ پھر اس کے بعد عورت آبادیوں پر سے گزرنے والے ہر ہوائی جہاز کو دیکھ کر رو پڑتی ہے۔

اسی لئے بالکل اسی لئے میں اب سپاہی کی آغوش سے اُکتا گئی ہوں اور مجھے ایک ایسی آغوش کی تلاش ہے جس میں میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک سمائی رہوں۔

شاید مس پیبرٹس کو بہت نشہ ہو گیا تھا اور وہ یہ بھول کر کہ میری جیب میں تو سو پچاس ڈالر ہیں اور وہ ایک گاہک پھانسنے والی تفریحی عورت ہے سچی سچی باتیں کرنے لگی تھی اور اچانک "عورت" بن گئی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ کاش چند رکی آغوش اسے دن بدن "عورت" میں تو نہیں تبدیل کر رہی ہے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کاش وہ صبح تک اسی طرح عورت ہی رہے۔ اس کے جسم میں جو سچ مچ کی عورت جاگ پڑی ہے وہ صبح تک جاگتی ہی رہے کیونکہ میں اسے رات کا ساتھی یا بستر کا ساتھی نہیں بنانا چاہتا تھا بلکہ میں چاہتا تھا کہ چند گھنٹوں کے لئے سہی ایک سیاہ اور ایک سفید جسم اسی طرح بغلگیر رہیں۔ اور اس کے علاوہ میں جنسی بھوک سے نہیں بلکہ غریب الوطنی اور اپنے آپ سے باتیں کرتے کرتے اُکتا گیا تھا۔ اسی لئے میں اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا:۔

اچھا مس پیبرٹس! آؤ چلو۔ اب کہیں باہر چلیں۔ کسی ہوٹل میں ڈنر کھائیں اور کوئی فلم دیکھیں اور اس کے بعد تمہارے نائٹ کلب بھی چلیں گے۔!

اچانک مس پیبرٹس کے جسم سے "عورت" غائب ہو گئی اور نائٹ کلب گرل لوٹ آئی۔ اس نے ذرا سنبھل کر جواب دیا۔

" میں اس طرح تمہارے ساتھ باہر نہیں جا سکتی۔ بے تکلفی معاف۔ اتنی ساری باتوں کے باوجود میں ایک نائٹ کلب کی ملازم ہوں۔ اور میرا کام نائٹ کلب کے لئے وزیٹرس فراہم کرنا ہے۔ اگر میں کسی کے ساتھ باہر جاؤں تو ہمارا نائٹ کلب ساتھ جانے والے سے دس ڈالر وصول کرتا ہے۔ اگر میں کسی کے ساتھ رقص کروں تو مزید دس ڈالر اور اگر ——— اگر ......

" اگر" کے آگے وہ مسکرائی۔ کچھ نہ کہہ سکی۔ اور کچھ کہنے کی ضرورت بھی کیا تھی جب کہ " اگر" کے آگے کی بات کہنے کی ہوتی ہی نہیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

" تم ڈالروں کی فکر نہ کرو۔ ڈالر تم سے زیادہ قیمتی نہیں ہیں "

ہم ہوٹل سے باہر نکلے ٹیکسی میں بیٹھ کر دریا کے کنارے پہنچے۔ ہانگ کانگ شہر ایک جزیرہ ہے جہاں فیری بوٹ سے جانا پڑتا ہے۔ ایک دو منزلہ فیری بوٹ تیار کھڑی تھی۔ اس فیری کے ذریعے دس منٹ کے اندر ہم جزیرہ ہانگ کانگ کے بلیک پیئر فیری ہالٹ پہنچ گئے۔ بلیک پیئر سے تھری زیرو نائٹ کلب ٹیکسی کے ذریعے ۱۵ منٹ کا راستہ تھا۔

تھری زیرو نائٹ کلب کے کاؤنٹر پر جب میں نے ایک بوڑھی موٹی فرنگی عورت کو مس پیبرٹس کی رفاقت کے دام ادا کرنے کے لئے پرس کھولا

تو مس پیڑس ایک منٹ کی اجازت لے کر ٹائیلٹ روم میں چلی گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد کاؤنٹر پر کھڑی ہوئی بوڑھی موٹی فرنگی دلالہ نے منہ بنا کر تلخ لہجے میں کہا۔

"ہم اپنی لڑکیوں کو ایشیائی باشندوں کے ساتھ نہیں بھیجتے۔ تم چاہو تو دوسری لڑکی ساتھ لے جا سکتے ہو! ہمارے پاس ایشیائی لڑکیاں بھی ہیں۔ برمی، ملائی، سیامی، جاپانی، چینی ——— تم کس کو پسند کرو گے؟

میں نے اس خبیث بڑھیا کو بڑی نفرت سے گھور کر دیکھا اور بولا۔

میں یہاں عورت کا جسم خریدنے نہیں آیا ہوں۔ مجھے صرف ایک ساتھی کی تلاش ہے جو اس اجنبی شہر میں میری تنہائی کو دور کر سکے اور مجھے اس شہر کی سیر کرا سکے۔ میں وہ ہانگ کانگ دیکھنے نہیں آیا ہوں جس کو دیکھنے کے لئے سیلیو یا پیڑس کے جسم سے گزرنا پڑتا ہے۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اس کو ایشیا کی قوت کا مزہ چکھاتا۔ اور پھر یہ بتاؤ جب تم اپنی نام نہاد اعلیٰ نسل اور نام نہاد سفید رنگ کی عظمت اور عزت بیچ ہی رہی ہو تو پھر یہ کیوں دیکھتی ہو کہ خریدار کا رنگ کیا ہے اور وہ کس نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ تم تو صرف ڈالر گنا کرو۔!

بوڑھی حرافہ غصّہ سے بڑے زور سے چیخ پڑی ——— شٹ اپ!! ——— کہ ہال میں بیٹھے ہوئے بہت سے امریکی انگریز اور دوسرے سفید فام عیاش اپنی اپنی میزوں سے اُٹھ کر کاؤنٹر کے قریب آگئے۔ ان کو دیکھ کر بوڑھی حرافہ جیسے اور زیادہ شیرنی ہو گئی اور زیادہ تیز آواز میں چیخنے لگی۔ یہ شور سن کر مس پیڑس بھی دوڑی دوڑی آئی۔ اس نے مجھ سے ماجرا پوچھا۔ تو میں نے اس کو ساری بات دو تین جملوں میں بتا دی۔ ہو سکتا تھا کہ اس نائیٹ کلب میں یا اُس امریکہ یا اُس برطانیہ میں ایک چھوٹی سی نسلی و رنگی لڑائی چھڑ جاتی لیکن مس پیڑس جسے سپاہی کی آغوش سے نفرت ہے جسے جنگ سے نفرت ہے اور جو خوبصورت ہونے کے علاوہ سمجھدار بھی ہے اس نے بوڑھی حرافہ کی طرف غضبیلی نظروں سے دیکھا اور ذرا کرخت لہجے میں بولی۔

ممّی۔ یہ میرا مہمان ہے۔ میں اسے یہاں ساتھ لائی ہوں۔ تمہیں میرے معاملے میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

اور پھر اس نے مسکرا کر اردگرد جمع ہونے والے سفید فام رقیبوں سے کہا کہ وہ اپنی اپنی میزوں پر چلے جائیں۔ سفید فام رقیب مس پیڑس کو غصّہ اور شکایت کی نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی اپنی میزوں پر چلے گئے۔ پھر مس پیڑس نے بے تکلفی سے میری جیب میں ہاتھ ڈال کر میرا پرس نکالا اور اس میں سے ۸۰ ڈالر گن کر نکالے اور کاؤنٹر پر ممّی کے سامنے پھینکتے ہوئے مجھ سے بولی۔

ڈیر لٹل کوئر تھینگ ——— آؤ چلتے ہیں۔

اس وقت اس کا سفید ہاتھ میری کمر کے گرد تھا۔ ممّی کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں اور وہ جیسے سفید نسل پر سیاہ نسل کے بڑھتے ہوئے سائے سے خوفزدہ اور خشمگیں تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس حرافہ کی آنکھوں کے سامنے اپنی رنگی و نسلی بے بسی کا انتقام لے لوں کیونکہ میں نے صرف ۸۰ ڈالروں کے عوض ایک تمکنت آفریں رنگ اور ایک پوری مغرور سفید نسل خرید لی تھی۔ یہ ایک بہت گھٹیا اور بڑا رجعت پسندانہ فعل سہی لیکن کبھی کبھی گھٹیا پن پر بھی فخر سا محسوس ہوتا ہے۔

میں مس پیڑس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر باہر نکلا لیکن دروازے پر ہی میری نظر ایک نوجوان جاپانی لڑکی پر پڑی جو ایک بلیک نیگرو امریکی سپاہی سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ جاپانی لڑکی ایک ننھی منّی سی خوبصورت گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا چھوٹا سا بھولا بھالا پیلا چہرہ، سر پر پگوڈا کی چھت کی طرح سنوارے ہوئے بال۔ سرخ بیل بوٹوں والا زرد فراک، اس میں کسا کسا ٹھگنا جسم اور چھوٹی چھوٹی چندھی آنکھیں ———

باتیں کرتے کرتے اس امریکی سپاہی نے اس ننھی سی جاپانی لڑکی کی کمر میں اپنی لمبی لمبی بانہیں ڈال دیں اور اسے اپنی بانہوں میں بری طرح جکڑ لیا۔ جیسے جاپان کی دوبارہ اسلحہ بندی ہو رہی ہو ———— میں نے پیٹرس کی طرف اور پھر پلیٹ کر کاؤنٹر پر ممی کی طرف دیکھا جو اپنے پوپلے منہ میں سے میلے پیلے دانت نکالے مسکرا رہی تھی۔ ایک ایشیائی مرد ایک انگریز عورت کی کمر میں ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے تو اس بڑھیا کے چہرے پر تیوریاں پھیل جاتی ہیں لیکن اگر ایک امریکی مرد ایک ایشیائی عورت کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیتا ہے تو اس کے میلے پیلے دانت پوپلے منہ سے باہر نکل پڑتے ہیں ———— جاپانی لڑکی اس امریکی مرد کی بانہوں سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی اور اپنا منہ اس کے بڑھتے ہوئے منہ سے بچانے کے لئے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہہ رہی تھی۔

" مجھے چھوڑ دو ———— مجھے تنگ نہ کرو۔ پہلے ممی سے دام طے کر و "

اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ لڑکی نہیں بلکہ سارا جاپان چیخ چیخ کر اس امریکی سپاہی سے کہہ رہا ہے۔

گو بیک یانکی !

گیٹ جاپان یانکی !!

گو ہوم یانکی !!!

اسی اثنا میں میں نے دیکھا کہ یانکی نے جاپانی لڑکی کے ہونٹوں سے زبردستی ایک بوسہ چرا لیا جیسے صلحنامہ جاپان پر امریکہ نے دستخط ثبت کر دیئے ہوں۔ مجھے پتہ نہیں غصہ آیا یا میں بیئر کے نشے میں بہک گیا تھا۔ میں کاؤنٹر کی طرف جانے لگا۔ مس پیٹرس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

واپس کہاں جا رہے ہو ؟

میں نے کہا :-

ڈارلنگ سیلیویا ———— کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اس لڑکی کو بھی اپنے ساتھ لے چلیں، مجھے یہ لڑکی بھی پسند آ گئی ہے ۔

مس سیلیویا پیٹرس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔

" یا تو تم بہت پی گئے ہو یا سچ مچ عجیب آدمی ہو۔ کیا میں ایک کافی نہیں ہوں ؟

میں نے سیلیویا کو اپنے اور قریب کھینچتے ہوئے کہا۔

ڈارلنگ سیلیویا ———— بس، میں صرف ایک کمپنی چاہتا ہوں صرف رفاقت ————

مس سیلیویا نے کوئی اعتراض نہیں کیا ———— اور یوں بھی اسے اس کے دام مل چکے تھے۔ میں نے کاؤنٹر پر جا کر اس جاپانی لڑکی کے لئے ۸۰ ڈالر نکالنے چاہے تو مس سیلیویا نے مجھے روک دیا اور کہا۔

صرف پچاس ڈالر کافی ہیں ! وہ جاپانی لڑکی ہے نا ———— ایشیائی لڑکیوں کے دام کم ہوتے ہیں۔ میں چونکہ انگریز عورت ہوں اس لئے ————

میں نے دل ہی دل میں سوچا یہ دنیا کیسا بھیانک بازار ہے ! میدانِ جنگ ہو یا قحبہ خانہ۔ ایشیائی جسم دونوں جگہ کوڑیوں کے مول بک رہے ہیں ———— غصہ اور ندامت سے میرا برا حال ہو رہا تھا لیکن میں نے پچاس ڈالر ادا کر دیئے اور ایک ہاتھ مس سیلیویا کی کمر میں اور ایک ہاتھ جاپانی لڑکی کی کمر میں ڈال کر بڑے فاتحانہ انداز میں اس امریکی سپاہی کے قریب سے گزرا۔ امریکی سپاہی نشے میں دھت نائٹ کلب کی ایک ستون سے ٹیک لگائے کہہ رہا تھا۔

" جونی ———— اینجائے اینجائے۔ زندگی بغیر عیاشی کے کچھ بھی نہیں۔ وِش یو اے ہیپی نائٹ ! لیکن مجھے بتاؤ تم کہاں جا رہے ہو۔ تم تو کہو

جا رہے ہو ——— میں جانتا ہوں تم ٹوکیو جا رہے ہو!

میں نے طنزیہ مسکراہٹ میں جواب دیا۔

" نہیں ——— میں ٹوکیو نہیں ——— میں تو وال اسٹریٹ جا رہا ہوں بانکی!"

وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

" سلی ——— وال اسٹریٹ بہت دور ہے۔ بہت دور ہے!"

میرا جی چاہا کہہ دوں۔

بیوقوف ——— وال اسٹریٹ کہاں دور ہے۔ وہ تو اب بھی میری بغل میں ہے۔

آدھی رات تک اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد میں مس سیلیویا اور جاپانی لڑکی کے ساتھ اپنے ہوٹل لوٹا۔ اور اپنے ڈرائنگ روم کے لمبے صوفے پر جاپانی لڑکی کو لٹاتے ہوئے میں نے کہا ———

میری چھوٹی سی گڑیا ——— تم صبح تک یہیں سوتی رہو۔ آرام سے سوتی رہو ——— !

جاپانی لڑکی حیرت سے میرا منہ تکنے لگی لیکن میں نے اپنے بستر کا کمبل اس پر اُڑھا دیا۔ وہ ٹکر ٹکر مجھے گھورے جا رہی تھی۔ اور میں شب بخیر کہنے کے بجائے اس کی پیشانی کا بوسہ لے کر اپنے بیڈ روم میں لوٹا اس وقت مجھے بڑی خوشی محسوس ہو رہی تھی جیسے میں نے اس جاپانی لڑکی کو امریکی نائٹ کلب سے آزاد نہیں کرایا ہے بلکہ جاپان کو امریکہ کے گناہ آلود اندھیرے سے بچا لیا ہے۔ اس کو اسلحہ بندی سے بچا لیا ہے۔ اس کے جسم کو مزید دستخطوں کے داغوں سے محفوظ کر لیا ہے ——— صرف ایک ہی رات کے لئے سہی ——— ایک رات بھی تو کبھی کبھی ایک عورت کی پوری زندگی کو سنوار دیتی ہے۔

بیڈ روم میں مس سیلیویا اور میں پھر بیئر پینے لگے۔ مس سیلیویا نے ایک بار گھڑی دیکھ کر جمائی لیتے ہوئے کہا۔

" اُف وہ ——— ساڑھے چار بج رہے ہیں۔ تم سوتے نہیں کیا؟"

میں نے مس سیلیویا کے سُرخ و سفید جسم کو اپنے سیاہ جسم کی آغوش میں بھینچ کر کہا۔

ڈارلنگ سیلیویا ——— اب سونا کیا ہے ——— ! اب صبح ہو رہی ہے۔ اب ہم یونہی ایک دوسرے سے بغلگیر بیٹھے صبح کے اُجالے کا استقبال کریں گے۔

سیلیویا نے مسکراتے اور شرماتے ہوئے پوچھا۔

لیکن تم جس کام کے لئے مجھے یہاں لائے تھے ——— وہ ——— وہ، اس کا کیا بنے گا ———؟

میں نے اس کے سنہرے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

سیلیویا پیاری ——— وہ کام تو کبھی کا ہو چکا۔ اور اب رات گزر چکی ہے اور اب صبح ہو رہی ہے!

سیلیویا نے ایک جمائی لیتے ہوئے میرے شانے پر سر رکھ دیا اور بولی۔

تم سچ مچ بڑے عجیب آدمی ہو۔ مجھے تو بہت نیند آ رہی ہے میں تو اب سوتی ہوں۔

شاید سیلیویا نے آنکھیں بند کر لیں مگر میں نے کہا۔

سیلیویا ——— اب تم سوجاؤ تو کوئی ہرج نہیں۔ لیکن میری یہ بات یاد رکھو اسی زمین پہ ایک اور صبح بھی ضرور طلوع ہو گی جب سارے انسانوں کا ایک رنگ ہو گا ——— سفید اور کالا نہیں ——— صرف انسانیت کا رنگ ——— کسی نائیٹ کلب کے اندھیرے میں نہ تو تمہارا رنگ بکے گا اور نہ میری نسل بے آبرو ہو گی۔ سنتی ہو پیاری سیلیویا ——— میں آج ——— میں آج بہت ....

سیلیویا جیسے نیند میں بڑبڑاتے ہوئے بولی۔

"ڈارلنگ! تمہیں سخت نشہ ہو رہا ہے۔ تم بڑی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو، اب سو جاؤ ——— آؤ سو جاؤ!"

اس کے بعد سیلیویا سو گئی۔

اس کے بعد رات مر گئی۔

اس کے بعد صبح ہو گئی۔

اور اس کے بعد انسان جاگ پڑا۔

اِندر سبھا

محمد احسن فاروقی

(۱)

"بیٹا۔ میں اندر سبھا کی ماری ہوئی ہوں" ان محترمہ نے کہا۔

ان کی آواز میں وہی ترنم تھا۔ ان کی زبان میں وہی شیرینی تھی۔ اور ان کے لہجے میں وہی سحر تھا جو ہمیں میر انیس کے کلام میں ملتا ہے۔ میں نے ان کو تعجب سے دیکھا۔ وہ بہت ہی بڈھی تھیں مگر ان کو دیکھ کر بے تحاشہ عرفی کا یہ شعر یاد آیا۔

کسے کہ محرمِ بادِ صباست می داند
کہ باوجودِ خزاں بوئے یاسمن باقیست

کسی جادو کے اثر سے ایک لمحے کے لئے میں اب سے کوئی اسّی برس پیشتر کی دُنیا میں پہنچ گیا اور وہ مجھے ایک نازک بدن نازک ادا نازنین نظر آئیں۔ میں کچھ چکرا سا گیا مگر فوراً سنبھل گیا لیکن اب ان کے چہرے کی جھریوں۔ ان کے پھٹے مگر صاف کپڑوں اور ان کے بیٹھنے کے انداز میں ایک ایسا حسن نظر آتا تھا جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

"بیٹا میری آپ بیتی سُن کے تم کیا کرو گے۔ فضول رنج ہوگا۔ میرے لئے کھانے کا انتظام کر دو۔"

میں نے فوراً جیب سے روپیہ نکالا اور ان کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا "یہ حاضر ہے۔ شاید کافی ہوگا۔"

وہ مسکرائیں اور بولیں "میں اس کا کیا کرونگی۔ مجھے پکا پکایا کھانا جو تم سے ممکن ہو لا دو۔ دو دن سے کوئی ادھر آیا ہی نہیں۔ میرے سوکھے ٹکڑے بھی ختم ہو گئے۔ وہ بڑا رزاق ہے۔ اس نے تمہیں بھیجدیا۔ مجھے کھانا لادو کہیں سے جو کچھ ممکن ہو۔"

میں فوراً چبوترے پر آیا۔ اس سے اُتر کے جوتے پہنے اور حسین آباد کے امامباڑے کی طرف روانہ ہوا۔ ان آثاروں میں سے گزرتا ہوا جو بن کر تیار بھی نہ ہونے پائے تھے کہ بگڑنے لگے میں امامباڑے کے سامنے والی سڑک پر پہنچا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس سڑک پر آگے بڑھ کر ایک نانبائی کی دکان تھی اور اس دکان پر پہنچکر میں نے دو آدمیوں کے کھانے بھر کا جس جس قسم کا پکوان تیار تھا خریدا اور ایک کپڑے میں بندھوا کر ہاتھ میں لٹکائے ہوئے واپس ہوا۔ وہ شاندار مسجد جس کے آثار دیکھنے کے لئے میں خاص طور پر آج آیا تھا میرے سامنے تھی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں اس کے شاندار کائی چڑھے ہوئے گنبدوں کو اور پرندوں کے گھونسلوں سے پُر میناروں کو چمکا کر ایک عجیب حسرت زدہ اثر پیدا کر رہی تھیں۔ میں حسین آباد کی سڑک پر سینکڑوں دفعہ گزرا تھا اور میں نے اس مسجد کو دُور سے دیکھا تھا۔ مگر آج پہلی دفعہ وقت نکال کے اس کے اندر آیا تھا۔ اور وہاں ان محترمہ پر نظر پڑی تھی جن کے لئے نہایت شوق کے ساتھ میں کھانا لئے جا رہا تھا۔

اودھ کے جس بادشاہ نے اس مسجد کی تعمیر شروع کرائی تھی اس نے دہلی کی جامع مسجد اور لاہور کی شاہی مسجد کے مقابلے کی عمارت بنانے کا خواب دیکھا تھا۔ مگر اس کی تعمیر کو وہ خود ہی آگے نہ بڑھا سکا یا پھر اس کے جانشینوں نے تعمیر رکوا دی اور وہ حصے جو بننے بھی نہ پائے تھے برباد ہونا شروع ہو گئے۔ پھر بھی کسی نے جتنا حصہ کہ بن گیا تھا اس کو اتنا مکمل کر دیا تھا کہ ایک کافی شاندار مسجد اور اس کے سامنے کافی بڑا چبوترا اپنی جگہ پر مکمل پورے وسیع رقبے کے ایک کونے پر رکھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس وقت جب میں گرم رفتاری کے ساتھ اس مسجد کی طرف بڑھ رہا تھا تو میرے ذہن میں ایک معنی خیز خیال آیا۔ مجھے یہ مسجد لکھنؤ کی تہذیب کا ایک سمبل یا اشارہ معلوم ہوئی اور وہ محترمہ جن کو میں اس مسجد میں چھوڑ آیا تھا اس مسجد کا انسانی صورت کا مجسمہ سمجھ میں آئیں۔

اس شاعرانہ خیال کی حقیقت پر غور کرتا ہوا میں مسجد کے اُس حجرے میں پہنچ گیا جس میں میں ان کو بیٹھا چھوڑ آیا تھا۔

میں نے کھانا ان کے سامنے رکھا تو وہ اپنے نفیس لہجے میں دعائیں دینے لگیں "جیتے رہو بیٹا۔ آباد رہو۔ پھولو پھلو شاد رہو۔ خدا تمہارے روئیں روئیں میں ہزار ہزار جانیں دے۔ جب تک گنگا جمنا میں پانی ہے جب تک جیو۔ اپنے خاندان کی بہار دیکھو......"

یہ کہتے کہتے ان کی نظر کھانے پر پڑی جو میں نے کپڑے سے کھول کر ان کے سامنے لگا دیا تھا اور وہ کہنے لگیں "اے اتنا ایک ساتھ لے آئے بیٹا۔ اتنا میں کہاں کھاؤں گی۔ خیر روٹیاں سوکھا کے رکھ لونگی وقت بے وقت منہ میں ڈال لونگی"۔

وہ کھسک کر حجرے کے ایک کونے میں گئیں اور وہاں سے بدھنا اٹھا کر کھسکتی ہوئی دروازے پر آئیں۔ باقاعدہ ہاتھ منہ دھو کر وہ کھانے کے پاس آئیں اور ایک روٹی توڑ کر شوربے میں بھگونے لگیں۔ اسی درمیان میں انہوں نے منہ اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولیں "سلامت رہو بیٹا اب سدھارو"۔

"میرے ابھی آپکے پاس سے جانے کو جی نہیں چاہتا"۔

"اے ہاں تم کو میری آپ بیتی سُننے کا شوق ہے۔ میرے واقعات داستان ہیں داستان طلسم ہوشربا کی سی جلدیں بھر جائیں"۔

"تو میں روز آجایا کرونگا سُننے کی مجھے بڑی دلچسپی ہے"۔

"اونہہ بیٹا۔ تمہاری بھی باتیں۔ کسے یارا ہے اب سنانے کا اور نہ سنو میری داستان نہ سنو۔ خیر میں بوڑھی آڑھی آدمی ہوں۔ جو دم آتا ہے وہ آتا ہے۔ میں تمہیں ایک نصیحت کر سکتی ہوں۔ اس کو گرہ میں باندھ کے رکھنا۔ بیٹا کبھی اندر سبھا نہ دیکھنا۔ کوئی کتنا ہی کہے پاس نہ پھٹکنا خدا کی مار ہے اس کے کرنے والے پہ بھی اور دیکھنے والے پہ بھی"۔

"اندر سبھا؟ اب تو کہیں بھی نہیں ہوتی۔ پرانے زمانے میں سُنا ہے ہوا کرتی تھی مگر اب تو کوئی نام بھی نہیں لیتا"۔

"اچھا۔ سچ کہہ رہے ہو۔ کب سے بند ہو گئی"۔

"میرے خیال میں کوئی تیس چالیس برس تو ضرور ہو گئے ہوں گے"۔

"تو ان انگریز بندوں نے بند کرا دی ہو گی"۔

"جی نہیں۔ اب رواج ہی نہیں رہا۔ کسی کو دھیان ہی نہیں"۔

"اچھا۔ تو اب یہ زمانہ ہے۔ بڑا اچھا زمانہ ہے۔ ہا۔ کاش میری بیگم اب پیدا ہوئی ہوتیں"۔

"آپ کی بیگم؟ میں سمجھتا ہوں آپ خود بیگم ہیں"۔

"میں نگوڑی کہاں سے بیگم آئی۔ میں ٹکے کی لونڈی تھی۔ میری قسمت میں یہ تجربے لکھے تھے۔ کال میں میرے ماں باپ میری بیگم کے والد کے ہاتھ دو روپے کا

نہ بیچ گئے تھے۔ میری قسمت میں ٹکڑوں کو محتاج ہونا ہمیشہ بدا تھا۔

میں ان کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولیں " دیکھئے کیا ہو مجھے میاں صاحبزادے میں بھی کوئی جھوٹ کہوں گی "۔

" مجھے تو آپ نہایت درجہ تہذیب یافتہ معلوم ہوتی ہیں اور اور" میں کچھ رُک گیا اور پھر کہا " آپ جوانی میں حد سے زیادہ حسین ہونگی "۔

وہ ہنسیں اور بولیں "معلوم ہوتا ہے کہ تم نے حسن و نزاکت والے دیکھے ہی نہیں۔ حسین تھیں میری بیگم۔ خدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ کیا بتاؤں کیا ناک نقشہ تھا۔ کیا نزاکت تھی۔ کیا جادو تھا۔ پان کھاتی تھیں تو گلے میں پیک دکھائی دیتی تھی۔ کنول کے پھولوں کی سی آنکھیں۔ وہ خواجہ آتش نے کہا ہے کچھ نہیں۔ ؎

الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے
مگر اس کو فریب نرگس مستانہ آتا ہے

وہ کیفیت تھی۔ بال سیاہ، جیسے ناگن، ایڑیوں تک آتے تھے۔ دہانہ جیسے کلی کھلی ہوئی۔ کیا کیا بتاؤں کون سی خوبی ہے جو ان میں نہ تھی۔ میں تو عورت ذات تھی، پہروں ان کی صورت تکا کرتی تھی۔ جن مردوں نے انہیں دیکھا تھا ان کے دل کا کیا حال ہوگا۔ کیا بتاؤں۔ ؎

تصوّر سے کسی کے کی ہے میں نے گفتگو برسوں
رہی ہے ایک تصویرِ خیالی روبرو برسوں

کوئی دن نہیں گذرتا جو پہروں ان کا تصوّر کئے نہ بیٹھی رہتی ہوں۔ ؎

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے

مگر بیٹا سچ کہتے ہیں لوگ کہ حسین عورت بد قسمت ہوتی ہے۔ وہ اتنی زیادہ حسین تھیں کاش اتنی ہی زیادہ بد قسمت نہ ہوتیں۔

وہ منہ میں روٹی پلپلاتی جا رہی تھیں۔ اتنا کہہ کر انہوں نے پانی پیا۔ میں ان کے اس بیان سے پرستان اور رومانی داستانوں کی دنیا میں گم ہو گیا۔ پانی پینے کے بعد وہ پھر بولیں:۔

" مگر اندر سبھا نے بیٹا ان کو تباہ کر دیا۔ گھر بھر تباہ کر دیا "۔

" اندر سبھا " میں نے کہا " میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا آپ کا کیا مطلب ہے۔ آپ کا اور آپ کی ان بیگم کا جو حور یا پری زاد تھیں اندر سبھا سے کیا تعلق ہے "۔

" کیا کروگے جان کے جانے بھی دو۔ بیکار افسوس ہوگا تم کو اور اب اندھیرا بھی چھا رہا ہے۔ جاؤ سدھارو۔ ان کھنڈروں کے بیچ میں رات کو کہاں بھٹکتے پھروگے۔ اور نہیں معلوم یہاں کیسے کیسے کیڑے مکوڑے ہوا ذات بلایات بستے ہیں۔ تم دن رہے سے اپنے گھر پہنچ جاؤ "۔

" مجھے کوئی ڈر نہیں ہے "۔

" نہ ہو میں تمہیں خطرے میں نہیں ڈالوں گی۔ اب تم یہاں نہ ٹھہرو "۔

" مگر آپ نے میری دلچسپی کو اس قدر بڑھا دیا۔ میں ہرگز بغیر آپ کی بیگم کا حال سُنے نہ جاؤنگا "۔

وہ ہنسیں۔ پھر خاموش بیٹھی رہیں۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ وہ بولیں " اب شام ہو رہی ہے۔ میں ضروریات سے فارغ ہونے جاؤنگی۔ پھر نماز مغربین کا وقت

ہو جائے گا۔ رات گئے تک وظیفہ پڑھوں گی۔ اگر شوق ہے میری بیگم کا حال سننے کا تو کسی دن دوپہر کو آؤ۔ میں سناؤں گی۔"

میں گھر چلا آیا۔ مگر میں کھویا کھویا سا رہا۔ شاید جس پری کا ان محترمہ نے ذکر کیا تھا اس کا میرے اوپر سایہ ہو گیا تھا۔

۲

دوسرے دن اپنے کام سے چھٹی لے کر اور کچھ عمدہ چیزیں ان کے کھانے کے لئے لے کر میں قریب بارہ بجے کے ان کے پاس پہنچا۔

"تو تمہیں بہت شوق ہے میری داستان سننے کا۔"

"جی ہاں۔ مجھے کل رات بھر نیند نہیں آئی۔"

"اف فوہ۔ مگر بیٹا میں کیا کیا سناؤں۔ کس کس کا حال کہوں۔ کہاں سے شروع کروں کہاں ختم کروں۔ کوئی حد ہی نہیں میرے واقعات کی دن رات وہی واقعات میری نگاہ کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ہائے میری وہ دنیا جو مٹ گئی اس کا تصور باندھے میں دن رات پڑی رہتی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ ان سب کے پاس پہنچ جاؤں۔ وہ سب جنت میں آرام سے ہوں گے۔ میں یہاں پڑی رہ گئی۔ قرنیں گزر گئیں۔ میں مرتی بھی نہیں۔ ملک الموت مجھ کو بھول گئے۔" اور اب انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگی "یا خدا یہ کس گناہ کے عذاب میں مجھے یہاں چھوڑ دیا ہے۔ کیوں نہیں حکم کرتا موت کے فرشتے کو۔ اس دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ میرے سنگی ساتھی جہاں ہیں وہاں مجھے بھی بلا لے۔"

ان کی دعا میں ایک عجیب خلوص اور جذب تھا اور میں ان کے چہرے کی جھریوں میں آتے جاتے ہوئے رنگ کو محویت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولیں "خدا میری نہیں سنے گا۔ خیر تم کیا سننا چاہتے ہو۔"

کچھ دیر سوچ کر میں نے کہا "میں آپ کی بیگم جو حور اور پری سے زیادہ خوبصورت تھیں ان کا حال سننا چاہتا ہوں۔"

"اے میری پوری داستان انہیں کی تو داستان ہے۔"

"اندر سبھا سے ان کا اور آپ کا کیا تعلق تھا۔"

"ہماری پوری زندگی اندر سبھا ہی تو تھی اور کیا تھا۔"

"اچھا تو یوں کام نہیں چلے گا۔ یہ بتائیے کہ آپ کی بیگم کون تھیں کس خاندان سے تھیں۔ کہاں رہتی تھیں۔"

"وہ پچھم کی طرف محلہ ہے نہیں۔ جو مرزا علی خان کا حاطہ کہلاتا ہے۔ وہاں جو بھی رہتے ہیں وہ سب اپنے کو ہماری بیگم ہی کے خاندان سے بتاتے ہیں مگر وہ ہیں تھوڑی۔ سب بدقوے ہیں۔ کوئی رنڈی کا کوئی لونڈی کا۔ کوئی دھوبن کا کوئی مہترانی کا کوئی مغلانی کا کوئی ڈومنی کا سب اسی طرح کے ہیں۔ مگر پاتے وثیقہ ہمارے نواب یعنی ہماری بیگم کے والد ہی کا ہیں۔ یہ محلہ جو نہیں دکھائی دیتا ہے یہ پورا ایک محل تھا ہمارے نواب کے زمانے میں۔ ان کے مرتے ہی وثیقے کے پیسے بٹ گئے۔ محل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ پشتیں گزر گئیں۔ سب بھول بھی گئے کہ یہاں کیا تھا۔ ایک میں کرم جلی رہ گئی ہوں جو جانتی ہوں کہ یہاں کیا تھا اور اب کیا ہو گیا۔ ہر بات کو پہروں یاد کر کر کے رویا کرتی ہوں۔"

"تو یہاں کسی زمانے میں بڑا شاندار اور خوبصورت محل ہو گا۔"

"ہاں ایسا شاندار ایسا خوبصورت کہ راجہ اندر کا پرستان اس کے سامنے مات کھائے۔ جنت بھی مجھے یقین ہے ویسی ہی ہو گی۔"

"اور اس پرستان کی سب سے خوبصورت پری آپ کی بیگم ہوں گی۔"

"ہاں وہ پکھراج پری تھیں۔ ہائے یہ پکھراج پری ہی بننا تو غضب ہو گیا۔"

"تو کیا آپ کے محل میں اندر سبھا کھیلی جاتی تھی؟"

"جب تک ہماری بڑی بیگم صاحبہ زندہ رہیں جب تک کچھ نہیں ہوا۔ بیگم ہماری کوئی بارہ برس کی ہوں گی۔ وہی اکلوتی لڑکی تھیں۔ ہوئے کئی مگر جئیں وہی ایک۔ بڑے لاڈ تھے۔ اگر چیل کا موت مانگتیں تو منگایا جاتا تھا۔ نواب صاحب کو تو کچھ ایسی توجہ نہیں تھی۔ وہ اپنی عورتوں میں محو تھے۔ جو بھی ذرا نوکیلی سجیلی نظر پڑی چاہے کوئی قوم ہو بس متاع کر لیا۔ جگہ رہنے کو مل گئی۔ تنخواہ مقرر ہو گئی۔ مگر ماں کا یہ عالم تھا کہ بیٹی کو دیکھے جیتی تھیں۔ کسی طرح بھی ذرا بھی دل نہ میلا ہونے دیتی تھیں۔ میں تھی اور بیسیوں لونڈیاں باندیاں تھیں عزیز و اقارب کی لڑکیاں تھیں۔ کھیل کود۔ ہنسی چہل۔ یہی دن رات ہوتا تھا۔ مگر ہا۔ نامراد گئیں میری بیگم صاحب۔ بڑا ارمان تھا لڑکی کا سہرا دیکھنے کا۔ ہا۔ لڑکی جوان ہوئی ہی تھی کہ اک دن بیمار پڑیں۔ لاکھوں دوائیاں ہو گئیں مگر نہ اچھی ہوئیں۔"

"نواب صاحب کو ان سے ذرا بھی محبت نہ تھی۔"

"محبت ہے اے تم بھی مرد ہو بیٹا۔ کیا کہوں لیلےٰ مجنوں کا قصہ سُنا ہے۔ مگر کوئی مجنوں دیکھا نہیں۔ مرد کی محبت بندر کی محبت ہوتی ہے ادھر ہوئی اُدھر ختم بس ہو چکا۔ اب دوسری کو تاک رہے ہیں۔ اور بیاہتا بیویوں سے تو کسی کو محبت کرتے نہ دیکھا۔ گھر کی مرغی دال برابر۔"

"آپ کی بیگم کو تو بڑا قلق ہوا ہوگا اپنی ماں کے مرنے کا۔"

"ہاں ایسا بلک بلک کر روتی تھیں کہ میں کیا بتاؤں۔ مگر پھر بچہ تھیں اور پھر کھیل کود میں پڑ گئیں۔ بھول گئیں ماں کو۔ اور ایک واقعہ اور ہو گیا۔ جیسی مجنوں کی محبت بتائی جاتی ہے ویسی عورت کو ہوتی ہے۔ میں تو جانتی ہوں قصہ اُلٹا ہو گا مجنوں عورت ہو گی اور لیلےٰ مرد۔ خیر تو بیگم کی اُٹھتی جوانی تھی۔ ہائے کیا جوانی تھی۔"

وہ تھوڑی دیر خاموش رہیں پھر بولیں "کہاں سے زبان میں قوت آئے جو اس جوانی کی تعریف کروں۔ ہماری بیگم کے ساتھ کھیلنے والوں میں ایک صاحبزادے تھے آغائی صاحب۔ دور کے عزیز ہوتے تھے۔ ہماری بیگم صاحب کیا کہوں بڑی دُور کی نگاہ رکھتی تھیں اکثر اپنی مغلانی سے کہتی تھیں مجھے ڈر ہے کہ کسی دن یہ آغائی اور طلعت بیگم کا ساتھ کھیلنا رنگ نہ لائے۔ مغلانی کہا کرتیں اے حضور بچے ہیں ابھی جوان ہونے پر الگ الگ ہو جائیں گے۔ یہ کیا معلوم تھا کہ جوان ہونے پر بیگم صاحبہ ہی نہ رہیں گی۔ اگر وہ زندہ رہتیں تو پردہ ہونے لگتا اور کچھ نہ ہوتا۔ نواب صاحب کو کوئی فکر ہی نہ تھی کہ لڑکی سیاہ کرتی ہے کہ سفید۔ اور سب لڑکوں سے تو پردہ ہونے لگا مگر آغائی صاحب کی روک ٹوک کسی نے نہ کی۔ بس بیگم ان پر جان دینے لگیں۔ ہم سب دیکھتے تھے مگر میں تو بیگم کی رازدار تھی۔ ہر وقت ان ہی کی باتیں کیا کرتی تھیں میٹھی میٹھی لچھے دار۔"

"کیا آغائی صاحب بھی بہت خوبصورت تھے؟"

"خاک۔ ہاں شریف کے لڑکے تھے۔"

"وہ بھی بہت محبت کرنے لگے ہوں گے۔"

"ہاں محبت کرتے تھے۔ جیسے مردوے کیا کرتے ہیں۔ بن رہے ہیں۔ باتیں چکنا رہے ہیں۔ میں تو سب سُنا کرتی تھی۔"

"کیسی کیسی باتیں ہوتی تھیں کچھ یاد ہیں آپ کو۔"

"اے کوئی یاد رکھنے کی باتیں ہوتیں تو یاد رہتیں۔ وہی باتیں جو داستانوں میں مثنویوں میں ہوتی ہیں وہی کرتے تھے۔ ہاں اندر سبھا کا نسخہ انہیں نے لگایا۔ ایک دن بڑے پیار کا لہجہ بنا کے بولے جانی بیگم تم نے اندر سبھا نہیں دیکھی کبھی۔ بیگم بولیں کبھی نہیں۔ وہ بولے تمہارے ابا جان کاہے کو جانے دیں گے۔ اور سچ بات بھی تھی۔ نواب صاحب کو لڑکی کا خیال تو کچھ تھا نہیں۔ مگر اس کے روادار نہیں تھے کہ لڑکی کہیں بھی جائے۔ اب روز اندر سبھا کی باتیں ہو رہی ہیں

اور بیگم کا شوق ہے کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ مجھ سے کہتی رہتی تھیں اے نرگس کیسے دیکھوں اندر سبھا۔ جی لوٹتا ہے۔ خیر ایک رات کو آغائی صاحب کے گھر کے پاس اندر سبھا تھی۔ پہلے ہی سے طے ہو گیا تھا کہ جیسے بھی بنے گا بیگم کو آغائی صاحب وہاں پہنچائیں گے۔ رات میں مَیں اور بیگم سب کی نگاہ بچائے ہوئے پیچھے کی کھڑکی سے محل کے باہر نکل گئیں۔ آغائی صاحب وہاں موجود تھے۔ ان کے ساتھ ہم وہاں پہنچے جہاں اندر سبھا ہوتی تھی۔ یہاں کوٹھے پر آغائی صاحب نے جاکے ہم دونوں کو کھڑا کر دیا اور رات بھر ہم موکھلے میں سے جھانک کے دیکھا کئے۔ کیا بتاؤں جادو کا کھیل تھا۔ خیر تماشہ ختم ہوا محل واپس آئے یہاں اور ہی گل کھلا ہوا تھا۔ سب پریشان تھے کہ بیگم کہیں غائب ہو گئی تھیں۔ میں نے لاکھ لاکھ کہا چوکی پر گئی تھیں میں ساتھ گئی تھی مگر بات نہ بنی۔ صبح نواب صاحب کے کان تک خبر پہنچی۔ انہوں نے فوراً نادری حکم لگا دیا کہ آغائی صاحب کا آنا جانا بند۔"

"تو بیگم کا تو عجب حال ہوا ہوگا۔"

"کیا پوچھتے ہو۔ بیگم آغائی صاحب کو میر اگلفام کہنے لگی تھیں۔ کہتی تھیں کہ راجہ اندر نے جو ظلم پکھراج پری پر گلفام کو قید کر کے ڈھایا تھا وہی ابا جان نے مجھ پر ڈھایا۔ دن رات پکھراج پری کے وہ گیت گایا کرتی تھیں جو وہ گلفام کی یاد میں گاتی تھی۔ ہماری بیگم کی یاد بڑی ہی اچھی تھی۔ ادھر کوئی گیت غزل سُنی بس پوری پوری اڑا لیتی تھیں۔ ایک ہی دفعہ اندر سبھا دیکھ کر سب گیت یاد ہو گئے تھے۔ تو وہ گا گا کے سُنایا کرتی تھیں۔ مگر یہ قصہ دو ہی چند مہینوں میں ختم ہو گیا۔ نواب صاحب نے شادی کی دن تاریخ سب مقرر کر ڈالی اور کہلا بھیجا کہ تیاریاں ہوں۔ بیگم کا عجب حال تھا مگر کیا کرتیں۔"

"شادی کہاں ٹھہرائی تھی۔"

"اُدھر اکبری دروازہ نہیں ہے۔ وہاں ایک نواب رہتے تھے۔ ان کا بھی بیاہتی بیوی سے ایک لڑکا تھا۔ اس سے جھٹ پٹ شادی ہو گئی۔ میں بیگم کے ساتھ گئی تھی آخر ان کی خاص لونڈی تھی۔"

"تو آغائی صاحب کے عشق کا قصہ یوں ختم ہو گیا۔"

"کئی مہینے تو بیگم سے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ نئی نئی شادی تھی میاں ہر وقت پاس رہتے ہیں الگ رہتی۔ میری وہاں خاطر بھی بہت ہوتی تھی۔ آخر میں غیر گھر کی لونڈی تھی۔ مگر کوئی چھ مہینے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ آپس میں ان بن ہونے لگی۔ وہ بھی اکلوتے تھے اپنے ماں باپ کے اور یہ بھی۔ دونوں نازوں سے پلے تھے دونوں ناز کرنا چاہتے اور ناز اُٹھانے سے دور بھاگتے۔ آئے دن جھپٹ ہونے لگی۔ بیگم منہ تھوتھائے بیٹھی ہیں۔ زار و قطار رو رہی ہیں۔ میں پیر دبا دبا کر سمجھا رہی ہوں۔ ہائے ان کا رونا بھی کیا قیامت تھا۔ آنکھیں اور بھی بڑی بڑی ہو جاتی تھیں اور بلا کا کٹیلا پن آجاتا تھا ان میں۔ میں کہتی ہوں کیسا سنگدل تھا ان کا میاں کہ اس کو ایسی پیاری صورت کے بلکنے پر رحم نہ آتا تھا۔ یہی ہوتا رہا۔ آخر کو ایک بڑی جھڑپ ہوئی۔ بیگم اپنے میکے چلی آئیں اور پھر زندگی بھر نہ گئیں سُسرال۔"

یہ سب بیان کرتے ہوئے ان کے آنسو نکلنے لگے تھے۔ اب وہ کھسک کر دروازے پر گئیں۔ اپنا منہ دھویا اور واپس آکر وہ کھانا کھانے لگیں جو میں ان کے لئے لایا تھا۔ میں خاموش دیکھتا رہا۔ میرے تصوّر میں وہ سب باتیں گھوم رہی تھیں جو انہوں نے بیان کی تھیں اور میری تخیّل آنکھوں کے سامنے ایک بڑی دلکش پُر درد تصویر بکھر رہی تھی۔

۳

جب وہ پھر فراغت سے بیٹھیں تو میں نے پوچھا "آپ نے ابھی کہا کہ آپ کی بیگم پھر کبھی سُسرال نہ گئیں۔ ان کے والد آپ کے نواب صاحب نے بیٹی اور داماد کے درمیان ملاپ کرانے کی کوشش نہیں کی۔"

"کیوں کرتے آخر۔ اکبری دروازے والے نواب سے وہ کسی طرح کم تھے بھلا اور پھر رئیس تھے۔ بیٹی کو گھر بٹھا کے کھلا سکتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ مجبولا کا ہے پہ ہے میری بیٹی کی جوتی کی نوک پہ ہے وہ اور اس کا گھر بھر"

مجھے یہ بات سُن کر بڑا تعجب ہوا کہ اس زمانے کے لوگوں کی کیا ذہنیت تھی اور کیا قدریں تھیں۔

وہ کہے گئیں "اور بیگم بھی خوش تھیں میکے میں آ کے۔ انہیں اپنا میاں پھوٹی آنکھ نہ بھاتا تھا۔ آغائی صاحب کو وہ کسی وقت بھولی تھوڑی تھیں"

"آغائی صاحب کی بھی شادی ہو گئی ہو گی شاید"

"انہیں کون پوچھتا۔ اول تو بدقوارے۔ دوسرے دادا ان کے بڑے رئیس تھے مگر ان کے بعد حصے بٹے اور پھر باپ کے بعد حصے بٹے اور آغائی صاحب کے پاس کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ یہ قسمت تھی ہاں کہ ہماری بیگم ایسی شریف، رئیس، حسین، جان دینے لگیں۔ اور وہ تھا بڑا ٹنکٹہ ہی ہوا۔ جب سے بیگم میکے میں آئیں وہ بھی محل کے گرد منڈلانے لگا۔ ایک دن ہم باغ میں تھے کہ ایک لنگڑ آ کے میرے سامنے گرا۔ دیکھتی کیا ہوں کہ اس میں ایک کاغذ بندھا ہوا تھا۔ میں نے کھول کے پڑھا تو بڑی محبت کی باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ القاب ندارد اور نیچے نام ندارد۔ میں نے اپنے سینے میں گھرس لیا۔ پھر اکیلے میں بیگم کو دکھایا وہ کہنے لگیں کہ آغائی کا خط ہے۔ وہ خط پہچانتی تھیں۔ اب کیا تھا۔ جتنی بھی محبت دبی تھی اب پھر اُبھر آئی۔ جس وقت لنگڑ گرا تھا دوسرے دن اسی وقت میں باہر آئی اور محل کی اس دیوار کی پشت پہ پہنچی جاں ہماری بیگم کی شہ نشین تھی۔ دیکھا کہ آغائی موجود ہیں۔ بیگم کا حال پوچھتے رہے اور پھر اندر سبھا کی ایک لکھی ہوئی کتاب دی کہ بیگم کو دے دینا۔ اب کیا تھا۔ بیگم دن رات اسی کو پڑھنے میں محو رہنے لگیں۔ ان کو پوری کتاب منہ زبانی یاد ہو گئی۔ کئی دن کے بعد مجھ سے بولیں اے ہم لوگ اگر اندر سبھا کھیلیں تو کیا ہو۔ میں نے کہا بیگم اس میں بڑے ریاض کی ضرورت ہے۔ بولیں ہٹ اور اس دن سے باغ میں دن رات تیاریاں ہونے لگیں۔ پردے بنے۔ تخت لگائے گئے۔ دیوؤں کے چہرے بنے سینگ دار۔ پریوں کے لئے پر اور پوشاکیں بنیں۔ اس سلسلے میں آغائی صاحب بھیس بدل کے کاریگر بن کے آتے۔ باغ میں الگ بٹھلائے جاتے۔ مشہور ہوتا کہ اُستاد آئے ہیں سکھلانے اور بتلانے۔ اور وہ بھی ایسا روپ بھرتا تھا کہ اسّی برس کا بڈھا لگتا تھا۔ لمبی سفید داڑھی اور زلفیں۔ مولویوں کے سے کپڑے۔ کسی کو شبہ بھی نہیں ہوا کہ کوئی جوان آدمی ہے۔ کچھ دنوں بعد بیگم سامنے آ کے بیٹھنے لگیں کہ اسے ہے بڈھا ہے منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت اس سے پردہ کیا۔ خیر یہ ہوتا رہا۔ گھر کی سب لونڈیاں باندیاں چھانٹی گئیں روپ بھرنے کے لئے۔ مجھے سبز پری کا روپ دیا گیا تھا اور اسی طرح سب کو"

"دیو شاید مرد لوگ بنے ہوں گے"

"مردوں کا محل میں کیا ذکر۔ ہمارے محل میں حبشنیں نوکر تھیں لمبی تڑنگی مکلے ٹھلے کی مردانی عورتیں۔ یہاں کے مردوں کا ان سے دم نکلتا تھا۔ ایک نے ایک دفعہ ایک مرد کو تھپڑ دیا تو تیورا کے گر پڑا۔ ان کو دیوؤں کے روپ دیئے گئے تھے۔ غرض مہینوں تیاریاں ہوا کیں اور بیگم اور آغائی مزے میں ملتے رہے"

"کیا یہ سب تیاریاں دکھاوا تو نہیں تھیں تاکہ آغائی سے ملا جائے۔ یا کبھی اندر سبھا کھیلی بھی گئی"

"واہ کھیلی کیوں نہیں گئی۔ اسی نے تو سب کو تباہ کر دیا۔ گھر کا گھر ڈھا کر دیا۔ جو جو کھیلا تھا اس میں سب تباہ ہو گئے۔ تب ہی تو میں کہتی ہوں بیٹا کہ بڑی منحوس ہے یہ موئی۔ تم کہتے ہو اب کہیں نہیں ہوتی۔ بڑا اچھا زمانہ آ لگا ہے"

"مگر آپ نے یہ نتیجہ کیسے نکالا کہ تباہی اسی کی وجہ سے آئی"

"سنو۔ سب روپ تو بھر گئے تھے ایک روپ رہا گلفام کا تو استاد نے کہا کہ اس میں کوئی زحمت نہیں۔ گلفام کا حصہ بہت کم ہے وقت کے وقت

ہو جائے گا۔ خیر ایک رات کو اندر سبھا کھیلی گئی۔ باغ میں دو قریب قریب کے پیڑوں سے پردہ کھینچا گیا۔ بڑے بڑے قمقموں سے روشنی کی گئی اور اندر سبھا شروع ہوئی۔ اب آیا وہ وقت جب پکھراج پری گلفام کو اپنے محل کے کوٹھے پہ سوتا دیکھتی ہے۔ اُستاد بولا میں ابھی ضرورت رفع کرنے جاتا ہوں اور غائب تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص گلفام کا روپ بھرے آیا۔ کسی نے پہچانا بھی نہیں۔ پکھراج پری اُڑا لے گئی اب بھی کسی نے نہیں پہچانا۔ اندر کے اکھاڑے میں پیش ہوا اس وقت کچھ کچھ کو شبہ ہوا کہ یہ آغائی کا سا کون آ گیا۔ مگر اس کے بعد وہ کنوئیں میں قید کرا دیا گیا اور غائب ہو گیا۔ دیکھا اُستاد پھر چلے آ رہے ہیں اور لپلے ہاں سب ٹھیک ہی ہوا میں سن رہا تھا۔ کھیل ہوتا رہا۔ اب آیا آخر اور راجہ اندر نے گلفام کو قید سے لے آنے کا حکم دیا۔ گلفام آیا۔ اب سب نے پہچان لیا۔ پکھراج پری کو وہ دے دیا گیا۔ بیگم پکھراج پری بنی تھیں انہوں نے اس کے گلے میں بانہیں ڈالیں اور اس نے ان کو گود میں اُٹھا یہ جا اور وہ جا پیڑوں کے جھرمٹ کی طرف بھاگا۔ میں کچھ قدم پیچھے گئی مگر آگے جانے کی ہمت نہ پڑی۔ واپس آئی۔ سب کی سب سناٹے میں تھیں۔ جو جلبش لال دیو بنی تھی اس نے کہا مجھے کھیل ہی میں شبہ ہوا تھا۔ اب سب بولنے لگیں۔ ایک بولی بڑا ہی غضب ہو گیا۔ دوسری بولی اگر نواب صاحب کو خبر ہو جائے۔ تیسری بولی اور ان کی سسرال تک خبر پہنچے۔ جو جلبش سیاہ دیو بنی تھی وہ کہنے لگی پہنچ کے ہی رہے گی خبر۔ مجھے خیال آیا کہ اسکی ایک عزیز بیگم کی سسرال میں نوکر ہے یہی خبر پہنچائے گی۔ غرض باتیں تو ہو رہی تھیں مگر سب شل تھے کہ کریں تو کیا کریں۔ سب اپنی اپنی جگہ سے ہلے نہیں۔ صبح ہو گئی اجالا پھیل گیا۔ کہ دیکھا کہ بیگم اُجڑی ہوئی چلی آ رہی ہیں اور ان کے پیچھے اُستاد کا روپ بھرے ہوئے آغائی۔ بیگم محل کی طرف چلی گئیں وہ باہر کی طرف چلا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب بیگم کے اور اس کے درمیان کی بندھی تھی۔ باغ میں پیڑوں کے جھرمٹ میں کچھونا بچھا ملا۔ یہیں وہ اپنا بھیس رکھ کے گلفام بن کر آیا تھا اور یہیں بیگم کو لے گیا تھا۔ اور یہیں سے ان کی تباہی شروع ہوئی۔"

"آپ لوگ چاہتیں تو یہ معاملہ چھپ جاتا۔"

"میں اور کئی ایک چاہتی تھیں کہ چُپ چپ ہو جائے مگر۔۔۔

نہاں کے ماند آن رازے کزو سازند محفلہا ؟

میں سوچتی تھی کہ کیا ہو گیا تھا بیگم کو۔ بیگم سے میں نے بعد میں پوچھا بھی تو انہوں نے بتایا کہ اپنے گلفام کو پاتے ہی میں بے بس ہو گئی۔ جیسے کسی جادو کا اثر ہو گیا مجھ پر اور مجھے سوائے اس کے چمٹ جانے کے اور کچھ نہ سوجھا۔ اس دن بیگم بڑی مضمحل رہیں اور ایک خواب کا سا عالم ان پر طاری رہا۔"

"پھر نواب صاحب کو خبر ہو گئی شاید۔"

"نہیں نواب صاحب کو پہلے خبر نہیں ہوئی۔ پہلے بیگم کی سسرال میں جا کر ان کے میاں سے کسی نے لگائی۔ سب رتی رتی کہہ دیا۔ وہ آگ میں بھرے ہوتے آئے۔ نواب صاحب کے یہاں اور لیے ہیں سات طلاقیں دیتا ہوں آپ کی لڑکی کو مجھے نہیں برداشت ہوتی کہ میری بیوی اور یہ کوتک کرے۔ طلاق کے نام پہ ہمارے نواب بھی آگ ہو گئے۔ میں تو تھی بھی نہیں وہاں بڑی دیر جھک جھک ہوئی سُنا ہے۔ بیگم کے دولہا چلے گئے، ہمارے نواب صاحب محل خانے میں آئے۔ ایک ایک کو ڈانٹ پھٹکار۔ ایک ایک کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ سب کو برطرف کر دیا۔ کھڑے کھڑے نکلوا دیا۔ وہ غصہ تھا کہ راجہ اندر کا غصہ مات تھا۔ بیگم اپنی شہ نشین میں لرز رہی تھیں اور مجھ پر بھی کپکپی چڑھی تھی کہ دیکھو اب کیا ہوتا ہے۔ جو نواب صاحب کی ماں کے وقت کی بوڑھی عورتیں تھیں ان کو تو چھوڑ دیا۔ ورنہ جتنی بھی جوان اور ادھیڑ عمر تھیں سب کو برطرف کر دیا۔"

"کتنی ہوں گی بھلا اندازاً میں آپ کے"

"کوئی تیس پینتیس تھیں۔ عتاب تو بوڑھیوں پر بھی کچھ نہ ہوا کیونکہ انہوں نے نواب صاحب خود کو گودوں میں کھلایا تھا اور نواب صاحب ان کا لحاظ کرتے

تھے اور پھر ان کو نکالتے تو وہ جاتیں کہاں۔ خیر سب برہم کر کے اب بیگم کے پاس آئے۔ بیگم اتنی دیر سے کانپ رہی تھیں۔ نواب صاحب کے آتے ہی غش کھا کر گر پڑیں۔ بے ہوش ہو گئیں۔ نواب صاحب کچھ نہیں بولے۔ مجھ سے بولے نرگس میرے ساتھ آ۔ میں پیچھے پیچھے چلی۔ یہ عالم کہ ادھر پاؤں رکھتی ہوں اور اُدھر پڑتا ہے۔ حلق اور ہونٹ خشک کھنکھر ہو گئے۔ خیر دیوان خانے میں پہنچے۔ اپنی چھپر کھٹ پہ بیٹھ گئے۔ میں سامنے کھڑی کانپ رہی تھی۔ ان کے پاس ان کی چہیتی رنڈی بیٹھی تھی۔ نواب صاحب غصّے سے سُرخ ہو رہے تھے جیسے اندر سبھا میں راجہ اندر کالے دیو کے چُغلی کھانے پر سُرخ ہو جاتا۔ مجھ سے کہنے لگے بتا یہ کیا سب ہو رہا تھا۔ میں کانپ گئی۔ بولے تیری بوٹی بوٹی کاٹ کے پھینک دونگا۔ تو سب جانتی تھی اور تیرے ہی ذریعہ سب کچھ ہُوا۔ بتا کیا ہوا۔ میں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا بس اندر سبھا ہو رہی تھی سرکار۔ بولے اور کچھ۔ اور کچھ نہیں میں نے کہا۔ کہا صاف صاف بتا۔ میں بولی اور کچھ ہُوا ہو تو بتاؤں۔ میرا لہجہ ذرا سخت ہو گیا تھا۔ اس پر اور بھی ان کا غصّہ بڑھ گیا۔ چلا کے بولے ٹراتی ہے اور اگالدان کھینچ کے مجھ پر پھینکا۔ میں بچی اور دھڑ سے گر پڑی۔ اگالدان میرے اس ہاتھ پہ آکے گرا۔ ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں بلبلانے لگی۔ بولے بنتی ہے حرامزادی اور نوکر کو آواز دی تفضّل تفضّل۔ وہ دوڑا آیا۔ بولے اُٹھا کے پھینک آ اس کو محل کے باہر یہ یہاں رہنے کے قابل نہیں۔"

"آپ پر بڑا ظلم ہُوا" میں نے کہا۔

"ظلم کیسا۔ رئیس کا غصّہ تھا۔ راجہ اندر کا غصّہ۔ راجہ اندر نے بھی تو گلفام کو قید میں ڈال دیا تھا اور پکھراج پری کے پر نچوا کر شہر بدر کرا دیا تھا۔"

"مگر پکھراج پری تو آپ کی بیگم تھیں۔"

"میں اور بیگم ایک ہی سمجھو۔ جو عتاب بیوی پر آنا چاہیئے تھا وہ لونڈی پر آ گیا۔"

"خیر جانے دیجئے آپ واقعہ بیان کیجئے۔"

"ہاں تو تفضّل آیا۔ میرا ٹوٹا ہاتھ پکڑا۔ میں بلبلا گئی۔ دوسرا ہاتھ پکڑ کے کھینچتا ہُوا باہر لے گیا۔ میرا یہ ہاتھ جھول رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا تھا۔ پھر مجھے یاد نہیں کیا ہُوا۔ میں غش کھا کے گر گئی۔"

"آپ کی ہڈی جڑوانے کی کوشش نہیں کی کسی نے۔"

"سُنو۔ جب میں ہوش میں آئی تو دیکھا کہ محل کے باہر گھاس پہ پڑی ہوں۔ جرّاح پٹی باندھ چکا ہے اور منظور پاس بیٹھا ہُوا ہے۔"

"یہ منظور کون۔"

"بتاتی ہوں۔ یہ باہر کے عملے میں ایک جوان نوکر تھا۔ مجھے بڑی حسرت سے دیکھا کرتا تھا۔ میں بھی اسے دیکھ کے مُسکرا دیا کرتی تھی۔ کبھی ایک آدھ بات بھی ہو جاتی مگر کبھی اس سے آگے نہیں بڑھے۔ جرّاح کو اس نے اپنے پاس سے پیسے دیئے۔ جب جرّاح چلا گیا تو بولا" نواب صاحب نے تو تم کو پھنکوا دیا تھا۔ تم یوں ہی کراہ کراہ کے مر جاتیں مگر مجھ سے کیسے دیکھا جاتا کہ تم تکلیف میں تھیں۔ میں تم کو اُٹھا کے یہاں لایا۔ میں جرّاح لایا۔ اور اب تم ٹھیک ہو۔ اور عملے والے تمہارے پاس تک آنے کو تیار نہیں تھے کہ کہیں نواب صاحب کا عتاب نہ نازل ہو۔ مجھے نواب صاحب کی کوئی پروا نہیں۔ میں تو تم پر جان دیتا ہوں۔ اب میں تو محل میں قدم رکھ نہیں سکتا اور نہ تم ہی۔ چلو میرے ساتھ میں کماؤنگا تم کھانا۔ میں کچھ دیر لیٹی سوچتی رہی۔ مجھے اپنی بیگم کی بڑی فکر تھی۔ مگر اب بیگم کے پاس جانا محال ہو گیا تھا۔ میں منظور کے ساتھ راضی ہو گئی۔"

اس کے بعد وہ کھسکتی ہوئی دروازے تک گئیں اور بولیں "نماز ظہر ین کا وقت ہو گیا۔"

وہ وضو کرنے لگیں تو اپنا بایاں ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولیں "یہ ہاتھ کی ہڈی تو جُڑ گئی تھی مگر ہاتھ کہنی پر سے مُڑتا نہیں۔ سیدھا ہی

رہتا ہے جب سے "

میں نے اب غور کیا کہ ان کا بایاں ہاتھ کہنی پر سے بالکل سیدھا تھا۔

۴

" پھر آپ کی بیگم کا کیا حال ہوا "

" میں تڑپتی تھی کہ بیگم کا حال کسی طرح معلوم ہو مگر کیسے معلوم ہوتا۔ محل خانے میں میری بھی بند ا بندی تھی اور میرے میاں منظور کی بھی اور نکاح کے کوئی مہینہ ہی بھر کے بعد سے وہ مُوا مردُود مجھے ڈانٹا کرتا تھا۔ بیگم کا ذکر سنتا تو اور بھی چلاتا۔ مردوں کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے بیٹا برا نہ ماننا تم بھی مرد ہو کہ دو دن کا پیار اور پھر گلے کا ہار۔ وہ مزدوری کرتا۔ میں گھر کا سب کام کرتی۔ آخر وہ تھکنے لگا۔ رئیس کے گھر کا نوکر مزدوری نہیں کر سکتا۔ مجھ پر اور بھی غصہ ہونے لگا۔ میں نے کہا میں قرآن شریف اور اردو پڑھی ہوئی ہوں۔ دو چار لڑکیاں پڑھا آیا کروں گی چلو تم مزدوری نہ کیا کرو۔ بس بھنّا گیا۔ میں مرد ہو کے عورت کی کمائی کھاؤں۔ لگا پھر کوئی مہینہ بھر کے بعد وہ ایک دن جو غائب ہوا تو آج تک نہ آیا۔ کیا معلوم کہاں گیا۔ کوئی کہتا تھا بمبئی چلا گیا۔ کوئی کہتا تھا کہیں اور کوئی کہیں "

" تو آپ اکیلی رہ گئیں "

" ہاں بیٹا۔ اس نے میرے لئے کوٹھری لی تھی۔ چار آنے مہینے کی اس میں رہتی تھی۔ جب وہ چلا گیا اور مہینہ گذر گیا تو مالک کرایہ مانگنے آیا۔ ادھر گھر میں جنس پانی بھی چک گیا تھا۔ اب میں نکلی اُستانی گیری کرنے۔ ایک ایک روپیہ مہینے پر دو جگہ لگ گئی۔ فراغت سے بسر ہونے لگی۔ اسی زمانے میں ایک دن میں لڑکی کو پڑھا رہی تھی سُنا کہ ہمارے نواب انتقال کر گئے۔ جہاں میں پڑھاتی تھی وہاں کے لوگوں سے اور نواب صاحب سے کچھ عزیزداری تھی اور سب کو نواب کے محل پر سے کو جا رہے تھے۔ میں وہاں سے باہر نکل کے سڑک پر جو آئی تو میں نے سوچا کہ موت کا دروازہ تو کھلا ہوا ہوتا ہے اب محل خانے پر مجھے کوئی نہ روکے گا اور اُلٹے پاؤں پھر کے میں وہاں پہنچی۔ محل میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ میں دھڑانہ گھستی چلی گئی اور اپنی بیگم کے پاس پہنچی۔ وہ پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کے چمٹ گئیں۔ دونوں مل مل کے خوب روئیں۔ خیر سب سامان ہوتا رہا۔ نواب صاحب کا دفن کفن ہو گیا اور میں بیگم کے پاس ٹھہری رہی "

" آپ کے نواب صاحب مرے کس مرض میں "

" اب خدا جانے بیٹا۔ وہ مر گئے مجھے بھی مرنا ہے۔ کچھ کہتے ہیں صدمے سے مر گئے۔ کچھ کہتے ہیں غصے میں انگوٹھی چبالی۔ وہی اگالدان جو مجھے کھینچ مارا تھا اس میں خون کی قے دکھائی دی "

" مگر یہ سب ہوا کیوں اور کیسے "

" اتنی بات تو صاف معلوم ہے کہ بیگم کے دُولہا طلاق کا صیغہ پڑھوانے کی تاریخ مقرر کر گئے ایک دن آکے اور جس دن مولویوں کو لے کے آنے والے تھے اسی دن صبح کو نواب صاحب چھپر کھٹ پر مرے پڑے ملے "

" میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں صدمے سے یا خودکشی کر کے مر جانے کی کیا بات تھی "

" آئیں " انہوں نے بڑے تعجب سے کہا " تم رئیسوں شریفوں کے قاعدوں سے واقف نہیں معلوم ہوتے ہو بیٹا۔ داماد بیٹی کو طلاق دینے آئے یہ ڈوب مرنے کا مقام نہیں ہے تو کیا ہے "

" تو طلاق ایسی بُری چیز ہے۔ مذہب اسلام نے تو اچھی چیز بتایا ہے "

" یہ کون سا مذہب ہے کون سا اسلام ہے ؟ ہمارے مذہب میں تو طلاق مر جانے کا مقام ہے "

میں نے دیکھا کہ ان کے عقائد میں کسی طرح کی تبدیلی کرنے کا خیال غلط ہے اور اس لئے بات کاٹتے ہوئے کہا "اور وہ آغائی صاحب کے معاملے کا کیا ہوا پھر؟"

"وہ آغائی مردہ خدا کرے اسکی قبر میں کیڑے پڑیں۔ موا بڑا حرامی نکلا۔ اس کا ذکر سنو۔ میں جب اُستانی گیری کرتی تھی ایک دن چوک میں سے گزر رہی تھی دیکھتی کیا ہوں کہ ایک رنڈی کے کوٹھے پر سے آغائی اُترا ہوا چلا آرہا ہے۔ اُستانی گیری کا رعب بنانے کے لئے میں بُرقع اوڑھنے لگی تھی مگر پردہ میں کبھی نہیں کرتی تھی اور لونڈیوں کے لئے مذہب سے بھی پردہ جائز نہیں ہے تو سڑک پر میں مُنہ کھول کے چلتی تھی۔ آغائی میرے پاس سے نکلا۔ غور سے میرا چہرہ دیکھ کے بولا "کون نرگس" میں نے کہا جی ہاں تسلیم۔ بولا ذرا گلی میں چلو تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔ میں پیچھے پیچھے چلی گئی اے گلی میں جا کے موا کہتا کیا ہے میں تم پر ہمیشہ سے مرتا تھا۔ بیگم مجھے پھوٹی آنکھ نہیں بھاتی تھیں تمہاری صورت دل میں کھُبی ہوئی تھی۔ میں دنگ دیکھ رہی ہوں اور وہ کہے جا رہا ہے کہ میں تمہاری تلاش میں تھا اچھی مل گئیں چلو اب میرے دل کی ویرانی کو آباد کر دو۔ اب تو مجھے غصّہ آیا۔ ایک تو بیگم میں جانتی تھی کہ کتنی اُس پہ جان دیتی تھیں، پھر موا رنڈی باز میری آنکھوں کے سامنے رنڈی کے کوٹھے پر سے اُترا اور اس سب پر طرّہ یہ کہ مجھے رجھانے چلا ہے میں نے زور سے کہا بھاگ موئے خدا تجھے غارت کرے اور میں چیخنے لگی کہ دوڑو یہ مردوا مجھے گھیر رہا ہے۔ وہ سر پہ پیر رکھ کے بھاگا۔ اس دن میں چاہتی تھی کہ بیگم سے کوئی جا کے یہ سب کہہ آوے۔ مگر کون جاتا۔ میری بندا بندی تھی۔ اور پھر معلوم ہُوا کہ وہی موا بیگم کے دُولہا کے یہاں گیا اور ان سے کہا کہ اتنا اتنا روپیہ دو نہیں تو میں تم کو اور تمہاری بیوی کو بدنام کر دوں گا۔ اسی پہ انہوں نے آکے نواب صاحب سے طلاق پہ زور دیا بلکہ دن بھی مقرر کر گئے اور نواب صاحب بیچارے کی جان گئی۔ خدا ان کو بخشے۔"

"نواب صاحب نے تو آپ پر ظلم کیا تھا اور آپ ان کو اس طرح یاد کرتی ہیں!"

"اے ہے میرے مالک تھے۔ اُوپر خدا اور نیچے وہ۔ وہ جو کچھ بھی کرتے سب بجا تھا۔ مصیبت پڑنے پہ کہیں کوئی خدا کو معاذ اللہ بُرا کہنے لگتا ہے بھلا اس طرح اگر غصّے میں اُنہوں نے مجھے مار دیا تھا تو کیا ہُوا۔ میں ہر دم ان کی مغفرت کی دعا کرتی ہوں۔"

"خیر۔ بیگم کے حال سے پیٹ کے ہم لوگ کہاں پہنچے۔ تو یہ بتائیے کہ نواب صاحب کے مرنے کے بعد پھر کیا ہُوا۔"

"جو کچھ ہُوا بہت بُرا ہُوا۔ بیگم آخر کچھ راج پری بنی تھیں۔ تباہی نہ آتی تو کیا ہوتا۔ نواب صاحب تو ٹھنڈے ٹھنڈے چلے گئے۔ ان کے پاس جو کچھ ہوگا وہ ان کی رنڈی لے کر سٹک گئی۔ داروغہ معدی۔ منشی کے پاس جو جو تحویلیں تھیں ان سے سب انکار کر گئے۔ اب پیسہ کہاں سے آئے جو نواب صاحب کی تجہیز و تکفین ہو۔ گھر میں ایک دم بیگم کا تھا۔ خیر اُنہوں نے اپنا گہنا مہاجن کے یہاں بھیجا۔ پانچ ہزار روپیہ منگوایا۔ وہ داروغہ کو دیا گیا۔ اس میں سب کام حیثیت کے موافق ہو گیا۔ آگے چالیسویں میں اور ضرورت پڑی تھی تو بیگم نے باقی گہنے کا بھی مُنہ نہیں کیا کہ دنیا والے کہیں نہ کہ باپ کا کچھ کیا نہیں۔ بڑی شاندار مجلس ہوئی۔ توڑے بندی ہوئی۔ کوئی پانچ دس ہزار اس میں بھی خرچ ہو گیا ہوگا۔ خیر اب سُنو کہ کیا تباہی آئی۔ نواب کے وراثت نامے پر ایک ہماری بیگم چڑھی ہوئی تھیں۔ وثیقہ ان ہی پہ کھلتا مگر نواب صاحب کے تو بچوں کی کوئی حد ہی نہیں تھی کہ رنڈی کے کہ منڈی کے کہ مغلانی کے کہ لونڈی کے خدا جھوٹ نہ بلائے کوئی پچاس بچے ہوں گے۔ سب نے دعوے کیا۔ اِدھر مقدمہ لڑنے والا بھی کوئی نہ تھا اور محل خانے کا خرچہ بھی دو بھر ہو گیا تھا۔ بیگم بیچاری ہار گئیں۔ وثیقہ بٹا۔ بیگم پہ کوئی پچاس روپلے آئے۔ محل خانے کے ٹکڑے ہو گئے۔ کونے کا ایک حصّہ بیگم کو ملا۔ اس میں وہ رہنے لگیں۔"

اور کوئی مددگار نہ ہُوا!"

"ڈوبتی ہوئی ناؤ کو سب ہی چھوڑ جاتے ہیں بیٹا۔ کون مدد کرتا ہے کسی کی اس دنیا میں۔"

"بڑا انقلاب آگیا ہوگا بیگم کی زندگی میں۔"

"انقلاب سا انقلاب۔ چہرے پہ کے گلاب جلتے رہے۔ سُوکھ کے کانٹا ہو گئیں۔ قبل از وقت بال سفید ہونے لگے۔ میں سمجھایا کرتی تھی کہ آپ کر

خدا نے اب بھی پلاؤ کی رکابی کھانے بھر کا دیا ہے اور میں خدمت میں جان دے دینے کو تیار ہوں۔ مگر کہاں دل کی خوشی جب ایک دفعہ مٹ جاتی ہے تو پھر کبھی نہیں آتی۔ جینے کو آدمی جیتا ہے جب تک خدا کا حکم نہ ہو۔ جوں توں کر کے کٹتی رہی۔"

"اس وقت وہ جوان ہی ہوں گی"

"اے ہاں ان کا سن ہی کیا آیا تھا۔ اور اب بھی مٹے پہ بھی لاکھ دو لاکھ میں ایک ہی نکلتیں۔ اُئے وہ تو مرتے مرتے ایسی حسین گئی ہیں کہ میں کیا بتاؤں۔ میں عورت ذات ہوں کہیں مرد ہوتی اور ایسی بیوی مجھے ملتی تو پیر دھو دھو کے پیا کرتی"

"مگر آپ مرد ہوتیں تو اپنے قول کے مطابق تھوڑے ہی دن میں بھول بھی جاتیں"

"ہاں سچ کہتے ہو بیٹا۔ اچھا ہوا کہ خدا نے مجھے مرد نہیں کیا۔ نہیں تو میں اپنی بیگم کی اتنی خدمت نہ کر سکتی جتنی میں نے کی تھی۔ خیر اب میں سمجھتی ہوں کہ میں خدا کے سامنے سرخرو جاؤں گی۔ میں نے لونڈی گیری کا اپنے بس بھر پورا حق ادا کر دیا۔ میرا فرض پورا ہو گیا۔ چالیس برس تک میں نے ان کی خدمت میں کوئی فرق نہیں آنے دیا اپنی جانب سے۔ خدا جانتا ہے۔ اور وہ بھی مرتے مرتے مجھے پیار کرتی گئیں۔ ہائے میں مر جاتی ان کے اسکے مُنے" اور اب ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر وہ بولیں "مگر خدا سب اچھا ہی کرتا ہے۔ اگر میں مر جاتی تو ان کی خدمت کون کرتا۔ وہ کہا کرتی تھیں نرگس خدا تیرے ہاتھ سے میری مٹی سوارت کرے تو وہی ہوا۔ بیس برس ہو گئے ہیں یہاں پڑی ٹھوکریں کھا رہی ہوں اس مسجد میں۔ خدا کا حکم ہی نہیں ہوتا کہ جاؤں اور اپنی بیگم کی خدمت میں وہاں لگ جاؤں"

وہ ٹھنڈی سانسیں بھرتی رہیں اور روتی رہیں۔ میں ان کے فلسفۂ حیات اور ان کے کردار پر غور کرتا رہا۔ اس نئے زمانے کے خیالات کی روشنی میں ان کے خیالات اور عقائد نہایت ہی درجہ دور از قیاس معلوم ہوتے تھے۔ وہ ایسی دنیا کا ایک فرد تھیں جس کے وجود کا آجکل کے سیاسی مفکر غلط اندازہ لگاتے ہیں۔ مگر وہ جو کچھ تھیں وہ اپنی جگہ پر مجھ ایسے وطلمل یقیناً نئی روشنی والے سے بہتر تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے پوچھا "آپ کو اس مسجد میں آکر کیسے رہنا پڑا"

"وہ تو ہوتا ہی بیٹا۔ بیگم ہماری جنت نصیب ہوئیں۔ ان کا وثیقہ بٹ گیا ان سب بدقوموں میں جو آباد دیکھتے ہو تم اس حاطے میں۔ مکان کے بھی حصے ہو گئے۔ مجھ بڑھی آڑھی کو اب کون پوچھتا اور اگر پوچھتا بھی تو کیا میں ان بدقوموں کی خدمت کرتی۔ بھیک مانگ لینا بہتر ہے۔ خدا نے جس کی خدمت کے لئے بنایا تھا۔ وہ میں نے کی۔ اپنے فرض سے ادا ہو گئی۔ اب مرنا وقت ہے۔ کھانے بھرنے کا خدا کہیں نہ کہیں سے بھیج ہی دیتا ہے۔ جب مر جاؤں گی تو کوئی اٹھوا کے توپ بھی آئیگا اس کا انتظام میں نے پہلے ہی کر لیا ہے جناب کے یہاں جن کی میں معتقد ہوں"

مغرب کا وقت ہو گیا۔ میں ان سے اجازت لے کر چلنے لگا انہوں نے کہا "کبھی فرصت ہو تو آجایا کرو۔ میرے حافظے میں داستانیں کی داستانیں بھری پڑی ہیں تمہیں سننے کا شوق ہے۔ جو جو تم پوچھو گے بتاؤں گی۔ لیکن کبھی اندر سبھا ———

اجنبی لڑکی

مہندر ناتھ

کمل نے کہا تھا۔ کہ وہ ساڑھے تین بجے فلورا فونٹین کے بس سٹاپ پر پہنچ جائے گی۔ ساڑھے تین بج چکے تھے، لیکن کمل ابھی تک نہ آئی تھی۔ وہ بس کے اڈے پر کھڑا اُس کا انتظار کر رہا تھا، جوں جوں وقت گذر رہا تھا، وہ کچھ بے چین سا ہو رہا تھا۔ اور ساتھ ہی اُس نے سوچ لیا تھا کہ وہ چار بجے تک کمل کا انتظار کرے گا۔ اگر وہ چار بجے تک نہیں آئی، تو وہ چلا جائے گا۔ اور وہ تقریباً ڈیڑھ ماہ کے بعد کمل سے مل رہا تھا، اس سے پہلے اس عرصہ میں ایک دو ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ لیکن نہایت فروعی سی، وہ اپنے دل کی بات نہ کہہ سکا۔ اور کمل بھی اپنے من کی بات نہ کہہ سکی۔ آج وہ کھل کر کمل سے بات کرے گا۔ اُس نے پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ پانچ منٹ اور گذر چکے تھے۔ ہوا میں ایک نرمی اور ملائمت سی تھی۔ آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ موسم بھی کچھ خوشگوار سا تھا۔ اور وہ واقعی کمل سے ملنا چاہتا تھا۔ کیا کمل آئے گی۔ اُس کے دل میں یہ خیال اچانک آیا۔ کئی دنوں سے وہ سوچ رہا تھا۔ کہ کمل اُس سے کچھ روٹھ سی گئی ہے۔ اس عرصے میں اگر وہ اُس سے ملی، تو نہایت پریشان کن حالت میں، کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی تھی، نہ جانے وہ کیا سوچتی رہتی ہے۔ بس کے اڈے پر کچھ لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اب تو تین بجکر ۵۴ منٹ ہو گئے تھے۔ جوں جوں وقت گذر رہا تھا، اُسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ کمل اب نہیں آئے گی۔ اُس نے اپنی نگاہ اِدھر اُدھر دوڑائی، تاکہ وقت آسانی سے کٹ سکے۔ لوگ کیو میں کھڑے تھے لیکن کچھ تھکے ماندے سے کوئی خوبصورت بشاش چہرہ نظر نہ آ رہا تھا۔ آسمان پر بادل اور گہرے ہو گئے تھے۔ کئی دنوں سے متواتر بارش ہو رہی تھی۔ آج ہی کچھ تھمی تھی۔ وہ بس کے اڈے کو چھوڑ کر ایک طرف کو ہو گیا۔ پہلے ایک بڑی بلڈنگ کے قریب کھڑا ہو گیا۔ سامنے ایک چنے والا چنے بیچ رہا تھا۔ اُس کے قریب ایک پھل فروش پھل بیچ رہا تھا۔ اور اڈے کے سامنے دو بچے پیٹ پر ہاتھ مار کر بھیک مانگ رہے تھے۔ جہاں وہ کھڑا تھا، وہاں سے وہ سامنے والی بڑی گھڑی کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ وہ وہاں سے گھڑی کی سوئی کی ہر حرکت کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ اب تو چار بجنے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ اب تو اُسے یقین سا ہو گیا تھا۔ کہ کمل نہیں آئے گی۔ وہ یہاں سے کہاں جائے۔ شام کہاں اور کدھر گذارے۔ آج اُس کے ذہن میں بہت سی باتیں تھیں۔ جو وہ کمل سے کہنے والا تھا۔ اُس نے سوچ رکھا تھا۔ کہ کمل آئے گی، تو وہ ڈیڑھ ماہ کا سارا غصہ کافور کر دیگا۔ وہ اس پیار و محبت سے پیش آئے گا۔ کہ کمل کی ساری بے رُخی دُور ہو جائے گی۔ وہ اُسے منائے گا۔ کمل اُس کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ وہ اسے اتنی چاہتی ہے، کہ وہ ہمیشہ اُس کی رہے گی۔ اُس کی محبت میں سرشار رہے گی، اس لئے وہ آئے گی، یہ درست ہے۔ کہ اس ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں وہ کمل سے بہت کم بار مل سکا، اُس کی سب سے بڑی وجہ تو موسلا دھار بارش تھی، برسات کا موسم تھا۔ جو آدمی کو گھر سے باہر نہ نکلنے دیتا تھا۔ اُس نے اڈے کی طرف دیکھا۔ بس جا چکی تھی، اڈہ مسافروں سے خالی پڑا تھا۔ وہ اُس بڑی بلڈنگ سے ہوتا ہوا پھر اڈے کے قریب آ گیا۔ اُس نے ایک اخبار فروش سے شام کا اخبار خریدا۔ اور سرخیاں پڑھنے لگا۔ لیکن اُس کا جی سرخیوں پر نہ لگا۔ نگاہیں کسی اور کا انتظار کر رہی تھیں۔

نگاہیں کسی اور کو پڑھنا اور دیکھنا چاہتی تھیں، اب اُسکی نگاہ پھر بڑی گھڑی پر پڑی۔ چار بج چکے تھے۔ اُس کا دل کچھ بجھ سا گیا۔ کیا وہ بیمار تو نہیں ہو گئی۔ اُس نے اپنے دل کو ڈھارس دیتے ہوئے سوچا۔ اب اور انتظار کرنا محض ایک احمقانہ فعل ہوگا۔ جس دن اُنہوں نے آج کی ملاقات کا وقت مقرر کیا تھا اُس دن وہ کچھ بیمار سی تھی، ہلکا سا نزلہ کام اور کھانسی، اور کچھ بخار سا تھا۔ اُس نے کہا تھا۔ کہ تم اس کا علاج کراؤ۔" کہنے لگی۔ کوئی بات نہیں، برسات کا موسم ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا،" اُس دن اُس نے ایک ڈھیلی سی قمیص پہنی ہوئی تھی، اور اُس کا جسم کچھ بھرا بھرا سا معلوم پڑتا تھا۔ اور وہ خود کمل سے کانپتا کانپتا باتیں کر رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں اُس کا بھائی بیٹھا ہوا تھا۔

یہ ملاقات مختصر سی تھی اس ملاقات میں کوئی چاشنی نہ تھی۔ اُس نے کمل کو دیکھنا چاہا۔ لیکن کمل کا رویہ کچھ اس قسم کا تھا۔ جیسے وہ کہہ رہی ہے۔ کہ اب تم جلد چلے جاؤ۔" اُس نے ملاقات کا وقت ٹھہرایا۔ وہ اُس کمرے سے نکل آیا تھا۔ اُس ملاقات کے بعد وہ خود کچھ اُداس سا ہو گیا تھا۔ آج اگر وہ آجاتی تو وہ کمل کے سارے وسوسے دُور کر دیتا۔ آج کی ملاقات کی بہت اہمیت تھی۔ وہ خلیج جو اُن دونوں کے درمیان وسیع ہو رہی تھی، شاید اس ملاقات کے بعد کم ہو جاتی۔ کیا کمل نے اپنا ارادہ بدل تو نہیں لیا۔ اگر کمل نے اپنا ارادہ بدل لیا ہوتا، تو وہ صاف کہہ دیتی، کہ میں نہیں آؤنگی، اُسے یہاں بلانے کی کیا ضرورت تھی، کیا اُس نے کسی اور لڑکے سے عشق تو نہیں کر لیا۔ لیکن کمل اس قسم کی لڑکی نہ تھی۔ اگر اُس نے اس قسم کی بات کرنی ہوتی۔ تو وہ ضرور اُسے کہہ دیتی۔ اور پھر اُن دونوں کے درمیان بحث کا ایک بھرپور جذبہ تھا۔ اُس کے دل میں طرح طرح کے خیال گشت لگا رہے تھے۔ اُن مکھیوں کی طرح جو ایک رِستے ہوئے زخم کے اردگرد منڈلاتی رہتی ہیں، چار بج چکے تھے۔ گھڑی کی سوئی چار سے آگے بڑھ چکی تھی۔ اب کمل نہیں آئے گی۔ اُس کے ہونٹ اس خیال کے آتے ہی خشک ہوتے گئے، سینہ بھاری سا ہو گیا۔ اور گلے میں ایک لرزش سی پیدا ہوئی، اُس نے سوچا، اب اُسے اور انتظار نہیں کرنا چاہیئے، اب وہ کیا آئے گی۔ وہ واقعی اُس سے ہمیشہ کے لئے روٹھ گئی ہے، اب کے ایک بار اُس نے پھر بڑی گھڑی کی طرف دیکھا۔ چار بجکر دس منٹ ہو گئے تھے۔ وہ واقعی اس اڈے سے جانا نہ چاہتا تھا۔ شاید وہ آجائے۔ اس اڈے سے اُسکی بہت سی اُمیدیں وابستہ ہو گئیں تھیں، لیکن اڈہ تو خالی تھا۔ اڈے کے عین پیچھے ایک کتب فروش کتابیں بیچ رہا تھا۔ اُس نے ایک قدم اُٹھایا، پھر حسرت بھری نگاہوں سے اس اڈے کی طرف دیکھا، جیسے وہ ایک بڑے مزار کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہو، جیسے وہ یہ محسوس کر رہا ہو، کہ یہاں میری محبت کی ناکامیاں اور حسرتیں دفن ہیں، اور پھر اُس نے آرزومند نگاہوں سے اُس راستہ کو دیکھا، جدھر سے اکثر کمل آتی تھی۔ نگاہیں آہستہ آہستہ اُس راستے کا جائزہ لینے لگیں۔ آج نگاہیں اپنی محبوبہ کے انتظار میں بچھی جا رہی تھیں۔ آج واقعی یہ راستہ دیکھ رہی تھیں ——— ہر پیچ و خم سے واقف ہو رہی تھیں۔ ایک ایک اینٹ، ایک ایک ذرّے کو دیکھ رہی تھیں۔ ٹٹول رہی تھیں ——— جب نگاہوں نے راستہ کا پورا احاطہ کر لیا، تو اچانک راستے کے اُس موڑ کے قریب اُسے کمل بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ اُس کے بیمار ہونٹوں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے جہاز ڈوبتے ڈوبتے بچ گیا ہو، جیسے مسافر ایک لمبا سفر کر کے منزل مقصود پر پہنچ گیا ہو۔ وہ کمل کی طرف ایک اندھے انسان کی طرح بڑھا، اُس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ کمل اُس کی طرف آ رہی تھی۔

وہ اُس کے قریب چلا گیا۔

"بہت دیر لگا دی تم نے۔" اُس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

کمل نے اُسکی طرف دیکھا۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔ اُس نے کمل کے چہرے کو دیکھا۔ اس چہرے کو کتنی بار دیکھ چکا تھا۔ اس چہرے کا ہر نقش اُس کے ذہن میں اُتر گیا تھا۔ ہاں۔ بالکل وہی آنکھیں، کالی سیاہ آنکھیں، بڑی بڑی آنکھیں، صاف اور شفاف آنکھیں، آنکھیں، جیسے نیلا آسمان۔

پُرسکون آنکھیں، ہاں وہی ماتھا، فراخ اور کشادہ، وہی بال، تھوڑے تھوڑے بھورے۔ کچھ کچھ گھنگھریالے، وہی سپیر گردن۔ وہی اُبھرا ہوا سینہ، وہی جسم جو اُس نے کتنی بار دیکھا تھا۔ وہ کچھ سوچنے لگا۔ کہ کمل نے کہا "کہاں چلو گے"!

" اُسی ریستوران میں"!

اور دونوں اُس ریستوران کی طرف چل دیئے۔

راستے میں دونوں نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی، وہ سوچ رہا تھا۔ کہ وہ بات کیا کرے، لیکن پہلے ریستوران میں جا کر چائے پی جائے، چائے پینے کے بعد کمل کا موڈ ٹھیک ہو جائے گا، آج وہ کمل کو ہر بات بتا دیگا۔ اپنے دل کا راز اُس کے آگے کہہ دیگا۔ اور اُس سے ہر بات پوچھ لے گا۔ وہ کیوں کئی دنوں سے اُس سے چُپ چُپ سی رہتی ہے۔ وہ اُس سے کھل کر بات نہیں کرتی، اُس کی آنکھوں میں وہ ملائمت کیوں نہیں، وہ اُسے دیکھ کر خوش کیوں نہیں ہوتی، اُس کے لبوں پر مسکراہٹ کیوں نہیں۔

وہ اپنے پُرانے ریستوران کے اندر پہنچے، اُسی پُرانی جگہ پر۔ ایک میز اور تین کرسیاں۔ جب دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے، تو بیرہ آیا۔

کمل اُس کے بائیں طرف بیٹھی۔ وہ ہمیشہ اُس کے بائیں بیٹھا کرتی تھی۔

کیا پیوگی۔ اُس نے کمل سے پوچھا۔

" کچھ نہیں" آواز میں کرختگی تھی۔

" کافی"!

" پیٹ خراب ہے" اُس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

" کیا ہُوا"؟

" گیس ———" اُس نے آنکھوں کو ایک لمحہ کے لئے بند کرتے ہوئے کہا۔

" چائے پی لو"!

" میں چائے کبھی نہیں پیتی، یہ تم جانتے ہو"!

" اورنج سکویش"!

" بالکل نہیں"!

" اگر آپ اجازت دیں تو منگواؤں"!

" کیا" کمل نے ذرا حیران ہو کر پوچھا۔

" تھوڑا سا سنکھیا" اُس نے موڈ کو بدلتے ہوئے کہا۔

" وہ آپ ہی کھا لیجئے گا۔ صحت کے لئے اچھا رہے گا" کمل نے بھڑک کر کہا۔

" پیٹ خراب ہے تو سوڈا منگواؤں" اُس نے پھر منانے کی کوشش کی۔

کمل نے سر ہلایا، جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ اگر تم ضد کرتے ہو تو منگوا لو۔

بیرہ چلا گیا تھا۔ ہماری باتیں سُن کر۔ اُس کو پھر بلایا گیا۔

" ایک سپیشل چائے۔ اور ایک سوڈا، ٹھنڈا!" اُس نے کمل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

" ٹھنڈا نہیں۔ گرم۔ یعنی بغیر برف کے۔"

بیرہ چلا گیا۔

اُس نے کمل کی طرف دیکھا۔ وہ کرسی پر اس طرح بیٹھی ہوئی تھی، جیسے ابھی وہ سُولی پر چڑھنے والی تھی۔

" ٹھیک طرح بیٹھو۔"

" میں بالکل ٹھیک بیٹھی ہوئی ہوں۔"

" تم خاموش کیوں ہو؟"

" طبیعت ٹھیک نہیں۔"

" تم تو اس سے پہلے بہت باتیں کیا کرتی تھیں، اور میں اکثر خاموش رہا کرتا تھا، آج تم خاموش کیوں ہو۔ آج ہی نہیں، بلکہ میں عرصہ ڈیڑھ ماہ سے دیکھ رہا ہوں، کہ تم خاموش رہتی ہو، اور مجھے باتیں کرنا پڑتی ہیں۔"

وہ خاموش رہی۔

کمرے میں کافی سنّاٹا تھا۔ قریب ایک جوڑا بیٹھا ہوا تھا، جو سر سے سر ملا کر سرگوشیوں میں گفتگو کئے جا رہا تھا۔

اُس نے پھر کمل کی طرف دیکھا، کمل کا چہرہ کچھ اُداس اور زرد تھا۔ اُس کے ہونٹ ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ اور اس قدر بھنچے ہوئے تھے، جیسے ایک دوسرے سے سی دیئے گئے ہوں، اُسکی آنکھوں میں ایک سختی سی آگئی تھی۔ جیسے پیار اور شفقت کی جگہ بے رحمی نے لے لی ہو۔ ماتھے پر سلوٹیں اور گہری ہو گئیں تھیں۔ آنکھوں کے نیچے گڑھے سے پڑ گئے تھے۔ شاید رات بھر کمل کو نیند نہیں آتی۔ وہ اُس سے کیا بات کرے، کیا وہ اپنی محبت کی بات کرے، کیا وہ اُس سے کہے کہ اُسکی مالی حالت ابھی تک نہیں سُدھری، کیا وہ اُس سے کہہ دے۔ " کمل میں تمہیں بہت چاہتا ہوں، لیکن یہ نہایت فرسودہ فقرہ ہے، یہ فقرہ ہر عاشق اپنے محبوب سے کہتا ہے، کیا وہ کہہ دے، کہ کمل میں تمہیں عمر بھر نہ بھول سکونگا، تمہاری محبت نے مجھے زندہ رہنے کی ترغیب دی ہے، اُس کا کتنا ممنون ہوں، تمہاری محبت نے میرے حُسن کو نکھارا ہے۔ اب یاسیت کی جگہ خوشی نے لے لی ہے، مجھے تمہاری محبت نے دوبارہ زندہ رہنے پر مجبور کر دیا ہے، اُسے کہہ دوں، اور کیا کچھ کہوں۔ کہ رات بھر نیند نہیں آتی، نیند تو آتی ہے۔ کمل۔ لیکن نیند۔ اور نیند میں فرق ہوتا ہے ——— لیکن یہ سب کچھ جھوٹ ہوگا۔ اُسے معلوم ہے، ان باتوں سے کمل پر کچھ اثر نہ پڑیگا۔ وہ ان باتوں سے کبھی مرعوب نہ ہوگی۔"

اتنے میں سوڈا اور چائے آگئی۔

کمل نے سوڈا کا گلاس اپنی طرف کر لیا، اُس نے چائے کی طشتری اپنی طرف کر لی، آج وہ جانتا تھا۔ کہ کمل اُس کے لئے چائے نہیں بنائیگی۔

" کیا تمہیں ابھی تک مجھ سے محبت ہے،" اُس نے کمل کو خوش کرنے کی کوشش کی۔

کمل کے ہونٹ ایک لمحہ کے لئے کانپے۔ اور پھر جامد ہو گئے۔

اُسے کچھ غصہ سا آگیا۔

" مجھے یہ تمہارا سُوجھا ہُوا چہرہ اچھا نہیں لگتا۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم بات تک نہیں کرتیں، اگر مجھے غصہ آگیا، تو تھپڑ مار کر بتیس دانت باہر نکال دونگا۔" اُس نے یہ الفاظ سخت گیر لہجہ میں کہے۔

"میں اب اس قسم کی گفتگو سننا پسند نہیں کرتی" کمل نے جل کر کہا۔

جوابی حملہ بہت سخت تھا۔ لیکن وہ اس چوٹ کو پی گیا۔ اُس نے سوچا، یہاں "تشدد" کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

اُس نے عدم تشدد کی پالیسی اختیار کی۔

اُس نے کمل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کی، لیکن کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہ ہوئی۔

یہ وار بھی خالی گیا۔

وہ سوڈا پینے لگی۔

وہ چائے بنانے لگا۔ اور چائے بناتے ہوئے پوچھنے لگا "کہ اس میں شک نہیں، کہ وہ نہیں چاہتا کہ کمل اُس سے روٹھ جائے۔

اُس نے اس لڑکی سے واقعی محبت کی تھی۔ اور اُسے اس لڑکی سے واقعی محبت تھی۔ لیکن دو ماہ سے وہ ایک عجیب غریب چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ نہ وہ اپنے آپ سے کچھ کہہ سکتا تھا۔ نہ اس لڑکی سے، وہ اس عرصہ میں کمل سے کیوں نہ مل سکا۔ ڈیڑھ ماہ سے کیوں الگ تھلگ رہنے لگا تھا، وہ کیوں اُسی شدت، اُسی پیار سے کمل کو نہ دیکھ سکا، ایسا ہوا۔ تو کیوں ہوا، اور کیا کمل کو اس بات کا علم ہو گیا تھا۔ کیا وہ کمل کو ساری حکایت سُنا دے۔ اگر اُس نے یہ ساری حکایت سُنا دی، تو کمل ہمیشہ کے لئے اُس سے روٹھ کر چلی جائے گی۔ وہ پھر منانے کی کوشش کرنے لگا۔ شاید ان خشک لبوں پر ایک ثانیہ کے لئے مسکراہٹ آجائے، اور وہ اُس مسکراہٹ سے فائدہ اُٹھا سکے۔

"کیا میں آپکے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہوں"

کمل نے قہر آلودہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا، جس کا یہ مطلب تھا۔ کہ جی نہیں۔

اُس کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ میز پر دھرا کا دھرا رہ گیا۔

یہ وار بھی خالی گیا۔

اُس نے ہارے ہوئے جواری کی طرح پینترا بدلا۔

"ایک عرصہ سے میں نے تمہارے لبوں کو نہیں چوما، کیا میں ایک بوسہ لے سکتا ہوں"

کمل کے لب اور اندر کی طرف بھینچ گئے، مہربان نگاہوں میں اور سختی اور بے رحمی سی آگئی، ماتھے کی سلوٹیں اور گہری ہو گئیں، اور لبوں کے کونے سکڑ کر رہ گئے۔

اس کا مطلب آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ اگر آپ نے نئی لڑکی سے محبت کی ہے۔ اُسے آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

وہ اس لڑکی کو ایک عرصہ سے جانتا تھا۔ اُس نے کتنی بار ان لبوں کو چوما تھا۔ یہ بھرے بھرے سے ہونٹ، وہ کتنی بار اس لڑکی کے ساتھ باہر گیا تھا۔ اس کے ساتھ گھوما تھا۔ اُس وقت جبکہ اُن کی محبت جوان تھی، ڈیڑھ سال تو ہوا ہوگا۔ وہ شہر سے بہت دُور نکل جاتے تھے، عجیب غریب جگہوں کا اُنہوں نے پتہ لگایا تھا۔ جہاں محبت کی جا سکتی ہے، ایک بار تو وہ شہر سے بہت دُور ایک چھوٹی سی پہاڑی کے اُوپر چڑھ گئے تھے، اور گھنی جھاڑیوں کے درمیان بیٹھ جاتے تھے، وہاں اُنہیں کسی کا ڈر نہ رہتا تھا۔ کتنے حسین تھے وہ لمحات، جب محبت کے آتشیں لمس سے وہ شامیں آنِ واحد میں گزر جاتی تھیں، اُن دنوں سے اُن دونوں کے درمیان کوئی دیوار حائل نہ تھی۔ اُس نے جو کچھ کہا، کمل نے مانا۔

کمل نے کہا "میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں" اور اُس نے کہا "مٹھی جائیے مجھے کہ ظاہر لینے تک جانا پڑتا رہتا ہوں۔ کمل۔ وہاں میں ٹانگیں

پھیلا کر سو نہیں سکتا۔ تمہارا اور ہمارا بچہ وہاں کیسے سوئے گا۔ وہ کہتی، تم کوشش نہیں کرتے، وہ کہتا، میں ایک عرصہ سے اسی کوشش میں سرگرداں ہوں، کہ کہیں سے مجھے دو کمرے کا فلیٹ مل جائے، میری ذرا مالی حالت سُدھر جائے، تو تم میرے پاس آ کر رہ سکتی ہو، وہ کہتی، میں تم پر بوجھ بن کر نہ رہونگی، میں بھی کام کر دونگی تم بھی کام کرنا۔ اور یہ کہہ کر وہ نگاہیں اُوپر کر لیتی، اور پھر کہتی، ہمارا بچہ کتنا خوبصورت ہوگا۔ نقش تمہارے ہوں گے۔ ذہانت میری ہوگی"۔ مجھے ماں بننے کی کتنی آرزو ہے۔ اور وہ اُس کے اُبھری چھاتیوں کی طرف دیکھنے لگتا جو واقعی بڑی بھرپور اور خوبصورت تھیں۔ اُن میں کتنی ملائمت اور ممتا تھی، میں بھی کام ڈھونڈنے کی کوشش کر دونگی"۔ اور یہ کہہ کر وہ قریب کی جھاڑیوں سے ایک خوشنما پھول توڑ لیتی، اور بھورے بھورے بالوں میں لٹکا لیتی۔ اُس نے زندگی میں پہلی ایک ایسی عورت سے محبت کی تھی، جسے واقعی ماں بننے کی اتنی شدید آرزو تھی، جسے خاوند کو پانے کی اتنی تمنا تھی، جسے ایک گھر بسانے کی اتنی خواہش تھی۔ اور وہ خود بھی عمر کے ایسے حصے میں قدم رکھ رہا تھا، جہاں وہ واقعی باپ بننا چاہتا تھا۔ وہ کمل سے عمر سے بڑا بھی تھا، وہ چاہتا تھا، کہ اُس کا ایک بچہ ہو۔ اس سے قبل اس قسم کی تمنا اُس کے سینے میں یوں خنجر بن کر کبھی نہ اُبھری تھی۔ بیٹے کے خیال نے اتنا نہ ستایا تھا۔ شاید اُس کے سر کے بال سفید ہو رہے تھے، جنہیں وہ اپنے کالے بالوں میں چھپا کر رکھتا تھا۔ یا صبح اُٹھ کر وہ اپنے سفید بالوں کو نوچ ڈالتا تھا۔ دو کمل بس ایک فلیٹ۔ صرف دو کمرے کا فلیٹ۔ اور ذرا سی مالی حالت اور سدھر جائے۔ اور تمہیں کچھ کام مل جائے۔ اور بس اور کچھ نہیں چاہیئے، کمل، اور کچھ نہیں چاہیئے"۔ اور وہ خوش ہو جاتی، وہ جانتی تھی کہ فلیٹ مل جائے گا، صرف دو کمرے کا فلیٹ۔ اور انہی دو کمروں کے فلیٹ کی تلاش میں وہ جوہو کی طرف نکل جاتے۔ اور شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں سمندر کی سیر کرتے۔ اور جب سورج ڈوب جاتا، اور سارے سمندر میں آگ سی لگ جاتی، تو وہ ارغوانی شفق کی خوبصورتی کو اپنے اندر جذب کرتے، کتنی بار انہی شاموں نے رات کا جامہ پہنایا۔ اور وہ ساحل پہ لیٹے رہے۔ چاند آسمان پر نکل آیا۔ اور اپنی چاندنی کے نور سے اُنہیں نہلایا۔ اور وہ دونوں ہم آغوش ہو کر ساحل پر اکٹھے لیٹ جاتے۔ اور کمل کہتی" آج تک اُس نے کسی انسان سے اس قسم کی محبت نہیں کی۔ وہ واقعی سچ کہتی تھی۔ وہ کہتی تھی، اب مجھے اپنا گھر اچھا نہیں لگتا، گھر جاتی ہوں، تو تمہاری یاد آتی ہے، تمہاری باتیں یاد آتی ہیں۔ تم مجھے کبھی چھوڑ کر نہ جانا" نہیں ان باتوں کے پیچھے واقعی ایک پُرخلوص جذبہ تھا۔ ایک ایثار تھا۔ کمل اُسکی پیشانی کو چومتی۔ اور وہ کمل کی سپر گردن کو۔ جہاں ایک نیلی سی رگ پھڑپھڑاتی۔ اور وہ کہتا" تمہاری گردن کتنی مرمریں ہے"۔

"مرمریں کیا،" وہ چونک کر کہتی۔

"یعنی نرم"۔

"وہ پھر ہنس دیتی"۔

اور وہ اُس کے بالوں سے کھیلنے لگتا۔

اور اس طرح وہ شامیں بیت گئیں۔ اس انتظار میں کہیں سے فلیٹ مل جائے، دو کمرے کا فلیٹ، مالی حالت ذرا سی سدھر جائے۔

اور اب کمل اُس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ بالکل ایک اجنبی لڑکی کی طرح، جیسے وہ اُس کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ یہ کیسے اور کیوں ہو گیا۔

اُس نے پھر کمل کی طرف دیکھا، وہ سوڈا پی چکی تھی۔ اُس کے چائے کی پیالی میں چائے کے آخری قطرے لرز رہے تھے۔

اُس نے سوچا، کیا ان نگاہوں میں اب نرمی نہ آئے گی۔ لیکن وہ آنکھیں، اُسی طرح اُسکی طرف دیکھ رہی تھیں، جسم میں وہی تناؤ تھا، کرسی پہ اُسی طرح اکڑ کر بیٹھی ہوئی تھی کوئی نرمی نہ تھی، کوئی لچک نہ تھی، وہ کمل سے کیا کہے، کیا کمل نے اُسے دوسری لڑکی کے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اور پھر یہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔ اگر دیکھ لیا تھا تو وہ [illegible] پوچھ سکتی ہے لیکن [illegible] پوچھ [illegible] تم کیوں نہیں بتا دیتے"۔

وہ سوچنے لگا۔

لیکن اُسے کچھ اور شک پیدا ہوا۔ کیا کمل کو دوسرے لڑکے سے محبت تو نہیں ہو گئی۔ اسی لئے اُس نے کہا "کیا تمہیں کسی اور لڑکے سے محبت ہو گئی ہے۔ کمل،

کمل کے ہونٹوں پہ ایک ہلکی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اور اُس نے سوچا کہ واقعی اُسے دوسرے لڑکے سے محبت ہو گئی ہے، اُس لڑکے کے پاس ضرور دو کمرے کا فلیٹ ہو گا ضرور ایک اچھے عہدے پہ فائز ہو گا۔ اسی لئے تو یہ مسکراہٹ لبوں پہ آ گئی۔ اس لئے شاید کمل نے مرن برت رکھ لیا ہے۔ اب اُس نے اصلی راز کو پا لیا۔

دوسرے لمحے میں وہ مسکراہٹ ایک نفرت انگیز جذبے میں تبدیل ہو گئی۔ اور کہنے لگی "کیا تم محبت کو اتنی سستی اور حبیب سمجھتے ہو۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو۔ کہ میں جب کبھی گھر سے باہر نکلتی ہوں تو لڑکوں کی تلاش میں نکلتی ہوں، کہ اگر تم سے لڑائی ہو گئی، تو میں فوراً دوسرے آدمی سے عشق کرنے لگوں گی۔ تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ ایک لمحہ کے لئے وہ سکتے میں آ گیا۔ اُس نے دیکھا۔ کہ کمل کے ناک کے نتھنے غصّے سے پھول گئے تھے۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اور سینے کے اُتار چڑھاؤ سے معلوم پڑتا تھا۔ کہ ابھی آتش فشاں کا پہاڑ پھوٹ پڑیگا۔ اور ہر چیز کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔ لیکن کمل نے اپنے اوپر قابو پا لیا، نہ جانے اُسکی آنکھوں میں ایک ہلکی سی نمی آ گئی۔ اُس نے سوچا، اب کمل روئے گی، وہ ضرور روئے گی۔ اُسکی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلیں گے۔ اور اُسے موقعہ مل جائے گا۔ کہ وہ محبت کو از سرِ نو زندہ کر سکے۔ وہ اُسے چپ کرائے گا۔ وہ اپنے ہونٹوں سے ان آنسوؤں کو پونچھ ڈالے گا۔ جو اُس کے رخساروں پر بہہ نکلیں گے۔ لیکن وہ لمحہ گذر گیا۔ ناک کے نتھنوں نے پھڑکنا چھوڑ دیا۔ اور ہونٹ پھر اپنی جگہ پر آ گئے۔ اور اس طرح ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے، جیسے کارک بوتل میں فٹ ہو کر رہ جاتا ہے۔

اُس نے سوچا۔ کمل کو معلوم ہو گیا ہے۔ کہ وہ اس عرصے میں ایک دوسری لڑکی کے ساتھ گھومتا رہا ہے۔ لیکن کیوں۔ یہ شاید اُسے معلوم نہیں۔ اگر کمل نے اُس کو نہیں دیکھا، تو کم سے کم ان باتوں کو محسوس ضرور کر لیا تھا۔ اس لئے اُس کا رویہ اس قسم کا ہے۔

"وہ دیکھو۔ وہ جا رہی ہے، سودا ختم ہو گیا ہے" ـــــ

"میں تمہارے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہوں" اُس نے کمل کو پیار بھرے لہجے میں کہا۔ اس وقت وہ واقعی چاہتا تھا۔ کہ کمل روٹھ کر نہ جائے۔ وہ واقعی چاہتا تھا۔ کہ کمل کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں رکھ لے۔ وہ واقعی چاہتا تھا۔ کہ وہ ایک بار پھر چائے کا آرڈر دے، اور کمل اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر دے۔ اُس سے ہنس ہنس کر باتیں کرے۔ اور وہ چائے پیتا رہے۔ اور اُس سے کہے۔ کہ اُسے جلد ہی دو کمرے کا فلیٹ مل جائے گا۔ لیکن وہ جانتا تھا۔ کہ وہ اس قسم کی حرکت نہ کر سکے گا۔

"کمل اپنا ہاتھ اِدھر لاؤ"

تم مجھے چھو نہیں سکتے۔ وقت کافی ہو گیا ہے، میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔ کمل نے بھڑک کر کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں۔ کہ میں تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤنگا۔ ذرا چھوڑ تو سہی"

"تم بیرے کو بلاؤ"

کمل نے بٹن دبایا۔ گھنٹی بجی۔ بیرہ آیا۔

بیرہ نے بل دیا۔

"کل آٹھ آنے"

اُس نے بل ادا کیا۔ بیرہ آٹھ آنے لیکر چل دیا۔

"اب چلیں" کمل نے اُسکی طرف دیکھ کر کہا۔

"ایک بات بتا کر جاؤ۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ تم مجھ سے ناراض کیوں ہو۔"

"میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ میں کسی سے ناراض نہیں ہوں۔ میں ناراض ہو کر کیا کر لونگی"

کیا میں نے تمہاری محبت کا ناجائز فائدہ اُٹھایا، کیا تم یہ سمجھتی ہو۔ کہ میں آج تک تمہیں دھوکا دیتا رہا ہوں۔

میں نے یہ باتیں کبھی نہیں سوچیں۔ میں نے یہ کبھی نہیں کہا۔ کہ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ جو کچھ میں نے کہا۔ وہ میں جانتی ہوں۔ اور اُس کا مجھے افسوس نہیں ہے۔ لیکن آج سے میں قسم کھا کر کہتی ہوں، کہ میں کسی مرد سے بات نہ کرونگی، کمل نے قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

"اُسے واقعی اُس کی حرکت کا علم ہو گیا ہے۔ اب کہنے سے کیا فائدہ۔ اُس نے ضرور اُسے کسی دوسری لڑکی کے ساتھ گھومتے دیکھ لیا ہوگا۔ جبھی اُس کا رویہ اس قسم کا ہے"

"اُٹھو۔ چلیں"

"جانے سے پہلے ایک بات بتاتی جاؤ"

"کیا"

"کیا تمہیں نوکری ملی"

"نہیں"

اس "نہیں" میں زندگی کی ساری شقاوت اور بہیمیت سمٹ کر آگئی تھی۔

"تم جا رہی ہو"

وہ کھڑی ہو گئی، کمل جا رہی تھی، اُسے یقین نہ آتا تھا۔ کہ وہ واقعی جا رہی تھی۔

"وہ کونسا حربہ استعمال کرے۔ لیکن اب کچھ فائدہ نہیں" اُس نے سوچا۔

وہ جا رہی تھی ـــــــ

یہ عورت۔ یہ لڑکی۔ تو اُس کی محبوبہ تھی۔ ڈیڑھ سال پہلے سب کچھ اُس کا تھا۔ اس لڑکی نے ہنس ہنس کر باتیں کی تھیں، اس لڑکی نے اس کے بالوں کو چوما تھا۔ اسکی آنکھوں کی تعریف کی تھی۔ اُس کی سانس کو اپنے اندر جذب کیا تھا، اُس کے جسم سے گرمی حاصل کی تھی۔ اُس کی رُوح کو اپنایا تھا۔ آج اسے کیا ہو گیا۔ آج ایک لوہے کی سلاخ کی طرح کیوں سخت اور پتھریلی ہو گئی تھی۔ وہ لچک اور نرمی کہاں گئی۔ صرف ڈیڑھ مہینے کے عرصہ میں یہ لڑکی اُس کے لئے ایک اجنبی بن گئی۔ اور یہ لڑکی اب اُس کو نہ جانتی تھی۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہ دونوں برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں۔ وہ کیا کہے۔

وہ کس طرح کہہ دے۔ وہ کس طرح سمجھائے، کہ اُس نے ہزار بار کوشش کی، کہ دو کمرے کا فلیٹ لے سکے۔ لیکن وہ آج تک نہ لے سکا۔

اُس نے اپنی ایڑیاں رگڑ لیں۔ کہ اُسکی مالی حالت سُدھر جلئے ۔. لیکن وہ پہلے سے ابتر ہوتی گئی ، اور جب اُسے یقین ہو گیا۔ کہ اب وہ ساری عمر باپ نہ بن سکے گا۔ تو اُس نے ایک لڑکی کے ساتھ گھومنا شروع کر دیا۔ اپنی خفت کو چھپانے کے لئے۔ اپنی ناکامیوں اور شکستوں پر پردہ ڈالنے کے لئے۔ وہ اُسے کیسے بتادے ، جب انسان شکست خوردہ ہو جاتا ہے ، تو انہی جھوٹی جھوٹی باتوں میں لذّت لیتا ہے۔ اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں ، وہ ابھی تک اُسے چاہتا ہے ، لیکن چاہنے سے کیا ہوتا ہے ، وہ دوسری لڑکی جو تمہارے ساتھ ہے ،۔ اُس کا کیا ہوگا۔ تو پھر اس کا کیا ہوگا۔ تمہارا کیا ہوگا۔ اس زندگی کا کیا ہوگا۔

— — — — — —

دونوں ہوٹل سے باہر نکلے۔

آسمان پر بادل اور گہرے ہو گئے تھے۔ اور ہلکی ہلکی پھوار سی پڑ رہی تھی ، لوگ جوق در جوق گھوم رہے تھے۔ موٹریں اور بسیں اُسی طرح دوڑ رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر لوگ اُسی طرح چل رہے تھے۔ زندگی اُسی طرح رواں دواں تھی۔ بس کے اڈے پر کمل کھڑی ہو گئی۔

" کیا میں تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں " اُس نے کہا۔

' مجھے ایک جگہ ضروری جانا ہے '۔

" کیا میں تمہارے گھر آسکتا ہوں۔ اگر تم ...... "

اُس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔

" ضرور آسکتے ہو " اُس نے لبوں کو سکیڑتے ہوئے کہا ، اتنے میں بس آگئی اور وہ دوڑ کر بیٹھ گئی۔

" وہ جا رہی ہے " اُس نے سوچا۔ ' وہ چلی گئی ہے ' ، دل نے کہا۔ وہ اُس سے ملنے جا سکتا ہے۔ لیکن وہ کس سے ملے۔ کمل سے ،۔ یا اُس اجنبی لڑکی سے جسے وہ نہیں جانتا ——

———

انناس کا درخت

دیویندر اِسّر

وِنے میرا دوست ہے اور اپنے تمام دوستوں کی طرح میں اُس سے پیار کرتا ہوں۔ وہ مجھے کب، کیسے، کہاں، اور کیوں ملا۔ یہ ایک غیر ضروری تفصیل ہے۔ لیکن جب وہ مجھے ملا تو میں اپنا گھر بار چھوڑ کر تلاشِ معاش میں دِلّی کی تنگ گلیوں اور کشادہ سڑکوں پر بیکار گھوم رہا تھا۔ اور وہ پانی کی بوتلوں میں سکرین اور کاربالک ایسڈ گیس بھرنے کے عمل میں مصروف تھا۔ دن بھر وہ گھوم پھر کر بوتلیں بیچتا تھا اور رات بھر پلک جھپکائے بغیر بوتلیں بھرنے کے عمل میں مشغول رہتا تھا۔ ایک بار اُسکی پلک جھپک گئی تھی تو ڈز سے ایک بوتل ٹوٹ گئی اور شیشے کے ٹکڑے اُس کے چہرے اور بازو پر جا لگے تھے۔ اُن زخموں کے نشان اُسکی پیشانی اور بازو پر ابھی تک موجود ہیں۔ شاید اِسی لئے وہ بار بار کہا کرتا "دوست چوکس رہنا۔ پلک نہ جھپکنے پائے۔ ورنہ ساری عمر اپنے چہرے اور بازو پر زخموں کا نشان لئے کہاں چھپتے پھروگے؟"

میرے دِلّی آنے کے چند روز بعد ہی وہ بھی بے روزگار ہو گیا۔ اُنہیں دنوں 'کوکا کولا' کی مشہور فرم نے اپنا کاروبار دِلّی میں کھول لیا تھا اور وِنے کے پاس بوتلیں بھرنے کے جتنے نادر فارمولے تھے سب بے کار ہو گئے۔ اور وہ خود دِلّی کی لمبی لمبی سڑکوں پر رات دن گھوم گھوم کر سوچنے لگا کہ کیوں نہ وہ "کوکا کولا" کی فرم میں ملازمت کر لے۔ لیکن اُس نے کوکا کولا کی فرم میں ملازمت نہ کی۔ شاید اُس نے کوشش کی مگر جگہ نہ ملی۔ جب ہم دونوں کی جیبیں خالی ہو گئیں تو ہم گھومنے کے بجائے گھنٹوں ایک ہی جگہ بیٹھنے لگے۔

ایک روز میں بنک اسٹریٹ پر ایستادہ ایک درخت کے سہارے سر لگا کر کچھ سوچنے لگا کہ ایک بزرگ سے آدمی نے مجھے شانوں سے جھنجھوڑا ——— "ینگ مین۔ تمہیں کیا تکلیف ہے؟" میں جیسے کسی ڈراؤنے خواب سے چونک اُٹھا ——— "کچھ نہیں ——— ویسے ہی ذرا تھک گیا تھا۔" وِنے نے میرے شانوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "یہ آرٹسٹ ہے۔ اور سمجھ رہا ہے کہ تصویر مکمل ہونے سے پہلے ہی اُس کے رنگ ختم ہو رہے ہیں۔ اِس لئے ذرا پریشان سے ہے۔"

بزرگ آدمی چلا گیا اور وِنے چند دنوں بعد قسمت آزمائی کے لئے پونا روانہ ہو گیا۔

پونا میں وِنے عمارتیں بنوانے والے کسی ٹھیکیدار کے پاس مزدوروں کی نگرانی اور حساب کتاب رکھنے پر ملازم ہو گیا۔ دو ڈھائی ماہ بعد عمارت کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ اُس کا خط آیا۔

"لیبارٹری کی عمارت مکمل ہو چکی ہے۔ مزدور عورتیں اور مرد کسی نئی تعمیر کی تلاش میں بیکار گھوم رہے ہیں ——— منگلو، مراد، لنگا پا، جو پا ماں اور میں ——— سب کے سب بے کار ہیں۔ اُن کے ہاتھ سیمنٹ کے سلیٹی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ سر کے بال مٹی میں اٹے ہوئے اور چوٹیں کھائے پاؤں پر رستے ہوئے زخم۔ اتنی بڑی عمارت کی تعمیر کے

بعد وہ ایسے نظر آتے ہیں۔ جیسے زلزلے کے بعد اس عمارت کے کھنڈر نظر آئیں گے
——— گل مہر کے کمسن درخت سُرخ پھولوں سے لدے ہوئے ہیں اور آہستہ آہستہ
پھول سُوکھ کر دھرتی پر گر رہے ہیں۔ میں بے کار ہوں، مجھے فرصت ہے اور گل مہر کے
پھول خوبصورت نظر نہیں آتے ———"

میں نے اُس کے خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ اُسکی زندگی میں جو زہر ہوئے ہوئے سرایت کر رہا تھا اُس میں میں مزید تلخی نہیں شامل کرنا چاہتا تھا۔ چند روز بعد اُس کا خط پھر آیا ——— اس بار خط مختصر تھا۔

"میرے پاس پیسے نہیں۔ کام نہیں اور جیولٹ اب بہت رات گئے تک آؤٹ ڈور
شوٹنگ پر جانے لگی ہے۔ تم بہت یاد آ رہے ہو اور تمہارے بغیر جیسے سناٹا سا
چھایا رہتا ہے۔"

میں نے کئی بار اُسے خط کا جواب دینے کے بارے میں سوچا۔ لیکن ہمیشہ یہی سوچکر رہ گیا۔ کہ میرے پاس اُس آب شباب کا ایک قطرہ بھی نہیں جو اُسے پلا کر اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کو ہی ابدی کر سکوں۔ وہ ادبی مجلسوں میں شرکت کرتا ہے۔ سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لیتا ہے۔ لیکن اُس کی بے کاری اُسے ایسے گناہ کی مانند کھا رہی ہے جس کے باعث نہ تو وہ اس دنیا میں مسرّت سے جی سکتا ہے اور نہ ہی جنّت کا خوش آیند تصوّر کر سکتا ہے اور اُس کے چاروں طرف جہنم کی آگ کے شعلے سانپ کی طرح لہرا رہے ہیں اور ہر لمحہ ڈسنے کے لئے تیار ہیں۔ گو میں نے اُسے خط کا جواب نہیں دیا لیکن میں نے اُسے اپنے تصوّر میں کئی بار دیکھا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں دیوار پر آویزاں اپنی پہلی محبوبہ کی تصویر دیکھ رہا ہے جس میں اُسکی محبوبہ اپنی گود میں اُسکی سب سے چھوٹی بھتیجی اُٹھائے اُسکی جانب مُسکراتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ وہ ہمیشہ اُسکی جانب ایسے ہی دیکھتی رہتی ہے اور مسکراتی رہتی ہے۔ اُس نے بارہا چاہا کہ وہ اُسے اس طرح نہ گھُورا کرے۔ کیونکہ اب اُسکی گود میں اُسکی خوبصورت بھتیجی نہیں بلکہ اُسکی محبوبہ کی اپنی بدصورت اور دائم المریض بچی ہے۔ جو اپنی ماں کے جذبات پر ٹوٹنے والے ستم کی کہانی بن گئی ہے۔ وہ پٹیالہ یا دہلی میں لالٹین کی بیمار زرد روشنی میں اُسے دُودھ پلا رہی ہے اور اُس کہانی کے سو جانے کا انتظار کر رہی ہے۔ میرے دوست کے سینے میں ایک کسک چبھتی ہے اور وہ مجھے خط لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔ تمام دن دھوپ اور دھول میں مارا مارا پھرنے کے بعد ——— اُس نے کئی روز سے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا ہے ——— باہر چاندنی میں مونگ پھلی کے ننھے ننھے پودوں پر نازک زرد پھول کھل رہے ہیں جن پر سنہری دوڑتے کھنچ رہے ہیں، فضا میں ٹماٹروں کی کچی کچی خوشبو گھل رہی ہے۔ اندر بسیلے ہوئے کمرے میں وہ مچھروں کی بھونڈی موسیقی سُن سُنکر اُوب گیا ہے۔ اُس کی محبوبہ اُسی طرح اُسکی جانب دیکھ رہی ہے اور مُسکرا رہی ہے۔ میرا دوست اُس تصویر کو کھڑکی سے باہر پھینکنے کے لئے اُٹھتا ہے۔ اُسکی آنکھیں آنسوؤں سے بوجھل ہو جاتی ہیں اور وہ تصویر کو وہاں سے نہیں اُٹھاتا۔ اُس کے دل پر محرومی کا زخم ہمیشہ ہرا رہتا ہے۔ وہ جینا چاہتا ہے مستقبل کے خواب دیکھنا چاہتا ہے ——— اور دھوپ میں ویران سڑکوں پر فکر روزگار میں گھومتا ہے۔ اِسی تلاش کے دوران میں کسی اُداس موڑ پر اُسے جیولٹ مل جاتی ہے ——— اِس سے آگے میں تصوّر نہیں کر سکتا۔ مگر میں پوری تفصیلات کے ساتھ اُسکی تصویر میں دیکھ سکتا ہوں۔ شاید اِس کا باعث وہ مشترکہ درد ہے جو آہستہ آہستہ ہماری رگوں میں سرایت کر رہا ہے اور جس کا درماں نہ اُس کے پاس ہے اور نہ میرے پاس ہے۔

میں اِسی طرح اُس کے بارے میں سوچتا رہتا۔ اچانک مجھے احساس ہُوا کہ میں نے اُس کے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ ایک ایسی کیفیت کا احساس

جیسے آدم کو جنت سے نکالنے کے جرم میں یزداں کو ہوا ہوگا۔ میں نے اسے خط لکھنے کی کوشش کی۔ لیکن آخر کار کس جذبے کے بے پناہ اثر کے زیر اُس کی ذہنی تصویریں دیکھتا ہوا لوٹتا چلا گیا۔ میں اُس کے کمرے میں اچانک داخل ہوا۔ اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ مسکرا نہ سکا وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگا۔ میرے ذہن میں کئی سوال اُٹھے مگر سب جیسے بھول سے گئے۔

"میرے دوست، میرے اچھے دوست۔ تم یہاں کیوں آئے ——— تم میرا گلا گھونٹ دو۔ میں خودکشی نہیں کر سکتا۔ میں بزدل ہوں ———" اُس نے میرے ہاتھ اپنی گردن پر رکھ لئے، میں نے اُس کے گالوں پر آنسوؤں کے قطروں کو اپنی اُنگلیوں سے پونچھا۔ اور اُسے قریب بٹھا لیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا ——— وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن کیسے کہے؟ اُس کے دل میں جوار بھاٹے کی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟" میں نے بہت ہی سیدھے سادے سوال پوچھنے شروع کئے۔

"کچھ نہیں ——— بے کار ہوں ———" تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ چلّانے لگا "میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ دیکھو میرے ہاتھوں میں توانائی ہے۔ میں جوان ہوں۔ خوبصورت ہوں اور مجھے کام نہیں ملتا۔ محنت مزدوری کا بھی نہیں۔ میں دو ماہ سے اپنے دوست کے ہاں رہ رہا ہوں۔ وہ مجھے اچھے اچھے ہوٹلوں میں کھانا کھلاتا ہے۔ چائے پلاتا ہے۔ جیب خرچ دیتا ہے ——— لیکن میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ اُس کے پاس نہیں رہ سکتا۔ نہیں رہ سکتا۔ میں مر جاؤں گا۔ مگر ———" وہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔

"کون ہے تمہارا دوست؟"

"رمنتا ——— وہ سائیکلوں کے آرمیچر چُراتا ہے۔ اُنہی ہوٹلوں کے باہر سے جن میں ہم ڈنر کھاتے ہیں۔"

میرے دوست کے دل میں کانٹے کی چبھن ہو رہی تھی۔ اُس کے بازو میں توانائی ہے۔ وہ جوان ہے۔ وہ خوبصورت ہے۔ وہ کام چاہتا ہے۔ عام کام ——— عام مزدوری کرنے والا کام۔ اور اُسے یہ کام بھی نہیں ملتا حالانکہ اُس کے پاس بوتلوں میں نئے ذائقے بھرنے کے کئی نادر فارمولے ہیں۔

ہم دونوں کافی دیر خاموش رہے۔ میں نے اُس کا خیال ذہنی کرب سے ہٹانے کے لئے کہا "یہ جیولٹ کون ہے؟

ایک لڑکی ہے۔ عیسائی لڑکی۔ لڑکی نہیں، اُس کا ٹوٹا ہوا بُت ہے۔ اُسے دیکھ کر مجھے کئی بار لڑکی اور عورت کی تعریف کے درمیان جھولنا پڑا۔ اچانک یہ ٹوٹا ہوا بُت میرے قریب آیا۔ ہاں میرے قریب آیا۔ میں اُس کے پاس نہیں گیا۔ اُس نے میرے زخم پر پیار سے ہونٹ رکھ دیئے۔ اُس کا رنگ سانولا ہے اور اُس میں اُس کے چہرے کے چبھتے ہوئے نقوش اس طرح تحلیل ہیں کہ بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے ———"

"کیا کرتی ہے؟"

"پیلیس ہائٹ میں کورنٹر گرل تھی ———"

"اب کیا کرتی ہے ———"

اُس کے چہرے پر ایک دم بادل سے چھا گئے "آؤٹ ڈور شوٹنگ ———"

اُس نے میرے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں ——— "لیکن اُس کی روح میں میرے لئے پیار ہے ——— آؤٹ ڈور شوٹنگ اس کا پیشہ ہے۔"

جیولٹ کے لئے اُس کے دل میں بہت گہرا پیار تھا۔ محبت میں کتنی مسرت تھی، محبوبہ کی یاد اور دوست کی رفاقت ——— کتنے شیریں اور تلخ لمحے تھے وہ۔

"آؤ کہیں باہر چلیں ——— اس کمرے میں تو جلیس بے جا محسوس ہوتا ہے" اُس نے کہا۔

"کہاں ؟" میں جانتا تھا اُس کا اشارہ اُس پرانی جھیل کی جانب تھا جس کی ایک جانب سے پانی گرتا ہوا بہہ کر نیچے ندی میں مل جاتا ہے شاید رات کے تین بج چکے تھے جب ہم وہاں پہنچے۔ رات مکمل تھی چاند کی چاندنی میں۔ سناٹا مکمل تھا گرتے ہوئے پانی کے گیت میں۔

وہ کہنے لگا: "تمام راستے میں ہی باتیں کرتا رہا ہوں۔ تم کچھ سناؤ۔ کیسے گذر رہی ہے زندگی ؟"

میں چند ثانیئے خاموش رہا۔ اس لئے نہیں کہ میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ بلکہ اتنا کچھ تھا کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ زندگی کا تار کس مقام سے پکڑا جائے ———

"روزگار کا کیا حال ہے ؟" اُس نے پوچھا۔

"چل رہا ہے۔"

"کیا کچھ مل جاتا ہے ؟"

"یہی کوئی سو پچاس۔"

"یعنی ایک سو پچاس۔"

"بس یہی سمجھ لو ——— اور کوئی بات کرو دوست ———" ہم دونوں کچھ لمحے خاموش رہے۔

"کچھ رومانس کی سناؤ ———"

"ہوں ———"

"ہاں تو سناؤ ———"

میں نے ایک قصہ چھیڑ دیا۔ اُس میں کچھ حقیقت، کچھ تخیل، اور کچھ افسانوی رنگ تھا۔ "سنو میں اُس میں روپے پیسے کا ذکر بالکل نہیں کرونگا۔ ورنہ سب مزہ کرکرا ہو جائے گا۔" میں نے اپنی کہانی میں کہیں ہلکے، کہیں شوخ رنگ بکھیرنے شروع کر دیئے۔

اپنی کہانی سنا کر میں خاموش ہو گیا۔ یادیں کم تھیں لیکن تلخ زیادہ تھیں۔

"لیکن اُس لڑکی کا کیا ہوا ؟" اُس نے اچانک سوال کیا۔

"کس لڑکی کا ؟"

"جس کے بارے میں تم سب کچھ چھپا گئے۔"

"کون ؟"

"نام میں نہیں جانتا۔ صرف تمہاری آنکھوں میں اُسکی ٹھہر گئی ہوئی تصویر دیکھ رہا ہوں ———"

روح میں گڑی ہوئی کیل کو جیسے کسی نے ایک دم جھنجھوڑ دیا ہو۔

"رمنی۔" میں نے کہا "اُس سے مل کر کچھ خوشی کا کچھ غم کا احساس ہوتا تھا۔ جیسے زندگی میں کوئی چٹکی بھر کے قہقہے بکھیر دے اور یکلخت دُور بھاگ جائے۔ چھن سے پائل کی جھنکار ہو اور چھن سے پائل ٹوٹ جائے۔"

وہ اچانک تمہاری زندگی میں آئی اور اچانک چلی گئی ——— کیسے ———" اُس نے پوچھا "کیا اُسکی شادی ہو گئی ؟ کیا اُس کے ماں باپ رضامند

نہیں تھے؟ کیا اُس نے خودکشی کر لی؟ ——— کیا وہ بے وفا نکلی ———"

"کچھ بھی نہیں ہُوا ———" میں نے اپنی خالی جیبوں میں اپنے خالی ہاتھ ٹھونس لیے اور اُس کی جانب دیکھنے لگا۔

"ہوں" تمہاری خالص جنسی اور رومانی کہانی کا انجام ———" وہ کسی سوچ میں غرق ہو گیا۔ وہ اِس درد کو محسوس کر رہا تھا۔

"یہ رات۔ یہ چاندنی اور گرتے ہوئے پانی کا گیت۔ کاش اِس لمحے جیولٹ میرے قریب ہوتی ———"

وہ تھوڑی دیر بعد بولا "آج بھوک بُری طرح ستا رہی ہے ——— تم خاموش کیوں ہو؟ کیا خاموش رہنے سے بھوک مر جاتی ہے"؟ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہم زیادہ دیر تک ایک دوسرے کی جانب نہ دیکھ سکے۔ اور اناناس کے درخت کی طرف دیکھنے لگے۔ اناناس کا درخت اپنے بازو پھیلائے وفورِ ثمر سے فیض یاب ہو کر چٹانوں میں سے اُبھر رہا تھا۔ ہمارے قریب گرتے ہوئے پانی کا گیت مدھم مدھم سروں میں بہہ رہا تھا۔ دُور بانسری پر کوئی گا رہا تھا۔ دل کا درد گیت میں ڈھل رہا تھا۔ سب کا گیت ایک تھا ——— شاید سب کا درد ایک تھا۔

"بانسری کی آواز کتنی دردناک ہے، شاید کوئی بڈھا گا گیت ہے۔" اُس نے کہا۔

"ہاں" اناناس کا درخت دیکھ کر مجھے ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی ایک نظم یاد آنے لگی اور میں ہولے ہولے گنگنانے لگا۔ اور وہ سامنے درخت پر نگاہ جمائے سُننے لگا۔

"اناناس کا درخت سخت سیاہ چٹانوں کا سینہ چیر کر

اُوپر ہی اوپر بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

اور پھلوں سے لدی ہوئی اِسکی شاخیں۔

نیچے ہی نیچے جھک رہی ہیں۔

زمین کے نیچے اناناس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔

اور اُس کے پتے پیالوں کی مانند بلندی پر

چاندنی کی شراب پی رہے ہیں!"

"میں اناناس کا درخت بننا چاہتا ہوں" وہ ایک دم ایڑیوں کے بل کھڑا ہو گیا اور اُس نے دونوں بند مٹھیاں اُوپر اُٹھائیں اور ہوا میں معلق کر کے کھول دیں۔ وہ ایک لمحہ تک ایسے ہی کھڑا رہا اور گرتے ہوئے پانی کا گیت دھیرے دھیرے اسکی رگوں میں درد بن کر بہنے لگا۔

بھنور اور چراغ

جیلانی بانو

آپ نے کبھی اجنتا کے غاروں میں رکھا ہوا بدھ کا وہ عظیم بُت دیکھا ہے، جو پہلی نظر میں بالکل غیر معمولی سا لگتا ہے لیکن جو دوسرے زاویئے سے دیکھنے پر اپنا انداز تفکّر بدل دیتا ہے، ہر دیکھنے والے سے ایک نئی بات کہتا ہے اور اس کے قدموں میں کھڑے ہو کر ہم لوگ کتنے چھوٹے نظر آتے ہیں۔ پیروں میں پس جانے والے کیڑوں کی طرح ——— اسکی عظمت کا بوجھ ہم پہ چھا جاتا ہے ——— کچھ ایسا ہی احساس ہوتا جب میں ثُریّا کو یاد کرتا ہوں۔

"آپ اس تصویر والی عورت سے کوئی اور کہانی سُنیئے۔ آپ جب بھی اس عورت کو دیکھیں گے یہ یقین و مسرّت کی نئی کہانیاں سنائیگی۔" پھر وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر چلی گئی تھی۔

جس چیز کو ثُریّا چھو لے وہ کتنی خوبصورت ہو جاتی ہے۔ اس کے ہاتھوں کا لمس ہر چیز کی ہیئت کو بدل دیتا ہے۔ جب وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر چلی گئی تو میں نے محسوس کیا تھا جیسے میرا ہاتھ جسم سے علیحدہ ہو چکا ہے۔ میں اس لمحہ کو ماضی کے گنے چُنے مسرّت بھرے لمحوں کے خانوں میں بند کر دینا چاہتا ہوں۔ اس خوش نصیب ہاتھ کو بار بار دیکھتا ہوں جسے ثُریّا کے ہاتھوں نے تھام لیا تھا۔

جب وہ چلی گئی تو میں سوچنے لگا، آج سے پہلے یہ ہاتھ میرے جسم کا جزو تو نہ تھا۔ ابھی ثُریّا اپنی یادگار کے طور پر دے گئی ہے۔ مجھے آج سے کئی مہینے پہلے کی ایک دوپہر یاد آئی، جب میں ساری دنیا کی نحوستیں سمیٹے پلنگ پر لیٹا سوچا رہتا تھا کہ خودکشی کا سب سے انوکھا اور ہیجان پرور طریقہ کونسا ہو سکتا ہے۔ اس منحوس دُنیا کو مٹانے کے لئے کتنے ایٹم بموں کی ضرورت ہو گی! تین مہینے سے میری چالیس روپے کی ملازمت بھی چھوٹ گئی تھی اور دُنیا کی ہر اُمید ہاتھوں سے چھوٹتی نظر آ رہی تھی۔ یہ خبر سُنکر ہر شخص دوڑا چلا آتا ——— "کیسے چھُوٹ گئی رشدی کی نوکری!" جیسے نوکری چھوڑنا بھی ہمالہ کی مُہم کو سَر کرنا تھا۔ ابّا نے تو سُنتے ہی کہہ دیا تھا ——— میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ تم لُٹیا ڈبو کر ہی آؤ گے۔ نوکری کرنا ایسا بچّوں کا کھیل تھوڑے ہی ہے۔"

امّاں بھی ابّا کی ٹوٹی کمانیوں والی عینک لگائے، پھٹے کپڑوں میں پیوند ڈالتے وقت ٹھنڈی سانسیں بھرا کرتیں۔ رعنا ذرا سی بات پر جھنجلا جاتی اور بھابی اُٹھتے بیٹھتے اپنی قسمت کو کوسے جاتیں۔ کروٹ بدلنے پر پلنگ بھی یوں چرمراتا جیسے بوجھ سے اُکتایا جا رہا ہو۔ کبھی کبھی ابّا حقّہ پیتے میں ٹھنڈی سانس بھر کے بڑبڑانے لگتے۔

"کیا وقت آن لگا ہے رشدی کی ماں۔ زندگی کی بچی کھچی سانسیں لینا بھی دوبھر ہو رہا ہے۔"

"تو پھر تشریف لے جایئے جناب ——— میں اُنہیں جواب دینا چاہتا۔

اس دن مجھے ہر شخص سے نفرت ہو رہی تھی۔ ہر ایک سے انتقام لینے کو جی چاہ رہا تھا۔ ہر ایک مجھ سے لہجہ میں طنز چھپائے بات کرتا، ہر ایک مجھے حقارت بھری نظروں سے دیکھتا۔ ہر طرف سے لعنت کے فرشتے میرے راستے میں ناکامیاں بکھیرتے چلتے۔

حد ہو گئی ابا جیسا مستقل مزاج انسان بھی ہمت ہار بیٹھا۔ آخر ابا نے اپنے بچپن سے بڑھاپے تک کا راستہ انہیں دلاسوں کے بھلاوے گزارا تھا۔ وہ تو یوں میری کمائی کھانے کے انتظار میں جی رہے تھے جیسے دنیا میں آنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ مجھ سے اپنا قرض وصول کریں۔ کئی بار جی میں آئی کہ اٹھ کر ابا سے زندگی بھر کا حساب کتاب چکا یا جائے۔ کون سے شاہانہ ٹھاٹھ سے پالا تھا۔ ہمیشہ ایک ایک پیسہ کو ترسایا۔ یہی چاہتے رہے کہ ایک دمڑی خرچ کئے بغیر رات ہی رات میں بڑھ کر ایک گریجوایٹ نوجوان بن جاؤں۔

بس پھر وہ مزے سے دالان میں اکڑوں بیٹھے مٹھو کو بولنا سکھائیں یا اپنے مصنوعی دانتوں کا میل ٹوٹے برش سے صاف کرتے رہیں ——

لیکن بی۔ اے پاس ہی کیوں! ہر باپ اپنے بیٹے کے مستقبل پر بی۔ اے کی سند رکھ دینا چاہتا ہے اور ہر ماں اپنی بیٹی کی زندگی میں سونے کے کنگنوں کا اجالا پھیلا دینا چاہتی ہے۔

ابا موڈ میں ہوتے تو میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر فخر سے کہتے "سوا لاکھ روپے کا چک ہے۔ اب دو چار برسوں میں ہم بھنا لیں گے"

اور اماں سر پہ پلو ڈال کر اپنا نیا خواب سنائیں۔

"اللہ نے چاہا میرے بچے ہمیشہ خوش رہیں گے۔ رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں رعنا کو سونے کے کنگن پہنا رہی ہوں۔ ہمارے دروازے پر برات کھڑی ہے اور میری نہ جانے کیوں مت کٹ گئی ہے جو مٹھے بری کے جوڑے کے لئے سمدھنوں سے لڑ رہی ہوں" —— لاحول ولا —— ابا کو غصہ آ جاتا "تمہاری یہ لڑائی کی عادت تو نہ جانے کتنے بنتے کام بگاڑے گی۔ اللہ سا نہ خیر کے رعنا کی برات لائے"

نہ جانے ہر ماں یونہی خوابوں میں گھری رہتی ہے یا اماں ہی اپنے سپنوں کا اجالا گھر میں پھیلائے رکھتی ہیں۔

میری پیدائش کے وقت سے دبئے ہوئے قرض کو واپس لینے کا وقت آن پہنچا تھا۔ مگر ابا کا چک کہیں نہ بھن سکا۔ رعنا کی گوری کلائیاں کانچ کی چوڑیوں سے بھی محروم نظر آتیں۔ بھابی پر دنیا کے ہر خوفناک مرض نے ایک وقت حملہ کر دیا اور سمدھنوں سے لڑنے کا ارمان اماں کے دل میں گھٹ رہا تھا۔

لیکن اس دن مجھے سونے کے کنگنوں، اور برانوں کی دھوم دھام سے نفرت ہو گئی تھی۔ اچھا ہی ہوا جو بھائی جان مزے سے جنگ میں ٹھکانے لگ گئے۔ کاش ایک بار پھر جنگ ہو اور موت کی اس چٹا پٹی میں چند دنوں سب کو خوش کر کے میں بھی ختم ہو جاؤں۔ جب بھائی جان بیکار رہتے تب بھی ہمارے گھر میں ایسا ہی سناٹا چھایا رہتا تھا۔ ابا ان کی بیکاری پر لعن طعن کرتے، اماں خاموش رہتیں اور بھابی ہر وقت بھائی جان کی مردانگی کو غیرت دلاتیں۔ چولھے کے پاس چھائی ہوئی خاموشی بھائی جان کے دماغ کے ساتھ ان کی آنتوں کو بھی جھنجھوڑ ڈالتی۔ پھر ایک دن انہوں نے بڑی شان سے ایک فارم دکھایا۔

ابا نہیں نہیں کرتے رہے۔ اماں کا رونے رونے گلا خراب ہو گیا اور بھابی نے انہیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے کہا "میں تو نہیں جانے دونگی"

مگر دو سو روپے کی جھنکار نے اماں سے دور دور کر امام ضامن بندھوا یا۔ بھابی نے آنسو پونچھ کر رخصت کیا اور ابا شرمندہ ہو کر کہتے رہے "دیکھو بھئی خدا کیا کرتا ہے۔ صرف چند سال کی بات ہے!"

مگر یہ بات صرف چند مہینے چل سکی تھی اس دن منی آرڈر کی بجائے ایک بھاری لفافہ آیا تھا۔ اس دن فضا میں ایک دھماکہ ہوا۔ ایک شعلہ لپکا اور ایک گولی ہاری سب کے سپنوں میں گھس کر فضا میں تحلیل ہو گئی۔

جب گھاؤ بھرنے لگے تو میں نے محسوس کیا تھا کہ گھر میں بھائی جان کی کمی محسوس نہیں ہوتی صرف وہ رونق کھو گئی ہے جو دو سو روپے سے چھائی رہتی تھی۔ بھائی جان کی زندگی پر مجھے رشک آ رہا تھا۔ یہ امن کے لئے شور مچانے والے سب پیٹ بھرے ہوں گے ورنہ جنگ ہمارے لئے کتنی بڑی رحمت ہو گی۔

اُس وقت بڑے چچا لاٹھی ٹیکتے کھانستے کراہتے آئے۔ "رشو بیٹے تمہیں کوئی بلا رہا ہے۔

بڑے چچا کو دیکھ کر میں نے نفرت سے کروٹ بدل لی۔ گاؤں میں لُٹ لٹا کر وہ اپنے بال بچوں کو لے کر شہر آ گئے تھے مگر یہاں آ کر اُنہیں معلوم ہُوا کہ انگریزی پڑھے بغیر مزدوری بھی نہیں ملتی۔ ابّا نے اُنہیں سمجھایا تھا کہ عزت اور شان دار ملازمت کے لئے بی۔ اے کرنا بہت ضروری ہے۔ ابّا سارے خاندان میں گھوم پھر کے میری عقلمندی اور قابلیت کا ڈھنڈورہ پیٹا کرتے تھے۔ اس لئے روز شام کو بڑے چچا میرے پاس صلاح و مشورے کو آ جاتے۔ کیونکہ میں ان کی نظر میں بہت بڑا انسان تھا۔

"تم بتاؤ بیٹا اب میرے بچوں کا کیا ہوگا ——— شاید وہ پڑھے لکھے نوجوانوں کو عالم غیب بھی سمجھتے تھے۔

سوچتا ہوں رشو بیٹا یہ بی۔ اے کا امتحان ویسے ہی ڈالوں، بس ذرا انگریزی کی کسر ہے۔"

مگر آج ابّا نے بڑے چچا کو وہیں روک لیا۔

"یہ کل کے لونڈے ہماری مشکلیں کیا سمجھیں بڑے بھیّا۔ اگر کچھ قابل ہوتے تو پہلے اپنے لئے ہی کچھ نہ کر لیتے۔ یہ انگریزی بھی بس نام کی ہی ہوتی ہے۔ ہم نے پڑھا کر دیکھ لی۔" مگر بڑے چچا نے مجھ سے بڑی شفقت سے اُٹھایا۔

"مایوس مت ہو بیٹا۔ اللہ سب کی سُنتا ہے۔ جاؤ باہر تمہارا وہ لوگ انتظار کر رہے ہیں۔"

میں بڑی بیزاری سے اُٹھ کر باہر گیا۔ وہاں ایک سانولی سی دبلی لڑکی بیٹھی تھی اور ایک سیاہ فام مرد۔ دونوں سفید کپڑے پہنے تھے۔ لڑکی نے سینے کے پاس امن کا نیلا بیج لگایا تھا جس پر فاختہ بیٹھی ہوئی تھی۔ مرد کے ہاتھ میں ایک کاغذوں کا پلندہ تھا اور ایک بڑا سا بیگ۔ لڑکی کے ہاتھ میں رول کئے ہوئے کچھ کاغذ تھے اور ایک سیاہ مخمل کا پاکٹ، جس پر ٹنکی ہوئی چمکیوں نے پورے کمرے میں روشنی کی لہریں دوڑا دی تھیں۔ میرے آتے ہی وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔ سلام کے بعد لڑکی نے ایک کاغذ میرے آگے بڑھا دیا اور اپنے بلاؤز کے گریبان سے قلم نکالنے لگی۔

امن اپیل کا وہ کاغذ دیکھ کر میرا غصہ اور بڑھنے لگا مگر اس اجنبی لڑکی کے جوڑے میں لگے ہوئے سُرخ گلابوں کو دیکھنے میں انہیں کوئی تلخ جواب دینا بھول گیا۔

"بات یہ ہے صاحب۔" میں نے کاغذ کو اسکی جانب لوٹاتے ہوئے کہا۔

میں جنگ کو بُرا نہیں سمجھتا۔ جنگ میں مرنے سے میں نہ تو خود ڈرتا ہوں اور نہ کسی اور کو بچانا چاہتا ہوں۔ اگر ابھی اسی وقت اس کمرے پر بم گر رہے ہوں تو میں تیار ہوں۔" آنکھیں بند کر کے میں لڑکی کے خدوخال کو ذہن میں یوں سمیٹنے لگا جیسے ایٹم بم گرنے کی آواز کا انتظار کر رہا ہوں۔ پھر آنکھیں کھول کر میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"کہئے میں کیوں دستخط کروں ———؟"

"بس یونہی۔ بہت سے دُنیا کے دوسرے لوگوں کی خاطر بھی امن چاہتے ہیں۔" اس بار مرد نے اسکی مدد کی۔

لڑکی نے اداسی سے کہا۔ "ممکن ہے آپ زندگی سے بیزار ہوں لیکن دوسروں نے جو پیار و محبت کے محل بنائے ہیں وہ باقی رہیں۔ جیسے

—— جیسے —— میرا مطلب ہے آپ کے گھر کے اندر سے تو بہت سی آوازیں آ رہی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں آپ کے دستخط میں اتنی تنہائی نہ ہوگی —— ؟

لیکن میرا موڈ اور خراب ہو گیا۔

" ضروری نہیں کہ اس گھر میں رہنے والوں سے میرا پیار و محبت کا کوئی رشتہ ہو اور اُن کے لئے میں اب کوئی اور قربانی دے سکوں۔ مجھ سے پہلے اگر اس گھر پر شعلے برسنے لگیں تو مجھے افسوس نہ ہوگا "

اس کے ساتھی مرد نے اُکتا کر لڑکی کو دیکھا جس کا مطلب تھا اس کھوس سے بحث بیکار ہے۔

" میں سمجھتا ہوں آپ کا قیمتی وقت یہاں بُری طرح ضائع ہو رہا ہے "

" نہیں یہ ہمارا فرض ہے —— " لڑکی خوش اخلاقی سے مسکرائی۔

" صرف پانچ منٹ دیجئے تاکہ ہم امن کی اہمیت آپ پر واضح کر سکیں۔

معاف کیجئے خاتون —— میں تقریر کرنے کے انداز میں پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔

مجھ پر امن و جنگ کی اہمیت واضح ہو چکی ہے۔ آپ سے کچھ مسکرا کر یقیناً مجھے مسرت ہوگی لیکن یہ بحث بیکار ہے "

" خیر —— لڑکی نے مایوسی سے دوبارہ قلم گریبان میں لگاتے ہوئے کہا۔

اُنہیں مجبور مت کرو نرائن۔ بچارے کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جب کبھی آپ کی محبوبہ سے صلح ہو جائے تو ضرور سوچئے گا کہ یہ دنیا کتنی خوبصورت ہے اسے باقی رکھنا کتنا ضروری ہے " وہ دونوں ہنستے ہوئے چلے گئے۔

دوسرے دن میں پیس کمیٹی کے آفس میں بیٹھا ایک گھنٹے تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ پانچ بجے وہ تین لڑکیوں کے ساتھ آئی۔

" کہئے جناب آج کیا آفس پر ایٹم بم پھینکنے کا ارادہ ہے —— ؟ "

نہیں —— میں نے اپنے بڑھے ہوئے شیو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

میں آج یہ اندازہ لگانے آیا ہوں کہ یہ دنیا کتنی خوبصورت ہو سکتی ہے۔ اسے باقی رکھنا چاہیئے یا نہیں "

وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگی اور باری باری سب ہی لڑکیوں کے کانوں میں میرے متعلق سرگوشیاں کیں۔ اس طرح کہ میں نہ دیکھ سکوں۔

لیکن آج پھر شوخ رنگ گلابوں کی سفارش سے میں نے اسے معاف کر دیا۔ لڑکیاں چاہے پڑھ لکھ کر کتنی ہی مہذب بن جائیں مگر سرگوشیاں، خوش فہمیاں اور چھوٹے چھوٹے راز ان کی زندگی سے جدا نہیں ہوتے۔ یہ راز جو اگر افشا ہو جائیں تو ان کا ہارٹ فیل ہو سکتا ہے لیکن ان رازوں کے پیچھے کوئی اہم بات نہیں ہوتی —— اس نے دفتروں میں اپنے فائلوں کی تکمیل کی اور بہت سے مصروف لوگوں میں مل کر ایک گھنٹے تک میز پر جھکی کام کرتی رہی پھر ایک ہاتھ میں پاکٹ اور دوسرے ہاتھ میں " سویٹ ڈریم " کا ایک پرچہ لئے وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

" اب تو آفس بند ہو چکا۔ آپ صبح آ کر دستخط کر سکتے ہیں یا پھر یوں کیجئے ——

لیکن میں دستخط کرنے تو نہیں آیا "

اچھا۔ وہ خوش ہو کر بولی اور رسالہ اپنے گھٹنوں پر رکھ کر ایک تصویر دیکھنے لگی —— ایک نوجوان عورت چہرے پر امید و بیم کی ملی جلی کیفیتیں لئے ایک بچے کو چھاتی سے چمٹائے ہوئے تھی اور دوسرے بچے کو اپنے ہاتھ سے چھپا رہی تھی۔ اسکی خوفزدہ نگاہیں دور کچھ دیکھ رہی تھیں جہاں پہاڑوں کے پیچھے ہوائی جہاز منڈلا رہے تھے، شعلے بلند ہو رہے تھے اور گہرے دھوئیں کے پیچھے سے شفق کی ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ

رہی تھی ۔

آپ معافی مانگنے آئے ہیں ——— ؟ بعض وقت اس کے چہرے پر بچوں کی معصومیت آجاتی ہے ۔

جی نہیں ——— مجھے اسکی خوش فہمی پہ ترس آنے لگا ۔ میں صرف آپ کا نام پوچھنے آیا تھا ۔

وہ پھر ہنسنے لگی اور ہنستے ہنستے رسالہ میری جانب بڑھا یا ۔ دیکھئے یہ عورت کتنی پیاری ہے ۔ اچھا آپ کو اس کا کونسا بچہ اچھا لگ رہا ہے ——— یہ ——— یا یہ گود والا ——— میرے خیال میں ——— ۔

" میرے خیال میں صرف یہ عورت ہی اچھی ہے ——— "

اُونہہ عورت کے متعلق کون پوچھ رہا ہے ——— "

لیکن میں صرف اسی کے متعلق سُننا چاہتا ہوں ۔

اچھا ——— اس نے رسالہ کھول کر غور سے اس عورت کو دیکھا ۔

" اس کا نام آشا ہے یا شانتی ——— جنگ کے میدان میں جلتے چراغ بجھتے ہیں یہ اُتنی ہی شمعیں روشن کر دیتی ہے ۔ جب تک یہ زندہ ہے کائنات کا دل دھڑکتا رہے گا ۔ آنے والی بہاروں پر کوئی شعلے نہ برسا سکے گا ——— پہلے اسے کہانیاں سُننے کا بہت شوق تھا پھر خود بھی ایک کہانی بننے لگی تو یہ بھی خواب دیکھنے لگی ۔ یہ خواب دیکھنے والے بڑے دُکھی رہتے ہیں ۔ اپنے سپنوں میں نہ جانے کتنے موتیوں کا سُراغ لگاتے ہیں اور آنکھ کھُلنے کے بعد اُن کی تلاش میں کانٹوں پہ چلتے ہیں ۔ ہر شخص اپنے خوابوں میں چمکنے والے ہیروں کی ضو سے اپنی زندگی کا اندھیرا دُور کرنا چاہتا ہے ——— اس لڑکی نے جب نیچے جھک کر اس گھر کو اُٹھانا چاہا تو اس کے ہاتھ میں سُرخ گلاب کی دو کلیاں آگئیں ۔ ننھی ننھی شاداب کلیاں جن کی خوشبو ابھی نہیں پھیلی جنہوں نے ابھی مسکرانا نہیں سیکھا مگر ان پھولوں پر بجلیاں منڈلانے لگیں موت انہیں ڈھونڈنے لگی ——— ایسا تو اکثر ہی ہوتا ہے کہ ہم ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اپنے لباس پہ ہیرے کی کنیاں ٹانکیں مگر وہ درد کے پیوندوں میں بدل جائیں ——— اور ان بند کلیوں کو سینے سے لگائے وہ اُفق کی جانب دیکھ رہی ہے جہاں للت چلا گیا ہے ——— شاید وہ مر چکا ہو یا ابھی تک کسی شہر کی اذیت گاہ میں تڑپ رہا ہو ——— شاید ——— شاید اپنی سُتر کو ایک لمبا چوڑا اُمیدوں بھرا خط لکھ رہا ہو ——— کاش ایسا ہی ہو کہ وہ خط لکھتا ہے ——— خط لکھتے وقت وہ بہت خوش ہو جاتا ہے ——— وہ شاعر ہے نا ——— آج تک ایک نظم نہیں لکھی لیکن آپ کہدیں کہ تم شاعر نہیں ہو تو خفا ہو جائے گا ——— کہتا ہے اوشا میری بہترین نظم ہے ——— للت کہتا ہے ——— للت کہتا ہے ——— اس نے تصویر سے نگاہیں ہٹا کر مجھے دیکھا اور اچانک کسی نشانے سے زخمی ہو کر زمین پہ آن گری ۔

" اوہ معاف کیجئے ——— میں ——— آپ کیا کہہ رہے تھے ——— ؟ نہیں ، میں کیا کہہ رہی تھی ——— ؟

" للت کہتا ہے ——— "

" نہیں ——— شرم و دُکھ کے ملے جُلے لہجہ میں اُس نے کہا ۔ للت کا ذکر چھوڑیئے آپ مجھ سے کیا پوچھ رہے تھے ! "

اس عورت کا نام ——— "

" نہیں اب آپ کوئی کہانی سُنایئے " اس نے رسالہ بند کر دیا ۔

مجھے تو سُرخ گلابوں اور ہیرے کی کنیوں والی کوئی کہانی یاد نہیں صرف سوا لاکھ روپے کے بیکار چیک کی کہانی یاد ہے جو کسی بنک میں کیش نہیں

ہوسکتا۔ میری کہانی میں ملمع چڑھے کنگنوں کی اُمید ہے اور بُری کے جوڑے کا ارمان اور میری ماں کے جھوٹے خوابوں کا طویل سلسلہ ——— شاید دُنیا کی ہر ماں خواب دیکھنے کی عادی ہوتی ہے اور آنکھ کھُلنے کے بعد اس خواب کا کوئی گرا پڑا ذرہ تلاش کرنے میں لگ جاتی ہے ——— بات یہ ہے ثمر ——— معاف کیجئے سر لا دیوی، کہ ہم لوگ آپ کی طرح سلیقہ سے خواب بھی نہیں دیکھ سکتے ———"

اچھا تو آپ کل صبح یہاں آکر دستخط کر دیجئے گا ———" وہ اپنا پاکٹ اور رسالہ لئے کھڑی ہو گئی۔

لیکن ابھی میں نے یہ کب طے کیا ہے کہ یہ دُنیا کتنی حسین ہے اسے باقی رہنے دوں یا نہیں! وہ شاید مسکرائی ہو کیونکہ اندھیرے کمرے میں کچھ روشنی کا احساس سا ہوا تھا۔

"یہ رسالہ لیجئے ——— اس ثمر سے پوچھیئے۔ آپ جب بھی اس کو دیکھیں گے یہ یقین و مسرت کی نئی کہانیاں سُنائے گی۔"

پھر وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر چلی گئی اور بہت دیر تک میں اپنے ہاتھ کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

کئی دن تک میں اس سے نہ مل سکا مگر مردوں کی فطری تجسس والی رگ نے مجھے کئی لوگوں سے ثمر کے متعلق پوچھنے پر مجبور کیا۔ مگر عام طور پر اس کے متعلق بُری رائیوں کا ڈھیر جمع ہو گیا۔

"ہم نے اسے چھُپ چھُپ کر مردوں سے ملتے دیکھا۔

ایک دن وہ گھونگھٹ کے کانوں میں کچھ کہہ رہی تھی۔

"کہتی ہے میرا شوہر جیل میں ہے۔"

"وہ ہر ایک کو ایسی ہی من گھڑت کہانیاں سُناتی ہے۔"

"صرف ایک ننھی سی بچّی کے ساتھ تنہا گھر میں رہتی ہے اور اس کے ہاں ہر وقت مرد آتے رہتے ہیں۔

بلکہ میرے ایک دوست کے دوست کا کہنا تھا کہ اس کے کسی دوست نے اسے بتایا ہے، یہ امن وغیرہ کا تو سب بہانہ ہے۔ جب کسی لڑکی کے پاس دکھانے کے لئے کافی چیزیں جمع ہو جاتی ہیں تو پھر وہ کسی کلچرل پروگرام میں حصّہ لیتی ہے یا کسی جلسے میں عورتوں کی بیداری پر ایک تقریر کرتی ہے جہاں یونیورسٹی کے لڑکوں کے آنے کا امکان ہو یا پھر ہاتھ میں امن اپیل اور قلم تھام کر ہر شخص کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ اور لوگ اس اپیل کو نہیں پڑھتے جس میں تمام دُنیا کے نیک دل لوگوں کو پکارا جاتا ہے بلکہ وہ اُن ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھتے ہیں، اُن خوبصورت ہاتھوں کو جو اُن کے آگے پھیلے ہوئے ہیں اور پھر جی چاہتا ہے ہمارا نام اتنا لمبا ہو جائے کہ دُنیا جہان کے سارے حروف ختم ہو جائیں۔ تاکہ ہم یونہی اس کے قریب کھڑے سینٹ کی خوشبو سونگھے جائیں۔ سُرخ گلابوں کو دیکھے جائیں۔"

میری مسرّت پر اوس پڑ گئی۔ ہمیں ان لڑکیوں سے مل کر کتنی مایوسی ہوتی ہے جو ہماری دسترس سے دُور ہوں جنہیں ہم سے پہلے دوسرے مرد جیت چکے ہوں۔ باسی گلابوں کے لئے کون مرتا پھرے۔

ثمر کے شاعرانہ لہجہ میں، اسکی خوبصورت آنکھوں میں اور بلا وجہ ہنسی میں گھُلی ہوئی آوارگی سے مجھے نفرت ہو گئی۔ کئی بار پبلک جلسوں میں وہ نظر آئی ———" کہیئے آپ نے دستخط کر دیئے ———؟"

"نہیں میں نے دستخط کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔" میں نے نفرت سے جواب دیا۔

"کسی دن فرصت ہو تو آفس آکر اس لڑکی کا پتہ ضرور بتایئے گا۔" اس نے مخصوص بے تکلفی کا انداز پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اسکی بیوقوفی پہ تعجب ہوتا ہے جو ابھی تک آپ کو دنیا کی خوبصورتی کا احساس نہ دلا سکی۔"

لیکن میں نے ثمر کی اس کھلی ہوئی دعوت کو کبھی قبول نہیں کیا۔ مجھے ثمر کے مقابلے میں وہ لڑکیاں زیادہ پسند ہیں جو سینما ہال یا پارک میں اچانک آپ کو مخاطب کرتی ہیں ——— کیا آپ نے مجھے بلایا ہے ———؟

میں پھر اپنے کمرے میں پلنگ پہ بوجھ بنا پڑا رہتا۔

"اللہ نے چاہا اب رشید کو نوکری ملنے ہی والی ہے۔ رات میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ کہہ رہے ہیں۔ جا اب تیری سب مشکلیں دور ہو جائینگی۔"

اماں کے خوابوں کا سلسلہ اب دیوانگی کو چھو رہا تھا اور اب تو سارے گھر کو متعدی بیماری کی طرح خواب دیکھنے کی عادت ہو گئی تھی۔ پنجرے میں بند مٹھو جو دن بھر گردن میں چونچ دبائے اونگھتا رہتا تھا معلوم نہیں خواب دیکھتا ہوگا یا نہیں۔ دن بھر آفسوں کی خاک چھاننے اور لوگوں کی لعنت ملامت سننے کے بعد جب میں گھر آتا تو یہی سوچتا۔ یہ جانور خوابوں کے بغیر کیسے زندگی گذارتے ہونگے! ان کی زندگی میں بڑی بڑی نوکریاں، گلابوں کی کلیاں، ہیرے کی کنیاں اور سونے کے کنگن کبھی نہیں جھلملاتے۔ خواب دیکھنے والے انسان بڑے دکھی رہتے ہیں۔ مجھے ثمر یاد آتی۔ مگر وہ تو ہمیشہ خوش رہتی تھی۔ اس دن ڈاکٹر کچلو کے لیکچر میں ملی تو کیسے بن بن کر کہہ رہی تھی "اوشا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ بڑی مشکل سے آئی ہوں کیا کروں یہ کام بھی تو ضروری ہے۔ للت کہتا ہے اوشا میری زندگی کی صبح ہے مگر اوشا کی زندگی پہ جنگ کی سیاہیاں پھیلنا چاہتی ہیں ———" پھر وہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی ایک دوسرے آدمی سے مخاطب ہو گئی۔

"ہم امن کے لئے ایک کلچرل پروگرام کر رہے ہیں۔ میں اس میں کتھا کلی ناچ پیش کرونگی۔ آپ کتنے ٹکٹ خریدیں گے!

چار مینار سگریٹ کا کڑوا دھواں میرے حلق میں اٹک گیا۔

پروگرام کے ٹکٹ بیچنے کے لئے ایک دن وہ پھر ہمارے ہاں آئی۔

"میں نے آپ سے عرض کیا تھا نا۔ مجھے امن کے نام سے نفرت ہو گئی ہے۔ میں جنگ کے خواب دیکھتا ہوں جو بھائی جان کی طرح میرے لئے بھی سکون و مسرت لیکر آئیگی۔ آپ رقص کا مظاہرہ کرنے کیلئے چندہ جمع کر رہی ہیں لیکن میں اپنے بیمار باپ کی دوا لینے کیلئے کس نام سے فنڈ جمع کروں۔ کونسی اپیل تیار کروں!

"صرف ملازمت نہ ملنے سے آپ پر اتنی مایوسی چھائی ہوئی ہے ——— وہ افسوس اور تعجب کے ملے جلے لہجہ میں بولی۔

میں نے ایک دن آپ کو "سویٹ ڈومن" کا ایک پرچہ دیا تھا۔ آپنے اس عورت کو دوبارہ نہیں دیکھا۔ آپ اپنی ماں سے اب ان کے خواب نہیں سنتے ———؟

"وہ پرچہ کسی دن ڈھونڈھ کے آفس پہنچا دونگا۔ مجھے ہر روز ایک نئی کہانی سننے سے نفرت ہے۔"

کئی مہینے گزر گئے۔ ان دنوں میں نے اسے بہت کم دیکھا۔ جب بھی وہ ملی تو گھبرائی ہوئی۔ مجھے دیکھ کر کچھ پریشان کچھ پشیمان سی ——— اور مجھے بڑی تسکین ملتی۔ جب انسان خود سلگ رہا ہو تو دوسروں پر انگارے اچھال کر کتنی تسکین ملتی ہے۔ یہ خیال ہی کتنا تسلی بخش ہے کہ دنیا میں بہت سے لوگ ہم سے بھی زیادہ بےبس اور ذلیل ہیں۔ ہم بھی کسی سے اونچے ہو سکتے ہیں۔

پھر کئی مہینے تک وہ غائب سی رہی اور اس سے وابستہ نفرت کے نقش بھی میرے حافظہ سے مٹنے لگے۔

کئی بار جب میں نے اسکی ساتھی لڑکیوں اور مردوں کو دیکھا تو مجھے ثمر کا خیال آیا۔ لیکن اسکی غیر موجودگی کا کوئی سبب معلوم نہ ہو سکا۔ جب میں نرائن سے ملنے پیس کمیٹی کے آفس گیا تو وہاں بھی سب ہمیشہ کی طرح اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ لیکن ان کی زبان سے ثمر کا نام کیوں غائب ہو گیا جس کے بغیر کوئی کام پورا نہ ہوتا تھا۔ کوئی مسئلہ نہ سلجھ پاتا۔ جب وہ آفس میں آتی تو قہقہوں کا سیلاب آجاتا اور جب سنجیدگی سے بات کرتی تو سب خاموش ہو جاتے اور اس کا وہ کہانی سنانے کا انداز ——— کاش وہ اتنی جلدی اپنے آپ کو تباہ نہ کر لیتی۔ اتنی جلدی کھل کر نہ مرجھا جاتی۔ اتنی بہت سی کہانیاں نہ سناتی ——— کاش

سُر تم بھی اس ماں کی طرح اُفق دیکھتیں۔ کاش تم بھی کئی شمعیں روشن کرتیں ——— کاش سُر ——— سُر ——— سُر کہاں ہے نرائن ؟

"کئی مہینے سے تو ہاسپٹل میں تھی لیکن آجکل یہیں ہے۔

ہاسپٹل میں ——— ؟

"ہاں" نرائن ٹائپ رائیٹر پر جھکا ہوا تھا۔ "اسکی لڑکی بہت بیمار ہے، بچاری کی ملازمت بھی چھوٹ گئی ہے۔ ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں جو لوگ کام کرتے ہیں اُنہیں بھی کچھ نہیں دے سکتے۔"

دوسرے دن آفس میں میں نے سُر کو دیکھا۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس کے جوڑے کی شوخ رنگ کلیاں مرجھا کر گر چکی تھیں اور ہمیشہ دودھ کی طرح سفید رہنے والی ساری بالکل میلی تھی۔ وہ بار بار چھاتی پکڑ کے کھانستی اور کچھ کاغذ ریڈی کے سامنے رکھے بحث کر رہی تھی۔ پھر اُٹھتے وقت اس نے فرداً فرداً سب کا شکریہ ادا کیا اور باہر آئی تو مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی ——— "ہلو رشدی، تمہاری ملازمت کا کیا ہوا!"

"ابھی تک نہیں ملی" میں نے لاپروائی سے کہا اور اپنے سامنے اخبار کی دیوار کھڑی کر لی۔

پھر ——— ؟ تمہارے ابّا کیسے ہیں۔ تم ابھی تک اپنے گھر پہ شعلے برساتے ہو" وہ تشویش بھرے لہجہ میں بولی۔

"تم بھی تو بہت دُبلی ہو گئی ہو۔ میں نے سُنا ہے کہ اوشا ———

اس نے اپنے چمکیوں والے پاکٹ کو میز پہ اوندھا دیا۔ کئی روپے کی ریزگاری بکھر گئی۔ جلدی سے اُس نے سب اُٹھا کر میری گود میں ڈال دی۔

"میں موتی کیسے ہو سکتی ہوں رشدی۔ تم نے ابھی تک کلیوں کو ہنسنے کی اجازت نہیں دی۔ لو گھر جاتے وقت اپنے ابّا کی دوا لیتے جانا۔ مجھے جلدی جانا ہے۔ اوشا کی طبیعت بہت خراب ہے ———

"ٹھہرو سُر ———" میں نے پیسے اُٹھا کر واپس کرنا چاہے۔

وہ سیڑھیوں پر سے اُترتے اُترتے رُک گئی اور پلٹ کر بولی۔

"سونے کے کنگن اور بُری کے جوڑے بھی جلد ہی آئیں گے رشدی۔ مگر جب تک تمہاری ماں کے سپنے سچے نہ ہو جائیں تمہیں اپنا چک سنبھال کر رکھنا ہے۔ یہ سوا لاکھ روپے کا چک جب تم بھناؤ گے تو میں بھی اپنا قرض وصول کر لونگی ———" اس کے تھکے ہوئے چہرے پر وہی شاداب ہنسی تھی۔ وہی بے باکی اور رنگین خوابوں کا دھندلکا۔

"پگلی ہے کمبخت ———" اندر کوئی لڑکی سُر پر لعنت بھیج رہی تھی۔

"ایک ہفتے کی محنت کے بعد ہم سب نے اوشا کے لئے یہ پیسے جمع کئے تھے اور ———

میں جلدی سے سیڑھیاں اُتر کے نیچے آیا۔ سڑکوں پہ اندھیرا چھا رہا تھا۔ موٹروں، سائیکلوں اور آدمیوں سے وہ بچتی ہوئی یوں جا رہی تھی جیسے جلتا ہوا چراغ بھنور میں چکرا رہا ہو۔

"سُر لا ——— سُر ——— میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ دنیا باقی رہیگی۔ میں نے اپنی محبوبہ سے صلح کر لی ہے۔ مجھے سُرخ گلابوں کی کلیاں بہت اچھی لگتی ہیں ———

سُر نے جاتے جاتے مجھے پلٹ کر دیکھا اور اپنے پاکٹ والے ہاتھ کو اونچا کر کے آشیرواد دی۔ اسکی مسکراہٹ کے ساتھ پاکٹ کی چمکیوں نے جھلملا کر بہت سی شمعیں روشن کر دی تھیں۔

———

گریز

آغا بابر

شمی کا باپ ملتان کا بڑا زمیندار تھا۔ شمی کی دو بہنیں شہریوں سے بیاہی گئی تھیں۔ دونوں کے خاوند نئی روشنی کے دلدادہ تھے۔ دونوں نے شادی کے بعد پردہ ترک کر دیا اور اپنے خاوندوں کے ساتھ آزادانہ پھرنے لگیں۔ شمی کی شادی ایک تو اس رنڈوے سے ہوئی جو عمر میں اس سے کافی بڑا تھا پھر اوپر سے وہ پردے کا اتنا سخت پابند کہ اس کی رُوح ایک خانماں برباد شہزادے کی طرح قید میں جکڑی گئی اور اس کی آرزوؤں کے دروازے پر تاریکی کی مہر لگ گئی۔ یہ حسرت اس کی رُوح میں ایک کانٹا بن کر پیوست ہو گئی کہ اسکی شادی جوان لڑکے سے نہ ہوئی۔ ملتان میں پردہ نشینوں کے لئے صرف سینما دیکھنا ہی واحد تفریح ہے جسے وہ بھی شادی سے پہلے خوب دیکھتی رہی اور اس کے تصور میں بھی آنکھ مچولی والی محبت کرنے والا ایک شوخ و شنگ سا جوان ڈھلتا رہا مگر شادی کے چند سال بعد اس کے خوابوں کے اونچے کلس پر اُلّو بولنے لگا۔ ایک بچہ پیدا ہوا پھر دوسرا پھر تیسرا مگر اس کی رُوح آنکھ مچولی والی محبت کو ترستی رہی۔ اس نے شادی کے بعد ہر جگہ سہیلیوں پر سہیلیاں بنائیں مگر طبیعت کی بے کلی کسی صورت کم نہ ہوئی۔ اس نے ہر نئی فلم دیکھنا فریضہ بنا لیا جسے دیکھ کر اُلٹی طبیعت سُلگنے لگتی اور میٹھا میٹھا درد جاگ اُٹھتا۔

اپنی کار سے الگ چودھری گل نواز نے ایک کار صرف شمی اور بچوں کے لئے لے رکھی تھی۔ بہترین سے بہترین کپڑا شمی پہنتی۔ اچھے سے اچھا عطر اور لیونڈر لگاتی۔ تینوں بچوں کو اس نے اپنا دُودھ نہیں پلایا تھا۔ ملتان سے بچے والی عورت منگالی جاتی تھی۔ ان کے خاندان میں یہ پُرانا دستور چلا آتا تھا کہ ماں کا دُودھ کسی نے پیا ہی نہیں۔ زچگی کے دنوں میں جسم کا توازن قائم رکھنے اور بدن کے پٹھوں اور رگوں کو اپنی جگہ پر واپس لانے کے لئے بڑی بڑی دوائیں کُوٹی جاتیں۔ بڑے بڑے جتن کئے جاتے۔ تمام آرام و آسائش کے ساتھ جب وہ چودھری گل نواز کے جُھرجُھر جسم اور مُرجھائے ہوئے چہرے اور چھ سلوٹوں والی توند کو دیکھتی تو آنکھیں بند کر لیتی۔ اسے اپنے باپ کی بات یاد آجاتی جو اس نے اپنے آموں کے باغ میں ایک دفعہ کہی تھی "آم کا لطف اپنے موسم میں ہے۔ بے موسمی آم تو تیل ہو جاتے ہیں۔ ان میں وہ تازگی کی خوشبو کہاں جسے سُونگھتے ہی آنکھوں میں روشنی ٹپکنے لگتی ہے۔"

گل نواز بے موسمی شوہر تھا جس میں پکے ہوئے میوے کا رس نہ تھا بلکہ بدبُودار تیل کی سڑاند تھی۔ اور وہ کمانی دار بطخ تھی جو دبانے پر انڈا دے دیتی تھی۔

وہ اپنی بہنوں یا سہیلیوں کے ساتھ باہر جاتی تو بُرقع کا نقاب بے دھڑک اُٹھا دیتی اور لوگوں کو جی بھر کے اپنا آپ دکھانے کی کوشش

کرتی ۔ بولٹن مارکیٹ پر وہ بجز مراسن کے ساتھ موٹر سے اُتر کر گئی تھی ۔ پھل کی دکان پر نقاب اُٹھا کر کھڑی رہی ۔ لوگ بُری طرح دیکھتے رہے
اس نے انہیں اور موقع دیا اور اچار والے کی ریڑھی پر آ کر خواہ مخواہ رُک گئی ۔ قسم قسم کا اچار چکھ چکھ کر طرح طرح کا منہ بناتی رہی اور لوگ
حسبِ توفیق دانت کچکچاتے رہے ۔ کباب بیچنے اور آئس کریم والے نے بجز کا دھیان اپنے سودے کی طرف دلایا مگر مراسن ذات نے ناپسندیدگی
کا اظہار ایسی جہل سے کیا کہ بیچاروں کے دانت کھٹے ہو گئے ۔ بجز تو شمی کی اپنی خادمہ تھی ہی ۔ ڈرائیور کو ایسا حکم تھا کہ اگر تم نے کبھی
چودھری صاحب سے باہر کی کوئی بات کہی تو پھر اپنی خیر نہ سمجھنا ۔

یہی کار جب کوٹھی کے احاطہ میں داخل ہوتی تو گل مراد کے دوست احباب سب اُٹھ کر منہ دیوار کی طرف اور پیٹھ کوٹھی کی طرف کر کے
کھڑے ہو جاتے تاکہ بیگم صاحبہ کار سے اُتر کر کوٹھی میں داخل ہو سکیں ۔

اس کی ایک سہیلی مریم انٹیلی جنس سکول کے کوارٹروں میں رہتی تھی جس کے ہاں کچھ دنوں سے اس کا ممیرا بھائی پرویز آیا ہوا تھا جو اپنے
محکمہ والوں کے خرچ پر دو سال کے لئے ولایت جا رہا تھا ۔

مریم اور شمی کا سینما کا پروگرام جو بنا تو مریم نے پرویز کو بھی ساتھ لے لیا ۔ باکس میں بیٹھے بیٹھے پرویز نے سگریٹ سلگا کر ڈبیا اپنی کرسی
کے نیچے رکھ دیا ۔ جب مریم نے ڈبہ وہاں سے اُٹھا کر شمی کو دیا اور اس نے گھونگھٹ کی اوٹ میں سگریٹ لگا لیا تو پرویز کے
دل میں کھُد بُد ہوئی مگر وہ غافل بنا رہا ۔ اس نے اگلے روز پوچھا "آپا تمہاری شمی تو رات کمال سگریٹ پر سگریٹ اُڑاتی رہی"

"کبھی کبھی اس کو کچھ ہو جاتا ہے" مریم بولی

"خاوند کو معلوم ہے ؟" پرویز نے پوچھا ۔

"توبہ کرو ۔ وہ تو پردے کا سخت پابند ہے"

یوں تو پرویز نے بھی دیکھا تھا کہ وہ پردہ کی بڑی پکی تھی ۔ مریم کے پاس بیٹھی ہوئی ہے ۔ وہ آ گیا تو اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی
یا برقع کی پرت اپنے اُوپر لے کر بیٹھ گئی ۔ مگر اس کے پردہ میں ایک حلیہ نگنی ضرور تھی ۔ اس کی مے فروش آنکھوں کی ذرا سی چھلکاہٹ
سے افسردہ و بے جان فضا میں کیف و سرمستی ارزاں ہو جاتی ۔ اس کے برقع کی پرت کے پیچھے یوں محسوس ہوتا کہ عطر و مشک کا کوئی ڈبہ
چھپا رکھا ہے یا کوئی عطر فشاں پہاڑیاں چھپی ہیں جن سے دل و دماغ پر چھا جانے والی خوشبو کی دھواں دھار لہریں اُٹھ رہی ہیں اور فضا
نکھرنے لگی ہے ۔ نکھری نکھری فضا میں یہ ہلکے ہلکے لطیف دھچکے پرویز محسوس کرتا رہا تھا ۔

شمی کے آنے کا کوئی وقت نہ تھا ۔ شام کو آتی تو رات گئے جاتی ۔ صبح آتی تو سہ پہر کو جاتی ۔ بچوں کو کبھی ساتھ نہ لاتی ۔ بہت
عمدہ عمدہ اور نفیس لباس پہنتی ۔ آج ایک جوڑا ہے تو کل دوسرا ۔ پرویز جب اپنے کاموں سے فارغ ہو کر آتا کوارٹر کے باہر شمی کی کار
کھڑی دیکھتا ۔

ایک روز وہ دوپہر کے بعد اپنے کمرے سے ذرا جلدی باہر نکل آیا ۔ اسے کسی کام سے باہر جانا تھا ۔ گول کمرے میں سے جہاں
وہ مجلس لگی چھوڑ کر گیا تھا اب کوئی آواز نہ آ رہی تھی ، جیسے کمرہ خالی پڑا ہو ۔ مریم باہر انگنائی میں بچے کو نہلا رہی تھی ۔ اس نے سمجھا شمی جا چکی
ہے مگر گول کمرے میں سے پانڈری کے عطر کی خوشبو بدستور آ رہی تھی ۔ وہ دو قدم آگے بڑھ گیا ۔ سکرین کی اوٹ میں شمی دیوان پر چت
سوئی پڑی تھی ۔ اس کا سر زرنگار گاؤ تکیہ پر تھا ۔ ایک کشن اس کے بازو کے گرم گرم دباؤ کو محسوس کر رہا تھا ۔ ایک ٹانگ سیدھی دوسری خمیدہ تھی

شلوار کے پائنچے ٹخنوں سے اُوپر کھسک گئے تھے۔ مے فروش آنکھوں کے آبگینے نیند کے نشے میں ادھ مندے پڑے تھے۔ سُرخ سُرخ ہونٹ، صبیح رخسار، کرل کٹے ہوئے بال۔ اس کے بدن کا سارا ناپ تول پرویز کے سامنے تھا اور انگ انگ کی غمازی کر رہا تھا۔ اس نے کئی بار سر سے پیر تک نظر ڈالی۔ اس کا دل اس خیال سے دھڑکنے لگتا کہ کہیں شمی کی آنکھ نہ کھل جائے۔ مگر اسے دوسرے ہی لمحہ اس خوف میں لذت محسوس ہونے لگی۔ آناً فاناً سنسنیوں کا ایک نیا ریلا اس کے خون میں جراتوں کی شمعیں جلا گیا۔ اس نے آہستگی سے شمی کے دودھیا رنگ کے پاؤں پر اپنے ہونٹ رکھ دئیے۔ اپنی آنکھوں کو ان پر ملا۔ اپنے گرم گرم رخساروں کو ان کے ساتھ لگا دیا۔ اس کے ہاتھوں کی بے چین وحشت نے پائنچوں کو اُوپر کھسکا دیا۔ سڈول سیمیں پنڈلی پر ہونٹ جھکے ہی تھے کہ شمی کے بدن میں حرکت ہوئی۔ وہ فوراً دبے پاؤں باہر کھسک گیا۔

ڈرتے ڈرتے چراغ جلے واپس آیا کہ شمی نے مریم سے کچھ کہہ نہ دیا ہو۔

"اچھا ہوا تم آ گئے" مریم بولی "شمی سینما کی دعوت دے گئی ہے۔ کھانا کھا کر بچوں کو سُلا کر آ رہی ہے"

یہ سُن کر پرویز نے اطمینان کا سانس لیا۔

پکچر کے انتخاب کی بات ہوئی تو پرویز نے کہا "انگلش پکچر کے متعلق کیا رائے ہے؟"

"اوں ہوں یہ انگریز عورتیں آپ جی بھر کے وہاں دیکھ لیجئے گا جا کر" شمی نے دروازے کی اوٹ میں مریم سے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے۔ شک تو مجھے بھی پڑتا ہے پرویز کہ تم وہاں سے کوئی میم نہ لے آؤ۔"

"ایک سے ایک بڑھ کر ہو گی وہاں تو" شمی نے یہ تیر بھی دروازے کی اوٹ ہی سے پھینکا۔

"خیر ہیں اتنا کچا تو نہیں۔ ہاں کوئی سر پیر کی ہوئی، میرا مطلب ہے کسی کے پیر خوبصورت ہوئے تو وہ الگ بات ہے، پھر تو مجھے ضرور سوچنا پڑے گا"

اس نے بڑی کوشش کی کہ اس فقرے کا ردِّعمل معلوم کر سکے مگر مریم نے کوئی بات بیچ میں کر دی اور پھر سینما کا وقت قریب تھا۔ آج شمی نے جو پھر گھونگھٹ کی اوٹ میں دو سگریٹ پی ڈالے تو پرویز کے دل میں کوئی کھُد بُد نہ ہوئی۔ اگلے روز ناشتہ پر پرویز نے مریم سے کہا "آپا کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا آج مجھے بڑے کام ہیں"

جب وہ واپس آیا تو حاضری کے پاس پلنگ پر کوئی چادر لئے لیٹا تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ سُن کر منہ پر سے چادر ہٹا کر منہ پھر چھُپا لیا گیا۔ پرویز نے دیکھ لیا شمی تھی۔

مگر اس نے کمرے میں جا کر مریم سے پوچھا "آپا باہر کون لیٹا ہے؟"

"شمی کے سر میں درد ہے۔ بچے یہاں شور کرتے تھے۔ وہ الگ جا لیٹی ہے"

"آپ آرام کریں، میں کھانا کھا آیا ہوں" پرویز نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنے چھوٹے سے کمرے میں آ کر کپڑے اُتارے اور بید کے کوچ پہ اخبار لے کر لیٹ گیا۔ پھر اُٹھ کر باہر جھانکا، آپا شمی کروٹ لئے ویسے ہی لیٹی تھی۔ ایک پیر کا پنجہ چادر سے ذرا باہر تھا۔ انگلیاں نظر آ رہی تھیں جن کے ناخنوں پر سُرخ سُرخ پالش چمک رہا تھا۔ پرویز پھر آ کر کوچ پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد مریم نے آ کر کہا "میں آج چائے پر پکوڑے بنا رہی ہوں۔ میں نے سوچا یہ چیزیں تمہیں وہاں

کہاں ملیں گی"

پرویز بولا " بڑی مہربانی آپا مگر ذرا بیسن کا خمیر ٹیسٹ کر لینا۔ یہ نوکر بعض دفعہ خمیر اُٹھانے میں غفلت کر جاتے ہیں"

جب مریم باورچی خانہ کی طرف نکل گئی تو پرویز نے اپنی کمین گاہ سے باہر نکل کر چاروں طرف دیکھا اور شمی کی پائنتی کی طرف فرش پر جا بیٹھا۔ پہلے ایک پیر سے چادر ہٹا کر اسے چُوما پھر دوسرے پیر کی ایڑی پنجہ انگلیاں بے تحاشا چوم ڈالیں۔ دل میں خوف کی چھپکلیاں اور جراثیموں کی سنسناہٹیں اُچھلنے لگیں۔ دل دھڑکنے لگا۔ وہ دبے پاؤں اپنے کمرے میں آگیا اور دہلیز پر کھڑا ہو کر سوچنے لگا ایک دفعہ پھر۔ ارادہ ہو رہی تھا کہ جافری کے پار مریم ہاتھ میں پلیٹ لئے آتی دکھائی دی۔ شمی کے پلنگ کے پاس آکر ذرا رُکی۔

"شمو اُٹھو چائے کا وقت ہو گیا"

شمی نے کروٹ بدل لی۔

چائے پی رہے تھے کہ اس کی کار آگئی۔ وہ چائے پی کر چلی گئی۔ آج اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی۔

شمی چیت لیٹی ہوئی تھی۔ جب دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے جالی دار برآمدے کے فرش پر ارغوانی رنگ کے دھبے ڈالتے ڈالتے اس کے پلنگ کی پائنتی تک آ پہنچے تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ ساتھ والے پلنگ پر اس کا خاوند خراٹے لے رہا تھا۔ ہر سانس کے ساتھ اسکی توند اُوپر پھُولتی پھر نیچے بیٹھ جاتی۔ کچھ چادر اس کے پیٹ پر سے کھسک گئی تھی۔ وہ رات کو بنیان پہن کر سوتا تھا۔ گرمی ہوتی تو بنیان بھی نہ پہنتا۔ اس کی بنیان کرسی پہ لٹک رہی تھی۔ شمی کو معلوم تھی اس کی بُو مارکہ بنیان۔ اس کے بدن سے ایسی بدبُو نکلتی تھی جیسے باسمتی چاولوں کی بوریاں اور پیاز کے ٹوکرے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیئے جائیں۔ اس کے سینے پہ بَل کھائے ہوئے بالوں کا ایک جنگل اُگا ہوا تھا جن میں کئی سفید بال تھے۔ اس کے چہرے پر رات بھر کے اندر اتنی ڈاڑھی اُگ آئی تھی کہ گالوں پر سفید ٹانگوں اور کالے دھڑ والی چیونٹیاں چلتی پھرتی معلوم ہوتی تھیں۔ شمی کا یہ احساس کوئی نیا نہ تھا کہ اس کالے دیو کے مقابلہ میں وہ ایک پری ہے جسے اس بودم بے دال نے ایسے تہہ خانہ میں قید کر رکھا ہے جہاں ہوا ہے نہ روشنی۔ اس نے زور سے چادر کو اپنے پاؤں پر سے یوں ہٹا دیا جیسے چادر اس کے پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑی تھی۔ وہ اپنے دودھیا رنگ کے دُھلے دُھلے پیروں کو دیکھتی رہی جنہیں کبھی وہ سنہرے قتلوں میں رکھ دیتی کبھی ہٹا لیتی، اسے لطف سا آنے لگا جیسے کوئی نور کا سیلاب جالی دار جھرنوں میں سے چور بن کر اس کے پاؤں چُومنا چاہا ہے۔ وہ ان زم زم کرنوں کے سپرد کبھی ایک پاؤں کر دیتی کبھی دونوں۔ اس نے محسوس کیا جیسے آج کے آفتابِ تازہ کی طرح اس کے بدن سے بھی شباب اور حسن کی شعاعیں پھُوٹ رہی ہوں۔ سامنے چھت کے کونے میں مکڑی کے جالے میں رات کا کوئی پتنگا پھنسا پڑا تھا۔ مکڑی کے اپنی کمین گاہ سے نکلنے کے ساتھ ہی پتنگا کچھ ہلا۔ شمی کو اس کی خود سپردگی کا یہ اضطراب افزا لمحہ بڑا بھلا معلوم ہوا۔

اس کے خاوند کا پیٹ دو دفعہ بولا۔ وہ اب اُٹھ کر بیٹھے گا تو اس کے پیٹ پر چھ سلوٹیں پڑیں گی۔ شمی کا ہاتھ آپ ہی آپ اپنے پیٹ پر آ رہا جو تین بچے جننے پر بھی پچکا ہوا تھا۔ اس نے سوچا بچہ سے آج پھر سارے بدن کی مالش کراؤں گی۔ اس نے منہ پہ ہاتھ رکھ کر اپنا سانس سونگھنا چاہا مگر اسے یاد آیا کل تو اس نے کوئی سگریٹ نہیں پیا تھا۔ پھر اسے اپنی دونوں بہنوں کا خیال آیا جو خاوندوں کے ساتھ کلب میں جا کر شیری پیتی ہیں سگریٹ اڑاتی ہیں۔ اگر میں سگریٹ کبھی کبھار پی لیتی ہوں تو کیا حرج ہے اس میں۔ ایسے دقیانوسی شوہر کے ساتھ زندگی بسر کرنا میرا ہی کام ہے۔ کیسے ڈھول کا ڈھول رنگ دھڑنگ لیٹا پڑا ہے۔ اس روز پرویز بنیان پہنے شیو کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر

جھٹ کمرے میں گھس گیا اور گاؤن پہن آیا۔ ان کے گھر زندگی کتنی شیریں ہو جاتی ہے۔ کس کس کنج سے کرنیں نہیں پھوٹتیں۔ ایسے ایسے محسوس ہوا جیسے یہ سارا ماحول جھلس رہا ہے۔ آسمان پہ گہرا گہرا چھا گیا ہے۔ شہر بھر میں صرف مریم کے گھر آسمان کی نیلاہٹ نظر افروز ہے جہاں قدموں کی چاپ سن کر نظروں میں پھول جھکنے لگتے ہیں اور اُمید کا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ کتنی وارفتگی ہے وہاں۔ شوق کی ترسی ہوئی رُوح کس طرح مہک اُٹھتی ہے۔

چودھری گل نواز کا پیٹ تیسری دفعہ بولا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور اُٹھ بیٹھا۔

"کیسا ہے اب سر کا درد؟"

"درد تو بالکل نہیں ہے مگر طبیعت کچھ ویسی ہی ہے"

"ابھی لیٹی رہو۔ آرام کرو" وہ اپنا تہمد ٹھیک کرتا ہوا بستر سے اُٹھ کر چلا گیا۔

شمی نے اپنے پاؤں جھرنوں سے آنے والی روشنی میں رکھ دیئے۔ اس نے پائنچا اُوپر کھسکا کر پنڈلی کو کھجلایا اور بخو مراسن کو آواز دی

"جی بی بی سرکار!"

"میرے پاؤں دباؤ"

بخو پاؤں دبانے لگی "بخو کیا میرے پاؤں اور پنڈلیاں خوبصورت ہیں؟" شمی نے اپنی مراسن سے پوچھا۔

مراسن بلائیں لے کر بولی "تہانڈیاں پنڈیاں چناں دیاں گیلیاں نیں تے مینڈی بی بی دے پیر کبوتراں ورگے"

شمی بولی "ان کو چوم لو"

بخو نے دونوں پاؤں چوم لئے۔ شمی نے اُوپر لی ہوئی چادر اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا "مجھے تھوڑی مالش کر دو۔ یہ چادر تم لے لو"

گل نواز کو دفتر بھیج کر وہ غسل خانہ میں چلی گئی۔ صابن اور چنبیلی کی کھلی سے مل مل کر اس نے مالش کی ساری چکناہٹ اپنے بدن سے اتار دی۔ اس کے غسل خانہ سے نکلنے سے پہلے بخو نے جوڑہ تیار کر رکھا تھا۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کہا "میری ساڑھی نکالو۔ میں آج ساڑھی پہنوں گی"

وہ بناؤ سنگار کرتی رہی اور بخو ساڑھی، چولی، پیٹی کوٹ پوچھ پوچھ کر نکالتی رہی۔ جب وہ تیار ہو چکی تو بخو نے بلائیں لے کر کہا "تسیں تے حوراں توں وی ودھ کے پیئے او!"

شمی اپنے آپ کو سر سے پیر تک دیکھ کر بولی "سچ مچ؟"

"مینڈی بی بی دے حسن دی کیا گال ہے ہے" بخو نے بڑے خلوص سے کہا

مریم کے گھر پہنچی تو وہاں سوائے باورچی کے اور کوئی نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ سب ڈرگ روڈ گئے ہیں ابھی آجائیں گے۔ وہ گول کمرے میں داخل ہوئی تو دلیوان نے جیسے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اپنے بدن کا گرم اور معطر دباؤ کبھی داہنی کبھی بائیں ٹھنڈے ٹھنڈے کشنوں پر ڈالتی رہی جیسے اپنے بیقرار خون کی حرارت ان میں منتقل کر دینا چاہتی ہو۔ وہ دلیوان کے پاس ہی سے گرا ہوا تصویروں والا رسالہ اُٹھا کر دیکھنے لگی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی پرویز کا خیر مقدم گول کمرے سے آنے والی خوشبوؤں نے کیا۔ وہ سیدھا کچن کی طرف نکل گیا۔ باورچی سے

کہنے لگا "آپا میرے پیچھے پیچھے آ رہی ہیں، دو مہمان بھی ساتھ ہیں کھانا کم نہ ہو جائے۔ کچھ زیادہ پکا لینا"

اس نے اب آہستہ سے گول کمرے میں جھانکا۔ سکرین کی اوٹ میں دیوان پر شمی عجب شانِ محبوبی سے سوئی پڑی تھی۔ ایک ہاتھ سر کے پیچھے ہالہ بنا رہا تھا۔ اِدھر کٹی چولی سے زیتونی رنگ کے پیٹ کا کچھ کچھ حصہ نمایاں تھا۔ سینڈل دیوان کے پاس پڑے تھے اور دودھیا رنگ کے پیر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ یوں لگے ہوئے تھے جیسے نرم نرم اُجلے اُجلے کبوتر گردن سے گردن جوڑ کر ایک دوسرے سے پیار کر رہے ہوں۔ کلوپٹرا تخت پر سوئی پڑی تھی۔ سیفو آرام کر رہی تھی۔ اپنی اسیری کا اقرار کرنے سے پہلے پرویز نے جی بھر کر دیکھا پھر اس نے ایک غلام کی طرح پاؤں پکڑ لئے۔ دیکھ دیکھ کر آنکھوں سے لگائے۔ ٹخنے کے اوپر پنڈلی کا سڈول پن اس کے ہاتھوں نے محسوس کیا، اور چکنی چکنی کھال پر اس کے ہونٹ پھسلتے چلے گئے۔

شمی سوئی ہوئی قطعاً نہیں ہے۔ یہ خیال حوصلہ افزائیوں کا ایک ریلا بن کر اسے بہائے لے گیا۔ اس نے جیب سے اپنا نیلا چشمہ نکال کر شمی کی آنکھوں پر لگا دیا۔

یہ چشمہ کتنی دیر لگا رہا۔ اسے کچھ یاد نہیں۔

مگر شمی نے ایک دم نیلا چشمہ اُتار کر دیوار سے مارا اور بولی "میں تمہیں اچھی طرح دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں اپنے چوتھے بیٹے کا نام پرویز گل مراز رکھوں گی"

پرویز کو یوں لگا جیسے چشمے کی ٹوٹی ہوئی کرچیں جڑ کر اس کی آنکھوں پر آ لگیں اور کمرے کی ہر چیز دُھندلا گئی۔

آپا

غلام علی چودھری

بدیشی نہیں سودیشی مارشل لاء کے دنوں کی بات ہے لاہور کے شہریوں کو گلی کوچوں، دکانوں، گھروں کی خاص صفائی کا عام حکم ہوا تھا۔ مالکان مکانات جنہوں نے کبھی کرائے داروں کی بات پر کان نہ دھرا تھا مکانوں کی مرمت اور صفائی کے سلسلے میں بہ نفس نفیس بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ میرے مکان کی کینچلی بھی اترنی شروع ہوئی۔ زینے کے اوپر والے گندے اندھیرے کھڈے کو صاف کیا جا رہا تھا کہ ایک گرد سے اٹا ہوا لمبا دفتری لفافہ ایک صندوقچے سے برآمد ہوا۔ میں نے لفافے کو جھاڑ کر کھولا تو اس میں سے چھوٹے بڑے کئی ٹکڑے کاغذ کے نکلے۔ کاغذ بھورا ہو گیا تھا اور تحریر دھندلی لیکن پھر بھی آسانی سے پڑھی جا سکتی تھی۔ انتہائی غور کے بعد معلوم ہوا کہ ان کاغذوں پر خطوں کا ایک سلسلہ مرقوم تھا جو دو لکھنے والوں نے ایک ہی شخص کو ایک ہی معاملے کے متعلق بھیجے تھے۔

خطوں کی تاریخیں چودہ سال پہلے کی تھیں اور یہ کوئی دیر کی بات نہ تھی۔ میں نے مالک مکان سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ بارہ تیرہ سال ہوئے رشیدہ نام کی ایک عورت لائل پور سے یہاں آئی تھی لیکن بیچاری بمشکل ایک سال یہاں رہی ہو گی کہ اس کا دماغ چل گیا۔ اس کے شوہر نے اسے یہیں پاگل خانے میں داخل کروا دیا اور خود اپنے دو بچوں کے ساتھ منٹگمری چلا گیا جہاں اس کی تبدیلی ہو گئی تھی۔

قیاس کہتا ہے کہ رشیدہ یہ خطوط لائل پور سے اپنے ساتھ لائی ہو گی اور اس نے خود ہی انہیں صندوقچے میں محفوظ کر دیا ہو گا اور اس وقت شاید اس کے ہوش و حواس قائم ہوں گے۔

قارئین کے مطالعے کے لئے میں نے ان خطوں کی نقلیں کر لی ہیں اور ان کی سہولت کے خیال سے میں نے انہیں تاریخوں اور واقعات کے اعتبار سے ترتیب دے دیا ہے۔

دونوں لکھنے والے "رشیدہ" سے "آپا" کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں اس لئے میں نے اس سلسلۂ خطوط کو "آپا" ہی کا عنوان دے دیا ہے۔

★

ٹی۔ بی وارڈ میو ہسپتال لاہور
۷ر فروری ۱۹۳۹ء

اچھی آپا!

تم نے لکھا ہے یوسف کی دوسری شادی ہو گئی تمہیں مبارک ہو!

میں تمہارے شوہر کی خالہ زاد بہن، یوسف ایک اجنبی، وہ مجھے بیاہے اور طلاق دے دے لیکن تم اسے اسی طرح بھائی بنائے رکھو صد آفرین ہے تم پر!

تمہاری ——— صبوحی

لاہور، ۲۶ر فروری ۱۹۳۹ء

آپا!

خط کا جواب کب لکھوں۔ دفتر تو خیر ہے ہی دفتر گھر میں دفتر سے بھی زیادہ مصروفیت ہے۔

آپا! خدا کی قسم بے حد میٹھی لڑکی ہے۔ پرسوں میں نے کہا "شائستہ! تم میں اتنی مٹھاس کیوں ہے؟" کہنے لگی "مٹھاس آپ کے ہونٹوں میں ہے مجھ میں نہیں"، میں نے کہا "مجھی میں سہی لیکن ہے تمہاری دی ہوئی۔ تم آج سے 'شیریں' ہو اور میں؟ ہاں میں 'کوہکن'!"

کبھی لاہور آؤ تو تمہیں دکھلاؤں گھریلو ایٹ بیوی کیا ہوتی ہے!

آج کل خیالات کہاں جذبات ہی جذبات ہیں اور کیا لکھوں؟

تمہارا بھائی ——— "کوہکن"

★

ٹی۔ بی وارڈ میو ہسپتال
لاہور، ۱۱ر مارچ ۱۹۳۹ء

اچھی آپا!

تمہارا خیال غلط ہے مجھے یوسف سے نفرت نہیں شکایت ہے۔ میرے دل میں صرف ایک بات کھٹکتی ہے۔ میرے ہاں مُردہ بچی ہوئی۔ میری طبیعت مہینوں خراب رہی لیکن یوسف نے میری طرف توجہ نہ دی کیونکہ وہ ان دنوں شیریں کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھانے میں مصروف تھا۔ یہ تو ڈاکٹروں نے بھی کہا کہ اگر علاج بہت پہلے شروع ہو جاتا تو شاید میں دق میں مبتلا نہ ہوتی۔ میری قسمت تو جو تھی سو تھی میں یوسف کو تو الزام نہ دے سکتی۔

اور پھر بھائی جان ناراض، میں ناخوش، لیکن تمہارا ملنا اور خط و کتابت یوسف سے اب تک جاری رہے!

میں تمہاری بات بخوبی سمجھتی ہوں۔ میں نے کبھی یہ نہ کہا کہ ایک نوجوان اپنی زندگی ایک دق زدہ بیوی کی بھینٹ چڑھا دے۔ میں تم سے اس لئے ناراض نہ تھی کہ تم یوسف کو مجھ سے بچانا چاہتی تھیں۔ مجھے رنج صرف اس بات کا تھا کہ تم نے یوسف کو کبھی میری زندگی بچانے پر مجبور نہ کیا۔

یوسف نے مجھے 'صبوحی' کہا اور صبوحی ہی سمجھا یعنی میں صرف اس کی جوانی کی صبح کے کام آئی۔ اب جوانی کی دوپہر کاٹنے کے لئے اس نے ایک بہت میٹھی لڑکی ڈھونڈ لی ہے، بڑی اچھی بات ہے۔ ——— لیکن لوگ کہتے ہیں زیادہ مٹھاس کڑواہٹ تک جا پہنچتی ہے۔

خدا کی شان! کل تک مجھے 'صبوحی' اور اپنے آپ کو 'میکش' کہنے والا آج کسی اور کو 'شیریں' کہتا ہے اور اپنے آپ کو 'کوہکن'، اور کل جانے کیا ہو!

تمہاری ——— صبوحی

★

لاہور، ۳ر اپریل ۱۹۳۹ء

آپا!

صبوحی مدتوں تمہارے پاس رہی ہو اور تم اسے اپنی سگی چھوٹی بہن سے بھی زیادہ عزیز جانو۔ میں تم سے اور صبوحی سے پہلی بار ایک اجنبی کی طرح سر راہ ملوں۔ میری اور صبوحی کی محبت تمہارے سامنے بنے اور بگڑ جائے۔ میں اور صبوحی تمہارے سامنے ملیں اور بچھڑ جائیں۔ اور تم مجھے نہ چھوڑ سکو!

اگر یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آسکی تو میری سمجھ میں کس طرح آسکتی ہے؟ لیکن آپا آخر تم نے یہ سوال ہی کیوں کھڑا کیا ہے؟ اور اس سے پہلے یہ تمہیں کیوں نہ سوجھا تھا؟

شیریں نے کل اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کی لیکن یہ اور بھی الجھ گیا۔ شادی کے بعد پہلی دفعہ میرے اور اس کے درمیان تلخ کلامی ہوئی اور نہایت شدید وہ گو کچھ ایٹ ہے، سمجھدار ہے، خوبصورت ہے، خوش سلیقہ ہے۔ لیکن نہ جانے اس نے اتنی بھدی بات کیوں کی۔

اس نے مجھ سے کہا "اصل میں آپا تمہیں چاہتی ہے۔ تم اس سے اس وقت ملے جب اس کا شوہر تھا اس کے بچے تھے اس کا گھر بار تھا۔ وہ یہ سب کچھ چھوڑ کر تمہیں نہیں دے سکتی تھی لیکن اس کی یہ خواہش تھی کہ تم اس کے قریب رہو۔ اسی لئے اس نے تمہاری اور صبوحی کی محبت خود پروان چڑھائی"

میں نے اسے لاکھ سمجھایا کہ آپا کی عزت میری نظر میں اتنی ہی رہی ہے اور ہے جتنی میری اپنی بہن کی اور صبوحی کے لئے میرے دل میں محبت تھی جنون کی حد تک محبت۔ لیکن وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ نتیجہ سوائے جھگڑے کے اور کیا ہو سکتا تھا؟

آپا! آج کے دن تک تم مجھ سے میری سنتی رہیں اور اپنی مجھ سے کہتی رہیں اور یہ تمہارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے لیکن سچ یہ ہے کہ مجھے تمہاری عزت پر حرف آنے کا اتنا صدمہ نہیں ہوا جتنا اپنی اور صبوحی کی محبت کی توہین کا۔ تم کہو گی کہ وہ محبت تو اب ایک پرانی یاد سے زیادہ نہیں۔ لیکن خدا کی قسم مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے ایک مرحوم عزیز کو گالی دے دی ہو اور یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ ایک زندہ عزیز کی بہ نسبت ایک مرحوم عزیز کی توہین کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔

یہ رات کے کھانے کے بعد کا قصہ ہے۔ شیریں اپنے کئے پر ذرہ بھر پشیمان نہ تھی۔ وہ بار بار کہتی تھی "یہ تو ایک خالص نفسیاتی بحث ہے۔ بھلا اس میں جذبات کو کیا دخل؟" لیکن میں بہت رنجیدہ تھا۔

صبح اٹھا تو طبیعت میں تکدر باقی تھا۔ ناشتے کے بغیر ہی دفتر چلا آیا۔ سوچا کہ تم سے باتیں کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لوں۔

بچوں کو دعا

تمہارا بھائی ——— "کوہکن"

پس نوشت:۔ ذرا ذہن کا مطلع صاف ہو جائے تو ایک بار پھر اس مسئلے کو شیریں کے سامنے رکھوں گا۔ امید ہے اس کی خرافات سے تمہارے دل پر میل نہیں آئے گا۔ جانے آج جی کیوں چاہتا ہے کہ تم سے صبوحی کا حال پوچھوں!

"ک ک"

★

ٹی۔ بی وارڈ، میو ہسپتال

لاہور، ۱۴ اپریل ۱۹۳۶ء

اچھی آپا!

"کوہکن" سے کہو صبوحی کا حال نہ پوچھے۔ شیریں کے ہونٹوں کی مٹھاس چوسے۔ میں ہی تو وہ پہاڑ تھی جسے کاٹ کر وہ شیریں تک پہنچا ہے۔

آہ! آج کتنی صبحیں مجھے یاد آرہی ہیں! وہ صبح جب ہم کشمیر روڈ پر سیر کر رہی تھیں اور ایک اجنبی کے پاؤں کی آہٹ ہمیں اپنے پیچھے سنائی دے رہی تھی۔ وہ صبح جب وہ اجنبی سامنے سے آرہا تھا اور ہمیں دیکھ کر مسکرایا تھا۔ وہ صبح جب تم نے خود ہی سورج مکھی کا پھول ہاتھ سے گرا دیا تھا اور پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد اسے اٹھالانے کے لئے مجھے بھیجا تھا اور میرے وہاں پہنچنے تک وہ اجنبی اسے اپنے سینے کے اوپر لگا چکا تھا جب میں باوجود کوشش کے نہ بول سکی تھی اور اس نے مسکرا کر کہا تھا "آپ نے گرا دیا ہم نے اٹھا لیا" اور میں مسکراتی ہوئی واپس تمہارے پاس آگئی تھی۔ وہ صبح جب اس نے شملہ پہاڑی پر ہمیں سورج مکھی ہی کے پھول پیش کئے تھے اور ہم باہم متعارف ہوئے تھے جب اس نے کہا تھا "میرا نام یوسف ہے" اور میں نے کہا تھا "میرا نام ہے طاہرہ اور یہ ہیں میری آپا رشی..... " تو اس نے میری بات کاٹ کر کہا تھا "ہاں آپا۔ بس آپا" اور تم اچانک منہ پھیر کے اٹھ بیٹھی تھیں۔ وہ اگلی صبح جب تم سیر کو نہیں گئی تھیں اور میں بھی نہیں گئی تھی اور وہ اس سے اگلی صبح جب ہم پھر شملہ پہاڑی پر ملے تھے اور یوسف نے کہا تھا "یہ لیجئے۔ یہ ہیں کل کے مرجھائے ہوئے پھول اور یہ آج کے تازہ پھول۔ کل کے مرجھائے ہوئے پھول تو ویسے ہی مرجھائے ہوئے ہیں لیکن کل والا مرجھایا ہوا دل کیسے دکھلاؤں۔ وہ تو ابھی تمہیں دیکھ کے

کھل اُٹھا۔ آج کے ان تازہ پھولوں کی طرح۔ کل تم نہ آئیں تو دن بھر میرا وہی حال رہا جو شرابی کا نشہ ٹوٹنے پر ہوتا ہے۔" پھر جب اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا "طاہرہ آؤ ہم اپنے نام بدل لیں۔ جانتی ہو صبوحی وہ شراب ہے جو صبح کے وقت پیتے ہیں۔ میں شرابی ہوں اور تم شراب اور ہم صبح کے وقت ملتے ہیں اس لئے تم "صبوحی" ہو اور میں "رہیکش"" اور پھر وہ صبح جب اس نے تم سے پوچھا تھا "آپا تم خود تو سُرخ و سپید گلاب ہو لیکن تمہیں پسند ہیں زرد پھول؟" اور تم نے کہا تھا "ہاں میں شروع ہی سے ایسی ہوں مجھے اپنے چہرے کے سوا کسی اور جگہ سُرخی اچھی نہیں لگتی نہ کسی انسان کے چہرے پر نہ کسی پھول کے چہرے پر" اور پھر ہم تینوں ہنس پڑے تھے۔

اُف میرے اللہ! کس جھنجھٹ میں پڑ گئی! کتنی صبحیں کتنی شامیں کتنے دن کتنی راتیں گنوں گی! کتنی باتیں کتنی ملاقاتیں یاد کروں گی!

آپا! میری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے بخار تیز ہو رہا ہے اور کھانسی دم نہیں لینے دیتی۔ نرس کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ مجھے لکھتے دیکھ لیا تو ناراض ہو گی!

وہ "میکش" سے "کوہکن" بن گیا تو کیا میں اب بھی وہی صبوحی ہوں اور ہمیشہ وہی صبوحی رہوں گی؟

امید ہے بھائی جان اچھے ہوں گے اور عادت کے مطابق فائلوں کا پلندہ اٹھائے آتے ہوں گے اور گھر کو بھی دفتر بنائے رکھتے ہوں گے۔ فوزی اور جاوید کو پیار!

تمہاری ——— صبوحی

★

لاہور، ۱۳ر اپریل ۱۹۳۹ء

آپا!

یہ کیا؟ پورے دو ہفتوں کے بعد خط کا جواب تم نے دیا۔ میں تو سمجھ بیٹھا تھا کہ اب آپا صبوحی کی سگی بہن بن گئی۔

پھر یہ کیا کہ خط لکھا تو دفتر کے پتے پر اور یہ اعلان کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوا کرے گا اور یہ حکم کہ خط شیریں کو ہرگز نہ دکھلائے جائیں۔

تمہارا خط نہ آتا تو پتہ نہیں کیا ہوتا۔ اپنا دکھڑا کسے سُناتا۔ جو بات پہلے علمی بحث تھی اب خانگی نزاع کی صورت پکڑ گئی ہے۔ تم نے خواہ مخواہ مجھ سے پوچھا اور میں نے بیکار اس کا ذکر شیریں سے کر دیا۔

میں نے آپ ہی پھر اس مسئلے کو چھیڑا تو اس نے مجھے فوراً روکا۔ کہنے لگی "آخر اس رات کی تلخی کے بعد آج پھر آپ اس بکھیڑے میں کیوں پڑنا چاہتے ہیں؟" مجھ سے بیوقوفی ہوئی میں نے سوچا دب رہی ہے اب اسے اس طرح میدان سے بھگاؤ کہ آئندہ کبھی سامنے نہ آئے۔ میں نے کہا "تم نے مجھ پر ایک سنگین الزام لگایا ہے۔ یا تم الزام واپس لو یا مجھے اپنی بریت ثابت کرنے دو" وہ ہنس کے بولی "اجی حضرت! الزام آپا پر ہے آپ پر نہیں۔ اپنی صفائی تو آپا خود ہی پیش کر سکتی ہے، آپ صرف ایک صورت میں کہ آپ اس کے وکیل ہوں" مجھے پتہ نہیں کیوں غصہ آ گیا میں نے چلا کے کہا "نہیں تم مجھ پر شک کرتی ہو" اس نے کہا "جی ہاں پہلے نہیں تھا اب، اس وقت، اس لمحے سے ہے آخر ایک انسان بے وجہ اتنا مشتعل کیوں ہو؟"

میرا غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ بولی "برہم ہونا بے ضرورت ہی نہیں بے فائدہ بھی ہے اس لئے نہایت سکون سے میرے چند سوالوں کا جواب دیجئے" میں اس کا منہ تک رہا تھا۔

"آپا کا شوہر کیا کام کرتا ہے؟" اس نے تھوڑی دیر کے بعد پوچھا۔

"تمہیں پتہ ہے میری طرح گزیٹڈ آفیسر ہے" میں نے جواب دیا

"آپ سے زیادہ تنخواہ پاتا ہے یا کم؟" اس نے کچھ سوچ کر کہا

"مجھ سے ڈیوڑھی!"

"عمر بھی آپ سے ڈیوڑھی ہے اس کی؟" اس نے مسکرا کر کہا

"ہاں تقریباً چالیس سال" میں نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

"آپا کے ساتھ اس کی دوسری شادی ہے کہ پہلی؟" اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا

"دوسری!" میری حیرت ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

"اور آپا کی تو قاعدے کے مطابق پہلی ہی ہونی چاہئیے" پتہ نہیں وہ کس قاعدے قانون کی بات کر رہی تھی

"آپا کے بچے تو دو ہی ہیں، ایک لڑکا ایک لڑکی؟" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی

"مجھے پتہ نہیں" کہتا ہوا میں کرسی سے اُٹھ بیٹھا "تم تفتیش کرنے والی ہو کون؟ آخر یہ کیا تماشا ہے؟ تم جج نہیں ہو اور میں کوئی مجرم نہیں ہوں" جانے مجھے کیا ہوا۔ خون میرے اندر کھولنے لگا تھا اور میں غصے سے کانپ رہا تھا۔

وہ اسی طرح کرسی پر بیٹھی مسکراتی رہی اور میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

لیکن ایک بار پھر میں اندر گیا اور میں نے کڑک کر کہا "اچھی طرح سُن لو۔ آپا ہی نے میری اور صبوحی کی محبت کی داغ بیل ڈالی۔ آپا ہی کی مدد سے ہماری شادی کے مراحل طے ہوئے۔ جب بھی ہمارا جھگڑا ہوتا آپا فوراً بیچ میں آجاتی۔ مجھ سے الگ بات کرتی صبوحی سے الگ۔ ہمیں کسی معاملے پر باہم بحث تک بھی نہ کرنے دیتی یہ ہماری قسمت تھی کہ بالآخر ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے"

وہ نہایت اطمینان کے ساتھ کرسی سے اٹھی اور بولی "اس ژالہ باری سے فائدہ؟ دیکھئے، میری دانست میں آپا اپنی دُھن کی پکی عورت ہے وہ کبھی غلط بات نہ کہے گی میرا اس رات والا الزام اس پر ابھی تک قائم ہے اس سے کہو ایک تردیدی جملہ لکھ بھیجے میری تسکین ہو جائے گی۔ اور جو کچھ آپ نے اب فرمایا ہے اس سے تو صاف ظاہر ہے کہ آپ کی اور صبوحی کی ناچاقی اور علیحدگی کی ساری ذمہ داری آپا پر ہے۔ اگر وہ آپ کو اپنے اختلافات خود دُور کرنے دیتی تو شاید نہ آج صبوحی ہسپتال میں ہوتی نہ میں یہاں!"

آپا کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم اپنی طرف سے بڑی سخت تردید شیریں کے بے بنیاد الزامات کی کر دیتیں اور میں تمہاری تحریر پیش کر کے اس کی تسلی کر دیتا۔ لیکن تم نے اس موضوع پر صرف یہ کہا ہے کہ شیریں شکی مزاج لڑکی معلوم ہوتی ہے اس کو اس قسم کی باتوں میں اُلجھانا مناسب نہیں تھا۔ اور تو اور تم نے اس خط و کتابت کو بھی صیغۂ راز میں رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ بہت اچھا۔ تمہیں ناراض کیسے کر سکتا ہوں۔ تم رُوٹھ گئیں تو گھر کا رونا کس کے پاس روؤں گا۔ ماں باپ، بھائی بہن نہ پہلے معاملے میں تھے نہ اس میں۔

تمہارا بھائی ——— "کوہکن"

لاہور، ۲۱ مئی ۱۹۳۹ء

آپا!

عجیب باتیں کرتی ہو تم بھی۔ میرا خیال تھا کہ تم ایک تردیدی جملہ لکھ بھیجو گی اور بات ختم ہو جائے گی لیکن تم نے یہ کہہ کر اپنا دامن بچا لیا کہ "شیریں بدتمیز ہے اسے کیچڑ اُچھالنے میں مزا آتا ہے مجھے ایسے لوگوں سے کوئی سروکار نہیں" میں تو یہ بات بخوبی سمجھتا ہوں لیکن اصل مقصد تو شیریں کو خاموش کرنا ہے پھر نہیں پر بس نہیں تم نے تو مجھے بھی ہدایت کی ہے کہ اس موضوع پر شیریں سے پھر بحث نہ کروں۔ خود مدد کو نہیں آتیں اور مجھے بھی نہتا کر رہی ہو حالانکہ چالاک دشمن کیل کانٹے سے لیس سامنے کھڑا ہے۔

میں نے اسے کہا لو دیکھو تمہاری یاد گھٹ گئی ہے آپا کا دل اتنا کھٹا ہو گیا کہ اس نے مجھے خط لکھنا چھوڑ دیا۔ کیا یہی تمہارے الزام کی تردید نہیں ہے؟" وہ بڑے اطمینان سے مسکراتے ہوئے بولی "مجھے اپنی تحقیق پر اور آپا کی مستقل مزاجی پر پورا بھروسہ ہے۔ الزام ٹھیک ہے اور آپا جھوٹ نہیں بولتی۔ آخر وہ لکھے تو کیا لکھے؟"

میری جان عذاب میں ہے۔ میں تو تمہارے کہنے کے مطابق کمبل کو چھوڑنے کے لئے تیار ہوں لیکن کمبل بھی تو مجھے چھوڑے۔

آپا! میں حیران ہوتا ہوں کہ صبیحہ کو میں نے کیوں چھوڑ دیا۔ الاماں! یہ ذہنی پریشانی! اس کا تو ایک شائبہ بھی اس وقت نہیں تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں ہو اکرتی تھیں لیکن وہ کس گھر میں نہیں ہوتیں۔ پتہ نہیں تمہارے جیسی سمجھدار عورت کے گھر میں ہوتے ہوئے بات کیوں بگڑ گئی۔

آپا! خدا کے لئے اصلاحِ احوال کی کوئی راہ نکالو ورنہ اس ڈرامے کا انجام نہایت حسرت ناک ہوگا۔ پہلے سے کہیں زیادہ حسرت ناک۔

بھائی جان دورے سے کب واپس آرہے ہیں؟ بچوں کو دعا

تمہارا بھائی ——— "کوکن"

★

ٹی۔بی وارڈ، میو ہسپتال
لاہور، ۳۰ رمئی ۱۹۳۹ء

اچھی آپا!

تم نے "کوکن" کی نئی پریشانیوں کا ذکر کیا ہے۔ مجھے اس کے معاملے سے کیا غرض؟ لیکن میں اس کے لئے برا نہیں چاہتی۔ وہ میرا ساتھ نہیں دے سکا تو کیا ہوا۔ خدا کرے کہ شیریں کے ساتھ اس کی بنی رہے۔ جانے کیوں میرے منہ سے یوسف کے لئے بددعا نہیں نکلتی۔ تم اس کی خیرخواہ ہو اس کی مدد کرو لیکن اگر بات زیادہ پیچیدہ نہیں تو دونوں کو ان کے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ یہ میں اپنے تجربے کی بناء پر کہہ رہی ہوں تم ہماری ذرا ذرا سی بات میں دخل دیتی تھیں اور اکثر اوقات نتیجہ سوائے ایک بڑی الجھن کے اور کچھ نہ ہوتا تھا۔

کل بائیں پھیپھڑے میں ہوا بھری گئی تھی۔ اس وقت بخار ہلکا ہے لیکن دو پہر تک وہی بھٹی گرم ہو جائے گی۔

بچوں کو دعا۔ بھائی جان کو آداب

تمہاری ——— صبوحی!

★

لاہور، ۲ رجون ۱۹۳۹ء

آپا!

سمجھ میں نہیں آتا تم کیا کہہ رہی ہو اور کیا کرنا چاہتی ہو۔ تم نے شیریں کے اطمینان کے لئے کچھ نہ لکھا۔ مجھے اس کے ساتھ بحث میں الجھنے سے روکا۔ یہ ایک بات تھی۔ لیکن یہ کیا کہ تم مجھے خط لکھو اور اس میں ایک لفظ بھی اس سلسلے میں بطور مشورے کے نہ ہو! کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ اس مسئلے پر میں شیریں کے سامنے خاموش رہوں اور تم میرے سامنے؟

ظاہر ہے کہ یوں نہیں ہو سکتا۔ ادھر میں اس حد تک آگے چلا گیا ہوں کہ میرا لوٹ کے آنا ناممکن ہے۔ شیریں مجھے قدم قدم پر ضرب لگا رہی ہے۔ میں ہزار چاہوں ہتھیار نہیں ڈال سکتا۔ ادھر تم اس معاملے سے یوں لاتعلق ہو گئی ہو جیسے یہ تمہارا نہیں کسی اور کا ہے۔ یعنی جو پھندا تم نے لگایا ایک تو اکیلا میں ہی اس میں

پھنسا رہوں اور دوسرے تم مجھ سے یہ پوچھنا بھی گوارا نہ کرو کہ میں اس پر اُلٹا ٹنگا ہوں یا سیدھا۔ حالانکہ تم اس پھندے کو ایک دم میں توڑ کر گرا دینے پر قادر ہو۔

آپا! تم کہو گی میرا لہجہ بے حد گستاخانہ ہے لیکن میں مجبور ہوں، بہت ہی مجبور۔ شدید ذہنی اُلجھن میں مبتلا ہوں۔ بیٹھا بیٹھا جھنجھلا اُٹھتا ہوں۔ جی میں آتا ہے کہ دیوار سے سر پھوڑ لوں۔

آپا! کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اکٹھے بیٹھ جائیں اور اس مفت کے دردِ سر سے چھٹکارا حاصل کریں۔ شیریں نہیں مانتی تھی لیکن بالآخر میں نے اسے اس بات پر راضی کر لیا ہے۔ تم لکھ بھیجو تو ہم کسی روز تمہارے ہاں آ جائیں اور یہ ناگوار قضیہ ختم ہو جائے۔ آمنے سامنے بیٹھ کر گفتگو ہو تو غلط فہمی کا امکان نہیں ہوتا۔

آپا! خدا کے لئے مجھ پر ترس کھاؤ اور مجھے برباد ہونے سے بچا لو۔

میں تمہارے جواب کا بے تابی سے انتظار کر رہا ہوں۔

تمہارا بھائی ——— "کوہکن"

پس نوشت:۔ میں نے شائستہ کو "شیریں" کہا تھا تو اپنا نام "کوہکن" رکھا تھا۔ شیریں نے میری زندگی اتنی تلخ کر دی ہے کہ یہ نام چھوڑ دینے کو جی چاہتا ہے لیکن کیوں چھوڑوں۔ آج کل یہ میرے حال پر بہت صادق آتا ہے میرا دن بھی پہاڑ ہے، میری رات بھی پہاڑ!

"ک ک"

لاہور، ۱۳ / جون ۱۹۳۹ء

آپا!

مجھے نظر آ رہا ہے تم مجھے لے ڈوبو گی۔ دس دن کے بعد خط کا جواب آیا اور اس میں میری مزید پریشانی کا سامان۔ اگر بھائی جان کی طبیعت ناساز ہے اور بچے بھی علیل ہیں تو ہمارے آنے میں کیا حرج تھا۔ دس منٹ تخلیے میں بات چیت ہو جاتی اور عقدہ حل ہو جاتا۔

میں ایسے سلوک کا مستحق نہ تھا۔ مجھے تمہاری سرد مہری سے سخت صدمہ ہوا۔ شیریں کا رویہ بجا طور پر درشت ہے لیکن تمہاری رو گردانی سراسر ناجائز ہے مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں ساری شکایت تم سے ہے۔

لیکن تم خوش ہو یا ناخوش میں یہ قصہ چکا کے رہوں گا۔ کسی روز اکیلا چلا آؤں گا کیونکہ ان حالات میں شیریں کا ساتھ آنا ٹھیک نہیں۔

خدایا! بہن اتنی سنگدل بھی ہو سکتی ہے؟

تمہارا بھائی ——— "کوہکن"

آفیسرز وارڈ، میو ہسپتال

لاہور، ۲۳ / جون ۱۹۳۹ء

آپا!

میں کتنا بدنصیب ہوں کہ بچتے بچتے مر گیا۔ ہاں جس کی زندگی ہی موت ہو اس کا مرتے مرتے بچ جانا، بچتے بچتے مر جانا نہیں تو اور کیا ہے؟

کاش وہ تانگہ میرے آگے نہ جا رہا ہوتا سامنے سے آ رہا ہوتا! کاش میری موٹر سائیکل کی رفتار زیادہ تیز ہوتی اور وہ پہیے کی بجائے گھوڑے سے ٹکر کھاتی!

یہ پانچ روز پہلے کا واقعہ ہے جب میں تمہیں ملنے کی غرض سے لائل پور آ رہا تھا۔ حادثہ شاہدرے کے قریب ہوا۔ دائیں کولھے کی ہڈی اور دائیں پنڈلی کی دونوں ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔

تمہارا بھائی ——— "کوہکن"

ٹی۔ بی وارڈ، میو ہسپتال

لاہور، ۱۳/ جون ۱۹۳۹ء

اچھی آپا!

آخر کوہکن نے اپنا سر پھوڑ لیا لیکن کیا "شیریں" تو اس سے نہ چھن جائے گی؟ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو! جب سے حادثے کا سنا ہے جو تھوڑی بہت نیند پہلے آجاتی تھی وہ بھی اُڑ گئی ہے۔ ہائے اللہ! اپنے دل پر بھی اپنا بس نہیں!

آپا! تم کہو گی کہ یا تم یوسف کے ساتھ میل جول اور خط و کتابت رکھنے پر مجھ سے ناراض تھی یا اب اس کے لئے اتنی بے چین ہے۔ میں خود حیران ہوں کہ ایسا کیوں ہے۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ مجھے اس کی حالت کے متعلق باقاعدہ اطلاع ملتی رہے! لیکن خبردار اسے ہرگز اس کا پتہ نہ چلے۔

اُف! یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ وہ اسی ہسپتال کے ایک کونے میں ایک چارپائی پر درد سے کراہ رہا ہو اور میں محض دنیا کے ڈر سے اپنے پاؤں کی بیڑیاں نہ کاٹ سکوں۔ حالانکہ میرا جی چاہتا ہے کہ ابھی اس کے پاس پہنچ جاؤں۔

تمہاری ——— صبوحی!

آفیسرز وارڈ، میو ہسپتال

لاہور، ۱۱/ جولائی ۱۹۳۹ء

آپا!

میں تمہارا منتظر رہا لیکن معلوم نہیں تم مجھے دیکھنے کیوں نہ آسکیں۔ اگر معذوری ہے تو بے قصور ہو اور اگر بے نیاز ہو تو عجیب بہن ہو! اس حادثے نے کئی گل کھلائے۔ میں نے شیریں سے کہہ رکھا تھا کہ آپا نے تم سے ناراض ہو کر مجھے خط لکھنا چھوڑ دیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا جھوٹ اس پر ظاہر ہو گیا ہے۔ میری غیر حاضری میں اس نے میرے وہ کاغذات ضرور دیکھ لیے ہیں جن میں تمہارے کچھ خط پڑے تھے لیکن غالباً میری تکلیف کے خیال سے اس نے مجھے نہیں جتایا۔

پھر چند ہی روز ہوئے مجھے خیال آیا کہ دفتر والوں کو کہلا بھیجوں کہ میرے خط گھر کی بجائے ہسپتال کے پتے پر پہنچا کریں لیکن اس عرصے میں تمہارا وہ خط دفتر سے گھر پہنچ گیا جو تم نے میرے زخمی ہونے سے دو روز پہلے لکھا تھا۔ شیریں کے کہنے کے مطابق اس میں دو مرجھائے ہوئے سورج مکھی کے پھول تھے اور ایک پُرزہ جس پر لکھا تھا "آپا" لیکن اس نے مجھے وہ پُرزہ دکھایا نہ وہ پھول۔

اس نے کوئی ناگوار بات تو نہ کی لیکن وہ پریشان تھی۔ اور میں بھی کچھ کم حیران نہ تھا۔ آخر ایسا تحفہ بھیجنے کا کیا موقعہ تھا؟ لیکن میں نے اس کی پریشانی دُور کرنے کے لئے اسے بتایا کہ آپا کو زرد پھول بہت پسند ہیں۔ پھر وہ شملہ پہاڑی والا لطیفہ سُنایا جب میں نے صبوحی کے سامنے تم سے کہا تھا "آپا تم تو بالکل گلاب کی طرح سُرخ و سپید ہو اور تمہیں اچھے لگتے ہیں زرد پھول؟" اور تم نے کہا تھا "بس میں کچھ ایسی ہی ہوں، میں چاہتی ہوں کہ سُرخی میرے ہی چہرے پر ہو کہیں اور نہ ہو نہ کسی انسان کے چہرے پر نہ کسی پھول کے چہرے پر!"

مجھے درد ہو رہا تھا لیکن میں پھر بھی ہنسا مگر پتہ نہیں کیوں شیریں کے چہرے کی لالی اُڑ گئی۔

شیریں آج کل بہت اُداس اور خاموش ہے۔ شاید کوئی بہت بڑا فیصلہ کرنے والی ہے۔ میں کوئی ایک مہینے سے ہسپتال کی آہنی چارپائی پر پڑا ہوں اور پتہ نہیں

کب تک پڑا رہوں اور پھر خدا جانے کس صورت میں یہاں سے اُٹھوں۔ ہاں شیریں کو سوچ بچار کرنے کا پورا حق ہے۔

سڑک والے حادثے سے کہیں بڑا حادثہ کل صبح یہاں ہوا۔ میں اخبار دیکھ رہا تھا اور شیریں میرے پاس بیٹھی تھی۔ مجھے پیشاب کی حاجت ہوئی میں نے کہا "ذرا پائنتی پڑا پاٹ (POT) مجھے دینا" اس نے جھک کر نیچے دیکھا اور بولی "یہاں نہیں ہے میں بھنگی سے منگواتی ہوں" اس نے اٹھ کر بھنگی کو بلایا اور پھر باہر برآمدے میں کچھ کھسر پھسر سنائی دی۔ میں نے اخبار ذرا ایک طرف ہٹا کر دیکھا بھنگی خالی ہاتھ کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں میری پائنتی تک آیا اور ہولے سے پاٹ اٹھا کر بولا "لو بابو جی میں اسے باہر صاف کر رہا تھا"

کچھ نہ پوچھو میرے دل پر کیا گزری۔ شیریں مجھ سے کتنی نفرت کرتی ہے اور صبوحی کس طرح میری ذرا ذرا سی تکلیف کا خیال رکھا کرتی تھی۔

صبوحی یاد آئی ہے تو ایک واقعہ بھی یاد آ گیا ہے۔ شادی کے بعد ایک صبح میں اور صبوحی شملہ پہاڑی کی طرف سیر کو جا رہے تھے۔ پہاڑی کے سامنے والے چوک میں ایک کتا خون میں لت پت پڑا تھا جو چند منٹ پہلے ایک ٹرک کے نیچے آ کے مر گیا تھا۔ کتے کی لاش کے پاس ایک ہرنی بیٹھی تھی۔ اس کا مالک اسے بار بار کھینچ کے پرے لے جاتا تھا اور وہ بار بار اسے کھینچ کے چوک میں لے آتی تھی۔ غمزدہ مالک نے ہمیں بتایا کہ کتا اور ہرنی اس کے پاس ایک سال سے اکٹھے پلتے آ رہے تھے اور ان میں بے حد پیار تھا۔ ہرنی کی بے چینی دیکھ کر صبوحی بہت آزردہ ہو گئی۔ میں نے اس کہا "صبوحی! کیا تم بھی میرے دُکھ میں اسی طرح بے چین ہو گی؟" اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی زبان الفاظ ٹٹولتی رہی مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی اور آخر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

آہ! آج میں زخموں سے نڈھال پڑا ہوں اور میرے لئے کوئی بے قرار نہیں۔ لیکن جب مجھ میں کتے کی سی وفا نہیں تو ہرنی کی سی محبت کیسے مل سکتی ہے میں تو اسی محبت کا مستحق ہوں جو مجھے شیریں سے مل رہی ہے۔

آفیسرز وارڈ سے ٹی۔بی وارڈ چند گز دوں کے فاصلے پر ہے لیکن صبوحی کو کیا معلوم؟

آپا! خط لمبا ہو گیا ہے لیکن مجھے آج کل ناول پڑھنے اور تمہیں خط لکھنے کے سوا اور کام ہی کیا ہے!

امید ہے بھائی جان کی طبیعت اب ٹھیک ہو گی اور بچے بھی اچھے ہوں گے۔

تمہارا بھائی ——— "کوہکن"

★

ٹی۔بی وارڈ، میو ہسپتال

لاہور ۱۲ جولائی ۱۹۳۹ء

اچھی آپا!

شیریں اسے چھوڑ جائے گی؟ ہائے اللہ! اس کا کیا بنے گا!

آپا! کیا وہ بھی میری طرح مہینوں ہسپتال میں پڑا رہے گا؟ وہ گھر کیوں نہیں چلا جاتا؟ وہ میرے قریب کیوں پڑا ہے؟

آپا ——— مجھے اپنے دل پہ قابو نہیں رہا۔ میں اپنے پاؤں کی بیڑیاں کاٹنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔ کہہ نہیں سکتی کب اُٹھوں اور اس کے سامنے جا کھڑی ہوں۔

بھائی جان سے کچھ نہ کہنا۔

تمہاری ——— صبوحی!

ٹی۔ بی وارڈ، میو ہسپتال
لاہور، ۲۳ جولائی ۱۹۳۹ء

اچھی آپا!
کل صبح میں اس کے پاس چلی گئی!
دروازہ بند تھا۔ میں نے ہولے سے دستک دی تو ایک نوجوان لڑکی باہر آئی۔ ظاہر ہے وہ شیریں تھی۔ اس کا چہرہ اُداس تھا اور وہ بہت آزردہ دکھائی دیتی تھی۔ بولی "آپ صبوحی ہیں؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ تھی کیونکہ ہم نے پہلے ایک دوسرے کو نہ دیکھا تھا۔ وہ مسکرائی اور کہنے لگی —
"حیران نہ ہوجیئے آپ کا زرد چہرہ وہ زرد پھول ہے جو آپا کو بہت پسند ہے" پھر دروازہ کھولتے ہوئے بولی "آ یئے تشریف لایئے ایک اور پھول یہاں زرد ہو رہا ہے"
"صبوحی......!" وہ مجھے دیکھ کر چلایا اور اُٹھنے لگا لیکن شیریں نے جھٹ اسے پکڑ لیا "دیکھئے، خدا کے لئے! پلستر ٹوٹ جائے گا"
شیریں نے اسے مضبوطی سے دبایا ہوا تھا اور وہ بچوں کی طرح سسکیاں بھر رہا تھا۔
میں نے ہزار ضبط کیا لیکن میرے آنسو نہ رک سکے۔
آپا! کیا کہوں آنکھوں نے کیا دیکھا۔ پیلا ہلدی کا سا رنگ اور بہت کمزور۔ تم اسے دیکھو تو پہچان نہ سکو۔
تقریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھی رہی۔ اُتنے وقت شیریں نے کہا "کیا ہرج ہے اگر آپ ہر روز انہیں دیکھ جایا کریں؟"
"ہاں ہاں صبح کے وقت......" اس نے کہا اور اس کی للچائی ہوئی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو جھلملانے لگے۔ شاید میری طرح اسے بھی وہ صبحیں ابھی تک یاد ہیں۔
شیریں میرے وارڈ تک میرے ساتھ آئی۔ بہت اچھی ملنسار لڑکی ہے۔ یوسف کا اس سے کیا اختلاف ہو سکتا ہے؟ خدا کرے کہ ان کے تعلقات ٹھیک ہو جائیں۔
کل سارا دن بڑی بے چینی میں گزرا۔ بخار معمول سے زیادہ رہا۔
لیکن آپا تم یوسف کو دیکھنے کیوں نہیں آئیں؟ آخر تمہیں کونسی ایسی مصروفیت ہے؟ اسے تم سے بہت گلہ ہے اور بجا طور پر ہے۔
تمہاری ——— صبوحی!

ٹی۔ بی وارڈ، میو ہسپتال
لاہور، ۲۹ جولائی ۱۹۳۹ء

اچھی آپا!
بھائی جان کو پتہ چل گیا کہ میں یوسف سے ملتی ہوں اور انہوں نے کہہ دیا کہ وہ کبھی میری صورت نہ دیکھیں گے؟ .... نہ سہی!
لیکن کیا میں تم سے پوچھ سکتی ہوں کہ انہیں یہ کیسے معلوم ہوا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں میرا اور شیریں کا ملنا پسند نہیں آیا۔ تم سچی ہو کیونکہ شیریں کہتی ہے آپا صرف میرے ڈر سے یوسف کو دیکھنے نہیں آئی۔ یہ تم جانتی ہو یا وہ جانتی ہے کہ تم اس سے کیوں ڈرتی ہو۔
بہر حال تم نے یہ بہت بڑی بات کی۔ تم چاہتیں تو بھائی جان کو ہرگز میرے یوسف سے ملنے کا علم نہ ہو سکتا۔
تمہاری ——— صبوحی!

آفیسرز وارڈ، میو ہسپتال
لاہور، ۷ اگست ۱۹۳۹ء

آپا!

شیریں چلی گئی۔ تمہیں مبارک ہو!

اس کا آخری خط تمہیں بھیج رہا ہوں۔ یہ خط وہ آئینہ ہے جس میں تمہاری اصل شکل ہم نے پہلی بار دیکھی۔

صبوحی کہتی ہے اگر جرأت ہے تو یہ خط بھی بھائی جان کو دکھا دو۔

تم کیا ہو؟ اب تک کیا کرتی رہی ہو۔ شیریں سب کچھ بتا گئی ہے اور میرا اور صبوحی کا خیال ہے کہ اس کا فیصلہ حرف بہ حرف صحیح ہے لیکن ہم دونوں کی دعا ہے کہ تمہارا انجام ہرگز وہ نہ ہو جو شیریں کو نظر آتا ہے۔

صبوحی ہر صبح مجھے ملنے آتی ہے اور اس ملاقات کا نشہ اس ملاقات سے کہیں زیادہ ہے جو شملہ پہاڑی پر ہوا کرتی تھی۔

شیریں کے خط کی طرح تمہارے نام میرا یہ آخری خط ہے۔

تمہارا بھائی ——— دمیکش،

! ———

آپ کو کیا کہوں؟ کس نام سے مخاطب کروں؟ میں شیریں، نہیں رہی آپ کو بکن کیسے ہو سکتے ہیں دمیکش، کہہ سکتی تھی لیکن اس کے لئے صبوحی سے اجازت لینے کی ضرورت ہے۔

میں جا رہی ہوں اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ پھر آپ کو بیوی کی حیثیت سے نہ ملوں۔

آپ وہ زرد پھولوں والی بات نہ سنانے تو میں کبھی آپا کو پورے طور پر نہ سمجھ سکتی اور صبوحی مجھ سے نہ ملتی تو شاید میں وہ کچھ نہ کہتی جو اب کہہ رہی ہوں۔

اجازت ہو تو آپ کی چہیتی آپا کا چہرہ اتار جاؤں ———

آپا نے پہلے پہل آپ کو دیکھا تو اس کا جی للچایا۔ آپ نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ لیکن صبوحی آپ کی نظر میں کھب گئی۔ اس نے صبوحی کا سہارا لیا اور بالآخر آپ کو اس کے ساتھ ٹانک دیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید آپ کسی روز اس کے ڈھب پر آجائیں گے۔ لیکن اس میں قدم بڑھانے کی جرأت نہ تھی اور آپ کو اس سے رغبت نہ تھی۔ آخروہ اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئی۔ اس نے آپ کے معاملات کو الجھایا اور آپ کی مشین بن کر ایک کو دوسرے سے بدگمان کیا۔ وہ آپ کے درمیان اس طرح حائل ہو گئی کہ آپ الگ رہنے پر مجبور ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ اگر شادی کے بعد آپ آپا کے ساتھ نہ رہتے بلکہ کہیں اور جا بستے تو کبھی یہ نوبت نہ آتی۔ آپ کو صبوحی سے اور اسے آپ سے اس قدر محبت ہو اور آپ میں جدائی ہو جائے! یہ کیسے ممکن ہے؟ بہرحال جو تسکین آپا کو حاصل نہ ہو سکی تھی اس نے صبوحی کو اس سے محروم کر دیا۔

پھر باوجود صبوحی کی اور اپنے شوہر کی مخالفت کے وہ آپ سے ملتی رہی اور خط و کتابت کرتی رہی۔ نہ وہ اتنی فیاض طبیعت رکھتی تھی کہ ناکام محبت کی سلگتی آگ کو خود ہی بجھا لیتی نہ اس میں اتنی دلیری تھی کہ اسے ہوا دے کے بھڑکا لیتی۔ وہ اس آگ کو دبائے رہی۔ حتیٰ کہ اس کا دل اس کے دھوئیں سے سیاہ ہو گیا اب وہ ایک ڈرپوک ڈائن کی طرح اندھیرے میں زندگی کا خون پینے لگی اور چہروں کی سرخی چوسنے لگی۔

اس نے بیکار ایک سوال اپنے اور آپ کے تعلقات کا اٹھایا اور ہمارے درمیان تلخی پیدا کی۔ آپ بے حد سادہ لوح ہیں اس لئے وہ آپ پر سوار رہی میں نے اس کی چوری پکڑ لی اس لئے وہ میرے سامنے نہیں آ سکی۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا وہ اپنی دُھن کی پکی ہے وہ نہ تو اپنی ہٹ چھوڑے گی اور نہ جھوٹ ہی بولے گی کیونکہ وہ کس طرح اپنے اس جذبے کی تحقیر کر سکتی ہے جس کی پرورش کرتے کرتے اس نے اپنے دل اور جگر کا خون جلا لیا ہے۔

آپا نے پہلے صبوحی کا خون پیا پھر میرا پینا چاہا۔ میں اس کے چنگل میں نہ آئی تو اس نے آپ کا شکار کر لیا۔ میں حیران ہوں کہ میں کیوں توہم پرست ہو گئی ہوں۔ میرے دل میں رہ رہ کے خیال آتا ہے کہ اگر آپا آپ کو زرد پھولوں کا تحفہ نہ بھیجتی تو آپ کو کبھی حادثہ پیش نہ آتا۔ اور سچ پوچھئے تو ایک طرح کا خوف مجھے آپا سے آنے لگا ہے۔

جو محبت صبوحی کو آپ سے ہے وہ مجھے آپ سے نہیں۔ باوجودیکہ مجھے آپا کے بارے میں اب آپ پر کوئی شک نہیں۔ اصل میں میں کسی سے بھی اتنی محبت نہیں کر سکتی جتنی صبوحی آپ سے کرتی ہے۔ صبوحی کی محبت نے مجھ سے کہا "شائستہ! راستے سے ہٹ جاؤ" اور میں ہٹ گئی میں نہیں جانتی آپ ایک دوسرے سے مل سکیں گے یا نہیں لیکن آپ کے ملنے کی راہ میں نے ضرور نکال دی ہے۔

آپ کی آپا کہے گی کہ آپ کے جسم تو کھنڈر ہیں آپ کا ملنا کیا؟ لیکن میں کہتی ہوں جن کھنڈروں میں محبت کے چراغ جلتے ہیں وہ ان محلوں سے کہیں زیادہ اچھے ہیں جن میں کینے کے اندھیرے چھائے ہیں۔

آپ کہیں گے کہ اب میں خستہ و شکستہ ہوں تو تم مجھ سے پیچھا چھڑا رہی ہو یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر میں صرف صبوحی کا بدلہ آپ سے لے رہی ہوں اس کا کہنا ہے کہ آپ اسے تندرستی کی حالت میں چھوڑ جاتے تو اسے اتنا صدمہ نہ ہوتا۔ لیکن اِدھر وہ دِق میں مبتلا ہوئی اُدھر آپ نے دوسری شادی کا فیصلہ کر لیا۔ آپ نے یہ خیال ہی نہ کیا کہ وہ فوری علاج سے ٹھیک بھی ہو سکتی ہے۔ میرے گھر والوں کو آپ نے یہی بتایا کہ وہ دِق کے آخری درجے کی مریضہ ہے۔

جس طرح آپ نے صبوحی کا ہاتھ بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا اسی طرح میں نے آپ کا!

آپا کا انجام دردناک ہوگا۔ وہ خودکشی کر لے گی یا پاگل ہو جائے گی۔ لیکن شاید پہلی بات کی اس میں ہمت نہیں۔

میں اسی خط میں آپا کے بھیجے ہوئے پھول بھی بند کر رہی ہوں۔ ان دو مُرجھائے ہوئے زرد پھولوں سے دو مُرجھائے ہوئے زرد چہروں کو اکٹھا کرنا مقصود تھا سو وہ ہو گئے۔

میں صرف وہی چیزیں اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں جو میرے ماں باپ نے مجھے شادی کے موقعے پر دی تھیں۔ آپ جتنی جلدی مجھے فارغ کر دیں میں اتنی ہی زیادہ آپ کی ممنونِ احسان ہوں گی۔

"شائستہ!"

مالک

سیّد خلیل احمد

اس پُرانی سات منزلہ عمارت میں ہر قسم کے ہی لوگ رہتے تھے۔ ہر مذہب، ہر پیشے اور ہر طبقے کے لوگ، مسلمان بھی تھے، عیسائی بھی اور پارسی بھی۔ کاروں کے مالک بھی تھے اور رکشا چلانے والے بھی۔ تاجر بھی تھے اور دفتر کے بابو بھی۔ کفنوک کے بیوپاری بھی تھے اور آلو چنے بیچنے والے بھی۔ غرضیکہ وہ عمارت کیا تھی ایک پوری بستی تھی، اور جیسا کہ ہر بستی میں ہوتا ہے ان کے درمیان بھی لڑائی جھگڑے ہوتے تھے۔ باہمی رنجشیں تھیں۔ امیر و غریب کا امتیاز تھا۔ انفرادی، طبقاتی اور اجتماعی کدورتیں اور اختلافات تھے۔ لیکن ان کے باوجود وہ لوگ اکھٹے اس عمارت میں رہ رہے تھے اور سب اس عمارت کے مکین کہلاتے تھے۔

اس عمارت کی نچلی منزل حسبِ دستور تاریک اور گندی تھی۔ روشنی اور ہوا کا وہاں پہ گذر ہی نہیں ہوتا تھا۔ دن میں بھی وہاں بتّیاں جلتی رہتی تھیں اور گندا اور سیلن کی وجہ سے وہاں پہ مستقل طور پر بوجھل بُو کے بخارات منڈلاتے رہتے تھے۔ اس منزل کے مکین "نیچے والے" کہلاتے تھے۔ اگر کبھی وہاں پہ دنگا فساد ہو جاتا یا شور و غل مچتا اور "اُوپر والوں" کے ہاں آیا ہوا کوئی مہمان پوچھ بیٹھتا کہ یہ شور و غل کیسا ہے تو "اُوپر والے" نفرت سے منہ بنا کر جواب دیتے "یہ نیچے والے ہیں۔ سارا دن اُودھم مچائے رکھتے ہیں ——" اگر کبھی اس عمارت میں گرم گرم بُو پھیل جاتی تو اس کا باعث "نیچے والوں" کی جھینگا مچھلی ہوتی جسے وہ بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ اور اگر کبھی اُوپر والوں کے ہاں پانی کم پہنچتا تو تب بھی بیچارے نیچے والے ہی قصوروار ٹھہرائے جاتے کیونکہ وہ سارا دن کپڑے دھوتے رہتے تھے اور ان کے نلکے کھلے رہتے تھے۔ لیکن نیچے والوں کو بھی کبھی نہ کبھی اپنے دل کا بخار نکالنے کا موقع مل ہی جاتا تھا۔ اگر بدقسمتی سے کوئی "اُوپر والی" بھولے سے یا دیدہ و دانستہ کوڑا کرکٹ یا کوئی اور ایسی ویسی چیز نیچے آنگن میں پھینک دیتی تو نیچے والیاں چلاّ اُٹھتیں "بڑی نواب زادیاں آئیں کہیں کی یہ اُوپر والیاں ——" اور وہ چیخ چیخ کر منہ اوپر کی منزلوں کی طرف اٹھائے انہیں بے نقط سُنائے چلی جاتیں اور دو چار موٹی موٹی گالیاں دینے سے بھی گریز نہ کرتیں۔ جسے سُن کر اُوپر والی نواب زادی اگر واقعی شریف زادی بھی ہوتی تو سُنی اَن سُنی کر کے چپ ہو رہتی۔ لیکن اگر وہ کچھ "اور زادی" ہوتی تو کھڑکی میں سے سر نکال کر مشین گن کی طرح تاڑ تاڑ چٹپٹی گالیوں کی ایک باڑ چلا دیتی۔ اُوپر کی متعدد منزلوں کی کھڑکیاں کھُل جاتیں اور ان میں سے رنگا رنگ کی گوری پیلی، سانولی اور کالی صورتیں آنگن میں جھانکنے لگ جاتیں اور کچھ دیر کے لئے بلڈنگ میں ہنگامی حالات پیدا ہو جاتے جو فوراً ہی خود بخود صابن کی جھاگ کی طرح نچلی منزل کی تاریکی اور سیلن میں جذب ہو جاتے۔

اس مکان کا ایک مالک بھی تھا جسے آج تک ان مکینوں میں سے شاید کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بس اتنا جانتے تھے کہ مالک کہیں اُوپر ساتویں منزل پہ رہتا تھا اور بہت بڑا آدمی تھا۔ اتنا بڑا آدمی کہ اس تک ان کی رسائی ناممکن تھی اور اس کے اُوپر آنے جانے کا راستہ بھی علیحدہ تھا

دراصل انہیں مالک سے ملنے کی کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی۔ اس چھوٹی سی بستی کا نظام کچھ اس باقاعدگی اور میکانکی انداز سے خود بخود چل رہا تھا کہ کسی مالک کے وجود یا اس کی ضرورت کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ ہاں اگر کبھی انہیں کوئی شکایت یا تکلیف ہوتی تو اسے رفع کرنے کے لئے تین آدمی موجود تھے جو اپنے آپ کو مالک کے نمائندے اور کارندے بتاتے تھے۔ یہ مالک اور مکینوں کے درمیان پیغام رسانی کا واحد ذریعہ تھے۔ لوگوں کو ان کے عہدے اور حیثیت پر کسی قسم کا شک وشبہ نہیں تھا کیونکہ وہ بہت عرصے سے اس عمارت کے نظام کو نہایت خوش اسلوبی اور ہمواری سے چلا رہے تھے۔ اور مالک کے بارے میں جو معلومات اور واقفیت انہیں حاصل تھی وہ انہیں تین نائندوں کی بدولت ان تک پہنچی تھی۔

ان تین آدمیوں میں سے پہلا آدمی تو اس عمارت کا منشی تھا جو ہر مہینے کی تیسری تاریخ کو کرایہ وصول کرنے کے لئے ہر مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا کرتا تھا۔ اس کی شکل سے اکثر لوگوں کو نفرت سی ہو گئی تھی۔ ایک تو منشی کا کام ہی کچھ ایسا تھا کہ اس کا وجود لوگوں کی نظر میں کھٹکتا تھا اور دوسرے اس کی شکل بھی کچھ کم مکروہ نہیں تھی۔ دُبلا پتلا، سیاہ رنگ کا چھوٹا سا آدمی۔ موٹے موٹے لال ہونٹوں میں سے باہر جھانکتے ہوئے لمبے لمبے زرد دانت، سیاہ حلقوں میں دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن سے چالاکی اور مکّاری ٹپکتی تھی۔ گھٹا ہوا، شکن آلود سیاہ ماتھا اور گنجا سر۔ اس کے لہجے میں کرختگی اور سختی تھی۔ نرمی اور ہمدردی اسے چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ اسے لوگوں کے غربت وافلاس، ان کی تکالیف ومصائب سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اسے ان باتوں سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اسے تو بس اپنا کرایہ وصول کرنے سے کام تھا اور اس کے نزدیک کرایہ ہی ایک ایسی کسوٹی یا معیار تھا جس کی مدد سے وہ لوگوں کے کردار اور مزاج کی جانچ پرکھ کرتا تھا۔ جو مکین کرایہ ادا کرنے میں باقاعدہ تھا وہ اس کی نظروں میں شریف تھا۔ اور جس سے کرایہ وصول کرنے میں اسے وقت پیش آتی وہ غیر شریف ہوتا۔ نیچ اور ذلیل قسم کا آدمی قرار پاتا۔ وہ ہمیشہ ہاتھ میں رسید بک اور قلم لئے ملک الموت کی طرح لوگوں کے دروازوں کے باہر منڈلاتا ہوا نظر آتا۔

منشی کے بعد جمعدار کا نمبر آتا تھا۔ وہ بھنگی کے معنوں میں جمعدار نہیں تھا بلکہ اصلی معنوں میں جمعدار تھا جیسے پولیس یا فوج کا جمعدار ہوتا ہے لمبا تڑنگا، زبردست جُثّہ کا آدمی تھا۔ اس کی لمبی لمبی تاؤ دی ہوئی مونچھوں اور باہر کو نکلی ہوئی لال انگارہ آنکھوں سے لوگ بہت مرعوب تھے۔ لیکن اس کی زبان کی مٹھاس اور شائستگی، اس کی ہمدردی اور خلوص نے اسے ہردلعزیز بنا دیا تھا۔ اس عمارت کی حفاظت اور نگہبانی کے علاوہ اس کی صفائی اور دیگر امور کی دیکھ بھال کا کام بھی اس کے سپرد تھا اور اگر کبھی ہمسایہ مکانوں سے کسی قسم کی جھڑپ یا دنگا فساد کا اندیشہ ہوتا تو وہ اپنی عمارت کی راہبری، نمائندگی اور دفاع کے فرائض بیک وقت سر انجام دیتا تھا۔ یوں تو وہ بہت حلیم الطبع اور خوش مزاج واقع ہوا تھا لیکن گاہے بگاہے جب اس پہ دورہ پڑتا تو وہ اپنی قوت وطاقت، رعب اور دبدبہ دکھانے کے لئے اس عمارت کا مطلق العنان بادشاہ ـــ بلکہ ڈکٹیٹر ـــ بن جاتا تھا اور اپنی طاقت کے نشے میں جبر وتشدد استعمال کرنے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ اور لوگ جن کی عزت وآبرو اس کی مٹھی میں تھی بلا چون وچرا سب کچھ سہہ لیتے تھے اور اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلّی دیتے کہ آخر وہ مالک کا آدمی تھا۔ اس کی اطاعت ان پہ لازم تھی۔ خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ کرے اس کی نافرمانی کسی صورت میں بھی جائز نہیں تھی۔ ممکن تھا اس میں مالک کی رضا ہو۔ اور وہ اس کی رضا پہ راضی تھے۔ لیکن یہ دورہ صرف چند دن کیلئے رہتا اور جمعدار جلد ہی اپنے معمول پر آجاتا۔

تیسرے آدمی کی شخصیت بڑی عجیب اور پُراسرار سی تھی۔ اس کے بارے میں یقینی طور پہ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ کون تھا؟ کیا تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ اس کا کام کیا تھا؟ ان سوالوں کا جواب کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کے متعلق ہر بات غیر یقینی اور غیر متعین تھی۔ حتیٰ کہ اس کے

اصلی نام سے بھی کوئی واقف نہیں تھا۔ وہ سب کے لئے "ننھے میاں" تھا حالانکہ "ننھے میاں" کی عمر کوئی پینتالیس پچاس کے لگ بھگ تھی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ مالک کے دُور دراز کے عزیزوں میں سے ہے اور اس نے اسے دردر کی ٹھوکروں اور گداگری سے بچانے کے لئے اپنے گھر میں رکھ لیا ہے۔ معلوم نہیں یہ بات کہاں تک درست تھی کیونکہ ابھی تک اس کی تصدیق نہیں ہوسکی تھی۔ بعض لوگ اسے دیوانہ اور پاگل سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ مالک نے اسے بچوں کی چھیڑ خانی اور سنگ باری سے بچاکر اپنے گھر میں پناہ دی ہے۔ مگر خیر وہ اتنا پاگل بھی نہیں تھا جتنا کہ لوگ اسے سمجھتے تھے۔ گو اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ اس کے دماغ کے کچھ کل پرزے ضرور ڈھیلے تھے۔ اس کی حرکتیں ہی کچھ ایسی تھیں جو اس خیال کی تائید کرتی تھیں۔ مثلاً کبھی تو اس کے سر پہ سادھوؤں کی سی لمبی لمبی جٹائیں اور ٹھوڑی پہ لمبی ڈاڑھی ہوتی اور کبھی کسی مہنت کی طرح ڈاڑھی، مونچھ اور سر کے بال صفاچٹ ہوتے۔ کبھی لمبا سا جبّہ پہنے، سر پر سبز عمامہ باندھے، ہاتھ میں تسبیح لئے گھوما کرتا تو کبھی گیروی لبادے میں نظر آتا اور کبھی محض ایک دھوتی پر ہی اکتفا کرتا۔ اس کا کام کوئی نہیں تھا اور لوگ اسے مجذوب اور فقیر سمجھ کر کچھ نہ کہتے۔ اکثر گھروں میں اسے آنے جانے کی کھلی آزادی تھی۔ وہ جس گھر میں جاتا وہاں گھنٹوں بیٹھ کر ان لوگوں کو اللہ سے لَو لگانے، زہدو تقویٰ اختیار کرنے اور نیکی کرنے کی تلقین کرتا اور انہیں بدی اور گناہ سے خبردار کرتا۔ اس نے کبھی اس بات کی پرواہ نہیں کی تھی کہ آیا اس کے سامعین عیسائی تھے یا مسلمان یا پارسی۔ سب لوگ اسے مجذوب سمجھ کر چپ چاپ اس کے لیکچر سنتے رہتے۔ چند عورتیں اسے پیر اور فقیر سمجھ کر اس کی معتقد ہوگئی تھیں اور اپنی ذاتی اُلجھنوں اور گھریلو مسائل کے بارے میں اس سے مشورہ لیا کرتی تھیں۔

سب سے نچلی منزل میں صحن کے چاروں طرف دو دو کمرے کے چھوٹے چھوٹے تاریک فلیٹ تھے۔ ان میں سے ایک فلیٹ میں ایک عورت رہتی تھی۔ وہ بیوہ تھی۔ اسے بیوہ ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا۔ یہی کوئی پانچ چھ ماہ ——— اس کا خاوند کسی ورکشاپ میں مستری تھا۔ وہ گزشتہ جاڑوں میں نمونیے کا شکار ہوگیا تھا۔ اس عورت کے تین بچے تھے۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ بڑا لڑکا جو اٹھارہ انیس برس کا تھا باپ کے ساتھ ہی ورکشاپ میں مستری کا کام کرتا تھا۔ خاوند کی موت کے بعد اب اس کی زندگی کا سہارا وہی لڑکا تھا۔ لڑکے نے دو تین مہینے تو بڑی شرافت اور فرمانبرداری میں گذار دیئے۔ لیکن بیٹھے بیٹھے اسے نہ جانے کہاں سے جوا کھیلنے اور شراب پینے کی لت پڑگئی کہ مسلسل کئی کئی رات گھر سے غائب رہنے لگا اور اپنی کمائی وہیں ہار یا ڈبو کر آنے لگا۔ آخر ایک دن وہ ایسا گیا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔ اب اسے گھر سے غائب ہوئے تین مہینے ہو چلے تھے۔ گھر پہ آمدنی کا کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ فاقوں تک نوبت پہنچ چکی تھی۔ پہلے ایک دو مہینے تو اس عورت نے گھر کا سامان بیچ بیچ کر پیٹ کی آگ بجھائی۔ مگر اب تو روکھی سوکھی چلانے کا یہ ذریعہ بھی ختم ہوچکا تھا اور کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کی لڑکی جوان تھی۔ سولہ سترہ برس کی۔ اور لڑکا ابھی بہت چھوٹا تھا اور کوئی بھاری کام کرنے کے قابل نہیں تھا۔ ہاں البتہ وہ خود محنت مزدوری کرسکتی تھی۔ لیکن اس میں بھی اس کی لڑکی اس کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ گھر پہ بیٹھ کر تو محنت مزدوری نہیں کرسکتی تھی۔ گھر سے باہر نکلنا لازم تھا لیکن وہ جوان لڑکی کو گھر پہ تنہا چھوڑ کر کیسے جاسکتی تھی۔ اس منزل میں بے شمار نوجوان لڑکے رہتے تھے۔ لڑکی تو دور رہی وہ اسے بھی دیدے پھاڑ پھاڑ کر کچھ ایسی لالچی اور حریصانہ نظروں سے دیکھتے تھے کہ وہ سٹپٹا اُٹھتی تھی۔ اور وہ آتے جاتے اس کے گھر میں جھانکنے کی کوشش کیا کرتے تھے اب وہ کچھ عرصے سے اپنے گھر کی کھڑکیاں دروازے مستقل طور پر بند رکھتی تھی۔ اور اس نے اپنی لڑکی کو باہر نکلنے اور تانک جھانک کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ ان حالات میں لڑکی کو گھر پہ تنہا چھوڑنا اس کے لئے کیسے ممکن ہوسکتا تھا۔

وہ بیچاری بڑی شش و پنج میں تھی۔ کرے تو کیا کرے۔ پیٹ کے جھنجھٹ کے علاوہ منشی کے مسلسل اصرار، گھُرکیوں اور دھمکیوں نے اس کی

زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ چار مہینے سے مکان کا کرایہ واجب الادا تھا اور منشی مکان سے نکال باہر کرنے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس کی پریشانی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اگر سر چھپانے کے لئے بھی جگہ نہ رہی تو ان بچوں کو لئے کہاں ماری ماری پھرے گی۔ گھر پہ کھانے کو تو کچھ تھا نہیں وہ کرایہ کہاں سے دیتی۔ تیسری تاریخ پھر آگئی تھی اور وہ خوف وہراس کے عالم میں بند دروازے کے پیچھے بیٹھی منشی کا انتظار کر رہی تھی۔

دروازے پر مخصوص انداز میں دستک ہوئی۔ وہ ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ اٹھی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ باہر منشی اپنا مکروہ چہرہ لئے کھڑا تھا "کرایہ!" وہ یخ بستہ لہجے میں بولا ـــــ "منشی جی میں کہاں سے دوں" وہ گڑگڑائی "ایک آدھ مہینہ اور صبر کرو میرا لڑکا واپس آجائے گا تو تم ـــــ " "مائی یہ کیا لڑکے بڑکے کی رٹ لگا رکھی ہے۔ تو ہر مہینے یہی کہتی ہے کہ لڑکا آئے گا تو کرایہ دے دوں گی۔ کہاں ہے تیرا لڑکا۔ تین مہینے ہو گئے تیرا لڑکا ابھی تک واپس نہیں آیا۔ مالک مجھ پہ ناراض ہوتا ہے۔ وہ مجھے جوتے لگاتا ہے۔ میں اسے کیا جواب دوں ــــ"

"منشی جی ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تمہیں اپنے بچوں کا واسطہ، کچھ دن اور ٹھہر جاؤ۔ میں کہیں سے کرائے کا بندوبست کر دوں گی۔ مالک کے پاس میری طرف سے ہاتھ جوڑ دو۔ وہ اتنا بڑا سیٹھ ہے۔ مجھ غریب کے تیس چالیس روپے نہ ملنے پر اس کا کیا بگڑ جائے گا۔ مجھے تم اس کے پاس لے جاؤ میں خود اس کی منت سماجت کر لوں گی۔ وہ ......" ـــــ "نہیں مائی اب زیادہ انتظار نہیں ہو سکتا" منشی نے سختی سے کہا "اس مہینے پیسوں کا انتظام کرو ورنہ مکان خالی کر دو" اور وہ رسید بُک کے ورق الٹتا ہوا پڑوس والوں کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔

اس نے دروازہ بند کیا اور زمین پر بیٹھ کر چپ چاپ، الجھن بھری ویران ویران آنکھوں سے چولھے پہ رکھی ہوئی ہنڈیا میں سے نکلتی ہوئی بھاپ کو دیکھنے لگی جس میں دال ابل رہی تھی۔ اب مزدوری کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ یا تو وہ کام کاج کر کے تینوں کا پیٹ بھر سکتی تھی اور مکان کا کرایہ دے سکتی تھی اور یا وہ تینوں فاقوں کی حالت میں در در کی ٹھوکریں کھا سکتے تھے۔ جوان لڑکی کے ہمراہ بے آسرا اور بے ٹھکانہ آوارگی کرنے کے خیال ہی سے وہ کانپ اٹھی۔ نہیں نہیں۔ وہ محنت مزدوری کرے گی۔ کام کی تو کمی نہیں تھی۔ اسی عمارت میں اسے بیک وقت تین چار گھروں میں کپڑا لتا دھونے، برتن مانجھنے اور جھاڑو دینے کا کام آسانی سے مل سکتا تھا۔ باقی رہا لڑکی کا سوال تو اس کا خدا حافظ تھا۔ وہ مجبور تھی۔ وہ جانتی تھی کہ منشی بڑا سخت دل آدمی تھا اور اس سے بعید نہیں تھا کہ چند دنوں میں اسے مکان سے نکال باہر کرے۔ لیکن اس مہینے تو اسے کسی نہ کسی طرح سے ٹالنا تھا۔ وہ کیوں نہ خود مالک کے پاس پہنچے اور اس کی منت سماجت کر کے اس سے ایک مہینہ کی مہلت مانگے؟ مالک مکان بڑا اچھا آدمی تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ وہ بڑا سخی، غریب پرور اور خدا ترس آدمی تھا۔ وہ ضرور اس پہ رحم کھائے گا اور ہو سکتا تھا کہ کرایہ بالکل ہی معاف کر دے! لیکن مالک تک پہنچنا بڑا دشوار تھا۔ سات منزلوں کی ان گنت سیڑھیاں طے کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا اور اس نے آج تک پہلی سیڑھی پر بھی قدم نہیں رکھا تھا۔ اسے اوپر کی دنیا سے کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا تھا۔ کبھی اوپر جانے کی خواہش ہی نہیں ہوئی تھی۔ ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ معلوم نہیں وہ کس وقت گھر پہ ملے۔ وہ ننھے میاں سے پوچھے گی۔ ننھے میاں بڑا نیک اور ہمدرد آدمی تھا۔ وہ مکینوں کے تمام دکھ سکھ اور خوشی غمی میں برابر شریک ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے اس سے کچھ عقیدت سی ہو گئی تھی۔ دراصل ننھے میاں لوگوں کے ہاتھ دیکھ کر ان کی قسمت بھی بتایا کرتا تھا۔ شاید اسے علم رمل سے تھوڑی بہت واقفیت تھی اس لئے کبھی کبھار اس کی باتیں سچ بھی نکل آتی تھیں۔ ایک بار اس نے اس کے تندرست ہٹے کٹے خاوند کا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا کہ ان لوگوں پر جلد کوئی مصیبت آنے والی ہے۔ اور اتفاق سے چند ماہ کے بعد اس کا خاوند چل بسا تھا۔ اس دن سے وہ ننھے میاں کی معتقد ہو گئی تھی۔ اور پھر اس کے بیٹے کی آوارگی اور اپنی بڑھتی ہوئی مفلسی نے اس کی عقیدت میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ وہ ہفتے میں دو ایک بار اس کے گھر آتا تھا اور وہ اس کے سامنے جو روکھی سوکھی گھر پہ موجود ہوتی رکھ دیتی جسے وہ

بسم اللہ کر کے بڑے شوق سے کھا لیتا تھا۔ اور پھر گھنٹہ آدھ گھنٹہ کے لئے نظریں نیچی کئے صبر و تحمل، قناعت اور نیکی پر وعظ کرتا۔ باری تعالیٰ کی ان گنت صفات اور نعمتیں گنواتا، اپنے مالک کی نیکی، شرافت، خدا ترسی اور غریب نوازی کے گُن گاتا اور اس کی فرمانبرداری اور اطاعت کی تلقین کرتا۔ حالانکہ اس کی لڑکی اس کے سامنے بیٹھی ہوتی اس نے کبھی آنکھ اُٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ ہاں کبھی کبھی اس کے آٹھ دس سالہ لڑکے کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے نصیحت کرتا "بیٹا اچھے لڑکے بننا۔ اپنے بھائی کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش نہ کرنا۔ ایسے لوگ ہمیشہ جہنم میں جاتے ہیں۔ ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ در در کی ٹھوکریں کھاتے ہیں" اور بچہ اس کی باتوں کو نہ سمجھتے ہوئے ٹکر ٹکر اس کا منہ تکتا رہتا۔

"بشیرن! ذرا اُٹھ کر ہنڈیا تو دیکھ لے" اس نے اپنی لڑکی سے کہا۔ وہ اپنی چھلکتی ہوئی جوانی کو سنبھالتے ہوئے کچھ اس انداز سے اُٹھی جیسے اس کے سر پر پانی سے لبالب بھری ہوئی بوجھل گاگر رکھی ہو۔ اس کے پاس سوائے اپنی جوانی کے اور کچھ نہ تھا۔ اور جوانی سے بڑھ کر حسین چیز اور کیا ہو سکتی ہے ——— ماں نے متفکر اور وسواس بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ لڑکی کی جھکی ہوئی آنکھوں پر نہ جانے کن خیالات کا بوجھ تھا۔ اس کے جسم کے بھرے بھرے تنے ہوئے اعضا کے نیچے نہ جانے کیا کیا خواہشات باہر پھوٹ نکلنے کے لئے زور لگا رہی تھیں اس کے تفکرات میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اسے گھر پر اکیلا چھوڑنا واقعی بڑا مشکل تھا اور ساتھ ساتھ لئے پھرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ مجبوری تھی "اماں!" وہ چونک پڑی۔ اس کا لڑکا باہر سے بھاگا بھاگا آیا "اماں مجھے ایک آنہ دو" ——— "ایک آنہ؟ کیا کرنا ہے؟" ——— "قلفی والا آیا ہے۔" "چل آرام سے بیٹھ" اس نے جھڑک کر کہا "اس وقت کوئی آنہ وانہ نہیں ہے" لڑکا مایوس ہو کر بسورنے لگا۔ اسے دفعتاً اس پر پیار آ گیا "نہیں بچہ آج کل موسم خراب ہے۔ قلفی کھانے کے دن نہیں ہیں۔ جا جا کر اپنا قاعدہ لے آ اور بیٹھ کر بہن سے سبق پڑھ، شاباش میرا لال!"

"مائی!" جمعدار نے دروازے میں سے اندر جھانکا ——— "کیا ہے جمعدار جی؟" اس نے دروازے میں جا کر پوچھا ——— "مائی تیرے دروازے کے باہر بہت گند پڑا ہے اسے صاف کیوں نہیں کرواتی" جمعدار نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اندر جھانکنے کی کوشش کی ——— "ابھی بھنگی آتا ہے تو اس سے صاف کرواتی ہوں" دراصل اس نے چار مہینے سے بھنگی کی تنخواہ بھی نہیں دی تھی۔ اس لئے اس نے اس کے گھر کا کوڑا کرکٹ اُٹھانے سے انکار کر دیا تھا ——— "کرایہ دے دیا؟" جمعدار نے پوچھا "نہیں جمعدار جی۔ کرایہ کہاں سے دوں؟ پیٹ بھرنا مشکل ...." ——— "مائی یہ تو بہت خراب بات ہے۔ مالک ہم پر بہت ناراض ہوتا ہے۔ ہم بھی تو مجبور ہیں۔ ہمارے اختیار میں تو یہ بات نہیں۔ کل اگر وہ ہمیں بھی نکال باہر کرے تو ——— ؟" ——— "جمعدار جی میں خود مالک کے پاس جاؤں گی اس سے منت" ——— "نہیں مائی! اس کے پاس مت جانا۔ وہ بہت ناراض ہوگا۔ ہم جو ہیں۔ جو بات کہنی ہے ہم سے کہو۔ ہم اس تک پہنچا دیں گے۔ کسی کرایہ دار کو اس کے گھر جانے کی اجازت نہیں۔ مائی وہ بہت بڑا آدمی ہے، سُنا؟ اسے اور بھی بہت سے کام ہیں۔ وہ صرف ہمارا تمہارا مالک ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگوں کا مالک ہے۔ اس جیسی کئی بلڈنگوں کا مالک ہے۔ اور پھر اس سے ملنا کوئی آسان کام نہیں۔ وہ دن بھر گھر سے غائب رہتا ہے۔ آدھی رات کو کہیں جا کر گھر لوٹتا ہے" ——— "تو پھر میں کیا کروں؟" وہ شکستہ آواز میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے تھے "تم ہی کچھ رحم کرو۔ کم از کم ایک مہینہ اور انتظار کر لو۔ میں کہیں کام کاج کروں گی۔ خدا نے چاہا تو اگلے مہینے سے تھوڑے تھوڑے پیسے دے کر تمہارا کرایہ ادا کر دوں گی" جمعدار ایک ہاتھ سے اپنے ڈنڈے کو زمین پر مارتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا "مائی تو اس چھچھ کرے کو کہیں نوکر کیوں نہیں رکھوا دیتی۔ اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ سارا دن آوارہ گردی کرتا ہے۔ کہیں دو چار پیسے کما لے تو کیا بُرا ہوگا" ——— "ابھی تو چھوٹا ہے کیا کام کرے گا؟" ——— "نہیں مائی چھوٹا کہاں،

اتنے اتنے لڑکے تو دن میں دو دو روپے کما لیتے ہیں۔ کہو تو میں اسے کہیں رکھوا دوں۔ مہینے کے دس پندرہ روپے اور دو وقت کا کھانا مل جائے گا۔" ——— "سچ مچ؟" عورت نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے حیرت سے پوچھا ——— "ہاں مالک کے گھر نوکروں کی جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے وہاں ....." ——— "مالک کے گھر؟" ——— "ہاں ——— اس کے گھر تو نوکروں کی فوج ہے فوج ——— مائی وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ بڑا دھنی ہے۔ کئی نوکر تو یونہی اس کے گھر پڑے رہتے ہیں۔ ان کا کام کاج کوئی نہیں۔ بس مالک کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں۔ وہاں ایک آدھ چھوکرا اور چلا گیا تو کون سا فرق پڑ جائے گا" ——— "ارے عبدو ادھر آ" ماں نے لڑکے کو پکارا۔ اس کا اصلی نام عبداللہ تھا۔ وہ دانتوں میں انگلی دابے سہمی ہوئی نظروں سے جمعدار کی مونچھوں کی طرف دیکھتا ہوا دروازے میں آیا ——— "کیوں بے کام کرے گا؟" جمعدار نے اس کے لال لال گالوں میں چٹکی بھرتے ہوئے پوچھا۔ لڑکے نے اس کی طرف خالی خالی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے سر ہلا دیا "مائی تو تو کہتی تھی کہ چھوٹا ہے۔ یہ تو جوان آدمی ہے جوان!" اس نے ایک بار پھر اس کے گالوں میں چٹکی بھری "اچھا تو مائی اسے کل نہلا دھلا کر تیار کر دینا۔ میں اسے مالک کے گھر لے جاؤں گا" اور وہ ڈنڈا بغل میں دبا کر چل دیا۔ لیکن چند قدم چل کر رک گیا "اور دیکھنا مائی اس کے گھر جانے کی کوشش نہ کرنا۔ سنا؟ اگر وہ ناراض ہو گیا تو ہم سب کی شامت آ جائے گی۔ تو فکر نہ کر۔ میں اس سے بات کروں گا۔" ——— "جمعدار جی! آپ منشی کو بھی سمجھا دیں۔ بہت تنگ کرتا ہے۔ بس ایک مہینے کی ......" ——— "اری تو منشی کی فکر نہ کر۔ وہ تیرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ یہاں میرا حکم چلتا ہے۔ اور وہ سالا منشی تو چور ہے چور۔ کرائے میں سے پیسے کھا جاتا ہے۔ مالک اس سے بہت تنگ آ گیا ہے۔ کسی دن نکال باہر کرے گا۔ تو تسلی رکھ۔ میں کوشش کروں گا" اور وہ جنگلے پر اپنا ڈنڈا کھٹکھٹاتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"کیوں بہن کیا بات تھی؟" اس کی کرسٹان ہمسائی نے پوچھا۔ وہ رات کے بچے ہوئے باسی چاول دروازے کے باہر ڈھیری کر رہی تھی ——— "کرائے کی بات ہو رہی تھی، کیوں تم نے کرایہ دے دیا؟" اس نے پوچھا ——— "نہیں بہن کہاں سے دیتے کرایہ۔ مگر اب آئندہ ہمیں کرائے کی فکر نہیں رہے گی" ——— "کیوں؟" ——— "تمہیں نہیں معلوم؟ ہماری جوُن نوکر ہو گئی ہے۔ اب کرایہ ہر مہینے اس کی تنخواہ میں سے کٹ جایا کرے گا" ——— "کہاں نوکر ہوئی ہے؟" ——— "مالک کے گھر!" پڑوسن نے رازدارانہ انداز میں کہا "خدا ننھے میاں کا بھلا کرے اس نے ہمیں آ کر بتایا تھا کہ مالک کو بچوں کے لئے آیا کی ضرورت ہے۔ اور کہا تھا کہ وہ جوُن کو وہاں نوکر کروا سکتا ہے۔ سو ہم نے جوُن کو وہاں بھیج دیا" اس نے انگلی سے اوپر کی طرف اشارہ کیا "چلو بہن اچھا ہوا۔ کم از کم کرائے کی مصیبت تو کٹی۔ اسے تیس روپے تنخواہ ملے گی اور دو وقت کا کھانا" ——— "تم خود وہاں گئی تھیں؟ اس نے اوپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ——— "نا بہن میں وہاں کیسے جاتی۔ مالک پسند نہیں کرتا۔ وہ بہت بڑا دھنی ہے بہن! اس تک ہماری پہنچ نہیں۔ اور پھر ان بوڑھی ہڈیوں سے میں وہاں تک کیسے پہنچتی۔ میرا تو راستے ہی میں دم نکل جاتا۔ ننھے میاں کا خدا بھلا کرے اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ بہت اچھا آدمی ہے ——— "

وہ اپنے گھر واپس آ گئی۔ ہوں! تو یہ بات ہے۔ نوکر ہو گئی ہے، جبھی اتنے دنوں سے دکھائی نہیں دی۔ نہ معلوم یہ لوگ کیسے اتنی لاپرواہی اور اطمینان سے اپنی جوان لڑکیوں کو نوکر کروا دیتے ہیں۔ اس نے اپنی لڑکی کی طرف دیکھا جو بیٹھی اپنی قمیص میں ٹانکے لگا رہی تھی۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ مالک ہزار مالک سہی پھر بھی ——— مگر ننھے میاں کو تو سب کچھ معلوم ہوگا۔ وہ اس کے گھر کے حالات سے پوری طرح واقف ہوگا۔ وہ کبھی کوئی غلط بات نہیں کہتا۔ الٹا سیدھا مشورہ نہیں دیتا۔ اگر وہ بشیرن کے لئے بھی کوئی اچھی سی نوکری ...... نہیں نہیں۔ جوان لڑکی کو کیسے ......؟ مگر اس میں ہرج ہی کیا ہے اور پھر تیس روپے بھی کوئی بری چیز نہیں ——— اگر پندرہ روپے رحیم کو ملنے لگیں اور بیس پچیس کی

نوکری میں کہیں کر لوں تو — ساٹھ ستر روپے ماہوار! زندگی کے دن اطمینان سے کٹ جائیں گے ——— " مائی تو کس سوچ میں پڑی ہے؟" وہ چونک پڑی۔ ننھے میاں دروازے میں کھڑا تھا — "آئیے بیٹھئے میاں جی" اس نے پیڑھی کھینچ کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ننھے میاں بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ تسبیح کے دانے کھٹکھٹا رہے تھے اور لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ نظریں فرش پر جمی ہوئی تھیں — "مائی کس فکر میں ہو؟" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولا ——— "وہ آج منشی پھر آیا تھا۔ کرایہ مانگ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اگر اس مہینے کرایہ نہ دیا تو مکان خالی کرنا پڑے گا" اس نے دکھ بھری روہانسی آواز میں کہا "میاں جی آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہماری کیا حالت ہے۔ دو وقت کا کھانا بھی پیٹ بھر کر نصیب نہیں ہوتا۔ اب اگر سر چھپانے کی جگہ بھی نہ رہی تو ان بچوں کو لے کر کہاں ٹھوکریں کھاتی پھروں گی" ——— "مائی تو وسواس نہ کر۔ خدا پر بھروسہ رکھ۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ اس کی نعمتوں سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ جہاں اس نے کھانے کے لئے اتنے منہ دئے ہیں وہاں رزق بھی مہیا کرے گا۔ اس کے رنگ بڑے نرالے ہیں جو اس کے در پہ پہنچتا ہے کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔ صبر اور حوصلے سے کام لے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ دکھ سکھ دھوپ چھاؤں کی طرح ہیں۔ آتے جاتے رہتے ہیں" ننھے میاں کے الفاظ نے اس کی ڈھارس بندھائی اس نے عقیدت اور امید بھری نظروں سے اس کے جھکے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا "میاں جی آپ منشی کو ذرا سمجھا دیں۔ میں کل سے کہیں کام کاج شروع کر دوں گی اور اللہ نے چاہا تو عبدو کو بھی کام مل جائے گا۔ اگلے مہینے پیسوں کی کچھ آس ہو جائے گی۔ بس ایک ...!" ——— "مائی منشی کیا چیز ہے! وہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں مالک سے کہہ دوں گا۔ وہ اپنا آدمی ہے۔ بڑا نیک اور شریف ہے۔ بڑا رحمدل اور سخی ہے۔ وہ مجھے بہت مانتا ہے۔ ہر بات میں مجھ سے صلاح مشورہ لیتا ہے۔ یہ منشی اور جمعدار تو دونوں بدمعاش ہیں۔ چڑ اچکے ہیں۔ مالک ان سے بہت تنگ آ گیا ہے۔ اگر میں اسے نہ روکتا تو اس نے کبھی کا ان دونوں کو نکال دیا ہوتا۔ مجھے ان پر رحم آ گیا۔ سوچا غریب آدمی ہیں خواہ مخواہ روزی ماری جائے گی۔ شاید خود بخود سدھر جائیں۔ میں انہیں روز ......" ——— "مگر میاں جی جمعدار تو اتنا برا آدمی نہیں" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی "اس نے عبدو کو نوکر کرانے کا وعدہ کیا ہے" ——— "عبدو کو نوکر؟ کہاں؟" اس نے حیرت سے پوچھا — "مالک کے گھر" — وہ خاموش سر ہلانے لگا — "میں نے سوچا تھا کہ میں خود اسے وہاں لے جاؤں اور مالک کو اپنی بپتا بھی سناؤں لیکن ......" ——— "نہیں نہیں مائی۔ وہاں مت جانا" وہ جلدی سے بول اٹھا "مالک کے گھر آنے جانے کی سخت ممانعت ہے۔ مالک کو ناراض نہیں کرنا چاہئے۔ پروردگار کا حکم ہے کہ اپنے آقا کی تابعداری اور اطاعت کرو۔ اور پھر مالک تو بہت بڑا آدمی ہے۔ اس کی جناب میں تیری رسائی ممکن نہیں۔ جو کہنا ہے ہم سے کہہ۔ ہم اسی کام کے لئے مقرر کئے گئے ہیں" ——— "میاں جی آپ کی بڑی مہربانی ہے۔ یہاں آپ کے سوا ہمارا کون ہے! اگر آپ کی مدد نہ ہوتی تو نہ جانے ہمارا کیا حال ہوتا" ——— "مائی میں کیا چیز ہوں۔ یہ تو سب اس مالک کی مہربانی اور عنایت ہے جس کا میں ادنیٰ غلام ہوں اور جس کے گھر میں تو رہ رہی ہے" ——— عورت کچھ سوچ رہی تھی "میاں جی آپ نے پڑوسیوں کی لڑکی کو نوکر کرایا ہے؟" ——— "ہاں مائی وہ لوگ بڑی مصیبت میں تھے۔ کئی مہینوں سے کرایہ بھی نہیں دیا تھا۔ مالک کے گھر آیا کی ضرورت پڑی تو میں نے سوچا چلو اسے وہاں رکھوا دوں۔ انہیں کچھ تو سہارا ملے گا" ——— "میاں جی، مالک کے گھر والے کیسے ہیں؟" ——— "بڑے شریف اور خدا ترس لوگ ہیں۔ اس کا کنبہ بہت بڑا ہے اور نوکروں کا تو کوئی شمار نہیں۔ روز نوکر آتے جاتے رہتے ہیں کام کاج کچھ نہیں ہے مفت کی کھاتے ہیں۔ مالک کا گھر کیا ہے خیراتی لنگر ہے۔ جس کا جی چاہے آ کر کھا لے" ——— "میں سوچ رہی تھی" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی "میں سوچ رہی تھی کہ — اگر — ب — بشیر — ن کے لئے — کوئی؟" ——— "نوکری؟ —

ہاں۔ ہاں۔ یہ کوئی بُری بات نہیں۔ کہو تو آج ہی رکھوائے دیتا ہوں۔ بیس پچیس روپے تو مل ہی جائیں گے اور —— کھانا پکانا جانتی ہے؟"
—— "جی ہاں گھر کا کھانا پکانا یہی کرتی ہے"۔ —— "تو بس پھر کل میرے ساتھ بھیج دو"۔ —— "اچھا!" اس نے اٹکتے ہوئے غیر یقینی لہجے میں کہا "میاں جی آپ تو ہمارے مائی باپ ہیں۔ یہ بھی آپ ہی کی بچی ہے۔ اس کا خیال رکھیں گے؟"۔ —— "مائی تو کوئی فکر نہ کر۔ جب تک میں یہاں پہ ہوں کسی کی مجال نہیں کہ دوسرے کی بہو بیٹی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے" وہ احسان مندی اور عقیدت کے بوجھ سے جھک گئی —— "کیا پکایا ہے آج؟" —— "دال چڑھائی ہے" —— اری بشیرن ذرا اُٹھ کر ہنڈیا کی خبر تو لے —— عبدو! ذری بھاگ کر تنور سے دو روٹیاں پکڑ لا۔ یہ لے دو آنے۔ شاباش بیٹا۔ بھاگ کر جائیو"۔ —— "نہیں مائی تو رہنے دے" اس نے اپنے لبادے کی جیب میں سے اٹھنی نکال کر لڑکے کو دیتے ہوئے کہا "یہ لے بیٹا۔ آٹھ روٹیاں لے آ۔ تم لوگ بھی تو آخر کھاؤ گے نا؟"
وہ عورت کی استفہامیہ نظروں کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

شام پڑ چکی تھی۔ وہ کھانے پکانے سے فارغ ہو کر دروازے کی دہلیز میں آن بیٹھی۔ عبدو سو گیا تھا اور بشیرن فرش پر بستر بچھا رہی تھی گندے، غم آلود آنگن میں سے سیلی سیلی بُو اُٹھ رہی تھی۔ دروازوں کے آگے دن بھر کے جمع کئے ہوئے کوڑا کرکٹ کی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں۔ آنگن کے چاروں طرف کمروں میں سے ہنسنے، بولنے، چلانے اور گالی گلوچ کا ملا جُلا شور نکل کر اس بلند عمارت کے کونوں میں گونج رہا تھا۔ کوئی بچہ رو دیا۔ کوئی مرد گرج اُٹھا۔ کوئی عورت چلائی، کہیں برتن کھنکھنائے۔ کسی نے قہقہہ لگایا، کہیں بتی جل اُٹھی اور کہیں بجھ گئی۔ وہ کونوں کی تہہ میں بیٹھی دیواروں میں جڑی ہوئی روشن کھڑکیوں اور روشندانوں کو دیکھتی رہی اور مختلف آوازیں سنتی رہی۔ سامنے سیڑھیاں بل کھاتی ہوئی اُوپر چڑھ رہی تھیں۔ ہر منزل پر ایک بلب روشن تھا۔ سیڑھیوں پر بھاری بھاری قدموں کی آواز آئی۔ کوئی چڑھنے لگا۔ پہلی منزل پر پہنچ کر اس نے بلب کے نیچے کچھ دیر رُک کر اپنی سانس برابر کی۔ کوئی ضعیف آدمی تھا۔ سفید داڑھی اور جھکی ہوئی کمر۔ وہ پھر چڑھنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد وہ دوسری منزل پر روشنی کے حلقے میں نمودار ہوا اور جنگلے پر سے جھک کر نیچے جھانکنے لگا۔ وہ منزل بہ منزل بڑھتا گیا۔ وہ دیکھتی جا رہی تھی اور اس کا سر پیچھے کو ڈھلکتا جا رہا تھا۔ چوتھی منزل کے بعد اس نے بہت دیر تک اس کا انتظار کیا لیکن وہ پھر نظر نہ آیا۔ دور کسی دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے اپنی اکڑی ہوئی گردن سیدھی کر لی اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اُوپر کیسے لوگ رہتے ہیں؟ اس نے سوچا۔ اس نے آج تک ان سیڑھیوں پر قدم رکھ کر نہیں دیکھا تھا۔ مالک کے بارے میں روز باتیں سُن سُن کر اس کا اچنبھا بڑھتا جا رہا تھا۔ اُوپر جانے کی خواہش قوی اور شدید ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی حیرت اور اچنبھے کی تسکین کرنا چاہتی تھی۔ اُوپر کیسے لوگ رہتے ہیں؟ کیسے مکان ہیں؟ سب سے بڑھ کر تو مالک کو دیکھنے کی خواہش تھی۔ مالک جو بہت بڑا آدمی تھا۔ کتنا بڑا؟ وہ کچھ صحیح اندازہ نہ لگا سکی۔ وہ بڑا نیک دل اور خدا ترس آدمی تھا غریبوں سے اسے بڑی ہمدردی تھی اور ہمیشہ ان کی مدد کیا کرتا تھا۔ اس کی یہی عنایت اور مہربانی کیا کم تھی کہ اس نے ان کے رہنے کے لئے مکان —— اتنا بڑا مکان بنوا دیا تھا۔ عید، شب برات کے موقع پر اس آنگن میں دیگیں چڑھتی تھیں جو صرف "نیچے والوں" کے لئے مخصوص ہوتی تھیں۔ جاڑوں میں گرم کپڑے تقسیم کیا کرتا تھا۔ گرم کوٹ، چادریں۔ کمبل اور لحاف وغیرہ۔ سب "نیچے والوں" کے لئے۔ لیکن خود مالک کو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ یہ سب کام اس کے کارندوں کے ذریعے ہوتے تھے۔ معلوم نہیں وہ کیسا ہوگا؟ بالکل میکانکی طور پر اس کے ذہن میں ایک تصویر اُبھری۔ سفید پُر نور چہرے پر سفید داڑھی۔ سر پر سنہری پگڑی، سیاہ یا سفید اچکن میں ملبوس!

مگر وہ اس تک کیسے پہنچے؟ اس نے منع جو کر رکھا تھا۔ لیکن کیوں منع کر رکھا........ "اماں بتی بجھا دوں؟" بشیرن نے اندر سے پوچھا
——— "ہاں!" وہ بولی۔ اس کے سامنے آنگن میں جو روشنی کی مستطیل پھیلی ہوئی تھی اور جس کے چوکھٹے میں اس کا اپنا سایہ نظر آ رہا تھا غائب ہو گئی۔ ابھی تک آنگن کے چاروں طرف روشنی کی کئی ایسی مستطیلیں باقی تھیں جن میں سے گاہے بگاہے کوئی سایہ گزر جاتا تھا۔ سامنے فلیٹ کے کھلے دروازے میں سے ایک کالا کلوٹا آدمی لنگوٹی باندھے کرسی پر بیٹھا نظر آ رہا تھا اور تیل مالش والے سے چمپی کروا رہا تھا۔ بازو والے فلیٹ میں سے مچھلی کی بُو کے بھبکے آ رہے تھے۔ دائیں طرف دروازے میں ایک ننگ دھڑنگ بچہ زمین پر لیٹا ہوا اپنی ٹانگیں ہلا ہلا کر پورے زور سے چلّا رہا تھا۔ اس کا باپ کہیں اندر سے کڑک کر بولا۔ بچے کی آواز فوراً بند ہو گئی اور وہ بے حس و حرکت فرش پر اوندھا لیٹا آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگا۔ اس نے مڑ کر اپنے لڑکے کی طرف دیکھا۔ وہ گٹھڑی بنا فرش پر بے خبر سو رہا تھا۔

چلو اچھا ہوا دونوں کا کام بن گیا۔ آمدنی کا کوئی وسیلہ تو ہوا۔ کل دونوں مالک کے گھر جائیں گے۔ لڑکے کو جمعدار کے ہمراہ بھیجنے میں تو اسے کوئی تامل نہیں تھا لیکن بشیرن کو اکیلا اُوپر بھیجنے میں اسے ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ خواہ وہ ننھے میاں کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو جس کی شرافت اور پارسائی پر اسے پُورا پُورا یقین تھا۔ لڑکی بہرحال لڑکی تھی۔ غیروں کے ہاتھوں میں خواہ وہ ہاتھ کتنے ہی قابل اعتماد اور قابل یقین کیوں نہ ہوں، وہ اپنی لڑکی کو کیونکر سونپ سکتی تھی۔ وہ ایک تذبذب میں تھی۔ معاً اسے خیال آیا۔ میں خود کیوں نہ ہو آؤں؟ صبح سے پہلے پہلے چُپ چاپ مالک سے خود بات کر آؤں؟ شاید میری نوکری کا سبب بھی بن جائے۔ اگر میں بھی وہیں ٹِک جاؤں تو مجھے بشیرن کی فکر بھی نہیں رہے گی۔ وہ دن بھر میری نظروں کے سامنے رہے گی۔ مگر اس نے منع جو کر رکھا ہے؟ تو کیا ہوا۔ کوئی جن بھوت تو ہے نہیں کہ کھا جائے گا۔ اگر ایک بار اس کے گھر پہنچ جاؤں تو باہر تھوڑی نکال دے گا۔ ہو سکتا ہے مانگنے والے اسے بہت تنگ کرتے ہوں اس لئے اس نے لوگوں کا آنا جانا بند کر دیا ہو۔ لیکن میں بھک منگی تو نہیں ہوں۔ اس کے کرایہ داروں میں سے ہوں۔ کچھ مانگنے تھوڑی جا رہی ہوں۔ میں تو مالک کو دیکھنے جاؤں گی۔ اس کو، اس کے گھر کو اور گھر والوں کو، کہ کیسے لوگ ہیں۔ کیسا رہن سہن ہے۔ وہ بہت دیر تک بیٹھی اس خیال سے کھیلتی رہی اور نیم تاریک بل کھاتی ہوئی پُراسرار سیڑھیوں کو دیکھتی رہی جو اُوپر جاتی تھیں جہاں مالک رہتا تھا۔

آنگن میں سے روشنی کی مستطیلیں ایک ایک کر کے غائب ہو گئیں۔ دروازے بند ہو گئے۔ شور و غل اور چیخ و چلّاہٹ مدھم ہو کر دبی دبی، سوئی سوئی، تھکی تھکی سرگوشیوں میں تبدیل ہو گئے۔ کنوئیں کی تہہ میں اندھیرا چھا گیا تھا اور اس کی بلند دیواروں میں ابھی تک اکی دُکی روشنی نظر آ رہی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کوئی روشن کھڑکی ہلکی سی "ٹک" کی آواز کے ساتھ اندھی ہو جاتی۔ باتوں کی بھنبھناہٹ، بلغم بھری کھانسی کی آواز، سیڑھیوں میں قدموں کی گونج، بچے کی بلبلاہٹ پر ماں کی خواب آلود جھنجھلاہٹ ——— وہ ان دبی دبی پُراسرار آوازوں کو سُن رہی تھی۔ رفتہ رفتہ کنوئیں کی تاریکی میں خاموشی کا اضافہ ہونے لگا۔ خاموش، بھیگی بھیگی، بدبُودار تیرگی تہہ میں سے اُٹھ کر دیواروں کے ساتھ ساتھ اُوپر کی طرف رینگنے لگی اور تیرگی کے اس خاموش سیلاب نے کئی روشن کھڑکیوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ بل کھاتی ہوئی سیڑھیوں کے چھ بلب ابھی تک روشن تھے۔ روشنی کے چھ حلقے ایک دوسرے کے اُوپر معلّق تھے اور ان روشن حلقوں کے درمیان لمبے لمبے تاریک وقفے تھے۔

اب موقع ہے۔ اس نے سوچا۔ اب جانا چاہیئے۔ کوئی دیکھنے والا نہیں اور اب تک شاید مالک بھی گھر واپس آ گیا ہو۔ اگر مالک سے ملاقات نہ ہو سکی تو نہ سہی کم از کم اُوپر کا حصّہ تو دیکھ آئے گی۔ اس کے گھر کا راستہ تو معلوم ہو جائے گا۔ شاید اس کے کنبے کے کسی فرد ہی سے

ملاقات کا شرف حاصل ہو جائے - وہ اُٹھ کھڑی ہوئی - اگر ناراض ہوگا تو دیکھا جائے گا - کہہ دوں گی کہ مجھے کچھ علم ہی نہیں تھا - بس اپنے مالک کا گھر سمجھ کر چلی آئی - اس نے دروازے میں سے اندر جھانکا - دونوں بچے آرام سے سو رہے تھے - اس نے دروازہ بند کیا اور ننگے پاؤں گیلے چپچپاتے ہوئے صحن میں سے گذر کر سیڑھیوں کی طرف گئی - اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پہلی سیڑھی پر قدم رکھا - اور آہستہ آہستہ اُوپر چڑھنے لگی -

پہلی منزل پر پہنچ کر اس نے جنگلے پر سے جھکتے ہوئے نیچے اندھیرے کنوئیں میں دیکھا - وہاں گہری خاموشی طاری تھی - وہ آگے بڑھ گئی - تیسری منزل پر پہنچ کر وہ ہانپنے لگی اور سانس برابر کرنے کے لئے جنگلے کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی - کنوئیں کی تہہ اور بھی تاریک ہو گئی تھی آنگنوں میں سے گرم، بوجھل، سیلی سیلی بُو کے بخارات اُٹھ رہے تھے - کہیں سے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی - دور بند دروازوں اور تاریک دالانوں کے عقب میں کوئی چارپائی چرچرائی - کوئی بچہ منمنایا - وہ پھر چل پڑی -

بس ایک منزل اور - اس نے چھٹی منزل پر پہنچ کر رُکتے ہوئے سوچا - اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا - اس کے پاؤں بوجھل ہو گئے تھے - بائیں طرف پہلو میں ہلکی سی ٹیسیں اُٹھ رہی تھی - اس نے جنگلے کے اوپر سے جھک کر دُور تاریکی میں اپنے مکان کا دروازہ ڈھونڈنے کی کوشش کی - مگر وہاں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا ——— میں وہاں نیچے رہتی ہوں ؟ اس نے حیرت سے سوچا - یہاں اُوپر سے وہ جگہ کتنی عجیب لگ رہی ہے - اندھیرا، گند، سیلن، بو ——— اور میں اس اندھیرے اور سڑاند میں رہتی ہوں مگر اُوپر والے لوگ کتنے خوش نصیب ہیں - اس نے اپنے پسینے میں بھیگے ہوئے ماتھے پر نم آلود ہوا کی ٹھنڈک محسوس کرتے ہوئے سوچا - یہاں ہوا ہے - روشنی ہے - اور پھر مالک اتنا قریب ! جب جی چاہا مالک سے مل لئے ——— یہ اُوپر والے تو مالک کے پاس روز آتے جاتے ہوں گے - نہ جانے مالک کے دروازے کے باہر کوئی پہرہ دار بھی ہو گا یا نہیں ؟ اگر کسی نے روکا تو ؟ خدا کرے کوئی پہرے دار نہ ہو - اگر وہی جمعدار ہوا تو ؟ نہیں وہ تو اس وقت نیچے دروازے کے باہر سو رہا ہو گا - اس نے دوپٹے سے اپنا پسینہ پونچھا اور قدم بڑھا دئیے -

وہ روشنی کے آخری حلقے میں کھڑی تھی - ہانپ رہی تھی - اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں - دل ڈوب رہا تھا - خنک ہوا کے جھونکے اس کے بالوں کو اُڑا رہے تھے - اب اسے مالک سے ڈر لگ رہا تھا - اگر وہ ناراض .... ؟ واپس چلی جاؤں ؟ نہیں ——— اب اسے دیکھے بغیر واپس نہیں جاؤں گی - اتنی دُور آ کر بھی خالی ہاتھ لوٹ جاؤں ؟ اس کے سامنے کنوئیں کے کھلے منہ میں سے سرمئی آسمان کا چوکور ٹکڑا نظر آ رہا تھا جس میں جڑے ہوئے تارے جگمگا رہے تھے - آسمان اس کے لئے نئی چیز تھی - تاروں بھرا آسمان دیکھے اسے مدتیں ہو گئی تھیں - بھلا نیچے والوں کو کھلے آسمان کا نظارہ کہاں نصیب ہو سکتا تھا - سیڑھیاں آگے جا کر کھلی چھت پر ختم ہو جاتی تھیں - اس نے منہ موڑا سامنے دیوار میں ایک بڑا سا دروازہ تھا جس پر پیتل کی پلیٹ چمک رہی تھی - دروازے کے نیچے روشنی کی لکیر نظر آ رہی تھی - چلو پہرہ دار تو نہیں ہے - اس نے اطمینان سے سوچا اور آگے بڑھی - اندر سے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں - داہنے ہاتھ دیوار میں ایک اور چھوٹا سا دروازہ تھا اس نے دستک دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا - ہاتھ لگتے ہی دروازہ ذرا سا کھل گیا - اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دروازے کو آہستہ سے دھکیلا اور اندر جھانکا - سامنے تاریکی تھی مگر بائیں ہاتھ دروازے میں سے روشن کمرے کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا - وہ اور آگے بڑھی اور رُک گئی - سامنے ایک آدمی میز پر جھکا ہوا تھا - میز پر کاغذوں کی ڈھیری تھی - وہ منشی تھا - اسے حیرت ہوئی - کیا منشی مالک ہی کے گھر میں رہتا ہے ؟ اس نے سوچا - وہ خاموش تھا - باتوں کی آواز کہیں اور سے آ رہی تھی - وہ اور آگے بڑھی - اسے ایک اور میز نظر آئی - میز پر بوتل پڑی تھی اور

ایک گلاس جس میں زرد زرد رنگ کی کوئی شے چمک رہی تھی۔ میز کے نیچے کسی کی ننگی بالوں بھری ٹانگیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ آگے کی طرف جھک گئی۔ اس کی نظر ٹانگوں پر سے ہوتی ہوئی ٹانگوں کے مالک کے چہرے پہ جا رکی۔ وہ ٹھٹھک گئی۔ بڑی بڑی مونچھیں اور لال لال آنکھیں ـــــ ارے یہ جمعدار بھی یہاں ہے؟ اس نے مایوسی سے سوچا۔ وہ لنگوٹی باندھے بیٹھا تھا اور مسکرا مسکرا کر ایک بارہ تیرہ سال کے لڑکے کے گالوں کو مسل رہا تھا۔ لڑکا اس کے پاس سٹول پر بیٹھا اس کی رانیں داب رہا تھا۔ اس کے گال دہک رہے تھے۔ وہ تاریک برآمدے میں بڑھ گئی۔ روشن کمرے میں بائیں ہاتھ چارپائی کا پایہ نظر آیا۔ وہ اور آگے جھکی۔ چارپائی کے اوپر ایک ننگا پاؤں اور اس سے آگے ایک سڈول ننگی ٹانگ جس پہ ایک بالوں بھرا ہاتھ دھیرے دھیرے رینگ رہا تھا ـــــ "کون ہے؟" منشی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چند سکے چھن سے فرش پہ گرے اور دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ وہ وہیں زمین میں گڑی کی گڑی رہ گئی۔ چارپائی سے دو ننگی ٹانگیں اتریں اور فرش پر ٹک گئیں۔ اس کے سامنے روشنی میں ایک نیم برہنہ لڑکی کھڑی تھی۔ صرف کولھوں کے گرد ایک چھوٹا سا کپڑا بے احتیاطی سے لپیٹا ہوا تھا۔ اس نے پہچان لیا۔ وہ اس کے پڑوسیوں کی لڑکی جمن تھی۔ اس لڑکی نے جلدی سے اپنے آپ کو ایک چادر میں لپیٹ لیا۔ "کون ہے منشی جی؟" لڑکی کے عقب میں سے آواز آئی۔ وہ ننھے میاں کی آواز کو پہچان گئی۔ وہ آگے کمرے کی روشنی میں بڑھ گئی۔ ننھے میاں پلنگ پر بیٹھے اپنا تہمد ٹھیک کر رہے تھے ـــــ "اری تو یہاں کیسے آ گئی؟" منشی نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ لڑکی اس کی طرف پھٹی پھٹی مجوب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ جمعدار اسے لال لال آنکھوں سے گھور رہا تھا اور لڑکا خالی خالی معصوم آنکھوں سے تک رہا تھا ـــــ "میں مالک سے ملنے آئی ہوں" اس نے جواب دیا ـــ

"مالک؟" منشی نے اس کی طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھا ـــــ "ہاں! کہاں ہے مالک؟ یہیں رہتا ہے نا؟" ـــــ "ہاں یہیں رہتا ہے" ننھے میاں نے چارپائی پہ لیٹے لیٹے جواب دیا ـــــ "جمو تو یہاں سے چلی جا" لڑکی نے التجا سے کہا "تو یہاں کیوں چلی آئی؟ یہاں تو........" ـــــ "چپ رہ چھوکری۔ زیادہ باتیں نہ بنا" اور ننھے میاں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے چارپائی پہ کھینچ لیا۔ اس نے استفسار اور حیرت بھری نظروں سے منشی، جمعدار اور ننھے میاں کی طرف باری باری دیکھا ـــ "مالک یہیں رہتا ہے" منشی زمین پہ سے گرے ہوئے سکے چنتے ہوئے بولا ـــ "کہاں ہے؟ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں" ـــ "بُرا ـ بُرا تم چلی جاؤ۔ ناحق اپنے آپ پہ ظلم......" ـــ "خاموش!" ننھے میاں نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا اور اسے کھینچ کر اپنے برابر لٹا لیا۔ دفعتاً ایک زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ وہ لرز گئی ـــ جمعدار سر کرسی کی پشت پہ پھینکے منہ چھت کی طرف کئے ہنسے جا رہا تھا "مائی ما ـــ مالک یہ بیٹھا ہے" اس نے اپنے سینے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا "ب ـ ب ـ بول کیا ـ چ ـ چ ـ چاہتی ہے تو؟" ـــ "تم ـــ تم مالک ہو؟؟" اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا ـــ "نہیں مائی یوں ہی بکتا ہے" منشی کرسی پہ بیٹھا نوٹوں کی گڈیوں سے کھیل رہا تھا "تم اس کی طرف مت دھیان دو۔ اس وقت پیئے ہوئے ہے۔ اس عمارت کا اصلی مالک تو میں ہوں" اس نے نوٹوں اور سکوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــ "تم؟ تم ما......؟" ـــ "نہیں مائی" ننھے میاں اٹھ کر بیٹھ گیا "یہ دونوں بکواس کر رہے ہیں۔ چور اچکے بدمعاش کہیں کے۔ مالک میں ہوں۔ یہ دونوں غنڈے میرے نوکر ہیں" ـــ اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکتی جا رہی ہو اور وہ تاریک گہرائیوں میں ڈوبتی جا رہی ہو۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ دل نیچے ہی نیچے بیٹھنے لگا۔ یہ مالک ہیں؟ یہ مالک ہیں؟ اس کے ذہن میں ایک چیخ گونج رہی تھی ـــ "ابے جاؤ۔ رہنے بھی دو۔ بڑے مالک

آئے کہیں کے!" منشی نفرت سے بولا "اگر میں تمہیں کھلاؤں پلاؤں نہ تو تم فاقوں مرنے لگو۔ یہ عیاشی اور بدمعاشی آخر کس کی دولت کے بل بوتے پر ہو رہی ہے؟!" اس نے جمعدار اور ننھے میاں کی طرف باری باری دیکھا "اگر یہ میرے کاغذ کے ٹکڑے نہ ہوں تو تم رنگ رلیاں کیسے مناؤ؟" ——— "ابے چپ رہ منشی کے بچے!" جمعدار گرج کر بولا "اگر میں تمہاری حفاظت اور مدد نہ کروں تو یہ دولت تمہارے پاس کیسے آئے؟ تمہیں یہ کرایہ کہاں سے ملے؟ اگر کرایہ داروں پر میرا رعب اور دبدبہ نہ ہو تو تجھ حقیر اور ذلیل آدمی کو کرایہ کون دے؟ اگر لوگوں کو میرا ڈر نہ ہو تو تجھے دوسرے دن کان سے پکڑ کر اس عمارت سے باہر نکال دیں اور تمہارا مالک بن اور تمہاری دولت دھری کی دھری رہ جائے ——— چلا ہے شیخی بگھارنے!" اس نے کونے میں رکھا ہوا ڈنڈا اٹھایا "اسے اچھی طرح سے دیکھ لو۔ ہاں ——— بھولیو مت۔ یہ کاغذ کے ٹکڑے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے" ——— "میاں لٹھ باز! یہ لوگ ڈنڈوں سے ڈرنے والے نہیں" ننھے میاں نے طنز سے کہا "اگر میں یہاں نہ ہوتا تو تمہاری لٹھ بازی بھی کسی کام نہ آتی۔ میں جو کام میٹھی میٹھی باتوں، صلح صفائی اور نرمی سے کر لیتا ہوں تمہارا ڈنڈا وہ کام کہاں کر سکتا ہے۔ اور نہ ہی وہ کام دولت کے بل بوتے پر ہو سکتے ہیں۔ اگر میں ان لوگوں کو نیکی، فرمانبرداری، اطاعت، صلح اور آشتی کی تلقین نہ کروں اور ہمیشہ مالک کے غیض و غضب سے ڈراتا نہ رہوں تو یہ لوگ فوراً اس جگہ انقلاب برپا کر دیں اور اس انقلاب میں ہم تینوں کی خیر نہیں۔ ان کو آہستہ آہستہ، چپکے چپکے دلاسا دینا، پیار سے چمکارنا، ان کو جھوٹی امیدیں دلانا، دھیرے دھیرے ڈرانا اور دھمکانا، یہ سب کام میرے نہیں تو اور کس کے ہیں؟ اگر یہ لوگ مجھ سے متاثر، میرے معتقد اور قائل نہ ہوں تو دوسرے دن تم دونوں کا صفایا کر کے رکھ دیں" ——— "ارے بھئی جانے دو ان جھگڑوں کو۔ بھلا اس میں بات ہی کیا ہے" جمعدار نے گلاس میں سے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا "ہم تینوں ایک ہی جگہ رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی حفاظت اور مدد کرتے ہیں۔ اگر ہم میں نااتفاقی ہو گی تو پھر تینوں در در کی ٹھوکریں کھائیں گے۔ چلو ہم تینوں مالک ہیں۔ کیوں مائی سُنا تم نے؟ ہم تینوں مالک ہیں" اور اس نے ایک بلند قہقہہ لگایا ——— "ہاں مائی! ہم تینوں اس عمارت کے مالک ہیں۔ سُنا؟ دوسرا کوئی مالک نہیں۔ ہم سے بڑا کوئی نہیں" منشی نے سکے چھنکاتے ہوئے کہا۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے باری باری ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجسم حیرت و سوال بنی۔ وہ کیا دیکھ رہی تھی؟ وہ کیا سُن رہی تھی؟ ——— "بوا تو اب چلی جا۔ یہاں زیادہ دیر نہ ٹھہر۔ تُو نے مالک تو دیکھ لئے۔ اب اور کیا چاہیئے؟ جا!" لڑکی لجاجت سے بولی ——— "اری تو کیوں اس کی خاطر پریشان ہو رہی ہے؟" ننھے میاں نے اس کے اوپر جھکتے ہوئے پوچھا۔ وہ بت کی طرح خاموش کھڑی تھی۔ یہ مالک؟ اتنے دنوں وہ دھوکے میں رہی۔ اسے مسلسل فریب دیا گیا۔ وہ ان بدمعاشوں کے رحم و کرم پر رہی جو خیالی اور فرضی مالک کا نام لے لے کر اسے ڈراتے دھمکاتے رہے اور اپنا اُلّو سیدھا کرتے رہے۔ اتنا عرصہ وہ ان غنڈوں کی خیرات، ان کے فریب اور جھوٹ کے سہارے جیتی رہی۔ اُف! اُف! اسے متلی سی ہونے لگی جیسے اس نے آنکھوں دیکھے مکھی نگل لی ہو۔ اس نے اُلجھی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ میرے بچے یہاں کام کرنے آ رہے تھے؟ ان غنڈوں کے پاس؟ اس نے کم سن لڑکے کی طرف دیکھا جو جمعدار کے گھٹنوں پر بیٹھا تھا۔ اسے اس کی معصوم حیرت بھری آنکھوں میں سے عبدو جھانکتا ہوا نظر آیا۔ منشی نوٹ گننے میں مصروف تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے لوٹی ——— "ٹھہرو مائی!" ننھے میاں اُٹھتے ہوئے بولا "کہاں جا رہی ہو؟" ——— "جانے بھی دو اس بے چاری کو کیوں روکتے ہو؟" لڑکی نے لجاجت سے کہا ——— "تو چپ رہ۔ مائی تو اب یہاں سے واپس نہیں جا سکتی" وہ اس کا راستہ روکتے ہوئے بولا ——— "کیوں؟" ——— عورت نے نحیف آواز میں حیرت سے پوچھا ——— "ہاں ٹھیک ہے۔ مائی اب تو نہیں جا سکتی۔ تجھے ہم نے منع کیا تھا کہ یہاں مت آنا۔

لیکن تُو مالک کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہاں آگئی - اب تو واپس نہیں جا سکتی - جو یہاں ایک بار آجاتا ہے وہ واپس نہیں جا سکتا قانون شکنی کی سزا یہی ہے - اس لڑکی سے پوچھ لے" منشی نے لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ——— " تمہیں میرا واسطہ اسے جانے دو" لڑکی نے ان تینوں کے سامنے ہاتھ باندھے " اسے کیوں روکتے ہو؟ میں تو اپنی مرضی سے آکر پچھتا رہی ہوں - مگر اس بے چاری نے تمہارا کیا بگاڑا ؟ اس غریب کو کیا معلوم کہ یہاں اصلی مالک تم جیسی ذلیل ہستیاں ہیں - اور یہ ڈھونگ ——— غریب پرور، خدا ترس، رحم دل اور سخی مالک کا ڈھونگ ——— جو تم نے رچا رکھا ہے محض لوگوں کو ڈرانے اور دھمکانے کا ایک ذریعہ ہے - یہ تو انجانے میں اپنے مالک سے ملنے چلی آئی اور یہاں آکر تم جیسے بھیڑیوں اور کتوں سے واسطہ پڑا " ——— " بس بس رہنے دے - زیادہ بکواس نہ کر ——— میں ابھی تجھے ٹھیک کرتا ہوں " ننھے میاں اس کی طرف دیکھ کر غرایا ——— " تم کہتی ہو کہ اس کا قصور کوئی نہیں " منشی آگے بڑھ کر بولا " یہی جرم کیا کم ہے کہ وہ یہاں چلی آئی - اب واپس جا کر سب لوگوں کو بتائے گی کہ یہاں مالک والک کوئی نہیں ہے - سب دھوکا اور فریب ہے - ہمارا راز جو کئی سالوں سے محفوظ چلا آ رہا ہے افشا کر دے گی - اگر لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ اس مکان کے مالک ہم ہیں ——— ایک نہیں تین ہیں - تو کون کرایہ دے گا ہمیں ؟ نہیں ——— اب یہ واپس نہیں جا سکتی " منشی نے سر ہلاتے ہوئے کہا ——— " مائی بہتر یہی ہے کہ اب تو یہیں رہ اور ہماری خدمت کر ——— تجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی کرایہ دینے اور پیٹ بھرنے کا جھنجھٹ نہیں ہوگا - آرام و آسائش سے زندگی کے دن گزر جائیں گے - جانتی ہو جو ایک بار ہماری نظروں میں چڑھ جائے تو اس کی تقدیر ہی بدل جاتی ہے - اور اگر تو چاہتی ہے تو تیرا لڑکا اور لڑکی بھی تجھے یہیں مل جائیں گے لیکن تو اب اس گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتی " ——— " یہاں رہوں ؟ تمہارے پاس ؟ " اس نے نفرت سے کہا - " تم جیسے مالکوں کے پاس ! لعنت ہے تم پر ——— لعنت ہے اس مکان پر جس کے مالک تم جیسے ہیں - اخ تھو ! " اس نے حقارت سے فرش پر تھوک دیا ——— " بڑی زبردست ہے یہ مائی " جمعدار نے ہنس کر کہا " ننھے میاں عورت مجھے پسند نہیں ورنہ میں اسے ٹھیک کر کے دکھاتا - عورت کو راہِ راست پر لانے کا ایک ہی طریقہ ہے ——— وہی استعمال کرو - اور پھر اتنی گئی گزری بھی تو نہیں - چند دن کا بہلاوا ہی سہی - تم خود ہی نپٹ لو اس سے - ورنہ منشی کے حوالے کر دو " ——— " ارے منشی کیا کرے گا " اس نے طنز اور تمسخر سے کہا " وہ تو ہیجڑا ہے - وہ اپنا کام آپ چلا لیتا ہے ——— اس مائی کو میں خود سیدھا کر لوں گا " اور وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھا " دیکھ مائی جانے دے ——— اب غصہ تھوک دے ——— خواہ مخواہ ضد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں - تجھے کسی نے بلایا نہیں تھا - تو خود ہی چلی آئی ——— اس غلطی کا خمیازہ اب بھگتنا پڑے گا - تو ہیں مالک مان یا نہ مان تجھے بہرحال رہنا یہیں ہے ——— اس لئے عقلمندی اسی میں ہے کہ مالک سے نباہ کر رہ ——— آ ——— شاباش ——— اب جانے دے غصے کو ! " اور اس نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی - وہ تڑپ کر علیحدہ ہو گئی ——— " خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا کمینے، ذلیل کہیں کے ——— یاد رکھ آنکھیں نوچ لوں گی - بڑا آیا مالک، بدمعاش کہیں کا ! " وہ غرائی - وہ پھر اس کی طرف بڑھا اور وہ بھری ہوئی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹی اور اسے زور سے دھکیل کر باہر نکل گئی - ننھے میاں فرش پر پٹخنیاں کھانے لگا - جمعدار نے اپنی گود میں بیٹھے ہوئے لڑکے کو ایک طرف پھینکا اور بھاگا " پکڑو کم بخت کو ——— مت جانے دو " ——— وہ ابھی دو تین سیڑھیاں ہی طے کر پائی تھی کہ جمعدار نے اسے آن دبوچا - اس نے اس کے بازو میں اپنے دانت گاڑ دئیے - جمعدار بلبلا اٹھا اور پیشتر اس کے کہ منشی

اور ننھے میاں اس تک پہنچ سکتے وہ سامنے جنگلے پر سے کنوئیں کی تاریکی میں پھلانگ گئی تھی۔

اگلی شام اس نے وہ مکان چھوڑ دیا لیکن اس حالت میں جب کہ وہ چار آدمیوں کے کندھوں پہ سوار سفید چادر میں لپٹی ہوئی تھی — لوگ رحم بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے اور تاسّف سے سر ہلا رہے تھے۔ بے چاری! زندگی کی مصیبتوں کا مقابلہ نہ کر سکی —! بڑی دُکھی تھی! لیکن کم از کم اپنے بچوں کا خیال تو کیا ہوتا۔ وہ بے چارے اب بالکل بے یار و مددگار رہ گئے۔ توبہ! توبہ!! اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا! بہت بُری بات ہے — پاپ ہے!

اور اسی رات جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ مالک کے کارندے ان یتیم بچوں کو اُوپر مالک کے گھر لے جا رہے تھے جس نے ان کی پرورش کا ذمہ لے لیا تھا۔ تو وہ مالک کی غریب پروری، سخاوت اور رحم دلی کے اور بھی قائل ہو گئے اور اسے لاکھ لاکھ دعائیں دینے لگے۔

رگِ سنگ

ضمیر الدین احمد

گھنٹی کے جواب میں اختر نے خود دروازہ کھولا۔ باہر ظہیر کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر اختر کو دوہری حیرت ہوئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ظہیر آئے گا۔ اور پھر اس نے کچھ عجیب حالت بنا رکھی تھی۔

شیو بڑھا ہوا تھا۔ کپڑے قدرے میلے اور کافی گنجلے ہوئے تھے۔ بال بکھرے تھے۔ ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی تھیں۔ آنکھیں جیسے اُبلی پڑ رہی تھیں۔ اور چہرے کے ریشوں کو جیسے کسی ساز کے تاروں کی طرح کس دیا گیا تھا۔

"ارے ظہیر بھائی!" کہہ کر اختر نے دروازہ پورا کھول دیا۔

کمرے میں پہنچ کر ظہیر اور اختر آمنے سامنے دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"شمی کی طبیعت اب کیسی ہے؟" اختر نے پوچھا۔

"اچھی ہے!"

"بخار کم ہوا؟"

"ہاں!"

"میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ جلدی اُتر جائے گا۔ موسمی بخار ہے۔ ٹائیفائڈ آئیفائڈ خاک نہیں۔ ڈاکٹروں کو تو آج کل ہر بخار ٹائیفائڈ نظر آتا ہے ...."

وہ بات کرتے کرتے رُک گئی۔ ظہیر کھلی ہوئی کھڑکی کے باہر جھکے ہوئے آسمان کے سُرخ کنارے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس نے ایک بار پھر غور سے ظہیر کی ہیئت کا جائزہ لیا اور اسے پھر تعجب ہوا۔ کیونکہ وہ جس ظہیر کو اتنے عرصے سے جانتی آئی تھی وہ تو بڑا نفاست پسند تھا۔ ہر وقت صاف ستھرا رہنے والا۔ پتلون کی شکن نہ ٹوٹے۔ گھنگھریالے بالوں کی ایک لٹ بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ چہرہ ہر وقت چمچماتا رہے۔ جوتوں میں منہ دیکھا جا سکے۔ اور یہ ظہیر! جیسے کوئی انقلابی جسے اپنے سوا سب کی فکر۔

"ظہیر بھائی!"

چونک کر ظہیر نے اپنی نگاہوں کا رُخ اختر کی طرف موڑ دیا۔

"میں کیا پوچھ رہی ہوں"

ظہیر کی آنکھوں نے پوچھا۔ کیا؟

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

ایک پھیکی مسکراہٹ ظہیر کا جواب تھی۔

اختر کو ظہیر کی خاموشی اور اداسی پر بھی تعجب ہو رہا تھا۔ کیونکہ وہ اگر باتونی تھی تو ظہیر بھی کم گو نہ تھا۔ دراصل ان کے تعلقات کی بنیاد ان کے مزاجوں کی موافقت پر ہی تھی۔ دونوں بلا کے ہنس مکھ۔ خوش مزاج اور زندہ دل تھے۔ شاذ و نادر ایسا ہوتا کہ ظہیر پر خاموشی اور اداسی کا دورہ پڑتا جس زمانے میں اس پر عشق کا بھوت سوار تھا اور شمی کو پلنے کے امکانات روز بروز کم ہوتے جا رہے تھے ان دنوں کبھی کبھار وہ اداس نظر آتا۔ لیکن اپنی پریشانی اور فکروں کا ڈھنڈورا کبھی نہ پیٹتا۔ اور اگر کبھی گم سم ہو بھی جاتا تو اختر اسے اتنا چھیڑتی اتنا چھیڑتی کہ وہ اپنی فکروں اور پریشانیوں کو بھول کر پھر وہی ظہیر بن جاتا کہ جو تھا۔

لمحہ دو لمحہ خاموش رہ کر اختر نے ہلکے پھلکے لہجہ میں کہنا شروع کیا:۔

"میں کل آ رہی تھی۔ مگر مرزا جی آن دھمکے اور ایسے جمے کہ ٹلنے کا نام نہ لیا۔ گیارہ بجے رات کو جا کر پیچھا چھوڑا۔ قدرت کے دوست بھی ایک سے ایک بڑھ کے ہیں۔"

اور ذرا رک کر

"......سوائے تمہارے!"

ظہیر نے جھکی ہوئی نظریں اٹھا کر اختر کی جانب دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

"مگر تم تو گئے ہاتھ سے اب۔ پرائے جو ہو گئے۔ شادی کیا ہوئی گویا ہم کو بھول گئے۔"

اس کے لہجہ میں نہ طنز تھا۔ نہ شکایت۔ بس تمسخر تھا۔

"......کبھی کبھی درشن ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی نہ معلوم کب تک... بیگم صاحبہ نے کہیں حکم صادر کر دیا کہ اختر کے ہاں آنا جانا بند تو پھر ہم تو صورت کو ترس جائیں گے"

اس نے اپنی کرسی گھسیٹ کر ظہیر کی کرسی کے پاس کر لی۔

"......کیوں نہ ہو صاحب! اکلوتی جو ٹھہریں۔ اور بڑی دقت سے ہاتھ آئی ہیں"

شمی کے گھر والوں کو نہ اس کا ظہیر سے ملنا جلنا پسند تھا اور نہ وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ ظہیر سے شادی کرے۔

"......ظہیر بھائی پر چادرے صبح شام پڑھا کرتے ہوں گے بیگم صاحبہ کی، تب چین آتا ہو گا کہیں۔ فرہاد کی قبر پر لات مار دی تم نے بھی ظہیر بھائی ——"

وہ یکایک اٹھ کھڑی ہوئی۔

ظہیر پھر کھلی ہوئی کھڑکی کے باہر پھولی ہوئی شفق پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔

اختر چلائی "ظہیر بھائی!"

ظہیر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"سن رہے ہو کہ نہیں؟"

"ہاں!"

"ہاں کیا خاک - میں پوچھتی ہوں چُپ کا روزہ رکھا ہے یا ہونٹ سی لئے ہیں"

ظہیر چپ رہا۔

"یا اللہ خیر!"

وہ آکر ظہیر کی کرسی کے ہتے پر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ بولتے کیوں نہیں.....؟"

ظہیر نے گردن جھکالی۔

"ناراض ہو گئے ہو کیا؟"

ظہیر پھر بھی چپ رہا۔

"بولو—" اختر نے اپنا ہاتھ اس کی بغل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "بولو- ورنہ میں کرتی ہوں گدگدی"

ظہیر کے گدگدی بہت ہوتی تھی اور جب کبھی وہ کھوسا جاتا تھا تو اختر اسے گدگدی کر کے ہنسایا کرتی تھی۔

"بولتے ہو کہ نہیں؟"

ظہیر کے ہونٹ بند رہے اور اختر گدگدی کرنے لگی۔

"نہیں بھابی" ظہیر نے آہستہ سے اختر کے ہاتھ کو اپنے بدن سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

اختر اُچھل کر کھڑی ہو گئی- اور اس کا چہرہ ایک دم نہایت سنجیدہ ہو گیا۔

"تم نے آج پھر پی؟"...

ظہیر کی جھکی ہوئی گردن اور جھک گئی۔

شادی سے پہلے جب ایک وقت ایسا آیا تھا کہ ظہیر شمی کو پانے کی اُمید قریب قریب چھوڑ چکا تھا تو اس نے شراب نوشی شروع کر دی تھی۔

"اچھی بھلی چھوڑ دی تھی - پھر یہ آج کیا ہوا کہ........"

سب سے پہلے اختر کو پتہ چلا تھا کہ ظہیر نے شراب پینی شروع کر دی ہے - اس نے بہت کوشش کی وہ اس حرکت سے باز آجائے مگر ظہیر نے کئی بار چھوڑی اور کئی بار پھر شروع کی - آخر عاجز آ کر اختر نے شمی کو خبر کر دی - اور جب ان کی شادی کے راستے سے تمام روڑے ہٹ گئے تو شمی نے ظہیر سے وعدہ لیا کہ وہ اب پھر کبھی شراب کو چھوئے گا بھی نہیں - ظہیر نے وعدہ کیا اور اسے نبھایا بھی - اس کی شادی کو تین مہینے ہو چکے تھے مگر ان تین مہینوں میں وہ شراب کے پاس بھی نہیں پھٹکا تھا۔

"........تمہیں شرم تو نہیں آتی - شمی کو پتہ چلے تو کیا ہو - اسی محبت کی اتنی ڈینگیں مارا کرتے ہو - اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے - یہ نہیں کر سکتے - وہ نہیں کر سکتے"

ظہیر کے جبڑے مضبوطی سے ایک دوسرے پر جم گئے۔

"......... کیا پتہ روز پیتے ہو گے۔ آج ادھر بھٹک آئے تو معلوم ہو گیا۔ تبھی چپ چپ، سادھ رکھی تھی۔ ذرا اپنی صورت تو دیکھو آئینے میں۔ کیسی نحوست برس رہی ہے۔ جیسے کہیں..."

ظہیر اچانک اُٹھ کھڑا ہوا۔

"بھابی! میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں لیٹوں گا۔ سونے کے کمرے میں کوئی ہے تو نہیں؟"

"ہو گا کون!" اختر کی آواز میں جھلاہٹ تھی۔ "قدرت آج نہ جانے کیوں ابھی تک آفس سے نہیں آئے"

ظہیر سونے کے کمرے کی جانب چلا۔

"درد نہیں ہو گا تو کیا آرام ملے گا۔ ہونہہ"

وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور اختر کرسی پر جیسے گر پڑی۔

اختر اور ظہیر ایک دوسرے کو اس زمانے سے جانتے تھے جب وہ کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ پھر اختر کی شادی قدرت سے ہو گئی جو ظہیر کا گہرا دوست تھا اور کالج کی سرسری ملاقات ہمدلی اور ہمدردی کے مضبوط رشتے میں تبدیل ہو گئی۔ وہ ظہیر کو بھائی اور ظہیر اسے بھابی کہنے لگا۔

کمرے کے باہر قدموں کی چاپ سُن کر اختر کے چہرے پر سے ناراضگی نا تکلیف کے آثار مٹ گئے۔ قدرت کے قدموں کی چاپ تھی۔ مگر بدلی ہوئی۔ قدم تیز تیز اُٹھ رہے تھے اور ان سے بے انتہا گھبراہٹ اور بے چینی کی صدا آ رہی تھی۔ اختر کا جسم تن گیا۔

دھڑ سے دروازہ کھلا۔

قدرت ہی تھا۔

اختر کا سانس رُک گیا۔

وہ بے حد سراسیمہ نظر آ رہا تھا

اختر یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ کیا ہوا۔

"غضب ہو گیا"

اختر کے منہ سے پھر بھی آواز نہ نکل سکی۔

"شمی کا انتقال ہو گیا!"

"ہائے!" اختر نے چھاتی پہ ہاتھ مارا "انا للہ وانا الیہ راجعون —— کب؟"

"کل رات کو" قدرت کا سانس پھولا ہوا تھا۔ گھبراہٹ کی وجہ سے یا تیز تیز چلنے کی وجہ سے "میں ظہیر کے ہاں گیا تھا۔ شام تک طبیعت بہتر تھی۔ پچھلے پہر اچانک ......"

دونوں ایک دوسرے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

"ظہیر جنازے کے بعد سے غائب ہے"

"وہ تو یہاں ہیں!"

"یہاں ہے، اگھر پر سب لوگ پریشان ہیں۔ خالہ بے چاری کا بُرا حال ہے۔ کہہ رہی تھیں اسے سکتہ ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا"

آگے آگے اختر اور پیچھے پیچھے قدرت سونے کے کمرے کی سمت لپکے مگر ظہیر وہاں نہیں تھا۔

اختر نے آواز دی "ظہیر بھائی!"

کوئی جواب نہ ملا۔

دونوں، ڈرائنگ روم کی طرف لپکے۔

اختر نے پھر آواز دی "ظہیر بھائی!"

جواب میں باہر گلی سے ایک عجیب قسم کا شور بلند ہوا۔ کسی کے چیخنے کی آواز اور پھر بہت سے لوگوں کی ملی جلی اونچی نیچی آوازیں۔

دونوں نے دوڑ کر بالکونی پار کی اور نیچے جھانکا۔

گلی میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ کچھ اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ کچھ دم بخود گردنیں اٹھائے اوپر دیکھ رہے تھے۔ دو ایک ہاتھ ہلا ہلا کر آس پاس کے لوگوں سے کچھ کہہ رہے تھے۔ پان بیڑی والا اپنی دکان چھوڑ کر گلی میں آگیا تھا۔ آئس کریم والے نے اپنا ٹھیلہ روک لیا تھا اور گھوڑا گاڑی والا گاڑی کی گدی پر کھڑا ہنٹر ہلا ہلا کر کسی کو کچھ ہدایت دے رہا تھا۔

قدرت کا فلیٹ تیسری منزل پر تھا۔ اس کے نیچے جو فلیٹ تھا اس کی بالکونی اور گلی کے فرش میں تقریباً ساٹھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ اگر کوئی بالکونی میں سے کودے یا گر پڑے تو ہڈی پسلی ایک ہو جانا یقینی تھا۔

دونوں ہاتھوں سے بالکونی کی آہنی باڑھ کو پکڑے ہوئے ظہیر نیچے گلی میں جمع لوگوں اور اوپر کی بالکونی میں کھڑے ہوئے قدرت اور اختر کے درمیان معلق تھا۔ وہ رہ رہ کر "مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ" کا نعرہ لگا رہا تھا اور ساتھ ساتھ کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح باڑھ کو عبور کر کے بالکونی میں پہنچ جائے مگر بالکونی کے نیچے کوئی ایسی چیز اس کی پہنچ میں نہ تھی جس پر پیر ٹیک کر وہ اوپر اُچک سکتا۔ اور نہ اس کے ہاتھوں میں اتنا دم تھا کہ خالی ان کے سہارے اتنا اوپر اُٹھ سکتا کہ اس کا سینہ باڑھ پر آجاتا۔

قدرت فوراً دروازہ کھول کر نیچے بھاگا۔ ابھی ایک زینہ اُترا ہوگا کہ کچھ لوگ دوڑتے ہوئے اوپر آئے۔ یہ لوگ قدرت سے پہلے نیچے والے فلیٹ کو دیکھ آئے تھے۔ اس کے دروازے میں تالا پڑا تھا۔

اب ایک ہی صورت باقی تھی۔ اگر کوئی مضبوط رسّی مل جائے تو اسے قدرت کے فلیٹ کی بالکونی سے نیچے لٹکایا جائے تاکہ معلق انسان اسے پکڑ کر نیچے اُتر سکے۔

قدرت اور اس کے پیچھے وہ لوگ اوپر بھاگے۔ فلیٹ میں داخل ہوتے ہی اس نے بدحواس اختر سے پوچھا کہ گھر میں کوئی مضبوط رسی ہوگی اور حالانکہ اختر کو بخوبی معلوم تھا کہ گھر میں اس کام کی کوئی رسی نہیں مگر پھر بھی اس نے آن کی آن میں آٹے دال کی کوٹھڑی کی ہر چیز اُلٹ پلٹ کر کے قدرت سے کہا کہ نہیں۔

فوراً قدرت اور وہ لوگ نیچے کی طرف دوڑے اور کئی کئی سیڑھیاں ایک ایک چھلانگ میں پار کرتے ہوئے گلی میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ کسی نے ایک رسی برآمد کی ہے۔ مگر گھوڑا گاڑی والا جواب اپنی گدی سے اُتر آیا تھا، چلا رہا تھا "و بائی! اس سے کام نئیں چلے گا۔ یہ بوت

کمزور ہے"

یکایک، پان بیڑی والے کے دماغ نے جست لگائی۔ اس نے جھپٹ کر اپنی دوکان کے سامنے لٹکا ہوا پھٹا گھسیٹا اور اس میں پھنسا ہوا بانس نکالنے لگا۔ دو نوجوانوں نے بڑھ کر مٹھائی والے کی دوکان کا پھٹا بغیر اس کی اجازت کے گھسیٹا اور اس کا بانس نکال کر پھینک دیا۔ چار پانچ نوجوانوں نے دونوں پھٹوں کو ملا کر مضبوطی سے پکڑا اور انہیں بالکونی کے نیچے فٹ پاتھ پر پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔

گلی میں سے ایک شور بلند ہوا۔

"کود پڑو بابوجی"

"ڈرو مت"

"ہاں، کود پڑو"

"ٹھیک ہے۔ گھبراؤ نہیں"

ظہیر نے دو بار چہرہ جھکا کر خوفزدہ نگاہوں سے نیچے پھیلے ہوئے پھٹوں کو دیکھا۔ پھر آنکھیں بند کیں اور بالکونی کی آہنی باڑھ کو آہستہ سے چھوڑ دیا۔

جب اس کے بدن نے فٹ پاتھ کی سختی محسوس کی تو ظہیر نے آنکھیں کھول دیں۔ جن پھٹوں پر وہ گرا تھا انہیں اس کے سمیت فٹ پاتھ پر رکھ دیا گیا تھا اور اب اس کے چاروں طرف بہت سے چہرے جمع تھے۔ چند ساعتوں تک موت سے بچ نکلنے کا خیال اس کے ذہن پر اس طرح حاوی رہا کہ ظہیر نے ان چہروں کو تو دیکھا مگر ان پر لکھی ہوئی عبارتوں کو نہ پڑھ سکا۔ مگر موت سے نجات کا خیال پھر خیال تھا۔ گذر گیا۔ اور پھر جو اس نے تماشائیوں کے چہروں پر بھٹکتی ہوئی نظریں ڈالیں تو وہاں اسے نہ فکر و پریشانی نظر آئی اور نہ طمانیت اور خوشی۔ اگر کچھ تھا تو تمسخر جس میں کہیں کہیں حقارت کا شائبہ بھی تھا۔

ظہیر کی نظریں جھک گئیں۔

قدرت نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔

"بابوجی! نذر نیاز کروا دینا" مجمع میں سے آواز آئی۔

کچھ لوگ ٹھٹھا مار کر ہنسے۔

ظہیر کے لئے اپنی آنکھوں کو جو بھیگنے کا نام نہ لیتی تھیں اب ڈوبنے سے بچانا مشکل ہو گیا۔

ایک اور آواز آئی "بالکونی کی منڈیر ذرا اونچی کروا لو صاحب!"

ایک اور قہقہہ پڑا ـــــــــ دو قدم چل کر بلڈنگ کے پھاٹک میں داخل ہونا ظہیر کے لئے دوبھر ہو گیا۔ پھاٹک میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر اختر پر پڑی جو زینہ اتر چکی تھی۔ ظہیر کو دیکھ کر وہ جہاں تھی، وہیں رک گئی۔

ظہیر نے جھجکتے ہوئے اختر کی نظروں سے نظریں ملائیں۔ ان میں نہ حقارت تھی نہ ملامت اور نہ تمسخر بس ایک استعجاب تھا جیسے کہہ رہی ہوں "تم اور یہ حرکت!"

اختر دو قدم چل کر ظہیر کے پاس آئی۔ اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے زینہ کی طرف لیجانے لگی۔ مگر ظہیر کے قدموں نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ اس کا سر جھک کر اختر کے کاندھے پر آ گیا اور اس کے منہ سے نکلا "بھابی! شمی مر گئی!"

اور پھر آنسوؤں کا نہ جانے کب سے اُمڈا ہوا طوفان جو ظہیر کی آنکھوں سے پھوٹا ہے تو ـــــــــ

★

فٹ پاتھیئری

ابن الحسن

رمضان کو جب دو کوٹھڑیوں کا ہوادار کمرہ ملا تو وہ بڑا خوش ہوا۔ لیکن کوارٹر میں چند ہی منٹ رہنے کے بعد اسے عجیب سی الجھن ہونے لگی۔ دم اُلٹا جاتا تھا جیسے اندر ہی اندر اس کا سانس گھُٹ رہا ہو۔ ایسے موقعوں پر وہ یہ کیا کرتا تھا کہ خود کو اور دنیا کے متعلقین کو دو چار گالیاں لگاتار دے ڈالتا۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا اور رمضان کو نیند آجاتی اور وقت گذر جاتا۔ اور وقت گذرنا ہی رمضان کی اصل زندگی تھی۔ وقت جہاں اس پر بھاری ہوا وہ یہ سمجھا کہ موت قریب ہے، یا کوئی آفت آنے والی ہے، یا کسی حادثہ سے دوچار ہونے والا ہے یا اسی قسم کا کوئی اور دہشتناک واقعہ پیش آنے والا ہے جس کا اس کے خیال میں زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اپنی زندگی میں نہ معلوم کتنی دفعہ ایسے سخت لمحات سے گذر چکا تھا۔ جب اچھی بھلی زندگی چلتے چلتے ایک دم رُک گئی تھی جیسے کسی نے چلتی ریل گاڑی کو زنجیر کھینچ کر روک لیا ہو۔ ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی رُکی ہو۔ ذراسی دیر کے لئے سب کو ایک ذہنی اور جسمانی دھکا سا لگا ہو۔ لیکن ہر مرتبہ بازار کی عام سی گالیاں دے کر وہ ان لمحات سے اپنا پیچھا چھڑا لیتا اور پھر زندگی گذرنے لگتی۔ جیسے ریل گاڑی کے اس طرح یکایک رُک جانے پر مسافر اپنے اپنے ڈبوں سے باہر نکل کر اس اچانک پیش آجانے والے واقعہ پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کرنے کے بعد پھر واپس اپنے اپنے ڈبوں میں آگئے ہوں اور گارڈ نے سیٹی دی ہو اور جھنڈی دکھائی ہو۔ اور گاڑی پھر چل پڑی ہو اس وقت تک کے لئے جب تک پھر نہ زنجیر کھینچی جائے یا کوئی اسٹیشن نہ آجائے۔

———— رمضان کی گالیوں میں کوئی فلسفہ نہ ہوتا تھا۔ اور اگر ہوتا بھی تھا تو اس درجہ مخفی کہ اس کی وضاحت کے لئے وقت اور سمجھ بوجھ درکار ہوتی ہوگی۔ ان گالیوں کا البتہ یہ اثر ضرور ہوتا ہے کہ رمضان کی طبیعت کا اضمحلال آہستہ آہستہ دُور ہو جاتا اور وہ پھر خود کو زندہ تصور کرنے لگتا۔ اس تاثر کی گہرائی تک پہنچنے کے لئے پیش آنے والے ہر واقعہ کا پس منظر، رمضان کی اپنی زندگی اور معاشرہ کے حقائق کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور کیونکہ یہ سب حقائق اہل دانش کو کچھ کر گذرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اور کچھ کر گذرنے کا مطلب ہوتا ہے قربانیاں اور خطرات اور تکالیف لہٰذا فی الحال ہم اگر ان حقائق سے بچتے ہوئے ہی آگے چلیں تو مناسب ہے ————

دو کوٹھڑیوں کا ہوادار کوارٹر نیا ہی بنا تھا۔ سامنے چھوٹا سا صحن تھا۔ سیمنٹ کا فرش، ایک طرف باورچی خانہ تھا جس پر ٹین کی چھت پڑی تھی۔ اس کے مقابل ایک نل لگا تھا جس کے نیچے بیٹھ کر وہ نہا سکتا تھا۔ دن میں کئی مرتبہ۔ دو کوٹھڑیوں میں ایک ایک الماری بنی ہوئی تھی۔ جن میں وہ کوئی چیز بغیر کسی روک ٹوک کے رکھ سکتا تھا اور جالی لگی کھڑکیاں باہر کی طرف کھلتی تھیں۔ نیچی نیچی چھتیں تھیں اور روشندان جن کا رُخ سمندر کی طرف تھا اور ہوا سیدھی کھڑکیوں اور روشندانوں سے گھس کر کوٹھڑیوں کو ٹھنڈا رکھتی تھی، مگر رمضان کی وحشت ان سب کے باوجود بڑھتی گئی اور وہ چارپائی پر لیٹا ہوا دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹتا رہا اور صاف ستھری نیچی چھت کو تکتا رہا اور تنگ آکر

گالیاں دینے کا ارادہ کرتا رہا تھا۔ مگر گالی کے تاثر کو حاصل کرنے کے لئے کسی سامع کی ضرورت ہوتی ہے اور سامع کی غیر موجودگی میں رمضان کی گالی ہر مرتبہ حلق میں اٹکی رہتی اور اس طرح اس کی وحشت اور بھی بڑھ رہی تھی۔

——— رمضان نے اپنی زندگی کے مختلف دور مختلف شغلوں میں گذارے تھے۔ مگر جنگ کے زمانہ میں فٹ پاتھ پر رات گذارنے سے پہلے وہ رتن ٹاکیز کے سامنے والے گلی کے پاس کھڑا ہو جاتا۔ اس جگہ جہاں ایک تختی پر سرخ ضرب کا نشان بنا ہوا تھا اور جس پر انگریزی میں "Out of Bound" اُردو میں "ممنوعہ علاقہ" لکھا تھا۔ گاہکوں کے گلی میں گھسنے سے پہلے وہ ہر ایک سے ملاقات کر لیتا اور نہایت لجاجت سے رازدارانہ لہجے میں پوچھتا "پرائیویٹ چاہیئے جناب؟" گاہکوں کو اُوپر ہی اُوپر اُچکنے کا یہ انداز ممکن ہے خود غرضی پر محمول کیا جائے لیکن جنگ کے زمانہ میں خود غرضی کوئی اتنا بڑا عیب نہ تھی۔ اس گلی پر جب اسے کوئی فوجی سپاہی مل جاتا تو اسے بڑی خوشی ہوتی، فوجی سپاہی گلی میں داخل ہونے سے گھبراتا تھا اور رمضان کو اپنی کم عمری کے باوجود یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اس قسم کے گھبرائے ہوئے گاہک ہمیشہ مناسب گاہک ہوتے ہیں، وہ فوراً اس سپاہی کی مشکل کشائی کے لئے آگے بڑھتا "پرائیویٹ چاہیئے حوالدار صاب" اور سپاہی اپنے عہدہ کی ترقی اور مشکل کے حل کو بیک وقت پا کر بہت خوش ہوتا——— "کس جگہ؟" سپاہی گلا صاف کرتے ہوئے پوچھتا "فسٹ کلاس........ نمبر ایک........ نئی آئی ہے.... اسکول میں پڑھتی ہے...... اِدھر رتن ٹاکیز کے پیچھے میرے ساتھ ساتھ آجاؤ، اس طرف" "وہ یہ کہتا آگے آگے چلتا۔ یہی چار پانچ فقرے جو استاد نے اسے بتا دئے تھے، اس کام میں زیادہ لمبی باتیں ٹھیک نہیں ہوتیں۔ یہ اس پر واضح کر دیا گیا تھا۔ اور سپاہی اپنے خیالات میں مگن اس کے پیچھے چل پڑتا۔ یہاں تک کہ منزلِ مقصود آجاتی اور سپاہی اقتصادیات پر اُتر آتا اور روزانہ یہی معمول رہتا———

لیکن وہ اس جھک جھک سے تنگ آگیا۔ رات کو جب فٹ پاتھ پر آکر کمر سیدھی کرتا اور خود کو بالکل اکیلا، ایک تنہا انسان پاتا تو پریشان ہو جاتا۔ فٹ پاتھ کی پتھریلی زمین سے اُٹھتی ہوئی گرمی اس کے بدن میں جذب ہونے لگتی اور اس کے پاس لیٹے ہوئے دوسرے لوگ آپس میں باتیں کر رہے ہوتے اور اسے کوئی منہ نہ لگاتا۔ ان سب کو ایک دوسرے کے متعلق پورا پورا علم تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ رمضان اپنی کم عمری میں ہی اس قسم کے دھندے میں پڑ گیا ہے جسے معیوب سمجھا تھا اور وہ سب اسے صرف اسی لئے اپنے پاس فٹ پاتھ پر پڑا رہنے دیتے کہ فٹ پاتھ ان میں سے کسی کی بھی ملکیت نہ تھا۔ لیکن سب کی یہ کوشش تھی کہ رمضان ان کی جاری کردہ اس سرد جنگ سے تنگ آکر فٹ پاتھ چھوڑ بھاگے، پہرہ کا سپاہی اِدھر سے گذرتا اور ان لوگوں میں کوئی باآواز بلند بڑبڑاتا "آج پھر کسی کی جیب کتری ہوگی" اور پہرہ کا سپاہی ذرا دیر کے لئے رُکتا اور رمضان فٹ پاتھ پر پڑے اپنی جگہ پر سکڑ جاتا اور سپاہی جب آدھی رات میں کھلی ہوئی پان کی کسی دکان سے ایک سگریٹ اور ایک پان کی توقع ہوتی آگے بڑھ جاتا اور رمضان آسمان کے سینے پر دھڑکتے ہوئے ستاروں کو دیکھتے دیکھتے سو جاتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ صبح اُٹھ کر جب وہ اپنی چیزوں کا جائزہ لیتا تو کسی نہ کسی چیز کو گم پاتا۔ مگر اتنے طاقت ور دشمن سے مقابلہ کی اسے ہمت نہ ہوتی، اور وہ سب کی طرف دیکھ کر خون کا گھونٹ پی جاتا۔

رمضان سرد جنگ کا مقابلہ نہ کر سکا۔ وہ جب کچھ عرصہ بعد اس نئے شہر میں آیا تو وہ دن کے مختلف اوقات میں مختلف کام کر کے پیسہ کمانے لگا۔ مثلاً گیٹ وے میں صبح سویرے یا شام کو آنے اور جانے والے ریزہ چیز کا سامان اُٹھا کر کچھ پیسہ بنا لیتا یا ٹریم پٹڑے کے پاس والی اس فٹ پاتھ پر بیٹھ کر جو لکشمی بلڈنگز کے بالکل سامنے تھی اپنی دوپہر گذار دیتا اور اس عرصہ امریکن سگریٹوں کے پیکٹ اور امریکن تھوک گریس

کے ڈبے بیچ ڈالتا۔ بچا ہوا مال وہ اپنے پاس بیٹھے ہوئے نسبتاً بڑے کاروباری کے سپرد کر دیتا اس شرط پر کہ اگر یہ بک گیا تو منافع میں آدھے کا شریک رہے گا ورنہ دوسرے دن واپس لے لے گا۔ رات کو وہ تاج محل سینما یا "ناز" میں تین چار ٹکٹ بھیڑ میں گھس کر خرید لیتا اور انہیں زیادہ قیمت پر شائقین کے ہاتھ فروخت کر دیتا۔ اس طرح ایک ہی دن میں اکثر اس کی آمدنی چار پانچ روپیہ کے لگ بھگ ہو جاتی۔ رات کو وہ صدر کی کسی فٹ پاتھ پر ٹانگیں پھیلا دیتا اور تمام دن کے واقعات اس کے دماغ میں چکر لگانے لگتے۔ اور اس سے پہلے کہ اس کی نیند اُڑ جاتی وہ سب واقعات خود بخود اس کے دماغ میں گڈمڈ ہو جاتے اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں، اور پھر صبح فٹ پاتھ پر دوکان لگانے کوئی مہاجر دلّی کے مخصوص لہجہ میں اسے اُٹھاتا "او بھائی! اُٹھ تا چچا میاں ——— ورنے کو ہو جا ——— بھائی بونی کا وقت ہو رہا ہے پیارے" وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھتا تو دن چڑھا ہوتا اور آس پاس کئی مہاجر دوکاندار اپنے اپنے حصّہ کی فٹ پاتھ کو کپڑے یا جھاڑو سے صاف کر رہے ہوتے، اور ملگجی نیلی اور سُرخ دریوں پر تام چینی کے برتن اور پُرانی کتابوں اور گرہستی کا سامان، کینوس کے جُوتوں، پلاسٹک کے پرس، اور سینڈلوں اور سستے رومالوں، بنیانوں اور جرابوں کا بازار لگا ہوتا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھتا، اور قریب کے دوکاندار کو ایک سگریٹ دیتا اور ایک خود پیتا اور اس فٹ پاتھ کے دوکاندار کی دوستی کے طفیل ریڈیو والے کی بڑی دوکان کے کسی عقبی گوشہ میں اپنا تھوڑا بہت سامان رکھ دیتا اور کام کی تلاش میں یا روزی کی تلاش میں نکل پڑتا ——— لیکن اس طرح کئی مرتبہ اس کا سامان غائب ہو چکا تھا۔ رات کو جب وہ فٹ پاتھ پر واپس لوٹتا تو دوکان کا چوکیدار اسے دھتکار دیتا۔ دوکان کے چوکیدار کو خوش رکھنے کے لئے اسے نئے نئے طریقے اختیار کرنے پڑتے پھر دوکاندار کی بھی خوشامد کرنی پڑتی۔ پولیس والوں کو بھی خوش رکھنا پڑتا اور یہ سب ایک بڑی دردسری ہوتی۔ پھر جب سب معاملات ٹھیک ہو جاتے اور زندگی بغیر کسی نئی اُلجھن کے گذرنے لگتی تو فٹ پاتھ پر سونے والے دوسرے لوگوں سے اس کی لڑائی ہونے لگتی اور معاملات طُول پکڑتے اور وہ اپنی فطری صلح پسندی سے مجبور ہو کر کوئی اور فٹ پاتھ ڈھونڈتا۔ اور وہاں پہنچ کر اسے سب کچھ از سرِ نو کرنا پڑتا۔ نئے لوگوں کی خوشامد، نئے پولیس کانسٹیبلوں کے مزاج سمجھنا، نئے دوکانداروں کو خوش کرنا اور پھر جب تک نئے فٹ پاتھ کے ماحول سے وہ اچھی طرح واقف نہ ہو جاتا اور اپنی زندگی کو اس ماحول کے مطابق نہ ڈھال لیتا اسے تنہائی اور غیریت گھیرے رہتی اور نئے فٹ پاتھ پر سونے والے پُرانے لوگوں کے سامنے اسے احساسِ کمتری ہوتا اور وہ کسی سے ٹھیک طرح نظریں نہ ملا پاتا۔

رمضان کے لئے فٹ پاتھ کی زندگی میں کچھ فوائد بھی تھے۔ رات کی تاریکی میں جب اس کے پاس سگریٹ ختم ہو جاتے اور دن کی تھکن اور رات کی خاموشی بھی اسے نہ سُلا سکتی تو کوئی موٹر قریب سے گذرتی اور اس میں بیٹھا ہوا کوئی آدمی ختم ہوتا ہوا جلتا سگریٹ سڑک پر پھینکتا چلا جاتا اور رمضان دوڑ کر سگریٹ سڑک پر سے اُٹھا لیتا اور دو چار کش کھینچ کر تھوڑا سا وقت اس تنہائی اور سنّاٹے میں سگریٹ کی محبت کے سہارے گذار دیتا اور پھر اپنے خیالات میں کھو جاتا اور اسے فٹ پاتھ کی پتھریلی زمین کمر کے نیچے اور زیادہ سنگلاخ محسوس ہوتی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دُھندلے دُھندلے منظر میں کچھ خاکے اُبھرنے شروع ہوتے۔ وہ اس دُھندلے منظر کو صاف صاف دیکھنے کی کوشش کرتا۔ اور اس طرح اس کی آنکھوں پر تھکن کا بوجھ پڑنے لگتا اور اس کا سر بھاری ہو جاتا اور وہ سو جاتا مگر دُھندلا منظر نیند میں بھی اس کے ذہن پر اُبھرنے لگتا اور دلچسپ مگر مبہم خاکے اس کے قریب آنے لگتے اور یکایک اس کی آنکھ کھُل جاتی اور اپنے پاس پڑے ہوئے دو نوعمر لڑکوں کو وہ بغلگیر دیکھتا اور دور کسی کا مردانہ پیر کسی نسوانی پیر کے تلوے سے چھُو جانے کے لئے آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہوتا۔ اور دوکان کی سیڑھی کے

پاس سوئی ہوئی کسی ماں کے کھلے ہوئے گریبان میں منہ ڈالے نوخیز بچہ سو رہا ہوتا۔ اور درخت کے پاس پڑے ہوئے وسیع تخت کے نیچے فقیرنی کروٹ لیتی اور اس کے پیر میں پڑے ہوئے کانسہ کے کڑے ایک دوسرے سے ٹکرا کر ہلکی سی آواز پیدا کرتے اور رمضان پھر سو جاتا ———

اسی فٹ پاتھ پر پڑے پڑے وہ زندگی کے بڑے معرکے دیکھ ڈالتا۔ رٹز بار RITZ BAR سے نکالے ہوئے شراب میں دھت مکرانی فٹ پاتھ کے کنارے کنارے آپس میں کسی معاملہ پر بحث کرتے گذرتے اور یکایک تیز تیز بات کرنے لگتے اور پھر ایک دم مار پیٹ شروع ہو جاتی دو پارٹیاں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جاتیں اور فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے بچے بوڑھے جوان ان شرابیوں سے ذرا بچ کر چاروں طرف کھڑے ہو جاتے اور رمضان کو بالکل وہی لطف آتا جو گولڈن گلوز GOLDEN GLOVES کے موقع پر وائی۔ ایم سی۔ اے Y.M.C.A میں سڈنی گریوز SYDNEY GREEVES اور سارجنٹ جونز مرحوم SERGEANT JONES کی مکہ بازی کے موقع پر آتا تھا اور جسے دیکھنے کے لئے دو روپیہ کا ٹکٹ لینا پڑتا تھا۔ یا پھر کبھی کبھی رمضان کا جی ایرانی کے فلاور منٹ اور ٹٹ سے جگمگ کرتے ہوٹل میں اچھے اچھے کھانے کھانے کو چاہتا۔ لیکن اتنے پیسے پاس نہ ہوتے۔ پر وہ ایک پیالی چائے اور بند لے کر کسی ٹیبل پر بیٹھ جاتا اور دوسرے لوگوں کو آملیٹ اور کٹلس اور آئس کریم اور ملک شیک سے شغل کرتے دیکھ کر اپنی طبیعت سیر کر لیتا۔ اور پھر فٹ پاتھ پر اپنی جگہ آ کر لیٹ جاتا۔ وہیں لیٹے لیٹے وہ مختلف دوکانوں اور ہوٹلوں میں بجتے ہوئے ریڈیو سنتا اور اپنے دل پسند لتا کے گائے ہوئے ریکارڈ بجتی ہوئی دھن کے ساتھ گنگناتا اور کلامِ اقبال سنانے والے کی اُکتا دینے والی آواز کو مذہبی اور متبرک سمجھتے ہوئے احترام سے سنتا۔ پاس سے کسی ٹیکسی پر لگے ہوئے لاؤڈسپیکر کی آواز گونجتی نکل جاتی اور اسے اعلان کے مرتعش فقروں کو جوڑنا پڑتا اور معلوم ہو جاتا کہ انجمن بدکوئی" اسلام یا انجمن "کوئی" ملت کا جبیح سندھ کی وزارت کے خلاف ایک ہنگامی جلسہ میں کیا طے کر چکی ہے اور بعد نمازِ جمعہ عیدگاہ مسجد میں کیا کرنے والی ہے اور جمعہ کی نماز کے لئے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو جمع ہونے کے لئے کیوں دعوت دے رہی ہے ———

لیکن فٹ پاتھ سے اسے آہستہ آہستہ وحشت ہونے لگی، اس کے پرانے ساتھیوں میں سے کئی فٹ پاتھ چھوڑ چکے تھے اور ان کی زندگی میں بڑی قابلِ رشک تبدیلی ہو چلی تھی۔ وہ خود بھی اس وقت تک ایک مل میں ملازم ہو گیا تھا لیکن اپنے ساتھیوں کی طرح اسے یہ ملازمت جلد ہی نہیں ملی تھی، اس ملازمت کے حاصل کرنے میں اس کے ساتھیوں کی مدد اور سہارے کو بڑا دخل تھا۔ اس کے ساتھی ملازم ہو چکے تھے اور وہ کئی دفعہ بھرتی کے لئے مل کے دروازے پر لائن میں کھڑا ہو چکا تھا مگر اس کا نمبر نہ آ سکتا تھا۔ اس کے ساتھیوں میں سے دو تین نے مل کے میٹ اور دوسرے بااثر ملازمین کے ذریعہ اسے بھرتی کرا دیا تھا۔ اس کے ساتھیوں کو کوارٹر مل چکے تھے اور وہ ہنوز فٹ پاتھ پر زندگی گذار رہا تھا اور یہ احساس بڑا سوہانِ روح تھا کہ اس کے ساتھیوں کے اپنے مکان ہو گئے تھے اور وہ ان میں بڑے آرام سے رہ رہے تھے۔ وہ اپنے گھروں کی طرف کام کے بعد لوٹتے اور اپنے گھروں پر کھانے کھاتے اور اپنے گھروں میں سوتے۔ کبھی کبھی ان کے گھروں سے آیا ہوا دوپہر کا کھانا اس نے بھی کھایا۔ شروع شروع میں اسے اس کھانے اور ہوٹل کے کھانے میں کوئی فرق محسوس نہ ہوا۔ دراصل اسے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ہوٹل کا وہ کھانا جو وہ برسوں سے کھا رہا تھا کس مزے کا تھا۔ لیکن جب اس کے ساتھیوں نے کھانا کھاتے وقت کئی مرتبہ اس فقرہ کی تکرار کی "یار کیا بات ہے گھر کے کھانے کی۔ جو مزہ گھر کی پکی ہوئی دال میں ہے وہ ہوٹل کے پلاؤ میں بھی نہیں۔ کیا بات ہے، کیا بات ہے گھر کی پکی ہوئی چیز کی" تو اس پر ہوٹل اور گھر کے کھانے کا فرق آہستہ آہستہ ظاہر ہونے لگا۔ اس نے دیکھا کہ گھروں میں رہنے والے

اس کے ساتھی شام کو نہادھو کر اپنے کوارٹروں کے سامنے چارپائیاں بچھا کر بیٹھ جاتے اور نہایت گھل مل کر ایک دوسرے سے بات چیت کرتے، اسے بھی اپنے لئے ایک کوارٹر کی ضرورت محسوس ہونے لگی، فٹ پاتھ پر لیٹے لیٹے وہ سامنے چار منزل کے مکان کی طرف دیکھتا اور کھلی ہوئی کھڑکیوں میں سے اسے کمروں میں بند چلتی پھرتی زندگی دکھائی دیتی۔ آسودہ، مطمئن، خطرات سے دُور، خوش اور صاف ستھری، کوئی عورت آئینہ کے سامنے کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی ہوتی۔ بچے بالکونی میں کھیل رہے ہوتے۔ پھر ایک کمرہ میں میز پر کھانا رکھا جاتا اور سب بیٹھے کھانا کھا رہے ہوتے اور کھانا کھانے کے بعد بڑی دیر تک آپس میں ہنس ہنس کر باتیں کرتے قہقہے بلند ہوتے اور پھر آہستہ آہستہ مکانوں کی زندگی خاموش ہونا شروع ہوتی اور ریڈیو سیٹ بند کئے جانے لگتے اور یکے بعد دیگرے کھڑکیاں بند ہونے لگتیں اور پردے گرنے لگتے، اور روشنیاں بجھنے لگتیں، اور صرف کہیں کہیں کسی کسی کھڑکی میں سے ہلکی ہلکی روشنی چھن چھن کر سڑک پر آتی اور تھوڑی دیر بعد وہ بھی بند ہو جاتی۔ رمضان ان مکانوں کو تکتا رہتا۔ اور ان میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کے متعلق قیاس آرائیاں کرتا اور پھر خود بخود کسی نہ کسی طرح سو ہی جاتا ———

کوارٹر ملنے تک کا وقت اس نے بڑی بے چینی سے گذارا۔ کوارٹر ملنے کے لئے جب وہ بہت بے تاب ہوتا تو مل میں اس کے ساتھ کام کرنے والا کوئی شخص کہہ اُٹھتا۔ "اسے کیا کرے گا کوارٹر کا۔ جورو نہ جاتا۔ کسی کا حق مارا جائے گا۔ اے کسی بال بچے والے کو اپنا چانس دے دے ہزاروں دعائیں دے گا۔ ہاں نہیں تو، کوارٹر کوارٹر ——— تو بھلا اس سے پوچھو کیا کرنا ہے اسے کوارٹر کا" اور وہ خاموش ہو جاتا اور سب کی طرف تیز تیز نگاہوں سے دیکھتا جیسے وہ سب اس کے کوارٹر کو چھیننے کے درپے ہیں فٹ پاتھ پر پہنچ کر جب وہ سونے کی تیاری کرتا تو اسے عجیب عجیب خیالات گھیر لیتے۔ اسے ڈر لگتا کہ شاید سب لوگ مل کر اس کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ شاید اسے کوارٹر کبھی بھی نہ مل سکے گا اور اس کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکیں گے، اور دوسرے دن مل میں پہنچ کر وہ خود ہی کوارٹر کا تذکرہ کرتا جیسے وہ ان سب کی سازش کی ٹوہ لے رہا ہو۔ اور پھر اپنی خواہشات کا جواز پیش کرتا۔ جھوٹے وعدے کرتا اور سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ "ویسے تو مجھے کوارٹر کی کیا ضرورت ہوتی۔ مگر ایک جگہ اکیلے آدمی کیلئے تو ہونی ہی چاہیئے جو اپنے گھر والوں سے گھبراؤ اور وہاں آ بیٹھو، بس یہ ہوا کرے گا کہ شام کو میرے کوارٹر پر سب کا ڈیرا جمے گا اور وہ اپنی ہی چیز ہوگی اور لوگوں کے مہمان آئیں گے تو میرے پاس جگہ ہوگی اور سب کے لئے اور سب کے مہمانوں کے لئے مکان ہوگا۔ اپنی چیز ہوتی ہے تو ذرا اچھا رہتا ہے، ویسے مجھے تو ذرا سی جگہ کی ضرورت ہے کسی کونے میں بھی پڑا رہوں گا" لیکن دل میں سوچتا رہتا کہ اس کوارٹر میں کسی دوسرے کا حق نہ ہوگا۔ اسی طرح جیسے دوسروں کے کوارٹر میں کسی تیسرے شخص کا حق نہیں ہے، لوگ اس کے تعمیر کئے ہوئے ان کلموں میں بسنے لگتے اور سب اپنی اپنی خواہشات کی تکمیل کے منتظر ہو جاتے۔ اپنے کوارٹر میں بیوی بچوں کی موجودگی میں وہ شراب نہ پی سکتے تھے۔ یا شاید پینا نہ چاہتے تھے اور رمضان کو کوارٹر ملتے ہی ان کے پاس ایک ایسی جگہ ہوگی جہاں بیٹھ کر وہ تھوڑا بہت شغل اطمینان سے کر سکیں گے۔ تاش بھی کھیل سکیں گے۔ چھوٹی موٹی فضول خرچیاں بھی کر سکیں گے۔ رمضان کا کوارٹر ایک بیٹھک کی قسم کی چیز ہوگا جیسے سارے بابو لوگوں کے پاس مکان میں مردانے کے لئے ایک بیٹھک ہوتی ہے اور رمضان ان سب کو اپنے کوارٹر ملنے کے سلسلے میں دلایل باذ و بنا کر مطمئن ہو جاتا اور اس دن کا انتظار کرتا جب اسے واقعی کوارٹر ملے گا۔ اور یہ سب قلعے دھڑام سے زمین پر آ رہیں گے۔

وہ سوچتا "کبھی کبھی کی اور بات ہے لیکن اس طرح مکان دوسروں کے ہاتھ گرو رکھ دینا کوئی اچھی بات نہیں معلوم ہوتی ویسے یار دوستوں

کے لئے جان بھی حاضر ہے مگر مکان کی اور ہی بات ہے۔ اور پھر کیا معلوم میری شادی کا کوئی سلسلہ ہو جائے مگر خیر اس بات کو جانے دو"
اس طرح کوارٹر کے انتظار میں دن گذرتے گئے۔

——— پھر ایک دن دو کمروں کا یہ ہوادار کوارٹر رمضان کو مل گیا۔ زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس کے سر پر علاوہ آسمان کے کوئی اور بھی مستقل قسم کی چھت موجود تھی، اور اس کے چاروں طرف پختہ دیواریں تھیں اور اس کا اپنا ایک نل تھا جس کے نیچے بیٹھ کر وہ نہا سکتا تھا۔ اور ایک چارپائی تھی جو فٹ پاتھ کے سنگین فرش سے ہر حالت میں زیادہ نرم اور آرام دہ تھی اور اس کوارٹر میں وہ اپنی مرضی سے جسے بھی چاہتا پناہ دے سکتا تھا "کیوں فکر کرتے ہو دوست اب تو میرا اپنا گھر ہے۔ جب بھی جی چاہے چلے آیا کرو، اور پھر دل میں جگہ ہونی چاہئے میرے بھائی کیوں ٹھیک ہے؟" ایک دن پہلے جب اسے معلوم ہوا کہ کل اسے کوارٹر ملے گا تو فٹ پاتھ پر اسے بڑی مشکل سے نیند آئی۔ فٹ پاتھ کے گرم فرش پر سے اٹھتی ہوئی گرمی اس کی کمر میں گھسی جا رہی تھی اور اسے کسی طرح چین نہ آ رہا تھا۔ آس پاس پڑے ہوئے دوسرے سب لوگ اسے بڑے حقیر سے نظر آ رہے تھے "بے شرم سے" ان میں بہت سے لوگوں کا اس نے فرداً فرداً جائزہ لیا۔ ادھر وہ میلے چکٹے ہوئے بالوں والا فقیر پڑا تھا جو چرس پیتا تھا اور رات بھر کھانستا تھا اور جس جگہ سوتا تھا اسی جگہ تھوکتا تھا۔ رمضان کو ابکائی سی آئی مگر خیر صرف ایک رات کی بات تھی۔ خدا خدا کر کے اس سے نجات ملنے والی تھی ——— اس نے گردن موڑ کر دیکھا ایک کالا موٹا مکرانی پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ وہ رمضان کو بڑی حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا اور ہمیشہ "رفیوزی" کہہ کر پکارتا تھا "اس کے باپ کا ہے پاکستان، گدھا گاڑی ہانکنے والے کی اولاد" ——— رمضان نے سوچا اور مسکرا دیا "پاکستان میں ساری عمر گذر گئی الو کی دم ایک مکان بھی حاصل نہ کر سکا۔ جا بے!" رمضان کا جی چاہا کہ اگر مکرانی جاگ رہا ہوتا تو وہ یہ بات زور سے کہتا۔ درخت سے ہٹ کے جو ٹوٹا تخت پڑا تھا اس کے نیچے فقیرنی کسمسائی اور اس کے پیروں کے کانسہ کے کڑے ایک دوسرے سے ٹکرائے اور رمضان ادھر متوجہ ہوا "ایک ہی سال میں بالکل ننگ گئی" رمضان کو فقیرنی سے ہمدردی ہوئی "جیسی کرنی تھی ویسی بھرنی" اس نے معاملہ فوراً رفع دفع کر دیا۔ فٹ پاتھ پر اس آخری رات میں لیٹے لیٹے اگر رمضان کو کسی چیز نے اپنی طرف کھینچا تو وہ سامنے والا چار منزلوں کا مکان تھا جس میں روشنیاں بند ہو چکی تھیں، اور پردے گر چکے تھے اور کھڑکیاں بند کی جا چکی تھیں۔ رمضان کو اپنے آنے والے دنوں میں گذرنے والی زندگی اور اس مکان کے کمروں میں گذرنے والی زندگی میں مماثلت نظر آ رہی تھی۔ ایمپرس مارکیٹ میں لگے ہوئے گھڑیال نے دو بجائے اور رمضان نے سونے کی ایک آخری کوشش کی۔ اور وہ اپنے خیالات میں مگن سو گیا ———

دلّی والے بیوپاری نے صبح اسے اٹھایا اور اس کی طرف سگریٹ بڑھاتے ہوئے رمضان نے اسے اپنے کوارٹر ملنے کی خوش خبری دی اور دلّی والے بیوپاری نے اس کی پیٹھ پر پورا ہاتھ مارتے ہوئے کہا "خوش رہ پیارے تو پھر دیر کیوں کر رہا ہے۔ لے آ نا مٹھائی اسی بات پر۔ لے ملا ہاتھ تو بھی کیا یاد کرے گا"

——— شام ہوتے ہی رمضان اپنے کوارٹر میں گھسا۔ پڑوس کے کوارٹر سے چارپائی آ چکی تھی۔ نل بند ہونے کے بعد سے اس وقت تک وہ پڑوسی کے پاس بیٹھا رہا۔ کھانا بھی اسے پڑوسی نے ہی کھلایا تھا اور کوارٹر میں گھستے ہی رمضان نے ہر چیز کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ نل کھول دیا اور پھر یہ سوچ کر کہ بلا ضرورت پانی ضائع ہو رہا ہے نل بند کر دیا۔ کھڑکیاں کھولیں اور بند کیں کوارٹر کو اندر اور باہر سے

مختلف زاویوں سے دیکھا ہر دفعہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا کہ شاید کوئی دیکھ رہا ہو — اور شاید کوئی اس کی اس حرکت پر ہنس پڑے۔ اس نے کوارٹر کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اور چارپائی پر لیٹ گیا اور پھر اسے وحشت ہونے لگی ————— وہ پریشان ہوتا گیا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ چارپائی پر پڑے پڑے اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ اس نے کروٹ لی اور سفید دیوار سامنے کھڑی تھی۔ وہ چت لیٹ گیا اور اوپر سفید چھت نظر آ رہی تھی، اس نے آنکھیں بند کیں، ہر طرف خاموشی اور سناٹا اور اندھیرا تھا اور اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ گھنٹے نے رات کے نو بجائے اور اس کی وحشت اور بڑھ گئی۔ نو ہی بجے اتنا سناٹا اتنی خاموشی، اس قدر تنہائی، وہ چارپائی پر سے اٹھا اور صحن میں ٹہلنے لگا۔ وہ تھک چکا تھا اور بے کار، بلا مقصد ٹہلنے سے اس کی وحشت میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ وہ پھر چارپائی پر لیٹ رہا۔ اس کی کمر کے نیچے وہ سختی نہ تھی جس کی اس کی کمر کو عادت پڑ چکی تھی۔ اس نے لتا کا کوئی فلمی گیت گانے کی کوشش کی مگر وہ دھن اس سے نہ چل سکی وہ اپنے کوارٹر سے باہر نکلا اور دوسرے کوارٹروں کا چکر لگایا مگر سب لوگ اپنے گھروں میں بند ہو چکے تھے۔ شاید سب لوگ سو چکے تھے، چاروں طرف بالکل خاموشی تھی۔ سڑک کے کنارے ایک جھونپڑی میں چائے والے کی دوکان تھی وہ اس دوکان پر جا بیٹھا اور چائے کا گلاس آنے پر اپنی تنہائی کو چائے اور سگریٹ کے سہارے دور کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ مگر سب لاحاصل سب بیکار۔ اور وہ پھر واپس اپنے کوارٹر میں آیا اور چارپائی پر پڑ رہا اور پھر جب اسی طرح رات کے بارہ بج گئے تو پھر برداشت نہ کر سکا۔ کوارٹر کا دروازہ باہر سے بند کیا اور چل پڑا، بلا سوچے سمجھے، بلا کسی مقصد کے۔

————— "او بھائی ——— چچا میاں اٹھنا دوکان لگانی ہے مجھے یا نہ" دتی والے بساطی نے آواز دے کر اسے اٹھایا ————— "کیوں بے ہوائی کھینچ رہا تھا۔ کوارٹر ٹل رہا تھا تجھے تو کل" اور رمضان نے آنکھیں ملتے ہوئے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور دتی والے بساطی کو ایک سگریٹ دے کر خود ایک سگریٹ سلگایا اور کپڑے جھاڑتا ہل پر کام کرنے کے لئے روانہ ہو گیا —————

سَت بھرائی

احمد ندیم قاسمی

جب وہ پیدا ہوئی اور میراثن نے باہر جا کر عبد اللہ کو بتایا کہ بیٹی ہوئی ہے تو عبد اللہ نے چونک کر کہا "ہیں ؟ بیٹی ؟" پھر وہ ذرا سا رُک کر بولا۔ "بھئی حد ہے۔"

میراثن رونی صورت بنائے کھڑی رہی جیسے عبد اللہ کے گھر میں موت ہو گئی ہے۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ عبد اللہ نے اپنے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا ہے تو وہ چُپ چاپ واپس چلی آئی مگر ابھی صحن کے وسط ہی میں پہنچی تھی کہ عبد اللہ اس کے پاس سے بگولے کی طرح نکل گیا اور بند دروازے پر جا کر پکارا۔ "باآلی۔ ذرا میری بات سُننا۔"

آہستہ سے کواڑ کی چول جیسے "ہائے" کہہ کر رہ گئی اور عبد اللہ کی بہن نے ڈر کر کواڑ کو وہیں روک لیا جیسے وہ ذرا سا اور کھُلا تو بین کرنے لگے گا۔ وہ بڑی احتیاط سے ایک طرف سے ہو کر باہر آ گئی۔ اسکی صورت کچھ ایسی ہو رہی تھی جیسے اس نے اپنی گردن پر میراثن کا سر رکھ لیا ہے۔

عبد اللہ نے باآلی کا ہاتھ پکڑ لیا "کیوں ؟ مُنہ سے خیر نکالنا۔"

باآلی کی آنکھوں میں سے بہت سے آنسو قطاروں میں گر پڑے۔ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "بیٹی ہے۔"

عبد اللہ مسکرانے لگا۔ "حد ہے بھئی۔ سچ کہتا ہوں، تم مجھ سے ایک سال بڑی نہ ہوتیں تو میں تمہارے منہ پر تھپڑ دے مارتا۔"

"کیوں رے دوسلے ؟" باآلی نے حیرت سے عبد اللہ کی طرف دیکھا، اس نے اپنے چھوٹے بھائی کا نام بگاڑ رکھا تھا مگر کچھ یوں کہ اس بگاڑ میں بھی بناؤ کی شان تھی۔

"اس لئے" عبد اللہ بولا۔ "اس لئے کہ تم میرے باپ کی سب سے بڑی اولاد ہو، اور تمہارے بعد میں آیا تھا۔" اس نے ایک مونچھ کو تاؤ دے کر مونچھوں کا توازن بگاڑ دیا۔

اور باآلی نے ہنس کر اس کے منہ پر ہلکی سی چپت مار دی "ہٹ، مچھیل کہیں کا۔"

عبد اللہ نے ہنس کر پیچھے دیکھا۔ اور پھر بولا "شرم کرو باآلی۔ میراثن دیکھ رہی ہے۔"

"تم میرے دیرہو" باآلی ذرا بلند آواز سے بولی۔ "چاہے میں تمہاری مونچھ توڑ کر تمہارے ہاتھ میں دے دوں۔"

"سُنو باآلی" عبد اللہ نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "سُنو۔ اس کا نام سُت بھرائی کیسا رہے گا ؟"

اور جیسے باآلی پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مارے خوشی کے سُرخی اس کے کانوں تک دوڑ گئی اور وہ ادھ کھلے کواڑوں کی طرف لپکی۔ اور مُسکراتا ہوا عبد اللہ باہر جانے لگا۔

صحن کے ایک طرف کھڑی ہوئی میراثن کا چہرہ بالکل خالی ہو کر رہ گیا تھا اور وہ بالکل آؤٹ لگ رہی تھی۔

صحن کی پرلی طرف جا کر عبداللہ رُکا۔ پھر تیزی سے پلٹا اور بند دروازے کے پاس جا کر پکارا "بالی ذرا میری بات سُننا۔"

کواڑ کی چول جیسے "واہ" کہہ کر رہ گئی اور اس کے بالی کا صرف سر باہر نکلا۔ وہ ابھی تک مسکرا رہی تھی۔ "کیا ہے دو۔ لھے؟" اس نے سرگوشی میں کہا "بار بار کیوں بھاگے آتے ہو؟ لوگ کیا کہیں گے کہ اِدھر اولاد ہوئی اُدھر دوڑے آئے۔ شرم کرو۔"

عبداللہ بولا "حد کرتی ہو" پھر آہستہ سے کہا "میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ کیسی ہے بٹیا؟"

"چاند کی ٹکڑی ہے" بالی کی آواز سرگوشی کی حدوں کو پھاند گئی "جہاں پڑی رو رہی ہے وہاں جیسے لالٹین پڑی جل رہی ہے۔ چپہ چپہ بھر تو پلکیں ہیں اور آنکھیں تو جیسے ہیرے پیالی سے مانگ لائی ہے۔ بس؟ اب جاؤ دفع ہو" اور اس نے کواڑ بند کر دیئے۔

اور اگرچہ ست بھرائی کے متوقع سات بھائی کبھی نہ آئے مگر عبداللہ اور اس کی بیوی نیکاں نے ست بھرائی کو وہ ساری محبت دے ڈالی جو بصورت دیگر سات بھائیوں میں بٹ جاتی۔

اسکی پھوپھی نے پہلے روز اسکی جو تصویر کھینچی تھی وہ دراصل ایک ملکا سا خاکہ تھا کیونکہ جب اس کو احساس ہوا کہ دوپٹے کے بغیر ابا کے سامنے چلے جانا بے حیائی ہے تو اس خاکے میں خطوں اور خموں، قوسوں اور دائروں کی ایک دُنیا آباد ہو گئی۔ اور کچھ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ست بھرائی کی تخلیق کرتے ہوئے قدرت نے اپنی حسن کاری پہ کوئی الزام نہیں لینا چاہا تھا۔

ایک بار وہ بیمار ہوئی تو بخار ہفتے سے بڑھ گیا اور عبداللہ پاگل ہوتے ہوتے بچا اور جب نیکاں اپنے شوہر کو اللہ پر توکل کرنے کا مشورہ دے چکی تو خود بھی پاگل ہوتے ہوتے بچی۔ دونوں نے ہاتھ باندھ کر حکیم جی سے کہا کہ اگر بھرائی اچھی ہو گئی تو وہ اپنی زمینیں اور اپنا مکان ان کے نام لکھ دیں گے "آپکے نام سارے مال کی رجسٹری کرانے کے بعد ہی سوچوں گا کہ اب کہاں جاؤں۔"

"کہاں جاؤ گے؟" حکیم جی نے پوچھا۔ وہ مریضوں کو اچھے اچھے مشوروں کے علاوہ موٹی موٹی گالیاں دینے میں بہت مشہور تھے مگر آج ان کے لہجے میں نرمی تھی۔

اور عبداللہ نے نیکاں کی طرف یوں دیکھا کہ اگر حکیم جی کے اس سوال کا جواب وہی دے ڈالتی تو اس پہ کتنا بڑا احسان کرتی۔

اچانک وہ بولا "یہی ایک بیٹی ہماری ساری دنیا ہے حکیم جی۔ یہ نہ رہی تو ——————"

حکیم جی بولے "اچھے باپ اپنے سروں پہ بیٹیوں کی چھینٹیں نہیں ڈال لیا کرتے۔ انہیں چلتا کرتے ہیں۔ شادی بھی تو ایک طرح سے بیٹی کی موت ہی ہوتی ہے نا؟"

عبداللہ اپنے پیار پہ اس پتھراؤ سے بکھر گیا "اُدھر بھرائی کی سانسیں اٹکی پڑ رہی ہیں اِدھر آپ کو رشتوں ناطوں کی سوجھ رہی ہے۔ آپ بھی تو حد کرتے ہیں حکیم جی۔ میں نے تو آپ کی منت کی تھی اور آپ منبر پر جا کھڑے ہوئے۔ حد ہے۔"

اور جب حکیم جی عبداللہ کے لہجے اور تیوروں سے چونکے تو انھوں نے دیکھا کہ نیکاں نے اپنے آنسوؤں سے ان کے جوتے بھگو ڈالے ہیں۔ وہ بدک کر الگ جا کھڑے ہوئے اور عیادت کے لئے آئی ہوئی پڑوسنوں کی طرف ہاتھ اُٹھا کر جیسے فریاد کرنے لگے "بھئی ان دونوں بدذاتوں کو سنبھالو کوئی۔ ذرا سا محرقہ ہے چھوکری کو۔ سات دن کے بعد نہیں اُترا تو تیرہ دن کے بعد اُتر جائے گا۔ اکیس دن کے بعد اُتر جائیگا۔ پر مجھے تو ان گدھوں کی فکر ہے کہ بیٹی کے اچھا ہونے سے پہلے انہی حرامزادوں کے جنازے نہ اُٹھ جائیں۔"

اور حکیم جی نے جو اتنی بڑی بات کہہ دی تھی تو انہوں نے غلط نہیں کہا تھا کیونکہ جب تیرھویں دن بھرائی کا بخار ٹوٹا تو وہ بولی: "ہم تو گھی شکر کھائیں گے پراٹھے کے ساتھ۔"

نیکاں نے آن کی آن میں توے پر دھب سے پراٹھا ڈالا اور عبداللہ شکر سے تنکے چُننے کے بعد کٹوری میں چلّو بھر گھی گرم کرنے بیٹھ گیا۔ اوپر سے حکیم جی آ گئے، انہیں یوں مشغول دیکھا تو بولے: "کیا ہو رہا ہے؟"

عبداللہ بولا: "یہی جی وہ ذرا سی طبیعت چاہی تھی اس کی ——— کیا نام ہے، بھرائی کی۔ پراٹھا کھانے کو ——— وہ تو دہی پک رہا ہے۔"

"میں پراٹھے کو کُتّے کے آگے ڈال دونگا۔" حکیم جی گرجے۔

"حد ہے۔" عبداللہ آنکھیں پھاڑ کر آہستہ سے بولا۔

"زہر خود کھلاتے ہیں مریضوں کو۔" حکیم جی بولتے چلے گئے۔ "اور جب مریض مر جاتا ہے تو حکیم کو صلواتیں سناتے ہیں خنزیر کے بچے۔ مجھ سے علاج کرانا ہے تو میری بات ماننی ہوگی۔ نہیں کرانا تو پراٹھا کیا سنکھیا کھلا دو۔ ابے جاہلو یہ تو سوچو کہ مرگئے کے مریض کو جب تک بخار رہتا ہے اس کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ اصل علاج تو بخار ٹوٹنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔"

پھر وہ اندر گئے۔ بھرائی کی نبض دیکھی، سر پر ہاتھ پھیرا، اور چلے گئے۔

اور شام تک بھرائی کو وہ شدت کا بخار چڑھا کہ آنچ آنے لگی۔

"کیا ہوا؟" حکیم جی نے آتے ہی پوچھا۔ "کیا کھایا تھا اس نے؟"

"پراٹھا۔" نیکاں کے ہونٹوں سے یہ لفظ اچانک یوں ٹپک پڑا جیسے بے خیالی میں ہاتھ سے چلنی کی پیالی گر پڑی ہے۔

"ذرا سا حکیم جی۔ بالکل ذرا سا۔" عبداللہ نے جیسے قتل کے الزام سے بچنے کے لئے اپنی صفائی پیش کرنا شروع کی۔ "بالکل یہ میری چھنگلیا جتنا ذرا سا بھورا حکیم جی۔"

"کیوں دیا؟" حکیم جی گرجے۔

"وہ مانگتی جو تھی حکیم جی۔" عبداللہ بچوں کی طرح بولا۔

حکیم صاحب نے اسی لہجے میں پوچھا۔ "اور اگر یہ تم سے اپنی پسند کا خصم مانگنے لگے تو لا دو گے؟"

عبداللہ زبان سے کچھ نہ بولا مگر گردن کو یوں ذرا سی جنبش دی جیسے کہہ رہا ہے۔ "بھئی حد ہے۔"

"لا دو گے حرامزادو؟" حکیم جی تو ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گئے تھے۔

اندر بھرائی بڑبڑانے لگی۔ "پھر جب گل نام نے ہاتھ رکھ دیئے ——— سبز پری کی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دیئے ——— اپنے ہاتھ رکھ دیئے، تو وہ سبز پری تھی نا۔ تو اس کو نیند آ گئی۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ اے اماں۔ اس چکی کی گھمر گھمر نے تو میرے کان کھا لئے۔ مجھے تو نیند آئی ہے۔ کل پیس لینا۔ آج کوئی برات کو آنا ہے کہ چکیاں چل رہی ہیں؟"

"چکیاں؟" نیکاں نے آنکھیں پھاڑ کر حکیم جی کی طرف دیکھا۔

"چکیاں چل رہی ہیں؟" عبداللہ نے بھی حکیم جی ہی سے پوچھا۔ "کہاں چل رہی ہیں چکیاں؟"

" تمہارے نصیبوں میں مل رہی ہیں " حکیم جی نے کندھے کا نیلا رومال ہاتھ میں لیکر آنکھیں ناک اور داڑھی صاف کی۔ " بھگتو حرامزادہ۔ اپنا کیا کیسا ناچتا ہوا سامنے آیا ہے۔ بھگتو۔ اب اس کے جہیز میں سے کفن کے لئے کوئی کپڑا نکال رکھو "

" حکیم جی " عبداللہ یوں چیخا جیسے اس کے حلق سے چھوٹی بڑی آوازوں کا ایک فوارہ ایک فراٹے سے اُبل پڑا ہے " قسم ہے قرآن مجید کی۔ حکیم ہو گے تو اپنے گھر میں ہو گے۔ ایسی بات پھر مُنہ سے نکالی تو عرق نکال دونگا۔ حد ہو گئی یارو " اور وہ تڑسے گر کر بیہوش ہو گیا۔ اور نیکاں اس سے پہلے چپ چاپ بے ہوش ہو چکی تھی۔

ان کی بے ہوشیوں، بڑبڑاہٹوں اور رت جگوں کا یہ سلسلہ ہفتے بھر تک جاری رہا، بالی نے یہ خبر سنی تو اپنے گاؤں سے بھاگی آئی، علاقے بھر میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ بخار بیٹی کے ہوا ہے اور گرمی ماں باپ کے دماغوں میں چڑھ گئی ہے۔ بیٹیاں اپنے ماں باپ کی ذراسی گھر کی سُنکر فوراً کہنے لگیں " ایک وہ بھرائی ہے خوش نصیب، اور ایک ہم ہیں کمبختیں کہ کوٹھے سے ذراسی نسّی چھلک گئی اور ماں باپ جان کو آ گئے "۔ ہل چلاتے ہوئے کسانوں اور حقہ پیتے ہوئے چوپالیوں سے لے کر تھانے کے سپاہیوں اور تحصیل کے محرروں تک میں یہ بات یوں مشہور ہو گئی جیسے کہیں آٹھ ٹانگوں والا بچھڑا پیدا ہو گیا ہے۔

بخار ٹوٹنے کے بعد بھرائی اتنی تیزی سے تندرست ہونا شروع ہوئی کہ چند ہی دنوں میں جیسے مساموں میں سے خون پھوٹ نکلے گا۔ یوں بھری بھری اور چھلکتی چھلکتی سی کہ جو دیکھتا نظریں ٹوٹ کر رہ جاتیں۔ اب اس کے نتھنوں میں ذرا سا اُبھار آ گیا تھا اور ہونٹوں میں کچھ ایسا بھرا بھرا پن جیسے بالپنے اور جوانی کے درمیان یہی مرحلے کی منزل طے کرنا باقی تھی۔ اسے گنگنانے کی بھی عادت ہو گئی تھی۔ جھاڑو دیتے ہوئے۔ چکی پیستے ہوئے۔ آٹا گوندھتے ہوئے وہ مسلسل گنگناتی رہتی اور جب عبداللہ اور اس کی بیوی نے دیکھا کہ یہ گنگناہٹ بلند ہوتی جا رہی ہے تو ایک دن عبداللہ نے کہا۔ " دیکھو بیٹی۔ یوں گایا نہ کرو "

" کیوں ؟ " بھرائی نے پوچھا۔

" اچھا نہیں ہوتا " عبداللہ نے ازلی وابدی دلیل دی۔

" کیوں اچھا نہیں ہوتا ؟ " بھرائی نے اسی لہجے میں پوچھا۔

" بس نہیں اچھا ہوتا بیٹی " ماں نے فیصلہ سنایا۔

" کیوں ؟ " بھرائی بولی " ہم تو گائیں گے "

عبداللہ گردن کو " حد ہے " کی جنبش دے کے رہ گیا۔

اور نیکاں نے ہنس کر کہا " میری بیٹی کتنی پیاری لگتی ہے ضد کرتے ہوئے "

ضد کرتے ہوئے وہ سچ مچ بڑی پیاری لگتی تھی۔ چپ چاپ جھاڑو دے رہی ہوتی کہ ایک دم جھاڑو کو پٹخ دیتی اور کہتی " ہائے آگ لگے اس جھاڑو کو۔ موئی ہتھیلی کاٹے لے رہی ہے " ———— چکی پیستے پیستے جب بھی ذراسی تھکی تو اسے تھکن کے ساتھ غصہ بھی آ گیا۔ ہتھی کو جھٹکا دیا تو کبھی ہتھی ہاتھ میں چلی آ رہی ہے اور کبھی چکی کا پاٹ کیل سے ہٹ کر جھر رسے پھسلتا آٹے میں ڈوب کر گنڈ توڑ گیا ہے۔ عبداللہ کے سر میں تیل ملتے ملتے اچانک ایک طرف ہٹ جاتی " تم خود تو بابا اپنی زبان سے کہتے ہی نہیں کہ بند کر دو " ہنڈیا تک کو آدھ کچرا چھوڑ کر پاؤں پھیلا لیتی " ہم سے یہ دھواں نہیں پھانکا جاتا۔ اُپلوں کا دھواں بھی کوئی دھوؤں میں دھواں ہے ! "۔ ایسے موقعوں پر اس کا رنگ گلابی ہو جاتا۔ پلکیں جھپکتی تو تھوڑی

تک ان کے ساتھ دوڑ جاتے۔ کانوں کی شفاف لوؤں میں سونے کے ننھے ننھے "دُر" کپکپاتے اور پھر اگر اس وقت ماں نے ڈانٹا تو باپ نے ماں کو ڈانٹ دیا۔ اور اگر کبھی باپ نے گھرکا تو ماں صدقے قربان ہو ہو گئی۔

مگر ایک روز جب ماں نے بھرائی کو ڈانٹا تو باپ بھی اسکی مدد کو نہ آیا۔ وہ صبح کو کھانا کھا کر پڑوس میں گئی اور دن ڈھلے تک واپس نہ آئی۔ پچھلے چند روز سے شہاب خانون سے اسکی کچھ ایسی گاڑھی چھن رہی تھی کہ شام کے بعد بھی اس کے ہاں ایک بار ضرور ہو آتی تھی۔ مگر اس روز تو وہ گھنٹوں غائب رہی اور جب وہ دمکتا ہوا چہرہ اور چمکتی ہوئی آنکھیں لئے واپس آئی تو ماں نے اسے دہلیز پر ہی لیا۔

" یہ چھن اچھے نہیں بیٹی کہ لالی آتے جاؤ اور لالی جاتے آؤ" بھرائی کو ماں کی آواز ایسی خوفناک لگی جیسے وہ اس کے کانوں پر ہونٹ رکھ کر چیخ دی ہے۔

بھرائی دہل کر وہیں رُک گئی۔

عبداللہ بیٹھا چارپائی میں نئی ادوائن ڈال رہا تھا۔ بیگاں کے اس لہجے سے اس کا چونکنا فرض تھا لیکن وہ بھرائی کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے بھرائی کو در اصل اسی نے جھڑکا ہے اور اب وہ اس جھڑکی کے ردِ عمل کا منتظر ہے۔

بھرائی نے باپ کی طرف یوں دیکھا جیسے دھوپ کی شدت میں مسافر گھنے درخت کی طرف دیکھتا ہے۔ مگر جب اس نے باپ کے تیور دیکھے تو دہلیز ہی پر ڈھیر ہو کر یوں لوٹ لوٹ کر روئی کہ اگر ماں باپ غصے میں نہ ہوتے تو مارے صدمے کے تیورا جاتے۔

آج بیٹی کو سینے سے لپٹا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے لئے کوئی آگے نہ بڑھا۔ ماں بولی "ایسی باتوں میں رونا دونا نہیں چلے گا۔ بیٹیوں کو لاڈ پیار دیا جاتا ہے عزت نہیں دے دی جاتی کہ جاؤ پڑوس میں جا کر گھنٹوں بیٹھی منہ پھاڑ پھاڑ کے ہنستی رہو چاہے چادر سر سے اُتر جائے چاہے تہبند گھٹنوں تک اُٹھ آئے۔ اور تم وہاں بیٹھی قصے گاتی رہتی ہو۔ میں نے چھت پر سے سب کچھ دیکھا ہے۔ آج دیکھا ہے پھر کبھی نہ دیکھوں۔ پھر دیکھا تو رسیوں میں باندھ کے بٹھا دوں گی۔ جن ہاتھوں سے مکھن چٹایا ہے انہی ہاتھوں سے تمہارا اور اپنا گلا بھی گھونٹ سکتی ہوں ——— ہاں"۔

اب کے عبداللہ ہڑبڑا کر اُٹھا تو اس کا گھٹنا چارپائی کی پائنتی سے ٹکرا کر تڑسے بج اُٹھا۔ اور وہیں بیٹھ گیا۔ پھر گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر اُٹھا اور ذرا سا لنگڑاتا ہوا بیوی کے پاس آکر سختی سے بولا "بہت کہہ چکیں۔ سب کچھ ایک دم سے یوں نہیں کہہ ڈالتے کہ بات ختم ہو تو زبان لٹک پڑے۔ آج گئی تھی، پھر نہیں جائے گی۔ بس"۔

" ہیں تو جاؤں گی" بھرائی پہلی بار پوری قوت سے چیخی۔

عبداللہ کو پہلی بار محسوس ہوا کہ اسکی بیٹی بدصورت بھی ہو سکتی ہے۔

" نہیں جائے گی تو" اب کے عبداللہ نے اسے ڈانٹا۔

" کیوں؟" بھرائی نے روتے روتے یوں سر جھٹکا کہ اس کے سارے بال اس کے چہرے پر بکھر گئے اور وہ بالوں کو ہٹائے بغیر گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی اور اس کے پہلو دھونکنیوں کی طرح اُٹھنے بیٹھنے لگے۔

" تو کیوں جاتی ہے وہاں؟" عبداللہ نے مردانہ جلد بازی اور اکھڑپنے کا ثبوت دیا۔

" شابی میری سہیلی ہے" بھرائی کی بھرائی ہوئی آواز میں غصے کی رو بدستور چل رہی تھی۔

اب کے نیکاں بولی "وہ تمہاری سہیلی ہے تو یہاں کیوں نہیں آبیٹھتی تمہارے پاس؟ یہاں کوئی اسے تاکنے والا بیٹھا ہے جو ہمارے صحن میں آتے ہوئے اس کے پاؤں کی مہندی اُترتی ہے! اور وہاں تو تھلوں کا رہنے والا اس کا وہ مسٹنڈا چھچھیرا دن بھر پڑا اینڈتا ہے۔ جب سے اپنے ماموں کے گھر آیا ہے مونچھوں کو گھی سے چپڑنے کے سوا اور کام کیا اس نے؟ کہتے ہیں وہ چکوال سے بیلوں کی ایک جوڑی کا انتظار کر رہا ہے پر نہ بیل آچکتے ہیں نہ ہمارا پڑوس ایک لفنگے سے خالی ہوتا ہے۔ اور تم دن بھر اس کے سامنے بیٹھی کیکر پہ انگور چڑھاتی رہتی ہو؟"

نیکاں خاموش ہوگئی۔

عبداللہ بھی جیسے بیٹی کی جوابی دلیل کا انتظار کرنے لگا۔

بھرائی کا رونا بھی بند ہوگیا۔

اس نے گھٹنوں پر سے سر اُٹھایا۔ بالوں کو جھٹک کر پیچھے پھینک دیا۔ آستینوں سے آنکھیں پونچھیں۔ گرا ہوا دوپٹہ سر پر رکھا اور وہاں سے اُٹھ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی چھپر تلے جا بیٹھی۔

عبداللہ نے نہایت غصے میں نیکاں سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا "یوں ایک دم سب کچھ بک دو تو اولاد بے شرم ہو جاتی ہے۔ ایک بار جھڑکا تھا تو پھر ذرا نرمی سے سمجھا دیتیں۔ اس کا دماغ چلا ہے کہ اپنی ضد پہ اڑی رہے۔ اور پھر تم نے تو ایک آدھی کا بھی ذکر کر دیا اس کے سامنے۔ حد ہے بھئی۔ یہ تو آ بیل مجھے مار والی بات ہوئی!"

نیکاں نے کوئی جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ وہ رو رہی تھی۔

عبداللہ کو جیسے نیکاں کے آنسوؤں نے سند دے ڈالی۔ پلٹ کر چھپر تلے جا پہنچا۔ بھرائی اسی طرح گھٹنوں پر بازو پھیلائے اور سر رکھے بیٹھی تھی۔ عبداللہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکی تک نہیں جیسے اسے پیار کے اس مس کا دیر سے انتظار تھا۔ ذرا سے وقفے کے بعد اس نے باپ کی طرف دیکھا اور سرخ آنکھوں میں ایک دم اتنے بہت سے آنسو اُمڈ آئے کہ پتلیاں تک ان میں پگھلتی معلوم ہوئیں۔ اور جب اس نے پلکیں جھپکیں تو آنسو یوں ایک دم اس کی جھولی میں گرنے لگے جیسے کسی نے بھیگا دامن نچوڑ دیا ہے۔

پھر وہیں اس کی ماں بھی آنکلی۔ اس سے لپٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کا ماتھا چومنے لگی۔ اس کی آنکھیں پونچھنے لگی اور پھر عبداللہ سے کہنے لگی "ذرا سی سوجی تو لے آتے۔ آج میٹھا کھلانے کو جی چاہ رہا ہے!"

اس دن سے بھرائی نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ دو روز کے بعد شاہی اس کے ہاں آنکلی۔ چھپر تلے گلے شکوے ہوئے اور بھرائی نے اس سے کہا "تو میری سہیلی ہے تو یہاں کوئی تجھے تاکنے والا بیٹھا ہے جو ہمارے صحن میں آتے ہوئے تمہارے پاؤں کی مہندی اُترتی ہے؟"

شاہی سناٹے میں آگئی اور کچھ دیر تک بیٹھی اسے چپ چاپ گھورتی رہی۔

پھر بھرائی نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں پوچھا "زبان طوطا لے گیا کیا؟"

شاہی مسکرا دی۔ صلح صفائی ہوگئی اور اس کے بعد روزانہ چھپر تلے دونوں کی بیٹھک ہونے لگی۔ شاہی زور زور سے منہ پھاڑ پھاڑ کر ہنستی۔ ہنسی کی ذرا سی بات پر بھرائی کے ایک دو دھموکے جڑ دیتی۔ دوپٹہ سر اور سینے سے گرتا تو گرا پڑا رہتا اور اسی حالت

میں دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں پھنسا کر انہیں سر کے نیچے رکھ کر لیٹ جاتی اور ہولے ہولے سروں میں کیکر پہ انگور چڑھاتی رہتی۔

انہی دنوں گاؤں بھر کے اچھے اچھے گھروں سے مہرائی کے لئے پیغام آنے لگے تھے۔ اور دُور دُور کے دیہات کی نائنیں میراثنیں بھی کسی نہ کسی بہانے مہرائی کو دیکھنے آرہی تھیں۔ اسی لئے جب ایک روز ابھی شابی نہیں آئی تھی تو مہرائی کو اس کی ماں ایک طرف لے گئی اور اسے بتایا کہ "یہ تمہاری شابی تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ لنگوٹ باندھ کر کبڈی کے میدان میں اُترنے کی کسر باقی ہے ورنہ ویسے تو یہ تمہاری سہیلی سب گنوں میں پوری ہے۔ آج کل ذرا لوگ بھی زیادہ آجا رہے ہیں اس لئے احتیاط ضروری ہے۔ سمجھ گئیں نا؟"

"نہیں" مہرائی نے یہ لفظ یوں ادا کیا جیسے پرات میں کنکر گر پڑے۔

"وہ نہ آیا کرے یہاں" نیکاں نے ڈانٹا۔

"تو میں وہاں چلی جایا کروں؟" مہرائی نے پوچھا۔

"نہیں" اب کے ماں نے پرات میں پتھر دے مارا۔

"کیوں؟" مہرائی بولی "نہ میں وہاں جاؤں نہ وہ یہاں آئے تو پھر کیا یہاں بیٹھ کے مجھے چلّہ کاٹنا ہے؟"

"چلّے ہی کاٹنے پڑتے ہیں بیٹی رانی" عبداللہ دروازے میں سے بولا "خاندانوں کی عزتیں بیٹیوں کے چلّے کاٹنے ہی سے بڑھتی ہیں۔"

آج پھر دو طرفہ محاذ دیکھ کر مہرائی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں سکیڑ لیں اور ان پر پلکوں کا سایہ کر کے جیسے کچھ دیر تک کسی فیصلے تک پہنچنے کی کوشش کرتی رہی۔

عبداللہ دروازے پر ہی رکا رہا۔

ماں گھٹنوں پر کہنیاں رکھے اسی طرح بیٹھی رہی۔

اور پھر مہرائی اُٹھتے ہوئے بولی "بہت اچھا۔ نہیں آئے گی"۔

"اور تم بھی نہیں جاؤ گی" ماں نے بھی اُٹھتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا۔ میں بھی نہیں جاؤں گی" مہرائی بولی۔

پھر ایک دم ماں باپ اس کی طرف جھپٹے اور اسے اُٹھا کر پلنگ پر بٹھا دیا۔ ماں نے اسے اتنے پیار کر ڈالے جیسے اسے مہرائی برسوں کے "وچھوڑے" کے بعد ملی ہے۔ باپ دیر تک اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا اور پھر دکان سے سوجی لینے چلا گیا۔

اتنے میں شابی آنکلی۔ ماں اُٹھ کر ایک طرف چلی گئی اور مہرائی نے شابی سے ہولے ہولے کچھ ایسی باتیں کیں کہ اس کے چہرے پر باری باری ساتوں رنگ پھر گئے اور جب وہ اُٹھی تو اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا اور وہ کہہ رہی تھی "ہم تمہارے بغیر مرے تھوڑی جاتے ہیں۔ ہاں"

عبداللہ سوجی لے کر آیا تو بیوی نے اسے بتایا کہ جب شابی واپس گئی ہے تو چہرہ مارے غصّے کے انگارہ ہو رہا تھا اور وہ بکے جا رہی تھی کہ ہم مر تھوڑی جائیں گے۔ "بڑا اچھا ہوا کہ بلا وقت پر ٹلی ورنہ شابی کے لچھنوں کی بات نکلتی تو مہرائی پر آکر ٹھہرتی۔ بے چاری میری بھولی سی گڑیا بیٹی۔"

پیار کا ریلا آگیا تھا اس لئے عبداللہ بیٹی کی طرف بڑھا۔ وہ پلنگ پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ عبداللہ نے جا کر سیدھا کیا تو اس کی آنکھیں سُوج رہی تھیں اور تکیہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ "ارے" عبداللہ بولا "ہائے! یہ تو رو رہی ہے۔ ارے سُنتی ہو نیک بخت۔ مہرائی نے رو رو کر آنکھیں

سجالی ہیں۔ حد ہے بھئی "۔

اور پھر وہ وہیں سے نیکاں کو ڈانٹ پلانے لگا " آخر ایسا بھی کیا کہ آدمی بیٹی کے سرہانے لٹھ لے کر بیٹھ جائے کہ اُٹھے گی تو کھوپڑی دو کر دی جائے گی۔ تمہارے جیسی مائیں مل جائیں ساری دُنیا کی بیٹیوں کو تو ڈولیوں کی جگہ جنازے نکل جائیں ان بے زبانوں کے "۔

ماں قریب آگئی اور بولی " تم مردوں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ آبرو کیڑی کا جالا ہے۔ آندھیاں بھی چلیں تو ایک تار تک نہ ٹوٹے۔ اور کوئی بچہ ہاتھ مارے تو اُنگلیوں میں لپٹا چلا آئے۔ اور پھر تم اندھے تو ہو نہیں کہ گاؤں بھر کے بیٹیوں کی ماؤں کو اپنے صحن میں اُڈکر آتا ہُوا نہ دیکھ سکو " پھر وہ ایک دم رُک گئی جیسے کفر بک گئی ہے۔ عبداللہ سے نہایت آہستہ سے کہا " اِدھر تو آؤ "۔

عبداللہ نے بھرائی کے سر پر سے ہاتھ یوں اُٹھایا جیسے اسے گوند سے چپکا دیا گیا تھا۔ میاں بیوی " چوٹھانے " میں جاکر دیر تک گُھسر پُھسر کرتے رہے اور جب وہاں سے ہٹے تو دونوں کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ عبداللہ نے بڑے پیار سے بھرائی کو چلم بھر لانے کے لئے کہا اور نیکاں چوٹھانے کی سیڑھی پر رکھے ہوئے اچار کے میلے چیکٹ مٹکے کو زور زور سے ہلانے لگی کہ تیل اور مرچیں یکجان ہو جائیں۔

بھرائی نے گھر سے باہر کبھی قدم نہ رکھا اور نہ شابی اس کے گھر آئی۔ البتہ ایک روز شابی نے چھت پر سے بھرائی کی ماں کو ماسی کہہ کر پکارا۔ اس وقت بھرائی سالن کے لئے مسالے کو ذرا سا رگڑ کر دیوار سے لگی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ اس نے شابی کی آواز سُنی تو چونک کر سب سے پہلے ماں کی طرف دیکھا اور ماں نے پلٹ کر کہا " کیا بات ہے شہاب خاتون؟"

بھرائی کا خیال تھا کہ ماں شابی پر برس پڑے گی مگر اس کے نرم لہجے کا سہارا لے کر وہ بھی اُٹھ بیٹھی۔

شابی نے کہا " آج ہماری ہنڈیا جل گئی ہے ماسی۔ ہم تو روکھا ہی کھا لیتے پر آج مہینوں سے وہ میرا بھیجیر پھر آگیا ہے۔ ذرا سا اچار ہو گا؟"

" کیوں نہیں ہو گا؟ " وہ مٹی کی بڑی سی رکابی اُٹھا کر چوٹھانے کی سیڑھی پر رکھے ہوئے میلے مٹکے کی طرف لپکی اور بولی " پر تو سیدھے راستے سے کیوں نہیں آجاتی؟"

" وہ اپنی لاڈلی سے پوچھئے " ، شابی نے کہا۔

اور بھرائی دوپٹے میں مُنہ چھپا کر ہنسنے لگی۔

شابی کو بھی ہنسی چھوٹ گئی مگر اس نے مُنہ کو دوپٹے سے چھپانے کا تکلّف نہ کیا۔

" اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ " نیکاں نے بیٹی سے پوچھا۔

اور بھرائی بولی " اپنی بھانجی سے پوچھئے "۔

پھر دونوں لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں اور ماں نے مسکراتے ہوئے کہا " کمبختیں ہنستی بھی ہیں تو پہیلیاں بوجھواتی ہیں "۔

پنجوں کے بل کھڑے ہو کر نیکاں نے رکابی اوپر بڑھائی۔ شابی منڈیر پر سے آدھی لٹک آئی اور ہاتھ بڑھایا مگر رکابی کو چھُو بھی نہ سکی۔

بھرائی بولی " پیڑھی لے آؤں اماں؟"

" تو سیدھے راستے سے جا کر دے کیوں نہیں آتی؟ " ماں نے رکابی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

بھرائی نے کنکھیوں سے شابی کی طرف دیکھا اور دوپٹہ لہراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہ دیر تک واپس نہ آئی۔ عبداللہ گھر آیا تو بولا " بھرائی نہ ہو تو سارا گھر کیسا اندھیرا اندھیرا سا لگتا ہے۔ کہاں گئی؟"

اور جب نیکاں نے اسے بتایا کہ بھرائی کو اس نے شانی کے ہاں اچار دینے بھیجا ہے تو عبداللہ بولا "چالیس سال کی عمر میں پہلی بار عقل کی کوئی بات کی ہے تم نے۔ آخر یہ بیٹیوں کو قید کرکے بٹھا دینا کہاں کی مانتا ہے؟ شانی کو بھی آنے دیا کرو۔ بات پکی ہو ہی چکی ہے۔ تاریخ پندرھویں مقرر ہوئی ہے۔ چاند گھڑی مار کر اُبھرے گا تو برات چلے گی۔ میں نے بابی کے ہاں بھی نائی کو بھیج دیا ہے کہ گانے دھروانے آجائے۔"

"کس کی برات؟ کیسے گانے؟" بھرائی نے یوں پوچھا جیسے اسٹیج پر ایکٹنگ کر رہی ہے۔

عبداللہ بالکل بوکھلا گیا اور "ہوں ہاں یہ وہ" کرتا رہ گیا۔ ماں نے بڑھ کر بھرائی کا ہاتھ تھاما۔ اسے کوٹھے میں لے گئی اور دیر تک باہر نہ نکلی اور جب نکلی تو ہنستی ہوئی "موئی یہ شادیاں بھی عجیب جنجال ہیں۔ دلہنوں کے پاس قیدی پریوں کا سا حال ہوتا ہے کہ ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ میں نے بھرائی کو بتایا ہے تو یوں تڑپ سے گری ہے جیسے اب جانے اُٹھے گی بھی کہ نہیں۔ اور جو میں نے جھک کر دیکھا ہے تو رویا جا رہا ہے۔"

"رو رہی ہے؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"پھر ہنسی بھی ہے؟"

"ابھی تو نہیں ہنسی۔" نیکاں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پر ہنسے گی۔ ہنسنا تو پڑتا ہی ہے۔ میں بھی جب آئی تھی تو روتی ہوئی آئی تھی نا۔ پھر ہنسنے بھی لگی۔"

"تم تو بن رہی تھیں" عبداللہ نے کہا۔

اور نیکاں نے اسکی پیٹھ پر چٹاخ سے ہاتھ مار دیا۔

اس روز سے بھرائی کی کچھ عجیب حالت ہو گئی۔ لوتھ کی لوتھ جہاں پڑی ہے بس پڑی ہے۔ گھر میں نائنوں میراثنوں کی آجا لگی رہتی تھی۔ بکس کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ زیوروں کی پیزیاں اور گھنگھریاں بجتی تھیں۔ ریشم کپڑے سرسراتے تھے اور گڑ کی بوریوں اور گھی کے کنستروں نے کوٹھے کا ایک حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ مگر بھرائی یونہی پڑی رہتی۔ کبھی کبھی شانی آنکلتی تو وہ پہلو بدلتی اور ذرا سا ہنس رولیتی ورنہ چپ چاپ، آنکھوں میں دھول جھونکے بال اجاڑے میلے کپڑوں میں پڑی چمکتی رہتی۔

اور اس روز شام کو گھر میں گانے شروع ہونے والے تھے جب عبداللہ اور نیکاں صبح کو اُٹھے تو بھرائی کا بستر خالی پایا۔ کچھ دیر تک دونوں بیٹھے انتظار کرتے رہے، پھر نیکاں آنکھیں سیکڑے شانی کے ہاں گئی اور آنکھیں پھاڑے واپس آگئی "وہاں تو نہیں۔"

"حد ہے" عبداللہ نے کہا۔

"آجائے گی" عبداللہ نے جیسے اپنے آپ کو سمجھایا۔

"آ تو جائے گی پر گئی کہاں؟" نیکاں نے پوچھا۔

"میں دیکھ آؤں؟" عبداللہ اُٹھا۔

"کہاں جاؤ گے؟" نیکاں نے پوچھا۔

اور عبداللہ جہاں سے اُٹھا تھا وہیں بیٹھ گیا۔

کافی دیر تک دونوں خاموش رہے۔

پھر عبداللہ اُٹھا اور کوٹھے کے اندر جاکر پلنگوں کے نیچے جھانکنے لگا۔

"بیٹی ڈھونڈ رہے ہو کہ سوئی؟" نیکاں نے دروازے پر سے کہا اور پھر اپنے ماتھے پر تڑاخ سے ایک ہاتھ مار کر وہیں دہلیز پر بیٹھ گئی اور بلبلا بلبلا کر رونے لگی۔

"حد ہے،" عبداللہ بولا "کیوں زمانے بھر میں ڈھنڈورا پیٹتی ہو پاگل کی بچی۔ آجائے گی؟"

"پر گئی کہاں؟" وہ بچوں کی طرح مچل کر بولی۔

اور عبداللہ خاموش ہو گیا۔

ذرا سے وقفے کے بعد عبداللہ نے کوٹھے کے دروازے کا رُخ کیا اور کافی بلند آواز میں پکارا "ست بھرائی"

اور ایک کوّے نے چولھانے کی سیڑھی پر رکھے ہوئے مٹکے کا ڈھکنا نیچے گرا دیا۔

"تیر تیر تیر،" نیکاں کوّے کی طرف جھپٹی اور مٹکے کو اُٹھا کر اندر لے آئی۔ پھر وہیں مٹکے کے پاس ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئی اور بولی "جاؤ اسے لے آؤ کہیں سے"

"کہاں سے؟" عبداللہ نے پوچھا۔

اور نیکاں مرگی کے مریض کی طرح فرش پر لیٹ کر سر جھٹکنے اور پاؤں پٹخنے لگی۔

شام تک سارے گاؤں میں مشہور ہو گیا کہ بھرائی بھاگ گئی۔

شام تک گھبرا گھبرا کر پانی پیتے ہوئے میاں بیوی نڈھال ہو کر نیم بے ہوش سے ہو گئے اور تھکی ماندی نودار دبالی ان کے چہروں پر پانی چھڑک چھڑک کے بے حال ہو گئی۔ وہ گانے دھروانے اور براتیوں کے منہ میٹھے کرانے آئی تھی۔ مٹھائی کا دونا چولھانے کی سیڑھی پر رکھا تھا اور باہر گلی میں گاؤں کے نوجوان یوں بپھرے کھڑے تھے جیسے بھرائی کو بھگالے جانے والا ان سب کو ننگا کر کے چلتا بنا ہے۔

دنوں تک کچھ پتہ نہ چلا کہ بھرائی کہاں گئی۔ دنوں تک لوگ گاؤں کے کنوؤں میں سے کسی کے کراہنے کی آوازیں سنتے رہے، اور دنوں تک حکیم جی یقین سے نہ کہہ سکے کہ عبداللہ اور نیکاں بچیں گے یا نہیں۔ اُنہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر یہ اچھے نہ ہوئے تو بالی کی بھی خیر نہیں کیونکہ دو نیم پاگل مریضوں کی تیمارداری کرنے اور ساتھ ساتھ روتے چلے جانے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

پھر ایک دن عبداللہ کے نام ایک لفافہ آیا جسے حکیم جی نے پڑھ کر سُنایا۔ لکھا تھا۔

جناب والد صاحب۔ قدمبوسی۔

آداب کے بعد عرض ہے کہ میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت خداوند تعالےٰ سے نیک مطلوب ہوں۔ صورت احوال یہ ہے کہ میں اپنی مرضی سے شانی کے پھپھیرے کے ساتھ یہاں مقلوں میں چلی آئی ہوں۔ ہم نے شادی کر لی ہے اور بڑے راضی خوشی ہیں۔ امید ہے آپ ناراض نہیں ہوں گے۔ اور مجھے معاف کر دیں گے۔ اولاد سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ آپنے اجازت دی تو آپ کے پاس جلد ہی آؤنگی۔ والدہ صاحبہ کو قدمبوسی اور مضمون واحد ہے

آپ کی گنہگار بیٹی

ست بھرائی

" حد ہے ! " عبداللہ نے بستر پر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

" قطامہ، حرامزادی، کتیا " نیرکاں نے کروٹ بدلتے ہوئے چنگھاڑ چنگھاڑ کر روتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد اچانک وہ سنبھلنے لگے۔ اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے لگے۔ اور چند روز کے بعد انہوں نے بالی کو بہت سے کپڑے دے کر اسے اپنے گاؤں واپس بھیج دیا۔

راتوں کو وہ دونوں بھرائی کے جوتوں چوتوں اور دوپٹوں کو سامنے رکھ کر روتے، اسے گالیاں دیتے۔ اس کے شوہر کی پشتیں تو م ڈالتے اور نیرکاں کہتی " یہ سارا کیا دھرا اس کنجری کا ہے۔ یہ جو ہمارے پڑوس میں رہتی ہے اسکی سہیلی۔ میں نہیں کہتی تھی کہ منہ پھاڑ کر ہنسنے والے کپڑے پھاڑ کر نکل جاتے ہیں "

" پر وہ تو نہ نکلی "

" خود نہ نکلی پر نکلوایا تو ہے ——— تمہی نے ——— "

" میں نے ؟ " عبداللہ کہتا " تمہی اس پہ پہرہ دیتی رہیں۔ کھلا چھوڑ دیتیں تو آج ——— "

" بکواس مت کرو "

" خود کرتی ہو اور ——— "

" میں کہتی ہوں بکو مت "

" لو اور سنو ——— حد ہے "

مگر ایک روز ماں کے ذہن میں جانے کیا آئی کہ وہ آدھی رات کو بولی " دو لکھے۔ اے سنتے ہو ؟ "

" کیا ہے ؟ " اس نے پوچھا۔

" سوئے نہیں ؟ "

" نہیں "

" سنو۔ یہ جو نشانی کا پھیر تھا۔ تو یہ کچھ ایسا بُرا تو نہیں تھا "

عبداللہ خاموش رہا۔

کچھ دیر کے بعد وہ بولا " ٹھیک کہتی ہو۔ بُرا تو نہیں تھا پر بُرا کر گیا "

" ہاں بُرا تو کیا اس نے "

پھر دونوں سو گئے۔

" سنو " ایک رات عبداللہ نے بیوی کو پکارا۔

" کیا ہے ؟ " نیرکاں نے پوچھا۔

" سوئی نہیں ؟ "

" نہیں "

" اس کے اب تک کتنے خط آ چکے ہیں ؟ "

" چار "

" تو ہم بھی اسے ایک خط نہ لکھ ڈالیں " ؟

" کیسا خط " ؟

" کہ ہم نے تم کو بخشا "

" بیٹی کے ننگا ہو جانے کو بھی کوئی بخش سکتا ہے پگلے ۔ ہم بخشیں گے تو دنیا تو نہیں بخشے گی نا "

" ہاں دُنیا تو نہیں بخشے گی "

" سو جاؤ "

پھر ایک روز انہیں ایک خط ملا ۔

جناب والد صاحب ۔ قدمبوسی ۔

آداب کے بعد عرض ہے کہ آپ کو سُنکر خوشی ہوگی کہ آپ کو خدا نے ایک نواسا دیا ہے ۔ آپ کو مبارک ہو ۔

والدہ صاحبہ کو قدمبوسی اور مضمون واحد ۔

آپ کی بیٹی ـــــــ ست بھرائی

اس روز نیکاں دن بھر بیٹھی چکی پیستی رہی اور عبداللہ نے اتنی چلم پی کہ ہفتے بھر کا تمبا کو ایک دن میں پھونک ڈالا ۔ شام کو وہ ذرا دیر کے لئے باہر گیا ۔ اور جب آیا تو نیکاں نے پوچھا " یہ تمہاری بغل میں کیا ہے " ؟

" تمباکو ہے " اس نے کہا اور کوٹھے کے اندر چلا گیا ۔

نیکاں اس کے پیچھے لپکی ۔ عبداللہ پلنگ پر بیٹھ گیا مگر پھر اچانک اُٹھ کر بولا " کھیس کے نیچے کیا ہے " ؟

" کچھ نہیں "

" کچھ تو ہے " اس نے کہا اور کھیس اُٹھا لیا ۔

نیچے گلابی اور نیلے ریشم کے ٹکڑے ، ایک ننھی سی زریں ٹوپی اور ذرا سی طلائی جوتیاں رکھی تھیں ۔

" میں نے کہا چلو ویسے ہی ـــــــ " نیکاں ہکلانے لگی " دے نہیں سکتے پر بنا تو سکتے ہیں ۔ بنا کے پھینک دیں گے پر بنائیں گے تو ـــــ آخر نواسہ ہے "

عبداللہ زور زور سے ہنسنے لگا ۔ بغل سے پوٹلی نکال کر پلنگ پر رکھی اور بولا " اسے کھول تو "

اور جب نیکاں نے پوٹلی کھولی تو اس میں ریشمی کپڑے کے بہت سے ٹکڑوں کے علاوہ مخمل کی ننھی سی واسکٹ رکھی تھی ۔

دونوں ایک ساتھ جیسے دھما کے کے ساتھ ہنسے پھر یونہی ہنستے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ گئے ۔ اور پھر نیکاں نے بھرائی کے جہیز کے صندوق بھی پلنگ پر کھول کر رکھ دیئے ۔

اور کچھ دیر کے بعد گاؤں کے چوکیدار نے دیکھا کہ عبداللہ اور نیکاں سروں پر صندوق رکھے رات کے اندھیرے میں اس ڈھلوان شاہراہ سے اُترتے جا رہے ہیں جو سیدھی تھلوں کو جاتی ہے ۔

ممتا!

اختر اورینوی

"اللہ، اُو دِن لاوے کی ہم اُنگنا کی اَلگنی پر اُن کا لُنگی دھو کے پساریں!"

اُس نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھاتے ہوئے ایڑی اُلگا کر گاؤں کی ہم راز عورتوں سے کہا۔ گویا وہ منشی جی کی لُنگی واقعی الگنی پر پھیلا رہی ہو۔ اُس کا مٹیالہ گندمی چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اُس کے دھیان میں چھوٹے سرکار کے منشی جی کی سبز چارخانہ دار لُنگی لبسی ہوئی تھی۔

اُن دنوں اُس پر وارفتگی کی کیفیت طاری تھی۔ وہ بیوہ تھی۔ بیوگی کو آٹھ سال ہو گئے تھے۔ یہ دن اُس نے سینے پر پتھر کا سل رکھ کر بتائے تھے۔ لیکن اُس کے قدم ڈگے نہ تھے۔ اُس کے ایک لڑکی تھی، جو اب دس سال کی ہو گئی تھی۔ یہی ایک دو سال کی بچی چھوڑ کر اُس کا جوڑا چکلا کماسُت میاں مٹی میں مل گیا تھا۔ کوکو بالکل اپنے باپ پر تھی۔ چوڑی چکلی، محنتی، خاموش۔ ابھی کوکو اُبھری بھی نہ تھی مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جوانی اُس کی گھات میں چھپی بیٹھی ہے، اب ٹوٹ پڑی کہ تب ٹوٹ پڑی۔

کوکو سیانی ہو رہی تھی۔ اُس کے کس بل کو دیکھ کر ناجو کی آنکھوں کے سامنے اُس کے مرنے والے شوہر کی تصویر پھر جاتی تھی۔ وہ بے چین ہو اُٹھتی تھی۔ رات رات بھر ناجو کو نیند نہیں آتی تھی۔ وہ کروٹوں پر کروٹیں بدلتی۔ ٹھنڈی سانسیں بھرتی۔ اُس کے تن من میں آگ سی لگ جاتی۔ وہ تلملا اُٹھتی۔ زیتون اور حالو کے آباد پہلوؤں کی گرمی کو سوچ سوچ کر وہ انگاروں پر لوٹتی رہتی تھی۔

زیتون اور حالو سے وہ چھیڑ چھیڑ کر "بُری بُری باتیں" پوچھتی۔ گاؤں کی گلیوں میں چلتے پھرتے مردوں کو جھانکتی۔ عورتوں کی ٹولیوں میں بیٹھ کر پھکڑ بکتی۔ گالیوں کو شربت کے گھونٹ کی طرح پیتی۔ مگر اُس کی تشنگی دُور نہ ہو پاتی۔

"مستا گئی ہے!" زیتون کہتی۔

"سنک گئی ہے!" حالو بولتی ——

اور گاؤں کی دوسری عورتیں فقرہ کستیں۔

"چملاوے ہے!"۔ "چونچلا کرے ہے!" "نکل جاگی!"

"بستی کا ناک کٹوا دے گی!" "باپ دادا کا نام اُونچا کرے گی!" ——

مگر وہ کرتی تو کیا کرتی۔ آٹھ سال پہلے ایک عورت اُس کے دِل کی چِتا کے اندر ستی ہو گئی تھی اور اب آٹھ سال کے بعد چِتا کی راکھ سے دیپک کی طرح وہ عورت پھر جی اُٹھی تھی۔ پھر راگ میں آگ کے شعلے سے لپک اُٹھتے تھے۔

ناجو ہنستی، گیت گاتی، ہنسی مذاق کرتی، فحش گالیاں بکتی، روتی اور اکثر کوکو کو کوسنے لگتی یا اُسے دو ہتڑ رسید کرتی۔ کوکو منحوس تھی،

کو کو اُس کے بے درد شوہر کی علامت تھی جو اُسے یوں تپتا سُلگتا چھوڑ گیا تھا۔ بھری جوانی میں مرجانا بھی بڑا ظلم ہے ——— !

نہ جانے اُسے کیا ہو گیا تھا؟ یہ کس اندھیرے سے بھوت جاگ اُٹھا تھا۔ ناجو کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ آخر اُس کے تن بدن میں ایک زلزلہ سا کیوں آ گیا تھا۔ اچانک، انجان طور پر۔ دھرتی اور عورت! عورت اور دھرتی! دھرتی دھمس رہی تھی، پھٹ رہی تھی، پُھنک رہی تھی۔ اندر تاریک شعلے بل کھا رہے تھے۔ ناگ کا پھن پھیل رہا تھا۔ اور اُس میں آتشیں لپس رِس رہا تھا۔ دھرتی ناگ کے پھن پر دھری ہے اور دھرتی کی کوکھ سے عورت جنم کر اُوپر کھڑی ہے۔ کوکھ کے اُوپر کوکھ! ناجو کے اندر عورت چلّا رہی تھی۔ شورِ انگیز شکتی! اور شکتی کی مورت کے ہزار ہاتھ! ناجو کے ہزار ہاتھ خلا میں وجود کی گرفت کے لئے اُٹھ رہے تھے ——— اور پھر ایسا ہُوا کہ چھوٹے سرکار کی ڈیوڑھی اُس کے لئے ہردوار بن گئی۔ وہ دن دن بھر اور رات گئے تک چھوٹے سرکار کی حویلی میں رہتی اور بہلانے بنا بنا کر ڈیوڑھی پر جا براجتی اور باہر جھانکتی رہتی۔ منشی جی کے درشن کے لئے۔

منشی جی گاؤں میں نئے نئے آئے تھے۔ چھوٹے سرکار کے دربار میں۔ رنڈوے تھے اور ابھی کام کے تھے۔ اُن کی خاندانی روایات بھی ہمت افزا تھیں۔ منشی جی کے ایک بھائی نے اس سے قبل گاؤں میں ہومیو پیتھک کی پریکٹس شروع کی تھی اور رہتے رہتے حویلی کی پروردہ ایک باندی سے جو اُن سے عمر میں بڑی تھی، وابستہ ہو گئے تھے۔ منشی جی پر بھی مُعلّق ہستیوں کی نظریں تھیں۔ لیکن ناجو کو تو منشی جی سے گرویدگی تھی۔ عالم فریفتگی میں ناجو بدل گئی تھی۔ اب وہ گلی گلی تاک جھانک نہیں کرتی تھی۔ فحش مذاق سے بھی بچتی تھی۔ وہ ہم راز عورتوں سے اپنے دل کی بات کہتی ———

" اب میرا دلدّر دُور ہوگا بہن! میرا دل کہے ہے کی منشی جی میرے گھر کو بسیئیں۔ بڑے اچھے ہیں منشی جی!"

" کھاک اچھے ہیں! چھچھوندر لے ہے!"

زیتون بول اُٹھتی۔

" نا بہن ہمرے بڑے اچھے لگے ہیں۔ جی چاہے ہے کی اُن کی صُورتیا ہردم دیکھتے رہیں"

ناجو جواب دیتی۔

" دُر ہٹ! کا اچھے لگ ہیں! مُسٹڈھنی تُسٹر ناھنی کے آگے پیچھے تو کرتے رہے ہیں۔ تُسٹر بھُسٹر! مَر!"

حالو ہنستی ہوئی یوں کہتی جیسے منشی جی کی آوارگی اُسکی دل پسند ہو مگر وہ غیر کے لئے کیوں ہو، خود حالو کے لئے کیوں نہ ہو۔ اس لئے وہ بُرے تھے، بہت بُرے! بد انتخاب! ——— اور منشی جی کھیلے کھائے ہوئے تھے۔ بستی والوں نے ایسی ویسی کئی نسبتیں منشی جی کے پاس بھیجیں۔ نہیں، اُنھوں نے کسی ایک کو بھی نہیں کہا۔ زیتون ناجو کی نسبت لے کر گئی اور جاتی رہی۔ ناجو کا یقین اُس کے وجود میں اُتر تا رہا، پیوست ہوتا رہا، پھوُلتا پھلتا رہا۔ وہ منشی جی کی دُھلی ہوئی لنگیاں انگنائی کی اَلگنی پر پسارتی رہی اور لنگیوں پر روز روز دھونے کی نوبت آتی رہی۔ کو کو سے کھانے پینے کی چیزیں منشی جی کو بھجوائی جاتی رہیں۔ اور کو کو پر اب دو ہتھّڑ نہیں برستے تھے۔ کو کو بھی اس آنے جانے اور بھیج بھجاؤ میں دبی دبی دلچسپی لیتی تھی۔ اُس کی بادامی آنکھوں کی سیاہ پُتلیاں مُسکرا مُسکرا اُٹھتیں۔ منشی جی اُسے دیکھ کر ہنستے اور اُسکی اِمٹی سِمٹی میلی کچیلی اوڑھنی کے اندر اُن کے چھوٹے چھوٹے دیدے گھُسے جاتے، جیسے لونڈے امرود کے درختوں میں بے موسم کے امرود ڈھونڈنے کے لئے اپنی گردنیں اکڑائے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں اور کوئی پھل نہیں پاتے۔ مگر کو کو کی بھری بھری شاخیں اب گدرانے والی ہی تھیں۔ منشی جی کا بس چلتا تو وہ کو کو سے ہی اپنی نسبت پختہ کروا لیتے۔ پینتالیس سال کی عمر میں بھی وہ بڑے دل گردے کے آدمی تھے۔ وہ ناجو کو ساس بنانا زیادہ پسند کرتے۔ مگر ناجو اُن کی لنگیوں کے

دو پے تھی۔ آخرش منشی جی نے دوسرے قصبے میں ایک تیرہ سالہ لڑکی سے نکاح کر لیا۔ یہ خبر اُڑتی ہوئی ناجو کے گاؤں پہنچی مگر منشی جی اپنی قدر و قیمت گھٹانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ خود نہ کھلے کہ ماجرا کیا ہے۔ رفتہ رفتہ سوائے ناجو کے سب کو حقیقت معلوم ہو گئی اور اُنہیں یقین ہو گیا کہ منشی جی اپنے بھائی کی پیروی کر کے اس گاؤں کے ہونے والے نہیں۔ لیکن ناجو کب اس بات کو ماننے والی تھی۔ وہ تو منشی جی کو اپنا چکی تھی، اپنے گھر بسا چکی تھی، اپنی سیجیا سُلا چکی تھی۔

سچ بھی بڑی بُری چیز ہے۔ تلخ اور نکیلی، اندر گھسنے والی، پردے چاک کرنے والی۔ سچ، خود بھی ننگا اور دوسرے کو بھی ننگا کرنے پر تُلا ہُوا۔ ناجو کی عقل میں سچ گھس پڑا۔ مگر اُس کے دماغ کے گہرے اندھیارے میں جو اندھی عورت بیٹھی ہوئی تھی اُس کے دیدے نہ کھول سکا۔ دونوں میں پنجے جھاڑ لڑائی شروع ہوئی اور ناجو کو ہسٹیریا کے دورے پڑنے لگے۔ وہ دورے کے وقت بڑی بے حیائی سے منشی جی سے بیاہ رچاتی اور وصل محبوب کے باب میں مثنویوں کی کھال اُدھیڑتی۔ اور اس خواب و خیال کا اثر یہ ہُوا کہ ناجو کے بھائی نے ایک روز اُسکی خوب کندی کر دی۔ اور روزانہ اُسکی کندی ہوتی رہی مگر وہ منشی جی کی لُنگی بھری محفل میں اُٹھا کر دھونے اور سُکھانے پر مُصر رہی۔ لُنگیاں بھیگتی اور سوکھتی رہیں، اور ناجو کا بھُرکس بنتا رہا۔ آخرش تنگ آکر ناجو کے بھائی نے ایک ” لفاتی ،، قسم کے آدمی سے ناجو کا بیاہ کر دیا۔ ناجو دوسرے گاؤں چلی گئی۔ سال بھر کے بعد وہ اپنی کوکھ میں بچہ لیکر واپس آئی اور میکے میں ہی بچّہ پیدا ہُوا۔

اُن ہی دنوں منشی جی ایک ماہ کی چھٹی لے کر گھر چلے گئے۔ جب واپس ہوئے تو بڑے شاداب تھے۔ لوگوں نے تاڑ لیا کہ شادی رچا کے آئے ہیں۔ لیکن اب بھی منشی جی اپنے منہ سے کچھ نہ پھوٹے۔ اب وہ جلد جلد چھٹی لے لیکر گھر جاتے رہے۔ لیکن کب تک۔ چھوٹے سرکار نے روک ٹوک شروع کی۔ سال بھر کے بعد وہ اپنی نئی نویلی کو ساتھ لے آئے اور حویلی سے قریب ہی ایک چھوٹے سے افتادہ مکان کو درُست کرا کر اُس میں اپنی بیوی کے ساتھ رہنے لگے۔

کوکو حویلی میں کام کرتی تھی اور کام کرنے پر مجبور تھی۔ بیوہ ماں کی شادی کے بعد بھی گھر کی حالت نہیں سنبھلی۔ ماموں کے ٹکڑوں پر پہلے بھی پڑی تھی اور بعد بھی پڑی رہی۔ اب یہ ہُوا کہ ماں کو نکھٹو میاں ملا جو خود بھی کبھی کبھی سُسرال ہی آ رہتا تھا، اور کھانے والا ایک منہ اور پیدا ہو گیا۔ جب تک دودھ پیتا ہے تو خیریت ہے ورنہ کوکو کے مُنہ کا لقمہ چھین جائے گا۔ کوکو کی ماں، ناجو نے اُسے مستقلاً حویلی میں رکھوا دیا، "اوپر کما" کے لئے۔ مگر اس اُوپر کما کی فہرست لامتناہی تھی۔ کوکو بڑے صبر سے یہ راہ طے کرتی رہی۔ کرنا ہی تھا اُسے۔

کوکو فرصت کے اوقات منشی جی کی بیوی کے کام کاج بھی کر دیتی تھی۔ اُن کے کام بڑی چاہ سے کرتی تھی۔ وہ انہیں اپنی ہجولی سمجھنے لگی تھی۔ نئی دُلہن کا جی بھی کوکو سے لگ جاتا تھا۔ وہ کوکو کو پھٹے پرانے کپڑے دے دیا کرتی تھیں اور منشی جی اُس سے مذاق کر لیا کرتے تھے۔ دونوں باتیں دلکش تھیں۔

جاڑے کا موسم آیا۔ کوکو کُگڑتی رہی۔ دن تو خیر، رات بڑی ظالم ہوتی تھی۔ رات گئے تک وہ حویلی میں کڑکتے جاڑے کی برچھیاں سہتی ہوئی کام کرتی رہتی تھی، چپ چاپ ایک دن وہ منشی جی کے گھر گئی۔ وہ حویلی سے رات کو واپس ہو رہی تھی۔ جی میں آئی ذرا منشی جی کے وہاں جھانک لیں۔ دونوں میاں بیوی ایک لحاف میں ملفوف ابھی میٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کوکو کوٹھڑی کی چوکھٹ پر جھکی اور ٹھٹھک کر شرم، حسرت اور افلاس کا مجسمہ بنی کھڑی ہو گئی۔

”آؤ کوکو! رُک کاہے گئی، اندر آجا!“ منشی جی کی بیوی نے آنچل ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

”تیرے جاڑا نہیں لگے ہے کوکو؟ جوان ہو رہی ہے نا!“ منشی جی نے اُس کے حُباب سے پرانے اُتارن کُرتے اور جھاگ سے بھٹی پھٹی اوڑھنی کو نگاہوں سے اُلٹ پُلٹ کرتے ہوئے کہا۔

کوکو کی کالی کالی پتلیاں لالٹین کی پیلی پیلی روشنی میں ناچنے لگیں۔ وہ خاموش رہی۔ اندر آ گئی۔ گول گول پتلیاں ٹھہر گئی رہیں۔ اُس نے اپنے پھٹے پھٹے کپڑوں کو ذرا سمیٹ لیا۔

"دیکھو! کوکو کیسا کانپ رہی ہے!" مگر کوکو سردی سے نہیں کانپ رہی تھی۔ وہ انجانے پیچیدہ و تُند جذبات سے کانپ گئی تھی۔ کون جانے اسکی حیات کے کتنے تار لرز اُٹھے تھے! "تم اِسے اپنا مارینے والا پرانا گرم شلوکہ کیوں نہیں دے دیتیں؟"

منشی جی نے بیوی سے کہا۔

"لے گی کوکو؟" بیوی نے رحم کھاتے ہوئے پوچھا۔

کوکو خاموش کھڑی رہی۔ اُس کی گہری سیاہ پتلیاں چمک اُٹھیں، جیسے ادھ سُلگے ہوئے کالے کوئلے سے چنگاری نکل پڑی ہو۔

منشی جی کی بیوی نے ٹین کے پیپے سے مارینے کا شلوکہ نکال کر کوکو کو دیا اور منشی جی نے اصرار کر کے اُسے وہیں شلوکہ پہننے پر مجبور کیا۔ کوکو نے اپنے پھٹے ہوئے کُرتے کے اوپر واسکٹ کی طرح شلوکہ پہن لیا۔ دُلہن جی کا شلوکہ اُسے اَنٹ گیا۔

"ایئیں!" منشی جی بڑے لُطف سے چونکے۔ دُلہن جی نے اپنے اُبھرے ہوئے سینے پر اُچٹتی ہوئی ترچھی نگاہ ڈالی اور پھر کوکو کو مُسکراتی ہوئی گھورنے لگیں۔ کوکو شلوکے کے اُبھاروں کو دامن سے چھپانے لگی، خاموشی اور خود اعتمادی کے ساتھ۔ بہت ہی خفیف سی مسکراہٹ اُس کے بند لبوں کے ایک گوشے میں لہرا کر غائب ہو گئی۔ کوکو اپنے گھر چلی گئی۔

"کس دلہن کا ہے شلوکہ؟" کوکو کی ماں ناجو نے پوچھا۔

"منشی جی کی دُلہن دلہن ہیں،" کوکو نے جواب دیا۔

ناجو اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ گودڑ کے اندر چُھڑ چُھڑ کی آواز اچانک رُک گئی۔ ناجو اُٹھ کر شیرنی کی طرح کوکو پر جھپٹی اور آن کی آن میں اُس نے گرم مارینے کا شلوکہ چھین لیا اور چھین کر خود پہن لیا۔ وہ شلوکہ اُسے اَنٹ نہیں رہا تھا۔ سانس روک روک کر اُس نے اَنٹایا، بہت مشکل سے دو ڈھیلے ڈھیلے سینوں کو کس کس کر، داب داب کر، سیپ کے بٹنوں کے درمیانی حصّے تن تن گئے۔ کئی قوسیں بن بن گئیں۔ اِن بلی بلی قوسین کی زنجیر سے بھی بھرے بھرے سینے نہ دبے اور زنجیر کے حلقوں سے جھانکتے رہے۔ دباؤ سے دودھ اُبل پڑا اور گرم شلوکے پر دو بڑے بڑے نم دھبّے پڑ گئے۔

ناجو نے یہ حرکت سوچ سمجھ کر نہیں کی۔ یہ سب کچھ بڑی بے شعوری سے ہوا، بڑی بے دردی سے۔ ناجو پر ایک جِنّ سوار ہو گیا اور رہا۔ کوکو حیرت زدہ رہ گئی اور اپنے آنسو پی کر گُگڑتی ہوئی سو رہی۔

دوسرے ہی روز گاؤں کی عورتوں میں شلوکے کی کہانی منشی جی اور اُن کی بیوی کی زبانی پھیل گئی۔ ناجو ہر وقت اُس شلوکے کو پہنے رہتی تھی۔ کوکو سے اسکی تصدیق کرائی گئی اور طعنے طشنے کا بازار گرم ہوا۔

"چھی! کوکو سے چھین کر گرم شلوکہ پہن لیس۔ بے شرم بڈھی عورت!" حاجرہ نے نشتر لگایا۔

"کیسی ممتا مر گئی ہے چودھرائن ہیں!" نور رسا نے مصلحانہ شان سے کہا۔

منشی جی کی بیوی جل جل کر ناجو پر وار کرتیں۔ عورت بھی کتنی سمجھ دار ہوتی ہے! وہ تہہ کی باتیں بھان لیتی ہے۔ وہ گہرے بھید پا جاتی ہے۔

منشی جی اِس جلاپے سے اور اُس شلوکے کے تصوّر سے لطف لیتے رہے جس کے پاٹوں میں تین جوڑے سینے متلاطم ہوئے۔

"ہائے غضب! تیری ممتا کہاں مر گئی تھی ناجو؟" زیتون نے پوچھا۔

"تم سب بھی تو حد کر دیے۔ کوّا کان لئے جائے! نہ پوچھ نہ مانت! ارے ہم تو اپنا دودھ گرم رکھنے لا شلوکہ لیا ہے۔ ہفتہ بھر سے لڑکا کو دست پر دست۔ ٹھنڈا ٹھنڈا دودھ پیتے پیتے منٹ منٹ پر دئے۔ ہائے رے ٹے! ہائے کا دل! ہم صد کے سائیں اپنے دونوں لال پر سے!" ناجو نے جواب دیا۔

کنیز

ہاجرہ مسرور

سول لائنز کی سب سے کشادہ اور سب سے خوبصورت سڑک پر میل ڈیڑھ میل کی مسافت سے تھکی ہوئی کنیز اور ان کی دادی سڑک پر جوتیاں گھسیٹتی چلی آرہی تھیں۔ دادی کی چادر لُو میں پھڑپھڑا رہی تھی، کنیز کا پرانا کالا برقعہ تو ہوا کے زور سے کئی بار سر سے اُترا اُتر گیا۔ اس پر سے ننّی اور چھیّ بانّی تو خیر ماں کی انگلی پکڑے بھاگی چلی آرہی تھی مگر چھیّ میں اتنی جان کہاں۔ دادی کا سوکھا جسم، جھکی کمر، اس پر سے کولھے پر چھیّ ——— لُو میں سُرخ تانبہ ہو رہی تھی۔

"اللہ تیرا شکر ہے، ہم نے صبر کیا تو صبر نہ کیجیو" دادی رہ رہ کے کراہ اُٹھتیں، لیکن کنیز بار بار سوچتی، "اماں بیگم تانگے کے لئے دو پیسہ دے رہی تھیں لے لیا ہوتا تو کاہے کو یوں لُو میں بھُنتے، قرض میں بھلا کیا بے عزتی؟ نانی پھر تو اپنی ناک رکھنے کو ادا ہی کرتیں، ویسے لاکھ نخست کریں۔"

مگر اس سوچ بچار کے باوجود سڑک لمبی ہی ہوتی جا رہی تھی۔ جو کوٹھی آتی بس جی چاہتا کاش یہی کوٹھی اپنی ہوتی، جلدی سے اس تپتی سڑک سے بچ کر اندر گھس کر بیٹھ رہتے۔ مگر جب لُو دھوپ میں آنکھیں میچ میچا کر دیکھا جاتا تو ابھی منزل دور ہی نظر آتی ——— نہر کے پل کے ادھر ہی تو اپنی ننھی سی کوٹھی تھی لمبے لمبے شیشم، یوکلپٹس، آم، جامن، اور گولر کے درختوں کے گھنے گھنے سایوں میں دبکی ہوئی کوٹھی۔ یہاں سورج بھی مار کھا کر آتا، لُو بھی غرّاتی آنے کے بجائے ٹھنڈی سسکی لے کر آتی۔

بہرحال حرکت میں برکت ہے۔ ان کی کوٹھی آہی گئی، لپک کر اپنے گوشۂ عافیت میں سب نے پناہ لی، ابھی دروازہ بھی بند نہ ہوا تھا، چادر برقعہ تک نہ اُترا تھا کہ کنیز پر اس کی بپتا نے جھپٹ کر حملہ کر دیا۔ "ارے تو قصّہ ختم"، حسرت ناک تعجب کی لہر میں اس نے اچانک اپنے زانوؤں پر ہاتھ مار کر رونا شروع کر دیا۔

"ارے عشرت میاں، میرے ساتھ تم نے دھوکا کیا، ارے پوچھوں ناؤ کس نے ڈبوئی، کہا خواجہ خضر نے" کنیز نے لہک کر بین کیا اور ماتھا کوٹ لیا۔

دادی نے کپکپاتے ہاتھوں سے چادر اُتاری، پان سے لال ہونٹوں کے گوشے لرزے، ٹھوڑی پھڑکی، چہرے کی ایک ایک جھری کانپ گئی اور میلی میلی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر جھریوں کی راہ سارے چہرے پر بہنے لگے۔ انہوں نے چھیّ کو زمین پر اُتارا تو اس نے تیز آواز میں رونا شروع کر دیا۔ دادی، دادی۔ وہ ایک ہی سُر میں رو رو کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن کنیز کو بے حال دیکھ کر دادی کو اتنا ہوش کہاں رہتا۔

نمّی کو پیاس لگ رہی تھی، اس نے بھی موقعہ غنیمت دیکھ کر پانی پانی پکار پکار کر رونا شروع کر دیا۔

"ارے میرا بچّہ مجھ سے چھڑایا، عشرت، تو اپنی میّا سے چھٹ جائے۔ تو مر جائے عشرت" کنیز نے کچہری میں ممتاز کو عشرت کے حوالے کئے جانے کا منظر یاد کر کے سینہ پیٹ لیا اور بے ہوش ہو کر کھڑے قد سے زمین پر آ رہی۔

اب تو نمّی چھمّی اور دادی نے مل کر وہ ہائے ویلا کی کہ اپنی کوٹھی والے بھی جاگ اٹھے بڑی بیگم ہول کر پلنگ سے اٹھیں تو چابیوں کا گچھا ٹخنوں پر ہتھوڑے کی طرح لگ کر بجا۔ ایک لمحے کو پاؤں پکڑ کر رہ گئیں ——— لیکن پھر فوراً ہی کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئیں سلمیٰ بی نے نہایت سستی سے ایک جماہی لیکر اپنے آپ سے کہا۔

"فیصلہ ہو گیا شاید،" اور پھر کروٹ بدل لی۔

"کنیز، اے کنیز ادھر تو آؤ کیا ہوا؟"

"ہائے کنیز کہاں، کنیز تو چل دیں" دادی کی پھٹی ہوئی آواز گونجی اور بڑی بیگم ننگے پاؤں ہی ادھر بھاگیں۔ پیچھے سے سلمیٰ بی بھی اپنا ساٹن کا پیٹی کوٹ سنبھالتی نکلیں ——— "چل دی؟ لو بھئی غضب ہو گیا۔ اب کیا کریں؟" کلیجے میں پنکھے سے لگ گئے۔

مگر کنیز تو وہاں موجود تھی، مری بھی نہیں تھی۔ کیسی صاف سانس چل رہی تھی۔

"اے اصغری بیگم تم نے تو دہلا دیا، کیا ہوا؟" بڑی بیگم کے ننگے تلوے جیسے ابھی تک بھوبل پر تھے۔

"ہونا کیا بیٹی، نصیب کے لکھے پورے ہو گئے، کبھی ہمارے گھروں میں کاہے کو ایسا ہوا تھا، اس پاکستان نے مٹی خراب کر دی ———"

"رہنے دو بُوا رونے دھونے کو، اچھا ہوا کمبخت سے لونڈیا کا پنڈ چھوٹ گیا۔ مہر کا کیا فیصلہ ہوا۔ لڑکا تو اسی کو مل گیا ہوگا، لڑکیاں بھی اس کے منہ پر پھینک دی ہوتیں۔ گندی بوٹی کا گندہ شوربا!"

"ارے بیٹی کوئی اولاد کیسے چھوڑ دے، ارے میں تو ہائے پیسے کی محبت میں گھر سے بے گھر ہو گئی، یہ تو اس کے اپنے جنے ہیں۔ لڑکے کے غم میں بے ہوش پڑی ہے۔" نانی نے رو رو کر کہا۔ بڑی بیگم نے کنیز کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ کنیز نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ کٹورا بھر پانی پیا اور سر پکڑ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔

بڑی بیگم نے کنیز کو اپنے کندھے سے لگا لیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں۔ "ادی کنیز تُو تو میری بچّی ہے تو کس بات کی فکر کرتی ہے۔ شکر کر تیرا اس کمبخت سے چھٹکارا ہو گیا۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے؟ دیکھ لینا ایسی جگہ بیاہوں گی کہ تو اپنی خوشیوں میں مجھے بھی بھول جائیگی۔ پرسوں ہی تیری بات آئی تھی۔ لڑکا پانسو کا نوکر ہے۔ میں نے کہہ دیا، بھئی ابھی لڑکی کا فیصلہ نہیں ہوا۔ پھر مجھے لڑکے کی صورت شکل بھی پسند نہ تھی۔ اے اصغری بُوا جیسی اپنی کنیز کی شکل صورت ہے ویسا ہی جوڑ کا لڑکا بھی ہو"

اس دوران میں سلمیٰ بی جا چکی تھیں۔ یہ سارے کام انہوں نے اپنی اماں پر چھوڑ رکھے تھے۔ انہیں تو بس اپنے کام سے کام تھا ——— دادی نے گھور کر سلمیٰ بی کو کوٹھی کی طرف جاتے دیکھا، انہیں یہ لونڈیا پھوٹی آنکھ نہ بھاتی۔ کنیز سے تو کافی ہنس بول لیتی، مگر دادی کو دو انگلی سلام بھی نہ کرتی، جیسے وہ اس کی نوکر ہوں۔ واہ غریبی میں کہیں کوئی شرافت مر جاتی ہے۔ دادی کو کیا پڑی تھی جو کسی کی خوشامد کرتیں، ان کے اپنے بڑے میاں کا مراد آباد میں اچھا بھلا پکّا مکان تھا ——— وہ تو آئے دن خط لکھتے رہتے کہ آجاؤ تم نے اپنے بھانجے کی اولاد کے لئے میرا ساتھ چھوڑ دیا، مگر وہ بے چاری لاولد تھیں اپنے مرحوم بھانجے کی ذرا سی بچی کو اولاد کی طرح پالا، شادی بیاہ کیا، اب یہ قسمت کہ اس کا میاں پاکستان آیا تو

وہ بھی دیوانی بنی اس کے پیچھے چلی آئیں۔ پالے پوسے کی آگ تو پیٹ میں رکھنے کی آگ سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے۔ مگر یہ باتیں آج کل کی لڑکیاں خاک سمجھیں؟ —— وہ تو بڑی بیگم کی مروّت تھی جو دادی سلمیٰ بی کے تیوروں پر کچھ نہ کہتیں۔ اور پھر اس وقت تو جہاں سلمیٰ بی یوں بیٹھے بیٹھے مٹکتی چلی گئیں وہاں بڑی بیگم نے سب کو اپنوں کی طرح سمیٹا اور اپنے کمرے میں لے گئیں۔

ان کے کمرے میں پلنگ دو ہی تھے، ایک پر سلمیٰ بی پہلے سے مسٹ مارے پڑی تھیں، اب بڑی بیگم کی مسہری پر اتنے لوگ کیسے بیٹھتے سو فرش پر ہی پاندان کھلا۔ دکھ سکھ کی یادیں ہوئیں اور خوب ہوئیں۔ دادی روئیں، کنیز آنچل منہ پر ڈال کر سسکی تو بڑی بیگم کی آواز بھی بھرا بھرا گئی۔ سلمیٰ بی نے بڑی بیگم کے اتنے خلوص پر سونے میں کئی بار ہوں ہوں بھی کی۔ آخر بیٹھے بیٹھے بڑی بیگم کی کمر میں درد ہونے لگا اور وہ دادی کے اصرار پر اپنے پلنگ پر لیٹ گئیں۔ مگر اس وقت بغیر کنیز کے چین کہاں —— بولیں "کنیز بیٹی میرے پاس آجا، ارے میں کہتی ہوں منہ سے کہنے کا بھی کیسا پیار ہوتا ہے، تجھے بیاہوں گی تو کیسے قرار آئے گا؟"

یہ سُنکر دادی کے دونوں ہاتھ قبلے کی طرف اُٹھ گئے۔ اللہ بیکسوں کے لئے تو ہی دنیا میں فرشتے بھیج دیتا ہے۔ دادی کی آنکھیں ایک بار پھر پُر آب ہو گئیں۔ اور کنیز کے زخموں کی جلن کچھ کم ہو گئی۔

وہ شرماتی، پائینتی بیٹھ گئی۔ بیگم سے اسکی عقیدت پیروں ولیوں سے بڑھ کر ہو گئی۔ بیگم نے اُٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیر اگر پھر فوراً ہی گٹھیا کے درد سے مجبور ہو کر اپنے ہاتھوں اپنی پنڈلیاں مسکنے لگیں۔

"اماں بیگم سو رہیئے" کنیز نے انہیں زبردستی لٹا دیا اور ان کی پنڈلیاں مسکنے لگی۔ بڑی بیگم نے بہت نہیں نہیں کی۔ دادی کو بھی کنیز کی اتنی عقیدت آنکھوں ہی آنکھوں میں کھل گئی مگر وہ ایک نہ مانی۔ اس نے سوچا "کیا ہوا کوئی اپنی ماں کے پاؤں دبانے میں بے عزتی ہووے ہے —— ارے یہ ماں نہیں تو اور کیا ہیں۔ انہیں ہم سے کیا میٹھا لالچ، اس اُجڑے دیس میں کون کسی کو پوچھتا ہے۔ ایک یہ بے چاری اپنی طرف کی مل گئیں جنہوں نے اپنا بنا کر گھر میں جگہ دے دی، ورنہ اماں بیگم کوئی غلط تو نہیں کہتی ہوں گی کہ سارے پنجابی پنجابی بھرے پڑے ہیں اس دیس میں، "آپ جناب" ہُنک کا مذاق اڑاتے ہیں —— مگر عشرت کو یہ سب سوچنے کی کیا ضرورت تھی، طلاق کے دو بول لکھ کر دے دیئے اور اپنی کوٹھڑی سے یہ کہہ کر نکال دیا کہ اب تمہارا مجھ سے پردہ واجب ہے۔ یہ نہ سوچا کہ اپنے مراد آباد میں اس طرح کرتے تو ایسا کچھ بُرا نہ تھا۔ وہاں میّا نصیبوں جلی کا گھر تو تھا، لاکھ سوت سوتنیلوں میں گھری سہی پھر بھی ایسے موے تعے پر سر پر ہاتھ تو رکھتی۔ وہ بھی چلو مجبور سہی، پر دادی کا گھر تو تھا اپنی سگی پوتیوں سے زیادہ سمجھ کر پالا، دادا اس بڑھاپے میں بھی ہر طرح مدد کو تیار ہوتے —— پر اس پاکستان میں تو دادی غریب کا ساتھ بھی اس حالت میں نہ ہونے کے برابر —— دادا کا پیسہ کوڑی بھی آنے کا کوئی راستہ نہیں —— نہ یہاں رہنے کا کوئی وسیلہ نہ جانے کی آس۔ اپنے غیر ہو گئے ارے یہ جنم کا ساتھی اس نے تو ایسی آنکھیں پھیریں کہ طوطا بھی کیا پھیرے گا۔ یہ نہ سوچا کہ اس بڑے شہر میں کہاں جاؤں؟ نہ عدّت گزارنے کی جگہ نہ مہر، نہ بچوّں کا گزارہ۔ پھر دعویٰ کیا تو وہ بھی بُرائی۔ کہتا ہے ویسے تو گزارہ دیتا پر اب ضد آ گیا ہوں۔ ارے ایسی ہی جی میں ٹھانی تھی تو پھر پاکستان کیوں بلوایا، اتنے دن سے جدائی تھی، سمجھ لیتے مر کر چھوٹ گئی —— پھر یہاں بلا کر منجدھار میں چھوڑ دینے کا کیا تُک۔ وکیل تو کہتا تھا اب مراد آباد میں جا بسنا بھی مشکل ہے، پرمٹ مہینے دو مہینے کا ملنے گا —— دادی کو تو شاید دادا کی وجہ سے رہنے کی اجازت بھی مل جائے پر میرا مشکل ہے۔ ہائے کیسا بے گھر بے در کیا۔ ارے عشرت تیرے پیارے تجھے رو دیں ——

اور کنیز پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی —— بیگم سو چکی تھیں۔ دادی بھی تھکی ہاری اونگھ گئی تھیں۔ سب صبر کر بیٹھے تھے۔ مگر کنیز کو صبر کیسے آجاتا

سات سال کا پالا پوسا لڑکا چھن گیا، اب پتہ نہیں ممّی چھّی کا کیا بننا ہے۔ دادی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہیں خود اسکی ایسی عمر نہیں کہ اکیلی کہیں محنت مزدوری کر کے پیٹ بھر لے۔ بقول بڑی بیگم۔ چوبیس پچیس کا سن، صورت شکل کی کھوٹو ایسی کہ بس فوٹو سا کھنچا ہوا۔ اس پر بھی عشرت بدنصیب کا دل دوسری جگہ اٹکا۔ مراد آباد سے نوٹوں کی پیٹی باندھ بیوی بچوں کو چھوڑ پاکستان چلے کہ بس جیسے ہی وہاں برتنوں کا کارخانہ چلا، سب کو بلا لوں گا ——— دادی تو عشرت کے لچھّن سے خوب واقف تھیں، اس پر سے کنیز کی طبیعت کی تیزی بھی ان سے کچھ چھپی نہ تھی ——— جب عشرت نے کنیز کو جھوٹوں بلایا تو انہوں نے فوراً ہی آنے کی تیاری کر دی۔ کنیز کو اکیلے کیسے بھیجتیں۔ دنیا نہ کہتی کہ لونڈیا کو اکیلے پردیس جان بوجھ کر بھیجا۔ یا اور خود بڈھے خصم کے کوٹھے سے لگی بیٹھی رہیں۔ سوچا لڑکی ذرا اس بس لے تو پھر چلی جاؤں گی۔ مگر یہاں آ کر جو دیکھا تو کارخانہ وغیرہ سب چوپٹ اور عشرت میاں ساٹھ ستّر کے کسی دوکان پہ ملازم اور ایک بنگلے کے سرونٹ کوارٹرز کی ایک کوٹھڑی کے پانچ روپیہ مہینے کے کرایہ دار۔ دادی کلیجہ مسوس کر رہ گئیں۔ انہی حالوں ہوتے جب بھی گزر ہو جاتی، مگر ان ساٹھ ستّر میں عشرت کی دل لگی بھی تو چلتی ——— اور کنیز کی زبان چلتی ——— دادی لاکھ کنیز کو لگام دیتیں مگر وہ تو آپے ہی نہ تھی ——— اور ایک دن عشرت نے بدزبانی اور فضول خرچی کے الزام میں طلاق لکھ دی ——— لڑکے کا ہاتھ پکڑا، اور کنیز کو ہانک کر کوٹھڑی میں تالا ڈال دیا ——— نہ کوئی داد نہ فریاد ——— اور جب کنیز اور دادی روتی پیٹتی کسی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر کی تلاش میں نکلیں تو بڑی بیگم تک پہنچ ہو گئی۔ پہلے تو بہت بے رخی سے پیش آئیں۔ مگر جب دکھیاریوں کو بے آسرا دیکھا تو پگھل گئیں، نہ صرف کوارٹر مفت رہنے کو دیا بلکہ کنیز کو بیٹی تک کہہ دیا ——— مانگنے والے کی قسمت ہے، آگ مانگے اور پیمبری تک مل جائے۔

اور بڑی بیگم جو اب کنیز کی اماں بیگم بن چکی تھیں، اس وقت گٹھیا کے درد سے نجات پا کر گہری نیند میں منہ کھولے سو رہی تھیں۔ اور کنیز ان کے پائینتی بیٹھی، اب چپکے چپکے آنسو بہا کر تھک چکی تھی۔ اپنا کوئی پیارا مر جائے جب بھی رو دھو کر صبر تو کرنا ہی پڑتا ہے ——— رفتہ رفتہ طبیعت ہلکی ہو ہی جاتی ہے۔

کنیز کی طبیعت تھوڑے ہی دنوں میں ہلکی کیا بس پھول سی ہو گئی، اب عشرت کی حیثیت کنیز کے لئے ویسی ہی تھی جیسی بچپن میں دادی کے منہ سے سُنی ہوئی کوئی اُدھوری کہانی۔ جیسے سناتے سناتے دادی کی آنکھ لگ گئی ہو اور کنیز دادی کے خراٹے سُن کر دو چار منٹ بعد ہوں ہوں کرتی خود بھی سو گئی ہو ——— اور جب صبح آنکھ کھلے تو کٹورا بھر دودھ باسی روٹی، اور کپڑے کی گڑیوں کی بڑی بڑی نمک پاروں جیسی آنکھوں کے سامنے کہانی یاد کرنے کی کسے فرصت؟ کسی کی یاد آنے کے لئے بھی تو فرصت چاہیئے اور کنیز کو اب اماں بیگم کی کوٹھی میں اتنی فرصت کہاں تھی ——— دادی عشرت کو کوستیں تو کنیز منہ بنا کر کہتی "اے دادی تمہیں کوئی کام نہیں کیا، جو بیٹھی اس کے نام کی مالا جپ رہی ہو۔ مجھے تو اس کے نام سے اپنا بچہ یاد آوے ہے۔ اللہ اسے کبھی تو اتنی سمجھ دیوے گا کہ اپنی میّا سے آ ملے گا باوا حرامزادے کے منہ پر تھوک آوے گا!"

اور اتنا کہہ کر کنیز آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پلکوں میں پروئے لپک کر کسی کام میں جُٹ جاتی۔ بجلی کی طرح ساری کوٹھی میں کوندتی پھرتی۔ اور دادی پر ایک نیا غم شام کے اندھیروں کی طرح اُترنے اور چھانے لگتا۔ دادی اس کے یوں جھلک دکھا کر غائب ہونے کی نئی ادا سے ہول جاتیں۔ وہ کنیز کے سامنے بیٹھ کر اسکی بدنصیبی پر رونا چاہتی تھیں، تاکہ کنیز یہ نہ بھولے کہ دادی اسکی کتنی مامتا رکھتی ہیں، مگر وہ تو اب

کنیز کی صورت کو ترس جاتیں۔ وہ اس کے پیچھے لپکتیں، مگر ان کی ٹانگوں میں وہ پھرتی کہاں۔ وہ کنیز کے تعاقب میں کوٹھی کے باورچی خانہ میں پہنچتیں، اتنے میں کنیز سلمیٰ بی کے کمرے میں بولتی سُنی جا سکتی تھی۔ کانپتی کراہتی دادی برآمدے طے کر کے وہاں پہنچتیں تو کنیز لان میں کھڑی کرسیاں ترتیب سے رکھتی دکھائی دے رہی ہے، ان حالوں پر دادی اپنی پھٹی ہوئی آواز میں چلّانے لگتیں۔

"اری کنیز تو بے حیا چھلاوہ ہو گئی۔ کمبخت عدّت میں تو شریف زادیاں اپنی کوٹھری سے باہر بھی قدم نہیں رکھتیں ہیں ——— اری ایسا گھر اُجاڑا اپنے گھر میں دکھایا ہوتا تو کاہے کو عشرت تھوک کر چھوڑ دیتا جو در بدر مارے پھرتے ———؟"

اس اعلان سے ساری کوٹھی گونج جاتی اور بڑی بیگم پر صدمے کا دورہ پڑ جاتا۔ سلمیٰ بی کا مہاسوں بھرا چہرہ تیوریوں پر بل پڑنے سے اور بھی زہر ہو جاتا۔

بڑی بیگم کہیں سے برآمد ہوتیں، چہرے پر رنج و ملال کا گہرا عکس لئے۔ کنجیوں کے بوجھ سے لٹکا ہوا کمر بند نیفے میں اڑس کر اور کنیز کو گلے لگا کر غم میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہتیں ——— "جاؤ بیٹی اپنی دادی کے پاس، ہم تمہارے ساتھ کچھ کریں کہلائیں گے غیر ——— ایک ذرا تم اپنی خوشی سے ہاتھ ہلا دو تو تمہاری دادی جان کو کھل جاتا ہے ——— اے حمیدو کہاں مر گیا؟ آ کر بستر باہر بچھا!"

اور کنیز کا خون جیسے نچڑ جاتا۔ یہ دادی تو پیر تسمہ پا ہو گئی تھیں اس کے لئے۔" ان کا دل ذرا بڑا نہیں۔ اماں بیگم کیسی تو محبت کرتی ہیں اور دادی کا یہ حال کہ بس چاہتی ہیں ان کا ذرا سا کام بھی نہ کروں، ارے اب اپنے پاس اُجڑ کر کسی کا احسان اتارنے کو رہ کیا گیا ہے۔

کنیز دادی کو سمجھا سمجھا کر تھک گئی۔ مگر دادی کی سمجھ میں خاک نہ آتا، ہزار اُلٹی باتیں کرتیں۔ کہتیں" انہوں نے بیٹی بنایا ہے تو ٹھیک ہے، جلدی سے کوئی لڑکا ڈھونڈھ دیں، عدّت ختم ہونے پہ نکاح ہو جائے، تو میں بھی تیرے دادا کا آخری وقت میں سامنا کروں۔ نہیں تو چل اپنے مراد آباد وہیں کہیں تیری ہو جائے گی۔"

"اب کوئی دادی کی باتیں دیکھیے؟" کنیز کھسیا کر کہتی اب کوئی لڑکے بھی آٹا دال کی طرح مٹکیوں میں بھرے رکھے ہیں جو ایک نکال کر اماں بیگم نکاح پڑھوا دیں ——— پھر وہ کچھ غلط تو نہیں کہتیں کہ بھئی لڑکا بھی تو کچھ لڑکی کی ٹکر کا ہو۔ ایسی صورت پہ تو بڑے بڑے آ کر ٹپکیں گے۔ جلدی کا کام شیطان کا۔ سہج پکے سو میٹھا ہو ——— کنیز آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر بڑی بیگم کی دُور اندیشی کی قائل ہو جاتی۔

لیکن دادی کو کسی طرح صبر نہ آتا۔ وہ تو مراد آباد سے جو کچھ زیور اور برتن کی شکل میں لائی تھیں، سب ایک ایک کر کے راشن اور ترکاری پر اُٹھتا جا رہا تھا۔ ایک دو نہیں، چار چار جانیں کھانے والی۔ کچہری سے لڑکیوں کا گزارہ تو بندھنے کا حکم ہو گیا مگر وصول کون ہو کچہری والا جا کر کرے۔ دادی دو ایک بار جوتیاں گھسیٹتی عشرت کی کوٹھری تک گئیں تو لگا بڑبڑانے "کہاں سے لاؤں؟ میری نوکری تو چھٹ گئی جاؤ دعوے دائر کر دو ———"

"لو بھلا اب روز روز دعوے کرنے کا کس بس ہوتا؟ دادی اپنا سا منہ لے کر چلی آئیں۔ کہنے کو تمی چار برس کی اور چھی دو برس کی مگر کھانے والی برابر کی۔ بچوں کو دودھ ملائی ملے تو روٹی کی طرف نظر بھر کر نہ دیکھیں، مگر وہاں تو لے دے کر وہی روٹی۔ روکھی سوکھی کھا کھا کر لڑکیوں کے معدے پھیل گئے، پیٹ بھر جاتے نیتیں نہ بھرتیں۔

بڑی بیگم یہ ساری مجبوریاں دیکھ سمجھ کر کنیز سے کئی بار کہہ چکی تھیں کہ لڑکیوں کو موئے عشرت کے سر مارو، کیوں جی کا جنجال بنا رکھا ہے۔

مگر کنیز رو پڑتی۔ اس کا ایک بچّہ تو چھن ہی گیا تھا۔ اب ان کو کس دل سے جدا کرے ——— یہ دیکھ کر بڑی بیگم کی آنکھیں بھی بھر آتیں۔

"اب دیکھو برس دن ہونے آتا ہے، الطاف میاں ولایت میں پڑے ہیں۔ ہر وقت اس کی جدائی سے کلیجہ سُلگتا رہتا ہے" یہ کہہ کر بڑی بیگم بھی بے اختیار آنسو بہانے لگتیں۔ اور جب دونوں طرف برابر کی آگ لگ جاتی تو کنیز اپنا غم بھول کر بڑی بیگم کے گلے سے لگ جاتی "ہائے رومت اماں بیگم"۔

اور بیگم آنسو پونچھ کر کنیز کے سر پر ہاتھ پھیرتیں "بچّی تُو نے تو سلمیٰ سے زیادہ مجھے سُکھ دیا، سلمیٰ تو کبھی پوچھتی بھی نہیں کہ اماں مرتی ہو یا جیتی ہو۔ گٹھیا سے سارا بدن پھوڑے کی طرح دُکھتا ہے، کبھی اس اپنی جنی سے یہ نہ ہوا کہ ———"

اور کنیز جلدی سے انہیں لٹا کر ان کے پاؤں مسکنے لگتی۔

لیکن اگر کہیں سے دادی یہ راز و نیاز دیکھ لیتیں تو جل جاتیں۔ بس وہ تو چاہتیں کہ کنیز سوائے ان کے کسی سے محبت نہ کرے، خواہ کنیز کو کوئی اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہے۔

"کنیز ادی کنیز ارے سنبھال اس حرامزادی چھچھوڑی کو میری جان کھائے لیوے ہے۔ رات دن کولھے پر چمبی رہوے ہے۔ ارے انٹر حرامزادی نہیں تو اُٹھا کر پٹخ دونگی۔ ہائے میری کمر ٹوٹ گئی اللہ!" دادی بھاں بھاں کر کے ایسا چلاّتیں کہ ساری کوٹھی دہل اُٹھتی۔ سلمیٰ بی کو تو اپنی اماں کا ذرا زور سے بولنا تک بُرا لگتا۔ آخر کوٹھی میں رہنے کے بھی کچھ تو آداب ہوتے ہیں۔ مگر کنیز کی صورت دیکھ کر صبر کر جاتیں۔

کنیز سلمیٰ بی کا کامدانی والا دھانی ڈوپٹہ اوڑھے دادی کے پاس کھسیائی ہوئی آتی۔

"اے دادی کچھ تو ہوش کی دوا کرو، لوگ سمجھیں گے شریفوں والی عادتیں ہی نہیں ———" یہ کہہ کر وہ ڈوپٹہ لہرا کر سر پر ڈالتی، "لاؤ میری لونڈیا کو، تمہیں تو میری اولاد کھلے ہے، ایک تو چھن گیا" اور وہ چمّی کو کھسوٹ کر کولھے پہ رکھ لیتی پھر بڑبڑاتی "کیسی میلی ہے سارا نیا ڈوپٹہ غارت کر دیوے گی"۔

"نیا ڈوپٹہ، تو تمہاری آنکھیں بھی پھوٹ گئیں، یہ دو بڑے بڑے پھبھاتے تو ہیں ڈوپٹے ہیں، مُوا سڑا ہوا ڈوپٹہ اوڑھ کر اترا دے ہے" دادی غرّا کر کہتیں۔

واہ ابھی کل تو سلمیٰ اوڑھ کر کالج گئیں تھیں، سائیکل میں آ گیا ہوگا، اے دادی بہت کمینی طبیعت ہے تمہاری" ——— کنیز اور بھی کھسیا کر کہتی۔

اور دادی آپے سے باہر ہو جاتیں۔

"ارے جس کے کارن سر منڈایا، وہی کہے منڈی آئی۔ اب تو مجھ میں سارے عیب نظر آویں ہیں تجھے۔ تیرے پیچھے بے وطن ہوئی، سب بیچ بیچ تجھے اور تیری لڑکیوں کو کھلاؤں ہوں اور اماں بنے وہ ———"

کنیز گھبرا کر دادی کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیتی، اور پھر خوب ہی تو روتی، دادی کو اس بات کا طعنہ دیتی کہ وہ کھلا کر گناتی ہیں، اسکی قسمت پھوٹ گئی، اس لئے دادی کی آنکھیں بھی بدل گئی ہیں۔

لیکن جب کنیز کی آنکھیں روتے روتے سوج جاتیں تو دادی اسکی خوشامد کرتیں اور دونوں میں میل ملاپ ہو جاتا۔ چمّی پھر دادی

کی گود میں چڑھ جاتی اور دادی ممّی کی انگلی پکڑ کر رات کی ہنڈیا روٹی کے بندوبست کے لئے بازار کو روانہ ہو جاتیں۔ اور کنیز ایک بار پھر چھلاوہ بن جاتی۔ کبھی باورچی خانے میں، کبھی گول کمرے میں، کبھی سلمیٰ بی کے کمرے میں ———

کنیز سلمیٰ بی کے کمرے میں ایک آدھ بار مچل جاتی۔

"اے سلمیٰ بی یہ قمیص تو ہم لیں گے۔"

"واہ وا ابھی تو بنائی ہے ہم نے، نہیں دیتے۔" سلمیٰ بی ٹکا سا جواب دیتیں۔

"اے رے دو سلمیٰ۔ کیا کنیز تیری بہن نہیں۔ اللہ کتنی خسیس ہے تو بھی۔ توبہ میری بچّی نے کیسا منہ پھوڑ کر مانگا۔ ایک تو وہ خود ہی اتنی غیرت دار ہے کہ کبھی کسی کی چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی۔ دے رے۔" بڑی بیگم کنیز کی کمک پر فوراً پہنچتیں۔

"اول پھر ہم کو اور قمیص بنا کر دو، اتنی سی قمیصیں تو ہیں میرے پاس۔" سلمیٰ بی نخرہ دکھاتیں۔

"لو اب میں کہاں سے لاؤں، تمہارے باوا کون سی روکڑ چھوڑ چلے تھے میرے پاس ——— جانے کیسے الطاف میاں کی پڑھائی اور تمہارا نخرہ پورا ہو رہا ہے، بینک میں اب دھرا ہی کیا ہے ——— اب کیا کہوں کیسے گذر ہو رہی ہے۔ تمہاری آنکھوں پر تو پٹی بندھی ہے۔" بڑی بیگم ایک ٹھنڈی سانس بھرتیں۔

گذر کرنے ہی کی تو بات ہوتی ہے۔ جب گذر نہ ہو تو پھر آدمی کیا کرے؟ کنیز کا برقعہ پردہ زیادہ دیر کیا چلتا۔ اب سلمیٰ بی کے ساتھ باہر اٹھنا بیٹھنا۔ کنیز کو فرصت ملے اور سلمیٰ کی سائیکل میں پنکچر بھی ہو تو کبھی کبھی لمبی چوڑی سڑک پر چہل قدمی بھی ہو جاتی۔ کنیز نے ذرا باہر کا قصد کیا اور دادی مردہ چوہے کی کھال جیسا بدرنگ برقعہ لئے کنیز کے سر پر موجود ——— ایک دن تو حد ہی کر دی، بڑی بیگم کے سامنے بولیں "نا بیوی بغیر برقعہ عورت دیکھ میرا تو جی جل جاوے ہے۔"

بڑی بیگم بے چاری ہمیشہ دادی کا لحاظ کرتیں اصغری بوا کتنے منہ خشک ہوتا مگر اس بات پہ ان کے تن بدن میں مرچیں لگ گئیں۔

"اے بوا رہنے دو شیخی بگھارنے کو، ہمارے گھرانے میں جیسا پردہ ہوتا تھا بھلا کیا مقابلہ کرو گی۔ میری لڑکی کی مجال نہیں تھی وہاں کھڑکی سے جھانک لے۔ پر اب دیس چھٹا، وہاں کی باتیں چھٹیں۔ اب کنیز میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہے ——— اب تو ایسے ہی گھر بیاہی جائیگی یہ جہاں میاں کے ساتھ سیر کو جائے گی ——— ویسے بھی میرا کوئی حق نہیں؟ ہم تو تم پہ جان دیں اور تم ———"

دادی چپ ہو گئیں۔ لیکن کنیز نے اس دن اپنا پرانا برقعہ دھو دھا ممّی جمّی کی فراکیں مشین پر بیٹھ کر سی ڈالیں۔ سچ ہے بے چاریاں کب سے پھٹے حالوں پھر رہی تھیں ——— چلو مہینہ دو مہینہ تو اس طرح گزر ہو ہی جائے گی۔ اس کے بعد ——— اس کے بعد ——— اے کیا سوتیلے باپوں کے دل میں اللہ رحم نہیں ڈالتا" ——— کنیز نے سوچا اور اس کے کلیجے میں ٹھنڈ سی پڑ گئی۔

لیکن گذر ہوتی کیسے، تن ڈھکنے کو ڈھک گئے، آہستہ آہستہ پیٹ خالی رہنے لگے ——— دادی کنیز کی صورت دیکھتے ہی دکھڑا لے بیٹھتیں۔ "اب کہاں سے لاؤں، قسم لے لو جو اب کچھ ہو میرے پاس؟" روز روز کی چلّی پکار چپنے لگی ——— ممّی جمّی دادی کو چھوڑ کر رات دن کنیز کے پیچھے لگی پھرتیں۔

"اماں روٹی، اماں سالن۔" بڑی بیگم کے ساتھ کنیز کو دسترخوان پر بیٹھے دیکھ کر ممّی جمّی کٹورا لئے موجود، بڑی بیگم ایسی دل والی کہ فوراً اپنے سامنے

کی چیز اُٹھا کر دے دیتیں اور کنیز شرما کر بچیوں کو اپنے چیتھڑوں گدڑوں کی طرح سمیٹنے لگتی۔ جی چاہتا مارے غیرت کے مرجائیے۔ "اے بیٹی مجھ سے کیا غیریت؟ میرے تو حلق سے نوالہ نہیں اُترے گا انہیں بھوکا دیکھ کر، تمہیں ان کی مامتا ہے تو مجھے بھی ہے، مگر میں کہتی ہوں بچی تمہیں میرے ہی گھر تو نہیں بیٹھا رہنا ہے۔ اللہ وہ دن لائے گا اپنے گھر بار کی ہو گی، مرد ذات سوتیلے بچّوں سے گذر نہیں کرتے، میں تو کہتی ہوں بچی کلیجے پہ پتھر رکھ کر ان دونوں کو عشرت لنگڑے کو دے دے، کمبخت کو ذرا پتہ تو چلے کہ طلاق دینا بچّوں کا کھیل نہیں۔" بڑی بیگم کنیز کی پیٹھ پہ ہاتھ رکھ کر سمجھاتیں۔

کنیز کے دماغ میں تو بات بیٹھ گئی لیکن دادی کسی طرح نہ مانتیں، کنیز رو رو کر دادی سے کہتی "اے دادی مجھ بد نصیب کے ساتھ کیوں لڑکیوں کی مٹی پلید کرو گی، تم اب کہاں سے کھلاؤ گی؟" مگر دادی تو کانوں پہ ہاتھ رکھتیں۔

مگر جب ایک دن دادی باوجود دلی خواہش کے اپنا صندوق نہ کھول سکیں اور دن بھر چولھا نہ جلا تو کنیز ضبط نہ کر سکی۔

"اے دادی اب نکالو نہ روکڑ کیوں لڑکیوں کو عذاب دے کر مار رہی ہو۔" کنیز چلائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میری بوٹیاں نوچ لو، اب کیا دھرا ہے میرے پاس، اب اپنی کوٹھی والی میّا سے کہو نا ———" دادی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"رہنے دو، اماں بیگم کا نام کیوں بیچ میں گھسیٹتی ہو، وہ کہاں سے لا دیں؟ ان کے پاس ہو تو میرے بچوں سے عزیز کرنے والی نہیں وہ ——— کیا کیا کریں وہ، واہ یہ تو وہی سانپ کے بل میں ساہی کے چھپنے والی بات کرتی ہو۔" کنیز کی آنکھیں لال انگارہ ہو گئیں۔

"اچھا تو پھر چل اپنے مراد آباد، مہینے دو مہینے کا پرمٹ تو بن ہی جاوے گا" دادی نے آخری حربہ استعمال کیا۔ اور کنیز کا دم نکل گیا ——

"اچھا کرایہ نکالو، پرمٹ بنوالو۔" کنیز اتنا کہہ کر کھاٹ پہ منہ ڈھک کر پڑ رہی۔ دادی کا سارا جوش ختم ہو گیا۔ کہیں سے چار جانوں کا کرایہ اور وہ بھی ہوائی جہاز کا، چلو ہو گیا، پرمٹ، مان لیا پرمٹ بھی بن گیا۔ پھر وکیل جو کہتا تھا پرمٹ ختم ہونے پر واپسی ہو گی ——— پھر کیا ہو گا؟

رات کو کنیز نے ممّی چمّی کو رو رو کر دادی کے ساتھ رخصت کر دیا۔ دادی روتی کپکپاتی چمّی کو گود میں اُٹھائے، ممّی کی انگلی پکڑے عشرت کی کوٹھری تک پہنچیں۔ عشرت نے ممّی کو تو چوم چاٹ کر گود میں بٹھا لیا اور چمّی کی طرف آنکھ بھی نہ اُٹھائی بولا "میں اتنی سی چھچھڑی کو کہاں اُٹھائے پھروں، اب ایک ہی رکھو۔ مامتا ختم ہو گئی تمہاری ———"

دادی کے پتنگے سے لگ گئے، چمّی کو گود سے زبردستی اُتارنا چاہا تو چمّی کی چیخوں سے کلیجہ ہل گیا ——— دادی بغیر کچھ جواب دیئے چمّی کو لئے واپس آ گئیں ——— اور کنیز جو چمّی کو دیکھ کر گود پھیلائے روتی دوڑی تو بس بڑی بیگم تک کا کلیجہ ہل گیا۔

دادی نے اپنے کپکپاتے سر کو اور ہلا کر کہا۔

"سچ ہے مامتا بھی کہیں مرے ہے۔"

لیکن دو چار دن بعد ہی سوکھی کمزور، اور آئے دن کی مریض چمّی نے ممّی کی یاد میں ہڑک کر دادی کی کمر پہ رات دن کی چڑھائی جو شروع کی تو، "مامتا" کی طرف سے ان کے خیالات میں بڑی انقلابی تبدیلیاں برپا ہو گئیں۔

"اللہ تیرا پردہ ڈھکے سے بچّی، اری بدنصیب کا کوئی نہیں ہو وے ہے، نہ ماں نہ باپ ———" دادی کی زبردست آہیں کوٹھی کے کونے کونے میں گونج اُٹھیں۔

اور یہ رات دن کے نوحے، یہ آہیں سن سن کر بڑی بیگم کا جی دہل جاتا۔ گھر میں جوان چھپن بیٹی، ولایت میں پانچ سال کی پڑھائی کے لئے گیا ہوا

جوان کنیر سا بیٹا ۔ اور گھر کے ایک کونے میں افیم کھا کر اونگھتے ہوئے بڈھے پھونس سسر، اس کوٹھی کے واحد مرد۔ اس پر غریب الوطنی مستزاد ـــــــ ان حالوں میں کوٹھی کے اندر دادی کے وقت بے وقت کے نوحے۔ نہ یہ دیکھیں کہ دونوں وقت مل رہے ہیں، نہ یہ کہ اذان کی آواز آرہی ہے ـــــــ بس ہمہ وقت دنیا کی بے ثباتی کے نقشے کھینچ رہے ہیں، کوئی سُنے نہ سُنے دکھڑے بیان ہو رہے ہیں ـــــــ بیگم نحوست کم کرنے اور اپنا دھیان بٹانے کو اس سمے زور زور سے سلمیٰ اور الطاف کے شادی بیاہ کی منظر کشی کرتیں ـــــــ کنیز کے جہیز کی تفصیلات کے بارے میں سلمیٰ سے مشورہ طلب کرتیں۔

"اے بھئی اب تو کنیز بی کا بھی اپنے ہی اوپر فرض ہے۔ ابھی سے تیاری کریں گے تب جا کر دو چار سال میں ایسا جہیز بنے گا کہ ہزار پانسو والا بھی دیکھ کر خوش ہو جائے۔ سلمو کنیز کے لئے وہ نگوں والا سوٹ کیسا رہے گا۔ اس پر کھلے گا بھی خوب ـــــــ بالکل سلیما کی شہزادی دکھے گی۔ میں تو کہتی ہوں کہ منہ سے یہ کنیز لگوڑی ایسی کچی کچی لگتی ہے۔ اگر کسی کو کچھ نہ دکھائے جائیں تو کنواری ہی سمجھے ـــــــ"

چمّی کو بڑی بیگم کے دبیئے ہوئے قلمی آم کھا کر دست لگے ہوئے تھے ـــــــ کنیز کو اپنے کاموں سے اتنی فرصت کہاں کہ اسے پتہ بھی چلتا۔ ذرا فرصت ملی تو سلمیٰ بی کی ڈریسنگ ٹیبل کے سلیے سے آئینے کے سامنے کھڑی کامدانی والا دھانی ڈوپٹہ سینے سے ڈھلکائے دیر سے کنگھی کئے جا رہی تھی۔ خدا جانے وہ کب تک آئینے کنگھے سے جوجھی رہتی اگر دادی کی پھٹی ہوئی آواز کمرے میں نہ گھستی۔

"ارے کنیز دیکھ تو سہی نامراد، لونڈیا آنکھیں پھیرے لیوے ہے" اور کنیز غرارے میں اُلجھتی نکٹ ہو جا گی۔ چمّی سچ مچ گردن ڈالے دے رہی تھی۔

"ہائے دادی میری بچی کو کیا زہر کھلا دیا، ہائے سب تو چھوٹ گئے تھے یہ ایک بھی نہیں کھل رہی تھی، یہ مرگئی تو تم مجھے بھی نہ پاؤگی دادی"

اسی رات ہسپتال میں چمّی چپ چاپ مر گئی۔ کنیز نے مرنے کی بہت کوشش کی۔ سر پھوڑ ڈالا، دھانی کامدانی کا ڈوپٹہ دانتوں سے نوچ کر چندھی چندھی کر دیا، مگر دادی اس سے لپٹی ساتھ ساتھ لڑھکتی پھریں، اسے مرنے کا موقع ہی نہ دیا ـــــــ دادی کو تو اپنے پالے پوسے کی اتنی آگ تھی پھر جس نے نو مہینے پیٹ میں رکھا ہو اس کے دل کا حال کون نہیں جانتا۔

کنیز نے کئی وقت کھانے کی طرف نگاہ نہ اُٹھائی۔ رو رو کر آنکھیں اتنی سوج گئیں کہ وہ پلک اُٹھانے سے بھی معذور ہو گئی، اسکی یہ حالت دیکھ دیکھ کر بڑی بیگم کے ڈوپٹے کا پلّو بھی آنکھوں سے نہ ہٹتا ـــــــ سلمیٰ بی بھی کئی بار کنیز کے گلے لگ کر گھگھیا گئیں اور پھر آنکھوں پر ہاتھ رکھے اپنے کمرے میں بھاگ گئیں۔

مگر کوئی کہاں تک روئے، دریاؤں تک کو نکاس کی راہ مل جائے تو اُتر جاتے ہیں ـــــــ پھر بڑی بیگم کی غمخواریاں۔ وہ رات دن اسی فکر میں گھلتیں کہ کنیز بچوں کا غم بھول جائے، ایک منٹ کے لئے بھی اسے اپنے پاس سے الگ نہ کرتیں، چپکا بھی نہ بیٹھنے دیتیں، سلمیٰ بی کو بھی اب اس کا انتہائی خیال رہتا۔

"آؤ کنیز ڈوپٹے میں ستارے ٹانکیں" وہ اپنا ڈوپٹہ لے بیٹھتیں، اور کنیز غم کی ماری کٹھ پتلی کی طرح ادھر ہی لگ جاتی، ایک ایک ستارہ یوں احتیاط سے ٹانکتی جیسے اپنے کلیجے کے ناسور نمائش کے لئے رکھ رہی ہو ـــــــ

"آؤ بیٹی کنیز سلمو کے دادا میاں کے پاجامے بیٹھ کر سی ڈالیں" بیگم لٹھے کا تھان اس کے سامنے پھیلا دیتیں اور کنیز وہاں بھی

جٹ جاتی۔

غرض بڑی بیگم اور سلمیٰ بی نے کنیز کا غم بھلانے کے لئے کوئی حد نہ اُٹھا رکھی، کئی بار بڑی بیگم کنیز کی خاطر سینما تک چلی گئیں ——— سلمیٰ بی نے اپنے کپڑوں کی الماری کھول دی کہ جو چاہو لے لو ——— بڑی بیگم نے اپنی چھنگلیا کا سونے کا چھلّا تک اُتار کر اسے پہنا دیا ——— اور چپکے سے اس پہ جھک کر بولیں " ہماری کنیز کا دولھا اس طرح انگوٹھی پہنائے گا ——— "

اور کنیز اس دن چچی کی موت کے بعد پہلی مرتبہ شرما کر کمرے سے بھاگ گئی۔

اور آہستہ آہستہ وہ پھر یوکلپٹس، شیشم اور گولر کے درختوں میں دبکی ہوئی پُر اسرار ننھی سی کوٹھی میں چھلاوہ بن گئی۔ ابھی سلمیٰ بی کے کمرے میں ہے، تو ابھی باورچی خانے میں بیٹھی سوئیوں کا زردہ پکا رہی ہے ——— اے لو نظر چوکی کہ وہ بڑی بیگم کے غسل خانے میں غائب، ذرا وقت نہیں لگا کہ بڑی بیگم کا چوڑی دار پاجامہ اور سلمیٰ بی کا ڈوپٹہ اوڑھے برآمدے کی چکنی سطح پر گیلا کپڑا لٹا کر فرش چمکا رہی ہے۔ اب یہ بھی کوئی تک ہے نہا دھو کر ایسا گندہ کام ؟۔ بڑی بیگم لاکھ لاکھ کہہ رہی ہیں کہ اری کنیز تجھ سے کون کہتا ہے ایسے کاموں کو۔ بھنگن کاموں کے لئے ہے۔ مگر کنیز بھی کسی کی سُنتی بھلا۔ بڑی بیگم نے زیادہ بڑ بڑ کی تو دوڑ کر نلکے سے ہاتھ دھوئے اور تیل کی شیشی لئے بڑی بیگم کے سر پہ موجود کہ ہم تو تیل دبائیں گے۔ بڑی بیگم کی آنکھوں سے محبت نور کی شعاعیں بن کر پھوٹنے لگیں۔ اور وہ ٹھنڈی سانس بھر کر یہ کہے بنا نہ رہ سکیں کہ کنیز جس گھر جائے گی اُجالا کر دے گی۔ عشرت موا گنوار کا لٹھ نقشا تیری قدر کیا کرتا ؟

" اے تو پھر اب کنیز کے لائق بر ڈھونڈھو نا۔ روز روز میرے میاں کے خط آ رہے ہیں کہ مرنے وخت تو سانتھ دو۔ میں یہاں کب تک جوان لونڈیا کو لئے بیٹھی رہوں، نہیں تو میں سوچوں لونڈیا کو سانتھ لے جاؤں رشتے برادری میں بہت لڑکے پڑے ہیں " دادی آئے دن تقاضہ کرتیں۔

" اے اصغری بوا نام نہ لو اپنے رشتے برادری کا۔ تم نے پہلے ہی بچی کی قسمت پھوڑنے میں کوئی کسر رکھی تھی ؟ میری زبان نہ کھلواؤ۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، اپنی سلمیٰ سے دو تین سال بڑی ہو گی۔ اور بوا جو تم کہو، جلدی کی تو میں جیسے سلمیٰ کے لئے دیکھ بھال کر رہی ہوں گی ویسے ہی کنیز کے لئے۔ اب کوٹھی سے رخصت ہو گی تو ہمارے ٹکّہ والے کے ساتھ ہی ہو گی ——— کنیز کے پیاموں کی نہ کہو کئی مشاطاؤں سے کہہ رکھا ہے، ہر چوتھے آٹھویں روز کوئی نہ کوئی سوال کرتا ہے۔ اب میں تمہیں کہاں تک دکھاؤں ——— ؟" بڑی بیگم گھنٹوں بڑ بڑاتی رہتیں۔

دوسرے چوتھے ہی موٹر سائیکل پہ ایک شخص آیا ——— بڑی بیگم بہلنے سے اُٹھیں اور دادی کو بلا کر جھنکوا دیا۔

" اچھا تو ہے کر دو " دادی نے خوش ہو کر کہا۔

" لو بیوی، کہہ دیا کر دو ——— ہم نے پوچھ گچھ کی پتہ چلا شراب پیتا ہے ——— ہم تو کبھی نہ کریں چاہے روز آکر ناک رگڑے " بڑی بیگم نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

" کر دو کنیز کی قسمت سے سدھر جاوے گا " دادی پر تو جلدی سوار تھی۔ انہیں تو اچھا بھلا بھولا سا لگ رہا تھا لڑکا۔ پھر انہوں نے کاہے کو کبھی ایسا " صاحب " بر دروازے آیا دیکھا تھا۔ وہ تو کہتیں بدنصیب طلاقن کو کوئی مرد کی شکل جڑ جائے یہی بہت ہے۔

" پھر تم ہی لڑکے سے بات کر لو، میں تو بیچ میں نہ پڑوں گی۔ تمہاری ذمہ داری، پھر شکایت نہ کرنا " بڑی بیگم دروازے سے ایک طرف ہو گئیں۔

دادی کلیجہ مسوس کر رہ گئیں۔ انہیں یقین ہی نہ آتا تھا کہ ان کی بدنصیب کنیز کے ایسے سرخاب کے پر لگ گئے ہیں۔

آئے دن بڑی بیگم راہ چلتے لوگوں کی طرف اشارہ کرکے بتاتیں "ارے دیکھو اصغری بُوا اس لڑکی کی اماں نے مجھ سے کہا تھا چاہے کنیز دیدو چاہے سلمیٰ۔ نہ بیوی اس سے تو میں کبھی نہ کروں۔ کالا کلوٹا"۔

ہر شخص میں کوئی نہ کوئی عیب۔ دادی اُکتا کر رہ گئیں۔ جہیز کے کپڑوں پر کپڑے بننے لگے۔ برتن خریدے جانے لگے اور دادی کو ذرا ذرا ڈھارس ہونے لگی کہ دُنیا میں منہ بولے کی بھی کچھ وقعت ہے۔ انہوں نے اپنے میاں کو لکھوایا۔

ارے میاں ذرا صبر کرو۔ لونڈیا کا ٹھیک ٹھکانہ کرکے بس چٹکی بجاتے میں پہنچوں گی —— پھر چاہے ہم دونوں پاکستان آکر پڑ رہیں گے۔ لونڈیا کے گھر اپنے لئے ایک کوٹھری تو کہیں نہیں گئی۔

مگر ایک دن ان کی ساری اسکیم ملیا میٹ ہوگئی۔ دادی اس دن کنیز کی بے توجہی پر بہت بپھری ہوئی تھیں۔ چمی کے مرنے کے بعد بڑی بیگم نے اصرار کرکے دادی کو الگ کھانے پکانے سے منع کر دیا تھا۔ سو اب وہ شرما حضوری کوٹھی کے باورچی خانے سے کھاتی تھیں۔ حمیدہ بھاگ گیا تھا، اور بیگم کہتی تھیں کہ میرے سونے کے بندے لے کر بھاگا ہے۔ پولیس مقابلہ کون کرتا۔ مگر انہوں نے آئندہ سے توبہ کر لی تھی کہ مرد نوکر کو ہرگز کوٹھی میں نہ رکھیں گی۔ قریب کا سودا تو دادی مر جی کر لے ہی آتیں، مگر دُور بازار جانا ہو تو اس کے لئے وہ مجبور تھیں۔ کنیز نے سلمیٰ بی کی سائیکل چلانا تو سیکھ ہی لی تھی۔ ایک دن بولی "لاؤ دادی سودا میں لے آؤں سائیکل پر۔ دو منٹ لگیں گے"۔

دادی کے گھرانے میں بھلا کاہے کو جوان جہان عورتوں کی یہ جرأتیں! آپے سے باہر ہوگئیں۔

"اے لڑکی ہوش کی دوا کر، کیوں میّا باوا کی عزت کے درپے ہوئے ہے، کھود کر گاڑ دوں گی اور آہ نہ کرنے دوں گی ——"

یہ تو گویا کھلّم کھلّا بڑی بیگم کی تربیت اور سلمیٰ بی کے چال چلن کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ حد ہوتی ہے صبر کی۔ بڑی بیگم کو کوئی اور اس طرح کہتا تو جوتی سے منہ مسل دیتیں اس کا۔ جوتی تو نہ اُٹھائی مگر سنائیں بے بھاؤ کی ——

"شرم نہیں آتی، اتنی بوڑھی ہوگئیں۔ کوٹھیوں میں رہو گی تو کنجڑوں قصائیوں کی طرح رات دن کی بھاں بھاں نہ چلے۔ واڑے کے ساروں میں ہمیں بدنام کر دیا، سننے والے ہمیں بھی تمہارا جیسا سمجھیں گے ——"

"اے دادی تو مجھ بدنصیب کو دم نہ لینے دیویں گی۔ یہ تو مجھے مار کر مریں گی۔ اللہ تو میرا پیچھا کاٹیو ان سے"۔ کنیز بھی ضبط نہ کر سکی آخر وہ اتنے دن سے کوٹھی والوں کے خلاف دادی کا معاندانہ اور جارحانہ انداز اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی —— اللہ یہ دُنیا فرشتوں پہ بھی عیب لگانے سے نہیں چوکتی۔

دادی کنیز کی یہ چوٹ برداشت نہ کرسکیں۔ خوب لڑیں، اپنے سارے احسان گنائے اور اسی وقت ہندوستان کے لئے پرمٹ کی درخواست دینے نکل کھڑی ہوئیں۔

"اے بڈھا مرنے کو ڈرا دے جوان بھاگنے کو —— پر دادی ایسی کہ بھاگنے کو ڈرا دیں۔ جائیں میرا کون ساتھ دینے والا ہے"۔

ان طعنوں کے باوجود دادی نے اپنا پرمٹ بنوا لیا۔ دبے دبائے زیور کام آہی گئے۔ اگر وہ بھی کھلا دیئے ہوتے تو آج مانگے بھیک نہ ملتی۔ چند مہینے سے کنیز کو نہ کھلایا تو آج کنیز کی آنکھیں بدل گئیں، جوتے مارنے کی کسر رہ گئی۔ دادی سوچتیں۔ کہتے ہیں جس کے پاس دام ہوں اس کا مردہ بھی رونے والے بہت۔ پرمٹ کے دفتر کے ایک کلرک نے جلد ہی ہوائی جہاز کی ایک سیٹ بھی ریزرو کرادی، اور دادی اپنی بقچی

اُٹھا چلنے کو کھڑی ہوگئیں۔ ہر طرف سے دل شکستہ۔ اپنے میاں کے ساتھ مرنے جینے کو ــــ

تانگے میں سوار ہونے سے پہلے دادی کا دل بھر آیا ــــ "کنیز میری قدر ہووے گی ــــ ابھی کچھ نہیں گیا ــــ اپنے جھمکے بیچ کر مراد آباد آجائیو، مہینے دو مہینے میں وہاں تیرا فیصلہ ــــ"

"جانے دو دادی ــــ میری چچی کو مار ڈالا، میری نمی کو چھپٹا دبا کہ کھلانے کو نہیں ــــ اب کہاں سے نہا کے کر کے نکل آئے، ہائے میاں مجھ بدنصیب کو کیوں جنا تھا ــــ ؟" کنیز نے منہ پھیر لیا اور دادی کا منہ کڑوا ہو گیا۔

تانگہ چلنے پر کنیز باورچی خانے کی جالی سے لگ کر یوں روئی کہ سارے زخموں کی کھرنڈ اُتر گئی۔ ٹپ ٹپ خون کی بوندیں گرنے لگیں ــــ عشرت، ممتاز، نمی، چچی اور دادی، سب دھم دھم کرتے زخمی کلیجے پر سے اچھلتے کودتے غائب ہو گئے۔

بیگم نے سینے سے لگایا۔ سلمٰی بی نے تسلی کے لئے اس کا منہ تک چوم لیا۔ حد تو یہ ہے کہ سلمٰی بی کے دادا تک نے اس دن اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا ــــ اور کنیز کے آنسو ٹکوں پر ہی جل گئے۔ لیکن وہ کئی دن تک جیسے کچھ کھوئی کھوئی سی رہی۔ وہ کوٹھی کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے جاتے رُک جاتی ــــ سڑک پر نظر ڈالتے ڈالتے ایک دم آنکھ بیچی کر لیتی ــــ کچھ اس طرح جیسے پنجرے کی ساری تیلیاں ٹوٹ گئی ہوں اور وہ ایک دم کھلی فضا میں پھینک دی گئی ہو۔ اور اب یہ فضا اسے ڈرا رہی تھی ــــ وہ ایک ایک ٹوٹی تیلی اُٹھاتی، چومتی، سینے سے لگاتی اور پھر رکھ دیتی ــــ سارے رشتوں سے آزاد ہو کر وہ خود کو کس قدر اجلنبی محسوس کر رہی تھی۔

جاڑے کی تیز تیز ہوائیں چلتیں۔ پیڑوں تلے آم، گولر اور پیپل کے زرد پتے چپ مروب کر ٹوٹتے۔ ہر طرف ایک عجیب سا سناٹا، ایک سونچی سی ویرانی۔ بڑی بیگم لان میں پلنگ بچھائے، زیادہ وقت پنڈلیوں اور کمر پر کڑوے تیل کی مالش کرواتی رہتیں۔ سورج سر پر چمکتا پھر بھی ان کے جوڑوں میں سردی گھسی درد پیدا کرتی رہتی ــــ انہی دنوں ایک ڈاکٹر انہیں دیکھنے آیا کرتا۔

بڑی بیگم نے ایک دن تھکی تھکی سی کنیز سے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب تجھ کو کیسے لگتے ہیں ؟"

اور کنیز ایک عرصے بعد پھر چونکی۔ دادی کے جانے کے بعد پہلی مرتبہ وہ کنواریوں کی طرح مسکرا کر سُرخ ہو گئی اور فوراً وہاں سے اُٹھ گئی۔ بہت دنوں بعد جیسے پھر اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں بجلی کی پھُرتی بھر گئی ــــ اس نے جی لگا کر باورچی خانے کی صفائی کی، برتن سوکھی راکھ سے اس طرح رگڑ کر مانجھے کہ چاندی کے نئے زیوروں کی طرح چمک گئے ــــ اس کے بعد جھاڑو اُٹھائے گھر کی روزانہ صفائی اس محنت سے کی کہ کہیں مکڑی کے جالے کا ایک تار نہ رہ سکا۔ ایک تنکا نہ رہا۔

"اے سلمٰی اے سلمٰی بیٹی اپنی بہن کا ہاتھ بٹا ــــ بیٹھی کیا دیکھ رہی ہے۔ دیکھوں گی تو کون سے گھر جائے گی جہاں اُٹھ کر تجھے تنکا نہ توڑنا پڑیگا۔"

بیگم پکار پکار کر کہتی رہیں اور سلمٰی بی بیٹھی اپنے ناخنوں پہ پیازی رنگ کی پالش کرتی رہیں۔

کنیز نے اپنے جی میں سوچا "سلمٰی بی جیسی کاہل تو مَنوں ماں باپ کی نظر میں بھی گر جاویں ہیں۔ انسان کا کام پیارا ہووے ہے چام نہیں"

کاموں میں جہیز کے کپڑوں کی تیاری بھی تو شامل تھی ——— کنیز راتوں کو بھی مشین کھٹکھٹاتی رہتی۔ لچکے، گوٹے، ستارے اور آئینے ٹنکتے رہتے۔

بیگم سُستی سے ٹانگیں پھیلا کر جماہی لیتیں اور کہہ اُٹھتیں: "دیکھیں میری دونوں بچیوں میں سے پہلے کس کا نصیبہ کھلتا ہے؟"

اور نصیبہ کھولنے کے لئے کنیز کے حسابوں دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب آلہ ہاتھ میں لئے، بیگ جھلاتے آتے۔ بیگم کی مزاج پرسی کے بعد گول کمرے میں تشریف رکھتے۔ سلمیٰ بی اپنا لپا پُتا چہرہ ایک خاص زاویے سے اُونچا کئے پُرانے صوفے پر بیٹھتیں۔ اور ان کے پس منظر سے کنیز نمودار ہوتی۔ جھکی جھکی آنکھیں۔ چوڑی دار پاجامہ اور تنگ کمر پر پھنسی ہوئی سلمیٰ بی کی فراک ——— ہاتھوں پر چلئے کی ٹوٹے ———

اس سے سلمیٰ بی خود کو کسی محل کی رانی سے کیا کم سمجھتیں۔ پُرانے صوفے سے لے کر کنیز تک ہر چیز اُن کے حُسن اور شان میں اضافہ ہی کرتی۔ اور کنیز شرماتی لجاتی، پردوں کے پیچھے غائب ہوتے ہوئے سوچتی، "اے سلمیٰ بی کی بھی کوئی شکل ہے، ٹیڑھا میڑھا نقشہ اس پر کھاسوں کے ٹیلے، اپنے آپ کو پری سمجھیں ہیں کوہ قاف کی۔"

مہینہ نہیں گذرا سلمیٰ بی کی بات بھی پکی ہو گئی، اور کڑکڑاتی سردی کی ایک رات کو سلمیٰ بی دُلھن بن کر رخصت بھی ہو گئیں۔ بقول بڑی بیگم نصیبے کی بات ہے، پہلے سلمیٰ بی کا نصیبہ ہی کھُل گیا، اس کے ساتھ ہی بڑے صندوقوں اور متروکہ جائداد کی الماریوں کے بڑے بڑے پٹ بھی کھُل گئے۔ پُرانی ڈریسنگ ٹیبل نئی پالش سے چمک کر چل دی، پرانے صوفوں پر نیا کپڑا کیا منڈھا گیا وہ بھی گول کمرہ سُونا کر گئے ——— کوٹھی کی طرح سُونے ویران صندوق اور الماریاں پڑی بھائیں بھائیں کرتیں۔ اور کنیز کے دل کی حالت تو ان صندوقوں اور الماریوں سے زیادہ بدتر تھی۔ شادی کی رات سے کہر سا پڑ رہا تھا۔ ہر طرف ٹھنڈ، ہر چیز گیلی۔ دوسرے دن جب کنیز نے رات بھر کی جگائی کے بعد، بڑی بیگم کے گٹھیا کے درد کی شکایت سُن کر چلئے بنانے کے لئے باورچی خانے میں قدم رکھا تو اسکی جلتی ہوئی آنکھیں کہرے سے دھندلائے ہوئے درختوں کی افسردگی اور ویرانی پر رہ پڑیں ———

بیگم کنیز کو تھکے حالوں دیکھ کر تڑپ تڑپ جاتیں۔ بیٹی بیاہ کر وہ خود ویران ہو گئی تھیں۔ اب تو کوئی آ کر کوٹھی میں جھانکتا بھی نہ تھا، پھر کنیز کے پیام کون لاتا ——— وہ بیٹھے تھک جاتیں تو لیٹ جاتیں، لیٹے لیٹے کر لگ جاتی تو بیٹھ جاتیں۔ کنیز جو الگ الگ پھرتی ہوتی تو اسے پاس بلاتیں۔ گلے لگاتیں۔

"کنیز تو بھی میرے کوٹھے سے لگی کب تک بیٹھی رہے گی۔ ایک دن سلمیٰ بی کی طرح گھر لوٹ کر چلی جائے گی، پھر میں نصیبوں جلی اکیلی کی اکیلی، ہائے جلدی سے وقت گزر جاتا اور الطاف ولایت سے آجاتا اس کے سہرے کے پھول کھلتے دیکھ لیتی ———"

یہ کہہ کر بڑی بیگم کی آنکھیں پُر آب ہو جاتیں، اور یہ سب سُنکر کنیز کی تھکی ہوئی رگوں میں تناؤ سا آتا جو فوراً ہی ٹوٹ جاتا ——— بس اس کا جی چاہتا کہ وہ کچھ نہ کرے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہے۔ یونہی اماں بیگم کی طرح پڑی رہے یا پھر انہی کی طرح بات بات پر رو دیا کرے۔

گھر میں ڈھول جمتی گئی، کمروں کے کونوں میں مکڑیوں نے جالے تان لئے اور مزے سے افزائش نسل کرنے لگیں۔ باورچی خانے میں دیگچیاں کالی کوٹ ہو گئیں۔ بیگم کے سُسر دن بھر بغیر حقے کے پڑے اونگھا کرتے وہ اب اتنی زیادہ افیم کھانے لگے تھے کہ ان کو کھانسنے

تک کا ہوش نہ رہتا۔ ہر چیز پہ ایک جمود، جیسے وقت کچھ تھم کر سوچنے لگا ہو۔

سلمیٰ بی کے میاں کا کہیں دُور تبادلہ ہو گیا تھا۔ کافی دن بعد دو دن کے لئے سلمیٰ بی اپنے میاں کے ساتھ آئیں۔ گھر کی حالت دیکھ کر بولا گئیں کہ کیا بُرا اثر پڑا ہوگا ان کے میاں پر۔ وہ بڑی بیگم سے بات کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ لیکن بڑی بیگم روٹھ گئیں۔ اب کہاں تک وہ اکیلی زندگی کی گاڑی دھکیلیں۔ صاحبزادی نے تو آ کر اعتراض کر دیئے۔ بچا ہی کیا ہے جس کے برتنے پر وہ دو چار نوکر لگا کر سلمیٰ بی کے میاں کے لائق کوٹھی کی صورت بنائے رکھیں۔ بے چاری سلمیٰ بی کھسیا کر رہ گئیں۔

تیسرے دن سلمیٰ بی اپنے میاں کے ساتھ گرمیاں گزارنے مری چلی گئیں جانے سے پہلے اپنے پُرانے کمرے میں وہ کنیز سے گلے ملیں اور کہا کہ "میں نے تمہاری شادی میں دینے کے لئے ایسا اچھا سوٹ کا کپڑا ابھی سے خریدا ہے کہ دیکھو گی تو آنکھیں کھل جائیں گی"۔

لیکن کنیز اُن کے جانے کے بعد بھی اس سوٹ کے بارے میں کوئی واضح تصوّر قائم نہ کر سکی۔

اس کا دل پلٹ گیا تھا۔ وہ عشرت کو یاد کرنے کی کوشش کرتی، اور جب اس کا خیال بھی نہ جمتا تو بس اس کا جی چاہتا آنکھیں بند کئے پڑی رہا کرے ——— موسم بھی تو بڑا سخت گرم تھا۔

"اماں کس کا خط ہے" کنیز نے بھری ڈاک سے آئے ہوئے بڑے سے لفافے کو دیکھ کر بے دلی سے پوچھا۔ اسے جانے کیوں ان دنوں دادی کے خط کا انتظار رہتا۔

بیگم نے لفافہ کھول کر ایک بڑی سی تصویر نکالی۔ اچھے بھلے شکل و صورت کے مرد کی تصویر تھی۔ بڑی بیگم نے للک کر تصویر کو چوم لیا۔

"یہ کون ہیں اماں بیگم" کنیز نے جاتے جاتے پوچھ لیا۔

"اے تو تمہیں خبر ہی نہیں، میرا الطاف ہے۔ ابھی نئی تصویر منگائی تھی اُسے۔ دیکھو سُوَر نے مونچھیں بالکل صاف کر دیں، کیا بُرا منہ لگتا ہے مرد کا مونچھ بغیر ———" بڑی بیگم کی آنکھوں میں مارے محبت کے آنسو آ گئے۔

اسی وقت تصویر بغیر فریم کے بغیر صوفوں والے گول کمرے میں سجا دی گئی۔ سلمیٰ بی کے چھوڑے ہوئے البم میں الطاف کی ذرا سی تصویر تھی، جس میں صورت شکل کا پتہ نہ چلتا، پر اب تو ایک ایک چیز صاف تھی۔

جب تک سلمیٰ بی گھر میں تھیں تو لائین برابر ہوتے الطاف کے اتنے ذکر نہ ہوتے لیکن اب تنہائی میں بیگم کو اس کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ بیٹیاں تو ماں باپ کے گھر چڑیا کی طرح بسیرا لیتی ہیں۔ اور پھر اپنے ٹھکانوں کو اُڑ جاتی ہیں۔ بیٹا بیٹا ہے۔ دلہن بیاہ کر لائیں تو یہ دلہن ہیں، رہے گا ماں باپ کے گھر کا، اور پھر اب تین سال ہی تو باقی تھے پڑھائی کے۔ بیگم ایک ایک دن گنا کرتیں ———

"اے بٹیا، اے بچی کنیز کہاں ہو، ادھر تو آؤ" بڑی بیگم کنیز کو پکارتیں، کنیز تھکے تھکے قدم اُٹھاتی ڈوپٹے کے پلّو سے ہاتھ پونچھتی آتی۔

"کیوں بیٹی الطاف کے لئے کون سا کمرہ صاف کر لیا جائے، ابھی سے کر لیں، ورنہ اس کے آنے کے بعد تو مارے خوشی کے مجھ سے کچھ نہ ہوگا"۔ بیگم ہول کر پوچھتیں جیسے الطاف بس رات کی گاڑی سے وہاں پہنچ رہے ہوں۔

"وہی سلمیٰ بی والا اماں بیگم" کنیز بیگم کے دل کی بات کہتی۔

"اچھا تو پھر کل ہل کر کمرہ ٹھیک کر لیں گے"۔ بیگم سے طے کرتیں،

لیکن کنیز اس "کل" کو عموماً اپنے روزانہ کام میں بھول جاتی۔ یہی کیا، کنیز تو ہفتوں کنگھی کرنا بھی بھول جاتی، عرصے سے وہ بیگم کی صندوقچی میں رکھے ہوئے ننھے سے آئینے میں اپنی صورت دیکھنا تک بھول چکی تھی۔ اسے اب عشرت کی یاد بھی نہ آتی۔ نہ ممتاز، نہ نمی اور نہ دادی ——— اور جیسے اس کے ہاں کبھی پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔ بسا اوقات وہ تو یہ بھی بھول جاتی کہ وہ کہاں بیٹھی ہوئی ہے، اور بیگم جن پر اسکی جان جاتی تھی، اسکی منہ بولی اماں ہیں یا محض ایک سوکھا ہوا پتہ۔

الطاف کا خط مہینوں میں آتا، اور جب آتا تو بیگم کی عید ہو جاتی۔ گٹھیا کا درد بھول کر سارے گھر میں ناچی ناچی پھرتیں۔

تو اس دن بھی الطاف کا خط آیا تھا ———

بارش کا موسم ختم ہو چکا تھا، اس کے باوجود فضا میں ٹھنڈک کے بجائے گرمی کی امس تھی، کم از کم کنیز کو تو ایسا ہی محسوس ہوتا۔ اسکی پتلی سی ستواں ناک اور اوپر کے ہونٹ پر پسینہ ہی پسینہ رہتا۔ کھانا تو کھایا ہی نہ جاتا ——— اس وقت وہ بمشکل آدھی روٹی حلق سے اُتار کر بیٹھی تھی۔ اور اسے جانے کیوں دادی بڑی شدت سے یاد آ رہی تھیں۔

"اے کنیز، اے بچی ارے او ری سُن" بڑی بیگم پیچھے سے جھومتی جھامتی کنجیوں کا گچھا بجاتی آئیں۔

اور کنیز اس طرح چونکی جیسے وہ عین چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔ دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ ان دنوں ذرا سی آواز پر یہی حال ہو جاتا۔

"الطاف میاں نے لکھا ہے، اماں اجازت دو تو تمہارے لئے ایک بہو لے آؤں، ایسی نیک بہو کہ انگریز بالکل نہیں لگتی ——— وہ بیوی میری تو کمبختی ہے" بیگم کا گلا رندھ گیا۔ کنیز ایسی بے تعلق سی بیٹھی رہی جیسے باورچی خانے کی کھڑکی میں سے سڑک پر نظر ڈال رہی ہو۔

"توبہ! اس گھر میں سُور کھلانے والی بہو آئے۔ اے ایسی بہو تو اُٹھ کر کاہے کو کسی کام میں ہاتھ لگائے گی، میاں کی ساری کمائی بیروں خانساموں پر اُڑے گی، ہم اپنی ساری جمع جتھا بیٹے بیٹی پر اُٹھا کر دہی منہ دیکھتے رہ گئے نا، نا بیوی میں کاہے کو اجازت دوں گی؟ لکھوں گی مرتے وقت دودھ نہ بخشوں گی، زہر کھا لوں گی، پھر میرے بعد جو مرضی ہو کرنا ——— میں اس اولاد کے لئے مر گئی، امید تھی بہو آ کر کچھ سُکھ دے گی؟" اور بیگم زار و قطار رونے لگیں۔

"اماں بیگم پھر ان کی شادی کر کے کیوں نہیں بھیجا" کنیز نے جیسے اعتراض جڑ دیا۔

"اے لاکھ سلیقے والی لڑکی ڈھونڈ ھی۔ فیشن والیاں پڑھی لکھی اپنی سلمیٰ بی جیسی تو لاکھ مل جاتی ہیں۔ مگر فیشن کے ساتھ گھرداری کرنے والی بھی تو ہو، شکل و صورت بھی ہو ——— اے بس سمجھو ———" بیگم خلا میں نظریں گاڑ کر کچھ ڈھونڈنے لگیں ——— (اور کنیز سوچنے لگی پتہ نہیں مراد آباد کا ٹکٹ دادی نے کتنے میں خرید ا ہوگا۔)

اور پھر بیگم اچانک خوابناک آواز میں بولیں "اے بس سمجھو، میں تو تمہاری جیسی ——— ہاں" بیگم ہکلا گئیں۔

اور کنیز کے جسم پر تڑ تڑا کر جیسے بجلی ٹوٹ پڑی۔ وہ کتنی دیر تک سُن بیٹھی رہی۔ اور پھر جب اُٹھی تو مشین کی طرح گھر کے مہینوں سے پڑے ہوئے کاموں میں جٹ گئی۔

اس دن الطاف میاں کا کمرہ بالکل تیار تھا۔

الطاف کا کمرہ روزانہ صبح سویرے چار بجے سے صاف ہوتا، اس کے بعد کوئی اور کام ہوتا۔ سارا گھر ایسا چمکتا جیسے ابھی بن کر تیار ہوا ہو۔ بیگم کا جسم اتنا دبتا کہ گدھیا کا ورد کہیں دبک کر رہ جاتا۔ ان کے سر میں اتنی بوتلوں کا تیل ٹھنک ٹھنک کر خشک ہو جاتا کہ اگر ان کے بال دوبارہ کالے ہو جاتے، یا وہ ایک دن بیٹھے بیٹھے بی۔ اے پاس کر لیتیں تو کچھ حیرت نہ ہوتی۔ دعائیں دے دے کر بیگم کا منہ دُکھ جاتا، لیکن کنیز نہ تھکتی۔ وہ گھر کا خرچ کم کرنے کی ایسی درپے ہوئی کہ ایسا اوقات شدید بھوک کے عالم میں روکھی سوکھی کھا کر اُٹھ جاتی۔ بیگم ارے ارے کہہ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتیں، لیکن کنیز "پیٹ بھر گیا" کی رٹ لگا کر کھسک لیتی۔ گھر کے اخراجات میں نمایاں کمی ہوتی رہی۔ ایک دن تو کنیز نے دھوبی کو بھی جواب دے دیا کہ "واہ ذرا ذرا سے کپڑوں کے دو دو آنے لگا دیے ہے۔ اے پیسہ کسی کو کھلے ہے" بیگم نے بہت ناں ناں کی لیکن کنیز کے آگے ایک نہ چلی۔ مگر جب دوسرے دن انہوں نے کنیز کے ہاتھ کے دھلے ہوئے کپڑے پہنے تو "واہ" کہے بغیر نہ رہ سکیں۔

اور اس سب کے باوجود جب عام کاموں سے فرصت پاکر لمحہ بھر کو آرام کی خاطر بیٹھتی تو اس کے رویئیں رویئیں سے مسکراہٹ کی لہر کھولتی ہوئی اُٹھتی اور اس کے دبلے پتلے زرد چہرے پر پھوار بن کر پڑنے لگتی۔ اور جب وہ اس توجہ سے اپنے خون کے سارے کھولاؤ کے بڑتے پر مسکراتی تو اس کا سر چکرا جاتا، ماتھے پر ٹھنڈا پسینہ آ جاتا ——

اور ایک دن ایسا آیا کہ وہ اس کیفیت کا بوجھ بھی نہ سنبھال سکی اور باورچی خانے میں بے ہوش ہو کر دھڑام سے گر پڑی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اس کا خون خشک ہو رہا ہے۔

کئی بہاریں آئیں اور گزر گئیں۔ موسموں کی تبدیلیاں اپنی پوری شدت سے ظاہر ہوتیں اور پھر مر جاتیں، لیکن کنیز ایک مشین کی طرح اپنے کاموں سے چمٹی رہتی ——

بیگم کئی بار اسے دیکھ کر دہل جاتیں ——

"اری بچی تجھے اپنا کچھ ہوش نہیں۔ کبھی میرے پاس بیٹھ کر منٹ بھر کو سیدھی کمر کر لیا کر، نگوڑی کچھ کھائے پیئے گی نہیں تو پھر روز روز بے ہوشی کے دورے پڑیں گے"

بیگم ہمدردی سے لبریز آنکھوں سے اس کا تعاقب کرتیں جو ایک خدری روح کی طرح یوکلپٹس، گولڈ شیشم اور جامن کے درختوں میں دبکی ہوئی ننھی سی کوٹھی میں بے تابی سے گھومتی پھرتی۔

بہت سارے دن اور بہت ساری راتیں تیزی سے گزرتی چلی گئیں۔ جیسے وقت ریل پر بیٹھ کر چلنے لگا ہو۔

سلمیٰ بی پچھلے دنوں آئی تھیں تو وہ دو بچوں کی ماں تھیں اور تیسرا پیٹ میں تھا، صاف ستھری لیکن نسبتاً نئی سی کوٹھی کی منڈیروں پر وقت کے اثرات کائی کی شکل میں نمایاں ہونے لگے۔ "چمی" کی دبائی ہوئی آم کی گٹھلی سے پھوٹا ہوا درخت نہ ہو گا تو "چمی" ہی کے قد برابر ہو گا —— لیکن کنیز کے چھوٹے چھوٹے پاؤں اس درخت کے پاس سے اتنی تیزی سے گزر جاتے کہ ہوا کے ایک مصنوعی جھونکے سے وہ کانپ کر رہ جاتا۔ مگر یہ تیزی یہ لپک جھپک تو کنیز کی سرشت بن چکی تھی۔

بھری گرمیوں کی ایک صبح کو الطاف میاں ولایت سے واپس آ گئے۔ دنیا کا اتنا بڑا واقعہ، اتنی شدید خوشی، ایک دن ظہور پذیر ہو گئی۔ مارے

مسرت کے بیگم کے دو آنسو پلکوں پر آکر اٹک گئے۔ سلمیٰ بی مارے خوشی کے دادی سے بھی زیادہ زور سے بول رہی تھیں۔ اور ان کے پیچھے اماں کی بے توجہی پر چچی سے زیادہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہے تھے ــــــ سلمیٰ بی کے میاں الطاف سے ولایت کی تعریفیں سُن سُن کر تھکتے ہی نہ تھے، اور کنیز منٹ منٹ پر منہ دھو کر باورچی خانے سے آتی اور دروازے میں سے جھانک کر ساری رونقیں دیکھ جاتی۔ الطاف سے ایک ہی بار آنکھیں چار کر کے وہ چکرا کر گرتے گرتے بچی تھی ــــــ "ہائے کیسے دیکھیں ہیں" کنیز چھپ کر سوچتی اور پھر باورچی خانے میں جا کر منہ دھونے لگتی۔

"مائی۔ ذرا پانی دینا" الطاف میاں نے آواز لگائی ان کا منہ ولایت خوانی کرتے کرتے خشک ہو چکا تھا۔

"اوئی سچ اس طرح نہ کہو" بڑی بیگم رو ٹھ گئیں "اے وہ تو ایسی سگھڑ ہے، دکھیاری، سمجھو اسکی وجہ سے مہینے کا سارا خرچ پچاس سے کم ہی کم ہوتا۔ نہ چور نہ چکار ــــــ ویسے ہی تمہیں دو دو چار چار سو نہیں پہنچتا رہا ــــــ ایسی سلیقے والی ہے کہ کیا کہوں" بس بیگم نے کنیز کی تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔

"ایسی ہی سلیقہ مند ہے خان بہادر وسیم کی لونڈیا، میں تو ــــــ" اور اس پُل پر سے بہو کا ڈولا بھی گذر گیا۔

پر پانی نہیں آیا۔

"اماں پانی تو ــــــ" الطاف میاں بڑبڑائے۔

"اے پانی نہیں آیا ــــــ اوئی کنیز کانوں میں تیل ڈال لیا بچی؟" بیگم بڑبڑاتی اُٹھیں۔

پانی نہیں آیا ــــــ کنیز اپنا منہ دھونے میں سارا پانی بہا چکی تھی، وہ اپنی بے سلیقگی کے بارے میں ذرہ برابر نہیں سوچ رہی تھی ــــــ وہ تو درختوں کے سائے میں خزاں زدہ زرد پتوں پر سے قدم رکھتی سوچتی جا رہی تھی ــــــ موئے درخت بھی بے فائدہ ہو دیں ہیں۔ صبح سے کتنی بار پتے سمیٹے، پھر بھی ساری کوٹھی میں پتے ہی پتے ــــــ

کوٹھی سے نکل کر وہ سول لائنز کی سب سے کھلی سڑک پر آگئی۔ باورچی خانے میں کیسی ٹھنڈک تھی، اسے اپنی ہڈیوں میں گُٹھیا کا درد اٹھتا محسوس ہو رہا تھا ــــــ

اس کا ڈوپٹہ غراتی ہوئی لُو میں پھڑ پھڑا رہا تھا، لیکن وہ چلتی گئی۔ اور آگے ــــــ اور آگے ــــــ

اور پھر وہ ہار کر ایک کوٹھی کے پھاٹک سے ٹک کر بیٹھ گئی ــــــ اس کا حلق پیاس سے خشک ہو رہا تھا، لیکن کوٹھی کے دروازے کے قریب ہی لگے ہوئے نل سے پانی پینے کا اسے خیال تک نہ آیا ــــــ بس وہ بیٹھی ہوئی لوہے کے پھاٹک کی سلاخوں پر اپنی انگلیاں پھیرتی رہی۔ اس کے چاروں طرف لُو کے مارے زرد پتے کھڑکھڑاتے رہے اور لُو غراتی رہی ــــــ

کوٹھی کے پھاٹک سے ایک نئی کار نکلی اور رُک گئی۔ اس میں سے ایک نئی نئی سی ٹھکی ہوئی بیگم نکلیں اور کنیز کے پاس آگئیں۔

"اے تم کنیز ہونا، سلمیٰ بی کے ہاں کام کرتی تھیں؟" نو عمر بیگم نے خوش ہو کر پوچھا۔

کنیز نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا نکال دیا انہوں نے؟" بیگم نے آنکھیں نچائیں۔

کنیز پھر بھی چپ رہی۔

بیگم کار کی طرف بڑھیں۔ پھر کچھ سوچ کر پلٹیں۔

"میرے ہاں رہو، کھانا کپڑا میرے ذمّے —— ماں کی طرح سمجھوں گی۔" بیگم نے کہا۔

اور کنیز حیران رہ گئی۔

"ماں! اس جوان بیگم کی ماں۔ اے کیا کھوبڑ ہیں لوگ، ایک دم سب کے دبدبے ہٹم ہو گئے کیا۔ ابھی تو میری اصلی عمر تین اوپر تیس کی ہووے گی۔"

اس نے ایک زرد پتہ اُٹھا کر پوری قوت سے مٹھی میں چرمر کر دیا۔ پانچ سال کے عرصے میں وہ بوڑھی ہو چکی ہے۔ اس بات کا اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا —— اسکی آنکھوں سے چند آنسو ٹپک کر چہرے کی مہین مہین چنٹوں میں پھیل گئے، اور کھچڑی بالوں کی ایک لٹ ماتھے پر لوٹتی رہی۔ منٹ بھر میں اس نے سوکھے پتوں کو مسل مسل کر اپنے سامنے ڈھیر کر لیا۔

ریلوے جنکشن

قدرت اللہ شہاب

"کتنی چھٹی پر آئے ہو؟" نثار نے چھوٹتے ہی بغیر کسی علیک سلیک کے پوچھا۔

"پندرہ دن کی" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب۔ چلو اس بار تمہیں لاہور کی زمین دوز مال گاڑیاں دکھائیں گے" نثار نے فیصلہ صادر کیا۔

"میں سیر کرونگا" وہ کچھ دیر سوچکر ——— مشفقانہ انداز سے کہتا ہے "تم کہانیاں لکھنا"

یہ لائحہ عمل ہم دونوں کے حسب منشا ہے۔ چنانچہ شام ہوتے ہی نثار مجھے مال روڈ پر ایک ہوٹل میں لے گیا۔ ہوٹل کے لان میں ہم کمال بے حیائی کے ساتھ ایک ایسی میز پر جا ڈٹے، جہاں پہلے سے دو ایک ایڈیٹر، چند نامہ نگار، کچھ ریڈیو آرٹسٹ، کچھ ادیب اور چند گوگ باران دیدہ حضرت کے سیاسی حضرات براجمان تھے۔ چائے کا دور چل رہا ہے۔ ایک صاحب کولڈ ٹی نوش جاں فرما رہے ہیں۔ یہ کولڈ ٹی اس گرم چائے سے مختلف ہے جو گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے، اور جسے معمولی ذہانت کے انسان پیا کرتے ہیں۔ یہ مشروب خاص لاہور کی ایجاد ہے۔ اور دستور کے مطابق اس ایجاد کی ماں بھی ضرورت ہے۔ وہ ضرورت جو پروہیبیشن کی وجہ سے اکثر حضرات کو پوشیدہ امراض کی طرح لاحق ہو گئی ہے۔

دانشوروں کی اس محفل پر پوسٹ مارٹم کے کمرے کی فضا بڑی شدت سے چھائی ہوئی ہے۔ قوم کی لاش سامنے ٹیبل پر دھری ہے۔ اور ہر شخص اس کا کوئی نہ کوئی عضو ہاتھ میں لئے بڑی چابکدستی کے ساتھ پوسٹ مارٹم کرنے میں منہمک ہے۔ روحانی، جسمانی، ایمانی، اور سیاسی امراض سے لے کر خودکشی کے نفسیاتی اسباب تک بڑی تندہی سے تشخیص ہو رہے ہیں۔ علاج تجویز ہوتے ہیں۔ نسخوں پر گرماگرم بحث ہو رہی ہے۔ میز پر مکے پڑتے ہیں۔ کرسیاں اُلٹتے اُلٹتے بچتی ہیں ——— لیکن اس وقت قوم کی ساری بیماریوں کا واحد علاج صرف اُس چائے دانی میں ہے، جس میں کولڈ ٹی بڑی احتیاط سے محفوظ ہے۔ کولڈ ٹی والے صاحب پیالی منہ سے لگائے مزے مزے کی چسکیاں لے رہے ہیں۔ اور اپنے ارد گرد کف در دہن مسیحاؤں کے طوفانِ بد تمیزی کے باوجود بڑی لاتعلقی سے داغ کی ایک عشقیہ غزل گنگنا رہے ہیں۔

"آج سینما کا پروگرام ہے؟" کولڈ ٹی صاحب نثار سے پوچھتے ہیں۔

"جی نہیں۔ آج دوسرے پروگرام ہیں" نثار میری طرف اشارہ کرکے دوسرے کے لفظ پر خاص زور دیتا ہے۔

"ہوں!" کولڈ ٹی صاحب عینک اُتار کر مجھے سر سے پاؤں تک بڑے غور سے گھورتے ہیں۔ "نثار، تم نے ابھی ان کی کیا تعریف کی تھی؟ کس جگہ کے میونسپل کمشنر ہیں یہ؟"

نثار قہقہہ لگا کر ان کی تصحیح کرتا ہے " میونسپل کمشنر نہیں، بھائی - یہ برخوردار ڈپٹی کمشنر ہے۔ ڈپٹی کمشنر "
کولڈٹی صاحب قطعی مرعوب نہیں ہوتے " ٹھیک ہے " وہ بڑے مربیانہ انداز سے فرماتے ہیں " اس نازک زمانے میں ایک آدھ ڈپٹی کمشنر کو ہاتھ میں رکھنا کوئی معیوب بات نہیں ہے "
پھر وہ کمال شفقت کے ساتھ میری ڈھارس بندھاتے ہیں " برخوردار، تم بے فکر رہو۔ میں لاہور میں تمہاری موجودگی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرونگا۔ انشاء اللہ "

" یہ بچہ لاہور کی زمین دوز مال گاڑیاں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ نثار مؤدبانہ گزارش کرتا ہے " یہ اُن پر کہانیاں لکھے گا "
" تم کہانیاں بھی لکھتے ہو؟ " کولڈٹی صاحب اس انداز سے پوچھتے ہیں جیسے کہانیاں لکھنا کوئی بہت بڑا اخلاقی جرم ہے " کہاں لکھتے ہو؟ "
میں خجالت سے منمنا کر نقوش، سویرا، ساقی، ہمایوں، ادبی دنیا وغیرہ کے نام لیتا ہوں۔
" یہ رسالے کہاں سے چھپتے ہیں؟ میں نے تو نہیں دیکھے " کولڈٹی صاحب کی نظر میں میری ادبی پوزیشن گر جاتی ہے - وہ اپنی عینک دوبارہ آنکھوں پر لگا لیتے ہیں، اور مشفقانہ انداز میں مجھے یہ رائے دیتے ہیں، کہ اگر مجھے کہانیاں لکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو شمع، ڈائرکٹر اور چنگاری میں لکھا کروں۔ کولڈٹی کا آخری پیالہ حلق میں انڈیل کر وہ ان رسالوں پر اپنی گرانقدر رائے کا اظہار بھی فرماتے ہیں۔
اس مختصر سی علمی و ادبی بحث کے بعد جب ہم ہوٹل سے نکل کر ایک تانگے میں سوار ہوتے ہیں، تو نثار اور کولڈٹی صاحب کا تانگے والے سے تبادلۂ خیالات شروع ہو جاتا ہے۔ تانگے والا بڑی مشاقی سے اپنے فنونِ لطیفہ کا پرچار کرتا ہے " زمیندار اخبار کے عقب میں رہنے والی جو انگریزی بولتی ہے .... چوبرجی والی جس کا رنگ گورا اور بال سنہری ہیں ...... میو گارڈن والی جو اسی سال میٹرک میں فیل ہوئی ہے ...... گھوڑا ہسپتال کے پاس والی جو لتا منگیشکر کی طرح گاتی ہے ..... ماڈل ٹاؤن والی جو ایک ہسپتال میں نرس ہے .... "
لیکن نثار اور کولڈٹی صاحب تانگے والے کے پراپیگنڈے سے بالکل متاثر نہیں ہوتے۔
" تم سالے باسی کڑھی کا اُبال ہو " کولڈٹی صاحب خفا ہوتے ہیں۔ تم سے تو مزنگ کے اڈے کے تانگے والے ہزار درجہ اچھے ہیں "
تانگے والا مزنگ کے اڈے والوں کو فصیح و بلیغ گالیاں دے کر ڈرامائی انداز سے اپنا تازہ ترین شاہکار برآمد کرتا ہے " لڑکی کیا ہے صاحب، نرا آلو بخارا ہے - ابھی کالج میں پڑھتی تھی۔ فقط دو مہینے سے اس لائن میں آئی ہے - اب تک صرف چار مرتبہ باہر گئی ہے - کالے خاں پٹھان نے پورے ساڑھے سو روپے دیئے تھے - تمہاری خاطر سے دو سو میں منا لونگا۔ چلوں؟ "
آلو بخارا کے نام پر نثار اور کولڈٹی صاحب کی رال بھی ٹپکنے لگتی ہے - لیکن دو سو روپے کا ذکر سن کر اُن کے جبڑے لٹک جاتے ہیں۔ وہ دونوں امید افزا نظروں سے مجھے گھورتے ہیں۔ خاص طور پر کولڈٹی صاحب کے انداز بڑی شدت سے للکار رہے ہیں، کہ برخوردار دیکھو، میں تمہیں اپنی خدمت کا سنہری موقعہ دے رہا ہوں۔ اگر تم اس وقت کام نہ آسکے، تو ڈپٹی کمشنر نہیں، گھسیارے ہو ——— لیکن میرے انداز میں کہ انہیں نفی کا جواب دیتے ہیں - اور وہ مایوس ہو کر پھر اپنا جبڑا لٹکا کر بیٹھ جاتے ہیں۔
اس خاموش کولڈ وار کے بعد موضوع سخن بدل جاتا ہے۔ تانگے والا گھوڑے کو مخاطب کر کے ہمیں بڑی سنگین اور پیچیدار گالیاں سناتا ہے۔ نثار اپنے جگری دوستوں کی تعریف کرتا ہے، جو ضرورت کے وقت اس پر کئی ہزار روپیہ تک خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے - اور کولڈٹی صاحب پاکستان کے جملہ افسروں کی کمینگی، نالائقی، اور بد دیانتی پر جی کھول کر تبصرہ فرماتے ہیں۔ یوں بھی رفتہ رفتہ کولڈٹی اپنا رنگ دکھا رہی ہے - اور جب تانگے والا

گھوڑے کی وساطت سے ہمیں چند الوداعی گالیاں سُنا کر ہیرامنڈی میں نوگزے کی قبر کے پاس اُتار دیتا ہے۔ تو کولڈی صاحب کے پاؤں بڑی شدت سے لڑکھڑا رہے ہوتے ہیں۔ اور وہ "س" کو "ش" میں بدل کر بڑی خوش سگالی سے چوک میں کھڑے ہوئے پولیس کانسٹیبل کو مخاطب کرتے ہیں "شپاہی جی، شلام۔ جیتے رہو۔"

سپاہی نتھنے پھیلا کر کولڈی کے منہ کو قریب سے زور لگا کر سونگھتا ہے "اچھا! آج بھی خوب چڑھا رکھی ہے، صاحب۔ پرمٹ کہاں ہے؟"

کولڈی صاحب فتح مند مُرغ کی طرح چھاتی نکال کر اپنا ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھاتے ہیں۔ غالباً وہ مجھے پرمٹ کے طور پر سپاہی کی خدمت میں پیش کرنے والے ہیں۔ لیکن میں نظر بچا کر کھسک جاتا ہوں۔ اور نوگزے کی قبر کی اوٹ میں جا چھپتا ہوں۔

مجھے غیر موجود پا کر کولڈی صاحب کی چھاتی کا تناؤ ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ اور وہ اپنی بُش شرٹ کی جیبیں ٹٹول کر پانچ روپے کا نوٹ کانسٹیبل کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ کانسٹیبل اِس پرمٹ سے مطمئن ہو کر چلا جاتا ہے۔ نثار اور کولڈی صاحب کی گرمی گفتار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت اِن کے درمیان میری ذات کا مسئلہ زیرِ غور ہے۔ وہ کچھ دیر میرا انتظار کرتے ہیں۔ اور پھر غصّے سے ایک طرف کو چل کھڑے ہوتے ہیں۔

نوگزے کی قبر کے پاس زیادہ دیر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ وہی پرمٹ والا سپاہی اب مشتبہ نگاہوں سے بار بار میرا جائزہ لے رہا ہے۔ میں واپس لوٹنے کے لئے کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں جہاں نثار، کولڈی صاحب، اور پرمٹ والے کانسٹیبل سے میرا سامنا نہ ہو۔ اِس تلاش میں میں ہیرامنڈی کی بے شمار پیچ در پیچ گلیوں کے تانے بانے میں اُلجھ جاتا ہوں۔ اِس حمام میں سب ننگے ہیں۔ گلیوں اور سڑکوں پر مٹرگشت کرتے ہوئے شائقین، قدم قدم پر چیل کی طرح جھپٹتے ہوئے دلاّل، دروازوں اور دریچوں میں گُڑیوں کی طرح سجی ہوئی عورتیں ——— اپنے رنگ برنگ ملبوسات کے باوجود یہ ساری مخلوق الف ننگی ہے۔ اور ان کے جسم اور ذہن ایک ہی بے آواز سُر پر بڑی ہم آہنگی کے ساتھ رقص کر رہے ہیں۔ فضا میں کچے گوشت کی بساند رچی ہوئی ہے۔ اور بڑی بڑی پاور کے قمقموں کا اجتماعی نور گلیوں اور سڑکوں پر برص کے داغوں کی طرح پھیلا ہُوا ہے۔ مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے۔ کہ یہ عورتیں جو دروازوں اور کھڑکیوں میں گردنیں لٹکائے بیٹھی ہیں، یکایک پھُر سے اُڑ جائیں گی۔ اور ابابیلوں کی طرح اپنی چونچوں میں کنکریاں اُٹھا کر ساری دُنیا کو اپنے نرغے میں لے لیں گی ——— لیکن عملی طور پر کنکریوں کی جگہ میری گردن پر چھپاک سے بلغم کا ایک بڑا سا غلغلہ آ گرتا ہے، جو ایک ادھ مُوئی سی عورت دریچے میں بیٹھی بڑے اطمینان سے کھنکار کھنکار کر نیچے تھوک رہی ہے۔ میں اپنی گردن کو اِس غلاظت سے پاک کرنے کی فکر کرتا ہوں، تو خدا کی خاص رحمت میری دستگیری فرماتی ہے۔ اور ایک گلی میں مجھے مسجد نظر پڑتی ہے، جس کے ایک دروازے پر کالی سیاہی سے "یا اللہ" اور دوسرے دروازے پر "یا محمدؐ" لکھا ہُوا ہے۔ یہ چھوٹی سی مسجد دو بلند و بالا عمارتوں کے درمیان بڑی بے کسی سے جکڑی کھڑی ہے۔ اندر پیشاب اور پاخانے کا تعفّن ہے۔ ایک طرف نالی میں بیئر کی چند خالی اور شکستہ بوتلیں اوندھی پڑی ہیں۔ وضو کے لئے ایک پرانا حمام ہے، جس کا پانی باسی لعابِ دہن کی طرح کثیف ہے، اور بڑے زوروں سے ہمک مارتا ہے۔ نہ جانے اس مسجد کو دیکھ کر میرے ذہن میں ریل کے انجن کا خیال کیوں آتا ہے، جو تیز رفتاری سے چلتا چلتا اچانک پٹڑی سے اُتر گیا ہو!

ہیرامنڈی سے بھٹکتا بھٹکتا آخر میں شاہی مسجد آ پہنچتا ہوں، اور خدا کی کھلی فضا میں اطمینان سے زور زور سے سانس لینے لگتا ہوں۔ رات کے بارہ بجے بھی مسجد کے آس پاس کئی شاندار کاریں کھڑی ہیں اور اُن کے ڈرائیور اِدھر اُدھر بیٹھے بے دلی سے اُونگھ رہے ہیں۔ یہ شرفا کی موٹریں ہیں، جو اپنی بیگمات سے اجازت لیکر شاہی مسجد میں آدھی رات نیم شبی یا اقبال کے مزار پر ہدیۂ عقیدت پیش کرنے یہاں آیا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے، کہ مسجد کی چکنی سیڑھیوں پر اکثر ان کا پاؤں پھسل جاتا ہے اور وہ لڑھکتے لڑھکتے بے اختیار ہیرامنڈی کے نہاں خانوں میں جا گرتے ہیں۔ اگر اقبال زندہ ہوتا، تو وہ مسئلہ جبر و قدر کی ایک

نئی تفسیر منظوم کر سکتا تھا!

شاہی مسجد کے عین مقابل پرانے قلعے کی اونگھتی ہوئی عمارت ہے، جس کے صدر دروازے پر پاکستان کا جھنڈا اکسلمندی سے لہرا رہا ہے۔ اقبال کے مزار میں ایک چھوٹا سا بلب روشن ہے۔ بڑا بلب کچھ عرصہ ہوا کہ چوری ہو گیا تھا۔ لاہور میں بجلی کے نئے بلب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ کیونکہ اُن کی مانگ ہیرا منڈی میں بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ اقبال کے مزار کو ایک چھوٹے سے بلب پر ہی قناعت شعار رہنا چاہیئے۔ مزار کے دروازے پر ایک آہنی قفل لگا ہوا ہے۔ تاکہ عقیدت مند اندر گھس کر سوچ بورڈ نہ چرا سکیں ——— باہر لان میں ہیرا منڈی کے اِکا دُکا دلال بھولے بھٹکے راہیوں کے لئے خضر راہ کا کام دینے کے لئے منتظر بیٹھے ہیں۔ ایک تانگے والا دو دو آنے میں داتا کے دربار پہنچانے کا اعلان کرتا ہے۔ میں اُچک کر اس میں سوار ہو جاتا ہوں۔ تانگے میں ضلع جہلم کے دو مقدمہ باز بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ دن بھر مقدموں اور کچہریوں کی زحمت کے بعد وہ گھڑی دو گھڑی دل بہلانے کے لئے ہیرا منڈی آ گئے تھے۔ اور اب حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ پر سلام کرنے جا رہے ہیں۔

"کرتا تو سب کچھ اللہ ہی ہے"۔ ایک مقدمہ باز اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے "لیکن بزرگوں کا سہارا بھی بڑی چیز ہوتی ہے"۔

دوسرا مقدمہ باز بھی اس نظریئے کی تائید کرتا ہے۔ اور اس روحانی گفتگو کے بعد وہ دونوں سرگوشیوں میں ہیرا منڈی کے ذاتی تجربات پر تبادلۂ خیالات کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

جمعرات کی وجہ سے داتا کے دربار میں عورتوں، مردوں اور بچوں کا بے پناہ ہجوم ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ اور دربار کے صدر دروازے میں نثار اور کولڈٹی صاحب ہاتھ میں ہاتھ ڈالے حیرت کھڑے ہیں۔ ہجوم کے ہر ریلے کے ساتھ وہ خس و خاشاک کی طرح بہتے ہوئے اندر چلے جاتے ہیں۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے واپس آکر صدر دروازے کے عین بیچ اپنی جگہ سنبھال لیتے ہیں۔ میں ہر چند کوشش کرتا ہوں، کہ اُن کی نظر بچا کر ادھر اُدھر ہو جاؤں۔ لیکن نثار مجھے دیکھ لیتا ہے، اور زبردستی کھینچ کر اپنے پاس کھڑا کر لیتا ہے، کولڈٹی صاحب بھی میری پچھلی لغزشوں کو فراموش کر کے بڑے اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ اور داتا کے دربار کے ساتھ مسلمان عورتوں کی عقیدتمندی کے جملہ فوائد پر عارفانہ روشنی ڈالتے ہیں۔ اپنے پروگرام کے مطابق یہ لوگ اب یہاں سے مزنگ کے اڈے پر جائیں گے۔ اور وہاں سے زمین دوز مال گاڑیوں کی دوسری منزل شروع ہوگی ——— لاہور نارتھ ویسٹرن ریلوے کا بہت بڑا جنکشن ہے۔ یہاں کی زمین دوز مال گاڑیاں ہر سڑک، ہر گلی، ہر کوچے میں چلتی ہیں۔ جگہ جگہ سُرخ بتیوں کے نشان ٹمٹماتے ہیں۔ لیکن ان بتیوں کے باوجود کئی گاڑیاں کانٹا بدلتے بدلتے چوک جاتی ہیں۔ اور اکثر تصادم کے حادثات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی تیز رفتار انجن چلتے چلتے پٹڑی سے اُتر جائے، تو اُسے پھینک نہیں دیا جاتا۔ بلکہ اس کی پیشانی پر کالی سیاہی سے اللہ اور رسول کا نام لکھ کر اُسے مسجد کے کام پر لگا لیا جاتا ہے......

شکارگاہ سے —

ابوالفضل صدیقی

کیمپ دراب نگر۔ ضلع بدایوں

۱۵ر دسمبر ۱۹۵۲ء

پیارے، سلام محبت!

تمہارا پہلا مکتوب ملا تھا جس کا جواب دے کر میں شکار کو چلا آیا تھا اور دوسرا مجھے آج اخبار کے ساتھ یہاں بھیجا گیا ہے۔ تم نے اپنے پہلے خط میں رسالہ کے لئے کہانی مانگی ہے اور اس میں شدید یاددہانی ہے۔ خیر کہانی تو سبھی مانگتے ہیں، اس امید میں کہ میں دیہاتی معاشرت پر کسان، زمیندار، ساہوکار کے مثلث، مساوی الساقین کے نکو نے میدان میں اپنے توسنِ قلم کو اناپ شناپ دوڑا کر کہیں رہنسا، کہیں پر روتا تڑپتا پھڑکتا، عزیب و سادہ و رنگین قسم کا متوازن افسانہ لکھ کر بھیج دوں گا۔ یا سرمایہ دار کی ہجو اور مزدور کا مرثیہ دونوں ایک جگہ جمع کر کے ایک عجیب قسم کا چوں چوں کا مربہ جیسا کھٹا میٹھا، میٹھا کڑوا بیک وقت سبھی کچھ لکھ کر بھیج دوں گا جس طرح مدتوں سے ہر کچی روشنائی سے نام نامی چھپا دیکھنے کا خواہشمند افسانہ نگار گھٹنوں چلتے ہی سرپٹ دوڑنے کی منزل پر پہنچنے کے لئے قلم سے بندر کی سی اضطراری حرکات کا مرتکب ہوتا ہے اور "انا الافسانہ نگار" کی بے ہنگامہ بانگ بلند کرتا ہے۔ یا اُدھر کچھ دنوں قورمہ پلاؤ تو مس کھن سے حلق تک پیٹ بھر کر ساڑھے سات سو میل پر بیٹھے ہی بیٹھے فسانہ نگاری کی دُوربین کے مشاہدہ سے بنگال کے بھوکوں کے پچکے پیٹ اور کھوکھلے سینے دیکھ کر اور کہانی گرہست کے ٹیلیفون پر تلنگانہ کے جانبازوں کے انقلابی نعرے سُن کر داستان گوئی کے منار پر ایک سری کنیسری کہانی الاپ دوں یا پھر جب راس کماری سے نندا دیوی تک سارا برِ اعظم جل رہا تھا تو بھیا سہیل تم نے سُنا ہو گا کہ کسی کا گھر جلے اور اور کوئی تاپے! اس بھٹی میں سے گرم گرم لوہا نکال کر اور کاغذ قلم کی بنائی ہتھوڑی پر جلدی جلدی پیٹ کر ایک برابر وزن کے دو باٹ گھڑوں، اور میزانِ عدل کی ڈنڈی پکڑ کر افسانہ نگاری کے تخت پر شہنشاہِ عالم الغیب بن کر بیٹھ جاؤں اور ہندو ظالموں اور مسلمان ظالموں کے درمیان اور ہندو مظلوموں اور مسلمان مظلوموں کے مابین توازن قائم رکھتے ہوئے دونوں پلے بجا بجا کر ہر راگ کی تان پر ہندو مسلم اتحاد کی ٹانگ توڑتا رہوں، اور اسطرح "TOPIC OF THE DAY" پر کہانیاں لکھ لکھ کر مدیرِ محترم کی بزرگانہ فرمائش اپنی طفلانہ کوششوں سے پوری کرتا رہوں! ...... لیکن سہیل! مشینی دور میں باتیں بھی کچھ "سورج کی چال کے بجائے بجلی کی رفتار سے" نئی اور پرانی ہوتی ہیں۔ کیا بتاؤں ایک کہانی شروع نہیں ہو پاتی اور پرانی ہو جاتی ہے اور ادھر کچھ دنوں سے زمانہ کی ٹکسال بھاپ اور تیل اور بجلی کے بجائے ایٹم کے ذریعہ نئے نئے سکے ڈھالتی ہے اور "TOPIC of The Day" صبح، دوپہر اور شام کے بھی ایٹمی ٹکڑے کر کے ہر نگاہ میں گرگٹ کے سے رنگ بدلتا ہے اور اب جبکہ ملک میں قتل لوٹ اور بھوک صبح شام دوپہر کی طرح روزِ روشن کا جزو بن گئیں تو مدیرانِ گرامی کچھ اس قسم کا مطالبہ فرماتے ہیں کہ اپنا توسنِ قلم ایک اضطراری جست میں ہمالیہ کے اس پار پھندا دوں، اور ماسٹر صاحب سے ساتویں کلاس میں پڑھی ہوئی اور نقشے پر چیونٹے کی سی ٹانگوں کی طرح دیکھی ہوئی کوریا کی اس سرزمین پر کاغذی گھوڑے دوڑاؤں جس کی سطح مرتفع کو سُنتے ہیں کہ امریکن بردہ فروشوں نے اپنی آہنی ورزش کا اکھاڑہ بنا کر غاروں میں تبدیل کر دیا ہے، یا پھر فارموسا کی خلاءِ بسیط میں منڈلاتے ہوئے چینی عقابوں اور امریکی گدھوں کی "دو دو چونچیں"

دکھلاؤں۔ اور، اور کچھ نہیں تو چشموں کے تیل کی لاش اور سویز کے پانی کے جنازے پر ایران و مصر کی بازی گاہوں میں غرغش کرتے انگریزی کتوں اور امریکی بھیڑیوں کی Sham Fight کے تماشہ کا ڈرامہ لکھوں۔ غرض نہ سہی عینی مشاہدہ سے سُن سُن کر ہی افسانہ کا پلاؤ پکانے کے لئے یخنی چاول گھی وغیرہ سب جنہیں کرۂ ارض کا نقشہ دیکھ دیکھ کر کہیں نہ کہیں سے IMPORT کروں اور تمام مرچ پاس سے ملا ملا کر مدیر گرامی کے جریدہ کا "ھل من مزید" پکارتا چولہا گرم رکھوں اور سو گھر ماروں، ہزار ٹھٹیاں پھاندوں ایڈیٹر صاحب کو ناشری اور اپنی ادبی بقائے حیات کے لئے خوراک بہم پہنچانے میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا رہوں۔

لیکن میاں سہیل تم بھی خوب جانتے ہو کہ تم تہذیب اس دور میں نکال رہے ہو جب نئی سے نئی چیز پرانی ہو چکی ہے لہٰذا ایک پرانے چابک دست قسم کے ایڈیٹر کی طرح بھیجی سے کام لیتے ہوئے موضوع کی فرمائش کر دی جو اتنا پرانا ہے کہ جدید ترین معلوم ہوتا ہے اور اُردو کے لئے تو درحقیقت نیا ہی ہے اور نباض قسم کے ایڈیٹر اور گھاگھ قسم کے صحافی ہونے کے علاوہ اُلٹے سیدھے شکاری بھی معلوم ہوتے ہو یار! ورنہ شکاری کی نفسیات کے اتنے اچھے محرم نہ ہو سکتے تھے۔ اس وقت خوب جانتے ہو کہ جانچ تول کر نشانہ لگایا ہے بھرپور [illegible] پڑے گا۔ سمجھتے ہو کہ امونیشن نایاب ہے، شوقین سے شوقین شکاری چھپٹا ہوا کارتوس بنا پڑا ہے۔ اور میں بھی [illegible] ہاتھ پر ہاتھ دھرے گھر بیٹھا رہوں گا۔ وصل نہ سہی حسرت ہی سہی! شکار نہیں تو شکار پر کہانی ہی سہی! میری تحریک پر اور کچھ نہیں تو بگڑے شاعر کی طرح مرثیہ ہی لکھنے بیٹھ جاؤں گا لہٰذا شکاری کہانی کی فرمائش دے ماری، لیکن تمہارا خط بجائے اس کے کہ میرے دماغ میں افسانہ نگاری کی تحریک کرتا، دیوانہ را ہوئے بس است! میرے خوابیدہ اعصاب میں کہربائی رو کی طرح گدگدی دوڑاتا چلا گیا اور میرے اندر جو شکاری کی سیلی ہوئی بارود دبی پڑی تھی اس پر چنگاری بن کر جا پڑا۔ اور تم نے یہ سمجھ کر کہ ایک فن کار جو کچھ مادی دنیا میں نہیں پا سکتا وہ خیالی دنیا میں پا لیتا ہے۔ حالات کا اندازہ کر کے ادیب کی نفسیات سے کام لینے کے لئے شکاری افسانہ کی فرمائش کی تھی، یہ خیال کر کے کہ کہانی کی کہانی ہو جائے گی اور شکار کا شکار! بندوق سے نہ سہی قلم سے، میدان و جنگل میں نہ سہی گھر کے اندر کاغذ پر ہی...... مگر یار تم نے فرمائش کرتے وقت مجھ کو نرا شکاری ہی سمجھا۔ اور یہ بھول گئے کہ میں ترقی پسند ہوں، اور ترقی پسند بھی افسانہ نگار! بغیر عہدۂ قضا کے پروانہ کے قطب شمالی سے قطب جنوبی تک ہر شہر کا قاضی بنا اندیشہ میں گھلتا ہوا۔ اور شکار میں کہانی بجائے پارکر ۵۱ قلم کے خواہ ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ ہائی ویلاسٹی رائفل سے کر لکھی جائے۔ پھر بھی اندیشہ معلوم ہوتا ہے کہ رجعت پسندی ہی رہے گی۔ کیونکہ وہاں تو توپ سے وعظ کرنا تو کچھ قیصر جرمن کے ہی حصہ میں آیا تھا اور اسٹالن اعظم تو پیام امن باندھ باندھ کر کبوتر اڑاتے تھے۔ شبہ نہیں! اور شکاری کہانی لکھنے کی اختراع ہے انیسویں صدی عیسوی کے وسط کی جب انگریز اپنی قدیم سپورٹنگ اسپرٹ کے ہاتھوں جوع الارض کا شکار ہو کر مشرقی مدنیت اور معاشرت پر سائنس کی ابتدائی صلاحیتوں، اور بورژوا ذہنیت کی انتہائی بلندیوں کے زور سے شراب دو آتشہ بن کر چڑھا تو نہ صرف اس نے انسانوں ہی کے اعصاب اور دماغوں پر ہاتھ صاف کیا بلکہ ایشیا اور افریقہ کے جنگلی چوپایوں اور پرندوں پر بھی قابو پا گیا اور قدیم طریقۂ شکار کو جو کول اور دراوڑ سے لے کر مغل دور تک تھوڑی بہت ترمیم و تنسیخ کے ساتھ رائج رہا تھا یکسر بدل دیا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے وسط میں شکار جیسے فروعی موضوعات پر انگریز شکاریوں نے اپنے افریقہ اور برما کے جنگلوں کے شکاری مہمات پیش کئے جو اس دور میں ہندوستان کے اندر بڑی دلچسپی کے ساتھ انگریزی داں طبقہ نے پڑھے ورنہ پرانے زمانہ میں کوئی شہزادہ گھوڑے پر سوار ہرن کا تعاقب کرتا۔ بیابان جنگل میں ساتھیوں سے بھٹک کر سرِ شام کسی دہقان کی جھونپڑی پر بھوکا پیاسا پہنچا کرتا اور وہاں سے بالعموم اس دہقان کی پری چہرہ، حور لقا لڑکی کو خطِ غلامی لکھ کر پلٹا کرتا اور اس طرح قصہ کی ہیروئن شکار کے طفیل اماں حوا کی طرح کہانی کے ہیرو کی بائیں پسلی سے پیدا ہو کر داستان آگے بڑھائی جاتی۔ اور پھر ساونتی کہانی شروع ہوتی۔ اب ترقی پسندی کے حدود میں تو شکاری کہانی کسی صورت پھنستی نہیں کیونکہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ شکار کا شوق ٹھیٹ فیوڈل دور کی یادگار ہے اور ہمیشہ سے اونچے طبقے میں اوقات گشتی کا تفریحی مشغلہ رہا ہے اور میں خواہ سمجھتا نہ ہوں اور ممکن ہے کہ بدنصیبی سے سمجھا بھی نہ جاتا ہوں مگر سوچتا پرولتاری طبقہ کے طریقۂ فکر سے ہوں لہٰذا پہلے تو شوقِ شکار کا جذبہ ہونا اور پھر یہ چیز عملی طور پر محبوب مشغلہ ہی کیا کہ بغاوت ہے اپنے پلیٹ فارم سے، اور بورژوا اور ساونتی رجعت پسندی ہے اور تم انقلاب کے بعد ڈھٹائی سے اقبالِ جرم کی دیدہ دلیری کی ترغیب دیتے ہو، ویسے ہی میری جلسی زندگی، اور

تربیتی ماحول مجھ پر رجعت پسندی کا چارج لگانے کے لئے کیا کم ہے اور شکار جیسے بورژوا موضوع پر کہانی لکھوا کر تم اس ریشمیں تانے بانے کو تار تار بکھروانا چاہتے
ہو جو میں نے اپنی ادبی نشست کے چاروں طرف تان کر ترقی پسندی کا حصار قائم کیا ہے اور جس کے اندر بیٹھ کر میں ترقی پسند افسانہ نگاری کرتا ہوں۔ لہٰذا بھائی
ایسا احمق تو نہ تھا کہ تمہاری فرمائش پر اندھا دھند قلم کاغذ لے کر شکاری کہانی گھڑنے بیٹھ جاتا۔ البتہ تمہارا شکاری کہانی لکھنے کی فرمائش والا خط سوئے ہوئے شوقِ شکار
کی تحریک کا موجب ہو گیا اور قلم دوات سنبھالنے کے بجائے تمام برسات کی گریس کے لحافوں میں لپٹی ہوئی بندوقیں پونچھ پانچھ کر جنگل کو چل دیا۔ میری اس حرکت پر
شاید اور میرے سب ادبی دوست کچھ حیرت کریں مگر سہیل تم اُلٹے سیدھے شکاری ہو اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر انصاف کرو نومبر دسمبر کا سیزن!! ایک ایسے شکاری سے
شکاری کہانی لکھنے کی فرمائش جس کی عمر کے پینتالیس سالوں میں سے پانچ کم پینتالیس کبھی کبھی شکار نہ کھیلنے میں گذرے ہوں اور اب تین سال سے کبھی کبھی شکار کھیلنا
نصیب ہوا ہو گیا اس کے بربطِ شوق کے سب خوابیدہ تاروں پر مضراب نہ ہوتی؟ بس جھنجھنا اٹھا تمہارا خط پڑھ کر سہیل! اور وہ جو کچھ تم بیچارے نے حرف لکھ کر بھیج دیئے
کے لئے لکھا تھا کرنے کے لئے مارنے مرنے پر تُل گیا! میاں میں کہا کرتا ہوں کہ جب میرا عالم نزع ہو اور مجھ پر سکرۃ الموت طاری ہو اور مجھے ہوش میں لا کر بات
کرنے کی ضرورت پیش آئے تو نہ تو کیمفر اور آکسیجن دینے کی ضرورت ہے اور نہ جواہر مہرہ خطائی اور نوشدارو دلوی حلق سے اُتارنے کی، بلکہ میرے کان کے قریب منہ
لا کر "شکار چلو" کہہ دینا مجھے ایک مرتبہ کو سچ مچ بسترِ مرگ پر اٹھا کر بٹھا دے گا۔

سہیل! آدمی آدمی سے پہلے شکاری ہوا۔ کیونکہ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ وہ جب بھی شکاری تھا جب SOCIAL نہیں ہوا تھا۔ اور یہ تو تم جانتے ہی
ہو گے کہ وہ فطرتاً و جبلتاً شکاری واقع ہوا ہے اور آج تک یہی جذبہ کبھی کبھی اسے رجعت علی الاصل کے تحت سوسائٹی سے گریز و فرار کرا کے جنگل میں لے جاتا ہے
شکار کے شوق میں یک گونہ دلچسپی مسخ سے مسخ شدہ طبقہ کے انسان کے اندر پائی جاتی ہے اور یہ اس کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ خالصتاً شکاری ہے اور شکاری
اصلِ آدمیت سے بہت زیادہ قریب ہے اور دونوں میں ابتدائے آفرینش کا رشتہ ہے۔

مشہور ضرب المثل شکاری شکار کھیلیں اور ...... ساتھ ساتھ پھریں تم نے عملی طور پر شکار کھیلتے وقت اپنے چاروں طرف بیسیوں ...... میں کارفرما
دیکھی ہو گی جو بغیر کسی مزدوری یا لالچ کے حتیٰ کہ بلا تحریک کے اپنا کام تج کر للّٰہی تماش بینوں کی صورت میں شکاریوں کے ساتھ ساتھ پھرتے ہیں یہ کیوں ہے یوں کہ یہ
مشغلہ فطرتِ انسانی کو شاید سب سے زیادہ اپیل کرتا ہے کیونکہ اس کے اندر اس کی اپنی اصلی و للّٰہی ارتقاع کی تاریخ پوشیدہ ہے اور شکاری اصطلاح میں ان
غریب ساتھ ساتھ پھرنے والوں کو ...... کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے حتیٰ کہ ان ...... نے شکار پور کے نام سے ہند و پاکستان دونوں ممالک میں
اپنی اپنی بستیاں بسا لیں۔

اور سہیل میری طبیعت ان شکاروں سے ہمیشہ گریزاں رہی ہے جن میں سوسائٹی کا لمبا چوڑا دائرہ ہوتا ہے اور جس میں انگریزی دور کا مجسٹریٹ ضلع لاٹ صاحب بہادر
کی آمد پر ضلع کے ہر چھوٹے بڑے لائسنس دار اسلحہ کو معاً ساتھ پھرنے والوں میں بھرتی کرنے کے لئے نیم سرکاری حکم نامہ قسم کے دعوتی رقعے ارسال کیا کرتا تھا اور
اس طرح لاٹ صاحب کے کیمپ کے کل اخراجات ایک یا دو بڑے ...... کے سر کر کے انہیں پیچھے پیچھے پھرایا کرتا تھا اور شکار کے اختتام پر لاٹ صاحب
ان ...... سے مصافحہ کرنے کا تمغۂ عطا کر کے اور نیم انگریزی نیم اُردو زبان میں شکریہ کے رسمی الفاظ ادا کر کے چل دیتے جس کا سرور رگ و پے میں
...... میزبان کے اندر اگلے سیزن تک دوڑتا رہتا اور جس کی فردوسی نغمہ کی سی آواز شامہ میں سال بھر تک گونجتی رہتی ــــ مگر بھیا یہ اس دور کی باتیں کرنے
پڑ گیا میں جب بڑے لاٹ صاحب اور چھوٹے لاٹ صاحب کی چھری کی دھار پیاز اور شلغم کی سرخی دیکھ کر نہیں مڑا کرتی تھی اور نہ انسانی خون کے جریان اور
حیوانی خون کی روک کے لئے بڑے لاٹ صاحب اور چھوٹے لاٹ صاحب سنگین اور قلم چلایا کرتے تھے۔ ہاں تو تم سمجھ گئے ہو گے سہیل بھیا! جب نیل گائے
بند نہیں تھا اور آدمی کھلا نہیں تھا "بند" اور "کھلے" کی شکاری اصطلاحات کو تم اچھی طرح سمجھتے ہو گے یعنی جو شکار ممنوع ہوتا ہے وہ بند کہلاتا تھا اور جس کی

اجازت ہوتی ہے وہ "کھلا" کہلاتا ہے یہ قانونِ جنگلات کی اصطلاحات ہیں۔ اور شاید تمہیں یہ بھی یاد ہو کہ چھوٹے لاٹ صاحب نے ابھی پچھلے چار پانچ سال ہی صرف اس کے نام کی عظمت کے سبب نیل گائے قانوناً بند کر دیا تھا اور شاید آدمی کھول دیا تھا لیکن اب اس سال SHORTAGE OF FOOD کے مسئلہ میں علاوہ پیٹور رئیسوں اور سیہ رو تاجروں کے نیل گائے کی شکل بھی بھیڑیئے کی سی نظر آنے لگی تو پہلے تو جلدی سے اس کا جدید نام "نیل گھوڑا" تصنیف کیا اور پھر اس سال اس کا تقدسِ نامی بالائے طاق رکھ کر اس کے استیصال کے لئے باقاعدہ مہم جاری کرنے کا اعلان فرما دیا اور اس کو قانونی شکل دے کر اس کے شکار کے لئے ہتھیار تقسیم کر دیئے .... اور اس کو ضلع پلاننگ کے محکمہ کے سپرد کر دیا اور اب آدمیوں کو پتہ لگا کہ پچھلے پانچ سال کے اندر اگر آدمی نیل گائے کی طرح اپنے نام میں اپنی مشابہت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لفظ بندر لگا لیتا اور اپنا نام "بندر مانس" رکھ لیتا تو شاید اس کا شکار بھی بندر کے نام کی عظمت کے سبب بند رہنا قانونی امر ہو جاتا ......

ہاں سہیل! ذکر تھا شکار کا اور یکدم جنگل سے مجلسِ آئین ساز کی بات میں جا پڑا اور مجلسِ آئین ساز کے اندر سے جنگل میں جا کھڑا ہوا۔ تم بھی کہو گے کہ کتنا بے مغز آدمی ہیں بھئی، مثبت منفی قسم کا آدمی! بات کرتے وقت جنگل اور مجلسِ آئین ساز اور مجلسِ آئین ساز سے جنگل میں کتنی جلدی بھٹک جاتی ہے اس کی!.....

ہاں تو میرا مطلب یہ ہے کہ "شکار" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل لفظ "شہکار" تھا۔ تاریخ اب بھی پتہ دیتی ہے کہ جب پٹھان اور مغل شہنشاہ فتوحات سے سیر ہو جاتے اور "سلطان شکاری" کرتے کرتے شکار ہی ختم ہو جاتا تو اپنی فوج کے سوئے ہوئے ہاتھ پاؤں کھلوانے کے لئے آبادیاں چھوڑ کر جنگلوں پر جا پڑتے، ہاتھیوں سے جا ٹکراتے، شیروں سے بھڑ جاتے، چرندوں کی ٹانگیں توڑتے، پرندوں کے پر کترتے، اور تم سمجھ گئے ہو گے سہیل! آبادیوں میں جب شکار کا میدان سمیٹ لیتے تو جنگلوں میں بھونچال برپا کر دیتے۔ غرض "لہو گرم رکھنے کا بہانہ" تلاش کرتے پھرتے۔ اور تم نے شاید پڑھا ہو، تاریخ مغل دور کے ایسے "معلم" چیتوں کا بھی تذکرہ کرتی ہے جو زرکار جھولیں پہنے، رو پہلے پٹکے باندھے بہلیوں میں بیٹھ کر اکبر و جہانگیر کے شکار میں ساتھ جاتے تھے اور شہکارانہ شان سے تیس تیس فیٹ کی یکلخت زقندوں میں ٹینس کی گیند اور فٹ بال کی طرح ٹپے کھاتے اچھلتے کودتے ہرن چکاروں پر بجلی سے جا گرتے اور تم نے ساونتی دور کے بادشاہوں اور راجپوت سرداروں کی تصویروں میں انگوٹھے پر شہباز و شاہین بھی بیٹھے دیکھے ہوں گے۔ شہباز و شاہین! نیلگوں آسمانوں کی بے کراں وسعتوں اور تاحدِ نگاہ بلندیوں کے UN. CHALLANGED فضائی جرنیل! جو سر اور گردن سے لال فند کے غلاف اترتے ہی سورج جیسی تند تابناکی سے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مالک کے انگوٹھے سے شاہانہ پرواز کرتے اور ایک ہی اڑان میں اپنی لامحدود جولانگاہ پر چھا جاتے اور اپنے چو طرفہ یکلخت حملوں کی پیہم شدت سے زمین سے لے کر آسمان تک اور آسمان سے زمین تک ہر چھوٹا بڑا پرندہ اپنے چنگل میں سمجھتے۔ اور سہیل! یقیناً تم نے سوداؔ کا وہ نوحہ پڑھا ہو گا جو انہوں نے "میرزا فیضو کی چرخ" کی موت پر لکھا ہے اور جس کا مشہور شعر ہے ؎ میرزا فیضو کی چرخ مر گئی : خوش خانے جگ کے ویران کر گئی! چرخ سب سے قلیل الجثہ شکاری پرندہ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی مادہ سے بھی بہت چھوٹا۔ نہایت تیز پر اور بلا کا خونخوار، اپنے سے اٹھ گنے قد و قامت کے شکار پر موت کا طمانچہ بن کر ٹوٹتا ہے اور یہ میرا تجربہ ہے کہ اس کا پکڑا کبھی چھوٹتا نہیں، اور سوداؔ کے نوحہ کی روشنی میں جب میں نے میرزا فیضو کے جذبات کا اندازہ کیا تو یہ سمجھا کہ چرخ اپنی شکل و صورت اور خوبصورتیٔ پرواز اور شدتِ خونخواری کے ساتھ اپنے ننھے منے وجود میں اپنے شکاری مالک کو بڑا پیارا لگتا ہو گا اور میرزا فیضو کے جذباتِ غم کے تحت سوداؔ کا یہ نوحہ معرضِ وجود میں آیا ـــ مگر یہ تو ساونتی دور کی باتیں ہیں اور اب ہے جمہوریت کا عہد! آج کی جمہوریت میں شکار کھیلنے کے لئے نہ تو جنگلوں جنگلوں اکبر و جہانگیر کی طرح خاک چھاننے کی ضرورت ہے اور نہ پلنگانہ اور خوش نمانہ تعمیر کرنے کی اور نہ فوج کو ہاتھ پاؤں کی چستی برقرار رکھنے کے لئے شکارگاہوں کو لے جانے کی ـــ اور دورِ حاضر کے "جہانگیر" و "اکبر" کے لئے کھلے بازاروں اور وسیع کھیتوں میں دن دہاڑے شکار کھلا ہوا ہے ....

اور سہیل! بیان نہیں کر سکتا کہ کس بلا کی گدگدی تھی تمہارے خط میں! تم نے تو اپنے رسالہ کے لئے شکاری افسانہ کی فرمائش کی تھی مگر میرے اندر والا شکاری

سچ مچ مچل پڑا اور افسانہ نگار بیچارہ اس کی تڑپ کے سامنے حرکت نہ کر سکا اور یہاں ہیں کوئی بھیّا ہر چند اس قسم کی چیز تو تھا نہیں جو تمہارے شکاری افسانہ کی فرمائش کے تازیانہ پر تڑپ نہ اُٹھتا اور سچ مچ شکاری کہانی کا عملی ڈرامہ کھیلنے نہ پہنچ جاتا۔ اور تمہارا خط! سہیل! جیسے مجھے پانچ سال کا بچھڑا پُرانا ساتھی مل گیا۔ جیسے تم بذاتِ خود میرے ساتھ کنوتی سے کنوتی ملائے شکاری کپڑے پہنے کھلونا سی بندوق لئے چل رہے ہو۔ آج میں تنہا تھا! سمجھ لو کہ آج جتنی میری قلم کی بزم آراستہ ہے اتنی ہی "سیف" کی رزم اُکھڑ چکی ہے! تمہارے فرمائشی خط پر جھرجھری آئی اور میں انگڑائی لے کر اٹھا۔ جیسے تمام دن کا سوتا شیر مغرب کے وقت اپنی سرو و نم خواب گاہ سے اینڈتا خمار اُتارتا اُٹھتا ہے۔ مگر شیر تو اکیلا ہی شکار کھیلتا ہے، اور میں تو آدمی ہوں اور میری شکاری سوسائٹی کا مخصوص دائرہ ختم سا ہو چکا ہے بڈھے اُستاد رضا خاں جن کی ستر سالہ پیری میں شکار کے دم قدم سے ٹھیک سترہ سالہ رنگ شباب اُچھلتا تھا، فالج کے حملہ کا شکار ہو کر اپنے سب ٹرافے خاموش کر چکے ہیں۔ اور مولانا بصیر قبلہ ضعفِ ہضم کے ہاتھوں کمزور ہو کر صرف ع زمینِ شعری ہیں رہ گئی زلف بتاں کا فر کے مصداق صرف شاعری شاعرہ گئے اور کبھی کبھی ہماری پارٹی کے شکار سے واپس آنے پر مہمات کی تفصیل سُن کر لطف اندوز ہونے تک شکاری! سیّد پاکستان بھاگ گیا اور اس کے پیچھے پیچھے مسلم جی! اسکسینہ بابو کا تبادلہ ہو گیا۔ اور وہ یک چشم کیپٹن ہارڈی ڈسٹرکٹ اوپیم ایجنٹ جو ہر وقت نشانہ تاکے رہتا تھا اور بوڑھا اینگلو انڈین انجینئر مسٹر پرو بٹ اور ریزرو پولیس لائن کا نوجوان انچارج ولیم نیسٹر جو مارتے کم تھے اور بولتے زیادہ تھے، تقسیم سے بہت پہلے تقسیم کی بو سونگھ کر ولایت چلے گئے تھے۔ اب تم ہی بتاؤ بچا ہے اس کے چھلکے میں ڈائنا میٹ ہی کیوں نہ بھرا ہو اکیلا چنا کیا خاک بھاڑ پھوڑے! اور ساتھ لاتا بھی تو کسے؟ میرے اندر جو اسپورٹس مین تڑپ رہا ہے اس کے ذوق کی روز افزوں تشنگی کو کیسے تسکین دوں! کبھی کبھی پڑے پڑے اور لکھتے لکھتے ویسے ہی اعصاب میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتی تھیں اور تمہارے خط نے بسمل بنا کر چھوڑا۔ اللہ اللہ! سہیل! تھی تو ہم دس بارہ ہی منچلوں کی ٹولی مگر سمجھ لو کہ شیر، چیتے، گلدار، عقاب، شاہین، شہباز سب کے سب ایک گوٹ جمع تھے۔ اور کوئی کھیلتا ہو گا سیزن سیزن یہاں بارہوں مہینے جنگل میں منگل منا کر خون کی ہولیاں کھیلتے اور تیسوں دن اپنی مقررہ ہانٹوں میں محشر تازہ بپا کئے رہتے۔ اور سہیل! تم تو خیر شکاری ہو اب یہ نہیں معلوم کون سے "بندوق لگنے والے" یا "بندوق چلانے والے" یا "بندوق چھوڑنے والے"؟ اور جس میں ذرا بھی اسپورٹس مین کا شعور ہو گا اس وقت میری مجبوری اور جذبات کو سمجھ لے گا۔ اور تم تو شاید خالص شکاری جذبہ کے بھی کچھ شناور ہو۔ یقیناً اس کی ابتدائی تکنیک اور قواعد و ضوابط سے واقف ہو گے اور یہاں میں تو سُنتے ہیں کہ بڑی لمبی چوڑی گہری جھیلیں ہیں جہاں اک ذرا سردی شروع ہوتے ہی قازمرغابی کلنگ کے ٹڈی دل سائبیریا اور چین کے برفستانوں اور تبت اور مانٹا کی جھیلوں اور صحرائے گوبی کے دلدلوں سے ایک پرواز اڑ کر آ پڑتے ہیں اور یوں تو تم جانتے ہو کہ ہر اسپورٹ ٹیم ورک TEAM WORK ہے اور خاص طور پر ان مائیگریٹ کر کے آنے والے پرندوں کا شکار تو بالکل ہی، اور اس کے لئے مقرر کردہ قواعد و ضوابط کے ساتھ جھیل پر بالکل اسی طرح پوسٹیں اور ڈیوٹیاں لگتی ہیں جس طرح پلے گراؤنڈ پر ہاکی، کرکٹ، فٹ بال کے کھیلوں میں، اب ایسی صورت میں میں اکیلا چڑیا کے شکار کو جا کر کیا کرتا اور کیسے کھیلتا اور تک نہ اس شکار کی بھی کوئی نہیں بنتی تھی جس میں آ پھنسا۔ کیونکہ جنگل کے شکار کے لئے بھی متعدد شکاری ہوتے ہیں تاہم بہت سے قلی اور حالی موالی کرائے اور جنگل کا ہانکا کرانے کا اور صرف ایک ناکا گھیر کر بیٹھنے کا اکیلا اکیلا سُونا سُونا پروگرام بنا لیا۔ سمجھ لو کہ ہماری اسپورٹنگ ایکسی اور تنہائی کا یہ عالم تھا کہ دشمنوں تک کو رحم آ گیا اور تمہاری بھاوج جو شادی کے بعد سے اب تک گھر کے اندر میرے شوقِ شکار سے دست و گریباں رہی تھیں میری اس تنہائی شوق اور شوقِ تنہائی پر افسوس سا کرنے لگیں اور انہوں نے عمر میں پہلی مرتبہ میرے اس کیمپ کا سامان جو پانچ سال بعد ہو رہا تھا ذرا دل کے ساتھ کیا۔ سہیل! تم نے بچپن میں بندر کا تماشا دیکھا ہے۔ بس یاد کر لو جب بندریا موڑھ کر میکے چلی جاتی ہے اور مداری بندر کو اسے منانے کے لئے بھیجتا ہے تو جس طرح وہ بندر کندھے پر ڈنڈا رکھ کر سسرال جایا کرتا ہے یا فلم دیوداس میں ہیرو کا پارٹ ادا کرتے ہوئے سہگل بندوق لے کر شکار کو جاتا ہے بس کچھ اسی انداز سے جیسے شکار جانے کا ڈرامہ سا کھیل رہا ہوں میں اپنا اکا دُکا تنہا ساتھی شکار کھیلنے چلا۔ جیسے بڑھتا آگے کو ہوں، چلتا پیچھے کو! اور تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ

"شکاری اور بھکاری کا کیا ٹھیک!" جدھر منہ اُٹھ جائے اُدھر ہی پاؤں چل پڑیں! بس تو تم یہ سمجھ لو کہ ایک رُخ کو میں بھی چل پڑا۔ جیپ کار نے وہاں تک پہنچایا، جہاں تک زمین نے اجازت دی۔ تمام راستہ دائیں بائیں نظر کی کمندیں پھینکتا، آنکھوں میں کھپے ہوئے مناظر کا ہر ہر زاویہ ناپتا اور قدموں میں چالیس سالہ پرانی ہوئی دوستوں کے چپے چپے سے صحن خانہ جیسا مانوس تاثر لیتا۔

میرا کیمپ قاعدہ کے مطابق کل صبح ہی لگ گیا تھا اور قلی وغیرہ سب طے ہو چکے تھے۔ مگر تمام دن سوچنے کے باوجود بھی کوئی اسکیم مرتب نہ کر سکا تھا۔ مشہور بات ہے اکیلا نہ ہنستا بھلا نہ روتا پہلے جب ایسے پروگرام بنا کرتے تھے تو چلنے سے پیشتر کئی کئی دن پارٹی کے اراکین میں بحث ہوا کرتی تھی اور باقاعدہ جائے قیام اور سمت کا پروگرام بنتا تھا جس پر نہایت پابندی کے ساتھ عمل کیا جاتا تھا۔ پہلے سے آدمی جنگل میں بھیج دئے جاتے تھے جو جانوروں کی آہٹیں اور گزرگاہیں بھانپ کر اطلاعیں دیتے تھے اور ان کے مطابق پروگرام بنا کرتا تھا...... اور اب......

خیر وہ آج سب کچھ خود ہی بنا کر اور اپنی پارٹی کا ایک اکیلا رکن بن کر شکار کھیلنے یہاں پہنچا ہوں۔ جیپ کار یہاں سے چار میل کے قریب ایک گاؤں میں چھوڑ دینی پڑی اور وہاں سے بیل تانگے پر سوار ہو کر سورج غروب ہوتے ہوتے اس جنگل کے کنارے پر لگے ہوئے کیمپ میں پہنچ گیا۔ پہلے شکاری مزدوروں سے کچھ بات چیت کی۔ پھر دو پیالی چائے پی اور سرِ شام ہی سے تمہیں خط لکھنے بیٹھ گیا۔ اب بھوک لگ رہی ہے لہٰذا خط ختم کرتا ہوں۔ دیکھو اگر کوئی خاص بات کل کے شکار میں قابلِ ذکر ہوئی تو اس خط کو کل شب میں پورا کر کے پرسوں پوسٹ کراؤں گا۔ آج کھانا کھا کر قاعدہ کے مطابق مجھے جلدی ہی سو جانا چاہئیے کیونکہ علی الصبح اُٹھ کر جانا ہے اور پہلا روز ہے لہٰذا کل بہت سویرے ہی چل پڑنا ہے۔ اچھا رخصت باقی کل شب......

۱۶ دسمبر (۱۱ بجے شب)

آج علی الصبح بیدار ہوا جیسا کہ میں نے رات لکھا تھا اور یوں تو شکار کو جانا ہی اس لئے جاتا ہے کہ وہاں عجیب النوع حالات و کیفیات سے دوچار ہوں اور خلافِ امید واقعات سے پالا پڑے مگر آج کے شکار نے کیا بتاؤں زندگی میں پہلی اور شاید آخری مرتبہ وہ حالات پیش کئے سہیل کہ تم اور نہ صرف تم بلکہ سب ادبی دوست اور خاص طور پر ایک ایک نثری پسند ساتھی یاد آیا اور ساتھ ساتھ اپنی بچھڑی ہوئی شکار پارٹی کا ایک ایک رکن بھی! کاش میرے ایک ہاتھ پر تم سب ہوتے اور دوسرے پر وہ سب! اور میں ایک اور ایک اور ایک ایک سو گیارہ ہوتا تو کچھ مزہ آتا۔ اور یہ جو آج "جنگل میں مور ناچا، کس نے دیکھا!" تمام دن اعصابی اور دماغی جھک جھک ہوئی یہ سب رائگاں سی گئی، تم سوچو گے کہ خیر اعصابی جھک جھک کے لئے تو شکار کو جاتے ہی ہیں بھلا دماغی جھک جھک کا کیا موقع ہو سکتا ہے، شکار جیسے اسپورٹ میں؟ مگر ایک بڑی بھلی کھنڈی دیہاتی مثل ہے کہ "چمار کو سُرگ بیگار!" یعنی شودر کو اللہ میاں کے گھر بھی بیگار رہتی ہے" آیا تھا یہاں کتاب کاغذ قلم دوات فلسفہ سیاست اور منطق سے گریز و فرار کر کے ذرا ہاتھ پاؤں چلانے اور دماغ کو سکون دینے سو تمام دن ٹھونٹھ پر اُلّو بنا بیٹھا رہا اور شام کو وہ بک بک کرنی پڑی کہ دماغ خالی ہو گیا اور اب سوچا کہ لاؤ تمہیں خط ہی لکھ کر دماغی تکان اتاروں۔ شکاری بے فکرے اگر ساتھ ہوتے تو وہ تو "خیر اپا دست" ہی رہتے۔ میری طرح اُلّو بنے کہیں بیٹھے ہی رہتے سارا دن اور تمام رات اپنی شکست پر دل ہی دل میں روتے مگر تم سب ساتھی آج وہ وہ جوہر دکھاتے کہ مزے آجاتے اور وہ بھی بچہ یاد کرتے کہ ہوئی تھی کسی خوش فکر سے ملاقات! کم سے کم تم نہ بھی بولتے تو میرے ہی نطق کے جوہر دیکھ لیتے؛ میری محنت تو وصول ہو جاتی۔ خیر! اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

سہیل! اس وقت تم دل میں کہتے ہو گے کہ کیا گزری؟ مگر پیارے ایسی گزریں جو سب تحیر کن کی حد تک خلافِ امید ہیں اور خط کے اختتام پر تم بھی اتفاقات کی ستم ظریفی کے قائل ہو جاؤ گے۔ آیا تھا یہاں ہاتھ پاؤں دُھنے کو سو وہ تو نہ ہوا اور پڑ گیا اسی چیز سے پالا جس سے بھاگ کر یہاں آیا اور اب دماغ ان تمام چیزوں کا متحرک اسٹاک بنا ہوا ہے۔ وہ تو اس کے بعد تھوڑی بہت گانے بجانے کی جدید ترین تفریح ہو گئی ورنہ نہ معلوم دماغ کے اندر کتنا ہجوم ہوتا ان تمام افکار کا جو سہ پہر سے شام تک متحرک رہے شاید ساری رات انہیں پر الٹو ہوتا رہتا۔

نقشہ یہ ہے سہیل کہ میرے کیمپ سے پورب کی جانب اس جنگل کے کنارے کنارے جہاں مجھے آج شکار کھیلنا تھا چھ سات میل چوڑا اور نہ معلوم کتنا لمبا ایک کمر کمر اونچی گھاس کا قطعہ پٹی کی شکل میں لگا چلا گیا ہے اور میرے خیال میں یہ اسی طرح جنگل کے کنارے کنارے بلا انقطاع سینکڑوں میل چلا گیا ہے۔ یہ پٹی کہیں پر زیادہ چوڑی ہو گئی ہے اور جنگل کے اندر گھستی چلی گئی ہے اور کہیں پر صرف دو تین میل ہی چوڑی رہ گئی ہے اور گھنا جنگل اس میں گھس آیا ہے مگر سلسلہ ساتھ ساتھ لا متناہی دوری تک گیا ہے جس کا اور چھور باوجود اس کے اندر تیس چالیس سال صحرا نوردی کرنے کے بھی مجھے نہ معلوم ہو سکا اور نہ میں نے کبھی اس کا جغرافیہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ البتہ یہ سنتے ہیں کہ یہ اودھ فارسیٹ اور نیپال کی ترائی کے جنگلات کے سلسلہ کی ایک شاخ ہے اور یہ مخصوص شاخ بھی اسی طرح گھاس کے قطعہ کی گوٹ لگی ہوئی کئی اضلاع میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ گھاس وہ ہے جس کی جھاڑو بنتی ہے جو سینک کہلاتی ہے اور اس کی جڑیں مشہور خوشبودار چیز خس ہوتی ہیں اور یہاں پر جہاں میرا کیمپ ہے یہ قطعہ میری مجوزہ شکارگاہ والے گھنے جنگل اور میرے کیمپ کے درمیان پانچ چھ میل کی چوڑائی میں حائل ہے۔

دسمبر کا مہینہ، اور صبح کا وقت آج تمام فضا بسیط کہرے کی نم آلود چادر میں گم تھی مگر میں اور میرے ساتھی حدتِ شوق اور فکرِ معاش میں سردی پر غلبہ پائے ہوئے منہ اندھیرے سے ہی بیل گاڑی پر گرمِ سفر تھے کہ کہر اصاف ہوتے ہوتے اپنے ٹھکانے پر جا دھمکیں اور ہم اس گھاس کے قطعہ کی چوڑائی طے کر کے سامنے والے ڈھاک جنگل کو جا رہے تھے۔ زردی مائل سبز گھاس کا قطعہ چڑھتی اترتی دھندلاہٹوں میں زیر و زبر تھا اور کبھی کبھی اس کنارے پر کالی لکیر کی شکل میں جنگل کی بھی ایک آدھ جھلک کہیں کہیں پر کہرے سے نکل کر سامنے آجاتی جس کی سمت بیل تیز تیز بڑھ رہے تھے اور گاڑی کے پہیوں کی گردش کے ساتھ میرے آدمی آگے پیچھے دائیں بائیں مستعدی سے قدم ملائے چل رہے تھے۔ پشت کی جانب پچھم میں چودھویں کا چاند اپنا خاموش و سرد سفر ختم کر کے تھکا تھکا ماندہ ماندہ سا مغربی پستیوں میں جھکا ہوا تھا اور سامنے جنگل کی سیاہ لکیر کے پرے مشرقی افق کی تابناکی لمحہ بہ لمحہ ترقی کرتی جاتی تھی اور چلتے چلتے تمام سلسلہ قرمزی خیر گیوں سے بھڑک ہی اٹھا۔ پیچھے سے مغربی ہوا کے رُک رُک کر آتے ہوئے جھونکوں نے کہرے کے غلیظ پردے پھاڑنا شروع کئے اور سامنے سے شفق کی تابناکیوں نے اس نم آلود تاریکی میں جگہ جگہ مشعلیں سی بھڑکا دیں اور دیکھتے دیکھتے سیندور کے ستون سے چنتے نظر آنے لگے، اور کہیں کہیں پر گلال اور افشاں کے درخشاں بگولے سے اٹھنے لگے اور کائنات پر شہابی روشنی کا سیلاب پھٹ پڑا اور اک ذرا آگے بڑھتے بڑھتے سامنے افق پر سونے کی بھٹیاں سی دہک اٹھیں اور چاندی کے آبشارے پھوٹ پڑے اور کہرا جو گلال اور افشاں کے ذرات کی طرح متحرک تھا اس سے رنگ و تابانی لے کر جیسے ہوا کی لہریں بھی چمک اٹھیں اور ان کے لمس سے سبزی مائل سنہری گھاس کے قطعہ پر بھی اور سیاہی مائل سبز جنگل کے سلسلہ پر بھی گنگا جمنی ملمع کاریاں ہونے لگیں اور سہیل! میں بے اختیار گنگنا پڑا ع صبح کا سونا جو لٹتا آتا امیر؛ بھیجتے تحفہ مواذن کے لئے اور چلتے ہی چلتے جیسے پردۂ سیمیں پر ابھرنے لگی اور مرتعش گھاس کا طویل قطعہ اور لا متناہی جنگل کا مہیب سلسلہ شہاب پاشیوں اور نور افشانیوں میں سے نکل کر سامنے آگیا۔ اور جب میں نے سامنے نظر اٹھائی تب جیسے اوشا دیوی کا رتھ مجھے اپنی گاڑی کے عین مقابل سُبک خرامی کے ساتھ بڑھتا دکھائی دیا اور گھاس کا تنکا تنکا جنگل کا پتہ پتہ پیشوائی کے لئے تن سا گیا۔ دور درختوں سے طاؤس کی باادب باملاحظہ ہوشیار! آواز نقیب کی طرح سنائی دی اور ننھی ننھی چڑیلوں کے ننگ بھنگیوں سے اڑ اڑ کر گھاس کے وسیع قطعہ کی جانب بڑھتے دکھائی دیئے۔ ہزار ہا اقسام کے کیڑے ٹڈے اچھلنے پھدکنے لگے۔ اور خاموش و پُرسکون جنگل اور میدان میں رنگا رنگ زندگی ناچنے لگی اور بھانت بھانت کی زندگی الاپنے لگی، زندگی جس کی بارش دستِ خلاق آباد شہروں سے کہیں زیادہ دریا دلی کے ساتھ ویران جنگلوں میں کرتا ہے قدرت کے ریڈیو اسٹیشن سے بڑے زور کے ساتھ بول پڑی، چلتے ہوئے بازاروں، دوڑتی ہوئی ریلوں اور گھومتے ہوئے ملوں سے کہیں زیادہ جوش کے ساتھ فطرت کے اس عظیم کارخانہ میں بھنبھنا پڑی اور سہیل! آدمی کے ہاتھ کے چلتے ہی آبادیوں میں پتھر اور فولاد چھلانگیں لگاتے ہیں، اندھیریاں جگمگا اٹھتی ہیں۔ اجالیاں تھرکنے لگتی ہیں اور صباحیں صبحِ بنارس اور شامیں شامِ اودھ کے لقب سے سرفراز کی جاتی ہیں۔ کاش آج کی صبح اور شام میں تم میرے ساتھ ہوتے تو کہہ اٹھتے کہ صبحِ بنارس کی سب نیرنگیاں اور شامِ اودھ کے کل رومان ہیچ ہیں جنگل کے ایک ایک لمحہ کے مقابلہ میں.......

گھاس کے ٹھاٹھیں مارتے دریا کے اس پار کھڑے ہوئے گھنے جنگل کی پہاڑ سی بلند چوٹی کے سلسلہ پر ایک جگہ سورج کی قرمزیں پیشانی چمکی اور جیسے رات کی سردی کا چراغ بھڑک اٹھا اور تمام رات کی سردی اور اُبھرتی ہوئی تو خیز سورج کی گرمی میں آویزش سی ہونے لگی اور ایک دفعہ کو رات نے دن کو اپنا چارج دیتے وقت بھڑک کر تمام کائنات کو طبقہ زمہریر بنا دیا۔ ادھر پورپ سے بڑھتی ہوئی گرم گرم کرنوں کی برچھیاں لمبی ہو ہو کر بڑیں اور بڑھیں! دیکھتے دیکھتے سردی اور گرمی کی جنگ ختم ہوئی معاونِ حیات حرارت نے جمود پر غلبہ پا لیا اور رع عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا سارے ماحول میں ذوقِ حفظ زندگی انگڑائیاں لے اٹھا اور قدرت کے کارخانے میں جد وجہد کا بازار گرم ہو گیا میں نے ایک انگڑائی اور چند جمائیاں لے کر اپنے چاروں طرف پر نالا اور کہا "ہوں، اس گھاس میں بھی تو شکار نکلتا ہے" اور پھر راستہ پر نگاہ ڈال کر کہا "یہ دیکھو نا یہ کھوج، ہاں میاں! یہ تمام رات کی چرائی کے ہیں۔ اور یہ سب اسی گھاس میں نکلیں گے، یہ چر کر سارا دن اسی میں بیٹھے رہتے ہیں اور اگر دن میں انہیں کوئی پریشان کرے تو اُٹھ کر جنگل میں گھس جاتے ہیں سامنے، اور ہاں سبھی جانوروں کے کھوج ہیں، چیتل سانبھر جھانک نیل، ہرن، پاڑھا اور کہیں کہیں پر چکارہ"

"مگر آج تو یہ سب راستہ راستہ لمبی ڈگ پر سیدھے جنگل میں جاتے معلوم ہوتے ہیں"

"لیکن سرکار آج ہاں میں یہ تو بتانا بھول ہی گیا اس گھاس میں سے تو سب شکار بڑھ گیا ہوگا جنگل میں یہ جو پڑے ہیں بھیلوں کے ڈیرے انہوں نے بدکا دیا ہوگا۔ بڑے مارنے والے ہیں۔ جال سے ماریں، کتوں سے ماریں، بھالوں سے ماریں"

"مگر بھیّا ان بیچاروں نے کیا ڈیرہ ڈالتے ہی بدکا دیا شکار یہ تو کل تیسرے پہر ہی اس جنگل میں آ کر پڑے ہیں۔ ابھی تک انہوں نے چوں بھی نہیں کی ہے"

"اور پھر یہ تو بڑے ٹھنڈے شکاری ہیں اور ان کی تو گذر اوقات ہی شکار پہ ہے ان سے بھڑک کر شکار بھاگا کرے تو یہ کھائیں کیا؟ ایں"

"اجی میں تو بیس دفعہ دیکھ چکا ہوں ان کا شکار، جب تک جنگل کا چپہ چپہ مار کر نہ کھا جائیں دم نہ لیں"

"اور اتنے چپکے چپکے کہ مجال کیا جو پتہ کھٹک تو جائے"

"اجی شکار کا بھیجا کھائیں سر سہلائیں، آسیب ہیں پورے آسیب، اب یہ گھاس ان کے خچر بھینسوں بکروں کا چارہ ہے اور اس میں کا شکار ان کا اور ان کے کتوں کا"

"مگر یہ خچر بھینسے کیوں پالتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"اپنا سامان اور جال لاد کر لے جانے کے لئے!"

"تو جالوں سے خرگوش، لومڑی گیدڑ پھانس لیتے ہوں گے"

"نہیں صاحب نیل سانبھر جھانک اور سُور تک اور ہرن چکارہ پاڑھا تو کوئی چیز نہیں اور ان کے کتے بلا کے کٹر اور ہونہار ہوتے ہیں، منہ ڈالیں تو شیر تک سے نہ چوکیں۔ اور پھر سرکار ایک دفعہ کو آپ کی گولی سے بچ کر نکل جائے ان کے برچھے کا مارا پانی نہیں مانگتا۔ یہ سب خیمے نیل سانبھر کی کھالوں کے گھٹے ہوئے ہیں"

"میاں بستر اور پہننے کے کپڑے تک کھالوں کے ہوتے ہیں"

"سرکار یہ سارے جنگل کو اپنی کھیتی سمجھتے ہیں اور بڑی ترکیب کے ساتھ بغیر بھڑکائے شکار کرتے ہیں"

میرے آدمی مجھ کو بتاتے چل رہے تھے اور سُن سُن کر میرا اشتیاق بڑھ رہا تھا اور تم یاد آ رہے تھے اگر اس وقت ساتھ ہوتے تو شکار کی دنیا سے ہٹ کر شاعری کی دنیا میں جا پڑتے اور شاید مجھ کو بہت زیادہ لطف آتا۔ میں نے دُور سے پُر اشتیاق نگاہیں ان کے چرمی خیموں کی بھوری بھوری بستی پر ڈالیں اور دل میں خیال کیا

کہ شکار تو کچھ ان صحرا نشینوں کا ہی حصہ ہے جو ابتدائے آفرینش سے آج تک تمدن سے برسرِ پیکار ہیں اور ہزارہا سالہ مدنیت سے گریز و فرار کیے آج ایٹم والی دنیا میں بقول میرزا غالب "بے در و دیوار سا گھر بنائے" آسمان کی پتنت چھت اور زمین کے مخملیں فرش پر جگمگاتے سنسناتے محلوں سے کہیں زیادہ سکون کے ساتھ محوِ استراحت ہیں۔ اور گڑگڑاتے کارخانوں اور بھڑبھڑاتی سڑکوں سے کہیں زیادہ مصروفِ کار! اور سہیل مجھے تو خلافت الارض کے صحیح علمبردار یہی فطرت زادے معلوم ہوئے اور مجھے ان کے دیکھنے کا شوق ہوا اور میں نے اپنے تانگے کا رُخ اس خانہ بدوش بستی کی جانب کرا دیا۔

اور ہم سب، کے سب ان کے یہاں پہنچ گئے۔ یہ لوگ بھی شکار پہ جانے کی تیاری میں تھے، میرا استقبال انہوں نے کچھ ناخواندہ مہمان جیسا مگر وہ تیور لیے سے کیا اور شاید یہ سمجھے کہ میں سرکاری اہلکار ہوں جو بالعموم انہیں پریشان کرتے رہتے ہیں مگر میرے یہ بتانے پر بھی کہ میں بھی ان کی طرح شکاری ہوں ان کی تیوریوں کی کراہت جوں کی توں رہی جیسے ان کے بشرے یہ کہہ رہے تھے کہ ہم پانچ ہزار سالہ پرانے شکاریوں سے تم پانچ ہزار سالہ نئے شکاریوں کی کیا مناسبت! اور جب انہوں نے آپس میں اپنی قدیم غیر آریائی زبان میں بات چیت کی تو میں نے ان کے لہجہ اور طرز سے اندازہ کیا کہ یہ اس وقت مجھ کو اپنے اوپر بار سمجھ رہے ہیں اور شکار جاتے وقت میرے ورود کو فالِ بد قسم کی چیز۔ خیر میں نے اپنے مخصوص انداز میں گویا بڑا بھاری ایثار کرتے ہوئے کہا "آج میں تم کو بھی اپنے ساتھ شکار میں رکھوں گا" اس پر انہوں نے پھر اپنی زبان میں آپس میں کچھ بحث کی اور پھر ان میں سے ایک نے جو ان کی جماعت کا مستند فرد معلوم ہوتا تھا، اپنی مطلب برآری کرتی ہوئی ٹوٹی پھوٹی زبان میں کہا "آپ کا ہمارا بھلا کیا ساتھ؟"

"کیوں؟" میرا بیباک بھنگی بول پڑا

"یوں کہ آپ کے ہتھیار بہت ناقص ہیں" اور یہ کہتے ہوئے اس نے میری بندوق اور رائفل پر حقارت آمیز نگاہ ڈالی جو میرے حالی موالی کندھوں پر لیے ہوئے تھے۔

سب ہنس پڑے اور میں نے طنز پر سنجیدگی سے نہایت نرمی کے ساتھ کہا "ہاں بھائی تو کیا خرابی ہے ہمارے ان ہتھیاروں میں؟ جو تم ہمیں اپنے ساتھ لیجانا مناسب نہیں سمجھتے"

اور اس نے یک گونہ آزادی کے ساتھ جواب دیا "خرابی آپ نہیں جانتے" اور پھر ٹھہر ٹھہر کر فلسفیانہ انداز میں کہا "آپ ایک شکار مار کر اتنا بڑا دھماکا کرتے ہیں کہ سارے جنگل کا شکار چوکنا ہو جاتا ہے" اور پھر سب ہنس پڑے اور اس نے پھر سنبھل کر بیباکی کے ساتھ کہا "او نہہ شکار تو شانتی اور داؤ گھات سے ہوتا ہے اور آپ دھماکوں سے کرتے ہیں، شکار بھاگ جاتا ہے، بچے نہیں دیتا، مشکل ہوتا جائے گا اور پھر مار بہت کم ملے گا!"

اور سہیل! اس کے اعتراض کا جواب نہ تو میرے پاس تھا اور نہ میرے ہائی ولاسٹی رائفل کے پاس اس کے برچھے کے خاموش و بے آواز کاٹ کا جواب تھا اور جیسے مجھے اپنے سب ہتھیار اس کے کھردرے بانس میں جھکے ہوئے برچھے کے ہاتھ بھر لمبے پھل کے مقابلہ پر ہیچ معلوم ہوئے اور پھر دوسری نظر میں اس کے فولادی جسم میں اعصاب کی رسیاں سی بل کھاتے اور بات بات پر اسپرنگ سے اُچھلتے دیکھ کر مجھ پر ایک قسم کا اعصابی احساسِ کمتری طاری ہو کر مجھے مرعوب سا کرنے لگا۔ اور بھیا! ان کے خیموں کو غور سے دیکھ کر تو شرم سے میری گردن جھک گئی۔ دوست! ہم ساری عمر میں ولایتی ساخت کے مہلک ترین شکاری ہتھیاروں سے چند جانور شکار کر لیں تو مانو بڑے شکاری بن گئے۔ اور پھر دس پانچ کھالوں اور سروں سے اپنے ڈرائنگ روم کی دیواریں اور فرش مزین کر کے ہر ایک مہم کی مسلسل روایت تاریخ کی طرح محفوظ رکھتے ہیں اور یہ چیزیں خاندانی ٹرافیز کے طور پر نسلاً بعد نسلاً چلتی ہیں۔ دُور کیوں جاؤ میرے لڑکے کو میرے باپ کے مارے ہوئے خاص شکاروں کی مہمات بر زبان یاد ہیں اور ہر کھال اور سر دکھا کر آپ کو اتنی تفصیل کے ساتھ سنائے گا جیسے یہ دادا میاں کے ساتھ شکار میں [illegible] انداز! شکاری دادا کا شکاری پوتا اپنے باپ کی پیدائش سے بھی پہلے کے تمام قصے علم سینہ کے ذریعہ

اپنے سینہ میں محفوظ کئے ہوئے ہے آج تک، اب دوست تم ہی بتاؤ جب ہم اعلیٰ ترین آلات ہلاکت سے مسلح ہو کر ایک ہزار پانسو چڑیاں چوپائے اور چار چھ درندے شکار کر کے KEEN SPORTSMAN کا خطاب پاتے ہیں اور بین الاقوامی مصوّر رسالوں میں تصویریں اور تفصیلیں چھپوا چھپوا کر نام و شہرت حاصل کرتے ہیں تو پھر ان صحرانشینوں کو کون سا خطاب دیا جائے جن میں سے ایک ایک شکاری جنگلی زندگی پر اُچھلتا کودتا، مارتا کاٹتا مجسم تھیسس ہے جو آج ایٹم کی بیسویں صدی والی دنیا کے اندر پتھر کے عین بعد والے لوہے کے ماورا التاریخی دور سے گذر رہے ہیں اور بارہ انچی لوہے کو بارہ فٹی بانس میں لگا کر شکار کے ذریعہ پیٹ بھرتے ہیں، شکار کے ذریعہ تن ڈھکتے ہیں، شکار کے ذریعہ گھر بناتے ہیں۔ اور میں نے ان کے خیموں پر باہر سے اندر تک گہری نگاہ ڈالی، اپنے ہاتھ کا مارا اور اپنے ہی ہاتھ کا کچا پکا دباغت کیا ہوا چمڑا، فرش سے لے کر چھت تک سب کچھ شکار کی کارفرمائی! خیمے نیل سانبھر اور چھانک کی دبیز کھالوں کے! بستر ریچھ، ہرنا، بھیڑیئے اور گلدار کی کھالوں کے اور ان کے نیم عریاں جسم بھی کھال ہی کھال کپڑے کے مرہونِ منت نظر آئے چونکہ موسم سردی کا تھا لہٰذا ضروری ستر پوشی کے علاوہ خرگوش، لومڑی گیدڑ اور بن بلاؤ کے پشم دار نرم چمڑے کام میں لائے گئے تھے.....

بال، کھال، ہڈی، سب کچھ اثاث البیت! اور ان دو گز چوڑے چار گز لمبے کھال اور بانس کے نیم انسانی مسکنوں میں زندگی مچل رہی تھی، بے فکری ناچ رہی تھی اور روح و جسم کے انفصال کی تمام ترنگیاں سمجھئے ایک ایک خاندان تندرستی، آزادی اور دلیری کے خزانے بھرے بیٹھا تھا۔ ان کا بدن ان کا ٹھوس سرمایہ تھا سنگین اعصاب کے پہیہ پر فولادی رگوں کے لوچ کے ساتھ خالص خون کی اعلیٰ ترین دہی نعمت گھمر گھمر کر رہی تھی اور بوڑھے، جوان، بچے ہیں بھرپور نوجوانی ہی نوجوانی کے سوتے اینڈ اینڈ کر اُبل رہے تھے اور ہر آنکھ سے زندگی کے نقرئی شرارے چھوٹ رہے تھے۔ وحشی جانوروں کی کھالوں کے گرم گرم سایہ میں امن و آزادی کا ڈیرہ تھا اور نوعِ انسانی کی فطری نعمتیں چپہ چپہ پر گلے مل رہی تھیں۔ وہ خود ہی اپنی ریاست ہیں اور خود ہی حکومت اپنا سرمایہ، محنت اپنے آپ! اور صحرا کی روش اور خاموش وسعتوں میں ان تنگ و پست خیموں کے اندر موت و زندگی، بغیر ایٹم بمب اور پنسلین کو بیچ ہیں ڈالے اپنے جھگڑے آپ ہی آپ سمجھوتے کر کے چکاتی رہتی ہیں اور آزادی تحریر و تقریر کی تمام پابندیاں اور حق و ناحق کے کل فیصلے بغیر گول میز کانفرنس اور قرطاس ابیض کے اپنے آپ اُلجھتے سلجھتے رہتے ہیں اور کشمیر و کوریا کے کل مسئلے بغیر سیکورٹی کونسل اور یو۔ این۔ او کے طے ہوتے رہتے ہیں اور حسن و عشق کی سب عشوہ طرازیاں بلا غازہ و کریم اور بغیر شراب و ریشم کے رہینِ منت ہوئے اپنے رومان پوری رنگینیوں اور تابناکیوں سے لڑاتے رہتے ہیں۔ ان کے چرمی خیمے ان کے شبستانِ عشرت بھی ہیں اور ایوانِ آئین ساز بھی۔ صحرا کا لامحدود و یکتا خاموش ماحول ان کی تعلیم گاہ بھی ہے اور رصدگاہ بھی۔ سیاست، قانون، معاشیات فنونِ عالیہ کے سب نکات ان کے اندر آپ ہی آپ حل ہو جاتے ہیں اور سیاست، مدن اور راس المال کے سب اتار چڑھاؤ اسی طرح متحرک رہتے ہیں جس طرح حبیب جنگلوں میں بھانت بھانت کی لمبا اُگتی تھی، گوکھنی اُگتی ہے۔ اور سہیل! میں نے خیال کیا کہ آج دو سو سال سے مشین انسان کو دہی خود کفالت سے بھی نکال چکی لیکن اللہ اللہ! یہ فرزندانِ صحرا آج بیسویں صدی کے وسط تک اپنی صحرائی خود کفالت کو تمدن کی اولیں شعاعوں کے لمس سے بچانے کے لئے ایٹم بمب اور پنسلین دونوں سے برسرِ پیکار ہیں، اور میں نے پھر ایک گہری نگاہ ڈالی تو ان کے ساتھ کہیں کہیں ولائتی ساخت کی چیزیں اور کپڑا وغیرہ نظر آیا! اور ہیں نے خیال کیا اتنے شدید گریز و فرار کے باوجود بھی یہ بیچارے "حضرت ڈالر" کی ہتھ پھیری سے محفوظ نہیں! اور میں نے سوال کیا "تمہارے شکار سے تو کسی چیز کی کھپت بازار میں معلوم نہیں ہوتی پھر تم کو یہ سامان خریدنے کے لئے روپیہ کہاں سے ملتا ہے؟"

"ان میں سے بعض چیزیں تو مشن کے پادری صاحب مہینہ پیچھے بانٹ جاتے ہیں" اور پھر ایک جانب پڑے ہوئے ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے کہا "اور خس، یہ خس ——— جب ہم شکار کھیل کر ذرا ستاتے ہیں تو جاڑوں میں یہ خس کھود کر جمع کر لیتے ہیں اور گرمی شروع ہوتے ہی خس کے ٹھیکیدار اسے شہروں میں بھر کرے جاتے ہیں" اس نے کہا۔ خس! او معاذ اللہ سہیل! میرے شامہ پر ایک ضرب سی پڑی، جاڑوں میں خس کا تخیل ہی کتنا روح فرسا ہے دوست!

ذرا غور تو کرو۔ اور پھر ستم بالائے ستم گرمی شروع ہوتے ہی خس سے محرومی! وائے بدنصیبی جب مئی جون کے آفتاب کی کرنیں ان کے چرمی مسکنوں کو بھٹیوں میں تبدیل کر دیتی ہیں تو ان کی دسمبر جنوری کی سونگھ سونگھ کر کھودی ہوئی خس متمدن دنیا کے اجارہ داروں کے شبستانوں میں کرنے کرنے کے اندر دسمبر جنوری کی ہوا باندھ دیتی ہے۔ لیکن واہ ری بے نیازی! ان کے اسفندیاری جسموں پر جس قدر گرم ہو کر آج دسمبر جنوری کے جھونکے لگ رہے ہیں اتنے ہی سردین کر مئی جون کے تھپیڑے پڑتے ہیں، ان کے پست خیموں سے جیٹھ بیساکھ کی لوئیں بھی منہ چڑاتی کھسیانی ہو کر نکلی چلی جاتی ہیں اور ماگھ پوس کی سیتیں ٹکرا ٹکرا کر اُلٹی جا پڑتی ہیں جنوری نعابتہ دسمبر اپنے خیموں کے اندر ہی نہیں زمین و آسمان کے درمیان کی کل فضا ان کے حق میں Conditioned رہتی ہے اور موسم برشگال کی کل تبدیلیاں اور نظام شمسی کے تمام انقلاب ان کی بے نیازی کے سامنے سر جھکائے کتنے بچتے نکلے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ خالص انسانی زندگی کا دھارا پہاڑوں کی بلندیوں اور گھاٹیوں کی پستیوں میں خود ہی اپنی سطح تلاش کرتا ہوا تندگامی اور سلامت روی کے ساتھ رواں ہے۔ بغیر بھاپ بجلی اور تیل کے سہارے کے! ــــ اپنا راستہ آپ بناتا! متمدن دنیا کی سب روپہلی سنہری قدروں کو اپنی رَو میں خس و خاشاک کی طرح اڑاتا یہ قافلہ اپنے بے سنگ و میل سفر میں رواں ہے۔ ....

اور سہیل! آج اگرچہ قاعدہ سے ان کے ساتھ شکار میں میرا پارٹ وہی رہا ہے جو مشہور ضرب المثل "شکاری شکار کھیلیں اور...... ساتھ ساتھ پھریں" میں ساتھ ساتھ پھرنے والے کا ہوتا ہے مگر ایسے ساتھ ساتھ پھرنے پر ساری عمر کے شکار قربان ہیں دوست! وہ لطف آیا! کاش تم میرے ساتھ ہوتے تو کتنا لطف اٹھاتے ہم دونوں! اور شکار سے تو ڈیڑھ دو بجے فارغ ہو کر ان کے خیموں پر پہنچ گیا تھا مگر وہاں ان کے مذہبی، سیاسی، سماجی جو کچھ کہو سب کچھ رہنما امریکن مشن کے پادری صاحب کو وارد پایا اور مغرب تک ان سے مباحثہ کرتا رہا اور جب وہ اپنے کیمپ کو رخصت ہو گئے تو پھر مغرب کے وقت میں بھی چلنے لگا مگر خانہ بدوشوں نے اپنی جنگلی تواضع میں مجھ کو روک لیا اور دس بجے تک ان کی محفلِ رقص و سرود دیکھ کر دن کے شکار کی تکان تو تھی نہیں البتہ وہ خفت اتار رہا جو آج ان کے برچھے کے مقابلہ میں میرے رائفل کو ہوئی تھی۔ اگرچہ دس کے بعد بھی اُٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا مگر دوسرے دن کے پروگرام کی تیاری کے خیال سے اُٹھ آیا پھر بھوک نے بھی حملہ کیا تھا اور چائے بھی نہ ملی تھی سہ پہر کی ٹھیک ہے، تھرموس میں بھری ہوئی چائے پی ضرور لی تھی مگر طلب بجھی نہ تھی۔ گیارہ بجے کھانا کھایا اور پھر ایک پیالی چائے پی لی، لہٰذا تمام دن کی روئداد سامنے آنے لگی اور نیند روٹھ گئی اور جب نیند روٹھ گئی تو پھر تمہیں خط لکھنے بیٹھ گیا۔ نیند نہیں منتی تو تم ہی کو منالوں۔

سہیل! ان کی محفل چھوڑے ہوئے مجھ کو اس وقت ڈھائی گھنٹے ہو گئے اور لکھتے لکھتے جب ذرا نظر اُٹھاتا ہوں تو کیمپ کے روزن سے ان کی جلتی ہوئی آگ کی سرخ سرخ روشنی دیکھ کر آنکھوں میں سرور اور دل میں تازہ گدگدی دوڑ جاتی ہے وہ دھوئیں کے شامیانے تلے ان کی زندہ محفلِ رقص و طعام گرم ہے یقین مانا سہیل! کہ ہم کسی جگمگاتی عشرت گاہ میں سفید براق میزوں کے گرد جھکے ہوئے بید کی کرسیوں پر بیٹھ کر سچی چینی اور کچی چاندی کے اتصال کی کھنک اور جام و مینا کے ٹکراؤ کی بلوریں جھنکار کے ساتھ پیہم نغمہ کی مدد سے بھی وہ سماں نہیں باندھ سکتے جو ان فطرت زادوں نے آگ پر بھنتے ہوئے سانبھر کے ادھ کچے گوشت اور ہرن کے بچے کی کھال سے منڈھے ہوئے دف کے زور سے جنگل کی تاریک و بسیط فضا میں باندھ دیا ہے۔ یہ جنگلی تقریباً روزانہ جاڑوں کی لمبی راتوں کا شروع حصہ بڑی بھاری آگ کے گرد ناچنے گانے میں صرف کرتے ہیں سہیل! کیا تمہیں باغوں اور پارکوں کی تراشی ہوئی یکسانیت ہی خوبصورت اور نظر فریب معلوم ہوتی ہے، سچ بتانا جنگل کی آزاد و بے لگام اُبلتی ہوئی لامحدود نمو کیا اس سے کہیں زیادہ متناسب اور فردوس نظر نہیں ہوتی؟ بھیا یقین مانا ہماری ساری تماشہ گاہیں جو بجلی اور کیمرے کے بل پر چمکتی اور تھرکتی ہیں اور گراموفون کے زور پر گاتی بجاتی ہیں ڈنگ ہیں ان فطرت زادوں کی گرما گرم جیتی جاگتی محفل کے سامنے! سنسناتی ٹھنڈی ہوا [illegible] ناچنے اور گانے کے لئے ناچ رہے ہیں

گا رہے ہیں! سڈول عضلات اور تیکھی چتونوں کی تجارت کے لئے نہیں، رونگٹے رونگٹے کے رومانی تقاضہ سے مجبور ہو کر آہنی جسموں سے سچے فولاد کی لچک کا جمالیاتی مظاہرہ کر رہے ہیں! تمام دن مریخ کے شکاری دور سے گذرنے کے ردِ عمل میں مشتری کے موسیقی سایہ میں متحرک رہے ہیں۔ اپنے شکار کے کھال کی دف اور سینگ کی کرنا بجا بجا کر صید افگنی کے سپاہیانہ فن سے موسیقی کے فائن آرٹ کو جنم دے رہے ہیں۔ پانچ ہزار سالہ پرانا گیت گا گا کر ہماری جگمگاتی گنگناتی "نقل" کی منزل پر پہنچی ہوئی بلوریں دنیا کی تابناک تماشہ گاہوں کا مضحکہ اڑا رہے ہیں! اور براہ راست فنکار فطرت سے اکتساب کئے ہوئے خالص آرٹ کا آزاد مظاہرہ کر رہے ہیں۔

پیارے سہیل! اگر وہ گیت جو انسان نے امکان کے ظلمت خانے سے نکلتے ہی گایا، سننا ہو تو ان کی محفل میں بیٹھو! اگر حیوانی جسم میں سچ مچ بجلی کی لپک کا نظارہ کرنا ہے تو ان کا ناچ دیکھو اور اگر آدمی کو ملک الموت کی طرح ٹوٹتے دیکھنا چاہتے ہو تو ان کا بے پناہ شکار! اور طاقت و بیباکی کے ساتھ آزادی و پاکدامنی کے ملے جلے تجسمے دیکھنا ہیں تو ان کی روغن کی ہوئی سی آبنوسی عورتوں کے نیم عریاں جسم دیکھو! ان کی عورتیں! صحیح معنی میں انسانی کھیتیاں! سات پردوں اور ہزار پابندیوں کے درمیان رہنے والیوں سے بھی زیادہ اپنے برہنہ جسموں میں ڈھکی ہوئیں۔ کانوں میں ہڈیوں کے زیور اور گلے میں پنجوں کے ہار پہن کر اور خرگوش لومڑی کے چمڑوں سے ستر پوشی کر کے سوسائٹی کی رنگین و ندیم لیڈیز سے کہیں زیادہ خاموش اور آزاد خیال! اور حویلی کی شرمیلی نویلی دلہنوں سے زیادہ باحیا و عصمت مآب! غرض سہیل! اگر انسان کو آدمی کے اصلی و نسلی روپ میں دیکھنا چاہتے ہو تو انسانیت کو تمدن و تہذیب کے ایوانِ طلائی کار پر یوں ہی ڈھاڑیں مار مار کر سر پیٹتے چھوڑ دو اور آؤ اس پتھریلی، خاکی، نباتی اور چرمی سوسائٹی کا مطالعہ کرو اور زمین، ہوا اور سورج کے ربط ضبط سے اپنی ضرورت کے مطابق بھرپور استفادہ کرتی ہوئی روحِ انسانی کو پُر امن بالیدگی میں دیکھو!

۱۷ر دسمبر (۱۰ بجے شب)

کل رات کا بڑا حصہ خانہ بدوشوں کے ناچ اور تمہارے خط کی نذر ہوا اور نہ معلوم لکھتے لکھتے کس وقت میں سو کر رہ گیا کیونکہ تم کو خط کیمپ کاٹ پر بیٹھ کر لحاف میں دبکے دبکے لکھ رہا تھا اور خط ختم کر کے ہی سونے کا ارادہ تھا مگر دن کی تکان اور لحاف اور چارپائی کے نشوں نے دبا لیا اور صبح کو آنکھ کھلی۔ خیر آج کے پروگرام کی تفصیل تو بعد میں لکھوں گا ابھی تو کل ہی کی آپ بیتی کیا کم ہے سنانے کو۔ تم سمجھتے ہو گے کہ چونکہ ان جنگلیوں کے ساتھ شکار میں پڑ کر خوب احمق بنا ہے لہٰذا اس ذکر سے قصداً احتراز کر کے ان کی سماجی و معاشی صورت گری کر کے خط ختم کرنا چاہتا ہے۔ مگر میں تم کو اوپر لکھ چکا ہوں کہ کل علی الصبح جب میں ان کے خیموں پر پہنچا تو یہ لوگ شکار جانے کی تیاری میں تھے اور میرے ہتھیار ناقص ہونے کے سبب مجھے اپنے ساتھ شکار میں لے جانے کے قابل نہ سمجھتے تھے، خیر میں نے مجبوراً ان کا شکار دیکھنے ہی کا ارادہ کر لیا۔ اور آج ان کا جال کا پروگرام تھا۔ ان کے جال جسے یہ اپنی مخصوص بولی میں 'کھابڑ' کہتے ہیں، جال کیا ہوتے ہیں، موٹی موٹی رسیوں کے تین تین انچ مربع پھندوں کا پچاس پچاس گز لمبا اور قدِ آدم چوڑا سلسلہ ایک ایک جال ہوتا ہے، یوں تو میں ان کی ہر چیز سے متاثر ہوا اور آج ان کے کتوں کے شکار سے کچھ کم کل ان کے برچھوں کے شکار سے بھی نہیں ہوا تھا مگر سب سے زیادہ ان کے جالوں کی مضبوط ساخت سے مرعوب ہوا۔ اور میں نے ان کی رسیوں کو یہ پہچان کر کہ نہ تو یہ پاکستانی جوٹ کے ریشہ کی ہیں اور نہ ہندوستانی سنئی کے، برجستہ سوال کیا کہ یہ کا ہے سے بٹی ہوئی ہیں تو انہوں نے بتایا کہ برسات میں جنگل سے ڈھاک کی باریک باریک جڑیں کھود کر اور انہیں کوٹ کر ان کا ریشہ تیار کیا جاتا ہے اور اس سے رسیاں بٹ کر جال بنے جاتے ہیں، جوٹ اور سن اس کی مضبوطی کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اور سہیل! جب میں نے ان سے ان کے وطن کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے اس کی جغرافیائی حدود کے متعلق کچھ I AM MONARCH OF ALL I SURVEY قسم کا جامع جواب دیا اور جو کچھ بتایا اس سے میں نے اندازہ کیا کہ یہ لوگ بندھیاچل کی ترائیوں سے چل کر وسط ہند کے جنگلات پار کر کے اودھ فاریسٹ سے گذرتے ہمالیہ کے دامنوں تک پہنچتے ہیں اور پھر اسی طرح موسموں کا لحاظ

کرتے ہوئے پلٹتے ہیں اور بس یہی ان کی لامحدود بازی گاہ ہے جس کے اندر یہ چھوٹے بڑے قبیلوں کی شکل میں متحرک خدا کی وسیع زمین کو اپنا وطن بنائے ہوئے ہیں۔ ان کا وطن جس میں کاغذی حد بندی کی تخصیص نہیں مگر تمدن اور مدنیت کے گریز و بغاوت میں ان سب قبیلوں کا عملی فلسفہ ایک فیڈریشن کے جیسے شعور میں ہے۔ اور سہیل! میں تو ان کا سب کچھ دیکھ کر اپنا سب کچھ قربان کر بیٹھا اور جی چاہا کہ اپنی ڈالر اور ایٹم کی زرّیں و بانذدہ دنیا سے سات ہزار سال پیچھے کو بھاگ جاؤں اور تمدن کے اس INFECTED ایریا سے نکل کر ان میں گھل مل جاؤں اور خالص آدمی ہی آدمی بن کر رہ جاؤں، اور امن، آزادی، خلوص، تندرستی اور بہادری کی اس صحرائی جنیت سے پھر ایک مرتبہ اپنا سفر جاری کر دوں۔ اور بھیّا انہیں دیکھ کر مجھے ان کا اشتیاق اس درجہ بڑھ گیا کہ میں ان کی ہر بات پہ تیار ہو گیا اور ان کا شکار دیکھ کر تو مجھے اتنا رشک آیا کہ جی میں آیا کہ اپنا ہائی ولاسٹی رائفل توڑ کر پھینک دوں۔ وہ اپنے اپنے سروں پہ جال لاد کر چلے، اور یہاں تک کہ ایک مخصوص مقام پر مجھے اپنا بیل تانگا بھی چھوڑ دینا پڑا اور دو ڈھائی میل پیدل چلنے کے بعد انہوں نے گھاس کے ایک بڑے حصہ کی نظری پیمائش کی اور اشارہ کرتے ہوئے اپنی بولی کی مخصوص شکاری اصطلاحات میں سرگوشیاں کیں۔

تقریباً سو آدمی تھے اور کم و بیش اتنے ہی جال! اور وہ یہ جال لے کر ایک عسکری نظام جیسے قاعدہ سے سفر مینا کے سپاہیوں کی طرح نپے تلے قدم بڑھاتے اپنی نظری پیمائش کئے ہوئے صحیح حساب کے ساتھ پھیل کر ایک مشینی نقشے کے ساتھ اپنا کام کرنے لگے۔ انہوں نے اپنے برچھوں کی نوک سے ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو انچ زمین کھود کر قدِ آدم سے کچھ بلند بانس جو ہر جال کے ساتھ کئی کئی تھے ایستادہ کر دیئے اور ان پر جال ٹانگ دیئے اور دیکھتے دیکھتے میلوں مربع قطعہ پر جالوں کی قدِ آدم دیواریں کھڑی کر دیں۔

اور جب میں نے اپنی شکاری دُوربین سے پرتالا تو بہت جلد سمجھ لیا کہ پانچ چھ میل مربع اراضی پر انہوں نے اچھا خاصہ جالوں کا گورکھ دھندا پھیلا دیا ہے۔ انہوں نے سوؤں جال ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلہ پر اس طرح کھڑے کئے تھے کہ اس لوپ LOOP کو جو دو جالوں کے درمیان تھا تیسرا آگے والے فرلانگ بھر کے فاصلہ پر گھیر کر پُر کرتا تھا اور اسی طرح میلوں کے گردہیں ایک کی سبدھ بجائے نکاس کا راستہ مسدود کرتے ہوئے دوسرا جال تنا کھڑا تھا اور میں نے اس تمام انتظام اور باقاعدگی کو دیکھ کر اندازہ کیا کہ ALTERNATE طریقہ پہ جالوں کی دیواریں اس طرح قائم کر کے نکاس کے راستوں پر حائل کر دی ہیں کہ اس چار پانچ میل کے قطعہ کے اندر جو بھی جانور آجائے گا نکل کر جا ہی نہ سکے گا۔ اور جب میں نے اور زیادہ غور کیا تو اندازہ کیا کہ جتنے جال کھڑے ہیں وہ مربع کے ایک، نہ ایک ضلع کا کام کر رہے ہیں اور پورا گھیرا تین سمتوں سے مربع کی شکل میں ہے اور سہیل! کیا بغیر پیمانہ پرکار اور بلا جریب فیتے کے ان کی یہ تقسیم قابلِ تحسین نہ تھی اور پھر ان کا جال لگانے کا طریقہ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا باقاعدہ پریڈ سی کرتی ہوئی شکل! اور انہوں نے بیک وقت کام شروع کیا اور یکدم ختم، اور جس وقت شمال والا اپنا آخری بانس نصب کر رہا تھا اسی وقت تین میل کی دوری پر جنوب والا آدمی اخیر بانس نصب کر کے کام مکمل کر رہا تھا۔ اللہ اللہ! سہیل! اقلیدس، منصوریشن، ٹرگنامیٹری سب کی سب ازبر ہیں ان کے نپے تلے قدموں اور نچے ہاتھوں کو! اور جال لگا کر وہ اُلٹے پاؤں قدم دبائے اسی عسکری نظام کے تحت پلٹ رہے تھے اور پلٹ کر پھر وہیں پر جمع ہو گئے جہاں سے چلے تھے اور اب انہوں نے سرگوشیوں اور اشاروں میں اپنی دوسری تقسیم شروع کی۔ اب اس تقسیم شکاری کی حیثیت سے میں نے اپنا FUNCTION دریافت کیا جس پر انہوں نے مجھ ناکارہ عنصر کے مصرف پر غور کیا۔ اور پھر اپنے اس گھیرے سے باہر دوسری حد پر جہاں ان کے جالوں کا سلسلہ ختم ہوتا تھا اور جدھر کو انہیں ہانکا کرنا تھا، اس سمت پر ایک سوکھے ہوئے درخت کا بلند تاہیری نشست کے لئے تجویز کیا اور جب میں نے دُوربین سے اپنی مجوزہ پوسٹ دیکھی تو غور کیا کہ یہ گھنے ڈھاک کے جنگل سے کچھ دُور ایک سوکھے ہوئے سہل کے درخت کا بڑا موٹا تنا ہے جس کی شاخیں اور گدّے غائب ہو چکے ہیں اور میں جال لگانے کے طریقہ سے بھی سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ جانور کی جبلّت کے مطابق ہانکا کریں گے اور گھاس کے قطعہ سے جنگل کی جانب کو چلیں گے کیونکہ تم جانتے ہو کہ

DISTURB ہو کر جنگلی جانور گھنے جنگل کی سمت راہِ فرار اختیار کرتا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا "اچھا تو پھر میں وہاں پر کیا کروں؟"

"آپ اس کے اوپر آرام کے ساتھ بیٹھ کر ہمارے ہانکے کا تماشہ دیکھیں اور اگر کوئی جانور جالوں سے بچ کر یا جال توڑ کر نکلے گا تو اس مچان سے سو قدم ادھر اُدھر نکلے گا"

"لیکن اگر کوئی جانور نکلا اور میں نے فیر کیا تو ممکن ہے کہ تمہارے ہانکے ہوئے دوسرے شکار پیچھے کو پلٹ پڑیں اور ہانکا بے کار ہو جائے" میں نے کہا۔

ان میں سے ایک نے مسکرا کر انتہائی خود اعتمادانہ تیوریوں سے کہا "آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں پہلے تو آپ کی زد تک کوئی جانور پہنچے گا ہی نہیں اور اگر کوئی گھیرے سے نکل کر کسی طرح پہنچ بھی گیا تو اس کے پیچھے والا سب شکار کسی نہ کسی جال میں پھنس چکا ہوگا اور گھیرا آزاد شکار سے بالکل خالی ہوگا" اور یہ کہتے ہوئے اس نے گھاس کے وسیع قطعہ پر کچھ اس انداز سے نگاہ ڈالی جیسے ایک کسان اپنی تیار فصل پر ڈالتا ہے۔

اس کی بات پر میں نے پھر دوربین لگا کر جالوں کے گھیرے کو پرتالا۔ یہ خیال کر کے کہ کس بلا کی خود اعتمادی ہے اس کی بات میں شکار جیسے اتفاقی اور حادثاتی کھیل کے متعلق، تو سب ناکہ بندیاں اور حد بندیاں دیکھ کر مجھ کو شاہنامہ فردوسی کے وہ کنوئیں یاد آ گئے جو رستم کے بھائی شغاد نے اس کے لئے کھودے تھے اور جن میں رخش گر گر کر ایک کے بعد دوسرے میں جست کرتا ساتویں میں جا کر مع رستم کے مرا تھا۔

اور میں اس گھاس کے بن میں جگہ جگہ اس سے پیشتر بھی شکار کھیل چکا تھا۔ تمام رات دور دراز کاشتہ رقبوں سے چر کر پلٹتے ہوئے جانور علی الصبح اس میں بیٹھ رہتے ہیں اور اگر دن بھر کوئی انہیں DISTURB نہ کرے تو شام کو یہیں سے اٹھ کر پھر کاشتہ رقبوں کی جانب چل دیتے ہیں اور اگر دن میں کوئی پریشان کرتا ہے تو اٹھ کر ملحقہ گھنے ڈھاک کے جنگل میں گھس جاتے ہیں اور کہیں کہیں پر تو یہ گھاس کا سلسلہ نیلوں، سانبھروں، جھانکوں اور ہرن چکاروں کی کان ہوتا ہے۔ مگر میرا پروگرام آج گھاس کے شکار کا نہ تھا اور میں جنگل کو جا رہا تھا لیکن ان ظالموں نے مجھے اتنا مائل کیا کہ اپنا پروگرام ہی بھول گیا اور پھر ان کے شکار سے اتنا مسحور ہوا کہ ہمیشہ کے لئے شکار چھوڑ دینے کو جی چاہتا ہے۔

"اور پھر پھنسنے کے بعد کیا ہوگا؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"آپ کے پاس تو دوربین ہے، آپ تو سب دیکھ لیں گے وہیں سے بیٹھے بیٹھے، ہم سب قاعدہ کے مطابق بغیر یہ غور کئے کہ کون کون سے جال میں کیا کیا شکار پھنس گیا اپنا ہانکا پورا کریں گے اور جب ہانکا ختم کر لیں گے تو اپنے اپنے جالوں کی طرف پلٹیں گے اور اتنی دیر میں پھنسا ہوا شکار، تڑپ تڑپ کر خوب اچھی طرح پھندوں میں اُلجھ جائے گا اور ہم اس پھنسے ہوئے شکار کو برچھوں سے مار مار کر اور پھر جالوں سے نکال نکال کر اپنے خچر بھینسوں پر لاد کر لے جائیں گے۔ اب ہمارا ہانکا کب ختم ہوگا؟ یوں سمجھ لیجئے کہ یہ اس وقت ختم ہوگا جب ہمارے دائیں اور بائیں بازو کے چاروں اخیر آدمی آپ کے قریب والے یعنی سب سے اخیر والے جال کے دونوں سروں پر اور ادھر پچھم سے بڑھنے والے دونوں آدمی آپ کے جال کے ادھر پہنچ جائیں گے اور جب یہ چھیوں اخیر والے جال پر جمع ہو جائیں گے تو کام اخیر ہوگا۔ اور ادھر ہمارے ڈیروں سے عورتیں اور بچے خچر بھینسے لے کر چل دیں گے شکار وہ لاد کر لے جائیں گے اور صبح کی طرح جال ہم اپنے اوپر"

"بات ختم کر کے میں اپنی جگہ پر پہنچنے کے لئے تیز تیز بڑھا کیونکہ وہ سب اپنی ڈیوٹی لے چکے تھے اور میرے پہنچنے کے منتظر تھے۔ تقریباً پندرہ فٹ بلند سہل کے درخت کا سوکھا ہوا تنا جس کی چھتری جنگل کی سینکڑوں سالہ تاریخی روایات اس ٹھڈے کے سپرد کر کے اور عمر پوری کر کے ٹوٹ کر گر چکی تھی۔ میں اپنے خاص ملازم کے ساتھ یہاں پہنچ گیا جو شکار کی خلوتوں اور جلوتوں میں میرا شریک ہے اور قوم کا بھنگی ہے۔ رائفل میں نے ملازم کے ہاتھ میں دے دیا

اور بغیر جوتے اتارے ہی لکڑی کی اُٹھی ہوئی گرہ بندیوں پر پاؤں ٹیکتا بندر کی سی ایک جست میں اُوپر دکھائی دیا۔ اچھی خاصی چھوٹی چوکی برابر کھُردری اونچی نیچی جگہ پو میں نے اپنے آپ کو پایا۔ نیچے سے اس نے رائفل ذرا اُچک کر بڑھایا اور میں نے اسے جڑ سے لپٹ جانے کی ہدایت کی۔ اور وہ خوب جانتا تھا کہ اس موقع پر چھپنے و بکنے کے سلسلہ میں اس کا کیا فرض ہے۔ اور میں نے دُور بین سے پھر پڑتالی کی اور یہ پانچ ہزار سال پُرانے شکار کا ڈرامہ دیکھنے کے لئے بہترین نشست تھی۔ خانہ بدوش میلوں کے گرد میں پھیل چکے تھے اور انہوں نے کام شروع کر دیا تھا اور ان کا طریقہ دیکھ کر مجھے افریقہ کے ان سوڈانی قبائل کا نقشۂ جنگ یاد آرہا تھا جس کی تفصیل ملکہ وکٹوریہ کی سوانح حیات میں نیم مورخ انگریز (G.A HENTY) نے ملکہ کی افریقی فتوحات کی تفصیل کرتے وقت لکھی ہے۔ یہ لوگ بھی انہی کی طرح باقاعدہ نیم دائرہ کی شکل میں بڑھ رہے تھے، نہایت سُبک رفتاری اور استقامت کے ساتھ قدم قدم پر تُلا ڈالتے ہوئے۔

پتہ نہیں سہیل تم نے ہانکے کا شکار دیکھا ہے مگر یہ تو تم جانتے ہی ہو گے کہ آج کل جو طریقہ ہانکے کے شکار کا ہم متمدن شکاریوں میں رائج ہے یہ بہت کچھ مغل بادشاہوں سے ہم تک پہنچا ہے اور انگریز شکاریوں نے تھوڑی بہت ترمیم تنسیخ کے ساتھ اس کو اپنا لیا۔ ہمارے ہانکے میں تو جنگل میں قیامت کبریٰ برپا ہو جاتی ہے۔ سو آدمیوں کی تعداد ہانکے کے قطعہ کے رقبہ کے مطابق کم اور زیادہ ہوتی ہے۔ جگہ جگہ نکاس کے راستوں پر محفوظ نشستوں پر شکاری دبک کر بیٹھ جاتے ہیں اور مخالف سمت سے ہانکا کرنے والے قلیوں کی جماعت بڑھتی ہے۔ پیدل ٹٹوؤں پر ڈھول بجاتی، چیختی چنگھاڑتی کہیں کہیں پٹاخے چھوڑتی شور کے سیلاب کی طرح بڑھتی ہے ان کے دائیں بائیں دونوں سمتوں پر جگہ جگہ آدمی تعینات ہوتے ہیں جو ساٹھیں گھیرے ہوئے نمایاں بھی رہتے ہیں اور تھوڑا آہٹ شور اور حرکت بھی کرتے ہیں تاکہ جانور شکاریوں کی سمت سیدھا بڑھے اور ادھر اُدھر کٹ کر نہ نکل جائے اور شیر کے ہانکے میں یہ آدمی حفاظت کے خیال سے درختوں پر رہتے ہیں انہیں ہماری شکاری اصطلاح میں سٹاپ (STOP) کہتے ہیں اور یہ ہانکے سے بھڑک کر بھاگے ہوئے جانور کا رُخ ٹھیک شکاریوں کے ناکوں کی جانب ہانکا کرنے والوں کے عین مخالف سمت برقرار رکھنے میں مدد دیتے ہیں اور ہمارے ہانکے میں اس مخصوص قطعہ صحرا کا امن و امان برباد ہو جاتا ہے اور بدحواس بھاگتے ہوئے جانور اندھا دُھند دبکے بیٹھے ہوئے شکاریوں کے قریب سے گذرتے ہیں اور بندوق کا لقمہ بنتے ہیں اور بے تحاشا بھاگتے ہوئے جانوروں کو شکاریوں کی بندوقوں کی آوازیں بھی صدائے بازگشت میں پیچھے سے ہانکا کرنے والوں کے شور میں مل کر سُنائی دیتی ہیں۔ جوں جوں ہمارا ہانکا ہماری سمت بڑھتا جاتا ہے اس کا شور قاعدہ کے مطابق کم ہوتا جاتا ہے اور جن اسٹاپوں کے محاذ کا جنگل جھڑا جاتا ہے وہ اپنی اپنی ڈیوٹیاں چھوڑ کر ہانکے میں شریک ہوتے جاتے ہیں۔ جنگل کے اس مخصوص قطعہ میں ایک ٹُنڈ کا یا مکھی بھی اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتی۔ ہر چھوٹا بڑا جانور انتہائی منتشر الاعصاب ہو کر کسی نہ کسی شکاری کے سامنے سے گذرتا ہے۔ مینائیں، مرغیاں، تیتر کڑکڑاتے بدحواس اُڑتے ہیں سانبھر، نیل، جھانک، سؤر، شیر، گلدار سبھی کو بے تحاشا شکاریوں کے محاذ کی پُل صراط سے گذرنا پڑتا ہے۔ سب کے سب اپنی جبلت بھُول کر گھال میل ہو جاتے ہیں اور ذرا ذرا سے وقفہ سے شکار کی بہتی ہوئی لہریں شکاریوں کے سامنے سے گذرتی ہیں اور بالعموم بلندی پر اطمینان کے ساتھ دبکے ہوئے شکاری دنادن چھٹتے ہیں اور من من بھر دو دو من کا ایک ایک لقمہ عزرائیل غپا غپ نگلتے ہیں اور شکاریوں کی پوری لائن پر موت کا بازار پوری حدت کے ساتھ گرم ہو جاتا ہے اور ایک کامیاب ہانکے میں ایک ایک شکاری کے ہاتھ پر شکار کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ ہانکا کرنے والوں کا شور، بندوقوں کے دھماکے، زخمی جانوروں کے ڈکرانے کی آوازیں اور سوکھے پتوں کے اوپر جھاڑیوں میں بے تحاشا بھاگتے ہوئے جانوروں کا شور۔ ایک دفعہ کو تو جنگل اُدھم قیامت بن جاتا ہے۔ گھاس سے لے کر دیو پیکر درخت تک زلزلہ میں آجاتے ہیں اور یہاں تک کہ قطعہ خالی ہو جاتا ہے اور بڑھتے بڑھتے ہانکا کرنے والے مزدور شکاری محاذ کی لائن کے قریب نمودار ہوتے ہیں جہاں مقتل گاہ ہوتی ہے اور شکاریوں کی نالیں جھکا دی جاتی ہیں، بازو ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور جوش مندھا جاتا ہے، چہرہ پر کامیابی

کی چمک، ہونٹوں پر دل آویز تفاخر کی مسکراہٹ، اور آنکھوں میں مخصوص اسپورٹنگ اسپرٹ کا سرور نمایاں ہو جاتا ہے، سامنے پڑے ہوئے بسمل و نیم بسمل جانوروں پر ہانکا کرنے والے مزدوروں کی دست درازیوں کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ مسلمان مزدور جھپٹ جھپٹ کر تڑپتے دم توڑتے جانوروں پر چھریاں پھیرنے لگتے ہیں اور ذرا دیر میں پھر موت کا سناٹا طاری ہو جاتا ہے اور صرف شکار کو لاد کر کیمپ تک لے جانے کی بھنبھناہٹ اور انتظام کی آوازیں رہ جاتی ہیں اور پھر جنگل میں وہی خاموشی ہو جاتی ہے جو ہانکے سے پہلے تھی یا طوفان کے بعد

مگر اس وقت میں اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا دوربین سے ان وحشیوں کے وسیع ہانکے کا سروے کر رہا تھا۔ کتنا پُرسکون! کتنا آہستہ اور کس قدر باضابطہ تھا سہیک ان جنگلیوں کا ہانکا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آہستہ آہستہ منکارتے جاتے اور مسلسل "ہُرر ہُرر" کی آواز ایسی مشینی ہم آہنگی سے نکالتے جاتے کہ ایک میٹھی میٹھی چونکا دینے والی کیفیت سے ان کا گھیرا ہوا تمام نیم دائرہ گونجتا چلتا اور میں نے اندازہ کیا کہ تمام رات کی چرائی کے نیند مار جاگے بھاگے جانور واقعی اس وقت بھڑک کر آہستہ آہستہ اُٹھتے ہوں گے جب یہ ہانکا کرتے ہوئے ان کے بالکل قریب پہنچ جاتے ہوں گے۔ ان کا نرم رو ہانکا میری جانب کو بڑھتا رہا مگر اس نرم روی اور شگفتہ آوازی کے باوجود بھی اتنا محیط اور حاوی تھا کہ اس مخصوص گھیرے کے اندر وہ انچ انچ بھر زمین پر گویا چھا گئے۔ وہ لوگ میری جانب نہایت فنکارانہ انداز میں بڑھ رہے تھے اور قریب تر ہوتے جا رہے تھے اور میرا ماتھا ٹھنکا۔ بہر حال اب تک جوں کا توں ایستادہ منتظر تھا۔ اور میں نے غور کیا کہ یہ لوگ تقریباً ایک تہائی فاصلہ سمیٹ چکے مگر کہیں سے ایک جانور بھی نہیں اٹھا! ہلکی ہلکی ہوا کے رک رک کر پچھم سے آتے ہوئے جھونکے گھاس میں جزر و مد کی میٹھی کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ زردی مائل سبز گھاس پر صبح کی دھوپ میں چمک چمک کر لہریں اٹھتیں، آہستہ آہستہ ہوا اور گھاس کے اتصال کا سناٹا اور ہانکے والے خانہ بدوشوں کی آوازیں ایک لطیف صوتی انداز میں میرے کانوں میں پڑ رہی تھیں اور دوربین کے لینس پیچھے پورب سے پڑتی ہوئی سورج کی کرنوں کے ساتھ بڑا اچھا کام کر رہے تھے۔ اب ہانکے والوں کا دائرہ تنگ ہو گیا اور بخوبی اس کی ہلالی شکل سامنے آگئی۔ یا اللہ! کیا راز ہے؟ شکار اس گھاس میں پہلے بھی کھیل چکا ہوں اور پھر ابھی علی الصبح راستہ میں کاشتہ رقبوں کی جانب سے واپس آتے ہوئے جانوروں کے قدموں کے نشانات بھی دیکھے تھے جو میرے اندازہ میں رات کے آخیر حصہ اور صبح صادق کے وقت کے تھے اور میں نے خیال کیا "کہاں مر گئے اتنی بڑی شکارگاہ کے سب جانور! زمین نگل گئی یا آسمان کو اُڑ گئے میرے اللہ!

اور دیکھتے دیکھتے ہانکا اور بھی قریب آ گیا۔ مگر کہیں پر ادنیٰ حرکت بھی دکھائی نہ دی۔ بس وہی تمام قطعہ پر بدستور ہوا کی دھوپ چھاؤں لہریں پڑ رہی ہیں اور میرا اندازہ تھا کہ کم و بیش سو چرندے برآمد ہو چکے ہوتے اس وقت تک، اور جال بھر چکے ہوتے، یوں تو جس وقت میں اس جگہ پر چڑھا تھا تو "شیخ بیٹھا بیٹھا دیکھ" ایک عجیب بیگانگی کا احساس لیے ہوئے تھا اور سہیک! خود ہی سمجھو جس شکار میں ایک پرانے اسپورٹس مین کو اس وقت چانس ملنے کی امید ہو جبکہ شکار سب سے اخیر جال توڑ کر بھاگے اس میں اسے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ مگر اُوپر پہنچ کر ان کے جالوں کی دیواروں کی باقاعدگی! ان کے ہانکے کا پرسکون محیط اور بے پناہ ہمہ گیری! ان کے بڑھنے کا خوبصورت انداز، گویا لپیٹے کا پورا نیم دائرہ ایک ڈوری میں پرو دیا ہوا ہے اور سامنے سے ڈوری کے دونوں سرے آہستہ آہستہ کھینچ کر کوئی اسے تنگ کر رہا ہے اور سرکل کے خم دار خط کا ہر نقطہ بیک وقت کسی ایک مستقل طاقت کے تحت نامعلوم طریقہ پر بنا ہوا سائے کی طرح سکڑ رہا ہے۔ اور میں نے غور کیا کہ وہ سب متفق الحرکاتی کے ساتھ اپنی سبک رفتاری سے بڑھ رہے ہیں کہ دریا کے اندر کھڑے ہوئے تیرتے معلوم ہو رہے ہیں۔

جوں جوں وہ آگے بڑھے میری ناامیدی بڑھی، اپنے شکار سے بھی گیا اور یہاں بھی معاملہ خالی ورنہ دیکھ کر تھوڑی بہت تفریح ہو جاتی۔ مگر یہ گھاس کیوں خالی ہے! جبکہ رات کے اخیر حصہ تک اس کے اندر جانوروں کی آمد کا کاشتہ رقبوں کی جانب سے نشاناتِ قدم کے ذریعہ کھوج ملتا ہے

اور کہیں چرہے کا بچہ بھی نہیں اُٹھا۔
میرے دل میں سوال پیدا ہوا۔ یہ آج ساری عمر کا تجربہ کیوں غلط ہو رہا ہے ۔ ایسے موقع کا اتنا مکمل ہانکا! اور کہیں چرہے کا بچہ بھی نہیں اُٹھا۔
دائرہ کافی تنگ ہو گیا۔ میری دُوربین خوردبین سی بن گئی اور میں نے ہرا میں جھومتی ہوئی گھاس کی پھنگیوں پر ایک عجیب لہر سی دیکھی، کچھ سمجھنے کی کوشش کی، لیکن کچھ سمجھ نہ سکا! مگر انداز سے یہ اندازہ ضرور کر لیا کہ خانہ بدوشوں نے اس رینگتی کھسکتی ہوئی لہر کو دیکھ لیا ہے اور وہ نہایت فنکارانہ چابکدستی سے اپنے ہر جال کی جانب ہانکنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بھیا سہیل! میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے غور کیا کہ یہ لہر ہر جال کے اتنے قریب پہنچ کر کہ ایک قدم آگے بڑھنے میں جال سے ٹکرا جائے، ذرا مدھم پڑتی ہے اور پھر نہایت آرٹسٹک طرز کے ساتھ اپنی مخصوص کھسکتی ہوئی سی سبک رفتاری سے دائیں بائیں کسی جانب کو کترا جاتی ہے اور جال کو صاف بچا کر اس LOOP میں سے گذر جاتی ہے جو دو جالوں کے درمیان میں پڑتا ہے مگر اس LOOP میں سے گذرنے کے بعد اس کے عین سامنے پھر جال پڑتا ہے اور ڈھائی تین سو گز چل کر وہ پھر اس جال سے کتراتی ایک جانب کو بچ کر نکل جاتی ہے اور میرے دیکھتے دیکھتے دس پندرہ جال بچا کر وہ میری طرف کھسکتی چلی آئی۔ اور میں نے اندازہ کر لیا کہ گھاس کے نیچے نیچے کوئی چیز چل رہی ہے، مگر کتنی ذکی الحس مخلوق ہے یا الٰہی! جال کے بالکل قریب پہنچ کر صاف راستہ کتر جاتی ہے! اندر ہی اندر! میں نے دل میں کہا اور میں تو تعجب میں دریافت حال کے لئے بیتاب تھا مگر جب میں نے دُوربین سے اسے ہانکتے ہوئے خانہ بدوشوں کا چہرہ دیکھا تو میری حیرت اور بڑھ گئی۔ سہیل! انتہائی سنجیدہ، بلکہ خونخواری حد تک پہنچا ہوا شکاری پن ان کے بُشروں سے عیاں تھا۔ میں اب تک کچھ نہ سمجھا، میرے دائیں بائیں اور سامنے پورے ہلالی محاذ پر گھاس میں کمر کمر ڈوبے خانہ بدوش شکاریوں کا نیم دائرہ میرے بالکل قریب آ گیا اور وہ بڑھتی ہوئی لکیر جیسے گھاس کے نیچے نیچے اژدہا سا لہراتا چلا آ رہا ہے میرے بالکل سامنے آ گئی۔ دو ڈھائی سو گز کے اندر۔ میں حیران ضرور تھا مگر مطمئن، اک ذرا میں سب حال کُھلا جاتا ہے، کیونکہ سب کچھ میری ہی جانب کو بڑھ رہا تھا۔ مگر میرا جالوں کے گھیرے کی سرحد میں فیر کرنا تو طے ہی نہ تھا اور قاعدہ کے مطابق نہ ہانکے کے اندر کو فیر کر سکتا تھا اور مارتا بھی کیا! ایک ٹیڑھی میڑھی لہراتی لکیر کے سوا اور کوئی چیز تو سامنے تھی نہیں۔

اور اب تو وہ میرے بالکل قریب آ گئے تھے، سہیل! تم نے شاید تصویر بھی دیکھی ہو گی پچھلی جنگ عظیم میں جرمنی نے میدان جنگ میں ROBUT اتارے تھے بس وہ فولادی آدمیوں کی مشینیں کچھ ایسی ہی بڑھتی ہوں گی لڑنے کے لئے۔ اور سہیل! نظارہ اتنا دلفریب، اتنا مشینی اور ساتھ ہی ساتھ اسقدر معمہ پن لئے ہوئے کہ تماشہ گاہ میں بیٹھا محسوس کر رہا تھا۔ نہ سہی شکار کا EXITEMENT یہ لہراتا ہوا TEMPO کس سے کم تھا۔ جیسے اٹھارویں صدی کے مغربی لٹریچر سے کوئی افسانہ پڑھ رہا ہوں۔

اور افسانہ اختتام پر آ گیا مگر نتیجہ کے عجوبہ پن میں ذرا کمی نہ آئی۔ ماحول پر جتنا سکون اور حرکت میں جتنا DISCIPLINE کارفرما تھا اتنی ہی میرے اندر دریافت حال کی شدید بیتابی متحرک تھی۔ جیسے گھاس سے نیچے شطرنج کا بادشاہ چوطرفہ چال چلتا گشت بچاتا نکلا چلا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ بچے میں چند گز ہانکا کرنے والوں کی جانب رُخ کرنا پڑتا پھر سیدھا ہو جاتا جو عام جنگلی جانوروں کی جبلت کے منافی سا ہے۔ اور یہاں تک کہ خانہ بدوش ہانکا کرنے والوں کا ہراول میرے بالکل قریب آ گیا اور نوبت اخیر جال پر پہنچ گئی اور یہاں پر ہراول کے چھیوں آدمیوں نے ہر چند کوشش کی کہ یہ اس جال سے ٹکرا جائے مگر وہ لہر اخیر جال کی ٹکر بھی بچا کر بائیں جانب کو مڑی۔ اور نہ معلوم کتنے جالوں کی ٹکر بچا کر جالوں کے گھیرے سے صاف باہر آ گئی۔ ادھر ہلال کی نوکوں والے دو خانہ بدوش اور دو دو شمال و جنوب کے بازوؤں والے بالکل آ ملے اور لمبا چوڑا ہلال سمٹتے سمٹتے صرف چھ آدمیوں کا ایک مثلث مساوی الساقین بن گیا اور ایک دوسرے سے پندرہ فٹ کے فاصلہ پر وہ چھیوں آدمی مثلث مساوی الساقین کے تینوں زاویوں پر دو دو کھڑے تھے۔ اور اب وہ آسیب کی قسم کی چیز ان تینوں کے درمیان ٹھہری ہوئی تھی اور چھیوں نظروں کی ٹکٹکی عین وہیں پر جمی ہوئی تھی اور اب جیسے وہ چھیوں آئندہ حرکت کے

منتظر تھے، برچھے تانے ہوئے ۔ ہمہ تن توجہ اور مجسم بہادری بنے ہوئے ——— اور تقریباً دو تین منٹ حرکت رُکی رہی اور معاً میرے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح لہرا گیا اور شروع سے آخر تک سب کچھ سمجھ میں آ گیا اور دیر میں سمجھ میں آنے کا سبب یہ تھا کہ جو کچھ تھا وہ دور دور میرے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ یہاں پر غیر متوقع طور پر یہ نکل سکتا ہے ۔ باوجودیکہ میرے ساتھ میں ۴۰۴ دیسٹلی رچرڈ کا روائٹ ہائی ولاسٹی رائفل تھا مگر میں اس شکار کے لئے نہ تو اس وقت تیار تھا جو میرے سامنے آنے والا تھا اور نہ موقع دیکھ کر خود کو اس کی اہمیت کے لئے تیار کر سکتا تھا ۔ میں یہاں نیل، سانبھر، بھانک، چیتل مارنے آیا تھا ۔ اگرچہ یہ تو شیر ہی تھا میرا رائفل ہاتھی تک کے لئے کافی تھا اور اس وقت بھی میں اس اہم شکار کے لئے تیار ہو جاتا جس سے دوچار تھا مگر جب میں نے سائنٹیفک انداز سے پرکھا تو میری نشست کی اونچائی تو بالکل ہی غلط تھی نہ تو ریڈر کے معیار پر صحیح اُترتی تھی اور نہ جم کاربٹ کے اور بیٹھتے وقت میں اس پر توجہ بھی کیوں دیتا میں تو یہاں چرندوں کا شکار کرنے آیا تھا ۔ پھر میں نے غور کیا کہ اگر یہ گھاس سے نکل کر ادھر چٹیل میدان میں سے گذرتا ہوا میرے سامنے کھل کر بھی آیا تو فاصلہ غلط ہے اور جنرل نائٹ انگیل کے تجربہ کے مطابق کم سے کم ساٹھ گز سے گولی مارنا چاہئے اور اس سے کم میں شکاری کے لئے خطرہ ہے اور یہ تو مشکل تیس چالیس گز ہے ۔ اور میں اسی چکیفم میں تھا کہ یکدم پیچھے والے دونوں زاویوں سے چاروں خانہ بدوشوں کی ایک آواز بلند ہوئی "مردہ گُھما !" اور سہیل ! تمہیں کیا بتاؤں شاید کسی سینما کا کٹ آؤٹ بھی اسکرین پر یہ منظر پیش نہیں کر سکتا اور میں نے گھاس میں سے ایک بجلی سی تڑپ کر آگے کو اُچھلتے دیکھی اور اسی جست کے ردِ عمل میں روما کے برچھے نے اسے پیچھے پٹخ دیا ۔ سہیل ! تمہیں کیا بتاؤں تفصیل میں تو بڑی دیر لگے گی اور اسے تو شاید علم الحرکات کا ماہر بھی قرار واقعی تفصیل نہ کر پاتا ۔ گھاس میں سے شیر کی جست اور اسی جست پر روما کا ذرا جھک کر اسے نیزہ پر لے کر نہایت فنکارانہ انداز میں اُلٹا پٹخنا اور جیسے اسی حرکت کے ساتھ ساتھ بیک وقت چھیوں نیزوں کو غپاغپ گھسیڑ کر شیر کو چومکا کر کے دبا لینا ایک ہی حرکت ہوئی سب اور جب نگاہ نے ذرا ٹھہر کر جائزہ لیا تو شیر پیٹ سے لے کر گردن تک چھ بھالوں میں اٹکا ہوا زمین پر دم توڑ رہا تھا بظاہر اس نے روما پر عاجز ہو کر حملہ کیا تھا مگر میرے خیال میں اس مثلث مساوی الساقین کے تکونے حصار سے وہ روما کے سر کے اوپر سے جست کر کے نکل بھاگنا چاہتا تھا اور اس نے گھبرا کر یہ جست لگائی تھی جو روما نے اپنے برچھے پر لے لی ۔ میرے رائفل کا سیفٹی چڑھا رہ گیا اور شیر مجھ سے چالیس گز کے اندر چومکا کر یا اخیر سانسیں لے رہا تھا اور اس ہنگامہ میں میرے رائفل کی بٹ بار بار میرے کندھے پر آئی کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ عنقریب یہ برچھوں کی بھالیں سونٹ کر اور ان میں سے دو چار کو نوچ کھسوٹ کر نو دو گیارہ ہوگا اور ان کے درمیان سے نکل کر میری صاف زد پر گذرے گا مگر بھیا سہیل ! توبہ کرو پار کر دیئے پورے پورے برچھے ان جنگلیوں نے اور چار چار انگل بانس تک گھسیڑ دیئے اندر ——— تم جانتے ہو کہ شیر غیر معمولی ذکی الحس درندہ ہوتا ہے اور اس کے کان بڑے تیز ہوتے ہیں گھاس جال سے ٹکرا کر بہت ہی آہستہ مانوس قسم کی آواز پیدا کرتی تھی جس کا سُن لینا کچھ شیر کے ہی سامعہ کا حصہ تھا اور اس سے وہ خطرہ کا احساس کر کے صاف کترا جاتا تھا مگر جب اس نے سب جال بچا کر بھی اپنے آپ کو گھرا پایا تو یہ حرکت کی ۔ اگرچہ روما اور اس کے ساتھیوں کا خیال ہے کہ وہ روما کے منہ پر عاجز ہو کر لپوٹا رسید کرنے کا حملہ تھا لیکن میرے خیال میں وہ بچ کر بھاگ نکلنے کی جست تھی جس کو روما نے اپنے برچھے کی نوک پر لیا اور دیکھتے دیکھتے دُم کا کوڑا لہرا کر پٹ سے زمین پر لگا اور یہ شیر کے جان نکلنے کی آخری شہادت تھی ۔

چھیوں خانہ بدوش ایک دوسرے کی جانب فتح مندانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے ۔ میرے رائفل کے میگزین میں چھیوں کارتوسوں کی کارڈائٹ پاؤڈر کے کیمیاوی اجزا مشتعل ہو کر گیسیں بننے کی آرزو میں جہاں کے تہاں رہ گئے اور ہزاروں من کی جھوک اور ہزاروں میل فی سکنڈ کی رفتار سے نکلنے والی گولیوں کے نپل جوں کے توں ٹھنڈے اور ساکت کارتوسوں میں اٹکے رہ گئے اور خالص انسانی حرکت میں شیر ڈھیر ہو کر رہ گیا ۔ اور سہیل ! جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ میں تو اتنا مفصل لکھنے کے بعد بھی اس حرکت و تصادم کی تشریح تمہارے سامنے قرار واقعی نہ کر سکا اور میں کیا شاید اسے علم الحرکات

کا کوئی ماہر بھی بھرپور الفاظ میں نہ سمجھ سکتا تھا۔ شاید کسی مووی کیمرے کا لینس اس کی کہربائی شعاعوں کو جذب کر کے تھوڑا بہت ریکارڈ کر سکتا۔

اور بھی وہ نوجوان جنگلیوں نے میرے سامنے آنے کی نوبت ہی نہ آنے دی اور سامنے آتا بھی تو شاید میں جیسا کہ ابھی لکھ چکا ہوں شیر جیسے اہم شکار
پر غیر سائنسی اور خلاف قاعدہ جگہ سے گولی نہ لگاتا اور SAFTY - FIRST کے اصول کو مدِ نظر رکھتا کیونکہ جیسا کہ میں نے بتایا کہ میری بلندی فاصلہ
اور اینگل کوئی چیز بھی مقرر کردہ شیر کے شکار کے اصولوں پر پوری نہ اترتی تھی اور ہر چیز شیر کی موجودگی کا احساس کرتے ہی میرے دماغ میں آ کر مجھ کو ہوشیار
کرتی چلی گئی۔ شیر کا شکار میں اس سے پیشتر بھی کر چکا ہوں لیکن اس کے لئے گھر سے تیاری کر کے چلا جاتا ہے اور میرے کیمپ کے ساتھ شیر کے شکار کی
کوئی تیاری نہ تھی۔ تو سہیل! تم ہی بتاؤ جب میں صحیح بلندی پر نہیں تھا، جب مجھ سے وہ محفوظ فاصلہ کے اندر نہ گذرتا، جب نشانہ لگانے کے لئے
ٹھیک اینگل نہیں پڑ رہا تھا اور جب کیمپ کے ساتھ کوئی سامان شیر کے شکار کے ضروری اور حفظِ ما تقدم کے لوازمات میں سے نہیں تھا تو شیر پہ گولی
لگانے کا ارادہ بھی کیسے کر لیتا جو اس وقت سچی میں تم کو یہ لکھ دوں کہ اگر خانہ بدوشوں کے درمیان سے نکل کر بھاگتا تو میں ایک گولی میں ختم کر دیتا ورنہ
خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو تم سب کہتے کہ میاں ان جنگلیوں میں اور تم میں فرق کیا رہا جو بانس میں فٹ بھر لوہے کی بھال لگا کر شیر سے دست بدست مجادلہ
کرنے کے لئے چار پانچ گھنٹہ اس کا تعاقب کرتے رہے۔ اور میں نے اپنے بھنگی ملازم کو آواز دی جس کو مچان پر بٹھا کر میں خود اوپر آ بیٹھا تھا مگر صدائے
برخاست! میں رائفل گلے میں ٹانگ کر نیچے اترا۔ مگر وہ اب تک بدستور تنے سے چپکا ہوا تھا۔ بیچارا ایک جانب اوندھا پڑا ہوا، رنگت مٹیالی، آنکھیں
پتھرائی پتھرائی تمام جسم میں رعشہ اور یہ عالم کہ جیسے سوکھی لکڑی میں پیوست ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور شاید مجھے مع رائفل کے دیکھ کر اسے کچھ ڈھارس
سی ہوئی۔ سہیل! تم جانتے ہوگے کہ دیہاتی و قصباتی زمیندار بھنگیوں کو اپنے باڈی گارڈ کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور یہ باڈی گارڈ بستیوں میں ہمہ وقت
„قربِ سلطانی" کے نشہ میں چور شیروں اور تیندوؤں کی طرح غراتے اینڈتے پھرتے ہیں مگر اس وقت مجھ کو دیکھ کر کیا بلانے پر بھی نہ اٹھ سکا اور تیوریوں
میں ضرور ایک گونہ اطمینان کی نشانیاں پیدا ہوئیں مگر اپنے مٹیالے کپڑوں میں تنے پر ایسا چمٹا ہوا تھا جیسے سوکھی لکڑی ابھری ہوئی ہے۔ تمام انداز سے
الامان! والحفیظ پکارتا ہوا۔

سہیل! وہ خاکروب تھا۔ اس کی تاریخ شاہد ہے کہ اسے تمدن نے مطیع کر کے اپنی ہسٹری کی کتاب میں ایک باب شودر کے نام سے شامل
کیا اور کتے کے ساتھ اسے بھی پکڑ کر 'وفادار' کا لقب دیا۔ ورنہ آج بھی اس کے جسم پر عضلات و اعصاب کی رسیاں رُوما سے کم بٹی ہوئی نہ تھیں
مگر اس کی رسیاں اس کے جسم و ضمیر کو جکڑے ہوئے تھیں اور وہ تمدن کا غلام تھا اور وہ۔ تو وہ اس کا نامدار آقا "عبدالماشین" تھا لیکن "ابو الماشین"
رُوما کا کھردرا برچھا آج بھی تمدن کے سامنے بلند تھا اور رُوما کے خون کی سُرخی براہِ راست دل سے اکتسابِ رنگ کئے ہوئے تھی مگر اس کے خون
کا راستہ دماغ کی تابناکیوں سے کسبِ ضیا کرتے ہوئے تھا تو بھی کیا ڈر ہے کہ جب اس سے دس گز کے اندر آدمی اور شیر میں دست بدست لڑائی
ہوئی تو اس کا خون ڈر کے مارے خشک ہو گیا۔

اور میں نے رُوما سے مخاطب ہو کر پوچھا "کیوں جی جب تم شیر کے سامنے آئے تھے تو تم نے اپنی حفاظت کا کیا بندوبست کیا تھا۔ تم تو یوں
ہی ننگ دھڑنگ شہتیر کے سے سینہ دیئے سامنے کھڑے تھے۔"

اور ان سب نے جیسے ایک گونہ طنزیہ حقارت کے انداز میں میری جانب دیکھا اور رُوما نے ٹھیٹ اسپورٹس مین والی بے باکی سے اپنا خون آلود برچھا
ذرا مضبوطی کے ساتھ پکڑ کر میری جانب کو بڑھایا اور فخریہ انداز اور خود اعتمادانہ تیوریوں سے کہا "ہمارا برچھا! یہ برچھا —— یہ ہے ہماری حفاظت کا
ضامن!" اور پھر اک ذرا توقف کے بعد اپنا یہ جوشیلا سا طرز بدلتے ہوئے اپنائیت کے انداز میں جیسے وہ میری اس ہمدردی کے خیالات سے میرا ممنون سا

ہو رہا ہے اس نے نہایت نرم طریقے سے کہا " دیکھئے ہم نے ہانکا شروع کرنے کے ذرا ہی دیر بعد اندازہ کر لیا تھا کہ یہاں شکار بالکل نہیں ہے۔ اب سوال پیدا ہوا کہ کیوں نہیں ہے؟ کھوج لگ رہے ہیں! پیشاب مینگنی مل رہا ہے! اور ہم میں سے ہر ایک سمجھ گیا کہ باگھ نکلے گا اور یہ جو ہم اسے دوپہر سے ہانکتے ہر جال پر لا رہے تھے اور یہ کٹ کٹ کر صاف بچ جاتا تھا یہ تو آپ نے اپنی دُوربین سے ہم سے بھی اچھی طرح دیکھ لیا۔ اور قاعدہ سے ہم چھیوں کی " ہان " میں یہ باگھ پڑتا تھا جب جال بچا کر باہر نکل گیا تو حساب سے ہم وہاں پر بالکل ٹھیک پہنچے جہاں پہ یہ گھرا ہوا تھا اور ہم چھیوں میں سے کسی کو پتہ نہیں تھا کہ شیر کس پر جست کرے گا مگر جس پر بھی جست کرتا وہ اسے ایسے ہی اُٹھا دے مارتا جیسے میں نے دے مارا " اور اس کے منہ سے ایک فراچتہ عمر کے خانہ بدوش نے بات لے کر کہا " اور آپ یہ تو بتائیے تین چار ہاتھ کا شیر ہوتا ہے اور ہمارا " برچھا " چھ سات ہاتھ کا ہوتا ہے ہم تک شیر پہنچ کیسے جائے گا جب یہ لمبا " برچھا " ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اور یہی اس کی لمبائی ہماری حفاظت کا انتظام ہے جس کے متعلق آپ باربار پوچھ رہے ہیں " اور پھر شیر کی لمبائی اور برچھے کی لمبائی دونوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا " دیکھئے نا! ——— اور ناپ لیں نا "۔ اور یہ کہہ کر اس نے شیر کی دُم سے لے کر مونچھ تک برچھا رکھ کر دکھایا۔ اور کتنی سادہ، سائنٹیفک اور عام فہم بات تھی سہیل! ذرا غور تو کرو میرے پاس اس کی اس دلیل کا کوئی جواب تھا بھلا؟ اور زندہ تائید میں مُردہ شیر سامنے پڑا تھا۔

خانہ بدوش جلدی جلدی جال سمیٹ سماٹ کر چل پڑے اور رمّا اور اس کے پانچوں ساتھیوں نے شیر کی چاروں ٹانگیں ایک رسّی کے ٹکڑے میں یکجائی باندھ کر اور اسے پوٹلی سا بنا کر اپنے برچھے کے بانسوں میں لٹکا کر کندھوں پر رکھ لیا اور چل دئے۔ وہ آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے۔ اور جب ان کے خیموں پر پہنچے تو پتہ چلا کہ ــــ

نکلے تھے جستجوئے بُت خانہ و صنم میں
بھٹکے تو آکے نکلے کہئے کہاں حرم میں

سامنے میدان میں انکی عورتوں اور بچوں کے درمیان خلافِ امید ایک مقدس صورت نظر آئی۔ جیسے ایک تازہ ولایت فرشتہ آسمان سے نازل ہوا ہے۔ سُرخ و سپید چہرہ، گویا خنظل کے پھل پر گرمس کی چاندنی پڑ رہی ہے، نیلی آنکھیں جن کے اندر فوری کینچلی اتارے ہوئے ناگ کی آنکھوں والی شعاعیں چھوٹ رہی ہیں اور قریب ہاتھ بھر لمبی نقلی ریشم جیسے سنہرے تاروں کی داڑھی، نوک پر زاویہ منفرجہ بناتی اور دونوں جانب جبڑوں پہ زاویہ حادّہ کی شکل پیدا کرتی کنوٹیوں تک چلی گئی تھی اور پھر مخصوص کاٹ کی سیاہ ٹوپی میں دونوں سرے گھسے چلے گئے تھے! اور پیشانی سے لے کر داڑھی کی نیچے والی نوک تک اچھی خاصی گاتھک طرزِ تعمیر کے دو دروازوں کی نوک دار ڈاٹیں ایک اُلٹی اور ایک سیدھی جڑی لگتی اور کھڑی معلوم ہو رہی تھیں اور یہ سُرخ سپید سیاہ انتظام نور و ظلمت کا پیارا امتزاج معلوم ہو رہا تھا جیسے کالی گھٹا چاند کو لئے ساری چاندنی ہضم کئے بیٹھی ہے۔ انہیں دیکھ کر پہلی نظر میں مجھے ایک دھچکا سا لگا اگرچہ فوراً سمجھ گیا تھا کہ مشن کے پادری صاحب رونق افروز ہیں جن کا ذکر خیر ان خیموں میں ولائتی اشیاء کی شانِ نزول کے ساتھ سُن چکا تھا " ولی را ولی می شناسد " اور جس طرح میں نے انہیں پہچان لیا کہ " حضرت شکاری ہیں " اسی طرح وہ میری وضع قطع دیکھ کر پہچان گئے کہ " میں شکاری ہوں " اور دونوں اپنے اپنے شکار پہ ہیں۔ اگرچہ میرا ہاتی ولاسٹی رائفل آج بیکار ثابت ہوا تھا مگر ان کا تڑا گلا سجال ان خانہ بدوشوں کے مضبوط کھاڑوں کے درمیان ایستادہ تھا۔ اور شکاریوں کا شکار کر رہا تھا۔ وہ شیشہ اور پلاسٹک کی چمکدار اور امریکن نیو گولڈ کی تابناک چیزیں ان میں بانٹ چکے تھے جو مجھے بعض بعض عورتوں اور بچوں کے ہاتھوں میں نظر آئیں اور جب انھوں نے آنکھیں چار کیں تو باوجودیکہ نہایت احتیاط کے ساتھ ان کے اندر بھیڑ بکری جیسی کیفیت پیدا کر کے چار کی تھیں مگر میں نے ان کی چمک میں امریکن سیاست کے دعوے ناچتے دیکھ ہی لئے۔ انھوں نے لٹکتے ہوئے شیر کو تو کچھ متعجب انداز سے نہ دیکھا مگر میرا خیر مقدم ضرور انہیں نامانوس سے طرز کے ساتھ کرنا پڑا۔ اور شاید میرے پہنچنے پر انہیں ان خانہ بدوشوں کے درمیان گفتگو کا کچھ رُخ بھی

بدلنا پڑا۔ اگرچہ ہم دونوں ایک دوسرے سے ان خانہ بدوشوں کی نسبت بہت زیادہ قریب تھے ان کے سر پہ سیاہ برج کی طرح دار ٹوپی تھی میرے سر پہ خاکی گابرڈین کا پگڑی دار ہیٹ! میں خاکی فلالین کا کوٹ اور ڈبل زین کی جودھ پوری برجس پہنے ہوئے تھا وہ سیاہ کوٹنگ کی عبادہ و قبائے زیب تن فرمائے ہوئے تھے۔ میرے پاؤں میں سانبھر کا انیکلیٹ بوٹ تھا۔ وہ کالے کروم کا شو پہنے ہوئے تھے۔ میرے گلے میں دوربین لٹک رہی تھی اور ان کے گلے میں سنہری صلیب، وہ سرخ سپید تھے اور میں بھی گورا چٹا، ان کے ہاتھ میں اسٹک چھڑی تھی اور میرے ہاتھ میں میگزین رائفل، وہ اپنے کیمپ سے چائے کے ساتھ مکھن توس کیک کھا کر چلے تھے اور میں انڈے کا حلوا اور روغنی ٹکیاں، غرض بیسویں صدی کی "نقل و عقل" کی دنیا میں ہم ایک دوسرے کے پورے محرم راز تھے لیکن پھر بھی ان سنگِ موسیٰ کے سیاہ فام چلتے پھرتے ستونوں کی دنیا میں وہ مجھ سے اور شاید میں ان سے ایک عجیب قسم کا اُچاٹ پن سا محسوس کر رہے تھے، جیسے ہم ایک دوسرے کے سامنے ننگے کھڑے ہو گئے تھے اور انداز سے کہہ رہے تھے کہ آپ کی ہماری ملاقات بنگلے پہ ہوتی یا سوئمنگ کے ہال میں، یا سینما میں، اور اور کہیں نہیں تو بدرجۂ مجبوری ریل کے ڈبہ میں ہی! اور میں تو خیر یہی سوچ رہا تھا کہ ہائی ولاسٹی رائفل تو میرے ہاتھ میں تھا اور شیر مار ان جنگلیوں کے برچھوں نے، یہی کیا کم تھا مگر اب یہ پادری صاحب کو تو نہ معلوم ہوتا کاش! اور شاید پادری صاحب یہ سوچ رہے تھے کہ ان خانہ بدوشوں کو یہ نہ معلوم ہوتا کہ پادری صاحب کے علاوہ ہمارے کوئی اور بھی پادری صاحب جیسے ہوا کرتے ہیں۔ اور میں زندہ مثال دولت کے درمیان کھڑا ہی ہوا تھا۔ اور میرا وجود پادری صاحب کے نزدیک خانہ بدوشوں کے اس پندار میں مخل ہو رہا تھا کہ پادری صاحب ان کا اور صرف ان کا مالِ غیر منقولہ قسم کی چیز ہیں اور کچھ اس قسم کی چیز کہ خیر شاید باپ تو پادری صاحب کے ہوا کرتے ہیں مگر بیٹا نہیں ہوا کرتا۔ اور سب کی حیرت ہے کہ پادری صاحب کے کلچرڈ جراثیم سے کئی پشت سے یہ خانہ بدوش اپنی فطرت بچائے ہوئے ہاتھ پاؤں بچائے موذی کوڑ جائے نظر آئے۔ اس نشہ پندار میں کہ وہ خواہ پادری صاحب کے ہوں یا نہ ہوں پادری صاحب صرف انہی کے ہیں۔ کچھ شیر مادر قسم کی چیز! اور اس وقت میرا وہاں پہنچنا کچھ ایسا ہوا، جیسے پڈنگ میں قورمہ ملا دیا جائے یا قورمہ میں ونیلا ایسنس!

میرا ورود ان کے سیاسی وعظ میں مخل ہوا اور میرے سلام پر انہیں میری جانب متوجہ ہونا پڑا۔ درمیان میں تعارف کرانے والا تو کوئی تھا ہی نہیں صورت سائل سوال تھی۔ میری وضع قطع پکار رہی تھی میں شکاری ہوں اور ان حضرت کی برزخ کہہ رہی تھی کہ ہم شکاری ہیں، اور دونوں اپنی اپنی شکارگاہ میں! اور انہوں نے نہایت ہی میٹھی اور نیچی آواز میں محبت بھرے تیوروں سے فرمایا:۔

"آپ شکاری ہیں، اور شاید یہاں کے کلچرڈ زمیندار؟ (CULTURED ZEMIDAR) ایں؟ یا کیا؟" اور انہوں نے مجھے ایک مخصوص پر تقدس انداز میں سلونے تیوروں سے سر سے پاؤں تک پرتالا۔ اور میں نے دل میں کہا کیوں نہ پہچانیں گے آپ مجھے پہلی نظر میں ع کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔ آپ بھی شکاری ہم بھی شکاری، آپ بھی کلچرڈ زمیندار ہم بھی کلچرڈ زمیندار!

"جی ہاں! جی ہاں" میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا "زمیندار، اور یہاں پر زراعتی فارم بھی ہیں، اور کبھی کبھی ادھر شکار کو چلا آتا ہوں، آج خوب ملاقات ہو گئی"

"ہوں —— وہ آں۔ جی ہاں، بڑی خوشی، بڑی خوشی" اور یہ کہتے ہوئے پادری صاحب نے اپنی عمر سے زیادہ لمبے تقدس اور شاید اس سے بھی زیادہ اپنی ڈاڑھی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے بجائے مصافحہ کرنے کے بزرگانہ شفقت کے ساتھ میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اور میں نے ذرا بھولے پن کے ساتھ کہا "ہوں وہ آپ کیا بتا رہے تھے انہیں؟ میں مخل تو نہیں ہوا؟"

"جی نہیں۔ آیئے نا۔ ہم انہیں کلچر کے ابتدائی اصول کی تعلیم دیتے ہیں" پادری صاحب کا یہ کلیسائی قسم کا جواب تھا جس کے لب و لہجہ سے میں نے

اندازہ کیا کہ اُردو بولنے پر نہایت اچھی طرح قادر ہیں اور آگے چل کر پتہ چلا کہ تمام ہندوستانی زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں بلکہ کل ایشیائی زبانوں میں خیل ہیں اور یہاں تک کہ ان خانہ بدوشوں کے مختلف قبائل کی زبان سمجھ سکتے ہیں اور بعض بعض خاص قبائل کی زبان بول بھی لیتے ہیں اور اس مخصوص قبیلہ میں جس کے اندر آج وہ بیٹھے ہوئے تھے اُردو زبان کی کارفرمائی میں بڑی حد تک انہیں کا ہاتھ تھا۔

اور ان کے جواب پر میں نے شرارت آمیز بھولے پن کے ساتھ کہا "یعنی مذہبی تعلیم، یہی مسیحیت کی تبلیغ؟"

"جی نا ہیں۔ ابھی مذہبی شعور قبول کرنے سے تو ان کے دماغ عاری ہیں۔ یوں سمجھئے کہ ابھی تک تو یہ آدمی سے دُور اور جانور سے قریب تھے اور ہم انہیں کلچر کی بہت ہی ابتدائی باتیں ان کی نفسیات کا لحاظ رکھتے ہوئے سکھا کر انہیں انسان کے قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر مذہبی شعور اور پھر مسیحیت جیسا اعلیٰ مذہبی شعور تو ان کے لئے ابھی بہت بعد کی بات ہے۔"

"لیکن تقریباً دو سال آپ کے مشن کو ہمارے ملک کے اندر ان کے ساتھ DEAL کرتے ہو گئے اور آپ نے خود بھی ہندوستان کے اندر تمام خانہ بدوش قبائل کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کیا ہوگا اور ہاں آپ کا مشن تو بین الاقوامی ہے اور آپ نے تمام دنیا کے خانہ بدوش قبائل کا نفسیاتی تجربہ کیا ہوگا اور آپ نے یہ اندازہ کر لیا ہوگا کہ ان کا رجحانِ طبع تمدن کے کون سے شعبہ کی جانب بآسانی موڑا جا سکتا ہے۔"

"جی مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میرے پاس میرا اپنا PRODUCE کیا ہوا لٹریچر نہیں ہے۔ دیکھئے انتظام کر دوں گا، آپ اسے پڑھ کر خوش ہوں گے یقیناً! میں نے ایشیا کے تمام خانہ بدوش قبائل پر تین تھیسس لکھے جس پر مجھ کو امریکہ کی تین مختلف یونیورسٹیوں نے ڈاکٹریٹ ایوارڈ کی۔ یوں تو ہر مقالہ جات میں نفسیاتی نقطۂ نظر سے ان کی زندگی کے ہر پہلو پر بحث کی ہے لیکن آپ کے اس خاص سوال کے جواب میں میں ہر جگہ اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کا رجحانِ طبع عسکریت کی جانب ہے اور دیکھئے نا، (ڈرے ہوئے شیر کی جانب اشارہ کر کے) اسے تو ہر عامی سمجھ سکتا ہے کہ ان کے ہر روزمرہ کے مشاغل میں اور اس میں یہ کتنے کامیاب ہیں اور کس قدر باضابطہ! یہ سب BORN SOLDIER ہوتے ہیں اور پیدائشی طور پر یہ سپاہی کی اعلیٰ اقدار سے مالا مال ہوتے ہیں جو بہت معمولی سی توجہ کے بعد سائنٹیفک راستہ پر لگ جاتی ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم میں CONSCRIPTION کے ذریعہ انہیں فیلڈ پر لے جایا گیا پھر بھی انہوں نے کارنمایاں دکھایا اور اس جنگ میں تو نہایت جوش کے ساتھ والنٹیر لئے گئے اور فوج کے ہر شعبہ میں بڑے کامیاب سپاہی ثابت ہوئے۔ بلا کے جفاکش، بہادر اور باضابطہ! لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی یہی صلاحیتیں بیکاری کے زمانہ میں بھٹک بھی جاتی ہیں اور یہ لوگ بڑے شہرہ پشت ڈاکو اور رہزن بھی بن جاتے ہیں اور انہیں امن واماں کے صحیح راستہ پر لگائے رکھنے کے لئے ہم ان کے اندر اپنا مشن جاری رکھتے ہیں۔ انیسویں صدی بھر تو ہم سے یہ لوگ بھڑکتے رہے کئی پادری ان کے درمیان تبلیغ کرتے ہوئے شہید ہو گئے اور ہم بمشکل پولیس کی مدد سے ان تک اپنا مشن لے کر پہنچ سکتے تھے اور اب تک ان میں بعض قبائل ایسے ہیں جو خانہ جنگی اور لوٹ مار کے راستہ پر پڑ گئے ہیں اور ہم اصلاح کے لئے اور پولیس احتساب کے لئے ان کے ساتھ سایہ کی طرح لگے لگے پھرتے ہیں اور ان میں سے زیادہ تر قبائل اصلاح ہو کر بدستور شکار اور گھاس کے سہارے پر ہیں اور تمدن کا ادنیٰ سا بھی اثر قبول کرنے سے ان کی آزاد فطرتیں اتنی جدوجہد کرتی ہیں کہ بس ہمیں پتھر میں جونک لگانی پڑتی ہے اور اس مخصوص ضمن میں ہم نے انہیں قطب شمالی سے قطب جنوبی تک یکساں عصبیت کا حامل پایا اور لطف یہ ہے کہ اس گریز و فرار کے سلسلہ میں ان کی ذہنیت میں تمام کرۂ ارض پر یکساں شکل کی مطابقت ہے۔ جیسے تمدن سے بغاوت۔ کا رشتہ ان کے اندر بین الاقوامی یکسانیت کا حامل ہے۔ اور یہ عجیب سی بات ہے، میرا ذاتی تجربہ ہے، ویسے ماہانہ اور پندرہ روزہ دوروں پر یہ ہمارا گرمجوشی سے استقبال کرتے ہیں۔ اب آپ دیکھئے نا خاصے مانوس ہیں، بچے اور عورتیں تک۔" اور یہ کہتے ہوئے پادری صاحب نے دو تین آبنوسی بچوں کے سروں پر اپنا ہاتھی دانت جیسا سفید ہاتھ پھیرا جو ان کی عبا قبا سے کھیل رہے تھے "اور یہ بات نہیں، یہ ہماری بات پر بھی کان دھرتے ہیں، ہمارے مشن نے ان کی زبان پر بھی

تھوڑی بہت مشق کر لی ہے اور انہیں بھی علاقائی زبانوں کا سمجھنا بولنا سکھا دیا ہے اب چونکہ یہ خاص قبیلہ اودھ فاریسٹ، روہیلکھنڈ اور کمایوں کے جنگلات میں گھومتا ہے لہٰذا عورت مرد سب اُردو زبان خوب سمجھ لیتے ہیں اور ان میں سے اکثر مرد اچھی خاصی بول لیتے ہیں اور یہاں پر ہی منحصر نہیں تمام ایشیا میں ہماری تبلیغ کے طفیل خانہ بدوش ان زبانوں سے آشنا ہو گئے ہیں جو اس HAUNT میں جس میں وہ چکر لگاتے رہتے ہیں، متمدن اقوام شہروں اور دیہات میں بولتی اور لکھتی پڑھتی ہیں۔ اور تمدن سے قریب تر لانے کا اولین و بہترین ذریعہ شناسائی دانست زبان ہے۔ شروع شروع میں ہمارے مشن کو ان کے اندر بڑی دقتیں پیش آئیں اور اب تو دیکھئے بے دھڑک ان میں اُردو بول رہا ہوں اور ان کی قدیم غیر آریائی زبان سمجھ رہا ہوں اور یہی رستہ انہیں تہذیب و تمدن کی بلندی پر لے جانے میں پہلی سیڑھی کا کام دے گا۔ ورنہ شروع شروع میں تو جان جوکھم کا کام تھا ان کے اندر تبلیغ کرنا اور اب تو کبھی کبھی ان کے ڈیروں میں ریڈیو لگا دیتے ہیں جب کوئی مطلب کا پروگرام ہو، ان میں سے اکثر قبائل کو اخلاقی اثرات سے ہم لوگ متاثر کر چکے ہیں اور جگہ جگہ اچھا خاصہ مذہبی رنگ بھی چڑھ گیا ہے اور جو بہت ہی پچھڑے ہوئے ہیں انہیں بھی کچھ نہ کچھ ٹرین کیا ہے ابھی شاید آپ نے اخبارات میں دیکھا ہو پچھلے مہینوں میں جزائر بورنیو سے نہایت ہی وحشی قسم کے بعض قبائل کو بلایا فرانٹ پر فنونِ جنگ کی ابتدائی تعلیم دے کر بھیجا گیا تو انہوں نے وہاں پر مکینیکل فورسز کے چھکے چھڑا دئے، ایسی بہادری سے لڑے کہ متمدن فوجیں انگشت بدنداں رہ گئیں، اور دشمنوں کے منہ پھیر دئے۔"

اور سہیل! تم جانتے ہو کہ میں یہاں نہ تو سیاسی مباحثہ کرنے آیا تھا اور نہ مذہبی مباحثے، پادری صاحب کے پورے لیکچر کو ہر پہلو سے چپکا بیٹھا سن رہا تھا۔ طبیعت شکار کے شدید EXITEMENT کے ردِ عمل میں کندی سی تھی، شاید تھوڑی دیر اور سنتا رہتا اور پھر رخصت ہو جاتا چپ چاپ مگر ان کے یہ آخیر جملے سُن کر میں جیسے جھنجھنا اُٹھا، اور کلیجہ منہ کو آ گیا اور میں تِل سا گیا! تم نے بھی اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ ابھی انگریز دیو زاد شاہی حکومت نے ملایا میں جنگِ آزادی لڑنے والی ترقی پسند فوجوں کے مقابلہ کے لئے بورنیو کے خانہ بدوش قبائل میں سے خاص طور پر ان وحشی قبیلوں میں CONSCRIPTION کیا جو آدم خور ہیں اور اپنے پرائے سب مُردے بے تکلف کھا جاتے ہیں اور انہیں جنگ کی ابتدائی تعلیم دے کر فرانٹ پر جا بھڑایا۔ اور بس ہتھیار تھما کر وہ ان وحشی فوجوں کی جملہ ضروریات سے بے نیاز ہو گئے۔ کپڑے کی انہیں ضرورت نہ تھی اور راشن کے لئے انہیں اپنی فوج سے لے کر دشمن کی فوج تک ہر لاش شکار ہی شکار تھی! ـــ اور اس پر میں تو ہیں چنگیز و ہلاکو بھی بھنّا اُٹھے۔ میں نے پادری صاحب کے منہ سے بات لے کر کہا "مگر کس کے دشمنوں کے؟" اور شاید میرا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

اور پادری صاحب نے میرے اس غیر متوقع سوال پہ ذرا چونک کر میری جانب دیکھا اور یہ اندازہ کر کے کہ میرے انداز سے یہ کہیں چونکنے نہ ہو جائیں اور پھر مجھ کو مزید گفتگو کا موقع نہ دیں اپنی بات خود نہایت او کھلے پن سے کاٹ دی اور چابک دستی کے ساتھ اڑا کہ ایک دوسرا سوال دے مارا "لیکن خود آپ کے ملک میں بھی تو بہت سے نیگرو ہیں اور کہیں کہیں آزاد NATIVES کے قبائل بھی، وہاں تو پھر کہنے ہی کیا ہوں گے ان کے ـــ! آپ نے انہیں سوسائٹی کی صفِ اول میں جگہ دے ہی دی ہوگی؟ ایں؟!"

اور پادری صاحب میرے پہلے ہی سوال پر بھڑکے ہوئے تھے اور اس میٹھے طنز بہ روغنِ قاز سے ملتے ہوئے سوال پر اُچھل سے پڑے، جیسے میں نے ان کی ناک کے اندر سے بال نوچ لیا، اور غالباً میری غیر متوقع ستم ظریفی اور تجاہلِ عارفانہ کے اس طنزیہ انداز پہ کچھ مشتبہ ہو کر میرا بشرہ بھانپا اور شاید کچھ پہچان کر ذرا سست سے ہو گئے اور فرمایا "وہ ـــ اوں ـ آں! ہم انہیں برابر متمدن بنانے میں کوشاں ہیں، اور کر رہا ہے وہاں بھی ہمارا مشن کام ـــ اور ہماری کوششوں میں تو کرۂ ارض پر کہیں بھی کوتاہی نہیں ......" اور انہوں نے مجھے پھر مشتبہ چڑی چڑی نظروں سے دیکھا مگر سہیل! میں جلا ہوا تھا بورنیو کی جدید ترین جبریہ بھرتی کی ہوئی فوج کی بھانت کے فخریہ اندازِ بیان پر! ایک زہر خند ہنسی کے ساتھ بول پڑا "جی ہاں! بھلا کیا کہنے آپ کی زرّیں انسانی خدمات کے! یہاں ہندوستان اور ایشیا میں تو آپ نے

اپنے دو صدی کے کارنامے اپنی گفتگو میں مجملاً بیان کر ہی دئے اور چھوڑئیے یہاں کی دونوں جنگوں کے سلسلوں میں اپنے مشن کی خدمات کی تشریح وہ تو خیر اظہر من الشمس ہیں اور خیر اس تازہ ترین بوئر نیو والے کارنامے کو بھی جانے دیجئے، میں تو آپ کے اپنے وطنِ مالوف کی خدمات کی تفاصیل پر کچھ روشنی چاہتا ہوں جہاں سے جناب کا یہ اصلاحی مشن بین الاقوامی اسکیم سے کہ دو سو سال بیشتر چلا ہے۔ قبلہ سچ بتائیے کیا وہاں پر نیگروز کے ساتھ آدمیوں جیسا سلوک ہوتا ہے یا بندروں جیسا؟ وہاں کے اصلی باشندے کیڑے مکوڑے سمجھ کر مسل دئے گئے یا کہیں آج ان کا مردم شماری میں وجود ہے؟" اور میں نے غور کیا کہ پادری صاحب بہت زیر و زبر ہو رہے ہیں اور مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں میدان چھوڑ نہ جائیں اور میں نے اپنے لہجہ کی طنزیہ تلخی کو سلونی مسکراہٹ میں تبدیل کرتے ہوئے اور لہجہ کو شیریں آواز میں پرو کر کہا

" صاحب امریکہ ہی پر کیا ہر جگہ جہاں کہیں متمدن اقوام کی سیادت ہے وہاں خانہ بدوشوں کے ساتھ ڈھٹائی سے قانون بنا بنا کر مذبحہ کے جانوروں سے بدتر سلوک کو آئینی شکل دی جاتی ہے۔ اب انہیں دو صدیوں کی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے جوں ہی یورپ سائنس کی ابتدائی صلاحیتوں سے آشنا ہوا سیدھا افریقہ پر تیندوے کی طرح جھپٹ پڑا اور غیر متمدن انسانوں کے ساتھ گھاس پھونس جیسا رویہ اختیار کر کے رسمِ غلامی کو شدید ترین شکل دی، اور کچھ افریقہ پر ہی منحصر نہیں، جیسا کہ ابھی آپ نے فرمایا کہ قطب شمالی سے قطب جنوبی تک اس بدنصیب مخلوق کا وجود کہاں نہیں ہے اور شاید ہر جگہ آپ کا مشن سایۂ رحمت بنا ہوا ساتھ ساتھ ہے۔ لیکن اس کے باوجود کیا عرض کروں یورپ کی نوآبادیاتی ذہنیت کا! آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں ان آدم زادوں کے حق میں آدم خور ثابت ہوئیں آپ کی متمدن اقوام! اور حضرت! میری گستاخی معاف آپ کے خالص مذہب اور تمدن کی جنم بھوم نے جس اعلیٰ انصاف اور عسکری اخلاق کا مظاہرہ بیسویں صدی کے وسط میں متمدن دنیا کے سامنے اپنی بیسنا کی حکومت اور عوام کے حق میں پیش کیا وہ تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہے"

"بالکل ٹھیک ہے بیٹا! مگر یہ بات ہمارے مشن کی نفی اور ہمارے خلوصِ نیت میں کون شبہ کر سکتا ہے" انھوں نے کنکھیوں سے میری جانب ایسے دیکھتے ہوئے کہا کہ میں عنقریب ان کی بغل میں گھونسہ مارنے والا ہوں۔

اور میں نے پھر ذرا ڈھیل دے کر قدرے رُخ سا بدلتے ہوئے کہا "لیکن ہوں حضرت! وہ آپ کا مشن تمام کرۂ ارض پر ان خانہ بدوشوں کی اصلاح میں مبتلا نظر آتا ہے مگر مشن بے چارہ بھی کیا کرے! آخر وہ بھی تو متمدن سوسائٹی ہی کا ایک منظم ادارہ ہے۔ یہ کچھ ان خانہ بدوشوں کی تنظیم تو ہے نہیں ———!" میں نے بجھ بیچ والے اپنائیت کے انداز میں کہا۔

لیکن سہیل! وہ تو واعظ تھے، اور سائنٹیفک واعظ! میرے ایک ایک لفظ کا دل ہی دل میں تجزیہ کرتے جا رہے تھے۔ نہ گھونٹ بھر پینے کو تیار تھے اور نہ اس جنگل کی تنہائی میں لگی لپٹی رکھنے کو۔ انہوں نے بات کا راہبانہ اور صلح کل سا پہلو لیتے ہوئے کہا "لیکن صاحب! جب ہم ان کی اصلاح کا بیڑا اٹھا کر اس کے لئے اپنی زندگی وقف کر چکے تو ہم خود کو انہیں میں سے ایک خیال کرتے ہیں اور یہی ساری دنیا سے امید کرتے ہیں کہ ہماری خدمات کے لحاظ سے ہمیں انہیں میں سے خیال کرے"

اور سہیل! بار بار لکھنا پڑتا ہے کہ میں یہاں شکار کھیلنے آیا تھا نہ کہ سیاسی بحثیں کرنے ——— اور وہ تو میں ان کی باتوں پر پھنک کر اور ان کے بھولے پن پر جل کر اُبل پڑا، اور تم ہی بتاؤ منطقی منافقت کا ڈھول کب تک بجتا۔ اور وہ تو میں شروع میں ہی بول پڑا تم میری عادت کو جانتے ہو مگر کچھ موڈ میں نہ تھا اور موڈ میں ہوتا بھی تو کیا، جی چاہ رہا تھا کہ کوئی شکاری دوست ملے تو آج اس پانچ ہزار سال پرانے شیر کے شکار پر دو باتیں کریں، برچھے کے زخموں پر تبصرہ ہو، شیر کے اُچھلنے کے زاویہ اور رُوما کے جوابی حملہ کا سائنٹیفک تجزیہ ہو۔ تمام راستہ غور کرتا آیا تھا کہ رُوما کے برچھے نے سامنے سے جست کرتے ہوئے شیر کا قلب چھید اتھا۔ اور دائیں بائیں کے دو خانہ بدوشوں کے برچھے اِدھر اُدھر سے دونوں شانوں میں گھس کر دونوں پھیپھڑے چیر گئے تھے اور شاید اندر رُوما کے برچھے کی نوک کے ساتھ مل گئے ہوں گے۔ بقیہ رُوما کے دوسرے ساتھی نے تقریباً رُوما کے ساتھ ہی ساتھ اپنا برچھا حلقوم سے پار کر دیا تھا اور داہنے بائیں والے

بقیہ دونوں نے پیٹ اور پچھلا حصہ کمر وغیرہ چھید کر جگر اور گردے وغیرہ پھاڑ دیئے تھے۔ نوجوان شیر تھا، تمام بال نرم اور چمکدار تھے اور عضلات واعصاب پورے بھراؤ پر تھے۔ کچلیاں نہایت نوکیلی اور چمکدار اور آنکھیں لگتی کر، خانہ بدوشوں نے چاروں شانے چت زمین پر چومیخا کر دیا۔ اب سہیل! تم ہی بتاؤ" اس مسئلہ پر بات چیت کرنا اس وقت خوشگوار معلوم ہوتی کہ یہ خشک، سیاسی بکواس میں پڑ گیا مگر میں کیا کروں وہ جتنے بھولے بنتے گئے اتنا ہی مجھے تاؤ آتا گیا۔ اور اصلاح، اصلاح سنتے سنتے میرے کان پک گئے تھے دوست کیا بتاؤں، میں نے کہا "مگر جناب وہ عیب تو بیان کیجئے جن کی اصلاح کے لئے آپ ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑے ہیں اور ان کی کتنی بستیاں اب تک آپ کہاں کہاں بسا چکے ہیں؟"

اور جیسے میرے سخت وار کو اپنی روئی کے گالے جیسی فطرت پر روک کر خالی سا دیتے ہوئے نہایت ہی رحم اور افسوس کے انداز میں اپنے چاروں طرف کھڑے ہوئے خانہ بدوشوں کی جانب میری توجہ مبذول کرتے ہوئے فرمایا "عیب! عیب و ثواب کی تخصیص تو ان آدمیوں کے درمیان ہو سکتی ہے جو نیکی بدی کی قوت تمیز رکھتے ہوں اور یہ غریب! چہ چہ چہ!! یہ تو اسقدر معصوم ہیں کہ غلط و صحیح کی تمیز سے ہی بے نیاز ہیں اور ان کے سامنے اچھا بُرا کیسا ہی راستہ نہیں ہے بس ہم تو انہیں نیکی کی تعلیم دے رہے ہیں"

"چہ خوش! تو گویا آپ انہیں صحیح راستہ دکھا رہے ہیں اور ماشاء اللہ ان کے ساتھ آپ کا خلوص اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ آپ خود کو انہیں میں سے بتاتے ہیں، اور شاید یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ کا سوچنے کا طریقہ بھی انہیں جیسا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم آپ کو مہذب دنیا کی بہترین ذہنی اقدار میں سے ایک خیال کرتے ہیں اور ادھر ان کے بہترین دوست بھی، لہٰذا ان کے ساتھ سب سے بڑی ہمدردی یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ آپ انہیں نیکی کی تعلیم دیں۔ مہذب دنیا کو ان کے ساتھ نیکی کرنے کی ترغیب کیوں نہ دیں اور شاید ان کے اور مہذب دنیا کے درمیان بہترین ثالث ثابت ہوں تو پھر ان کو صحیح راستہ دکھانے میں آپ کی کوششیں ایک اور ایک گیارہ بن جائیں، اور سب سے آسان کلچر کی تعلیم ان کی آبادکاری ہے"

"لیکن جب ہم ان کی اخلاقی اور تمدنی حالت سدھارنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو متمدن دنیا ان کے حقوق ان کے حوالے کرنے پر خود ہی مجبور ہو جائیگی" پادری صاحب کا مہمل سا جواب تھا اور میں نے خیال کیا کہ پادری صاحب مجھے بھی اتنا ہی بھولا سمجھ رہے ہیں جتنا خود بنتے ہیں اور جیسا ان جنگلیوں کو خیال کرتے ہیں میں نے ذرا جھرجھری لے کر کہا:

"قبلہ میری تلخ نوائی معاف! میں جناب سے دریافت کرتا ہوں کہ ان جنگلیوں کو چھوڑیئے امریکہ کا متمدن اقوام کے ساتھ دنیا کے اندر کیا رول رہا ہے جو ہم سمجھ لیں کہ تھوڑا سا کلچر پیدا ہونے کے بعد ان خانہ بدوشوں کے حقوق انہیں مل جائیں گے"

"مگر دیکھیئے یہ موضوع اس وقت زیر بحث نہ تھا کہ امریکہ اور دیگر ممالک کے کیا تعلقات ہیں۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس پر زبان کھولوں۔ لیکن آپ ہمیں امریکہ میں شامل کر کے بات کرتے ہیں تو ہم اس سے انکار بھی نہیں کر سکتے۔ دیکھیئے ہم مذہبی ہیں اور ہمیں کسی حکومت سے سروکار نہیں، اور نہ میں امریکن نظام حکومت کی بھٹی اور پراپیگنڈہ کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن شاید ہمیں سب کو ان عظیم احسانات کا اعتراف کرنا پڑے گا جو ہمارے موجودہ تمدن کی تعمیر کے سلسلہ میں امریکہ نے کل کرۂ ارض پر کئے ہیں، اور ان دو صدی کے معاشی اور سائنسی انقلابات سے ایجادات و اختراع کے ذریعہ انسانی ضروریات کی جو آسانیاں ہماری دنیا کو بہم پہنچائیں وہ محتاجِ بیان نہیں اور جارج واشنگٹن اور ابراہیم لنکن جیسے عظیم اور ہمدرد انسانیت مفکر دنیا کو امریکہ ہی نے دیئے جن کی تعلیم سے انسان نے آدمی کا درجہ پہچانا۔

اور اب میں نے نہایت ڈھٹائی سے تکلف بالائے طاق رکھ کر پادری صاحب سے آنکھیں چار کرتے ہوئے کہا "ممکن ہے کہ ابراہیم لنکن اور جارج واشنگٹن اور شاید کئی اور کی نیت میں خلوص رہا ہو اور ان کا عمل اپنے وقت پر ترقی پسند رہا ہو۔ اور ممکن ہے کہ اس سے ایک وقت خاص تک

آدمی کے حقوق آدمی کو قرار واقعی ملے ہوں۔ مگر موجودہ دور میں جو رول امریکہ دنیا کے ساتھ ادا کر رہا ہے وہ خالص شدید اور فسطائی ہے اور معاف فرمائیے قبلہ! آپ کا مشن بھی اسی نظام کا چلتا ہوا ایک پرزہ ہے اور امریکہ کی جملہ بین الاقوامی جدوجہد میں اپنے مخصوص پہلو سے ممد و معاون ہے۔"

اور پادری صاحب کے چہرے پر قوسی روشنیاں سی ٹمٹمانے بجھنے لگیں اور انہوں نے جلدی جلدی اِدھر اُدھر سے اپنی عبا قبا سمیٹی اور بار بار گھونٹ سے لئے اور بولے "چ چ چ! دیکھئے آپ مسلمان ہیں! اور کلام پاک کی تعلیم ہے" ظَنُّ الْمُؤْمِنِيْنَ خَيْرٌ" اور کسی کے متعلق بھی بغیر پرکھے ہوئے بُری رائے قائم کر لینا ہی اسلام کی تعلیم کے منافی ہے نہ کہ ایک اچھے کے متعلق، توبہ! توبہ!!"

"جی ہاں! مگر بیباک صداقت بھی تو مسلمان کی پہچان ہے، اور اس وقت میں اپنی خلقی صداقت سے کام لے کر عرض کر رہا ہوں کہ جانے دیجئے ساری دنیا کے اور امریکہ کے تعلقات کو، ذرا ان نیم وحشی اقوام ہی کو لیجئے جن میں ہم اس وقت بیٹھے ہوئے ہیں، شاید ان کی اصلاح آپ کے مشن کی اسکیم کا ایک اہم جز ہے جو آپ امریکہ سے بنا کر چلے ہیں اور چلتے وقت یہ بھی نظر ڈالی آپ نے کہ خود آپ کی قومی حکومت کا اپنے ہم وطن نیگروز اور ریڈ انڈینز کے ساتھ کیا سلوک ہے لہٰذا پہلے CHARITY BEGINS FROM HOME وہیں سے کام شروع کیا ہوتا، پہلے امریکہ اور اس کے حلیفوں سے آئینی طور پر ان کے جائز حقوق طلب کیجئے اور ان کی اصلاح خود بخود جنگلوں جنگلوں ہو جائے گی۔ قبلہ بغیر آپ کے تکلیف فرمائے ہوئے یہ آپ کے دوش بدوش نظر آئیں گے ورنہ ان کے اندر یہاں اصلاح کی کوشش کرنا اور انہیں ان کے حال پر ڈھیلا چھوڑ دینا جو جان بوجھ کر راہِ مستقیم چھوڑے چاہِ ضلالت کی تاریکی میں پھاند رہے ہیں آپ کے مشن کو انہیں کا ایک ایجنٹ سمجھنے کے لئے کافی سے زیادہ ثبوت ہے اور آپ ٹیکے بردیری ٹیکے بر فریب، قسم کی امریکن پالیسی کا آخر الذکر پہلو ہیں، معاف کیجئے قبلہ، آپ کی یہ نام نہاد مقدس تعلیم ڈالر کی جھنکار کا جدید ایڈیشن ہے جیسا کہ بات کرتے وقت امریکن پالیسی کی حمایت کرتے ہوئے آپ کے قول سے بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔"

پادری صاحب نے میری جانب ایسے عجیب سلونے تیوروں سے دیکھا جیسے بکرا دیکھتا ہے، پھر آنکھیں نیم وا کر کے اُوپر آسمان کی جانب منہ اُٹھایا اور پھر ذرا ہاتھ بلند کر کے شاید میرے حق میں خدا سے عقل و برکت نازل کرنے کی دُعا فرمائی اور پھر پُر تقدس انداز میں پھول سے جھڑتے ہوئے ہونٹوں سے فرمایا "افسوس! آپ ایک عظیم تہذیب کے پیرو ہوتے ہوئے ہماری دیہی اصلاحات کو سیاست اور پالیسی سے مطعون کر کے ہمارے مشن کو متہم کرتے ہیں، معبودا! رحم کر!"

"نہیں تو سُنئے تو! آپ کی دیہی اصلاح ان کے درمیان یہی ہے کہ آپ انہیں ذہنی اعتبار سے اتنا بلند کرنے کا بیڑا اُٹھا کر چلے ہیں کہ متمدن اقوام خود ہی ان کے حقوق ان کے حوالے کر دینے پر مجبور ہو جائیں تو بندہ نواز یہ کون سا طریقۂ کار ہے کہ آپ مظلوموں کی اصلاح کریں اور ظالموں کو ڈھیلا چھوڑ دیں جبکہ آپ طبقاتی لحاظ سے ان میں سے ایک ہیں آپ کی بات ان سے بہت پہلے ان کے کان میں پڑے گی اور آپ انہیں اخلاقیات کا احساس ان سے بہت آسانی کے ساتھ دلا کر ان کے حقوق ان کو دینے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ مگر اس کی وجہ! اس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم اصلاح کی آڑ میں آپ امریکن ڈالر کے لئے مزدور تیار کرتے ہیں اور تیسری جنگِ عظیم کی تیاری میں امریکہ کے حریفوں کی توپوں کے لئے چارہ! جیسا کہ ابھی آپ نے ان خانہ بدوش قبائل کے متعلق فرمایا کہ انہوں نے پچھلی دونوں جنگوں میں کارہائے نمایاں دکھلائے اور بورنیو کے آدم خوروں نے ملایا میں آپ کے دشمنوں کے چھکے چھڑا دئے۔ ورنہ قبلہ اصلاح کے محتاج آج ایشیا اور افریقہ کے جنگلوں سے زیادہ یورپ کے بڑے بڑے شہر ہیں جہاں SLUM AREA کی جانب جا کر دیکھئے تو گورے امریکن بچے اور بوڑھے بھوک سے مجبور ہو کر مرغیوں اور کتوں کی طرح وہ کوڑے کے ڈھیر کرید کرید کر منہ چلاتے نظر آئیں گے جو اونچے طبقہ کے محلوں سے پڑاؤ پر آ کر جمع ہوتا ہے۔ اور اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ہر تین سال میں اہل امریکہ اتنی شراب پی جاتے ہیں کہ اگر اس کو کسی نشیب میں جمع کیا جائے تو امریکن بیڑے کا ایک بڑا حصہ اس پر تیر جائے۔ چھوڑیئے اسے بھی، پچھلے الیکشن میں جب امریکہ کے نیگروز اور ریڈ انڈینز نے اپنا حقِ رائے دہندگی استعمال کرنے کی کوشش کی

تو انفیشل غنڈہ گردی نے LYNCHING کر کے انہیں محروم کر دیا۔ حضرت LYNCHING، تو آپ خوب سمجھتے ہوں گے قتل، آتشزدگی
لوٹ، آئینی طور پہ جائز کر کے نفاذ کرنے کو Lynching کہتے ہیں۔ اور قبلہ امریکہ کی ان دو رائٹ آنریبل جماعتوں سے بھی آپ خوب واقف ہوں گے
جن کے اسماء گرامی Tamany Hall اور KLU-KLUX-KLAN ہیں، سائنٹیفک غنڈے، باضابطہ سفید پوش تعلیم یافتہ،
بھرپور رقابو یافتہ۔ کیوں صاحب یہ بات غلط ہے کہ آپ کے ملک کی یہ دونوں طاقتور جماعتیں اسٹریٹ غنڈہ گردی، انفیشل غنڈہ گردی اور پولٹیکل غنڈہ گردی
کے منظم پلان کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ جن کے مارے عوام اور چھوٹے اہلکار بیچارے تو کس شمار قطار میں ہیں آپ کے پریذیڈنٹ تک کے پر جلتے ہیں
جناب آپ کی امریکن سوسائٹی ان جنگلیوں سے بہت زیادہ اصلاح کی محتاج ہے جس کے اسلحہ ساز کارخانوں کی بقاء حیات صرف مرنے اور مارنے ہی والے
آدمیوں پہ ہے۔ اور اس کے لئے اپنے بدترین نازی دشمنوں کو قید سے نکال نکال کر بحال کر رہے ہیں اور مشرق پر جنگ کے بادل امنڈ رہے ہیں! اور قبلہ!
ذرا امریکی ڈالر کی بے پناہ ہمت پہ توجہ دیجئے جو آج خزانے کے سانپ کی طرح ساری متمدن دنیا کے گرد کنڈلی مارے بیٹھا ہے اور آپ کے ہزار ہا سالہ کلچر کو
بھوک کی دیا کے نذر کئے دے رہا ہے" اور سہیل! میں ان کے چہرہ کا جائزہ لیتے ہوئے ٹھٹکتا چلا جا رہا تھا اور وہ دھوپ چھاؤں سے ہو رہے تھے۔
اور یہ اندازہ کر کے کہ گرگِ باراں دیدہ راہب پر اپنی تلخ نوائی سے غالب آ رہا ہوں، ایک پُر اطمینان گھونٹ سا لے کر پیشتر اس کے کہ وہ کچھ جواب دینے
پائیں، بولا "تو شاید آپ ان بچوں کو اسی کلچر کے لئے تیار کر رہے ہیں جس کے مکتبوں میں معصوم طالب علموں کو حروف ابجد ذہن نشین کرانے کے لئے مہلک ہتھیاروں
کی تصویروں اور جنگی اصطلاحوں سے کام لے کر ان کی گھٹی میں عسکریت کے نام پر امن شکنی اور جنگ پسندی ڈالی جاتی ہے۔ آج آپ کی تبلیغ کا اس سے
بہت بہتر میدان کوریا کا محاذ ہے جہاں امریکن کارخانوں کے دلال اپنے ہتھیار بجانے والے مزدور کو دس ہزار ڈالر پیشگی کرایہ دے کر اپنی تجارت کی
بقاء حیات کے لئے مرنے کو لے جاتے ہیں۔ اور شاید اس سے بھی زیادہ جناب کی اصلاحی چارہ گری کے محتاج وہ تو ندوں کے چند غار ہیں جن کے اندر ڈالر
کے خمیر سے جو دالارض کے جراثیم کلچر ہوتے ہیں" اور میں اک ذرا ٹھہرا تھا کہ پادری صاحب جلدی جلدی تھوک نگل کر مجھے نیم کلیسائی قسم کا جواب دینے کو
تیار ہو گئے اور خد و خال میں نہایت ہی نرم اور صلح کل کیفیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا "خیر یہ سب کچھ، مگر ہم تو بائیبل کا مقدس درس اور مسیح کا پاک
پیغام ان کے کانوں تک پہنچاتے ہیں اور اس کے لئے انہیں کلچر کی ابتدائی چیزوں سے آشنا کرنا ضروری سمجھتے ہیں"

"مجھے بار بار کہنا پڑتا ہے قبلہ امریکن طرز زندگی و سیاست آج نوعِ بشر کی روحانی کوڑھ بن چکا ہے اور فسق و فجور، ظلم و جور کی دوزخ جیسی زندگی دنیا
میں بھڑکا رہا ہے اور اس سے زیادہ امریکی مکتب خیال کی لعنت آپ کے نئے اور پرانے دونوں عہدناموں کو مطعون کر رہی ہے اور آنجناب خانہ بدوشوں میں مذہبی
خدمت انجام دے رہے ہیں اور وہاں آپ کے ہم وطن و ہم مذہب، مسیح پاک کے جنازہ کو توپ پر رکھ کر تشہیر کر رہے ہیں۔ آپ یہاں جنگل میں تہذیب و تمدن
کا دیا ٹمٹماتے پھرتے ہیں اور وہاں ابراہیم لنکن اور جارج واشنگٹن کی لاشیں اندھیرے بازاروں میں گھسیٹی جا رہی ہیں۔ معاف فرمائیے قبلہ خود را فضیحت، دیگراں را
نصیحت، ان تاریک خیموں کا پیچھا چھوڑئیے اور امریکہ کے جگمگاتے شہروں کو پکڑیئے جو ان سے بہت پیچھے ہٹ گئے۔

اور سہیل! تم جانتے ہو کہ ملّا ہمیشہ داخلی احساسِ برتری کے نشے میں چور رہتا ہے اور پھر پڑھا لکھا سائنٹیفک ملّا تو پورا اعلم الملکوت ہوتا ہے، پادری صاحب
کے کان میں شاید اتنی ثقلِ سماعت آوازیں عمر میں پہلی مرتبہ جنگل کے اندر پڑی تھیں اور انہوں نے پھر ایک خانقاہی بیٹھک ماری، بہت ہی ٹھنڈے اور مختتم انداز میں گویا پیری
ساری گفتگو کا توڑ کرتے ہوئے اپنے مشن کی پرانی تاریخ کے ایک آدھ صفحہ کی ٹیک لے کر فرمایا "جس آزاد خیال سوسائٹی اور جس ایماندار ادارہ نے INDIA IN
BONDAGE کا مصنف ڈاکٹر سنڈرلینڈ جیسا نیک اور صادق مصنف اور REU TEMPLEN جیسا حق گو واعظ دیا اسے آپ یوں مطعون کرتے ہیں۔

"اور یہی تو میں کہتا ہوں حضرت پھر آگے کیا ہوا، ہر دو حق پسند امریکن مشن اور امریکن حکومت دونوں کے موردِ عتاب ہوئے اور شاید چرچ سے

خارج ہوئے اور امریکہ واپس جانے پر مجبور، کیونکہ ان کا وجود ہندوستان کے اندر برٹش سامراج کے حق میں مضر تھا۔ بس ایسی ہی مثالوں سے تو ہم نے آپ کے دیسی مشن کو پہچانا ہے جناب!"

واعظ کی شانِ جمالی اور شانِ جلالی میں کشتی ہونے لگی۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ایک لمبی سانس لے کر بار بار ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا مگر خیریت گذری کہ پھر جمالی رنگ جم گیا۔ انہوں نے ماحول کو پڑتال کر اور شاید یہ اطمینان کر کے کہ ہماری گفتگو نہایت مقدس اور مہذب قسم کی زبان میں ہو رہی ہے اور خانہ بدوش باوجود ہمہ تن توجہ ہونے کے بھی کچھ نہیں سمجھ رہے ہیں اک ذرا اطمینان کا سانس لیا اور مجھ سے علیحدہ ہو کر خدا سے ہم کلام ہوئے ذرا بھرّائی بھرّائی سی آواز میں فرمایا "خداوندا برکت دے اور رحمت نازل کر گمراہوں پر اور روشنی عطا فرما کھلی آنکھوں والے کور دلوں کو —" اور پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوتے اپنے انتہائی پُر تقدس بشرہ سے فرمایا "بیٹا! دیکھئے آپ عقلمند اور تعلیم یافتہ ہیں خدا کے واسطے بات کو فلسفہ کی حدود سے باہر نہ جانے دیجئے۔ آپ امریکہ کو فسطائی بتائیں یا فیوڈل یا کچھ، لیکن تذکرہ تھا ہمارے مشن اور ان آزاد قبائل کے درمیان ہماری خلوص و عدم خلوص نیت کا۔ اس پر ایمانداری کے ساتھ سوچئے۔ میں نے مانا امریکہ اور یورپ بڑی زبردست اخلاقی اصلاح کے محتاج ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی کب ہوئے کہ یہ خانہ بدوش اصلاح کے محتاج نہیں۔ لہٰذا جہاں تک ہمارے اس فعل کا تعلق ہے آپ اسے قابلِ قدر سمجھئے"

"میں ابھی عرض کر چکا ان کی اصلاح میں خلوصِ نیت سے زیادہ امریکہ کے لئے نئے جنگ کے میدان اور سپاہی فراہم کرنا مدِ نظر معلوم ہوتے ہیں اور آپ کا طریقۂ کار میرے اس دعوے کا ثبوت اپنے اندر مضمر رکھتا ہے۔ میں مختلف پہلوؤں سے آپ کو اس کا جواب دے چکا۔ آپ امریکن سیاست اور طرزِ زندگی کو اصلاح سے بے نیاز خیال کرتے ہیں یا اسے یوں ہی آزاد چھوڑے ہوئے ہیں اور ان قبائل میں اصلاح کرتے پھرتے ہیں تو صاف ظاہر ہے کہ ان کے لئے ان کے ذریعہ مواد پیدا کرتے ہیں ورنہ ان کا کون سا جھگڑا کس حکومت سے اٹکا ہوا ہے؟ اپنی شہنشاہی اغراض کے لئے انہیں ROBUTS کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ سستے بھاؤ پر حاصل کرنے کے لئے آپ انہیں کلچر اور مذہب کی آڑ سے بہکاتے ہیں اور یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے پس ماندہ سوسائٹی کی قیادت کر کے شہنشاہی سیادت کو تقویت پہنچانا ہر دور میں کلیسا کا رول رہا ہے"

اور پھر! اب کی مرتبہ انہوں نے خضوع و خشوع کے ساتھ آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا کر تو بہ کھینچی اور شاید رحم، محبت، انصاف وغیرہ کے الفاظ زیرِ لب ادا کئے اور پھر بڑبڑائے "کوئی نئی بات نہیں صحائف انبیاء اور آسمانی کتب شاہد ہیں کہ انبیائے کرام کو جادوگر کا لقب دیا گیا، پاک مریم کو متہم کیا گیا اور معصوم مسیح کو تختۂ دار پہ لٹکایا گیا۔ آسمانی باپ! بصارت و بصیرت دے ان کور دلوں کو جو تیرے مقدس پیغام اور تیرے بیٹے کے پاک عمل کی تبلیغ کرنے والوں کا صحیح مقام نہیں دیکھ سکتے"

اور اب کی مرتبہ سہیل میں پھنک سا گیا ان کے اس بہروپیہ پن پر اور میں نے ذرا بھکڑپن سے کہا "جی ہاں! جی ہاں! اور یہ بھی دعا مانگئے کہ تیرے نام پر جو ظالموں کے ایجنٹ بنیں ان کی فوجی طاقت بڑھانے کے لئے جنگلوں جنگلوں مارے مارے پھریں انہیں بھی، تیرے نام پر جو لٹیروں کی تھیلیاں بھرنے اور کمزوروں کی جیبیں کترنے کا انتظام کریں انہیں بھی......." اور میں شاید کچھ اور بولتا کہ انہوں نے آمین کہنے سے پیشتر میرے منہ سے نہایت ہی ملونے انداز میں بات لے لی اور بولے "میاں نوجوان ہو، وقت اور خون کا تقاضا ہے۔ اب یہ سب باتیں سچ بتائیے کہ آپ کے دل کی آواز ہیں، یا صرف سخن پروری.....؟"

میں نے کہا "قبلہ! نہ میرے دل کی آواز ہیں نہ سخن پروری، یہ زندہ حقیقت ہیں کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ آپ کا BOARD OF —— FOREIGN MISSIONS IN AMERICA آپ کو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے سائے سے ہر ملک میں امریکن سفارت خانہ سے ہدایات لے کر کام کرنے کے حکم دے کر

بھیجتا ہے۔ اور ہر ملک کے سیاسی و سماجی ماحول کے مطابق امریکی سفارت خانہ اپنے مفاد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ کو طریقہ کار کی OUT LINE دیتا
ہے۔ چنانچہ چین میں آپ کی پانچویں کالم والی سرگرمیوں کا پول کھل گیا۔ اور اب ہندوستان کے اندر بھی آپ دم توڑتی انگریزی سیادت کے ختم ہوتے ہی
TO SLIP INTO OTHERS SHOES کے مصداق نہایت آہستہ سے امریکی خواجگی قائم کرنا چاہتے ہیں اور فرقہ پرست جماعتوں کو شہ دے کر امریکی سرمایہ
کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں اور ہندوستان کے طول و عرض میں کہیں پر تیسری جنگِ عظیم کے اڈے کی ٹوہ میں ہیں اور قبلہ ہندوستان ہی کیا تمام ایشیائی ممالک میں آپ
امریکن و برطانوی بساطِ سیاست کا مہرہ بنے ہوئے ہیں اور عوامی جمہوریتوں کے مقابلہ پر دنیا کی تمام فسطائی حکومتوں کی وکالت کا کام انجام دیتے ہیں۔ اور یہ ہے
جناب کا شکار جو مسیحیت کی پاک تبلیغ کے نام پر کھیل رہے ہیں اور امن کے نام پر فساد کی تخم ریزی کرتے ہیں"

اور سہیل! دونوں جانب معاملہ نہایت سُرخی اختیار کر گیا تھا، میری زبان ولایتی مقراض کی طرح چل رہی تھی اور شاید آج کے شکار کی جھونٹ اتار رہی تھی
ادھر بھی کلیسائی جوالا مکھی میں لاوا بڑے زور سے پک رہا تھا۔ سب خانہ بدوش کھڑے ہمہ تن توجہ تھے اور بعض ہوشیار و ذہین آدمی ہماری گفتگو کا مفہوم سمجھ گئے
اور غالباً یہ تو سبھی سمجھ گئے تھے کہ پادری صاحب جو کچھ کہا کرتے ہیں اس میں بھی قیل و قال کی گنجائش ہے۔ اور شاید پادری صاحب کچھ اور بدتر از گناہ قسم
کی چیز کہنے والے تھے کہ آج کا نوجوان شکاری ہیرو روما بول پڑا "مگر دیکھیے تو اب تو ہمارے دیس میں گوروں کی حکومت نہیں پھر آپ پادری صاحب کی نیت
کو کیوں خراب بناتے ہیں؟" اور یہ کہتے ہوئے اس نے میری جانب اسپورٹس مین یا اسپورٹس مین والے اپنائیت کے انداز میں دیکھا اور میں نے اندازہ کیا کہ
وہ اپنی ذہانت سے اتنا ضرور سمجھا کہ میں پادری صاحب کو امریکی حکومت کا دلّال بتا رہا ہوں اور وہ یہ بھی سمجھ گئے کہ ہمارے بھائی بند ساری دنیا میں گورے کالے
پھیلے ہوئے ہیں اور بندھیا چل اور ہمالیہ کے درمیان منحصر نہیں ہیں اور میں نے اس کی فکر و استعداد کے مطابق جواب دیا "اور اب ہمارے حاکم تو پہلے والے
گوروں سے بھی زیادہ گورے ہو گئے ہیں، اور پرانے گورے نئے گوروں کے کندھوں پر دھر دھر کر بندوق چھوڑتے ہیں اور جب پادری صاحب کا ملک اپنے
دشمنوں سے لڑنے کو میدان ہمارے ملک میں بنائے گا تو ہمیں ساتھ لڑنا پڑے گا"

"کیوں؟ ہمارا ملک پہلے تو میدان بناتے ہی کیوں دے گا؟"

"اسی بات پر قرض جو کھائے پڑا ہے۔ ابھی پچھلے سال امریکہ نے گیہوں قرض دیا تو پیٹ بھرا ورنہ سارا ملک بھوکوں مر جاتا۔ اب جب اس نے چلایا ہے
تو جہاں چاہے گا لڑائے گا" اور شاید شکاری نوجوان جو گھاس کے قطعہ پر ایسی نگاہیں ڈالتا تھا جیسے ایک کسان اپنی تیار فصل پر گیہوں کی کمی اور امریکہ کی امداد کو
نہ سمجھ سکا اور نہ پھر اس مجبوری میں میدانِ جنگ کے جائے وقوع کو، مگر ایک اور بوڑھے خانہ بدوش نے کہا "بالکل ٹھیک ہے صاحب! وہ جو کوئی بھی اُدھار
کھلاتا ہے کرائی ان کہی سب کرا لیتا ہے" اور پھر روما سے مخاطب ہو کر کہا "تمہارے یہاں جاڑوں میں خس کا ٹھیکیدار کپڑا، تھوڑا بہت غلہ اور لوہا بانٹ
جاتا ہے اور جس کو پیسہ کی ضرورت ہو اس کو پیسہ دے جاتا ہے اور پھر گرمیوں میں تم سے من مانے بھاؤ پر خس لے جاتا ہے اور اسٹیشن تک لدان کے لئے
ساتھ پکڑتا ہے" اس نے تو اپنی غیر آریائی زبان کے ساتھ اردو ملا کر میرا لحاظ کرتے ہوئے روما کو یہ بات سمجھائی اور میرے دماغ میں بجلی سی کوند گئی خس کی
فروخت کے طریقہ پر! یعنی ڈالر کے پنجہ سے یہ دُور افتادہ گم نام بیابان جنگل بھی محفوظ نہیں جو اس وقت پکی سڑک اور ریلوے لائن سے پچیس پچیس میل کے
فاصلہ پر ہیں۔ خیر میں نے دل میں خیال کیا کہ وہ خس کا معاشی ٹھیکہ دار تو سال میں ایک دو مرتبہ ان کے اندر آتا ہے اور یہ پادری صاحب کی شکل میں امریکہ کے
ڈالر کی توپ کا پھینکا ہوا گولا تو ہر پندرھویں روز ان کے درمیان گرتا ہے۔ ذرا دیر خاموشی رہی اور پادری صاحب نے آنکھیں بند کر کے رخصتی دعا کی "الٰہی!
گمراہوں کے دل پر شیطان اپنی مہر لگاتا ہے، اور وہ بد کو نیک اور نیک کو بد سمجھتے ہیں۔ بصیرت اور برکت! آسمانی باپ! رحم و محبت!" اور سہیل ان کی آواز
ایسے گونج رہی تھی جیسے "محل" نامی فلم میں سینما کے ہال کے اندر ٹریجڈی کو کامیڈی بنانے کے لئے کہانی کے ہیرو کی مرنے کے بعد پھر زندہ ہو کر بھرائی بھرائی سی

روحانی آواز گونجتی ہے، اور کچھ اپنی ہیئت کذائی میں وہ کھڑے ہوئے تھے۔ دعا کے اختتام پر انہوں نے "آمین" کہا اور میں نے ان سے زیادہ بلند آواز میں تائید کی اور وہ اپنی جیب کی جانب لپکے۔ اور سہیل تم نے اخیر سیزن کے شکار میں کبھی کبھی ان مرغابیوں کو جو مائیگریٹ کرکے واپس جانے والی ہوتی ہیں اور ان کے ڈاؤن کے نیچے چربی کی دبیز تہہ پیدا ہو جاتی ہے تیر کھا کر زخمی اڑتے ہوئے دیکھا ہوگا، تیاتی، کٹتی، فضا میں تلتی گرتی پڑتی جاتی ہیں، یا کبھی HAWKING میں وہ سین یاد کرو جب شکرا مالک کے انگوٹھے سے شکار پر اڑ کر اور اپنی جھپٹ میں ناکامیاب ہو کر کھسیانا کھسیانا ترچھے ترچھے پر چلاتا منہ کی کھائے مالک کی جانب پلٹتا ہے بس ایسے ہی کچھ پادری صاحب بڑھے، ایک پاؤں کہیں پڑ رہا ہے دوسرا کہیں، عبا و قبا کے طرے پورب کو اڑ رہے ہیں اور دستار فضیلت کے پچھم کو! غرض کچھ ع آگے آگے بے خودی تھی پیچھے پیچھے ہوش تھا! کچھ دُوڑ بڑھ کر اپنی جیپ بڑھا گئے۔

اور اب میں نے خانہ بدوشوں کے ساتھ اس ماحول کو پرتالا تو اندازہ کیا کہ ان کے درمیان میں ہی میں ہوں، میرا خیال تھا کہ وہ پادری صاحب کی شکست سے کچھ زیادہ خوش نہ ہوں گے۔ مگر ان کی نظریں دیکھ کر میں ان کے درمیان جم کر بے تکلفی کے ساتھ بیٹھ گیا اور مجھے کچھ ایسا اندازہ ہوا کہ ان لوگوں کی نگاہیں میرے اوپر کچھ ایسی پڑ رہی ہیں جیسی میری ان پر اس وقت پڑی ہوں گی جب انہوں نے برچھے سے شیر کو مارا تھا۔ وہ الاؤ کے لئے بڑے اہتمام سے لکڑیاں جمع کر چکے تھے اور ناچ گانے کی تیاری کر رہے تھے اور مجھ کو اپنی محفل میں شرکت کے لئے بڑے اصرار کے ساتھ روک رہے تھے۔ سورج غروب ہوتے ہوتے تیاریاں مکمل ہو گئیں اور تقریباً سب میرے گرد مجھ کو "میر مجلس" سا بنا کر جمع ہو گئے اور میں نے ان کے رویہ سے اندازہ کر لیا کہ جس طرح آج رزم میں میں ان کا لوہا مان گیا اسی طرح بزم میں یہ میرے سامنے زانوئے ادب تہہ کر رہے ہیں۔ اور اس وقت وہ ایک سمجھدار ساتھی والی نظروں سے صبح کی بیگانہ وار نگاہوں کی تلافی کر رہے تھے جیسے ان کے درمیان اس وقت میرا وجود کوئی نئی چیز شاید نیک فال ہے، نیا ہتھیار! اور مجھے ان کے بشروں سے اندازہ ہوا کہ ان کے اندر میری فتح اور پادری صاحب کی شکست کے اطمینان و بے اطمینانی کے درمیان کشتی سی ہو رہی ہے، جیسے وہ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں مگر اپنے مفہوم کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں قاصر سے ہیں۔ اور میں نے ان میں سے بعض کا انداز مائل بہ تکلم دیکھ کر ان سے خود ہی کہا "سمجھے تم پادری صاحب کی کچھ حقیقت؟"

اور روما نے کہا "ہاں کچھ سمجھے کچھ نہیں سمجھے مگر آپ یہ کہتے ہیں کہ پادری صاحب ہمارا سدھار نہیں کر رہے ہیں تو پھر کون کر رہا ہے۔ کیا آپ ہمارا سدھار کریں گے؟" اور ہوا سہیل یہ خانہ بدوش کے اندر والا آدمی بولا، اور اس کے لہجہ اور انداز میں مجھے انقلاب کی تڑپ نظر آئی۔ قانع قطعی ہونے کے بعد بھی اصلاح کی بھوک اور تمدن کی التجا! مشین کی حسرت! اور میں نے کہا "ہاں! اب بہت جلد وقت آ رہا ہے کہ ہم تمہارا سدھار کریں گے، تمہارے پاس بولی ہے، ہم تمہیں پڑھنا لکھنا سکھائیں گے! تمہارے پاس طاقت ہے ہم تمہیں طاقت کا صحیح مصرف سکھائیں گے! اور تمہاری یہ سب سے بڑی مصیبت جنگلوں جنگلوں لدے پھرنا ہے اور ہم تمہارے شہر بسائیں گے، گاؤں آباد کریں گے۔ اور تمہیں اپنے جیسا "صاحب" بنائیں گے اور ایسے ہی کپڑے پہن کر رائفل سے شکار کھیلنا سکھائیں گے"۔ اور ان میں سے چند تڑپ کر بولے "ہوں رائفل! مگر پہلے اس کا دھما کا بند کیجئے اس سے ہمارا برچھا اچھا ہے" اور میں ہنس پڑا اور روما بھی اور سب نوجوان۔ اور میں نے ان کے چہروں پر نگاہ کی تو ممنون احسان نگاہیں اپنے اوپر جمی پائیں! مجھے از سر تا پا بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے ان کے انداز اور بشروں میں میری جانب سے ایک پیارا پیارا سلونا پن تھا، جیسے میں نے انہیں محلوں کا خواب دکھایا ہے، اور جب میں نے دیکھا کہ ان میں سے اکثر کچھ دل خوش کن باتیں کہنا اور سننا چاہتے ہیں تو میں نے شکار کے ہیرو روما سے مخاطب ہو کر کہا "کیوں دوست روما! تم پسند کرو گے ہماری طرح موٹر میں بیٹھ کر پہیہ گھماتے ہوئے بازار جانا؟"

اور جیسے وہ سب بول پڑے اور روما نے جو کچھ کہا اس کی ہر ایک نے نظروں سے تائید کی مسکرا مسکرا کر اثبات میں سر ہلا ہلا کر، اور روما نے کہا "آپ سمجھتے ہوں گے کہ ہماری بڑی اچھی کٹ رہی ہے یہاں جنگلوں میں لدے لدے خاک چھانتے، ہم کو تو پھونس کا جھونپڑا اور دو بیل بھی نصیب نہیں! کیا ہم نہیں

جانتے کہ جھونپڑوں اور محلوں میں کیا ہوتا ہے ...." اور اس کے منہ سے بات لے کر ایک بڈھے نے کہا "آپ شکار کھیلیں راجہ جی، آپ ہمیں کیا دے دیں گے جب سو برس سے پادری صاحب بسوہ بھر زمین نہ دلا سکے" اوہ! میں تڑپ سا گیا اس کے شکوہ پر سہیل! زمین کی حسرت کتنی شدید ہے اس "ابن الارض" کے دل میں! میں نے اندازہ کیا اور کہا "واہ! وہ کیسے دے دیتے آپ کو کوئی چیز! وہ تو اپنے مطلب کے لئے تم میں سے لڑا کر سپاہی بنانے کو آیا کرتے تھے، اور اب تم کو کوئی نہ دے گا تو وقت دے گا اور تم کو تمہارا اگلا پچھلا سب ملے گا" میں نے کہا اور پھر ان کی محفل میں جم گیا۔ شام کی چاء بھی کیمپ سے تقریباً لگ کر وہیں پہنچی۔

اور سہیل پیارے تم آؤ! اور ہم تم ساتھ ساتھ ان کے اندر چلیں لیکن بھیا دیکھو جھم بہت کڑی ہے! اس میں تاریخ کی روایاتی عادت بدلتی ہے اور بدلنے سے پیشتر ہمیں تاریخ دیکھتی ہے اور تاریخی تحقیقات میں مورخ کبھی ٹیلے کریدتا ہے اور کبھی سنسان کھنڈر ڈھاتا ہے اور کبھی اہرام مصر اور مینار بابل ٹٹول کر عقلی گتے لگاتا ہے اور اپنی نامعلوم مدت کا پیمانہ قبل مسیح قائم کرتا ہے لیکن آؤ دیکھو یہ ہے تاریخ آدم کی ابجد! اور ارتقاء کی کتاب کا پہلا صفحہ، انہیں دو گز کے خیموں تلے تخلِ تمدن کی سب بالیدگیاں اور ارتقائے آدم کی تمام بلندیاں پلی ہیں۔ وہ منزلِ مقصود جہاں سے نکل کر اور جہاں پہنچنے کے لئے آدم نے جنت سے نکلتے ہی اپنی تقدیر کا پہیہ گھمایا تھا۔ بابا آدم کا پہیہ جو شکاری سے گردش کر کے گلہ بان تک اور گلہ بان سے آقا و غلام تک پہنچا۔ اور پھر جاگیر اور کاشتکار کی منازل سے گذر کر آج سرمایہ دار اور مزدور کے چکر میں گردش کر رہا ہے۔ بس ایک اکھیڑ کا محتاج ہے اور اک ذرا سے گھماؤ میں جب اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچے گا تو ارتقائے آدم کی منتہائے منزل یہی خیمے ہوں گے جہاں سے معصوم آدم نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اور آؤ سہیل دیکھو انسانی آبشار کا مخرج اور مدخل یہی خیمے ہیں جنہیں آج تک جھونپڑی بننا بھی نصیب نہیں ہوا۔ اور بڑے بڑے خارستانوں اور لق و دق ریگ زاروں سے گذر کر ہمارے تمدن کا متحرک محل انہیں خیموں کی جانب رواں دواں ہے جن کے اندر زندگی کے تمام ریگستان شاداب ہیں، اور ہر خار زار گل نار! اور جہاں تلخ حیات کا مزہ شہد جیسا شیریں ہے اور دودھ جیسا سفید! اور آتما کی جوت بھرپور اٹھان کے ساتھ جلتی ہے اور جیون کی پرکاش ٹیوب لائٹ راڈ کی طرح جھل جھل کر چمکتی ہے۔ سہیل پیارے بس تمہارے ساتھ کی دیر ہے مشین کی سب گردشیں لے کر آؤ، فلسفہ اور آرٹ کے کل اسکول ساتھ لاؤ اور تہذیب و تمدن کی کل بلندیاں سمیٹ سماٹ ان خیموں میں سمو دو! اور سمو کر روحانی اقدار کی فردوسیں کرنوں سے اپنا دامن بھر لو.......

اور آؤ سہیل ان سے پاک تبادلہ کریں، انہیں اپنا سب کچھ دے کر عالمگیر امن، ہمہ گیر تندرستی، جہانگیر محبت اور حقیقی امداد باہمی وہ سب کچھ لے لیں جس کی تلاش میں ایک مرتبہ کھو کر جنت کے لئے روحِ آدم بے قرار ہے۔

اور آؤ پیشتر اس کے کہ تمدن و تہذیب کے جاگیرداروں کے انگوٹھوں سے اڑے ہوئے شکرے جھپٹنے پائیں ہم تم پر سے پر ملائے ساتوں آسمانوں کی بلندیوں پر محیط ہو کر کائنات کو اپنے شہپر کی جولانگاہ بنا لیں۔ اور سہیل نرم نرم گدوں پر بیٹھ کر تو ان شکاریوں کے کارناموں کو پڑھتے ہی ہو جو دنیا کے گرد گرد گھیرا ڈال کر بڑے زور سے انسانی ہانکا کر رہے ہیں لیکن اگر تم یہاں آجاؤ تو اندازہ کرو کہ ان کا صد سالہ جال اس جنگلی سوسائٹی میں سب سے کم کامیاب ہے اور آج تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ پادری صاحب میرے مقابلہ پر اسے کندھے پر رکھ کر چلتے بنے۔

تم بھی کہو گے عجیب بے تکا آدمی ہے، میں شکاری کہانی طلب کر رہا ہوں اور یہ مجھے اپنے ساتھ پر سے پر ملا کر دعوتِ پرواز دے رہا ہے، مگر بھیا تم ہی غور کرو کہ اب آج شکاری کہانی لکھنے کا وقت ہے یا شکار کھیلنے کا! شروع میں تو جنگل کی رات بھنبھناتی رہی یا رات میں جنگل بھائیں بھائیں کرتا رہا اور اسی میں پادری صاحب کے مکالمہ کی آواز صدا بصحرا سی کانوں میں گونجتی رہی، اور پھر اس کے بعد آج تک وحشیوں کے نغمہ کی شیریں آواز جل ترنگ سی بجا رہی ہے میرے اندر! جیسے بہت سے پہاڑی چشموں کا ایک میٹھا نغمہ تسلسل و تواتر کے ساتھ شعور میں گونج رہا ہے! اور یہ تو کل ہی کی داستان ہے اور سمجھ میں نہیں آتا دوست ان کی کون سی مہم کو ترجیح دوں! کل کے برچھے کے شکار کو یا آج کے کتوں کے شکار [illegible] غضب کا تاش کیا! ہمارے اس نسل کے بلکہ اس سے بہتر نسل کے کتے ان کے پاس ہیں سہیل!

حیرت سے زیادہ رونے کا مقام ہے کہ شکاری بن بلاؤ کی ذرا سی پھنکار اور گیدڑ کی ادنیٰ سی بھبکی کے مارے دم دبا کر HOUNDING کا میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں اور دودھ پلا پلا کر اور ڈاگ بسکٹ کھلا کھلا کر شکار کے لئے تیار کئے جاتے ہیں اور ان کے پس خوردہ چھیچھڑوں پر پلے کتوں نے آج میری آنکھوں کے آگے آن کی آن میں شیرنی کے چیتھڑے اُڑا دیئے جو کل اسی LOCALITY میں کہیں پر دبکی ہوئی تھی اور پھر تمام رات غرّا غرّا کر شیر کو پکارتی پھری تھی اور آج علی الصبح ان ظالموں نے اسے اپنے کتوں سے جا دبایا۔ غضب کا سین تھا سہیل! بس وہی کہنا پڑتا ہے کہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ کیا لکھوں! کل سے زیادہ سنسنی خیز تھا آج کا ڈرامہ اور بھیا آج تو میری بندوق میں کارتوس ڈالنے کی بھی نوبت نہ آئی! بس دوربین سے تھیٹر کے اسٹیج کی طرح سب کچھ دیکھا کیا۔ الاماں! عزرائیل کی عزرائیل کی ٹکر تھی اور کئی کتے بھی بُری طرح زخمی ہوئے یہ خانہ بدوش اپنے کتوں کو اپنے بچوں کی طرح چاہتے ہیں اور شیر کا شکار ان کے معاشی مشاغل میں تو ہے نہیں ویسے یہ ہٹنا تو کسی چیز کے سامنے سے جانتے ہی نہیں ہیں نہ راجپوتانہ سے اُٹھی ہوئی آندھیوں سے، نہ خلیج بنگال کی چلی ہوئی بارشوں سے اور نہ ہمالیہ کی چوٹیوں سے آتی ہوئی برف باریوں سے، ہر ایک کے مقابلہ میں ان کا علم بلند ہی رہتا ہے تو اس شیر کے جوڑے سے کب پہلو تہی کرتے، مگر اس کا مارنا تو ان کے لئے معاشی فرض بھی بن گیا تھا کیونکہ انہوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ ان کی موجودگی کی وجہ سے چرندے جنگل خالی کر گئے ہیں جو ان کی زندہ کھیتی ہیں، اور بس اس کھیتی کی رکھوالی کے سلسلہ میں انہوں نے شیر کا شکار علاوہ شکاری جذبہ کے ایک معاشی فرض سمجھ کر کیا اور پہلے روز تو خیر خلافِ امید بجائے نیل، سانبھر، جھانک، چیتل پھاندنے کے گھاس میں سے وہ لہر چل پڑی تھی مگر آج تو یہ کتوں کو لے کر اور رات میں شیرنی کی آواز سن کر باقاعدہ منظم شیر کے شکار کی اسکیم بنا کر گئے تھے۔ اب وقت کوتاہ قصہ طولانی آج کی مہم کے حالات اگر تم آئے تو جا، وقوع دکھا کر سناؤں گا۔

لیجئے! صبح صادق ہو رہی ہے، کیمپ کے روزنوں سے وہ خطِ نور نظر آ رہا ہے، دھندلے میلے آسمان پر کھنچا ہوا مشرق سے مغرب تک، فضا آج صاف ہے، سردی جمود پیدا کر رہی ہے اور انگلیوں سے قلم چھوٹ رہا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ سی معلوم ہو رہی ہے! طبیعت آرام چاہتی ہے، اگر اک ذرا کی ذرا پیٹھ سیدھی کرنے کو لیٹ بھی گیا تو کچھ بھی نہیں کسل اور بڑھ جائے گا اور آج کے شکار میں میرا FUNCTION ضرور رہے گا سورج نکلتے نکلتے چل پڑنا ہے، اور تمام رات لکھتے گذر گئی شروع میں لیٹ گیا کچھ سونے کی کوشش کی، منہ ڈھکا، کروٹیں بدلیں مگر کل اور آج کے شکار، پادری صاحب کی بحث اور خانہ بدوشوں کا نغمہ اور صبح کا پروگرام جس میں خوش ہو کر خانہ بدوشوں نے میرا بھی پارٹ اور چانس مدِ نظر رکھا ہے اور ان سب پر ستم بالائے ستم رات کھانے کے بعد دو پیالی چائے! دیوانہ را ہوئے بس است! اور یہاں تو ایک دیوانے کے ساتھ "دو ہوئیں" تھیں، لہٰذا نیند آنا تو معلوم ہو گیا تھا۔ جاڑوں کی پہاڑ سی رات، سوچا تھوڑی بہت تمہارا خط پڑھا کرنے میں ہی کاٹ دوں، اور ابھی خط پورا نہ کرنے پایا تھا کہ اخیر رات کیمپ سے تھوڑی دور پر بارہ سنگھا ہوکنے لگا، شاید کبھی سُنی ہو تم نے اس کی آواز، کتنی وحشت زا ہوتی ہے کم بخت! چرندہ ہوتے ہوئے اتنی ڈراؤنی کہ نئے شکاری تو کیمپ کے اندر لحافوں میں سہم جاتے ہیں، جیسے براہِ راست سینہ کے اندر گونج کر ہول سی پیدا کرتی ہے اور بچپن کا بیٹھا ہوا باطل خوف آج تک دل میں جگہ کئے ہوئے ہے، مجھے یاد ہے جب آٹھ نو سال کی عمر میں اباجان کے ساتھ شکار کو آیا تھا تو پہلی مرتبہ سن کر ڈر کے مارے لحاف میں خوب بھینچ کر منہ ڈھانپ لیا تھا اور کیمپ کاٹ پر پڑے ہی پڑے کپڑے کی دیواروں کے غیر محفوظ ہونے کے اندیشہ میں نیند اُڑ گئی تھی۔ سہیل! کہتے ہیں کہ خوشبو اور رنگ وقت کو یاد دلاتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ آواز بھی، ورنہ اس کی پہلی ضرب پر آج تک وہ وقت کیوں یاد آ جاتا ہے اور اب جبکہ اٹھائیس سال سے عمر کے ہر سال میں سے آٹھ مہینے جنگل میں کٹنے کا اوسط ہے یہ ہوک کم بخت مجھ کو یک گونہ متاثر ضرور کرتی ہے اور آج بھی باوجود تمہارے اس خط کے استغراق کے ہر مرتبہ مجھ کو اپنی جانب متوجہ کر رہی ہے۔ اور اگر میں نہ لکھتا ہوتا تو ایک نامعلوم سی وحشت کا موجب ہوتی۔ اگرچہ آج کے شکار کیلئے یہ نیک فال ہے اور صبح ہی صبح اچھا شگون! اور تم جانتے ہو کہ جنگلی جانوروں کی بولیوں سے شگون لینا تو ہندوستانی روایات میں چلا آ رہا ہے اور ہم شکاریوں میں تو باقاعدہ انہیں پیشگوئیاں سمجھا جاتا ہے اور ان چرندوں کی ناک کو تو تم جانتے ہی ہو گے بڑی تیز ہوتی ہے بس جیسے شیر کے کان! اور یہ درندوں کی بُو پا کر ہٹ جاتے ہیں اور اپنی ہانٹیں چھوڑ جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ جنگل چرندوں سے خالی ملا یہاں پر شیر کا جوڑا نہ معلوم کہاں سے بلا سان گمان ان جنگلیوں کے

ہاتھوں کتّے کی موت مرنے آن مرا! اور تمام جنگل کا چرند درہم برہم ہوگیا۔ لیکن آج تو جبر آدھی رات گئے سے بارہ سنگھا ہوک رہا ہے جنگل میں خیریت کا نقیب!
ہاں، آج ادھر چرندے رجوع ہو رہے ہیں، کل تو خاموش فضا میں شیرنی کی بلاتی ہوئی مخصوص نرم آواز کسی کسی وقت سنائی دی جو میں پہچان ہی نہ سکا کہ یہ بیوہ شیرنی کا نالۂ نیم شبی ہے کیونکہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ابھی ایک اور باقی ہے مگر صبح کو یہ گل کھلا، یک نہ شد دو شد!

لو اب تو بالکل ہی صبح نکل آئی۔ میں لکھ چکا ہوں کہ آج خانہ بدوش مجھ کو شکار میں باقاعدہ شریک کر کے میرے "ناقص" ہتھیاروں کے مطابق مجھ کو چانس دیں گے۔ یہ سو برس میں پادری صاحب سے نہ معلوم کیوں اتنے مانوس نہ ہونے پائے جتنے مجھ سے پچاس گھنٹوں میں ہو گئے اور آج تو یہ عالم تھا کہ جبر پادری صاحب کے بقول میں تو خود کو ان میں سے ایک نہیں سمجھ رہا ہوں لیکن جیسے وہ مجھے اپنوں میں سے ایک خیال کر رہے ہیں۔ میری سیادت اور وجاہت کا اپنے مخصوص زاویہ سے اس سے بالکل مختلف جس سے میرے متعلقہ کاشتکار اور رعایا کرتے ہیں پُرخلوص لحاظ سا کرتے ہوئے مجھے ایک بالکل نئے جذبہ سے آشنا کر رہے ہیں اور میں ان کے درمیان ایک ساتھی کی تلاش میں ہوں تاکہ ہم مل کر ان کے متعلق تبادلۂ خیال تو کر سکیں۔ اور یہاں سے ہے انیسِ شامِ فرقت دشتِ تنہائی میں کون : گونج صحرا کی فقط دمساز ہو کر رہ گئی!
گونج! جس میں حل سا ہوتا جا رہا ہوں یا یہ گونج میرے کان کے پردوں پر ریکارڈ ہو کر رہ گئی ہے! لو وہ مرغا بول اٹھا! فادر سماعت بن مرغے! درختوں کی پھنگیوں پر بیٹھے اذان کی زنجیر مشرق سے مغرب تک ملا رہے ہیں، کیمپ کے ارد گرد درختوں پر جھانپلیں، سچے پیرا سچے پیرا چیخ رہی ہیں — اور اب تو یہ جھاڑی والے راجہ "رکھوالے تیتر" بھی "پٹی لو! پٹی لو" پکارنے لگے، تمام جنگل مسلسل بھنبھناہٹ میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ خاموشی و سکوت کا دبیز پردہ آہستہ آہستہ چاک ہو رہا ہے، ڈوبتے چاند کی کرنیں مغرب سے مشرق کو لمبے لمبے سائے سے پھینک رہی ہیں اور آج تو مطلع صاف ہے اور مشرق سے بڑھتی ہوئی روشنی کے سرخ سیلاب اور معدوم ہوتی ہوئی دودھ سی چاندنی میں ایک دل آویز امتزاج سا ہو کر زمین سے آسمان تک فردوسیں ماحول کا سماں پیش کر رہا ہے اور نہ معلوم باہر کیا عالم ہوگا میں تو کیمپ کے جالی دار روزنوں سے ہی اندازہ کر کے وجد میں آیا جا رہا ہوں، باوجود سردی کی اتنی شدت کے بھی! کیمپ کاٹ پر بیٹھے ہی بیٹھے خط پورا کیا اور کل رات تو تمہیں لکھا لکھا سو گیا تھا۔ آج تمام بدن لحاف لپیٹے ہونے کے باوجود بھی یخ سا ہو گیا اور باورچی خانہ سے چائے کے برتنوں کی کھنک گرما گرم شیریں نغمہ سا بن کر کان میں پڑ رہی ہے تمہاری شکاری کہانی لکھنے کی دعوت پر تمہیں یہاں جنگل میں شکار کی دعوت دے رہا ہوں، سوال دیگر جواب دیگر! اب تم یہاں آ کر دیکھ ہی جو لو گے کہ شکاری کہانی لکھنا یا شکار کھیلنا! جواب اور آمد کے پروگرام سے مطلع کرنا، میری ڈاک اخبار کے ساتھ گھر سے روزانہ شام کو یہاں پہنچتی رہے گی، اور جس ٹرین سے تم آؤ گے اس پر جیپ بھیج دوں گا۔ یہاں سے چھوٹی لائن کا اسٹیشن گھٹوری بائیس میل پورب کو کچے راستہ پر ہے اور گرینڈ ٹرنک روڈ جس پر بس چلتی ہے کچے راستہ پر پچیس میل کے فاصلہ پر پچھم کی جانب ملتی ہے اور اس کے لئے بڑی لائن کے بریلی علی گڑھ برانچ کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن آصف پور پر اترنا پڑتا ہے۔ جس راستہ آؤ گے جیپ ملے گی، صحیح اطلاع دینا تمہارا کام رہا اور میں تو لمبا پروگرام بنا کر آیا ہوں شاید پورا چلہ یہیں گھومتا رہوں۔ ہاں ایک چیز لیتے آنا اگر مل سکیں تو ایک گنڈی پرول اور تھوڑے سنگترے، جنگل میں سبزی ترکاری اچھی طرح! تو نہیں آتی اور گوشت کھاتے کھاتے جی چھوڑ جاؤ گے اور سنگتروں کو میں نے یوں لکھ دیا کہ ادھر تمہاری جانب غالباً سلہٹ کا سنگترا آتا ہے چاشنی دار وہ ہمارے یہاں پہنچتا نہیں، اور یہ ناگپوری سنگترے تو اتنے شیریں ہوتے ہیں کہ پھل کی حد سے گذر کر مٹھائی سی بن جاتے ہیں اور آخیر فصل پر تو PERRY اور MORTON کے آریج ڈراپس — اور ہاں بھولنا مت، ڈھیر سارا گیا جی کا خمیرہ بھی ساتھ لانا۔ تمام دن جنگل میں سگریٹ پیتے پیتے پریشان ہو جاتا ہوں، رات کو حقہ کو طبیعت چاہتی ہے اور تمباکو یہاں اچھی نہیں ملتی اور بنگلہ پانوں کی ایک ٹوکری آجکل جاڑوں میں بنگلہ پان بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اور تم پان کے رسیا ہو!

اچھا تم شکاری افسانہ کے منتظر ہو گے اور میں شکار پارٹی بنانے کیلئے تمہارا منتظر ہوں۔ بھابی سے تھوڑے دنوں کیلئے رخصت کی معافی مانگ لینا سمجھے! اور کوئی حیلہ درمیان میں نہ لانا، اپنا چھوٹا بڑا رائفل اور بارہ بور لیتے آنا۔ رائفل کے کارتوس رکھتے لانا بارہ بور کا ہر قسم کا امونیشن لانگ رینج کا میرے ساتھ ہے۔ فکر نہ کرنا — لیجئے چائے حاضر ہے!

اچھا رخصت! بچوں کو پیار، بھابی کو آداب و دعائیں! فقط والسلام باقی بالمشافہ......!

تمہارا منتظر
ابوالفضل صدیقی ۱۸/۱۲/۱۹۵۲
(۶ بجے صبح)

لالۂ صحرائی

خدیجہ مستور

"لان اتنا اُجاڑ تو نہیں"——— کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوتے ہوئے شمیم آختر نے سوچا ——— "میں نے خود ہی کبھی توجہ نہ دی کہ لاؤ ذرا سا پانی ڈال دوں، بارش کے پہلے ہی چھینٹے سے سارے پودے لہلہا اُٹھے"——— وہ بڑے آہستہ آہستہ متوازن قدم ڈالتی کوٹھی میں داخل ہوگئی ——— "کتنا شریف انسان ہے، مہاجروں کی حالت پر اسے کتنا رحم آ رہا تھا، مگر اسے کیا معلوم کہ میں تو ازل سے مہاجر ہوں، میں کوئی یہاں آتے ہوئے تھوڑا ہی لٹی ہوں، میں تو مدت ہوئی لُٹ چکی ہوں، بس زندگی بے غیرت ہے جو جئے چلی جاتی ہوں، بھلا کوئی اس طرح بھی زندہ رہتا ہے"——— وہ اپنے کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کئے بغیر آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ پیدل راستہ طے کرنے کی آج ذرا بھی تکان نہ تھی۔ ورنہ روز جب وہ پیدل آتی جاتی تو راستے بھر اسے اس بات پر غصہ آتا رہتا کہ آج تک ایک سیکنڈ ہینڈ سائیکل بھی نہ خرید سکی۔ اتنا لمبا راستہ طے کرتے ہوئے پاؤں ٹوٹ کر رہ جاتے اور پھر گھر آ کر وہ اپنی ڈگر ڈگر کرتی آرام کرسی پر لیٹ کر دیر تک پاؤں دبایا کرتی ——— "واقعی بہت شریف انسان تھا، اگر میں پانی میں بھیگ جاتی تو بھلا اس کا کیا بگڑ جاتا، اوروں نے بھی تو مجھے اس طرح بارش میں چلتے دیکھا مگر کسی کی کار نہ رکی، کسی کا تانگہ نہ ٹھہرا، لیکن اس نے کتنی ہمدردی سے کار روک کر مجھے بیٹھنے کی دعوت دی۔ راستے میں اس نے کتنی تہذیب سے میرے حالات پوچھے اور میں کس صفائی سے جھوٹ بولتی رہی، ہم یہ تھے، ہم وہ تھے، فساد میں لٹ گئے اور اب یہاں نہ کوئی اپنا ہے اور نہ پرایا"——— اور پھر جب کالج آ گیا تو اس نے کتنی پُرخلوص نظروں سے مجھے دیکھا، حالانکہ وہ مجھے برابر دیکھ سکتا تھا، میں اسکی دعوت پر بغیر کچھ سوچے سمجھے احمقانہ انداز سے اس کے برابر جا بیٹھی مگر وہ تو کتنا شریف نکلا"——— "میں آپ کا پڑوسی ہوں اگر کسی وقت میری ضرورت پڑے تو ضرور یاد کیجئے گا، میں ہر طرح حاضر ہوں"——— "اوہ! ابھی دُنیا میرے لئے ختم نہیں ہوئی، ابھی انسان زندہ ہیں" اس نے کرسی کی پشت پر سر ٹکا دیا۔

"شمیمہ بیٹی کھانا تو کھالو آ کر، پھر آرام کر لینا، میں سر دبا دونگی اپنی بچی کا، ایسے سارا دماغ پچی ہو جاتا ہے پڑھانے میں"

اماں کب سے دالان میں بچھی ہوئی دری پر بیٹھی کھانے کا انتظار کر رہی تھیں وہ کسی بیزاری یا تکان کا اظہار کئے بغیر آ کر سکون سے کھانے بیٹھ گئی۔ قریب ہی دری پر نسیم بیٹھی کورس کی کتابوں سے اُلجھ رہی تھی اس نے شمیم کی طرف ایک لمحے کو بھی رُخ نہ کیا۔ صبح دونوں میں کھٹ پٹ جو ہو گئی تھی ——— وہ بیزاری سے کالج جانے کی تیاری کر رہی تھی اور ادھر نسیم اپنا چھدیلا دوپٹہ دکھا رہی تھی۔

"اللہ آپا بس میرے دو دوپٹے بنوا دیجئے، پورا سال نہ نکال دوں تو آپ میرا نام بدل دیجئے گا، بھلا یہ دوپٹہ اب اسکول کے لائق رہ گیا ہے"

"اماں سے کہا کرو میرے پاس اپنے کفن کو بھی کچھ نہیں" وہ سخت اکھڑپن سے بولی اور نسیم بلک کر روئی اور پھر منہ چھپائے تیزی سے کمرے

سے باہر چلی گئی۔ امّی کے جانے کے بعد شمیم بھی ایسا جواب دینے پر خوب ہی روئی۔ یہ تو اس کی عادت ہو گئی تھی کہ ہر وقت جھلا جھلا کر بولتی اور پھر آپ ہی مارے شرمندگی کے روتی مگر اس سے یہ نہ ہوتا کہ جلو جو کہا ہے تو اب تلافی کر ڈالیں اور اسی لئے وہ اپنے گھر میں اکھڑ اور چڑچڑی مشہور ہو رہی تھی

اس نے نوالہ توڑتے ہوئے نسیم کی طرف دیکھا، کتنی خوبصورت لگ رہی تھی وہ۔

" خفا ہو؟ معاف کر دو!" آج بڑی مدّت بعد وہ پیار سے بول رہی تھی ـــ

" نہیں "، نسیم کتابیں سمیٹ کر پاس کے کمرے میں چلی گئی ـــــــ " خدا کسی کو اپنوں کا دست نگر نہ کرے" ـــــــ وہ کتابیں پلنگ پر ڈالتے ہوئے بڑبڑائی۔ سب سے بڑے کمرے میں اس کے اس کے چاروں چھوٹے بھائی بہنیں، اسکول سے آنے کی تکان اُتار رہے تھے ـــــــ نسیم زور سے چیخی " زیادہ ادھم مچایا تو آکر سر توڑ دونگی "۔ وہ اپنے غصّے کا ہر طرح اظہار کر رہی تھی۔

" انہیں لوگوں کے لئے زندہ ہوں مگر یہ بھی خوش نہیں " شمیم نے بڑی بے لبسی سے اماں کو دیکھا، آج وہ جانے کیوں بڑی نرم دل ہو رہی تھی ـــــــ

" اماں آپ بھی مجھ سے خوش نہ ہوں گی "

" بس چُپ رہو " اماں کی آنکھوں میں آنسو آرہے تھے۔ انہوں نے شمیم کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور ہولے ہولے اسکی پیشانی سہلانے لگیں شمیم نے بچّوں کی طرح آنکھیں بند کر لیں ـــــــ " کتنا شریف انسان " ـــــــ آنکھیں بند کرتے ہی وہ پھر سوچنے لگی ـــــــ اماں اسے اتنا پُرسکون اور کچھ خوش سا دیکھ کر کھلی ہوئی تھیں، کتنی مدّت ہو گئی کہ وہ اسے ہر وقت بیزار دیکھ رہی تھیں۔ کالج جانا، کالج سے آکر کھانا کھانا اور اگر کوئی اس سے زیادہ باتیں کرنے کی کوشش کرتا تو چڑ چڑا اُٹھنا۔ کھانے کے بعد اپنے بستر پر پڑ کر سو جانا، گھنٹہ آدھ گھنٹہ سونے کے بعد اُٹھتی تو جیسے خود کو جبراً بہلانے کے انداز سے چھوٹے بھائی بہنوں کے پھٹے پُرانے کپڑے سینے بیٹھ جاتی، اس سے فرصت ملتی تو جھاڑو لے کر سارا گھر جھاڑ ڈالتی، پھر کتابوں سے اُلجھتی اور آخر جیسے تنگ آکر کوٹھی کے پچھلے لان میں میلی ڈھچر آرام کرسی ڈال کر بالکل خاموش بیٹھ جاتی اور زمین پر بکھری ہوئی خشک پتیوں کو پیروں سے روندا کرتی۔ اماں اسے اس حالت میں دیکھتیں تو جانے کیوں ان کی آنکھیں بھیگنے لگتیں ـــــــ " بھئی ہمیں تو اب اسی طرح زندگی گزارنی ہے " ـــــــ وہ زیرِ لب اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتیں ـــــــ " ماں ہو کر اپنی اولاد کی جوانی تباہ ہوتے دیکھ رہی ہوں۔ چھتیس سال کی ہو گئی " ـــــــ وہ انگلیوں پر حساب لگاتیں ـــــــ " جوانی بیت گئی بچّی کی، کیسی حسرتیں ہوں گی دل میں " ـــــــ وہ لہسن پیاز کی بو میں بسے ہوئے ڈوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھتیں ـــــــ پھر وہ اپنے باوا کو یاد کرنے لگتیں ـــــــ " اگر مجھے جاہل نہ رکھا ہوتا تو آج میں خود چار ٹکے کما کر اپنے بچوں کو پال لیتی " ـــــــ پھر انہیں اپنے میاں کا خیال ستاتا ـــــــ " تم بھی مجھے اپنے ساتھ نہ لے گئے، خود تو اچھے گئے مگر مجھے میری اولاد کی جوانی پر سانپ بنا کر بٹھا گئے ـــــــ اور پھر سب کے دیکھنے کے خیال سے وہ گھر کے کسی کونے میں منہ چھپا کر خوب ہی دل کی بھڑاس نکالتیں۔ اگر شمیم انہیں روتا دیکھ لیتی تو کبھی تسلی نہ دیتی، انہیں چُپ نہ کراتی ـــــــ " اچھا ہے ذرا رولیں، دل کا بوجھ کم ہو جائے گا، ساری زندگی کا رونا ہے، اگر گھٹ گھٹ کر رہے تو دم ہی نکل جائے گا۔ آج ہم تم رو رہے ہیں اماں، کل نسیم روئے گی، پرسوں صفیہ اور پھر یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا، زندہ رہے تو ایک دن ہاتھ پاؤں جواب دے جائیں گے اور پھر جانے کیسے کیسے میرا بڑھاپا سمیٹنا پڑے " اور پھر وہ اُلجھ کر ان خیالات سے پیچھا چھڑا لیتی ـــــــ " بھئی یہ سب کچھ تو ہو کر ہی رہے گا پھر ابھی سے کیا غم "

آٹھ سال پہلے جب وہ ایم۔ اے کر رہی تھی تو مستقبل چھم چھم کرتا اس کے قریب آتا جا رہا تھا۔ سہانے خواب گنگا جمنی محل بناتے جا رہے تھے۔ وہ اپنی امیر امیر سہیلیوں کے اندھیرے اندھیرے ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر ان سے سرگوشیاں کرتی، کسی آئی۔ سی۔ ایس کے خواب دیکھے جاتے۔ کار دل

پر گھوما جاتا اور پھر اسی کار پہ ایک سال بعد ایک پیارا سا بچہ آیا کی گود میں پچھلی سیٹ پر براجمان ہوتا۔

"بھئی تم بہت آگے بڑھ جاتی ہو" اسکی دوستوں کے چہرے کانوں تک سُرخ ہو جاتے۔

"واہ! یہ سُرخ پڑنے کی کیا بات ہے، یہ تو ہر لڑکی کی خواہش ہوتی ہے" وہ ثابت کرنا چاہتی۔

"تم بہت بقراط بنتی ہو، بس ان کا نام بقراط بی بی رکھ دو" اور پھر زور سے قہقہے پڑتے۔ یونیورسٹی کے سارے کے سارے خوبصورت لڑکوں کا ذکر ہوتا اور پھر ان میں کیڑے ڈال ڈال کر رد کیا جاتا۔

"بہت اچھا ہے، امیر گھر کا بھی ہے مگر بات کرنے میں اسکی آنکھیں بُری طرح جھپکتی ہیں۔"

"وہ بھی اچھا ہے مگر بال اس قدر سیدھے اور کم ہیں کہ ذرا ذرا سی کھوپڑی نکل آئی ہے"—— اور یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہتا۔

ان دنوں وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ وہ ایک نچلے متوسط گھرانے کی لڑکی ہے، اس کے ہاں زندگی ٹھٹھک ٹھٹھک کر گزرتی ہے۔ اس کی تعلیم سے گھر والوں کی کچھ اُمیدیں بھی وابستہ ہیں، اسے اپنے گنگا جمنی محلوں سے جھانک کر ادھر بھی دیکھنا پڑیگا۔ خیر دیکھنے کی حد تک تو وہ بھی اپنے ذہن کو ہموار کر لیتی مگر یہاں تو محلوں کو اپنے ہاتھوں ڈھا دینے کا حکم آ گیا۔ امتحان دینے میں ایک آدھ مہینہ باقی تھا کہ ابّا اپنا ہارٹ فیل کر گئے۔ امّاں نے روتے ہوئے اسے بتایا کہ ہم تو لُٹ چکے ہیں اب ہمارا سہارا تم ہو اور اس نے ابّا کی جدائی میں تڑپتے ہوئے ان سب کو تسلی دی۔

جیسے تیسے امتحان میں تو پاس ہو گئی مگر اب نوکری کا مسئلہ تھا۔ اس نے فوراً ہی بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ اور دو مہینے بعد اسے اپنی سہیلیوں کے ابّاؤں کی مدد سے ایک کالج میں ملازمت مل گئی۔ اس نے بڑے عزم سے چھوٹے بھائی بہنوں کی تعلیم جاری رکھی۔ ماں کی دلجوئی میں بھی کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ اب اس نے سہیلیوں کے ہاں آنا جانا بند کر دیا تھا، کچھ کی تو شادیاں ہو گئیں اور کچھ اسی طرح اندھیرے اندھیرے ڈرائنگ روموں میں سرگوشیاں کر رہی تھیں—— "کیا فائدہ، خواہ مخواہ دل پہ بوجھ ہو جاتا ہے ان کی باتوں سے" وہ سوچتی اور کالج سے آنے کے بعد سارا وقت گھر پہ گزارتی۔ بڑے اچھے موڈ کے ساتھ وہ ہر کام میں اماں کا ہاتھ بٹاتی بس یوں ہی کسی کسی وقت ایک ذرا دیر کو چُپ ہو بیٹھتی—— "ابھی تو یہ سب دوسرے تیسرے کلاسوں میں پڑھ رہے ہیں، ابھی یہ سب کتنے چھوٹے ہیں" وہ بڑے دُکھ سے سوچتی اور پھر بڑے بڑے عزم سے خود کو سمجھاتی" —— "میں تو بہت عظیم ہو جاؤں گی، خدمت تو زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے"—— اور پھر وہ اماں کے اردگرد پھرنے لگتی۔ وہ ایک لمحے کو بھی اماں کی اُتری ہوئی صورت دیکھنے کو تیار نہ تھی۔ اگر جنگ کی وجہ سے مہنگائی نہ ہوتی تو شاید وہ انہیں پھولوں میں تول دیتی، مگر اب تو اماں گائے کا گوشت کھاتیں، ہاضمے کو ٹھیک رکھنے کے لئے قسم قسم کے چورن بنا لیتیں اور اپنے میاں کی یادیں روتیں، ان کی تنخواہ بیٹی سے تو بہر حال زیادہ تھی اور ان دنوں کوئی بھی گائے کا گوشت نہ کھاتا۔

ایک ڈیڑھ سال یوں ہی گزر گیا۔ لیکن اب اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ بہت دوڑی ہے، اب وہ تھک گئی ہے اور تھکن اُتارنے کے لئے اسے تنہائی کی ضرورت ہے —— وہ بڑی دیر دیر تک تنہائی میں چُپ چاپ بیٹھی رہتی—— ڈھائے ہوئے گنگا جمنی محلوں سے کوئی کچلی ہوئی تمنا بلبلا کر سر اُٹھاتی تو پہچاننے سے انکار کر دیتی —— "میں اب تمہیں نہیں جانتی"—— وہ کوئی خشک سی کتاب اُٹھا لیتی مگر صفحے اسکی نظروں سے غائب ہونے لگتے —— "زندگی صرف تمہارے ہی گرد نہیں گھومتی میری تمناؤ!"—— کتاب رکھ کر وہ سر کو تھام لیتی اور پھر گزرا ہوا زمانہ اسے کمزور پا کر چڑھائی کر دیتا —— وہ گھبرا کر بھاگ اُٹھتی—— "اماں، صفیہ، نسیم، ارے بھئی تم سب آ کر میرے پاس آ کر بیٹھو!" وہ چیخ کر بلاتی اور پھر خواہ مخواہ ذرا ذرا سی باتوں پہ ہنستی، جانے کہاں کہاں کی انٹ شنٹ باتیں کرتی پھر بھی جی اُچاٹ رہتا—— "زندگی کی سب سے بڑی عظمت

دوسروں کی خدمت ہے، اور پھر یہ تو اپنے ہی گوشت پوست ہیں"۔ وہ خود کو سمجھاتی —— شروع میں وہ سخت شاکی تھی کہ آخر راتیں اتنی چھوٹی کیوں ہوتی ہیں۔ صبح صبح کالج جانے کے لئے اس سے کسی طرح نہ اُٹھا جاتا مگر اب وہی راتیں اتنی طویل ہوگئی تھیں کہ کاٹے نہ کٹتیں اور صبح بے خوابی کی وجہ سے اس کے چہرے پر جھلاّہٹ ہوتی۔

سال آہستہ آہستہ بیتے جا رہے تھے اور اسکی طبیعت اُلجھتی جا رہی تھی۔ زندگی بھاڑے کے ٹٹو کی طرح گذرتی جا رہی تھی، کوئی تبدیلی نہیں، کوئی ہلچل نہیں۔ گھر سے کالج اور کالج سے گھر۔ وہ دُنیا کی ہر دلچسپی سے خود کو محروم کر چکی تھی۔ "کیا فائدہ دنیا دیکھ کر جی جلانے سے" —— وہ سوچتی اور خود کو بہلانے کی کوشش کرتی مگر اب وہ چڑچڑی ہوتی جا رہی تھی، ذراسی بات پر ناراض ہو جاتی اور آپ ہی آپ پہروں کڑھا کرتی۔ اب وہ مشکل ہی سے کسی بات پر ہنستی۔

جنگ ختم ہوگئی —— اپنے ملک میں فساد ہو رہے تھے۔ پھر ملک تقسیم ہوگیا۔ آزادی مل گئی، مگر بھلا کبھی کسی نے ایسی آزادی دیکھی ہوگی جس کا خیر مقدم کرنے کے لئے شادیانے بجنے کے بجائے لاشیں بچھ گئیں —— وہ دھما چوکڑی مچی کہ انسان سب کچھ بھول گیا۔ موت کے خوف سے جس کا جدھر منہ اُٹھا بھاگ رہا تھا وہ سب بھی اپنا بھرا گھر چھوڑ کر پاکستان آگئے۔ ہندوؤں کے سامان سے لدے پھندے مکان جیسے ماتم کدے بنے ہوئے تھے۔ جس کا جہاں جی چاہا آباد ہوگیا۔ چولھوں میں آگ جل گئی، چلموں سے دُھواں نکلنے لگا، بہاروں کی موت کا ماتم ہو رہا تھا، جو لاپتہ تھے، انہیں آنکھیں ڈھونڈھ رہی تھیں۔ فرنیچر توڑ توڑ کر چولھوں کی نذر ہو رہا تھا، قیمتی پردے چادریں بن گئے تھے، —— اور ماتم کدے جیسے پوچھ رہے تھے کہ یہ سب کیا ہے —— شمیم اختر کا چھوٹا سا خاندان ایک مقامی بزرگ کے بتانے پر ایک کوٹھی میں جا پڑا۔ کوٹھی والے شاید حالات کو پہلے سے سمجھ گئے تھے اس لئے وہاں چند ٹوٹی ہوئی آرام کرسیوں، خالی ڈبوں اور ردّی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ کوٹھی کی صفائی کرتے وقت اماں نے ایسی کرسیاں چھانٹ کر رکھ لیں جو مرمت کے بغیر کام دے سکتی تھیں۔ اس کے بعد جب دری بچھا کر وہ ذرا سکون سے بیٹھیں تو اپنے شوہر کے باپ دادا کی گاڑھی کمائی سے بنا ہوا گھر یاد کر کے خوب ہی روئیں۔ بہت دن بعد آج وہ پھر اماں کو تسلی دینے بیٹھ گئی۔ اسے ان باتوں سے زیادہ یہ فکر تھی کہ کس طرح ملازمت مل جائے ورنہ اماں کی سونے کی چوڑیوں کے دام زیادہ دن کام نہ دے سکیں گے۔

دو مہینے بعد اسے کالج میں جگہ مل گئی اور جب ذرا سکون سے بیٹھنا نصیب ہوا تو اس نے اپنے نئے گھر کو دیکھا۔ دس کمروں برآمدوں اور اونچے اونچے درختوں سے گھری ہوئی کوٹھی اسے بڑی اُداس نظر آئی۔ کوٹھی کی تمنا تھی مگر اب مل بھی تو کتنی تنہا اور اُداس۔ ایک کمرے میں اماں کی کھاٹ پڑی تھی، دوسرا نسیم نے سنبھال لیا تھا تیسرے میں اس کے لئے بانس کی ایک کھاٹ ڈال دی گئی تھی۔ باقی گھر میں چھوٹے بھائی بہن اُودھم ڈھاتے پھرتے۔

پہلی تنخواہ پر اس نے آرام کرسیاں بنوا لیں اور شام کو ہرے اور پھولوں سے لدے پھندے لان میں ایک کرسی ڈال کر بیٹھ جاتی اور کبھی کبھی نظروں سے دُور دُور تک دیکھتی رہتی، شفاف چوڑی سڑک کے دونوں طرف اُونچے اُونچے گھنے درختوں سے گھری ہوئی کوٹھیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ جان بچا کر بھاگنے والوں کی بہت سی کوٹھیاں ابھی خالی پڑی تھیں کیونکہ رات کو وہاں روشنی کی ایک کرن بھی نظر نہ آتی، بس آوارہ کتے اِدھر —— اُدھر دندناتے پھرتے یا پھر منہ اُٹھا کر زور زور سے رونے۔ شام کو سڑک پر بڑی رونق ہو جاتی۔ چٹے بھنے جھبرے جھبرے کتے، آیائیں، بچے اور بھڑک دار لباسوں والے جوڑے ٹہلتے نظر آتے۔ وہ خالی خالی نظروں سے یہ سب کچھ دیکھتی تو دل بیٹھنے لگتا۔ اس کے ابا کا گھر بھرے شہر میں تھا اس لئے وہ وہاں اتنا سُونا پن نہ محسوس کرتی مگر یہاں زبردستی تمناؤں کی ایک ٹوٹی پھوٹی کوڑی تھما کر اسے اور بھی بے چین

کر دیا گیا تھا۔

"اب تو میں نے نہ چاہا تھا کہ کسی چپ چاپ سی جگہ پر ایک کوٹھی ہو!" وہ بڑی اُداسی سے سوچتی ——— "اب مجھے اس کا کیا کرنا ہے، کیا کہیں شہر کی گلیوں میں ایک مکان نہ مل سکے گا جہاں سارا دن سودے والے چیختے پھریں" ——— وہ بڑی بے بسی سے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیتی پھر جس وقت کرسی اُٹھاتی تو رات کا کھانا تیار ہوتا۔ وہ بڑی خاموشی سے کھانا کھاتی، اماں اب اسے بڑے غور سے دیکھنے لگی تھیں۔ وہ جب انہیں اس طرح اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاتی تو مجرموں کی طرح نظریں چرا لیتی۔

ایک سال بعد ری ہیبلیٹیشن آفیسر نے اس کی کوٹھی کے دو حصے کر دیئے۔ ایک حصہ اس کے نام الاٹ ہو گیا اور دوسرا کسی اور کے نام۔ اماں بہت چیخی چلّائیں کہ ہم تو اپنا محل جیسا مکان چھوڑ کر آئے ہیں، مگر سُنتا کون؟ دوسرے دن چھکڑوں قیمتی سامان کے ساتھ ایک بڈھا بڑھیا اور آدھا درجن جوان جوان لڑکیاں آکر آباد ہو گئیں۔ فوراً ہی مالی لگ گیا، سفیدی ہوئی اور سارا دن سامان کے اُٹھنے دھرنے کی آوازیں آتی رہیں، پوری رفتار سے ریڈیو کھلا رہا اور پھر شام کو لان میں آرام کرسیاں بچھ گئیں، سارا کنبہ باہر آکر بیٹھ گیا اور کاروں پر بوڑھے اور نوجوان مہمانوں کا تانتا بندھ گیا۔ لڑکیاں اِترا اِترا کر اُن کا استقبال کر رہی تھیں ——— اماں نے کتنی ہی بار جلن کا اظہار کیا۔

"بھئی یہ اچھے مہاجر ہیں، خیر سے سارے ٹھاٹ باٹ ہیں۔" اماں کی بات کا اس نے ایک بار بھی جواب نہ دیا۔ اب وہ ویسے بھی بہت کم بولتی تھی ——— دو تین مہینے تک اماں کو پڑوسیوں کے ٹھاٹ جلاتے رہے۔

کوٹھی کے دونوں حصوں میں کیسا زبردست فرق تھا۔ سفید چمچماتی ہوئی کوٹھی کے سامنے سبزہ اُبلا پڑتا تھا اور ادھر خشک گھاس تنکوں کے کانٹے بن گئی تھی۔ پھولوں سے لدے پودے ٹُنڈ منڈ ہو گئے تھے، مگر وہ کبھی ایک لوٹا پانی نہ ڈالتی۔ پڑوسیوں کی آمد نے اسے اور بھی بے چین کر دیا تھا۔ شام کو پڑوسیوں کی لڑکیاں زور زور سے قہقہے لگاتیں اُردو بولتے بولتے انگریزی میں کوکنے لگتیں اور پھر اُردو بولتیں اور نوجوان مہمان انہیں میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتے تو وہ عجیب سا دُکھ محسوس کرتی۔ وہ ان سے چند ہی قدم کے فاصلے پر تو کرسی ڈالے بیٹھی ہوتی مگر وہ سب کبھی کبھی اسے یوں دیکھ لیتے جیسے وہ کوئی بے جان چیز ہو۔ اسے یونیورسٹی کا زمانہ یاد آتا جب وہ لڑکوں کی نگاہوں کا مرکز تھی۔

"ہمیرہ، کتنی حقیر ہو تم بھی" وہ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگتی اور پھر رات بستر پہ وہ جی بھر کر روتی۔

سال گزرا ہو گا کہ پڑوسیوں کی ایک لڑکی آنے جانے والے نوجوان مہمان سے بیاہ گئی۔ کئی دن تک خوب چہل پہل رہی اور اماں جانے کیوں مُنہ چھپا چھپا کر روتی رہیں۔ وہ جانتی تھی کہ اماں کس کے غم میں رو رہی ہیں اور اسی لئے وہ ان سے کچھ نہ پوچھنا چاہتی تھی ——— "بھئی اب نسیم کی شادی کر کے دل کے ارمان نکال لیں" ——— اس نے بڑے غصّے سے سوچا۔ لڑکی کی رخصتی سے پہلے تک وہ یوں پھرتی رہی جیسے اسے ذرا بھی پروا نہیں۔ مگر شام کو جب پھولوں سے سجی ہوئی کار پر دُلہن رخصت ہو گئی تو اسے اپنا کلیجہ مسوستا ہوا محسوس ہوا۔ رات وہ دیر تک روتی رہی ——— دن اسی بے ڈھنگے پن سے گزرتے جا رہے تھے۔ اب اس نے سامنے کے لان میں بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ پڑوسیوں کی دوسری لڑکی اس کے وجود کو بُری طرح نظر انداز کر رہی تھی۔ وہ راتوں کو اپنے محبوب کے ساتھ ٹہلتی ہوئی آتی اور اس کے سامنے والے درخت کے نیچے کھڑی ہو جاتی ——— لاکھ وہ مُنہ پھیر لیتی پھر بھی اسے یہ معلوم ہوتا رہتا کہ اب وہ سرگوشیوں میں کیا کہہ رہے ہیں۔

اب وہ آہستہ آہستہ اتنی جھلّی اور چڑچڑی ہو گئی کہ جاہل عورتوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر لڑتی اور روتی اماں بہنوں کو اپنی زندگی برباد ہونے کے طعنے دیتی۔ سب اس کے خوف سے زبانیں سیئے رہتے اور اسکی غیر موجودگی میں اسے بُرا بھلا کہتے۔ اماں کے علاوہ کسی کو بھی اس سے

ہمدردی نہ تھی۔ اماں دوسری اولادوں کو اسکی مخالفت میں بڑبڑاتے سُنتیں تو بڑی رقت سے سمجھاتیں۔

" تم لوگوں کی خاطر اسکی جوانی تباہ ہوگئی، چھتیس سال کی ہورہی ہے، شادی ہوگئی ہوتی تو دو بچّوں کی ماں ہوتی اور اپنے گھر میں عیش کرتی، صورت تک بگڑ گئی میری بچی کی " اماں رو پڑتیں۔ وہ اس کے لئے ہر وقت اُداس اور پریشان رہا کرتیں مگر آج وہ اسے اتنا پُرسکون اور نرم دیکھ کر کتنی حیران اور خوش تھیں۔ نسیم اُسے اس طرح معافی مانگتے دیکھ کر پہلے کی طرح سر چڑھ رہی تھی۔ گھر کی ویران فضا کیسی بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ لڑائی جھگڑا، آنسو، سب یکلخت بند ہوگئے۔ اس کے چہرے پر مدتوں کی رچی بسی بیزاری جیسے کسی نے کھرچ کر پھینک دی۔ کالج سے آنے کے بعد وہ بڑی پُرسکون سی اِدھر اُدھر پھرتی۔ اس کے چہرے پر نیند جیسی معصومیت تھی ——— چھ سات دن تک، بارش والے واقعے کو بڑی تفصیل سے یاد کرتی رہی، اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس نے اسٹیرنگ پر ہاتھ کس طرح رکھا تھا۔ اس نے کتنی بار پہلو بدلا تھا، اس کے بات کرنے کا کیسا انداز تھا، اور اسکی ٹھوڑی کے نیچے ایک ننھا سا سیاہ تل تھا۔ اور اب چھ سات دن بعد اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کار میں بیٹھنے کی دعوت صرف شرافت کی وجہ سے نہ تھی بلکہ کوئی اور جذبہ بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس سے عجیب سی محبت محسوس کر رہی تھی اور اسی محبت میں وہ اس قدر رنگین تھی کہ ہر وقت اُونگھتی ہوئی معلوم ہوتی۔

محبت کتنی حساس ہوتی ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح اُجاڑ نہ پھرتی بلکہ کالج جانے سے پہلے بڑے انہماک سے خود کو سنوارتی اور جب اسکی کوٹھی کے سامنے سے گزرتی تو اسکی ساری جان کپکپا اُٹھتی حالانکہ لان میں صرف چار خالی کرسیاں پڑی ہوتیں اور کوئی نوکر اِدھر سے اُدھر پھر رہا ہوتا۔

ایک رات جبکہ دوسری تیسری تاریخوں کا چاند درختوں کی اوٹ میں چھپ رہا تھا تو وہ اس سے ملی۔

" مجھے تم سے محبّت ہے " ——— وہ ساری جان سے کانپ رہی تھی۔ وہ بڑی معصومیت سے مُسکرایا۔

" اس دن تم مجھے بہت اچھی لگی تھیں، اسی لئے میں تم کو پانی میں بھیگتا ہوا نہ دیکھ سکا، تمہیں معلوم ہے کہ میں خود تم کو پسند کرنے لگا ہوں "

" نہیں! " وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کتنی مدت بعد اسکی یہ تمنّا پوری ہوئی تھی کہ کسی کے بازوؤں میں مُنہ چھپا کر روئے۔ وہ اسے چپ کرانے کے لئے اپنی محبّت کا واسطہ دے رہا تھا۔ گھنے درختوں میں چاند جانے کہاں ڈوب گیا تھا، رو چکنے کے بعد اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بچّوں کی طرح زور زور سے ہنسے ——— مگر وہ لوگوں کے سُننے کے خوف سے چُپ رہی اور سرگوشیوں میں ان سات دنوں کی بے چینیاں بتاتی رہی اور وہ اسے بڑے میٹھے میٹھے انداز سے دیکھتا رہا ———

اب وہ اس سے روز ملتی اور اس قدر کھوئی کھوئی پھرتی کہ اماں کو ایک نیا خطرہ لاحق ہوگیا۔

" تمہاری طبیعت گری گری تو نہیں رہتی بٹّو ؟ "

" نہیں اماں میں بالکل اچھی ہوں " وہ بڑے پیار سے مسکرائی۔

" پھر بھی ڈاکٹر کو دکھا لینے میں حرج کیا ہے "

" آپ بھی کمال کرتی ہیں " وہ زور سے ہنستی اور پھر شرما کر رہ جاتی۔

" اللہ میری بچی کو دق سے بچائے " وہ تڑپ کر دُعا کے لئے ہاتھ پھیلا دیتیں،

کیسی کمزور کمزور سی لگ رہی تھی ان دنوں۔ اماں کا کلیجہ منہ کو آتا۔

اب روز رات کو لان میں وہ اس سے اُسی درخت کے نیچے ملتی جہاں پڑوسی لڑکی اس کے جذبات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے محبوب کے

ساتھ پھر اکرتی اور پھر ایک دن وہ بھی اپنی بہن کی طرح پھولوں سے سجی ہوئی کار میں رخصت ہوگئی تھی "یقین کرو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے نہ چھین سکے گی" وہ اسے بازوؤں میں سمیٹ کر کہی ہوئی باتیں بار بار دہراتا ——— "ہم زندگی کے آخری لمحوں تک ساتھ رہیں گے، ہمیں کوئی بھی نہ چھڑا سکے گا" اور وہ جیسے گنگناتی ——— "تمہارے بغیر میری زندگی کتنی سونی تھی۔ میں کتنی تنہا تھی۔ اب میں کتنی آباد ہوں" اس کا جی چاہتا کہ وہ اسے چوم لے مگر وہ جھجک جاتی اور پھر منہ چھپا کر اپنی اس خواہش پر بڑی طرح شرماتی ——— وہ جیسے اڑن کھٹولے پر بھاگے جا رہے تھے۔

آج آسمان بالکل صاف تھا۔ دور دور ابر کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہ آتا، چودھویں کا چاند جیسے وسط آسمان پر چمک رہا تھا۔ اونچے اونچے درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ بس کسی کسی وقت بسیرا لئے ہوئے ننھے پرند پتوں میں ہلچل مچا دیتے اور پھر خاموشی طاری ہو جاتی۔ رات شروع ہوئے تھوڑی ہی دیر بیتی تھی لیکن اس خاموش جگہ پر ایسا معلوم ہوتا جیسے آدھی رات گذر چکی ہے۔ سڑک پر اب صرف کاروں کے زن سے گذرنے کی آواز ہوتی اور پھر خاموشی کا راج ہو جاتا۔ پڑوسی آج شاید سینما دیکھنے گئے ہوئے تھے اس لئے ان کے ہاں بھی سناٹا تھا۔ ایک صرف وہی ایسی تھی جو اتنے سناٹے میں عجیب سے کرب میں ٹہل رہی تھی ——— رات کا اتنا نکھرا ہوا حسن اسے دھیمی دھیمی آنچ میں جلا رہا تھا، اس کا دل چیخ رہا تھا، وہ اس وقت اس سے ملنے کے لئے بے چین تھی۔ وہ آج ہمیشہ کے لئے اس کی بن جانا چاہتی تھی، وہ اسے چومنا چاہتی تھی، وہ اس کے پیروں سے لپٹ کر رونا چاہتی تھی ——— آج اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اب ایک لمحے کو بھی اس سے جدا رہی تو تڑپ کر مر جائے گی ——— جذبات کی شدت سے اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو رہا تھا ———،

لان کے حدود میں پھرتے ہوئے قدم آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے، چاندنی میں نہائے ہوئے اونچے اونچے درختوں کے سائے سے گذرتی وہ اس کے ڈرائنگ روم کا بند دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی ——— بند دروازوں کے شیشوں سے روشنی چھن رہی تھی اور ریڈیو پر ہولے ہولے ارکسٹرا بج رہا تھا۔

"کون! اوہ آپ ہیں" دروازہ کھلا اور وہ اس کے سامنے جھک کر پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ وہ گم سم کھڑی تھی، وہ اسے عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی، وہ سر سے پاؤں تک محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں" وہ بے حد سنجیدہ ہو رہا تھا۔

"جی کچھ نہیں، شکریہ!" وہ تیزی سے واپس مڑی۔ ادھر چلتے ہوئے اس نے پلٹ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ شخص صرف دوسری بار اس سے اس طرح ملنے پر کس قدر حیران کھڑا تھا۔

اشفاق احمد

یہ سردیوں کی ایک یخ بستہ اور طویل رات کی بات ہے میں اپنے گرم گرم بستر میں سر ڈھانپے گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے زور سے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔

"کون ہے؟" میں نے چیخ کر پوچھا اور اس کے جواب میں ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر سے ٹکرایا اور گھپ اندھیرے سے آواز آئی "تھانے والوں نے راتو کو گرفتار کر لیا۔"

"کیا؟" میں نے لرزتے ہوئے ہاتھ پرے دھکیلنا چاہا "کیا ہے؟"

اور تاریکی کا بھوت بولا "تھانے والوں نے راتو کو گرفتار کر لیا ـــــ اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔"

"داؤجی کے بچے" میں نے رونکھے ہو کر کہا "آدھی آدھی رات تنگ کرتے ہیں ـــــ دفع ہو جائیے ـــــ میں نہیں آپ کے گھر رہتا۔ میں نہیں پڑھتا ـــــ داؤجی کے بچے ـــــ کتے!" اور میں رونے لگا۔

داؤجی نے چمکار کر کہا "اگر پڑھے گا نہیں تو پاس کیسے ہوگا! پاس نہیں ہوگا تو بڑا آدمی نہ بن سکے گا پھر لوگ تیرے داؤ کو کیسے جانیں گے؟"

"اللہ کرے سب مر جائیں۔ آپ بھی آپ کو جاننے والے بھی...... اور میں بھی ـــــ میں بھی...... میں بھی" اپنی جوانا مرگی پر میں ایسا رویا کہ دو ہی لمحوں میں گھگھی بندھ گئی۔

داؤجی بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرے جاتے تھے اور کہہ رہے تھے "بس اب چپ کر۔ شاباش ـــــ میرا اچھا بیٹا۔ اس وقت یہ ترجمہ کر دے پھر نہیں جگاؤں گا۔"

آنسوؤں کا تار ٹوٹتا جا رہا تھا۔ میں نے جل کر کہا "آج حرامزادے راتو کو پکڑ کر لے گئے کل کسی اور کو پکڑ لیں گے۔ آپ کا ترجمہ تو......"

"نہیں نہیں" انہوں نے بات کاٹ کر کہا "میرا تیرا وعدہ رہا آج کے بعد رات کو جگا کر کچھ نہ پوچھوں گا ـــــ شاباش اب بتا "تھانے والوں نے راتو کو گرفتار کر لیا۔""

میں نے روٹھ کر کہا "مجھے نہیں آتا۔"

"فوراً نہیں کہہ دیتا ہے" انہوں نے سر سے ہاتھ اٹھا کر کہا "کوشش تو کر!"

"نہیں کرتا!" میں نے جل کر جواب دیا۔

اس پر وہ ذرا ہنسے اور بولے "کارکنان گزمہ خانہ راتو را توقیف کردند ـــــ کارکنان گزمہ خانہ، تھانے والے۔ بھولنا نہیں نیا لفظ ہے

نئی ترکیب ہے دس مرتبہ کہو۔"

مجھے پتہ تھا کہ یہ بلا ٹلنے والی نہیں ناچار گنہ مرخانہ والوں کا پہاڑہ شروع کر دیا۔ جب دس مرتبہ کہہ چکا تو داؤجی نے بڑی لجاجت سے کہا اب سارا فقرہ پانچ بار کہو۔ جب پنجگانہ مصیبت بھی ختم ہوئی تو انہوں نے مجھے آرام سے بستر میں لٹاتے ہوئے اور رضائی اوڑھاتے ہوئے کہا "بھولنا نہیں! صبح اُٹھتے ہی پوچھوں گا۔"

پھر وہ جدھر سے آئے تھے ادھر لوٹ گئے۔

شام کو جب میں ملّاجی سے سیپارے کا سبق لے کر لوٹتا تو خراسیوں والی گلی سے ہو کر اپنے گھر جایا کرتا۔ اس گلی میں طرح طرح کے لوگ بستے تھے مگر میں صرف موٹے ماشکی سے واقف تھا جس کو ہم سب "کدو کریلا ڈھائی آنے" کہتے تھے۔ ماشکی کے گھر کے ساتھ بکریوں کا ایک باڑہ تھا جس کے تین طرف کچے پکے مکانوں کی دیواریں اور سامنے کے رُخ آڑی ترچھی لکڑیوں اور خاردار جھاڑیوں کا اُونچا اُونچا جنگلا تھا۔ اس کے بعد ایک چوکور میدان آتا، پھر لنگڑے کمہار کی کوٹھڑی اور اس کے ساتھ گیردرنگی کھڑکیوں اور پیتل کی کیلوں والے دروازے کا ایک چھوٹا سا پکا مکان۔ اس کے بعد گلی میں ذرا سا خم پیدا ہوتا اور قدرے تنگ ہو جاتی پھر جوں جوں اسکی لمبائی بڑھتی توں توں اس کے دونوں بازو بھی ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے۔ شاید وہ ہمارے قصبے میں سب سے لمبی گلی تھی۔ اور حد سے زیادہ سنسان! اس میں اکیلے چلتے ہوئے مجھے ہمیشہ یوں لگتا تھا جیسے میں بندوق کی نالی میں چلا جا رہا ہوں اور جونہی میں اس کے دہانے سے باہر نکلوں گا زور سے "ٹھائیں" ہو گا اور میں مر جاؤں گا۔ مگر شام کے وقت کوئی نہ کوئی راہگیر اس گلی میں ضرور مل جاتا اور میری جان بچ جاتی۔ ان آنے جانے والوں میں کبھی کبھار ایک سفید مونچھوں والا لمبا سا آدمی بھی ہوتا جس کی شکل بارہ ماہ والے ملکی سے بہت ملتی تھی۔ سر پر ململ کی بڑی سی پگڑی۔ ذرا سی خمیدہ کمر پر خاکی رنگ کا ڈھیلا اور لمبا کوٹ۔ کھدر کا تنگ پائجامہ اور پاؤں میں فلیٹ بوٹ۔ اکثر اس کے ساتھ میری ہی عمر کا ایک لڑکا بھی ہوتا جس نے عین اُسی طرح کے کپڑے پہنے ہوتے اور وہ آدمی سر جھکائے اور اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ اس سے باتیں کیا کرتا۔ جب وہ میرے برابر آتے تو لڑکا میری طرف دیکھتا اور میں اسکی طرف اور پھر ایک ثانیہ ٹھٹھکے بغیر ہم دونوں کو ذرا ذرا موڑتے ہم اپنی اپنی راہ چلے جاتے۔

ایک دن جب میں اور میرا بھائی مٹھیاں کے جوہڑ سے مچھلیاں پکڑنے کی ناکام کوشش کے بعد قصبہ کو واپس آ رہے تھے تو نہر کے پُل پر یہی آدمی اپنی پگڑی گود میں ڈالے بیٹھا تھا اور اسکی سفید چُٹیا میلی مُرغی کے پَر کی طرح اس کے سر سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے بھائی نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے کہا "داؤجی سلام"۔

اور داؤجی نے سر ہلا کر جواب دیا "جیتے رہو"۔

یہ جان کر کہ میرا بھائی اس سے واقف ہے میں بیحد خوش ہوا اور تھوڑی دیر بعد اپنی منّھی آواز میں چلایا "داؤجی سلام"۔

"جیتے رہو! جیتے رہو!!" اُنہوں نے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر کہا۔ اور میرے بھائی نے پٹاخ سے مجھے زنّاٹے کا ایک تھپڑ دیا۔

"شیخی خورے، کُتّے" وہ چیخا "جب میں نے سلام کر دیا تو تیری کیا ضرورت رہ گئی تھی؟ ہر بات میں اپنی ٹانگ پھنسانا ہے کمینہ ——— بھلا کون ہے وہ؟"

"داؤجی!" میں نے بسور کر کہا۔

"کون داؤجی" میرے بھائی نے تنگ کر پوچھا۔

"وہ جو بیٹھے ہیں وہ داؤجی" میں نے آنسو پی کر کہا۔

"بکواس نہ کر" میرا بھائی چڑ گیا اور آنکھیں نکال کر بولا "ہر بات میں میری نقل کرتا ہے کُتّا ——— شیخی خورا!"

پھر میں نہیں بولا اور خاموشی کے ساتھ راہ چلتا رہا۔ در اصل مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ داؤجی سے تعارف ہو گیا۔ اس کا رنج نہ تھا کہ بھائی نے مجھے تھپڑ کیوں مارا۔ وہ تو اسکی عادت ہی تھی۔ بڑا تھا نا اس لئے ہر بات میں اپنی شیخی بگھارتا تھا۔

داؤجی سے علیک سلیک تو ہو ہی گئی تھی۔ اس لئے میں کوشش کر کے گلی سے اس وقت گذرنے لگا جب وہ آ جا رہے ہوں۔ انہیں سلام کر کے بڑا مزہ آتا تھا اور جواب پا کر اس سے بھی زیادہ۔ وہ جیتے رہو کچھ ایسی محبّت سے کہتے کہ زندگی دو چند سی ہو جاتی اور آدمی زمین سے ذرا اوپر اُٹھ کر ہوا میں چلنے لگتا ——— سلام کا یہ سلسلہ کوئی سال بھر یونہی چلتا رہا اور اس اثنا میں مجھے اسی قدر معلوم ہو سکا کہ داؤجی گیرو رنگی کھڑکیوں والے مکان میں رہتے ہیں اور چھوٹا لڑکا ان کا بیٹا ہے۔ میں نے اپنے بھائی سے ان کے متعلق کچھ اور بھی پوچھنا چاہا مگر وہ بڑا سخت آدمی تھا اور میری چھوٹی سے چھوٹی بات پر چڑ جاتا تھا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اس کے پاس گھڑے گھڑائے دو فقرے ہوتے تھے "تجھے کیا" اور "بکواس نہ کر"۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میرے تجسّس کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا۔ اسلامیہ پرائمری سکول سے چوتھی پاس کر کے میں ایم۔ بی ہائی سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا تو داؤجی کا لڑکا میرا ہم جماعت نکلا۔ اس کی مدد سے اور اپنے بھائی کا احسان اُٹھائے بغیر میں یہ جان گیا کہ داؤجی کھتری تھے اور قصبہ کی منصفی میں عرضی نویسی کا کام کرتے تھے۔ لڑکے کا نام امی چند تھا اور وہ جماعت میں سب سے ہشیار تھا۔ اس کی پگڑی کلاس بھر میں سب سے بڑی تھی اور چہرہ بلّی کی طرح چھوٹا۔ چند لڑکے اُسے مہاوٗں کہتے تھے اور باقی نیولا کہہ کر پکارتے تھے۔ مگر میں داؤجی کی وجہ سے اس کو اس کے اصلی نام ہی سے پکارتا تھا اس لئے وہ میرا دوست بن گیا اور ہم نے ایک دوسرے کو نشانیاں دے کر پکّے یار رہنے کا وعدہ کر لیا۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے میں کوئی ایک ہفتہ ہو گا جب میں امی چند کے ساتھ پہلی مرتبہ اس کے گھر گیا۔ وہ گرمیوں کی ایک جھلسانے والی دوپہر تھی لیکن شیخ چلّی کی کہانیاں حاصل کرنے کا شوق مجھ پر بھوت بن کر سوار تھا اور میں بھوک اور دھوپ دونوں سے بے پروا ہو کر سکول سے سیدھا اس کے ساتھ چل دیا۔

امی چند کا گھر چھوٹا سا تھا لیکن بہت ہی صاف ستھرا اور روشن۔ پیتل کی کیلوں والے دروازے کے بعد ذرا سی ڈیوڑھی تھی آگے مستطیل صحن سامنے سرخ رنگ کا برآمدہ اور اس کے پیچھے اتنا ہی بڑا ایک کمرہ۔ صحن میں ایک طرف انار کا پیڑ۔ عقیق کے چند پودے اور دھنیا کی ایک چھوٹی سی کیاری تھی۔ دوسری طرف چوڑی سیڑھیوں کا ایک زینہ جس کی محراب تلے مختصر سی رسوئی تھی۔ گیرو رنگی کھڑکیاں ڈیوڑھی سے ملحقہ بیٹھک میں کھلتی تھیں اور بیٹھک کا دروازہ نیلے رنگ کا تھا۔ جب ہم ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو امی چند نے چلّا کر "بے بے نمستے!" کہا اور مجھے صحن کے بیچوں بیچ چھوڑ کر بیٹھک میں گھس گیا۔ برآمدے میں بوریا بچھائے بے بے مشین چلا رہی تھی اور اس کے پاس ہی ایک لڑکی بڑی سی قینچی سے کپڑے قطع کر رہی تھی۔ بے بے نے منہ ہی منہ میں کچھ جواب دیا اور ویسے ہی مشین چلاتی رہی۔ لڑکی نے نگاہیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن موڑ کر کہا "بے بے شاید ڈاکٹر صاحب کا لڑکا ہے۔"

مشین رُک گئی۔

"ہاں ہاں" ببے بے نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں اپنے جزدان کی رسّی مروڑتا اور ٹیڑھے ٹیڑھے پاؤں دھرتا برآمدے کے ستون کے ساتھ آ لگا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" ببے بے نے چمکار کر پوچھا اور میں نے نگاہیں جھکا کر آہستہ سے اپنا نام بتایا۔

"آفتاب سے بہت شکل ملتی ہے" اس لڑکی نے قینچی زمین پر رکھ کر کہا "ہے نا بے بے؟"

"کیوں نہیں بھائی جو ہوا۔"

"آفتاب کیا؟" اندر سے آواز آئی "آفتاب کیا بیٹا؟"

"آفتاب کا بھائی ہے داؤ جی" لڑکی نے رکتے ہوئے کہا "امی چند کے ساتھ آیا ہے۔"

اندر سے داؤ جی برآمد ہوئے۔ انہوں نے گھٹنوں تک اپنا پائجامہ چڑھا رکھا اور کرتہ اتارا ہوا تھا۔ مگر سر پہ پگڑی بدستور تھی۔ پانی کی ایک ہلکی سی بالٹی اٹھائے وہ برآمدے میں آ گئے اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے "ہاں بہت شکل ملتی ہے۔ مگر میرا آفتاب بہت دبلا ہے اور یہ گولو مولو سا ہے" پھر بالٹی فرش پر رکھ کے انہوں نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور پاس ہی کاٹھ کا ایک سٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے۔ زمین سے پاؤں اوپر اٹھا کر انہوں نے آہستہ سے انہیں جھاڑا اور پھر بالٹی میں ڈال دیئے۔

"آفتاب کا خط آتا ہے؟" انہوں نے بالٹی سے پانی کے چلّو بھر بھر کر ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"آتا ہے جی" میں نے ہولے سے کہا "پرسوں آیا تھا۔"

"کیا لکھتا ہے؟"

"پتہ نہیں جی ابّا جی کو پتہ ہے۔"

"اچھا" انہوں نے سر ہلا کر کہا "تو ابّا جی سے پوچھا کرنا! ——— جو پوچھتا نہیں اسے کسی بھی بات کا علم نہیں ہوتا۔"

میں چپ رہا۔

تھوڑی دیر انہوں نے ویسے ہی چلّو ڈالتے پوچھا "کونسا سیپارہ پڑھ رہے ہو؟"

"چوتھا" میں نے وثوق سے جواب دیا۔

"کیا نام ہے تیسرے سیپارے کا؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی پتہ نہیں" میری آواز پھر ڈوب گئی۔

"تِلْكَ الرُّسُلُ" انہوں نے پانی سے ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ پھر تھوڑی دیر وہ ہاتھ جھٹکتے اور ہوا میں لہراتے رہے۔ ببے بے مشین چلاتی رہی، وہ لڑکی نعمت خانے سے روٹی نکال کر برآمدے کی چوکی پر لگانے لگی اور میں جزدان کی ڈوری کو کھونٹی پہ لپیٹتا رہا۔ امی چند ابھی تک بیٹھک کے اندر ہی تھا اور میں ستون کے ساتھ ساتھ جھینپ کی عمیق گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا۔ معاً داؤ جی نے نگاہیں میری طرف پھیر کر کہا۔ "سورۂ فاتحہ سناؤ!"

"مجھے نہیں آتی جی" میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔

انہوں نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا "الحمد للہ بھی نہیں جانتے؟"

"الحمدللہ تو جانتا ہوں جی" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ذرا مسکرائے اور گویا اپنے آپ سے کہنے لگے "ایک ہی بات ہے! ایک ہی بات ہے!" پھر انہوں نے سر کے اشارے سے کہا سناؤ۔"

جب میں سنانے لگا تو انہوں نے اپنا پائجامہ گھٹنوں سے نیچے کر لیا اور پگڑی کا شملہ چوڑا کر کے کندھوں پر ڈال لیا۔ اور جب میں نے ولاالضالین کہا تو میرے ساتھ ہی انہوں نے بھی آمین کہا۔ مجھے خیال ہوا کہ وہ ابھی اٹھ کر مجھے کچھ انعام دیں گے کیونکہ پہلی مرتبہ جب میں نے اپنے تایا جی کو الحمد سنائی تھی تو انہوں نے بھی ایسے ہی آمین کیا تھا اور ساتھ ہی ایک روپیہ مجھے انعام بھی دیا تھا مگر داؤجی اسی طرح بیٹھے رہے بلکہ اور بھی پتھر ہو گئے۔ اتنے میں امی چند کتاب تلاش کر کے لے آیا اور جب میں چلنے لگا تو میں نے عادت کے خلاف آہستہ سے کہا "داؤجی سلام" اور انہوں نے ویسے ہی ڈوبے ڈوبے ہوئے سے جواب دیا "جیتے رہو" بے بے نے مشین روک کر کہا "کبھی کبھی امی چند کے ساتھ کھیلنے آجایا کر......"

"ہاں ہاں آجایا کر" داؤجی چونک کر بولے "آفتاب بھی آیا کرتا تھا" پھر انہوں نے بالٹی پر جھکتے ہو کہا "ہمارا آفتاب تو ہم سے بہت دور ہو گیا" اور وہ فارسی کا شعر سا پڑھنے لگے۔

یہ داؤجی سے میری باقاعدہ پہلی ملاقات تھی اور اس ملاقات سے میں یہ نتائج اخذ کر کے چلا کہ داؤجی بڑے کنجوس ہیں۔ حد سے زیادہ چپ سے ہیں اور کچھ بہرے سے ہیں۔ اسی دن شام کو میں نے اپنی اماں کو بتایا کہ میں داؤجی کے گھر گیا تھا اور وہ آفتاب بھائی کو بہت یاد کر رہے تھے۔

اماں نے قدرے تلخی سے کہا "تو مجھ سے پوچھ تو لیتا۔ بے شک آفتاب ان سے پڑھتا رہا ہے اور ان کی بہت عزت کرتا ہے مگر تیرے اباجی ان سے بولتے نہیں ہیں۔ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا سو اب تک ناراضی چلی آتی ہے۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ تو ان کے ہاں گیا تھا وہ خفا ہوں گے" پھر اماں نے ذرا ہمدرد بن کر کہا "اپنے ابا سے اس کا ذکر نہ کرنا۔"

میں اباجی سے بھلا اس کا ذکر کیوں کرتا مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میں داؤجی کے ہاں جاتا رہا اور خوب خوب ان سے معتبری کی باتیں کرتا رہا۔ وہ چٹائی بچھائے کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے میں آہستہ سے ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو جاتا اور وہ کتاب بند کر کے کہتے "گولو آگیا" پھر میری طرف مڑتے اور ہنس کر کہتے "کوئی گپ سنا" اور میں اپنی بساط اور سمجھ کے مطابق ڈھونڈ ڈھانڈ کے کوئی بات سناتا تو وہ خوب ہنستے بس یونہی میرے لئے ہنستے حالانکہ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ ایسی دلچسپ باتیں بھی نہ ہوتی تھیں۔ پھر وہ اپنے رجسٹر سے کوئی کاغذ نکال کر کہتے لے ایک سوال نکال۔ اس بات سے میری جان جاتی تھی لیکن ان کا وعدہ بڑا رسیلا ہوتا کہ ایک سوال اور پندرہ منٹ باتیں اس کے بعد ایک اور سوال اور پھر پندرہ منٹ گپیں۔ چنانچہ میں مان جاتا اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتا۔ لیکن ان کے خود ساختہ سوال کچھ ایسے الجھیلے ہوتے کہ اگلی باتوں اور اگلے سوالوں کا وقت بھی نکل جاتا۔ اگر خوش قسمتی سے سوال جلد حل ہو جاتا تو وہ چٹائی کو ہاتھ لگا کر پوچھتے یہ کیا ہے؟ "چٹائی" میں منہ پھاڑ کر جواب دیتا "اوں ہوں" وہ سر ہلا کر کہتے "فارسی میں بتاؤ" تو میں تنک کر جواب دیتا "لو جی ہمیں کوئی فارسی پڑھائی جاتی ہے" اس پر وہ چمکار کر کہتے "میں جو پڑھاتا ہوں گولو۔ میں جو سکھاتا ہوں ——— سنو! فارسی میں بوریا اعربی میں حصیر" میں شرارت سے ہاتھ جوڑ کر کہتا "بخشو جی بخشو، فارسی بھی اور عربی بھی۔ میں نہیں پڑھتا جی معاف کرو،" مگر وہ سنی ان سنی ایک کر کے کہے جاتے فارسی بوریا عربی حصیر۔ اور پھر کوئی چاہے اپنے کانوں میں سیسہ بھر لیتا داؤجی کے الفاظ گھستے چلے جاتے ——— امی چند کتابوں کا کیڑا تھا۔ سارا دن بیٹھک میں

بیٹھا لکھتا پڑھتا رہتا۔ داؤجی اس کے اوقات میں مخل نہ ہوتے تھے لیکن ان کے وار امی چند پر بھی برابر ہوتے رہتے۔ وہ اپنی نشست سے اُٹھ کر گھڑے سے پانی پینے آیا داؤجی نے کتاب سے نگاہیں اُٹھا کر پوچھا "بیٹا ڈوُ کا مادّہ کیا ہے؟"

اس نے گلاس منہ کے ساتھ لگائے لگائے "ڈبڈ" کہا اور پھر گلاس گھڑونچی تلے پھینک کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ داؤجی پھر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ گھر میں ان کو اپنی بیٹی سے بڑا پیار تھا۔ ہم سب اُسے بی بی کہہ کر پکارتے تھے اکیلے داؤجی نے اس کا نام قرۃ رکھا ہوا تھا۔ اکثر بیٹھے بیٹھے ہانک لگا کر کہتے "قرۃ بٹیا یہ قینچی تجھ سے کب چھوٹے گی؟" اور وہ اس کے جواب میں مُسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ بے بے کو اس نام سے بڑی چڑ تھی۔ وہ چیخ کر جواب دیتی "تُو نے اس کا نام قرۃ رکھ کر اس کے بھاگ میں کُرتے سینے لکھوا دیئے ہیں۔ مُنہ اچھا نہ ہو تو شبد تو اچھے نکالنے چاہئیں" اور داؤجی ایک لمبی سانس لے کر کہتے "جاہل اس کا مطلب کیا جانیں" اس پر بے بے کا غصہ چمک اُٹھتا اور اس کے منہ میں جو آتا کہتی چلی جاتی۔ پہلے کوسنے پھر بد دعائیں اور آخر میں گالیوں پر اُتر آتی۔ بی بی روکتی تو داؤجی کہتے "ہوائیں چلنے کو ہوتی ہیں بٹیا اور گالیاں برسنے کو۔ تم انہیں روکو مت انہیں ٹوکو مت۔ پھر وہ اپنی کتابیں سمیٹتے اور اپنا محبوب حصیر اُٹھا کر چپکے سے سیڑھیاں چڑھ جاتے۔

نویں جماعت کے شروع ہی میں مجھے ایک بُری عادت پڑ گئی اور اس بُری عادت نے عجیب گُل کھلائے۔ حکیم علی احمد مرحوم ہمارے قصبہ کے ایک ہی حکیم تھے۔ علاج معالجے سے تو ان کو کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی لیکن باتیں بڑی مزیدار سُناتے تھے۔ اولیاؤں کے تذکرے، جنّوں بھوتوں کی کہانیاں اور حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کی گھریلو زندگی کی داستانیں اُن کے تیر بہدف ٹوٹکے تھے۔ ان کے تنگ و تاریک مطب میں معجون کے چند ڈبے۔ شربت کی دس پندرہ بوتلوں اور دو آتشی شیشیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ دواؤں کے علاوہ وہ اپنی طلسماتی تقریر اور حضرت سلیمان کے خاص صدری تعویذوں سے مریض کا علاج کیا کرتے۔ انہی باتوں کے لئے دور دراز گاؤں کے مریض ان کے پاس کھنچے چلے آتے اور فیضیاب ہو کر جاتے۔ ہفتہ دو ہفتہ کی صحبت میں میرا ان کے ساتھ ایک معاہدہ ہو گیا۔ میں اپنے ہسپتال سے ان کے لئے خالی بوتلیں اور شیشیاں چُرا کے لاتا اور اس کے بدلے میں وہ مجھے داستان امیر حمزہ کی جلدیں پڑھنے کے لئے دیا کرتے۔ یہ کتابیں کچھ ایسی دلچسپ تھیں کہ میں رات رات بھر اپنے بستر میں دبک کر انہیں پڑھا کرتا اور صبح دیر تک سویا رہتا۔ اماں میرے اس رویّے سے سخت نالاں تھیں، ابّا جی کو میری صحت برباد ہونے کا خطرہ لاحق تھا۔ لیکن میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے جان چلی جائے اب کے دسویں میں وظیفہ ضرور حاصل کروں گا۔ رات طلسم ہوشربا کے ایوانوں میں بسر ہوتی اور دن کلاس میں بنچ پر کھڑے ہو کر۔ سہ ماہی امتحان میں فیل ہوتے ہوتے بچا۔ ششماہی میں بیمار پڑ گیا اور سالانہ امتحان کے موقعہ پر حکیم جی کی مدد سے ماسٹروں سے مل ملا کر پاس ہو گیا۔ دسویں میں صندلی نامہ، فسانۂ آزاد اور الف لیلہ ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ فسانۂ آزاد اور صندلی نامہ گھر پر رکھے تھے لیکن الف لیلہ سکول کے ڈیسک میں بند رہتی۔ آخری بنچ پر جغرافیہ کی کتاب تلے سندباد جہازی کے ساتھ ساتھ چلتا اور اس طرح دُنیا کی سیر کرتا......

بائیس مئی کا واقعہ ہے کہ صبح دس بجے یونیورسٹی سے نتیجہ کی کتاب ایم۔ بی۔ ہائی سکول پہنچی۔ امی چند نہ صرف سکول میں بلکہ ضلع بھر میں اوّل آیا تھا۔ چھ لڑکے فیل تھے اور بائیس پاس۔ حکیم جی کا جادو یونیورسٹی پر نہ چل سکا اور پنجاب کی جابر دانشگاہ نے میرا نام بھی ان چھٹوں لڑکوں میں شامل کر دیا۔ اسی شام قبلہ گاہی نے بید سے میری پٹائی کی اور گھر سے باہر نکال دیا۔ میں ہسپتال کے رہٹ کی گدی پر آ بیٹھا اور رات گئے تک سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیئے اور کدھر جانا چاہیئے۔ خدا کا ملک تنگ نہیں تھا اور میں عمرو عیار کے ہتھکنڈوں

اور سند باد جہازی کے تمام طریقوں سے واقف تھا مگر پھر بھی کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ کوئی دو تین گھنٹے مسلسل اسی طرح ساکت و جامد اس گدی پر بیٹھا زیست کرنے کی راہیں سوچتا رہا۔ اتنے میں اماں سفید چادر اوڑھے مجھے ڈھونڈتی ڈھونڈتی ادھر آگئیں اور اباجی سے معافی دے دینے کا وعدہ کر کے مجھے پھر گھر لے گئیں۔ مجھے معافی وافی سے کوئی دلچسپی نہ تھی مجھے تو بس ایک رات اور ان کے یہاں گذارنی تھی اور صبح سویرے اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ چنانچہ میں آرام سے ان کے ساتھ جا کر حسبِ معمول اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

اگلے دن میرے فیل ہونے والے ساتھیوں میں سے خوشیا کوڈو اور ڈبلیو بیب بیب مسجد کے پچھواڑے ٹال کے پاس بیٹھے مل گئے۔ وہ لاہور جا کر بزنس کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ڈبلیو بیب بیب نے مجھے بتایا کہ لاہور میں بہت بزنس ہے کیونکہ اس کے بھاپا جی اکثر اپنے دوست فتح چند کے ٹھیکوں کا ذکر کیا کرتے تھے جس نے سال کے اندر اندر دو کاریں خرید لی تھیں۔ میں نے ان سے بزنس کی نوعیت کے بارے میں پوچھا تو بیب بیب نے کہا لاہور میں ہر طرح کا بزنس مل جاتا ہے۔ بس ایک دفتر ہونا چاہیئے اور اس کے سامنے بڑا سا سائن بورڈ۔ سائن بورڈ کو دیکھ کر لوگ خود ہی بزنس دے جاتے ہیں۔ اس وقت بزنس سے مراد وہ کرنسی نوٹ لے رہا تھا! میں نے ایک مرتبہ پھر وضاحت چاہی تو کوڈو چمک کر بولا "یار ڈبلیو سب کچھ جانتا ہے۔ یہ بتا کہ تو تیار ہے یا نہیں"؟

پھر اس نے پلٹ کر ڈبلیو سے پوچھا "انار کلی میں دفتر بنائیں گے نا؟"

ڈبلیو نے ذرا سوچ کر کہا "انار کلی میں یا شاہ عالمی کے باہر دونوں ہی جگہیں ایک سی ہیں"

میں نے کہا "انار کلی زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہی زیادہ مشہور جگہ ہے اور اخباروں میں جتنے بھی اشتہار نکلتے ہیں ان میں انار کلی لاہور لکھا ہوتا ہے۔"

چنانچہ یہ طے پایا کہ اگلے دن دو بجے کی گاڑی سے ہم لاہور روانہ ہو جائیں گے!

گھر پہنچ کر میں سفر کی تیاری کرنے لگا۔ بوٹ پالش کر رہا تھا کہ نوکر نے آ کر شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا "چلو جی ڈاکٹر صاحب بلاتے ہیں"

"کہاں ہیں؟" میں نے برش زمین پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔

"ہسپتال میں" وہ بدستور مسکرا رہا تھا کیونکہ میری پٹائی کے روز حاضرین میں وہ بھی شامل تھا۔

میں ڈرتے ڈرتے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا۔ پھر آہستہ سے جالی والا دروازہ کھول کر اباجی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ان کے علاوہ داؤجی بھی بیٹھے تھے۔ میں نے سہمے سہمے داؤجی کو سلام کیا اور اس کے جواب میں بڑی دیر کے بعد جیتے رہو کی مانوس دعا سنی۔

"ان کو پہچانتے ہو؟" اباجی نے سختی سے پوچھا۔

"بے شک!" میں نے ایک مہذب سیلزمین کی طرح کہا۔

"بے شک کے بچے، حرامزادے، میں تیری یہ سب......"

"نہ نہ ڈاکٹر صاحب" داؤجی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا "یہ تو بہت ہی اچھا بچہ ہے اس کو تو......"

اور ڈاکٹر صاحب نے بات کاٹ کر تلخی سے کہا "آپ نہیں جانتے منشی جی اس کمینے نے میری عزت خاک میں ملا دی"

"آپ فکر نہ کریں" داؤجی نے سر جھکائے کہا "یہ ہمارے آفتاب سے بھی ذہین ہے اور ایک دن......"

اب کے ڈاکٹر صاحب کو غصہ آ گیا اور انہوں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا "کیسی بات کرتے ہو منشی جی! یہ آفتاب کے جوتے کی برابری نہیں کر سکتا"

"کرلیگا، کرلیگا ——— ڈاکٹر صاحب" داؤ جی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "آپ خاطر جمع رکھیں۔"

پھر وہ اپنی کرسی سے اُٹھے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے "میں سیر کو چلتا ہوں تم بھی میرے ساتھ آؤ راستے میں باتیں کریں گے۔"

ابا جی اُسی طرح کرسی پر بیٹھے غصّے کے عالم میں اپنا رجسٹر اُلٹ پلٹ کرتے اور بڑبڑاتے رہے۔ میں نے آہستہ آہستہ چل کر جالی والا دروازہ کھولا تو داؤ جی نے پیچھے مڑ کر کہا "ڈاکٹر صاحب بھول نہ جائیے گا ابھی بھجوا دیجئے گا۔"

ابا جی نے ویسے ہی چیزیں پٹختے "اچھا" کہا اور داؤ جی خدا حافظ کہہ کر میرے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آئے۔

داؤ جی مجھے اِدھر اُدھر گھماتے اور مختلف درختوں کے نام فارسی میں بتلاتے نہر کے اُسی پُل پر لے گئے جہاں پہلے پہل میرا ان سے تعارف ہوا تھا۔ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر انہوں نے پگڑی اُتار کر گود میں ڈال لی، سر پہ ہاتھ پھیرا اور مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور کہا "آج سے میں تمہیں پڑھاؤنگا اور اگر جماعت میں اول نہ لا سکا تو فرسٹ ڈویژن ضرور دلوا دونگا۔ میرے ہر ارادے میں خداوند تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے اور اس ہستی نے مجھے اپنی رحمت سے کبھی مایوس نہیں کیا......"

"مجھ سے پڑھائی نہ ہوگی" میں نے گستاخی سے بات کاٹی۔

"تو اور کیا ہوگا گولو؟" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے کہا "میں بزنس کرونگا، روپیہ کماؤنگا اور اپنی کار لیکر یہاں آؤنگا پھر دیکھنا......"

اب کے داؤ جی نے میری بات کاٹی اور بڑی محبت سے کہا "خدا ایک چھوڑ تجھے دس کاریں دے لیکن ایک اَن پڑھ کی کار میں نہیں بیٹھونگا ڈاکٹر صاحب۔"

میں نے جل کر کہا "مجھے کسی کی پروا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے گھر راضی میں اپنے یہاں خوش۔"

انہوں نے حیران ہو کر پوچھا "میری بھی پروا نہیں؟" میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ دُکھی سے ہو گئے اور بار بار پوچھنے لگے "میری بھی پروا نہیں؟ اوگولو میری بھی پروا نہیں؟"

مجھے ان کے لہجہ پر ترس آنے لگا اور میں نے آہستہ سے کہا "آپ کی تو ہے مگر......" مگر انہوں نے میری بات نہ سُنی اور کہنے لگے "اگر اپنے حضرت کے سامنے میرے مُنہ سے ایسی بات نکل جاتی؟ اگر میں یہ کفر کا کلمہ کہہ جاتا...... تو ——— تو......" انہوں نے فوراً پگڑی اُٹھا کر سر پر رکھ لی اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے "میں حضور کے دربار کا ایک ادنےٰ کُتّا۔ میں حضرت مولانا کی خاک پا سے بدتر۔ بندہ ہو کر آقا سے یہ کہتا لعنت کا طوق نہ پہنتا؟" پھر انہوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے اور سر بالکل گود میں جھکا کر بولے "میں ذات کا گڈریا۔ میرا باپ منڈاسی کا گوالا۔ میں جہالت کا فرزند۔ میرا خاندان ابوجہل کا خانوادہ اور آقا کی ایک نظرِ کرم، حضرت کا ایک اشارہ۔ حضور نے چلتو کو منشی جینت رام بنا دیا۔ لوگ کہتے ہیں منشی جی میں کہتا ہوں رحمۃ اللہ علیہ کا کفش بردار...... لوگ سمجھتے ہیں......" داؤ جی کبھی ہاتھ جوڑتے، کبھی سر جھکاتے کبھی اُنگلیاں چُوم کر آنکھوں کو لگاتے اور بیچ بیچ میں فارسی کے شعر پڑھتے جاتے۔ میں کچھ پریشان سا پشیمان سا ان کا زانو چھُو کر آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا داؤ جی! داؤ جی؟! اور داؤ جی "میرے آقا، حضرت مولانا، میرے مرشد" کا وظیفہ کئے جاتے۔ جب جذب کا یہ عالم دُور ہوا تو نگاہیں اُوپر اُٹھا کر بولے "کیا اچھا موسم ہے۔ دن بھر گرمی پڑتی ہے تو خوشگوار شاموں کا نزول ہوتا ہے" پھر وہ پُل کی دیوار سے اُٹھے اور بولے "چلو اب چلیں بازار سے تھوڑا سودا خریدنا ہے" میں جیسا سرکش و بدمزاج بن کر ان کے ساتھ آیا تھا اس سے کہیں زیادہ منفعل اور خجل ان کے ساتھ لوٹا۔ گھُٹّے پنساری یعنی دسویب بب کے باپ کی

دوکان سے انہوں نے گھر بلو ضروریات کی چند چیزیں خریدیں اور لفافے گودیں اُٹھا کر چل دیئے۔ میں بار بار ان سے لفافے لینے کی کوشش کرتا مگر ہمت نہ پڑتی ایک عجیب سی شرم ایک انوکھی سی ہچکچاہٹ مانع تھی اور اسی تامّل اور جھجک میں ڈوبتا اُبھرتا میں ان کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر یہ بھید کھلا کہ اب میں انہی کے ہاں سویا کرونگا اور وہیں پڑھا کرونگا کیونکہ میرا بستر مجھ سے بھی پہلے وہاں پہنچا ہُوا تھا اور اس کے پاس ہی ہمارے یہاں سے بھیجی ہوئی ایک ہریکین لالٹین بھی رکھی تھی۔

بزنس مین بننا اور ہاں ہاں کرتی پیکارڈ اڑائے پھرنا میرے مقدر میں نہ تھا۔ گو میرے ساتھیوں کی روانگی کے تیسرے ہی روز بعد ان کے والدین بھی انہیں لاہور سے پکڑ لائے لیکن اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو شاید اس وقت انارکلی میں ہمارا دفتر پتہ نہیں ترقی کے کونسے شانداراسال میں داخل ہو چکا ہوتا!

داؤ جی نے میری زندگی اجیرن کر دی، مجھے تباہ کر دیا مجھ پہ جینا حرام کر دیا۔ سارا دن سکول کی بکواس میں گذرتا اور رات، گرمیوں کی مختصر سی رات، ان کے سوالات کا جواب دینے میں۔ کوٹھے پہ ان کی کھاٹ میرے بستر کے ساتھ لگی ہے اور وہ مونگ رسول اور مرالہ کی نہروں کی بابت پوچھ رہے ہیں۔ میں نے بالکل ٹھیک بتا دیا ہے وہ پھر اسی سوال کو دُہرا رہے ہیں میں نے پھر ٹھیک بتا دیا ہے اور انہوں نے پھر انہی نہروں کو آگے لا کھڑا کیا ہے۔ میں جل جاتا اور جھڑک کر کہتا "مجھے نہیں پتہ میں نہیں بتاتا" تو وہ خاموش ہو جاتے اور دم سادھ لیتے میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا تو وہ شرمندگی کنکھ بنکر پتلیوں میں اُترتی جاتی۔ میں آہستہ سے کہتا "داؤ جی"

"ہوں!" ایک گھمبیر سی آواز آتی۔

"داؤ جی کچھ اور پوچھو"

داؤ جی نے کہا "بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے —— اسکی ترکیب نحوی کرو"

میں نے سعادتمندی کے ساتھ کہا "جی یہ تو بہت لمبا فقرہ ہے صبح لکھ کر بتا دونگا کوئی اور پوچھئے"

انہوں نے آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھائے کہا "میرا گو تو بہت اچھا ہے"

میں نے ذرا سوچکر کہنا شروع کیا بہت اچھا صفت، ہے حرفِ ربط مل کر بنا مسند......

اور داؤ جی اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئے، ہاتھ اُٹھا کر بولے جانِ پدر تجھے پہلے بھی کہا ہے مسند الیہ پہلے بتایا کر"

میں نے ترکیب نحوی سے جان چھڑانے کے لئے پوچھا "آپ مجھے جانِ پدر کیوں کہتے ہیں جانِ داؤ کیوں نہیں کہتے؟"

"شاباش" وہ خوش ہو کر کہتے "ایسی باتیں پوچھنے کی ہوتی ہیں۔ جان لفظ فارسی کا ہے اور داؤ بھاشا کا ان کے درمیان فارسی اضافت نہیں لگ سکتی۔ جو لوگ دن بدن لکھتے یا بولتے ہیں سخت غلطی کرتے ہیں روز بروز کہو یا دن پہ دن۔ اسی طرح سے......

اور جب میں سوچتا کہ یہ تو ترکیب نحوی سے بھی خطرناک معاملے میں اُلجھ گیا ہوں تو جمائی لے کر پیار سے کہتا "داؤ جی اب نیند آرہی ہے!"

"اور وہ ترکیب نحوی؟ وہ جھٹ سے پوچھتے۔

اس کے بعد میں چاہے لاکھ بہانے کرتا ادھر اُدھر کی ہزار باتیں کرتا مگر وہ اپنی کھاٹ پر ایسے ہی بیٹھے رہتے۔ بلکہ اگر ذرا سی دیر ہو جاتی تو کرسی پر رکھی ہوئی پگڑی اُٹھا کر سر پہ دھر لیتے۔ چنانچہ کچھ بھی ہوتا ان کے ہر سوال کا خاطر خواہ جواب دینا پڑتا۔

امی چند کالج چلا گیا تو اس کی بیٹھک مجھے مل گئی اور داؤجی کے دل میں اسکی محبت پر بھی میں نے قبضہ کر لیا۔ اب مجھے داؤجی بہت اچھے لگنے لگے تھے لیکن ان کی جو باتیں مجھے اُس وقت بُری لگتی تھیں وہ اب بھی بُری لگتی ہیں بلکہ اب پہلے سے کسی قدر زیادہ، شاید اس لئے کہ اب میں نفسیات کا ایک ہونہار طالب علم ہوں اور داؤجی پُرانے مُلّائی مکتب کے پروردہ تھے۔ سب سے بُری عادت ان کی اُٹھتے بیٹھتے سوال پُوچھتے رہنے کی تھی اور دوسری کھیل کود سے منع کرنے کی۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ آدمی پڑھتا رہے پڑھتا رہے اور جب اس مدقوق کی موت کا دن قریب آئے تو کتابوں کے ڈھیر پر جان دیدے۔ صحت جسمانی قائم رکھنے کے لئے ان کے پاس بس ایک ہی نسخہ تھا، لمبی سیر! اور وہ بھی صبح کی۔ تقریباً روز سورج نکلنے سے کوئی دو گھنٹے پیشتر وہ مجھے بیٹھک میں جگانے آتے اور میرا کندھا ہلا کر کہتے "اُٹھ گوتو موٹا ہو گیا بیٹا" دنیا جہان کے والدین صبح جگانے کے لئے یہ کہا کرتے ہیں کہ اُٹھو بیٹا صبح ہو گئی یا سورج نکل آیا مگر وہ "موٹا ہو گیا" کہہ کر میری تذلیل کیا کرتے ہیں میں نانا تو چمکار کر کہتے "مجدّا ہو جائے گا بیٹا تو گھوڑے پر ضلع کا دورہ کیسے کیا کریگا!"

اور میں گرم گرم بستر سے ہاتھ جوڑ کر کہتا "داؤجی خدا کے لئے مجھے صبح نہ جگاؤ چاہے مجھے قتل کر دو۔ مجھے جان سے مار دو"

یہ فقرہ ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی وہ فوراً میرے سر پر لحاف ڈال دیتے اور باہر نکل جاتے۔

بے بے کو ان داؤجی سے اللہ واسطے کا بیر تھا اور داؤجی ان سے بہت ڈرتے تھے۔ وہ سارا دن محلے والیوں کے کپڑے سیا کرتیں اور داؤجی کو کوسنے دیئے جاتیں۔ ان کی اس زبان درازی پر مجھے بڑا غصہ آتا تھا مگر پائی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہ ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھار جب وہ ناگفتنی گالیوں پر اُتر آتیں تو داؤجی میرے پاس بیٹھک میں آجاتے اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر کُرسی پہ بیٹھ جاتے۔ تھوڑی دیر بعد کہتے "غیبت کرنا بڑا گناہ ہے لیکن میرا خدا مجھے معاف کرے تیری بے بے بھٹیارن ہے اور اسکی سرائے میں میں میری قرۃ العین اور تھوڑا تھوڑا تو بھی، ہم تینوں بڑے عاجز مسافر ہیں۔" اور واقعی بے بے بھٹیارن سی تھی۔ اسکا سخت رنگ کالا تھا اور دانت بے حد سفید، ماتھا محراب دار اور آنکھیں چُنیاں سی۔ چلتی تو ایسی گھربرائی کے ساتھ جیسے (خدا مجھے بھی معاف کرے) کُٹنی کنسوئیاں لیتی پھرتی ہے۔ بچاری بی بی کو ایسی ایسی بُری باتیں کہتی کہ وہ دنوں دن رو رو کر ہلکان ہوا کرتی۔ ایک امی چند کے ساتھ اسکی بنتی تھی شاید اس وجہ سے کہ دونوں ہمشکل تھے یا شاید اس وجہ سے کہ اس کو بی بی کی طرح اپنے داؤجی سے پیار نہ تھا۔ یوں تو بی بی بچاری بہت اچھی لگتی تھی مگر اس سے میری بھی نہ بنتی تھی۔

میں کوٹھے پر بیٹھا سوال نکال رہا ہوں داؤجی نیچے بیٹھے ہیں اور بی بی اوپر برساتی سے ایندھن لینے آئی تو ذرا رُک کر مجھے دیکھا پھر منڈیر سے جھانک کر بولی "داؤجی پڑھ نہیں رہا ہے تنکوں کی چارپائیاں بنا رہا ہے"

میں غصیل بچے کی طرح منہ چڑا کر کہتا "تجھے کیا، نہیں پڑھتا، تو کیوں بڑبڑ کرتی ہے ——— آئی بڑی تھانیدارنی"

اور داؤجی نیچے سے ہانک لگا کر کہتے "نہ نہ گوتو موتو بہنوں سے نہیں جھگڑا کرتے"

اور میں زور سے چِلّاتا "پڑھ رہا ہوں جی جھوٹ بولتی ہے"

داؤجی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آجاتے اور کاپیوں کے نیچے نیم پوشیدہ چارپائی دیکھ کر کہتے "قرۃ بیٹیا تو اس کو چڑایا نہ کر۔ یہ جن بڑی مشکل سے قابو کیا ہے اگر ایک بار پھر بگڑ گیا تو مشکل سے سنبھلے گا"

بی بی کہتی "کاپی اُٹھا کر دیکھ لو داؤجی اس کے نیچے ہے وہ چارپائی جس سے کھیل رہا تھا"

میں قہر آلودہ نگاہوں سے بی بی کو دیکھتا اور وہ لکڑیاں اُٹھا کر نیچے اُتر جاتی۔ پھر داؤجی سمجھاتے کہ بی بی یہ سب کچھ تیرے فائدے

کے لئے کہتی ہے ورنہ اُسے کیا پڑی ہے کہ مجھے بتاتی پھرے۔ تو فیل ہو یا پاس اسکی بلا سے! مگر وہ تیری بھلائی چاہتی ہے تیری بہتری چاہتی ہے۔"
اور مجھے داؤجی کی یہ بات ہرگز سمجھ نہ آتی تھی۔ میری شکائتیں کرنے والی میری بھلائی کیونکر چاہ سکتی تھی!

ان دنوں معمول یہ تھا کہ صبح دس بجے سے پہلے داؤجی کے ہاں سے چل دیتا گھر جا کر ناشتہ کرتا اور پھر سکول پہنچ جاتا۔ آدھی چھٹی پر میرا کھانا سکول بھیجدیا جاتا اور شام کو سکول بند ہونے پر گھر آکے اپنی لالٹین تیل سے بھرتا اور داؤجی کے یہاں آجاتا۔ پھر رات کا کھانا بھی مجھے داؤجی کے گھر پر ہی بھجوا دیا جاتا۔ جن ایام میں منصفی بند ہوتی داؤجی سکول کی گراؤنڈ میں آکر بیٹھ جاتے اور میرا انتظار کرنے لگتے۔ وہاں سے گھر تک سوالات کی بوچھاڑ رہتی۔ سکول میں جو کچھ پڑھایا گیا ہوتا اسکی تفصیل پوچھتے۔ پھر مجھے میرے گھر تک چھوڑ کر خود سبیر کو چلے جاتے۔ ہمارے قصبہ میں منصفی کا کام مہینے میں دس دن ہوتا تھا اور بیس دن منصف صاحب بہادر کی کچہری ضلع میں رہتی تھی۔ یہ دس دن داؤجی باقاعدہ کچہری میں گذارتے تھے ایک آدھ عرضی آجاتی تو دو چار روپے کما لیتے ورنہ فارغ اوقات میں وہاں بھی مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھتے۔ بے بے کا کام اچھا تھا اسکی کنز ہونٹ اور محلے والیوں سے جوڑ توڑ اچھے مالی نتائج پیدا کرتی تھی۔ چونکہ پچھلے چند سالوں سے گھر کا بیشتر خرچ اسکی سلائی سے چلتا تھا اس لئے وہ داؤجی پر اور بھی حاوی ہو گئی تھی ——— ایک دن خلاف معمول داؤجی کو لینے میں منصفی چلا گیا۔ اس وقت کچہری بند ہو گئی تھی اور داؤجی نانبائی کے چھپر تلے ایک بنچ پر بیٹھے گُڑ کی چائے پی رہے تھے۔ میں نے ہولے سے جا کر ان کا بستہ اُٹھا لیا اور ان کے گلے میں بانہہ ڈال کر کہا "چلئے آج میں آپ کو لینے آیا ہوں" اُنہوں نے میری طرف دیکھے بغیر چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے۔ ایک آنہ جیب سے نکال کر نانبائی کے حوالے کیا اور چپ چاپ میرے ساتھ چل دیئے۔ میں نے شرارت سے ناچ کر کہا "گھر چلئے اب بے بے کو بتاؤنگا کہ آپ چوری چوری یہاں چائے پیتے ہیں۔"

داؤجی جیسے شرمندگی ٹالنے کو مسکرائے اور بولے "اسکی چائے بہت اچھی ہوتی ہے اور گڑ کی چائے سے تھکن بھی دُور ہو جاتی ہے۔ پھر یہ ایک آنہ میں گلاس بھر کے دیتا ہے۔ تم اپنی بے بے سے نہ کہنا خواہ مخواہ ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔ زیادتی پہ اُتر آئے گی" پھر اُنہوں نے کچھ خوفزدہ ہو کر کچھ مایوس ہو کر کہا "اسکی تو فطرت ہی ایسی ہے" اس دن مجھے داؤجی پر بڑا رحم آیا۔ میرا جی ان کے لئے بہت کچھ کرنے کو چاہنے لگا مگر اس وقت میں نے بے بے سے نہ کہنے کا وعدہ کر کے ہی ان کے لئے بہت کچھ کیا۔ جب اس واقعہ کا ذکر میں نے اماں سے کیا تو وہ کبھی میرے ہاتھ اور کبھی نوکر کی معرفت داؤجی کے ہاں دودھ، پھل اور چینی وغیرہ بھیجنے لگیں مگر اس رسد سے داؤجی کو کبھی بھی کچھ نصیب نہ ہوا۔ ہاں بے بے کی نگاہوں میں میری قدر بڑھ گئی اور اس نے کسی حد تک مجھ سے رعائتی برتاؤ کرنا شروع کر دیا۔

مجھے یاد ہے ایک صبح میں دودھ سے بھرا لوٹا ان کے یہاں لے کر آیا تھا اور بے بے گھر پہ نہ تھی وہ اپنی سکھیوں کے ساتھ بابا ساون کے جوہڑ میں اشنان کرنے گئی تھی اور گھر میں صرف داؤجی اور بی بی تھے۔ دودھ دیکھ کر داؤجی نے کہا "چلو آج تینوں چائے پئیں۔ میں دکان سے گڑ لے کر آتا ہوں۔ تم پانی چولھے پر رکھو" بی بی نے جلدی جلدی چولھا سلگایا۔ میں پتیلی میں پانی ڈال کر لایا اور پھر ہم دونوں وہیں چوکے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ داؤجی گڑ لے کر آگئے تو اُنہوں نے کہا "تم دونوں اپنے اپنے کام پر بیٹھو چائے میں بناتا ہوں" چنانچہ بی بی مشین چلانے لگی اور میں ڈائرکٹ اِن ڈائرکٹ کی مشقیں لکھنے لگا۔ داؤجی چولھا بھی جھونکے جاتے تھے اور عادت کے مطابق مجھے بھی اُونچے اُونچے بتانے جاتے تھے گلبیلو نے کہا "زمین سورج کے گرد گھومتی ہے" گلبیلو نے دریافت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے یہ نہ لکھ دینا کہ سورج کے گرد گھومتی تھی، پانی اُبل رہا تھا۔ داؤجی خوش ہو رہے تھے اسی خوشی میں جھوم

جھوم کر وہ اپنا تازہ بنایا ہوا کبت گا رہے تھے۔ اوگولو! اوگولو!! گلبلو کی بات مت بھولنا، گلبلو کی بات مت بھولنا۔ انہوں نے چائے کی پتی کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دی۔ برتن ابھی تک چولھے پر ہی تھا اور داؤجی ایک چھوٹے سے بچے کی طرح پانی کی گل بل گل بل کے ساتھ گولو گلبلو! گولو گلبلو کئے جا رہے تھے۔ میں ہنس رہا تھا اور اپنا کام کئے جا رہا تھا۔ بی بی مسکرا رہی تھی اور مشین چلائے جاتی تھی اور ہم تینوں اپنے چھوٹے سے گھر میں بڑے ہی خوش تھے گویا سارے محلے بلکہ سارے قصبہ کی خوشیاں بڑے بڑے رنگین پروں والی پریوں کی طرح ہمارے گھر میں اُتر آئی ہوں۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور بے بے اندر داخل ہوئی۔ داؤجی نے دروازہ کھلنے کی آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا اور ان کا رنگ فق ہو گیا۔ چمکتی ہوئی پتیلی سے گرم گرم بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ اس کے اندر چائے کے چھوٹے چھوٹے بھلاوے ایک دوسرے کے پیچھے شور مچاتے پھرتے تھے اور ممنوعہ کھیل رچانے والا بڈھا موقع پر پکڑا گیا تھا۔ بے بے نے آگے بڑھ کر چولھے کی طرف دیکھا اور داؤجی نے چوکے سے اُٹھتے ہوئے معذرت بھرے لہجہ میں کہا "چائے ہے!"

بے بے نے ایک دوہتڑ داؤجی کی کمر میں مارا اور کہا، "بڈھے بڑھاپے تجھے لاج نہیں آتی۔ تجھ پر بہار پھرے تجھے بم سمیٹے یہ تیرے چائے پینے کے دن ہیں۔ میں بیوہ گھر میں نہ تھی تو تجھ کو کسی کا ڈر تجھے نہ رہا۔ تیرے بھانویں میں کل کی مرتی آج مروں تیرا من راضی ہو، تیری آسیں پوری ہوں کس مرنے جوگی نے جنا اور کس لیکھ کی ریکھا نے میرے پلّے باندھ دیا ..... تجھے موت نہیں آتی ...... اوں ہوں تجھے کیوں آئیگی" اسی فقرے کی گردان کرتے ہوئے بے بے بھیڑنی کی طرح چوکے پر چڑھی کپڑے سے پتیلی پکڑ کر چولھے سے اُٹھائی اور زمین پر دے ماری۔ گرم گرم چائے کے چھپاکے داؤجی کی پنڈلیوں اور پاؤں پر گرے اور وہ "اوہ تیرا بھلا ہو جائے! اوہ تیرا بھلا ہو جائے" کہتے وہاں سے ایک بچے کی طرح بھاگے اور بیٹھک میں گھس گئے۔ ان کے اس فرار بلکہ اندازِ فرار کو دیکھ کر میں اور بی بی ہنسے بنا نہ رہ سکے اور ہماری ہنسی کی آواز ایک ثانیہ کے لئے چاروں دیواروں سے ٹکرائی۔ میں تو خیر بچ گیا لیکن بے بے نے سیدھے جا کر بی بی کو بالوں سے پکڑ لیا اور چیخ کر بولی "میری سوت! بتا بڈھے سے تیرا کیا ناتا ہے۔ بتا نہیں تو ابھی پران لیتی ہوں۔ تو نے اس کو چائے کی کنجی کیوں دی؟" بی بی بچاری بھس بھس رونے لگی تو میں بھی اُٹھ کر اندر بیٹھک میں کھسک آیا۔ داؤجی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے تھے اور پاؤں سہلا رہے تھے۔ پتہ نہیں انہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے پھر کیوں گدگدی ہوئی کہ میں الماری کے اندر منہ کر کے ہنسنے لگا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلایا اور بولے "شکر کردار گم کہ گرفتارم بہ مصیبتے نہ کہ بہ معصیتے!" تھوڑی دیر رُک کر پھر کہا "میں تو اس کے کتوں کا بھی کتا ہوں جس کے سرِ مطہّر پہ مکّے کی ایک کم نصیب بڑھیا غلاظت پھینکا کرتی تھی۔"

میں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے "آقائے نامدار کا ایک ادنیٰ حلقہ بگوش گرم پانی کے چند چھینٹے پڑنے پر نالہ وشیون کرے تو لعنت ہے اسکی زندگی پر۔ وہ اپنے محبوب کے طفیل نارِ جہنّم سے بچائے۔ خدائے ابراہیم مجھے جراٴت عطا کرے، مولائے ایّوب مجھے صبر کی نعمت دے۔"

میں نے کہا "داؤجی آقائے نامدار کون؟"

تو داؤجی کو یہ سنکر ذرا تکلیف ہوئی۔ انہوں نے شفقت سے کہا "جانِ پدر یوں نہ پوچھا کر۔ میرے اُستادِ میرے حضرت کی روح کو مجھ سے بیزار نہ کر۔ وہ میرے آقا بھی تھے میرے باپ بھی اور اُستاد بھی وہ تیرے دادا اُستاد ہیں ...... دادا اُستاد ....." اور انہوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔

آقائے نامدار کا لفظ اور کوتاہ قسمت مجوزہ کی ترکیب میں نے پہلی بار داؤجی سے سنی۔ یہ واقعہ سنانے میں انہوں نے کتنی ہی دیر لگا دی کیونکہ ایک ایک فقرے بعد فارسی کے بے شمار نعتیہ اشعار پڑھتے تھے اور بار بار اپنے استاد کی روح کو ثواب پہنچاتے تھے۔

جب وہ یہ واقعہ بیان کر چکے تو میں نے بڑے ادب سے پوچھا "داؤجی آپ کو اپنے استاد صاحب اس قدر اچھے کیوں لگتے تھے اور آپ ان کا نام لے کر ہاتھ کیوں جوڑتے ہیں اپنے آپ کو ان کا نوکر کیوں کہتے ہیں؟"

داؤجی نے مسکرا کر کہا "جو طویلے کے ایک خر کو ایسا بنا دے کہ لوگ کہیں یہ منشی جنت رام ہے یہ منشی جی ہیں وہ مسیحا نہ ہو وہ آقا نہ ہو تو پھر کیا ہو؟"

میں چارپائی کے کونے سے آہستہ آہستہ پھسل کر بستر میں پہنچ گیا اور چاروں طرف رضائی لپیٹ کر داؤجی کی طرف دیکھنے لگا جو سر جھکا کر کبھی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی پنڈلیاں سہلاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے وقفوں بعد ذرا سا ہنستے اور پھر خاموش ہو جاتے ——— کہنے لگے "میں کیا تھا اور کیا ہو گیا ——— حضرت مولانا کی پہلی آواز کیا آواز تھی! میری طرف سر مبارک اٹھا کر فرمایا 'چوپال زادے ہمارے پاس آؤ'، میں لاٹھی ٹیکتا ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ چھتہ پٹھاڑا اور دیگر دیہات کے لڑکے نیم دائرہ بنائے ان کے سامنے بیٹھے سبق یاد کر رہے تھے۔ ایک دربار لگا تھا اور کسی کو آنکھ اوپر اٹھانے کی ہمت نہ تھی ——— میں حضور کے قریب گیا تو فرمایا 'بھئی ہم تم کو ہر روز یہاں بکریاں چراتے دیکھتے ہیں۔ انہیں چرنے چگنے کے لئے چھوڑ کر ہمارے پاس آ جایا کرو اور کچھ پڑھ لیا کرو ——— پھر حضور نے میری عرض سنے بغیر پوچھا کیا نام ہے تمہارا؟ میں نے گنواروں کی طرح کہا جنتو ——— حضرت مسکرائے ——— تھوڑا سا ہنسے بھی ——— فرمانے لگے پورا نام کیا ہے؟ پھر خود ہی بولے جنت رام ہو گا ——— میں نے سر ہلا دیا ——— حضور کے شاگرد کتاب سے نظریں چرا کر میری طرف دیکھ رہے تھے میرے گلے میں کھدر کا لمبا کرتہ تھا پائجامہ کی بجائے صرف لنگوٹ بندھا تھا پاؤں میں ادھوڑی کے موٹے جوتے اور سر پر سرخ رنگ کا جانگیہ لپیٹا ہوا تھا۔ بکریاں میری ....

میں نے بات کاٹ کر پوچھا "آپ بکریاں چراتے تھے داؤجی؟"

"ہاں ہاں" وہ فخر سے بولے "میں گڈریا تھا اور میرے باپ کی بارہ بکریاں تھیں"

حیرانی سے میرا منہ کھلا رہ گیا اور میں نے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے جلدی سے پوچھا "اور آپ سکول کے پاس بکریاں چرایا کرتے تھے۔"

داؤجی نے کرسی چارپائی کے قریب کھینچ لی اور اپنے پاؤں پائے پر رکھ کر بولے "جانِ پدر اس زمانے میں تو شہروں میں بھی سکول نہ ہوتے تھے میں گاؤں کی بات کر رہا ہوں۔ آج سے چوہتر برس پہلے بھلا کوئی تمہارے ایم۔ بی ہائی سکول کا نام بھی جانتا تھا؟ وہ تو میرے آقا کو پڑھانے کا شوق تھا، اردگرد کے لوگ اپنے لڑکے چار حرف پڑھنے کو ان کے پاس بھیج دیتے ——— ان کا سارا خاندان زیورِ علم سے آراستہ اور دینی اور دنیوی نعمتوں سے مالا مال تھا۔ والد ان کے ضلع بھر کے ایک ہی حکیم اور چوٹی کے مبلغ تھے۔ جدِ امجد مہاراجہ کشمیر کے میر منشی۔ گھر میں علم کے دریا بہتے تھے۔ فارسی عربی، جبر و مقابلہ، اقلیدس، حکمت اور علم ہیئت ان کے گھر کی لونڈیاں تھیں۔ حضور کے والد کو دیکھنا مجھے نصیب نہیں ہوا لیکن آپ کی زبانی ان کے تبحرِ علمی کی سب داستانیں سنیں۔ شیفتہ اور حکیم مومن خان مومن سے ان کے بڑے مراسم تھے اور خود حضرت مولانا کی تعلیم دلی میں مفتی آزردہ مرحوم کی نگرانی میں ہوئی تھی ....

مجھے داؤجی کے موضوع سے بھٹک جانے کا ڈر تھا اس لئے میں نے جلدی سے پوچھا "پھر آپ نے حضرت مولانا کے پاس پڑھنا شروع کر دیا؟"

"ہاں" داؤ جی اپنے آپ سے باتیں کرنے لگے "ان کی باتیں ہی ایسی تھیں۔ ان کی نگاہیں ہی ایسی تھیں۔ جس کی طرف توجہ فرماتے تھے بندے سے مولا کر دیتے تھے مٹی کے ذرے کو اکسیر کی خاصیت دینے تھے ——— میں تو اسی وقت لاٹھی زمین پر ڈال ان کے پاس بیٹھ گیا۔ فرمایا اپنے بھائیوں کے پاس بوریئے پر بیٹھو۔ میں نے کہا جی اٹھارہ برس دھرتی پر بیٹھے گذر گئے اب کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر مسکرا دیئے اپنے چوبی صندوقچے سے حروفِ ابجد کا ایک مقوا نکالا اور بولے الف، بے، پے، تے ——— سبحان اللہ کیا آواز تھی، کس شفقت سے بولے تھے کس لہجہ سے فرما رہے تھے الف، بے، پے، تے" اور داؤ جی ان حرفوں کا ورد کرتے ہوئے اپنے ماضی میں کھو گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر کہا ادھر رہٹ تھا اور اس کے ساتھ مچھلیوں کا حوض۔ پھر انہوں نے بایاں ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا "اور اس طرف مزار عین کے کوٹھے۔ دونوں کے درمیان حضور کا باغیچہ تھا اور سامنے ان کی قدیم عظیم الشان حویلی۔ اسی باغیچے میں ان کا مکتب لگتا تھا۔ درِ فیض کھلا تھا جس کا جی چاہے آئے نہ مذہب کی قید نہ مسلک کی پابندی ....

میں نے کافی دیر سوچنے کے بعد با ادب بالملاحظہ قسم کا فقرہ تیار کر کے پوچھا "حضرت مولانا کا اسم گرامی شریف کیا تھا؟" تو پہلے انہوں نے میرا فقرہ ٹھیک کیا اور پھر بولے "حضرت اسماعیل چشتی رحمتہ اللہ علیہ۔ فرماتے تھے کہ ان کے والد ہمیشہ انہیں جان جاناں کہہ کر پکارتے تھے۔ کبھی جانِ جاناں کی رعایت سے مظہر جانِ جاناں بھی کہہ دیتے تھے۔"

میں ایسی دلچسپ کہانی سننے کا ابھی اور خواہشمند تھا کہ داؤ جی اچانک رک گئے اور بولے "سب سٹڈی ایری سسٹم کیا تھا؟" ان انگریزوں کا برا ہو یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں آئیں یا ملکہ وکٹوریہ کا فرمان لے کر سارے معاملے میں کھنڈت ڈال دیتے ہیں۔ سوا کے پہاڑے کی طرح میں نے سب سٹڈی ایری سسٹم کا سارا ڈھانچہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پھر انہوں نے میز سے گرامر اٹھائی اور بولے "باہر جا کر دیکھ کے آ کہ تیری بے بے کا غصّہ کم ہوا یا نہیں"، میں دوات میں پانی ڈالنے کے بہانے باہر گیا تو بے بے کو مشین چلاتے اور بی بی کو چوکا صرف کرتے پایا۔

داؤ جی کی زندگی میں بے بے والا پہلو بڑا ہی کمزور تھا۔ جب وہ دیکھتے کہ گھر میں مطلع صاف ہے اور بے بے کے چہرے پر کوئی شکن نہیں ہے تو وہ پکار کر کہتے "سب ایک ایک شعر سناؤ" پہلے مجھی سے تقاضا ہوتا اور میں چھوٹتے ہی کہتا ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

اس پر وہ تالی بجاتے اور کہتے "اولیں شعر نہ سنوں گا، اردو کا کم سنوں گا اور مسلسل نظم کا ہرگز نہ سنونگا"، میں کہتا "مجھے سوچنے دیجئے۔ اتنے میں بی بی سنائیے"۔

بی بی بھی میری طرح اکثر اس شعر سے شروع کرتی:۔

شنیدم کہ شاپور دم در کشید
چو خسرو بہ اسمش قلم در کشید

اس پر داؤ جی ایک مرتبہ پھر آرڈر آرڈر پکارتے۔

بی بی تینچی رکھ کر کہتی"

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شبِ فتنہ غنودیم"

داؤ جی شاباش تو ضرور کہہ دیتے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے "بٹیا یہ شعر تو کئی مرتبہ سنا چکی ہے"۔

پھر وہ بے بے کی طرف دیکھ کر کہتے "بھئی آج تمہاری بے بے بھی ایک سنائے گی"، مگر بے بے ایک ہی دو کھا سا جواب دیتی "مجھے نہیں آتے شیر کبت"،

اس پر داؤ جی کہتے "گھوڑیاں ہی سُنا دے۔ اپنے بیٹوں کے بیاہ کی گھوڑیاں ہی گا دے" اس پر بے بے کے ہونٹ مسکرانے کو کرتے لیکن وہ مُسکرا نہ سکتی اور داؤ جی بین عورتوں کی طرح گھوڑیاں گانے لگتے۔ ان کے درمیان کبھی امی چند کا اور کبھی میرا نام ٹانک دیتے۔ پھر کہتے "میں اپنے اس گولو مولو کی شادی پر سُرخ پگڑی باندھونگا۔ برات میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ چلونگا اور نکاح نامہ پر شہادت کے دستخط کرونگا" میں دستور کے مطابق شرما کر نگاہیں نیچی کر لیتا تو وہ کہتے "پتہ نہیں اس ملک کے کسی شہر میں میری چھوٹی سی بہو پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھ رہی ہو گی۔ ہفتہ میں ایک دن لڑکیوں کی خانہ داری ہوتی ہے۔ اس نے تو بہت سی چیزیں پکانی سیکھ لی ہوں گی۔ پڑھنے میں بھی ہوشیار ہو گی۔ اس بُدھو کو تو یہ یاد نہیں رہتا کہ مادیاں گھوڑی ہوتی ہے یا مُرغی۔ وہ تو فرفر سب کچھ سُنا تی ہو گی۔ میں تو اس کو فارسی پڑھاؤنگا۔ پہلے اس کو خطاطی کی تعلیم دونگا پھر خطِ شکستہ سکھاؤنگا۔ مستورات کو خطِ شکستہ نہیں آتا۔ میں تو اپنی بہو کو سکھادونگا ——— سُن گولو! پھر میں تیرے ہی پاس رہونگا۔ میں اور میری بہو فارسی میں باتیں کریں گے۔ وہ بات بات پر بفرمائیے بفرمائید کہے گی اور تو احمقوں کی طرح منہ دیکھا کریگا" پھر وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے خیلے خوب خیلے خوب کہتے۔ جان پدر چرا ایں قدر زحمت می کشی ...... خوب ...... یاد دارم ...... اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ کہتے۔ بچارے داؤ جی! چٹائی پر اپنی چھوٹی سی دُنیا بسا کر اس میں فارسی کے فرمان جاری کئے جاتے ——— ایک دن جب چھت پر دھوپ میں بیٹھے ہوئے وہ ایسی ہی دُنیا بسا چکے تھے تو ہولے سے مجھے کہنے لگے "جس طرح خدا نے تجھے ایک نیک سیرت بیوی اور مجھے سعادت مند بہو عطا کی ہے ویسے ہی وہ اپنے فضل سے میرے امی چند کو بھی دے۔ اس کے خیالات کچھ مجھے اچھے نہیں لگتے۔ یہ سیوا سنگ یہ مسلم لیگ یہ بیلچہ پارٹیاں مجھے پسند نہیں اور امی چند لاٹھی چلانا گتکا کھیلنا سیکھ رہا ہے۔ میری تو وہ کب مانے گا ہاں خدا ئے بزرگ و برتر اس کو ایک نیک مومن سی بیوی دلا دے تو وہ اُسے راہ راست پر لے آئیگی۔

اس مومن کے لفظ پر مجھے بہت تکلیف ہوئی اور میں چپ سا ہو گیا۔ چُپ محض اس لئے ہُوا تھا کہ اگر میں نے منہ کھولا تو یقیناً ایسی بات نکلے گی جس سے داؤ جی کو بڑا دُکھ ہو گا ——— میری اور امی چند کی تو خیر باتیں ہی تھیں لیکن بارہ جنوری کو بی بی کی برات سچ مچ آ گئی۔ جیجا جی رام پرتاپ کے بارے میں داؤ جی مجھے بہت کچھ بتا چکے تھے کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور اس شادی کے بارے میں انہوں نے جو استخارہ کیا تھا اس پر وہ پورا اُترا ہے۔ سب سے زیادہ خوشی داؤ جی کو اس بات کی تھی کہ ان کے سمدھی فارسی کے استاد تھے اور کبیر پنتھی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ بارہ تاریخ کی شام کو جب بی بی وداع ہونے لگی تو گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ بے بے زار و قطار رو رہی ہے۔ امی چند آنسو بہا رہا ہے اور محلے کی عورتیں پھُس پھُس کر رہی ہیں۔ میں دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہوں اور داؤ جی میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں اور بار بار کہہ رہے ہیں آج زمین کچھ میرے پاؤں نہیں پکڑتی۔ میں توازن قائم نہیں رکھ سکتا" جیجا جی کے باپ بولے "منشی جی اب ہمیں اجازت دیجئے"، تو بی بی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ اُسے چار پائی پر ڈالا۔ عورتیں ہوا کرنے لگیں اور داؤ جی میرا سہارا لے کر اسکی چار پائی کی طرف چلے۔ انہوں نے بی بی کو کندھے سے پکڑ کر اُٹھایا اور کہا "یہ کیا ہُوا بٹیا۔ اُٹھو! یہ تو تمہاری نئی اور خود مختار زندگی کی پہلی گھڑی ہے اسے یوں منحوس نہ بناؤ" بی بی اُسی طرح ڈھاڑیں مارتے ہوئے داؤ جی سے لپٹ گئی اُنہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "قرۃ العین میں تیرا گنہگار ہوں کہ تجھے پڑھا نہ سکا۔ تیرے سامنے شرمندہ ہوں کہ تجھے علم کا جہیز نہ دے سکا۔ تو مجھے معاف کر دے گی اور شاید بر خوردار رام پرتاپ بھی لیکن میں اپنے آپ کو معاف نہ کر سکوں گا۔ میں خطاکار ہوں اور میرا اجل سر تیرے سامنے خم ہے" یہ سُنکر بی بی اور بھی زور زور سے رونے لگی اور داؤ جی کی آنکھوں سے کتنے سارے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے ٹوٹ کر زمین پر گرے۔ ان کے سمدھی نے آگے بڑھ کر کہا "منشی جی آپ فکر نہ کریں بیٹی کو میں کربیا پڑھا دونگا" داؤ جی ادھر پلٹے اور ہاتھ جوڑ کر بولے "کربیا تو پڑھ چکی ہے، گلستاں بوستاں بھی ختم کر اچکا ہوں لیکن میری حسرت پوری نہیں ہوئی" اس پر وہ ہنس کر بولے "آپ بھی حد کرتے ہیں ساری گلستاں تو میں نے بھی نہیں پڑھی جہاں عربی آتی تھی آگے

گذر جاتا تھا" ——— داؤجی اسی طرح ہاتھ جوڑے کتنی دیر خاموش کھڑے رہے۔ بی بی نے گوٹہ لگی سرخ رنگ کی ریشمی چادر سے ہاتھ نکال کر پہلے امی چند کے اور پھر میرے سر پر پھیرا اور سکھیوں کے بازوؤں میں ڈیوڑھی کی طرف چل دی۔ داؤجی میرا سہارا لیکر چلے تو انہوں نے مجھے اپنے ساتھ زور سے بھینچ کر کہا "لو یہ بھی لا رہا ہے۔ دیکھو یہ ہمارا سہارا بنا پھرتا ہے۔ او گولو...... او مردم دیدہ...... تجھے کیا ہو گیا...... جان پدر تو کیوں......"

اس پر ان کا گلا رندھ گیا اور میرے آنسو بھی تیز ہو گئے۔ برات والے تانگوں اور اکوں پر سوار تھے۔ بی بی رتھ میں جا رہی تھی اور اس کے پیچھے امی چند اور میں اور ہمارے درمیان داؤجی پیدل چل رہے تھے۔ اگر بی بی کی چیخ ذرا زور سے نکل جاتی تو داؤجی آگے بڑھ کر رتھ کا پردہ اٹھاتے اور کہتے "لاحول پڑھو بیٹا۔ لاحول پڑھو!"

اور خود آنکھوں پر رکھے رکھے ان کی پگڑی کا شملہ بھیگ گیا تھا!

راتو ہمارے محلے کا بڑا ہی کثیف سا انسان تھا۔ بدی اور کینہ پروری اسکی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ باڑہ جس کا میں نے ذکر کیا ہے اسی کا تھا اس میں بیس تیس بکریاں اور دو گائیں تھیں جن کا دودھ صبح و شام راتو گلی کے لبِ میدان میں بیٹھ کر بیچا کرتا۔ تقریباً سارے محلے والے اسی سے دودھ لیتے تھے اور اسکی شرارتوں کی وجہ سے دبتے بھی تھے۔ ہمارے گھر کے آگے سے گذرتے ہوئے وہ یونہی شوقیہ لاٹھی زمین پر بجا کر داؤجی کو "پنڈتا جے رام جی کی" کہہ کر سلام کیا کرتا۔ داؤجی نے اسے کئی مرتبہ سمجھایا بھی کہ وہ پنڈت نہیں ہیں معمولی آدمی ہیں کیونکہ پنڈت ان کے نزدیک بڑے پڑھے لکھے اور فاضل آدمی کو کہا جا سکتا تھا لیکن راتو نہیں مانتا تھا وہ اپنی مونچھ چبا کر کہتا "لے بھئی جس کے سر پہ بودی (چٹیا) ہو وہ پنڈت ہی ہوتا ہے" ——— چوروں یاروں سے اسکی آشنائی تھی۔ شام کو اس کے باڑے میں جوا بھی ہوتا اور گندی اور فحش بولیوں کا مشاعرہ بھی۔ بی بی کے جانے کے بعد ایک دن جب میں اس سے دودھ لینے گیا تو اس نے شرارت سے آنکھ میچ کر کہا "موروثی تو چلی گئی بابو اب تو اس گھر میں رہ کر کیا لے گا" میں چپ رہا تو اس نے جھاگ والے دودھ میں ڈبہ پھیرتے ہوئے کہا "گھر میں گنگا بہتی تھی سچ بتا غوطہ لگایا کہ نہیں" مجھے اس بات پر غصہ آ گیا اور میں نے تاملوٹ گھما کر اس کے سر میں دے مارا۔ اس ضرب شدید سے خون وغیرہ تو برآمد نہ ہوا لیکن وہ بلبلا کر تخت پر گر پڑا اور میں گھر بھاگ گیا۔ داؤجی کو سارا واقعہ سنا کر میں دوڑا دوڑا اپنے گھر گیا اور اباجی سے ساری حکایت بیان کی۔ ان کی بدولت راتو کی تھانہ میں طلبی ہوئی اور رحواللہ صاحب نے ہلکی سی گوشمالی کے بعد اسے سخت متنبہ کر کے چھوڑ دیا۔ اس دن کے بعد سے راتو داؤجی پہ آتے جاتے طرح طرح کے فقرے کسنے لگا۔ وہ سب سے زیادہ مذاق ان کی بودی کا اڑایا کرتا تھا اور واقعی داؤجی کے فاضل سر پر وہ چلپی سی بودی ذرا بھی اچھی نہ لگتی تھی۔ مگر وہ کہتے تھے "یہ میری مرحوم ماں کی نشانی ہے اور مجھے اپنی زندگی کی طرح عزیز ہے۔ وہ اپنی آغوش میں میرا سر رکھ کر اسے دہی سے دھوتی تھی اور کڑوا تیل لگا کر چمکاتی تھی۔ گو میں نے حضرت مولانا کے سامنے کبھی بھی پگڑی اتارنے کی جسارت نہیں کی لیکن وہ جانتے تھے اور جب میں دیال چند میموریل ہائی سکول سے ایک سال کی ملازمت کے بعد چھٹیوں میں گاؤں آیا تو حضور نے پوچھا "شہر جا کر چوٹی تو نہیں کٹوا دی؟" تو میں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا تم سا سعادتمند بیٹا کم ماؤں کو نصیب ہوتا ہے اور ہم سا خوش قسمت استاد بھی خال خال ہو گا جسے تم ایسے شاگردوں کو پڑھانے کا فخر حاصل ہوا ہو۔ میں نے ان کے پاؤں چھو کر کہا حضور آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں یہ سب آپ کے قدموں کی برکت ہے۔ ہنس کر فرمانے لگے چینت رام ہمارے پاؤں نہ چھوا کرو بھلا ایسے لمس سے کیا فائدہ جس کا ہمیں احساس نہ ہو۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے میں نے کہا اگر کوئی مجھے بتا دے تو سمندر پھاڑ کر بھی آپ کے لئے دوائی نکال لاؤں۔ اپنی زندگی کی حرارت حضور کی ٹانگوں کے لئے نذر کر دوں لیکن میرا بس نہیں چلتا ——— خاموش ہو گئے اور نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے "خدا کو یہی منظور ہے تو ایسے ہی سہی۔ تم سلامت رہو کہ تمہارے کندھوں

پھر میں نے کوئی دس سال بعد سارا گاؤں دیکھ لیا ہے"——— داؤجی گذرے ایام کی تہہ میں اُترتے ہوئے کہہ رہے تھے "میں صبح سویرے حویلی کی ڈیوڑھی میں جا کر آواز دیتا "خادم آگیا"۔ مستورات ایک طرف ہو جاتیں تو حضور صحن سے آواز دے کر مجھے بُلاتے اور میں اپنی قسمت کو سراہتا ہاتھ جوڑے جوڑے ان کی طرف بڑھتا۔ پاؤں چھُوتا اور پھر حکم کا انتظار کرنے لگتا۔ وہ دُعا دیتے میرے والدین کی خیریت پوچھتے گاؤں کا حال دریافت فرماتے اور پھر کہتے "لو بھئی جنت رام اب اس گناہوں کی گٹھڑی کو اُٹھا لو" میں سبد گل کی طرح انہیں اُٹھاتا اور کمر پر لاد کر حویلی سے باہر آجاتا۔ کبھی فرماتے ہمیں باغ کا چکر دو۔ کبھی حکم ہوتا سیدھے رہٹ کے پاس لے چلو اور کبھی کبھار بڑی نرمی سے کہتے جنت رام تھک نہ جاؤ تو ہمیں مسجد تک لے چلو۔ میں نے کئی بار عرض کیا کہ حضور ہر روز مسجد لے جایا کروں گا مگر نہیں مانے یہی فرماتے رہے کہ کبھی جی چاہتا ہے اور جب جی چاہتا ہے تم سے کہہ دیتا ہوں۔ میں انہیں وضو کرنے والے چبوترے پر بٹھا کر ان کے ہلکے ہلکے جوتے اُتارتا اور انہیں جھولی میں رکھ کر دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ چبوترے سے حضور خود گھسٹ کر صف کی جانب جاتے تھے۔ میں نے صرف ایک مرتبہ انہیں اس طرح جاتے ہوئے دیکھا تھا اس کے بعد جُرأت نہ ہوئی۔ ان کے جُوتے اُتارنے کے بعد دامن میں منہ چھپا لیتا اور پھر اُسی وقت سر اُٹھاتا جب وہ میرا نام لے کر یاد فرماتے۔ واپسی پر میں قصبے کی لمبی لمبی گلیوں کا چکر کاٹ کر حویلی کو لوٹتا تو فرماتے ہم جانتے ہیں جنت رام تم ہماری خوشنودی کے لئے قصبہ کی سیر کراتے ہو لیکن ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ایک تو تم پر لدا لدا پھرتا ہوں دوسرے تمہارا وقت ضائع کرتا ہوں۔ اور حضور سے کون کہہ سکتا کہ آقا یہ وقت ہی میری زندگی کا نقطۂ عروج ہے اور یہ تکلیف ہی میری حیات کا مرکز ہے۔ آپ تو فرماتے تھے کہ لدا لدا پھرتا ہوں اور مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایک ہُما ہے جس نے اپنا سایہ محض میرے لئے وقف کر دیا ہے ——— جس دن میں نے سکندر نامہ زبانی یاد کر کے انہیں سُنایا اس قدر خوش ہوئے گویا ہفت اقلیم کی بادشاہی نصیب ہو گئی ہو۔ دین و دُنیا کی ہر دعا سے مجھے مالا مال کیا۔ دستِ شفقت میرے سر پہ پھیرا اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر انعام دیا۔ میں نے اسے حجرِ اسود جان کر بوسہ دیا آنکھوں سے لگایا اور سکندر کا افسر سمجھ کر پگڑی میں رکھ لیا۔ دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر دعائیں دے رہے تھے اور فرما رہے تھے جو کام ہم سے نہ ہو سکا وہ تُو نے کر دکھایا۔ تو نیک ہے خدا نے یہ سعادت تجھے نصیب کی۔ جنت رام تیرا موسیٰ چوہاں کا پیشہ ہے تو شاہ لطفی کا پیرو ہے اس لئے خدائے عز و جل تجھے برکت دیتا ہے وہ تجھے اور بھی برکت دے گا۔ تجھے اور کشاکش میسر آئیگی۔

داؤجی یہ باتیں کرتے کرتے سر گھٹنوں پہ رکھ کر خاموش ہو گئے۔

میرا امتحان قریب آ رہا تھا اور داؤجی سخت ہوتے جا رہے تھے۔ انہوں نے میرے ہر فارغ وقت پہ کوئی نہ کوئی کام پھیلا دیا تھا۔ ایک مضمون سے جھگڑا ہوتا تھا تو دوسرے کی کتابیں نکال کر سر پہ سوار ہو جاتے تھے۔ پانی پینے اُٹھتا تو سایہ کی طرح ساتھ ساتھ چلے آتے اور نہیں تو تاریخ کے سن ہی پوچھتے جاتے۔ شام کے وقت سکول پہنچنے کا انہوں نے وطیرہ بنا لیا تھا۔ ایک دن میں سکول کے بڑے دروازے سے نکلنے کی بجائے بورڈنگ ہاؤس کی راہ کھسک گیا تو انہوں نے جماعت کے کمرے کے سامنے آ کر بیٹھنا شروع کر دیا۔ میں چڑچڑا اور ضدی ہونے کے علاوہ بد زبان بھی ہو گیا تھا۔ داؤجی کے بچے گو یا میرا تکیہ کلام بن گیا تھا اور کبھی کبھی جب ان کی یا ان کے سوالات کی سختی بڑھ جاتی تو میں انہیں کُتّے کہنے سے بھی نہ چوکتا۔ ناراض ہو جاتے تو بس اسی قدر کہتے "دیکھ لے ڈومنی تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ تیری بیوی بیاہ کر لاؤں گا تو پہلے اُسے یہی بتاؤں گا کہ جانِ پدر یہ تیرے بڈھے باپ کو کُتّا کہتا تھا" میری گالیوں کے بدلے وہ مجھے ڈومنی کہا کرتے تھے۔ اگر انہیں زیادہ دُکھ ہوتا تو منہ چڑھی ڈومنی کہتے۔ اس سے زیادہ نہ انہیں غصّہ آتا تھا نہ دُکھ ہوتا تھا۔ سب مجھے میرے اصلی نام سے انہوں نے کبھی نہیں پکارا۔ میرے بڑے بھائی کا ذکر آتا تو بیٹا آفتاب، برخوردار آفتاب کہہ کر انہیں یاد کرتے تھے لیکن میرے ہر روز نئے نئے نام رکھتے تھے۔ جن میں گولو انہیں بہت مرغوب تھا۔ طلبورا دوسرے درجہ پر مسٹر ہونق اور اخفش اسکوائر ان سب کے بعد آتے تھے اور ڈومنی صرف غصّہ کی حالت میں۔ کبھی کبھی میں ان کو بہت دق کرتا۔ وہ اپنی چٹائی پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے ہیں مجھے الجبرا کا ایک سوال دے رکھا ہے اور میں سارے جہان کی ابجد کو ضرب دے دے کر تنگ آچکا ہوں تو میں کاپیوں اور کتابوں کے ڈھیر کو پاؤں سے

پرے دھکیل کر اُونچے اُونچے گانے لگتا۔

تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دُکھ تینوں نیوں دسنا

داؤ جی حیرانی سے میری طرف دیکھنے تو میں تالیاں بجانے لگتا اور قوالی شروع کر دیتا۔ نیوں نیوں نیوں دسنا۔ تے دُکھ تینوں نیوں دسنا ——— دسنا دسنا دسنا دسنا...... تینوں تینوں تینوں تینوں۔ سارے گاما رونا رونا رونا سارے گاما رونا رونا تے دُکھ تینوں نیوں دسنا۔ وہ عینک کے اُوپر سے مسکراتے۔ میرے پاس آکر کاپی اُٹھاتے، صفحہ نکالتے اور میری تالیوں کے درمیان اپنا بڑا سا ہاتھ کھڑا کر دیتے۔ "سن بیٹا" وہ بڑی محبت سے کہتے "یہ کوئی مشکل سوال ہے!" جونہی وہ سوال سمجھانے کے لئے ہاتھ نیچے کرتے میں پھر تالیاں بجانے لگتا۔ "دیکھ پھر، میں تیرا داؤ نہیں ہوں؟" وہ بڑے مان سے پوچھتے۔

"نہیں!" میں منہ پھاڑ کر کہتا۔

"تو اور کون ہے؟" وہ مایوس سے ہو جاتے۔

"وہ سچی سرکار" میں اُنگلی آسمان کی طرف کر کے شرارت سے کہتا "وہ سچی سرکار وہ سب کا پالنے والا ——— بول بکرے سب کا والی کون؟" وہ میرے پاس سے اُٹھ کر جانے لگتے تو میں ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا "داؤ جی خفا ہو گئے کیا؟"

وہ مسکرانے لگتے "چھوڑ طنبورے! چھوڑ بیٹا! میں تو پانی پینے جا رہا تھا ——— مجھے پانی تو پی آنے دے۔"

میں جھوٹ موٹ بُرا مان کر کہتا "تو جی جب مجھے سوال سمجھنا ہوا داؤ جی کو پانی یاد آ گیا۔"

وہ آرام سے بیٹھ جاتے اور کاپی کھول کر کہتے "اخفش اسکوائر جب تجھے چار ایکس کا مربع نظر آ رہا تھا تو نے تیسرا فارمولا کیوں نہ لگایا اور اگر ایسا نہ بھی کرتا تو........"

اور اس کے بعد پتہ نہیں داؤ جی کتنے دن تک پانی نہ پیتے۔

فروری کے دوسرے ہفتہ کی بات ہے۔ امتحان میں کل ڈیڑھ مہینہ رہ گیا تھا اور مجھ پر آنے والے خطرناک وقت کا خوف بھوت بنکر سوار ہو گیا تھا۔ میں نے خود اپنی پڑھائی پہلے سے تیز کر دی تھی اور کافی سنجیدہ ہو گیا تھا لیکن جیومیٹری کے مسائل میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ داؤ جی نے بہت کوشش کی لیکن کچھ بات نہ بنی۔ آخر ایک دن انہوں نے کہا کُل باون پراپوزیشنیں ہیں زبانی یاد کر لے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ میں انہیں رٹنے میں مصروف ہو گیا لیکن جو پراپوزیشن رات کو یاد کرتا صبح بھول جاتی۔ میں دل برداشتہ ہو کر ہمت چھوڑ سی بیٹھا۔ ایک رات داؤ جی مجھ سے جیومیٹری کی شکلیں بنوا کر اور مشقیں سنکر اُٹھے تو وہ بھی کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔ میں بار بار اٹکا تھا اور انہیں بہت کوفت ہوئی تھی۔ مجھے سونے کی تاکید کر کے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں کاپی پنسل لے کر پھر بیٹھ گیا اور رات کے ڈیڑھ بجے تک لکھ لکھ کر رٹا لگاتا رہا۔ مگر جب کتاب بند کر کے لکھنے لگتا تو چند فقروں کے بعد اٹک جاتا۔ مجھے داؤ جی کا مایوس چہرہ یاد کر کے اور اپنی حالت کا اندازہ کر کے رونا آ گیا اور میں باہر صحن میں آکر سیڑھیوں پر بیٹھ کے سچ مچ رونے لگا۔ گھٹنوں پر سر رکھے رو رہا تھا اور سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا تو میں نے داؤ جی کی عزت بچانے کے لئے یہی ترکیب سوچی کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر چپکے سے نکل جاؤں اور پھر واپس نہ آؤں۔ جب فیصلہ کر چکا اور عملی قدم آگے بڑھانے کے لئے سر اُوپر اُٹھایا تو داؤ جی کمبل اوڑھے میرے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے ساتھ لگایا تو سسکیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ صحن میں پھیل گیا۔ داؤ جی نے میرا سر چوم کر کہا "ارے بھئی طنبورے میں تو یوں نہ سمجھتا تھا۔ تُو تو بہت ہی کم ہمت نکلا" پھر انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کمبل میں لپیٹ لیا اور بیٹھک میں لے آئے۔ بستر میں بٹھا کر انہوں نے میرے چاروں طرف رضائی لپیٹی اور خود پاؤں اُوپر کر کے کرسی پر بیٹھ گئے۔

انہوں نے کہا "اقلیدس چیز ہی ایسی ہے۔ تو اُس کے ہاتھوں یوں نالاں ہے میں اس سے اور طرح تنگ ہوا تھا۔ حضرت مولانا کے پاس جبر و مقابلہ اور اقلیدس کی جس قدر کتابیں تھیں انہیں میں اچھی طرح سے پڑھ کر اپنی کاپیوں پہ اُتار چکا تھا۔ کوئی بات ایسی نہ تھی جس میں اُلجھن ہوتی میں نے یہ جانا کہ ریاضی کا ماہر ہو گیا ہوں۔ لیکن ایک رات میں اپنی کھاٹ پر پڑا متساوی الساقین کے ایک مسئلہ پر غور کر رہا تھا کہ بات اُلجھ گئی۔ میں نے دِیا جلا کر شکل بنائی اور اس پر غور کرنے لگا۔ جبر و مقابلہ کی رُو سے مفروضہ کا جواب ٹھیک آتا تھا لیکن علم ہندسہ سے پایۂ ثبوت کو نہ پہنچتا تھا۔ میں ساری رات کاغذ سیاہ کرتا رہا لیکن تیری طرح سے رویا نہیں۔ علی الصبح میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اپنے دستِ مبارک سے کاغذ پر شکل کھینچ کر سمجھانا شروع کیا لیکن جہاں مجھے اُلجھن ہوئی تھی وہیں حضرت مولانا کی طبع رسا کو بھی کوفت ہوئی۔ فرمانے لگے "جنت دام اب ہم تم کو نہیں پڑھا سکتے۔ جب اُستاد اور شاگرد کا علم ایک سا ہو جائے تو شاگرد کو کسی اور معلّم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے"۔ میں نے جرأت کر کے کہہ دیا کہ حضور اگر کوئی اور یہ جملہ کہتا تو میں اسے کفر کے مترادف سمجھتا۔ لیکن آپ کا ہر حرف اور ہر نوشتہ میرے لئے حکم ربّانی سے کم نہیں اس لئے خاموش ہوں بھلا آقائے غزنوی کے سامنے ایاز کی کیا مجال! لیکن حضور مجھے دُکھ بہت ہوا ہے۔ فرمانے لگے تم بیحد جذباتی آدمی ہو۔ بات تو سُن لی ہوتی، میں نے سر جھکا کر کہا "ارشاد"، فرمایا "دِلّی میں حکیم ناصر علی سیستانی علم ہندسہ کے بڑے ماہر ہیں اگر تم کو اس کا ایسا ہی شوق ہے تو ان کے پاس چلے جاؤ اور اکتساب علم کرو۔ ہم ان کے نام رقعہ لکھ دینگے۔ میں نے رضامندی ظاہر کی تو فرمایا اپنی والدہ سے پوچھ لینا اگر وہ رضامند ہوں تو ہمارے پاس آنا ——— والدہ مرحوم سے پوچھنا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق جواب پانا انہونی بات تھی چنانچہ میں نے ان سے نہیں پوچھا۔ حضور پوچھتے تو میں دروغ بیانی سے کام لیتا کہ گھر کی لپائی پتائی کر رہا ہوں جب فارغ ہونگا تو والدہ سے عرض کرونگا۔ چند ایام بڑے اضطرار کی حالت میں گذر رہے۔ میں دن رات اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کرتا مگر صحیح جواب برآمد نہ ہوتا۔ اس لاینحل مسئلہ سے طبیعت میں اور انتشار پیدا ہوا۔ میں دِلّی جانا چاہتا تھا لیکن حضور سے اجازت مل سکتی تھی نہ رقعہ۔ وہ والدہ کی رضامندی کے بغیر اجازت دینے والے نہ تھے اور والدہ اس بڑھاپے میں کیسے آمادہ ہو سکتی تھیں ——— ایک رات جب سارا گاؤں سو رہا تھا اور میں تیری طرح پریشان تھا تو میں نے اپنی والدہ کی پٹاری سے اسکی کل پونجی سے دو روپے چرائے اور نصف اس کے لئے چھوڑ کر گاؤں سے نکل گیا۔ خدا مجھے معاف کرے اور میرے دونوں بزرگوں کی روحوں کو مجھ پر مہربان رکھے! واقعی میں نے بڑا گناہ کیا اور ابد تک میرا سر ان دونوں کرمفرماؤں کے سامنے ندامت سے جُھکا رہے گا ——— گاؤں سے نکل کر میں حضور کی حویلی کے پیچھے ان کے مسند کے پاس پہنچا جہاں بیٹھ کر آپ پڑھاتے تھے۔ گھٹنوں کے بل ہو کر میں نے زمین کو بوسہ دیا اور دل میں کہا، بدقسمت ہوں، بے اجازت جا رہا ہوں لیکن آپ کی دعاؤں کا عمر بھر محتاج رہوں گا۔ میرا قصور معاف نہ کیا تو آپ کے قدموں میں جان دے دونگا۔ اتنا کہہ کر اور لاٹھی کندھے پہ رکھ کر میں وہاں سے چلدیا ——— سُن رہا ہے؟" داؤجی نے میری طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔

رضائی کے بیچ خارپُشت بنے میں نے آنکھیں جھپکائیں اور ہولے سے کہا "جی؟"

داؤجی نے پھر کہنا شروع کیا "قدرت نے میری کمال مدد کی۔ اُن دنوں جاکھل جنید براستہ حصار والی ریل کی پٹڑی بن رہی تھی۔ یہی سیدھا راستہ دِلّی کو جاتا تھا اور یہیں مزدوری ملتی تھی۔ ایک دن میں مزدوری کرتا اور دو دن چلتا۔ اس طرح تائید غیبی کے سہارے سولہ دن میں میں دِلّی پہنچ گیا۔ منزلِ مقصود تو ہاتھ آ گئی تھی لیکن گوہرِ مقصود کا سُراغ نہ ملتا تھا جس کسی سے پوچھتا حکیم ناصر علی سیستانی کا دولت خانہ کہاں ہے نفی میں جواب ملتا۔ دو دن ان کی تلاش جاری رہی لیکن پتہ نہ پا سکا۔ قسمت یاور تھی صحت اچھی تھی۔ انگریزوں کے لئے نئی کوٹھیاں بن رہی تھیں وہاں کام پہ جانے لگا۔ شام کو فارغ ہو کر حکیم صاحب کا پتہ معلوم کرتا اور رات کے وقت ایک دھرم شالہ میں کھیس پھینک کر گہری نیند سو جاتا۔ مثل مشہور ہے جوئندہ یابندہ! آخر ایک دن مجھے حکیم صاحب کی جائے رہائش معلوم ہو گئی۔ وہ پتھر پھوڑوں کے محلے کی ایک تیرہ و تار

گلی میں رہتے تھے۔ شام کے وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں فرد کش تھے اور چند دوستوں سے اونچے اونچے گفتگو ہو رہی تھی۔ میں جوتے اُتار کر دہلیز کے اندر کھڑا ہو گیا۔ ایک صاحب نے پوچھا "کون ہے؟" میں نے سلام کر کے کہا "حکیم صاحب سے ملنا ہے"۔ حکیم صاحب دوستوں کے حلقہ میں سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کی پشت میری طرف تھی۔ اُسی طرح بیٹھے بیٹھے بولے "اسم گرامی"۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "پنجاب سے آیا ہوں اور ......" میں بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ زور سے بولے "او ہو! چنت رام ہو؟" میں کچھ جواب نہ دے سکا فرمانے لگے "مجھے اسماعیل کا خط ملا ہے لکھتا ہے شاید چنت رام تمہارے پاس آئے۔ ہمیں بتائے بغیر گھر سے فرار ہو گیا ہے اسکی مدد کرنا۔ میں اسی طرح خاموش کھڑا رہا تو پاٹ دار آواز میں بولے "میاں اندر آجاؤ کیا چُپ کا روزہ رکھا ہے؟" میں ذرا آگے بڑھا تو بھی میری طرف نہ دیکھا اور ویسے ہی عروسِ نو کی طرح بیٹھے رہے۔ پھر قدرے تحکمانہ انداز میں کہا "برخوردار بیٹھ جاؤ"۔ میں وہیں بیٹھ گیا تو اپنے دوستوں سے فرمایا "بھئی ذرا ٹھہرو مجھے اس سے دو دو ہاتھ کر لینے دو۔ پھر حکم ہوا "بتاؤ ہندسہ کا کونسا مسئلہ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا تو انہوں نے اُسی طرح کندھوں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے اور آہستہ آہستہ کرتہ یوں اُوپر کھینچ لیا کہ ان کی کمر برہنہ ہو گئی۔ پھر فرمایا "بناؤ اپنی انگل سے میری کمر پہ ایک متساوی الساقین۔ مجھ پہ سکتہ کا عالم طاری تھا نہ آگے بڑھنے کی ہمّت تھی نہ پیچھے ہٹنے کی طاقت۔ ایک لمحہ کے بعد بولے "میاں جلدی کرو، نابینا ہوں کاغذ قلم کچھ نہیں سمجھتا۔ میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور ان کی چوڑی چکلی کمر پہ کانپتے ہوئی اُنگلی سے متساوی الساقین بنانے لگا۔ جب وہ غیر مرئی شکل بن چکی تو بولے اب نقطہ س سے خط ب ج پر عمود گراؤ۔ ایک تو میں گھبرایا ہوا تھا دوسرے وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یونہی اٹکل سے میں نے ایک مقام پہ انگلی رکھ کر عمود گرانا چاہا تو تیزی سے بولے رہے ہے کیا کرتے ہو یہ نقطہ س ہے کیا؟ پھر خود ہی بولے آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے۔ بائیں کندھے سے کوئی چھ اُنگل نیچے نقطہ س ہے وہاں سے خط کھینچو —— اللہ اکبر اللہ اکبر کیا علم تھا کیا آواز تھی اور کیسی تیز فہم تھی۔ وہ بول رہے تھے اور میں مبہوت بیٹھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ابھی ان کے آخری جملے کے ساتھ نور کی لکیریں متساوی الساقین بن کر ان کی کمر پہ اُبھر آئیں گی۔" پھر داؤجی دلّی کے دنوں میں ڈوب گئے۔ ان کی آنکھیں کھُلی تھیں وہ میری طرف دیکھ رہے تھے لیکن مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے پوچھا "پھر کیا ہوا داؤجی؟" انہوں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا "رات بہت گذر چکی ہے اب تو سو جا پھر بتاؤں گا"۔ میں ضدّی بچے کی طرح ان کے پیچھے پڑ گیا تو انہوں نے کہا "پہلے وعدہ کر کہ آئندہ مایوس نہیں ہو گا اور ان چھوٹی چھوٹی پراپوزیشنوں کو بتاشے سمجھے گا"۔ میں نے جواب دیا "حلوا سمجھونگا آپ فکر نہ کریں" اُنہوں نے کھڑے کھڑے کمبل لپیٹتے ہوئے کہا "بس مختصر یہ کہ میں ایک سال حکیم صاحب کی حضوری میں رہا اور اس بحرِ علم سے چند قطرے حاصل کر کے اپنی کور آنکھوں کو دھویا۔ واپسی پر میں سیدھا اپنے آقا کی خدمت میں پہنچا اور ان کے قدموں پہ سر رکھ دیا۔ فرمانے لگے چنت رام اگر ہم میں قوت ہو تو ان پاؤں کو کھینچ لیں، اس پہ میں رو دیا تو دستِ محبت میرے سر پہ پھیر کر کہنے لگے "ہم تم سے ناراض نہیں ہیں لیکن ایک سال کی فرقت بہت طویل ہے۔ آئندہ کہیں جانا تو ہمیں بھی ساتھ لے جانا"، یہ کہتے ہوئے داؤجی کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ مجھے اسی طرح گم سُم چھوڑ کر بیٹھک سے باہر نکل گئے۔

امتحان کی قربت سے میرا خون خشک ہو رہا تھا لیکن جسم پھُول رہا تھا۔ داؤجی کو میرے موٹاپے کی فکر رہنے لگی۔ اکثر میرے لُفن مُتھنے ہاتھ پکڑ کر کہتے، "اسپ تازی بن طویلہ، خرنہ بن۔ مجھے ان کا یہ فقرہ بہت ناگوار گذرتا اور میں احتجاجاً ان سے کلام بند کر دیتا۔ میرے مسلسل مون برت نے بھی ان پہ کوئی اثر نہ کیا اور ان کی فکر اندیشہ کی حد تک پہنچ گئی۔ ایک صبح سیر کو جانے سے پہلے انہوں نے مجھے آجگایا اور میری منّتوں خوشامدوں گالیوں اور جھڑکیوں کے باوجود بستر سے اُٹھا کوٹ پہنا کر کھڑا کر دیا۔ پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر گویا گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ سردیوں کی صبح کوئی چار کا عمل۔ گلی میں نہ آدم نہ آدم زاد، تاریکی سے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا اور داؤجی مجھے اُسی

طرح سیر کو لے جا رہے تھے۔ میں کچھ بک رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے ابھی گراں خوابی دور نہیں ہوئی ابھی طنبورہ بڑبڑا رہا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کہتے کوئی سُر نکال طنبورے کسی آہنگ پر بج یہ کیا کر رہا ہے! جب ہم بستی سے بہت دور نکل گئے اور صبح کی یخ ہوا نے میری آنکھوں کو زبردستی کھول دیا تو داؤجی نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ سرداروں کا رہٹ آیا اور نکل گیا ندی آئی اور پیچھے رہ گئی۔ قبرستان گذر گیا مگر داؤجی تھے کہ کچھ آیتیں سی پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ جب مقبرہ پر پہنچے تو میری روح فنا ہو گئی۔ یہاں سے لوگ دوپہر کے وقت بھی نہ گذرتے تھے کیونکہ پرانے زمانے میں یہاں ایک شہر غرق ہوا تھا۔ مرنے والوں کی روحیں اس ٹیلے پر رہتی تھیں اور آنے جانے والوں کا کلیجہ چبا جاتی تھیں۔ میں خوف سے کانپنے لگا تو داؤجی نے میرے گلے کے گرد مفلر اچھی طرح لپیٹ کر کہا کہ سامنے ان دو کیکروں کے درمیان اپنی پوری رفتار سے دس چکّر لگاؤ، پھر سو لمبی سانسیں کھینچو اور چھوڑو، تب میرے پاس آؤ میں یہاں بیٹھتا ہوں۔ میں مقبرہ سے جان بچانے کے لئے سیدھا ان کیکروں کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے ایک بڑے سے ڈھیلے پر بیٹھ کر آرام کیا اور ساتھ ہی حساب لگایا کہ چھ چکّروں کا وقت گذر چکا ہو گا اس کے بعد آہستہ آہستہ اونٹ کی طرح کیکروں کے درمیان دوڑنے لگا اور جب دس یعنی چار چکر پورے ہو گئے تو پھر اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگا۔ ایک تو درختوں پر عجیب و غریب قسم کے جانور بولنے لگے تھے دوسری میری پسلی میں بلا کا درد شروع ہو گیا تھا یہی مناسب سمجھا کہ مقبرہ پر جا کر داؤجی کو سوئے ہوئے اٹھاؤں اور گھر لے جا کر خوب خاطر کر دوں! غصّہ سے بھرا اور دہشت سے لرزتا میں ٹیلے کے پاس پہنچا۔ داؤجی مقبرہ کی ٹھیکریوں پر گھٹنوں کے بل گرے ہوئے دیوانوں کی طرح سر مار رہے تھے اور اونچے اونچے اپنا محبوب شعر گا رہے تھے ؎

جفا کم کُن کہ فردا روزِ محشر

بہ پیشِ عاشقاں شرمندہ باشی!

کبھی دونوں ہتھیلیاں زور سے زمین پر مارتے اور سر اوپر اٹھا کر انگشتِ شہادت فضا میں یوں ہلاتے جیسے کوئی ان کے سامنے کھڑا ہو اور اس سے کہہ رہے ہوں دیکھ لو، سوچ لو۔ میں نہیں...... میں تمہیں بتا رہا ہوں...... سُنا رہا ہوں...... ایک دھمکی دیئے جاتے تھے پھر تڑپ کر ٹھیکریوں پر گرتے اور جفا کم کُن جفا کم کُن کہتے ہوئے رونے سے لگتے۔ تھوڑی دیر میں ساکت و جامد وہاں کھڑا رہا اور پھر زور سے چیخ مار کر بجائے قصبہ کی طرف بھاگنے کے پھر کیکروں کی طرف دوڑ گیا۔ داؤجی ضرور اسم اعظم جانتے تھے اور وہ جِنّ قابو کر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک جِنّ ان کے سامنے کھڑا دیکھا تھا۔ بالکل الف لیلہ، با تصویر والا جِنّ تھا۔ جب داؤجی کا طلسم اس پر نہ چل سکا تو اس نے انہیں نیچے گرا لیا تھا۔ وہ چیخ رہے تھے جفا کم کُن جفا کم کُن مگر وہ چھوڑتا نہیں تھا۔ میں اُسی ڈھیلے پر بیٹھ کر رونے لگا ——— تھوڑی دیر بعد داؤجی آئے انہوں نے پہلے جیسا چہرہ بنا کر کہا "چل طنبورے" اور میں ڈرتا ڈرتا ان کے پیچھے ہو لیا۔ راستہ میں انہوں نے گلے میں لٹکتی ہوئی کھُلی پگڑی کے دونوں کونے ہاتھ میں پکڑ لئے اور جھوم جھوم کر گانے لگے۔

تیرے لمے لمے وال فریدا ٹریا ٹریا جا!

اس جادوگر کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے ان آنکھوں سے واقعی ان آنکھوں سے دیکھا کہ اس کا سر تبدیل ہو گیا اس کی لمبی لمبی زلفیں کندھوں پر جھُولنے لگیں اور اس کا سارا وجود جٹا دھاری ہو گیا ——— اس کے بعد چاہے کوئی میری بوٹی بوٹی اُڑا دیتا میں ان کے ساتھ سیر کو نہ گیا!

اس واقعہ کے چند ہی دن بعد کا قصّہ ہے کہ ہمارے گھر میں مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے اور اینٹوں کے ٹکڑے آ کر گرنے لگے۔ بے بے نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ بچوں والی گنیا کی طرح داؤجی سے چمٹ گئی، سچ مچ ان سے لپٹ گئی اور انہیں دھکّا دے کر زمین پر گرا دیا۔ وہ

چلّا رہی تھی "بڈھے ٹوٹکی یہ سب تیرے منتر ہیں۔ یہ سب تیری فارسی ہے۔ تیرا کالا علم ہے جو اُلٹا ہمارے سر پر آگیا ہے۔ تیرے پریت میرے گھر میں اینٹیں پھینکتے ہیں۔ اُجاڑ مانگتے ہیں۔ موت چاہتے ہیں" پھر وہ زور زور سے چیخنے لگی "میں مرگئی، میں جل گئی لوگو اس بڈھے نے میرے امی چند کی جان لینے کا پربندھ کیا ہے۔ مجھ پر جادو کیا ہے، میرا انگ انگ توڑ دیا ہے" امی چند تو داؤجی کو اپنی زندگی کی طرح عزیز تھا اور اس کی جان کے دشمن بھلا وہ کیونکر ہو سکتے تھے لیکن جنون کی خشت باری انہی کی وجہ سے عمل میں آئی تھی۔ جب میں نے بھی بے بے کی تائید کی تو داؤجی نے زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے جھڑک کر کہا "تو احمق ہے۔ اور تیری بے بے اُمّ الجاہلین ——— میری ایک سال کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ تو جنوں بھوتوں میں اعتقاد کرنے لگا۔ افسوس تو نے مجھے مایوس کر دیا، اے وائے کہ تو شعور کے بجائے عورتوں کے اعتقاد کا غلام نکلا۔ افسوس ——— صد افسوس" بے بے کو اُسی طرح چلّاتے اور داؤجی کو یوں کراہتے چھوڑ کر میں اوپر کوٹھے پر دھوپ میں جا بیٹھا ——— اسی دن شام کو جب میں اپنے گھر سے آ رہا تھا تو راستہ میں رانو نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھ کانی کر کے پوچھا "سنا بابو تیرے تو کوئی اینٹ ڈھیلا تو نہیں لگا؟ سنا ہے تمہارے پنڈت کے گھر میں روڑے گرتے ہیں" میں نے اس کمینے کے منہ لگنا پسند نہ کیا اور چپ چاپ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ رات کے وقت داؤجی مجھ سے جیومیٹری کی پرابلیمز سنتے ہوئے پوچھنے لگے "بیٹا کیا تم سچ مچ جن بھوت یا پری چڑیل کو کوئی مخلوق سمجھتے ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑے اور بولے "واقعی تو بہت بھولا ہے میں نے آج خواہ مخواہ تجھے جھڑک دیا۔ بھلا تو نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ جن ہوتے ہیں اور اس طرح سے اینٹیں پھینک سکتے ہیں ہم نے جو دلی مستری اور پچھتّر مزدور کو لگا کر برساتی بنوائی ہے وہ تیرے کسی جن کو کہہ کر بنوا لیتے۔ لیکن یہ تو بتا کہ جن صرف اینٹیں پھینکنے ہی کا کام کرتے ہیں کہ چنائی بھی جانتے ہیں؟" میں نے جل کر کہا "جتنے مذاق چاہو کر لو مگر جس دن سر پھٹے گا اس دن پتہ چلے گا داؤ" داؤجی نے کہا "تیرے جن کی پھینکی ہوئی اینٹ سے تو تا قیامت سر نہیں پھٹ سکتا اس لئے کہ نہ وہ ہے نہ اس سے اینٹ اُٹھائی جا سکے گی اور نہ میرے تیرے یا تیری بے بے کے سر میں لگے گی۔"

پھر بولے "سن! علم طبعی کا موٹا اصول ہے کہ کوئی مادی شے کسی غیر مادی وجود سے حرکت میں نہیں لائی جا سکتی ——— سمجھ گیا؟"

"سمجھ گیا!" میں نے چڑ کر کہا۔

ہمارے قصبہ میں ہائی سکول ضرور تھا لیکن میٹرک کے امتحان کا سنٹر نہ تھا۔ امتحان دینے کے لئے ہمیں ضلع جانا ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ صبح آگئی جب ہماری جماعت امتحان دینے کے لئے ضلع جا رہی تھی اور لاری کے ارد گرد والدین قسم کے لوگوں کا ایک ہجوم جمع تھا۔ اور سب لڑکوں کے گھر والے انہیں خیر و برکت کی دعاؤں سے نواز رہے تھے اور داؤجی سارے سال کی پڑھائی کا خلاصہ تیار کر کے جلدی جلدی سوال پوچھ رہے تھے اور میرے ساتھ ساتھ خود ہی جواب دیتے جاتے تھے۔ اکبر کی اصلاحات سے اچھل کر موسم کے تغیر و تبدّل پر پہنچ جاتے پیچھے رہ سکتے تھے۔ اور اس ہجوم سے داؤجی کیسے وہاں سے پلٹتے تو "اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا کر اپنی وضع سے ہندو معلوم ہوتا تھا۔ وہ نشہ میں چور تھا ایک عورت صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آئی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی" لہکر پوچھتے یہ کون تھا؟

"جہانگیر" میں نے جواب دیا "اور وہ عورت؟" "نور جہاں" ہم دونوں ایک ساتھ بولے ——— "صفت مشبہ اور اسم فاعل میں فرق؟" میں نے دونوں کی تعریفیں بیان کیں۔ بولے "مثالیں؟" میں نے مثالیں دیں۔ سب لڑکے لاری میں بیٹھ گئے۔ اور میں ان سے جان چھڑا کر جلدی سے داخل ہوا تو گھوم کر کھڑکی کے پاس آگئے اور پوچھنے لگے۔ "برِیک اِن اور برِیک اِن ٹو کو فقروں میں استعمال کرو۔" ان کا استعمال بھی ہو گیا اور موٹر سٹارٹ ہو کر چلی تو اس کے ساتھ قدم اُٹھا کر بولے "ملٹیوڑے مادیاں گھوڑی ماکیاں مرغی ...... مادیاں گھوڑی ...... ماکیاں ...... مرغی ——— ایک سال بعد خدا خدا کر کے یہ آواز دور ہوئی اور میں نے آزادی کا سانس لیا!

پہلے دن تاریخ کا پرچہ بہت اچھا ہوا۔ دوسرے دن جغرافیہ کا اس سے بھی بڑھ کر تیسرے دن اتوار تھا اور اس کے بعد حساب کی باری تھی۔

اتوار کی صبح داؤجی کا کوئی بیس صفحہ لمبا خط ملا جس میں الجبرے کے فارموں اور حساب کے قاعدوں کے علاوہ اور کوئی بات نہ تھی۔

حساب کا پرچہ کرنے کے بعد برآمدے میں مَیں نے لڑکوں سے جوابات ملائے تو سو میں سے اسّی نمبر کا پرچہ ٹھیک تھا۔ میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ زمین پر پاؤں نہ پڑتا تھا اور میرے مُنہ سے مسرّت کے نعرے نکل رہے تھے۔ جونہی میں نے برآمدے سے پاؤں باہر رکھا داؤجی کھمبس کندھے پہ ڈالے ایک لڑکے کا پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں چیخ مار کر ان سے لپٹ گیا اور "اسّی نمبر! اسّی نمبر" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ انہوں نے پرچہ میرے ہاتھ سے چھین کر تلخی سے پوچھا "کون سوال غلط ہو گیا؟" میں نے جھوم کر کہا "چار دیواری والا" جھلّا کر بولے "تو نے کھڑکیاں اور دروازے منفی نہ کئے ہوں گے" میں نے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر پیڑ کی طرح جھُلاتے ہوئے کہا "ہاں جی ہاں جی ——— گولی مارو کھڑکیوں کو" داؤجی ڈوبی ہوئی آواز میں بولے "تو نے مجھے برباد کر دیا طنبورے۔ سال کے تین سو پینسٹھ دن میں پکار پکار کر کہتا رہا مسطحات کا سوال آنکھیں کھول کر حل کرنا مگر تو نے میری بات نہ مانی۔ تو نے میری بات نہ مانی بیس نمبر ضائع کئے...... پورے بیس نمبر" اور داؤجی کا چہرہ دیکھ کر میری اسّی فیصدی کامیابی بیس فیصدی ناکامی کے نیچے یوں دب گئی گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا، راستہ بھر وہ اپنے آپ سے کہتے رہے "اگر ممتحن اچھے دل کا ہوا تو دو ایک نمبر ضرور دیگا، تیرا باقی حل تو ٹھیک ہے" اُس پرچے کے بعد داؤجی امتحان کے آخری دن تک میرے ساتھ رہے۔ وہ رات کے بارہ بجے تک مجھے اس سرائے میں بیٹھ کر پڑھاتے جہاں ہماری کلاس مقیم تھی اور اس کے بعد بقول ان کے اپنے ایک دوست کے یہاں چلے جاتے۔ صبح آٹھ بجے پھر آجاتے اور کمرۂ امتحان تک میرے ساتھ چلتے۔

امتحان ختم ہوتے ہی میں نے داؤجی کو یوں چھوڑ دیا گویا میری ان سے جان پہچان ہی نہ تھی۔ سارا دن دوستوں یاروں کے ساتھ گھومتا اور شام کو ناولیں پڑھا کرتا۔ اس دوران میں اگر کبھی فرصت ملتی تو داؤجی کو سلام کرنے بھی چلا جاتا۔ وہ اس بات پر مصر تھے کہ میں ہر روز کم از کم ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گذارا کروں تاکہ وہ مجھے کالج کی پڑھائی کے لئے بھی تیار کر دیں لیکن میں ان کے پھندے میں آنے والا نہ تھا۔ مجھے کالج میں سو بار فیل ہونا گوارا تھا اور ہے لیکن داؤجی سے پڑھنا منظور نہیں۔ پڑھنے کو چھوڑئیے ان سے باتیں کرنا بھی مشکل تھا۔ میں نے کچھ پوچھا انہوں نے کہا اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔ میں نے کچھ جواب دیا فرمایا اسکی ترکیب نحوی کرو۔ جوالداروں کی گائے اندر گھس آئی۔ میں اُسے لکڑی سے باہر نکال رہا ہوں اور داؤجی پوچھ رہے ہیں cow ناؤن ہے یا ورب۔ اب ہر عقل کا اندھا پانچویں جماعت تک پڑھا جانتا ہے کہ گائے اسم ہے مگر داؤجی فرما رہے ہیں کہ اسم بھی ہے اور فعل بھی۔ to cow کا مطلب ہے ڈرانا۔ دھمکی دینا۔ اور یہ اُن دنوں کی باتیں ہیں جب میں امتحان سے فارغ ہو کر نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا ——— پھر ایک وہ دن بھی آیا جب ہم چند دوست شکار کھیلنے کے لئے نکلے تو میں نے ان سے درخواست کی کہ منصفی کے آگے سے نہ جائیں کیونکہ وہاں داؤجی ہوں گے اور مجھے روک کر شکار بندوق اور کارتوسوں کے محاورے پوچھنے لگیں گے۔ بازار میں دکھائی دے جاتے تو میں کسی بغلی گلی میں گھس جاتا۔ گھر پر رسماً ملنے جاتا تو بے بے سے زیادہ اور داؤجی سے کم باتیں کرتا۔ اکثر کہا کرتے "افسوس آفتاب کی طرح تو بھی ہمیں فراموش کر رہا ہے" میں شرارتاً خیلے خوب خیلے خوب کہہ کر ہنسنے لگتا۔

جس دن نتیجہ نکلا میں اور اباجی لڈوؤں کی ایک چھوٹی سی ٹوکری لے کر ان کے گھر گئے۔ داؤجی سر جھکائے اپنے حصیر پر بیٹھے تھے۔ اباجی کو دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اندر سے کرسی اُٹھا لائے اور اپنے بوریئے کے پاس ڈال کر بولے "ڈاکٹر صاحب آپ کے سامنے شرمندہ ہوں لیکن اسے بھی مقسوم کی خوبی سمجھیئے۔ میرا خیال تھا اسکی فرسٹ ڈویژن آجائیگی لیکن نہ آسکی۔ بنیاد کمزور تھی......"

"ایک ہی تو نمبر کم ہے" میں نے چہک کر بات کاٹی۔

اور وہ میری طرف دیکھ کر بولے "تو نہیں جانتا اس ایک نمبر سے میرا دل دو نیم ہو گیا ہے۔ خیر میں اسے منجانب اللہ خیال کرتا ہوں"

پھر اباجی اور وہ باتیں کرنے لگے اور میں بے بے کے ساتھ گپیں لڑانے میں مشغول ہو گیا۔

اوّل اوّل کالج سے میں داؤجی کے خطوں کا باقاعدہ جواب دیتا رہا۔ اس کے بعد بے قاعدگی سے لکھنے لگا اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا چھٹیوں میں جب گھر آتا تو جیسے سکول کے دیگر ماسٹروں سے ملتا ویسے ہی داؤجی کو بھی سلام کر آتا۔ اب وہ مجھ سے سوال وغیرہ نہ پوچھتے تھے۔ کوٹ پتلون اور ٹائی دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ چارپائی پر بیٹھنے نہ دیتے تھے۔ کہا کرتے اگر مجھے اُٹھانے نہیں دیتا تو خود کرسی لے لے۔ اور میں کرسی کھینچ کر ان کے پاس ڈٹ جاتا۔ کالج لائبریری سے میں جو کتابیں ساتھ لایا کرتا انہیں دیکھنے کی تمنّا ضرور کرتے اور میرے وعدے کے باوجود اگلے دن خود ہمارے گھر آ کر کتابیں دیکھ جاتے۔ امی چند بوجوہ کالج چھوڑ کر بنک میں ملازم ہو گیا تھا اور دلّی چلا گیا تھا۔ بے بے کی سلائی کا کام بدستور تھا۔ داؤجی بھی منصفی جاتے تھے لیکن کچھ لاتے نہ تھے۔ بی بی کے خط آتے تھے اور وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی ——— کالج کی ایک سال کی زندگی نے مجھے داؤجی سے بہت دُور کھینچ لیا۔ وہ لڑکیاں جو دو سال پہلے ہمارے ساتھ آپوٹا پو کھیلا کرتی تھیں بنت عم بن گئی تھیں بسیکنڈ ایئر کے زمانے کی ہر چھٹی میں آپوٹا پو میں گذارنے کی کوشش کرتا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا۔ گھر کی مختصر مسافت کے سامنے ایبٹ آباد کا طویل سفر زیادہ تسکین دہ اور سُہانا بن گیا۔ انہی ایّام میں مَیں نے پہلی مرتبہ ایک خوبصورت گلابی پیڈ اور ایسے ہی لفافوں کا ایک پیکٹ خریدا تھا اور ان پر نہ اباجی کو خط لکھے جا سکتے تھے اور نہ ہی داؤجی کو۔ نہ دسہرے کی چھٹیوں میں داؤجی سے ملاقات ہو سکی نہ کرسمس کی تعطیلات میں۔ ایسے ہی ایسٹر گذر گیا اور یوں ہی ایّام گذرتے رہے۔

...... ملک کو آزادی ملنے لگی تو کچھ بلوے ہوئے پھر لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ ہر طرف سے فسادات کی خبریں آنے لگیں اور اماں نے ہم سب کو گھر بلوا لیا۔ ہمارے لئے یہ جگہ بہت محفوظ تھی۔ نتھے ساہوکار گھر بار چھوڑ کر بھاگ رہے تھے لیکن دوسرے لوگ خاموش تھے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہی لوگ یہ خبر لائے کہ آزادی مل گئی! ایک دن ہمارے قصبہ میں بھی چند گھروں کو آگ لگ اور دوناکوں پر سخت لڑائی ہوئی۔ تھانے والوں اور ملٹری کے سپاہیوں نے کرفیو لگا دیا، اور جب کرفیو ختم ہوا تو سب ہندو سکھ قصبہ چھوڑ کر چل دیئے۔ دوپہر کو اماں نے مجھے داؤجی کی خبر لینے کو بھیجا تو اس جانی پہچانی گلی میں عجیب و غریب اجنبی صورتیں نظر آئیں۔ ہمارے گھر بیبی داؤجی کے گھر کی ڈیوڑھی میں ایک بیل بندھا تھا اور اس کے پیچھے بوری کا پردہ لٹک رہا تھا۔ میں نے گھر آکر بتایا کہ داؤجی اور بے بے اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور یہ کہتے ہوئے میرا گلا رندھ گیا۔ اُس دن مجھے یوں لگا جیسے داؤجی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے گئے ہیں اور اب لوٹ کر نہ آئیں گے۔ داؤجی ایسے بے وفا تھے! ——— کوئی تیسرے روز غروبِ آفتاب کے بہت بعد۔ جب میں مسجد میں نئے پناہ گزینوں کے نام نوٹ کرکے اور کمبل بھجوانے کا وعدہ کرکے اس گلی سے گذرا تو کھلے میدان میں سو دو سو آدمیوں کی بھیڑ جمع دیکھی۔ مہاجر لڑکے لاٹھیاں پکڑے نعرے لگا رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے تماشائیوں کو پھاڑ کر مرکز میں گھسنے کی کوشش کی مگر مہاجرین کی خونخوار آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ ایک لڑکا کسی بزرگ سے کہہ رہا تھا، "ساتھ کے گاؤں میں گیا ہوا تھا جب لوٹا تو اپنے گھر میں گھستا چلا گیا۔"

"کونسے گھر میں؟" بزرگ نے پوچھا۔

"رہتکی مہاجروں کے گھر میں" لڑکے نے کہا۔

"پھر؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"پھر کیا۔ اُنہوں نے پکڑ لیا۔ دیکھا تو ہندو نکلا۔"

اتنے میں اس بھیڑ سے کسی نے چلّا کر کہا "اوئے راتو جلدی آ اوئے جلدی آ ——— تیری سامی ——— پنڈت ——— تیری سامی۔"

راتو بکریوں کا ریوڑ باڑے کی طرف لے جا رہا تھا۔ انہیں روک کر اور ایک لاٹھی والے لڑکے کو اُن کے آگے کھڑا کرکے وہ بھیڑ میں گھس گیا۔ میرے دل کو ایک دھکا سا لگا جیسے اُنہوں نے داؤجی کو پکڑ لیا ہو۔ میں نے ملزم کو دیکھے بغیر اپنے قریبی لوگوں سے کہا "یہ بڑا اچھا آدمی ہے

بڑا نیک آدمی ہے ——— اسے کچھ مت کہو ...... یہ تو ...... یہ تو ...... "خون میں نہائی ہوئی چند آنکھوں نے میری طرف دیکھا اور ایک نوجوان گنڈاسی تول کر بولا۔

"بتاؤں تجھے بھی ——— آگیا بڑا حمائتی بن کر ——— تیرے ساتھ کچھ ہوا نہیں نا" اور لوگوں نے گالیاں بک کر کہا۔ "انصاری ہوگا شاید" ـ

میں ڈر کر دوسری جانب بھیڑ میں گھس گیا۔ رآنو کی قیادت میں اس کے دوست داؤجی کو گھیرے کھڑے تھے اور رآنو داؤجی کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا "اب بول بیٹا اب بول" اور داؤجی خاموش کھڑے تھے۔ ایک لڑکے نے ان کی پگڑی اُتار کر کہا "پہلے بودی کاٹو بودی" اور رآنو نے مسواکیں کاٹنے والی درانتی سے داؤجی کی بودی کاٹ دی۔ وہی لڑکا پھر بولا "بلا دیں جے؟" اور رآنو نے کہا "جانے دو بڈھا ہے، میرے ساتھ بکریاں چرایا کریگا" پھر اس نے داؤجی کی ٹھوڑی اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا "کلمہ پڑھ پنڈتا" اور داؤجی آہستہ سے بولے۔

"کون؟"

رآنو نے ان کے ننگے سر پر ایسا تھپیڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا "سالے کلمے بھی کوئی پانچ سات ہیں!"

جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو رآنو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا "چل بکریاں تیری انتظاری کرتی ہیں"

اور ننگے سر داؤجی بکریوں کے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فریدا چل رہا ہو!

مُردہ گھر

شوکت صدیقی

ساڑھے آٹھ بجے، ایک بار پھر بگل کی تیز آواز فضا میں گونجنے لگی۔ کیمپ نمبر ۱۵ کے سارے قیدی، اپنی بیرکوں سے باہر نکل کر پھاٹک پر اکٹھے ہونے لگے جہاں پستہ قد کا سارجنٹ، رجسٹر میں ان کی حاضری درج کر رہا تھا۔ پھر نیم پختہ سڑک پر سے گزرتی ہوئی قیدیوں کی ٹولیاں، جنوبی پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گئیں۔ یہاں ہوائی اڈے کی تعمیر ہو رہی تھی۔ اس وقت ان کے چہرے کسی قدر بشاش نظر آ رہے تھے اور مارچ کرتے ہوئے فوجی دستوں کی طرح ان کے قدم بڑی باقاعدگی کے ساتھ حرکت کر رہے تھے۔

اس کیمپ میں اس وقت دو ہزار سے زیادہ قیدی موجود تھے۔ مگر نئی بیرکوں کی تعمیر سے یہ اندازہ ہونے لگا تھا کہ ابھی اور قیدی آنے والے ہیں۔ یہ ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے۔ جب مشرق قریب کے محاذ پر اطالوی فوجیں پسپا ہوتی جا رہی تھیں اور ان شکست خوردہ فوجی دستوں کے ہزاروں سپاہیوں کو جہازوں میں بھر کر بمبئی کے ساحل پر پہنچایا جا رہا تھا۔ جہاں سے ان کو جنگی قیدیوں کے مختلف کیمپوں میں منتقل کر دیا جاتا۔ کئی دن تک اسپیشل ٹرین میں سفر کرنے کے بعد، جب وہ پہلی بار بیراگڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر اترتے تو ان کے سہمے ہوئے چہروں سے وحشت برستی تھی۔ بے ڈھنگے لباس اور برہنہ پا ہونے کے باعث، وہ نیلام ہونے والے غلاموں کی طرح بدنصیب معلوم ہوتے تھے۔ اس زمانے میں فوجی ٹرکوں کی بڑی قلت تھی، اس لئے عام طور پر ان کو مسلح پہرے داروں کی نگرانی میں، مویشیوں کے گلہ کی طرح ہانک کر کانٹوں دار باڑہ کے اندر پہنچا دیا جاتا۔ یہیں ان کو سرمئی رنگ کی یونیفارم دی جاتی، جس کی پشت پر سیاہ کپڑے کا چوکور پیوند آویزاں ہوتا۔ یہ جنگی قیدی ہونے کا نشان تھا۔

(ہوائی اڈے کی تعمیر کے علاوہ اطالوی قیدیوں کو اور بھی بہت سے کام کرنے پڑتے تھے۔ اس مشقت نے ان کے پٹھوں کو مضبوط بنا دیا تھا۔ لیکن ذہنی طور پر وہ جرائم پیشہ قیدیوں کی طرح روز بروز ناکارہ بنتے جا رہے تھے ——!)

اور جب اساڑھ کی چلچلاتی دھوپ میں، پتھریلی چٹانیں، دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح سرخی مائل نظر آنے لگیں تو کینٹین کے سامنے لکڑی کی بنی ہوئی گاڑیاں آ کر ٹھہر گئیں اور ان کو کھینچ کر لانے والے قیدی سائبان کے نیچے بیٹھ کر خچروں کی طرح ہانپنے لگے۔ ان کے سروں پر کپڑے کے بنے ہوئے بے ڈھنگے ہیٹ تھے اور جسم کا اوپری حصہ بالکل برہنہ تھا۔ گرد آلود چہروں پر سے پسینہ پونچھ کر وہ بار بار اسٹورکیپر کی طرف دیکھ کر بے تکے پن سے ہنسنے کی کوشش کرنے لگے، لیکن وہ اس غیر واضح خوشامد پہ ذرا بھی توجہ نہیں دیتا۔ اس لئے کہ اگر سپلائی میں تاخیر ہو گئی تو کوارٹر ماسٹر خواہ مخواہ ناراض ہو جائے گا وہ سامان کی فہرست پر سرخ پنسل سے نشان لگاتا جا رہا تھا اور اونچی آواز میں کینٹین کے قلیوں کو ہر طرح کی ہدایتیں دے رہا تھا۔ آخر جب سارا سامان گاڑیوں پر لد گیا تو اس نے برابر والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ کوارٹر ماسٹر ابھی تک منیجر سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ لہٰذا اس نے قیدیوں کی طرف دیکھا اور تھکے ہوئے انداز میں ان سے دریافت کرنے لگا۔

"تمہارے ملک میں بھی اتنی سخت گرمی پڑتی ہے؟"

قیدیوں کی سمجھ میں حسب معمول اس کی بات واضح نہ ہو سکی۔ اس لئے وہ بے ترتیب انگریزی میں بہت سی باتیں یکبارگی پوچھنے لگے۔ لیکن اس دفعہ ادھیڑ عمر کا اسٹورکیپر بھی احمقوں کی طرح صرف ان کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ وہ ہاتھ کے اشاروں سے اس کو سمجھانے لگے مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آخر وہ جھنجھلا کر ان کو گالیاں دینے لگا۔ اس بات پر وہ مضمحل ہو کر خاموش ہو گئے۔ اسٹورکیپر ذرا دیر تک تو خواہ مخواہ ہنستا رہا، پھر کسی نامعلوم جذبۂ ہمدردی سے متاثر ہو کر اس نے میز کے نیچے سے سستے قسم کے سگرٹ کا ایک پیکٹ نکالا اور ان کے سامنے پھینک کر کہنے لگا۔

"اچھا لو، سگرٹ پیو!"

لیکن اس خیرات نے اچھا خاصا ہنگامہ برپا کر دیا۔ دراصل قیدی تعداد میں زیادہ تھے اور سگرٹیں کم تھیں۔ اس لئے آپس میں چھینا جھپٹی شروع ہو گئی اور تمام سگرٹوں کا کچومر نکل گیا۔ پھر وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگے اور بھوکے کتوں کی طرح ایک دوسرے پر حملہ کرنے لگے۔ جب جھگڑا بہت بڑھ گیا اور ان کے جسم لہولہان ہو گئے تو اسٹورکیپر بھی گھبرا گیا۔ حالانکہ اس طرح کے فساد وہ قیدیوں کے درمیان اکثر دیکھ چکا تھا، مگر اس وقت ہنگامہ کچھ زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ دوسرے کمرے میں کوارٹر ماسٹر مینیجر سے کہہ رہا تھا۔

"جس طرح بھی ممکن ہو، ہفتہ کے روز مجھ کو آسٹریلین جن کی ایک بوتل مہیا کر دو، ورنہ میرا سارا پروگرام ادھورا رہ جائے گا"

لیکن کینٹین کا مدراسی مینیجر کوئی قطعی وعدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے کوارٹر ماسٹر کو بار بار اصرار کرنا پڑ رہا تھا۔ مینیجر کچھ نیم رضامند ہوا تھا کہ باہر شور مچنے لگا اس بے ہنگم خلل پر کوارٹر ماسٹر ایکبارگی جھنجھلا اٹھا۔ باہر آکر اس نے چمڑے کا تسمہ اٹھایا اور غصہ سے بے قابو ہو کر ان پر جھپٹ پڑا۔ ذرا دیر تک فضا میں سڑ سڑ کی آوازیں ابھرتی رہیں اور قیدیوں کے برہنہ جسموں پر سوکھی شاخوں کے سے بھدے نشان پھیلنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا شور دب کر رہ گیا اور جھگڑا کرنے والے قیدی سرکس کے پالتو جانوروں کی طرح مسکین سی شکلیں بنا کر دیوار کے پاس سمٹ سمٹ کر بیٹھ گئے۔ ان قیدیوں میں مارٹینو بھی موجود تھا، جو اپنی نرم بالوں والی داڑھی کیساتھ برطانوی ملاحوں کی طرح خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ ابھی اس کی عمر زیادہ نہیں تھی، مگر اس کے چہرے سے بڑی ذہانت برستی تھی۔ وہ اپنے بازو کی گہری خراش کو آہستہ آہستہ سہلاتا رہا اور تیز عقابی نظروں سے کوارٹر ماسٹر کو گھورتا رہا جو دروازے پر کھڑا مینیجر سے باتیں کر رہا تھا۔

پانچ بجے تمام جنگی قیدی، اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر کیمپ کے اندر پہنچ گئے۔ اس وقت حسب معمول بیرکوں میں بڑا ادھم ہو رہا تھا۔ اب دن ڈھل چکا تھا اور پہاڑی ٹیلوں پر سائے طویل ہو گئے تھے۔ سامنے سڑک پر ایک بھدے جسم کی عورت تھکے ہوئے انداز میں آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ قیدیوں نے اس کو دیکھا تو ذرا دیر تک وہ اس کو گھورتے رہے، پھر ان میں سے کچھ احاطہ کو عبور کر کے کانٹوں دار باڑھ کے قریب پہنچ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اور بھی قیدی وہاں اکٹھے ہو گئے پھر انہوں نے سیٹیاں بجا کر اور حلق سے بے ڈھنگی آوازیں پیدا کر کے اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ بھدے جسم والی عورت نے ان کو ایکبار بے نیازی سے دیکھا اور سر جھکا کر چلنے لگی۔ مگر جب وہ سڑک پر بالکل ان کے سامنے سے گزرنے لگی تو قیدیوں نے زیادہ شدت کے ساتھ شور مچانا شروع کر دیا۔ دیوانوں کی طرح انہوں نے باڑھ کے کانٹے دار تاروں کو جھنجھوڑ ڈالا اور اپنے نیم برہنہ جسموں کو اور بھی عریاں کر دیا۔ اس وقت وہ حملہ آور ہونے والے بن مانسوں کی طرح غضبناک معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھیں وحشت سے پھٹی ہوئی تھیں اور منہ سے کف جاری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کیمپ کے گرد و نواح میں عورتوں کے گزرنے پر پابندی عائد تھی، پہرے پر کھڑے ہوئے فوجی سپاہی نے پہلے تو عورت کو چیخ چیخ کر گالیاں دیں اور پھر قیدیوں کو ڈانٹنے لگا۔ مگر جب وہ اس پر بھی باز نہ آئے تو وہ اپنی سنگین سنبھال کر ان کی طرف جھپٹا۔ آخر قیدیوں نے باڑھ کو چھوڑ دیا اور ہانپنے کے سے انداز میں لمبی لمبی سانسیں بھرتے ہوئے بیرکوں کی طرف لوٹ گئے۔ لیکن اس وحشیانہ ہنگامہ میں مارٹینو شریک نہیں تھا۔ وہ دروازے کے نزدیک کھڑا ہوا خاموشی کے ساتھ قیدیوں کی اس حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں کی عقابی چمک کچھ اور شدید ہو گئی تھی۔

مارٹینو اسی طرح خاموش کھڑا ہوا، گہری نظروں سے ان کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ قیدیوں کا یہ کیمپ ایک بہت وسیع پاگل خانہ ہے۔ جس میں ہر شخص بہکے ہوئے شرابیوں کی طرح اپنے حواس کھو بیٹھا ہے۔ لیکن وہ خود پاگل تو نہیں بن سکا، البتہ وہ بے حد خونخوار ہوتا جا رہا ہے لیکن وہ کس کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ یہ اس کو ابھی تک نہیں معلوم تھا۔ شام کا اندھیرا اب بڑھنے لگا تھا اور ہر طرف روشنیوں کی جگمگاہٹ پھیل گئی تھی۔ بیرک کے اندر بہت سے قیدی ملی جلی آوازوں کے ساتھ کوئی اطالوی گیت گا رہے تھے۔ یہ آوازیں اپنی انتہائی شدت پر پہنچ کر آہستہ آہستہ ایک کربناک لے کی طرح مدھم پڑتی جا رہی تھیں۔ کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت سے لوگ کسی تابوت کے سامنے بیٹھے رو رہے ہیں۔ پھر بوجھل قدموں سے چلتا ہوا، وہ بھی اس طرف چل دیا (اس لئے کہ ان ماتم کرنے والوں میں خود اس کی آواز بھی کہیں دبی ہوئی تھی)، شام کی تاریکی رفتہ رفتہ اور گہری ہو گئی۔

نو بجے شب کو جب بگل کی تیز آواز آخری بار رات کے سناٹے میں گونجنے لگی تو کیمپ کے سارے قیدی اپنے بستروں پر جا کر دراز ہو گئے۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ ابھی تھوڑی دیر بعد سارجنٹ معائنہ کرنے آئے گا۔ اگر کوئی قیدی بیرک کے باہر پایا گیا تو سویرے اس کو کیپٹن ہارڈ کے روبرو پیش کیا جائے گا جو ہمیشہ بڑی کڑی سزا دیتا تھا۔ اب بیرکوں کے اندر روشنیاں گل ہونا شروع ہو گئی تھیں اور پہرے داروں کی آوازیں اونچی ہوتی جا رہی تھیں۔

لیکن اس روز مارٹینو کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ اپنے بستر پر خاموش لیٹا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا۔ بیرک کے اندر تمام قیدی گہری نیند میں پڑے سو رہے تھے۔ ایکا ایکی باہر ورانڈے میں بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی ٹارچ کی تیز روشنی بیرک کے اندر پھیل گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں، اور خاموش لیٹا ہوا غور کرنے لگا کہ اب ساڑھے دس بج چکے ہیں اور سارجنٹ رات کے معائنہ کا دوسرا گشت لگا رہا ہے۔

آخر جب سارجنٹ دورہ کر کے واپس چلا گیا اور ہیڈ کوارٹر کے گھڑیال نے گیارہ بجے کا اعلان کیا تو مارٹینو نے اپنے سرہانے سے ٹٹول کر کسی چیز کو تلاش کیا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سارے قیدی بے خبر سو رہے تھے۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا پہلے غسل خانے کی طرف گیا اور دروازے پر ذرا دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر اس نے باہر احاطہ کی طرف دیکھا۔ اس وقت آہستہ آہستہ بارش ہو رہی تھی۔ پہریدار اپنی سنگینیں سنبھالے ہوئے فوجی انداز سے گشت کر رہے تھے۔ ان کے جوتوں کی آواز رات کے سناٹے میں صاف سنائی دے رہی تھی۔ مشرقی کونے پر بنی ہوئی لکڑی کی اونچی برجی پر ایک گورکھا سپاہی بڑی مستعدی سے کھڑا تھا۔ کئی منٹ تک وہ تمام باتوں کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اس کی نگاہ ایک مقام پر ٹک گئی جہاں برابر والی بیرک کے سائے کی وجہ سے تھوڑا سا اندھیرا ہو گیا تھا۔

اس عرصہ میں پہرے دار کئی بار اس کے سامنے سے گزر چکا تھا۔ آخر ایک بار جب اس کی پیٹھ مارٹینو کی طرف ہو گئی تو وہ دیوار کے سہارے سمٹ کر چلتا ہوا، احاطہ کے میدان کو عبور کر کے باڑھ کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں کسی قدر تاریکی بھی تھی اور کوڑے کا ڈھیر تھا۔ جس کے پیچھے وہ دبک کر لیٹ سکتا تھا جب وہ اس جگہ پر پہنچ گیا تو اس نے پہرے دار سپاہی کے فوجی جوتوں کی آواز اپنے قریب محسوس کی۔ اس نے سانس بالکل روک لی اور زمین سے چمٹ گیا۔ کھٹ، کھٹ! پہرے دار کے جوتوں کی آواز تیز ہوتی گئی۔ وہ قریب، اور قریب آتا گیا۔ پھر اس نے بالکل اپنے سر کے برابر قدموں کی آہٹ محسوس کی۔ اس کا تمام جسم ایک بارگی لرز کر رہ گیا۔ پہریدار اب دور ہوتا جا رہا تھا۔ دوبارہ اس طرح کا خطرہ مول لینے کی گنجائش نہیں تھی اس لئے اس کے پاس ایک منٹ سے بھی کم عرصہ تھا۔ اس کو جو کچھ بھی کرنا تھا اس کے واسطے کل اتنا ہی وقت تھا۔ اس نے کسی طرف نظریں اٹھائے بغیر، آہستہ سے، لوہے کا ایک ٹیڑھا سا ٹکڑا نکالا اور پھرتی کے ساتھ باڑھ کے کانٹوں دار تاروں کو کاٹ ڈالا۔ اس میں سے گزر کر وہ دوسری باڑھ کے پاس پہنچا، جب اس کو کاٹ کر وہ باہر نکل رہا تھا تو اس نے محسوس کیا کہ پہرے دار واپس لوٹ رہا ہے۔ اب کیا کیا جائے؟ کیا وہ کٹی ہوئی باڑھ کے نزدیک زمین پر لیٹا رہے یا رینگتا ہوا آگے بڑھ جائے۔ یہ بات اس کو فوراً ہی طے کرنا تھی۔ پہرے دار کے جوتوں کی بھاری آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔ بارش کی بوندوں سے اس کے سر کے بال بھیگ کر چہرے پر بکھر گئے، اس لئے

سامنے کچھ ٹھیک سے نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ کچھ بھی فیصلہ نہ کرسکا اور جب پہریدار بالکل قریب آگیا تو وہ گھبراکر تیزی سے داہنی طرف بھاگنے لگا۔ اسی وقت قریب ہی سے کسی نے چیخ کر کہا۔

"ہے، کون ہے ؟"

لیکن اس نے آواز کی پروانہ کی اور اسی طرح بے تحاشہ بھاگتا رہا، پھر رات کے سناٹے میں بندوق چلنے کی آواز چیختی ہوئی معلوم ہوئی اور گولی اس کے بازو کے پاس سے سنسناتی ہوئی گزرگئی۔ وہ جھٹ سے زمین پر گرپڑا۔ پھر کئی گولیاں اس کے سرپر سے گزرگئیں، مگر وہ ان سے خوفزدہ نہیں ہوا۔ اس لئے کہ اس بات کا تو وہ عادی ہوچکا تھا) اب اس کو فکر یہ تھی کہ وہ جائے تو کس طرف، البتہ اتنا اس کو احساس تھا کہ وہ سڑک کے کنارے لیٹا ہے جس کے قریب ہی ایک نالہ بہتا تھا۔ کچھ بھی سوچ کر وہ اس طرف رینگنے لگا۔ پہرے دار اونچی آوازوں سے شور مچا رہے تھے۔

"ہوشیار رہو، ایک قیدی فرار ہوگیا ہے"

"دیکھو دور نہ جانے پائے !"

"ہوشیار رہو، سڑک کو گھیرے میں لے لو"

ان آوازوں کے ساتھ ہر طرف سیٹیاں بجنے لگیں۔ سڑک پر سپاہیوں کے قدموں کی آہٹیں اُبھرنے لگی تھیں۔ پھر رات کے سناٹے میں خطرہ کا سائرن، بڑے بھیانک انداز میں گونجنے لگا اور مارٹینو سڑک کے کنارے پڑا ہوا غور کرنے لگا کہ جس جگہ پر وہ لیٹا ہے وہاں گہرا اندھیرا ہے اور کیچڑ بہت زیادہ ہے نالہ تک پہنچنے میں اس کو روشنی سے گزرنا پڑے گا، جس کو وہ کیچڑ سے لتھڑے ہوئے بدن کے ساتھ پھرتی سے عبور نہیں کرسکتا۔ اب سڑک پر فوجی جوتوں کی آوازیں قریب آتی جارہی تھیں اور جب ایک دفعہ ٹارچ کی تیز روشنی اس کے جسم پر سے گزرگئی تو کسی نے چیخ کر کہا۔

"ادھر دلدل کی طرف کوئی نظر آرہا ہے"

"خبردار، دوسری طرف نہ جانے پائے"

ان آوازوں سے پریشان ہوکر وہ ایک دم سے اٹھ کر بھاگنے لگا، کئی بندوقیں ایک بارگی چیخیں اور ایک گولی اس کے کندھے کو چیرتی ہوئی گزرگئی مگر وہ برابر دوڑتا رہا۔ آخر کینٹین کے نزدیک پہنچ کر وہ اس کے سائبان کے نیچے چلا گیا۔ زمین پر لیٹا ہوا ایک قلی اس کی ٹھوکر سے جاگ کر چیخ پڑا۔

"کون ہے ؟"

مارٹینو نے گلا دبوچنے کے سے انداز میں غضب ناک ہوکر اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دئے۔ وہ خوفزدہ ہوکر وہیں بستر سے چمٹ گیا۔ مارٹینو نے دیکھا کہ اسٹور کا دروازہ کھلا ہے اور وہ راستہ میں بکھرے ہوئے سامان سے ٹکراتا ہوا ایک الماری کے پیچھے جاکر بے سُدھ ہوکر گر پڑا۔

تھوڑی دیر بعد کینٹین کے چاروں طرف فوجی سپاہیوں کا ہجوم ہوگیا۔ لیکن جب مارٹینو کو الماری کے پیچھے سے گرفتار کیا گیا تو زیادہ خون بہہ جانے کے باعث وہ بیہوش ہوگیا تھا۔ آخر ایمبولنس کے اندر ڈال کر اسے جلد ہی اسپتال پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹر نے جب اس کو پہلی مرتبہ دیکھا تو اس نے بڑے افسردہ لہجہ میں کہا تھا

"ارے یہ تو بہت نو عمر ہے"

ڈیوٹی نرس کہنے لگی "بے وقوف لڑکا! اس کو یہ بھی خبر نہیں کہ وہ بھاگ کر جائے گا کہاں!"

"اجنبی ملک میں کوئی اس کی بولی بھی تو سمجھنے والا نہیں"

"........"

پھر اس کے زخموں کا اپریشن کر کے ٹانکے لگا دئے گئے اور اس کو قیدیوں کے وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔ لیکن وہ رات بھر بیہوش پڑا رہا۔ دوسرے دن اس کو ہوش آیا۔ مگر زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے نقاہت اتنی زیادہ تھی کہ وہ نیم مردہ حالت میں چپ چاپ بستر پر پڑا رہا۔ کئی روز تک وہ اسی طرح بے سُدھ لیٹا ہوا آہستہ آہستہ کراہتا رہا۔

اس روز رات کو اس کے زخموں کی تکلیف کچھ کم تھی۔ وہ نیم غنودگی کے عالم میں لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا؟ یہ سب کیا ہو گیا؟ پھر اچانک اس نے کمرے کے اندر قدموں کی آہٹ سُنی۔ رات کی ڈیوٹی والی نرس آئی تھی۔ ذرا دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کو کروٹ کے بل لٹانے کے بعد وہ آہستہ آہستہ اس کی پشت پر مالش کر رہی تھی۔ اس کا ہاتھ بے حد نرم تھا اور وہ بڑی احتیاط کے ساتھ ہاتھوں کو چلا رہی تھی اس طرح اس کو بڑا سکون مل رہا تھا۔ پھر اس نے مارٹینیز کا داہنا بازو ایک طرف کر کے انجکشن دیا اور اس کے بعد وہ دبے قدموں چلتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اب اس میں زندگی کی حرارت نمودار ہوتی جا رہی تھی اور اس کا ذہن تیزی کے ساتھ بہت سی باتیں سوچنے لگا تھا۔

جس کمرے میں اس کو رکھا گیا تھا اس کی دیواریں ہلکی زرد رنگ کی تھیں۔ سامنے کونے میں ایک لمبی میز تھی، جس کے قریب نرس بیٹھ کر رجسٹر میں اندراج کرتی تھی۔ لیکن وہ ہر وقت کمرے کے اندر موجود نہیں رہتی۔ البتہ مارٹینیز کے سرہانے بستر میں گھنٹی لگی تھی جس کو دبانے سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اندر آ جاتا، اس کا لباس بڑا میلا تھا اور اس کے چہرے پر بڑی کرختگی تھی لیکن گھنٹی کی آواز کے ساتھ ہی وہ فوراً اندر آ جاتا تھا۔ وہ اس کو عام طور پر اس وقت بلاتا جب اس کو پیاس معلوم ہوتی۔ یوں وہ اس کو بار بار دیکھنا نہیں چاہتا تھا اس لئے کہ اس کے چہرے سے اس کو بڑی وحشت ہوتی تھی۔ البتہ رات کی ڈیوٹی پر جو اردلی رہتا تھا وہ بڑا ہنس مکھ تھا، مگر بے حد لاپرواہ۔ کبھی کبھی تو دیر تک گھنٹی کی آواز چیختی رہتی اور اس کا کہیں پتہ نہ چلتا۔

سرہانے کی طرف کھڑکی تھی جس سے ہوا کے نرم جھونکے اندر کمرے میں بکھر جاتے اور صبح کی نرم دھوپ ہر طرف سنہری روشنی پھیلا دیتی، مگر وہ پیچھے مڑ کر پہاڑیوں کی پشت سے ابھرتے ہوئے سُورج کو نہیں دیکھ سکتا۔ البتہ باہر کی دنیا کے متعلق وہ آہٹوں کے ذریعہ سب کچھ محسوس کرتا رہتا۔ ان میں فوجی بوٹوں کی آوازیں، ٹھیلہ گاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور بڑا گڑھ کے اسٹیشن پر آنے والی ٹرین کی کھٹ کھٹ اور ایسی ہی دوسری آوازیں شامل تھیں یہ آوازیں جو اس کی زندگی کا بہت بڑا حصہ بن چکی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب کبھی وہ ٹرین کی کھٹ کھٹ محسوس کرتا تو اس کو اچانک یاد آ جاتا کہ یہ ٹرین بھوپال سے سیہور جا رہی ہے۔ ایک ایسی ہی ٹرین کے ذریعہ وہ اس علاقہ میں آیا تھا اور اس احساس کے ساتھ ہی زخموں کی تکلیف میں ٹیسیں اُبھرنے لگتی۔ پھر وہ جلدی سے گھنٹی کا سوئچ دبا تا۔ ذرا دیر بعد ایک فربہ اندام عورت ٹک ٹک کرتی ہوئی اندر آ جاتی۔ اس کا لباس بے حد شفاف تھا۔ یہ ڈیوٹی نرس ہوتی اس کا نام مسز میریا تھا۔ دن کے وقت عام طور پر وہی ڈیوٹی پر رہتی تھی۔ وہ کمرے کے اندر آتے ہی بڑے کاروباری انداز سے پوچھتی۔

"ہیلو" پھر وہ بڑی مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہتی "سب ٹھیک ہے، زیادہ تکلیف تو نہیں؟"

وہ آہستہ سے گردن ہلا کر کندھے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتا۔ اس موقع پر وہ اس کو میز کی دراز سے دواؤں کی شیشیاں نکال کر ایک گلابی رنگ کی ٹکیہ کھلا دیتی۔ پھر اس کو سمجھانے لگتی۔

"دیکھو، چپ چاپ لیٹے رہا کرو۔ بدن کو حرکت مت دو، اس طرح درد بڑھ جاتا ہے"

اس بات پر وہ چڑھ جاتا اور اس کے کندھے اور سینہ پر لپٹی ہوئی سفید پٹیاں اوپر کو کھنچنے لگتیں۔ لیکن وہ اس سے اپنی تکلیف کا اظہار نہ کرتا بس خاموشی سے لیٹا اس کی طرف دیکھتا رہتا۔ یوں بھی وہ نرسوں سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ البتہ صبح جب بوڑھا کرنل مریضوں کا معائنہ کرنے آتا تو وہ کبھی کبھی اس سے زخموں کی تکلیف کے متعلق بات کر لیتا۔

رات کی ڈیوٹی مس مینڈس کی ہوتی تھی۔ چھریرے جسم کی یہ نرس ہمیشہ مسکراتی رہتی۔ اس کا سن پینتیس سال سے تجاوز کر چکا ہے لیکن اس کا قد لمبا نہیں ہے اس لئے اس کی عمر کا ٹھیک سے اندازہ نہیں ہوتا۔ وہ مارٹینو کے ساتھ بڑی نرمی کے ساتھ پیش آتی ہے۔ اس کے کام میں پوری مستعدی کا اظہار کرتی ہے۔ مارٹینو کو اس کی موجودگی سے بڑا آرام ملتا تھا اور جب وہ چلی جاتی تو تنہائی کا احساس شدید ہو جاتا۔

ایک روز جب مس مینڈس ٹمپریچر لینے کے بعد اس کی پیٹھ پر مالش کر رہی تھی تو مارٹینو نے آہستہ سے پوچھا۔

"نرس اب جنگ کا کیا حال ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔

مارٹینو نے پھر کہا "اچھا یہ بتاؤ کہ یہ جنگ کب ختم ہوگی؟"

مس مینڈس نے غور کیا کہ اس دفعہ اگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بچوں کی طرح مچل کر رونے لگے گا۔ لیکن ایسی باتوں پر وہ اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتی۔ اس لئے اس نے بڑے پیار سے اس کو ڈانٹ دیا۔

"ایسی باتیں نہیں پوچھتے، خاموش لیٹے رہو۔ بات کرنے سے تکلیف بڑھ جاتی ہے"

یہ بات مارٹینو کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس دفعہ وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی کے بجائے اطالوی لہجہ میں پوچھتا ہے "درکُوسا؟" نرس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے سامنے میز پر رکھی ہوئی ڈکشنری کو کھول کر پڑھا اور پھر رُک رُک کر اس کو سمجھانے لگی۔

"رات کو زیادہ نہ جاگا کرو، نہیں تو تم بہت جلد بوڑھے ہو جاؤ گے"

اتنا کہہ کر اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا، شاید وہ اپنے سر کے ان سفید بالوں کو دکھانا چاہتی تھی جن کو وہ بال گوندھتے وقت بڑی احتیاط سے چھپا دیتی تھی۔ مگر کچھ سوچ کر اس وقت وہ ایسی بات کہہ نہ سکی۔ مارٹینو کو اس کی یہ حرکت بہت بری معلوم ہوئی۔ اس لئے وہ رُوٹھ جانے کے انداز سے سامنے دیوار کی طرف دیکھنے لگا۔ نرس آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باہر چلی گئی۔

مارٹینو کے زخم اب مندمل ہوتے جا رہے تھے۔ مگر نقاہت بہت تھی۔ اس لئے وہ ہر وقت خاموش لیٹا رہتا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت افسردگی چھائی رہتی۔ مینڈس اس سے ہر طرح کی باتیں کرتی مگر وہ بیزاری سے لیٹا ہوا اس کو دیکھتا رہتا۔ ان دنوں رات میں اس کو نیند بھی کم آتی وہ بہت دبے قدموں کمرے کے اندر آتی مگر اس کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ اس کو روز تنبیہ کرتی کہ وہ رات کو جاگا نہ کرے مگر وہ اس کی بات پر ذرا بھی توجہ نہ دیتا۔ اس بات سے پینتیس سالہ نرس کو تکلیف ہوتی تھی۔ اکثر وہ جھنجھلا کر تیز لہجہ میں کہتی۔

"تم بہت خطرناک لڑکے ہو، تم خودکشی کرنا چاہتے ہو"

لیکن یہ سب کچھ کہنے کے بعد اس کو دکھ بھی ہوتا اور وہ بڑی بیچارگی کے ساتھ اس کے قریب بیٹھ کر اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگتی۔ اس روز رات گئے بھی کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ اس کے بستر پر بیٹھی ہوئی پیٹھ پر مالش کر رہی تھی کہ اسی اثناء میں سارجنٹ ڈیوڈ آ گیا۔ وہ رات کے گشت پر آیا تھا لیکن مینڈس کو وہاں موجود پا کر میز کے پاس کرسی پر بیٹھ کر رجسٹر دیکھنے لگا۔ پھر دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ نرس وہیں مارٹینو کے بستر پر سنبھل کر بیٹھ گئی اور ایک دفعہ جب اس نے کسی بات پر ہلکا سا قہقہہ لگا کر اپنے جسم کو حرکت دی تو اس کی ایک ٹانگ اوپر تک برہنہ ہو گئی۔ مارٹینو نے محسوس کیا کہ مینڈس کے جسم کے نچلے حصہ پر گوشت کی تہیں بہت دبیز ہیں۔ اس میں حرارت ہے، پھڑپھڑاہٹ ہے اور اس لمس کو وہ اپنے قریب محسوس کرنے لگا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد نرس اور سارجنٹ اٹھ کر باہر چلے گئے۔ باہر برآمدے میں ان کے قدموں کی آہٹ

تھوڑی دور تک اُبھرتی رہی اور پھر ایکبارگی خاموشی چھاگئی۔ مارٹینو نے سوچا کہ وہ کہیں دور نہیں گئی ہے۔ آفس میں ہوگی اس لئے وہ ابھی پھر آئے گی مگر وہ دیر تک واپس نہ لوٹی۔ وہ اس کا انتظار کرتا رہا، اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ آجائے۔ آخر جب وہ نہ آئی تو وہ داہنے بازو کا سہارا لے کر اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے باہر جھانک کر دیکھا، آفس میں روشنی ہو رہی تھی لیکن وہاں بالکل خاموشی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ کبھی کبھی کسی مریض کے کراہنے سے خاموشی کا طلسم درہم برہم ہو جاتا۔ دور اسپتال کے باہر پہرے دار سپاہیوں کے جوتوں کی آواز کبھی کبھی بہت قریب سُنائی پڑتی۔ وہ ان آوازوں کو چپ چاپ کھڑا سُنتا رہا۔ پھر ایکبارگی اس کی نظروں میں ہر طرف پھیلی ہوئی پرچھائیاں گھل مل کر تیزی سے گردش کرنے لگیں، اس کے قدم لڑکھڑائے اور وہ فرش پر دھڑام سے گر پڑا۔

بہت دیر کے بعد جب اس کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر اس پر جھکا ہوا، سانس کی آمد و رفت کا اندازہ لگا رہا تھا۔ اس نے بولنے کی کوشش کی تو اس نے منع کر دیا اور سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا۔

"ابھی تم بہت کمزور ہو۔ اس لئے چلنے کی کوشش نہ کیا کرو۔ جلدی ہی تمہارے لئے پہیوں والی گاڑی کا انتظام کر دیا جائے گا۔ اس میں بیٹھ کر تم آسانی سے گھوم پھر سکو گے۔ اور ہاں دیکھو رات کو جلدی سو جایا کرو"

ڈاکٹر آہستہ آہستہ کہتا رہا اور وہ آنکھیں بند کئے سوچتا رہا کہ واقعی وہ بہت کمزور ہو گیا ہے۔ ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کر کے اسپتال کے عملہ کو خواہ مخواہ پریشان نہیں کرنا چاہئے۔ جب ڈاکٹر نرس کو ضروری ہدایتیں دے کر چلا گیا تو اس نے پھر آنکھیں کھول دیں، سامنے میز کے اوپر لگے ہوئے آئینہ کے سامنے مس میڈس اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوار رہی تھی۔ ہاتھ کو بار بار بلند کرنے سے اس کے جسم کے بہت سے اعضا اس قدر نمایاں ہو جاتے تھے کہ اس پر نیم برہنہ ہونے کا گمان ہوتا۔ اسی طرح بالوں کو درست کرتے ہوئے ایکبار اس نے مارٹینو کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

"تم ابھی تک جاگ رہے ہو، اب سو جاؤ"

وہ بڑی نحیف آواز میں بولا "نیند نہیں آتی"

"کوشش کرو"

اس دفعہ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ لیٹا ہوا نرس کو دیکھتا رہا جو ابھی تک ہر ہر پہلو سے اپنے بال آراستہ کرنے میں محو تھی وہ سوچنے لگا کہ مس میڈس ایسی ہیجان پرور حرکتوں کو اس کے سامنے اس قدر بے باکی سے کرتے ہوئے مطلق نہیں جھجکتی۔ آخر وہ یہ سب کیوں کرتی ہے؛ اسی وقت وہ اس کے سرہانے آکر کھڑی ہو گئی۔ پھر تکیہ کے سہارے اس کو کروٹ کے بل لٹا کر پیٹھ پر آہستہ آہستہ مالش کرنے لگی۔

"آنکھیں بند کر لو، نیند آجائے گی"

مارٹینو کہنے لگا "نرس جب تم چلی جاتی ہو تو مجھ کو بڑی گھبراہٹ معلوم ہوتی ہے"

"تم کو معلوم ہے کہ اسپتال میں نرسیں کم ہیں اور مجھ کو تمام وارڈ کے مریضوں کو دیکھنا پڑتا ہے"

اس نے بڑی معصومیت سے کہا "تو پھر میں کیا کروں؟"

نرس شاید آہستہ آہستہ ہنس رہی تھی۔ اس کا جسم ہلتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ ذرا دیر بعد وہ کہنے لگی "دیکھو میں تمہارے پاس سب سے زیادہ وقت گذارتی ہوں۔ حالانکہ اس بات پہ بہت سے مریض مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ اگر انہوں نے کرنل ولیم سے شکایت کر دی تو یہ بہت بری بات ہو گی"

اس دفعہ مارٹینو نے آہستہ سے کچھ کہا جس کو نرس مطلق نہ سمجھ سکی۔ ذرا دیر بعد مارٹینو نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "نرس! تم اپنا ہاتھ ذرا ادھر تو لاؤ"

اس نے چپ چاپ اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر اس کے سامنے کر دیا۔ مارٹینو نے اس کے ہاتھ کو اپنی انگلیوں میں آہستہ سے دبایا اور پھر اپنا گرم تپتا ہوا گال اس کی ہتھیلی پر رگڑنے لگا۔ وہ بھی خاموش تھی۔ اچانک مارٹینو نے بڑے بے ڈھنگے پن سے کہا "مس مینڈس میں تم سے محبت کرتا ہوں"

نرس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور ایکبارگی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے مارٹینو کو دیکھا جو کروٹ کے بل چپ چاپ لیٹا تھا پھر اس زرد رو مریض سے اس کو ڈر معلوم ہونے لگا۔

مارٹینو نے پشیمانی کے سے انداز میں آہستہ سے کہا "تم ناراض ہو گئیں؛ میں نے بہت برا کیا۔ ایک قیدی کو ایسی بات نہیں کہنا چاہئے" نرس کا خوف جاتا رہا، وہ اس کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے بہت واضح لہجہ میں کہا "سچ، تم ابھی بالکل نوعمر ہو، ایسی باتیں نہیں کرتے میں تم سے بالکل ناراض نہیں ہوں"

مارٹینو کہنے لگا "میں جانتا ہوں کہ تم بھی مجھ سے پیار کرتی ہو" اور پھر وہ تکیہ میں سر چھپا کر رونے لگا۔

مینڈس نے جھک کر اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس کی پیشانی کو چوم کر بولی "ہاں میں تم سے پیار کرتی ہوں۔ تم میرے بچے ہو" اور پھر ممتا کے جذبے سے اس کی پلکوں میں بھی آنسو آ گئے۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں ڈال کر آہستہ آہستہ کہنے لگی "اچھا اب تم سو جاؤ" لیکن مارٹینو ایکبارگی چیخ کر بولا "ایسی بات مت کہو، تم جھوٹ بول رہی ہو"

اس کے ساتھ ہی وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے نرس کو بازوؤں میں دبوچ کر اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اس کی کمزور گرفت سے نکل کر دور چلی گئی۔ ذرا دیر کمرے کے اندر بالکل خاموشی چھائی رہی۔ دھندلی روشنی میں وہ پرچھائیوں کی طرح پراسرار نظر آ رہے تھے۔ پھر نرس نے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے کہا "اچھا اب تم سو جاؤ"

مارٹینو بڑی بے چارگی سے کہنے لگا "رک جاؤ مس مینڈس" اور پھر وہ لمبی لمبی سانسیں بھر کر ہانپنے لگا۔

وہ تیزی سے بولی "نہیں، اس وقت تم پر دیوانگی طاری ہے" اور وہ دروازے کی طرف چل دی۔

مارٹینو پلنگ پر سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھا "رک جاؤ مس مینڈس، رک جاؤ" لیکن وہ ٹک ٹک کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔ وہ تیزی سے اس طرف بڑھا مگر دروازے کے قریب رکھے ہوئے اسٹول سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ نرس نے اس شور کو سنا مگر وہ واپس نہ آئی، اس وقت وہ بے حد پریشان ہو رہی تھی اس لئے وہ دفتر بھی نہ گئی بلکہ اپنے کوارٹر پر چلی گئی۔

صبح سے تھوڑی دیر پہلے ایک آرڈرلی نے آ کر مس مینڈس کے دروازے پر دستک دی۔ وہ ابھی سوئی نہیں تھی۔ شاید وہ اسی بات کا انتظار کر رہی تھی۔ ابھی تک سفید یونیفارم اس کے جسم پر تھی۔ ڈاکٹر نے اس کو فوراً طلب کیا تھا۔ اس لئے وہ فوراً اسپتال روانہ ہو گئی۔ جنگی تبدیلیوں کے وارڈ کے قریب پہنچ کر اس کے قدم سست پڑ گئے۔ مارٹینو کے کمرے کے باہر ڈاکٹر خاموش کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے کوئی بات نہ کی۔ آفس میں آ کر صرف اتنا کہا۔

"قیدی مر گیا" ذرا دیر رک کر وہ کھڑا ہو گیا "کل صبح تم کو کرنل ولیم کے سامنے پیش کیا جائے گا" اور پھر وہ باہر چلا گیا۔ لیکن نرس ڈاکٹر سے ایک لفظ کہے بغیر مارٹینو کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اسپتال کے دو ملازم، مارٹینو کی لاش کو اٹھا کر اسٹریچر پر ڈال رہے تھے۔ وہ اس کو گہری نظروں سے دیکھتی رہی پھر اس نے چیخ کر کہا "اس کو کہاں سے مردہ گھر لئے جا رہے ہو، یہ تو بہت پہلے ہی مر چکا تھا" اور پھر دیوار کا سہارا لے کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ لیکن کسی نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہ دی، اور اسٹریچر کو سنبھال کر مردہ گھر کی طرف چل دئے۔ ان کے قدموں کی آواز پختہ فرش پر دیر تک ابھرتی رہی!

———

کچّی نبولی

انتظار حسین

جب چھٹی کا گھنٹہ بجا اور وہ کلاس کے اندھیرے کمرے سے تیزی سے نکلتے ہوئے لڑکوں کے ساتھ کتابیں بغل میں دبائے باہر آیا تو دُھلی دُھلی اُجلی فضا اور ٹھنڈی گیلی زمین کو دیکھ کر حیرت اور خوشی کی ملی جُلی کیفیت اس کے دل کو گدگدانے لگی۔ گھنٹہ شروع ہوتے وقت تک یہ سان و گمان بھی نہیں تھا کہ ایک ساتھ مینہ پڑنے لگے گا اور پھر ایک ساتھ رُک جائے گا۔ بوا جی کا کئی دن سے گرمی سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ اسے گنتی یاد نہیں تھی مگر یہ یاد تھا کہ دو سے زیادہ مرتبہ انہوں نے آسمان کو دیکھ دیکھ کر کہا تھا کہ "آسمان تانبا ہو گیا ہے کمبخت مینہ کی بوند نہیں پڑتی" اور رات کو اس کی جب بھی آنکھ کھلی، اور گرمی کی وجہ سے کئی مرتبہ اس کی آنکھ کھلی تھی، بوا جی کو اپنے برابر پنکھا ہلاتے دیکھا۔ وہ سو سو گیا لیکن تڑکے ہیں اس کی نیند پھر اُچٹ گئی۔ پنکھا ہلنا بند ہو گیا تھا اور وہ چارپائی پر اکیلا ایک بے کلی کے ساتھ لیٹا ہوا آدھا سو رہا تھا آدھا جاگ رہا تھا اور کانوں میں ایک ہلکی ہلکی کانپتی آواز پڑ رہی تھی — یا علی یا ایلیا.... ...... اور اسے یوں لگا کہ ٹھنڈے سفید پانی کی پتلی سی دھار ہولے ہولے چل رہی ہے...... یا علی یا ایلیا یا بوالحسن...... اس کی آنکھیں اسی طرح بند تھیں اور نیند کی بدلیاں بدستور شعور پر منڈلا رہی تھیں۔ پھر بھی اسے یہ دُھندلا دُھندلا سا احساس تھا کہ یہ آواز بوا جی کی ہے جنہوں نے سامنے جانماز پہ بھدے میلے پیلے کاغذوں کی ایک کتابیا کھول رکھی ہے اور اپنی عینک لگائے اس پر جھکی ہوئی ہیں۔

یا علی یا ایلیا یا......

وہ نہ معلوم کیا پڑھا کرتی ہیں مگر اسے پڑھتے ہوئے ان کی آواز ہی نہیں ان کے پورے جسم میں ایک ہلکی سی کپکپاہٹ ہوتی ہے۔ نہ جانے کیا پڑھتی ہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کی آواز ذرا تیز ہو جاتی ہے اور زیادہ لرزنے لگتی ہے اور الفاظ صاف سُنائی دیتے ہیں:۔

یا علی یا ایلیا یا بوالحسن یا بوتراب

وہ لوری جو اسے بڑے پیار سے جگا رہی تھی۔ اب اسی پیار سے تھپک تھپک کر سُلا رہی تھی۔ یا علی یا ایلیا یا بوالحسن یا بوتراب۔ حلِ مشکل...... نیند کا ٹوٹتا نشہ پھر چڑھنے لگا اور بوا جی کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی، مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ یا...... ع...... لی...... یا...... اے...... لیا...... یا...... مگر پھر اچانک کسی نے اس کا بدن ہلایا۔ اس نے کروٹ لے لی مگر بدن کو پھر کوئی ہلا رہا تھا۔ ایک نرم سا ہاتھ اس کے کاندھے کو ہلا رہا تھا "اِسّو اُٹھ اسکول کا وقت ہو رہا ہے" اسکول کا وقت۔ اس کی نیند میں شرابور آنکھیں اک ذرا کُھل چلی تھیں۔ ایک گول گورا گورا چہرہ اس پر جھکا ہوا تھا اور چوڑیوں سے بجتے ہوئے ہاتھ اس کے کاندھے کو ہلا رہے تھے "اِسّو اُٹھ! اسکول نہیں جائے گا آج؟" فضہ۔ غنودگی کی بدلیاں تتر بتر ہو گئیں اور آنکھوں میں ایک اُجالا پھیل گیا۔ وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ بوا جی نے اپنی پھٹی ہوئی کتابیا جزدان میں، جس میں پنجسورہ، حدیثِ کسا، خاکِ شفا کی تسبیح اور نہ جانے کیا کیا رکھا رہتا تھا، بند کر کے رکھ دی تھی اور دونوں ہاتھوں میں دوپٹے کا آنچل پھیلائے، آنکھیں بند کئے ہولے ہولے دُعا مانگ رہی تھیں اور سارے

آنگن میں، دیواروں پر، چھت پر اور چھت سے آسمان تک پیلا پیلا دھند چھایا ہوا تھا۔

اس نے جلدی جلدی ہاتھ منہ دھویا۔ کپڑے بدلے اور چولھے پہ فضہ کے پاس پیڑھے پر بیٹھ کر روغنی ٹکیاں کھائیں۔ جب وہ کتابیں سنبھال رہا تھا تو بُوا جی جانماز لپیٹ چکی تھیں اور چوکی سے اتر کر جُرابیں پہنتے ہوئے کہہ رہی تھیں "حبس ہو رہا ہے۔ آج ضرور مینہ ......" مگر وہ جلدی سے باہر نکل گیا تھا۔ اسکول کو دیر بھی تو ہو رہی تھی۔ وہ راستے ہی میں تھا کہ حاضری کا گھنٹہ بجنا شروع ہو گیا۔ حاضری کے وقت تک کلاس میں پہنچ جانے کے لئے اسے اتنی تیزی سے چلنا پڑا کہ جب وہ اپنی نشست پر جا کر بیٹھا تو اس کی کمر پر قمیص پسینے سے بالکل گیلی ہو چکی تھی۔

وقفہ میں جب وہ کلاس سے باہر نکلا تھا تو بارش کے کوئی آثار نہیں تھے لیکن آخری گھنٹے میں اچانک بادل کے گرجنے کی آواز آئی، پھر اکا دکا بڑی بڑی بوندوں کے ٹپ ٹپ گرنے کی آواز، جنہوں نے دیکھتے دیکھتے ایک بڑے شور کی شکل اختیار کر لی۔ ایک ڈیڑھ منٹ کے لئے وہ، کلاس کے سارے لڑکے اور خود ماسٹر صاحب دروازے سے باہر ایسے دیکھنے لگے جیسے باہر کوئی بڑا واقعہ ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے بعد ماسٹر صاحب نے پھر پڑھانا شروع کر دیا اور لڑکے پھر ماسٹر صاحب کی طرف دیکھنے لگے اور تھوڑی دیر میں وہ تو بالکل ہی بھول گیا کہ باہر مینہ پڑ رہا ہے۔ کلاس سے نکل کر جب اس نے بہت سے لڑکوں کو چھپ چھپ پانی میں چلتے دیکھا اور سامنے گیلی کیاریوں میں بیلے چنبیلی کے ہرے ہرے دُھلے ہوئے پتوں پر موتی جیسے سفید قطرے ٹھہرے ہوئے نظر آئے تو اسے ایسا لگا کہ رات کو اس کے سوتے میں مینہ پڑا تھا اور اب صبح ہونے پر اس نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ اسکول کے مالی نے ایک بڑی سی قینچی ہاتھ میں لے رکھی تھی اور دُھلی ہوئی پھلواری کی لمبی لمبی ڈالیوں کو کھٹ کھٹ قلم کرتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے بدن میں ٹھنڈک کی ایک ہلکی سی لہر اترتی چلی گئی اور آنکھوں میں اُجالا سا ہو گیا۔ اسے یوں نظر آ رہا تھا کہ اسکول کی ہر چیز نے، درختوں اور پودوں نے، سُرخ تانبا سی دیواروں نے، پرانی سیاہی مائل لکڑی کے گیٹ نے، فیلڈ نے اور فیلڈ میں دور دور کھڑے ہوئے گول کے ڈنڈوں نے اشنان کر لیا ہے اُجلے سُرخ پھولوں سے لدے پھندے گل بانس کے درختوں کے پاس سے گذرتے وقت اس کا جی چاہا کہ ان کے چوڑے چوڑے پتوں کے کناروں پر جو موتی سے ٹنکے ہوئے ہیں انہیں چھو کے دیکھے مگر اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کیاری کے دوسرے کنارے پر کھڑا ہوا مالی چلاّ پڑا اور وہ آگے بڑھ گیا۔ اسکول کے گیٹ سے نکل کر جس وقت وہ اس نیم کے نیچے سے نکلنے لگا جہاں وقفہ میں چاٹ والے کے گرد لڑکے جمع ہوا کرتے ہیں تو اس کے سر اور پیٹھ پر ٹپ ٹپ بوندیں گرنے لگیں۔ مینہ دیر ہوئی بند ہو چکا تھا مگر نیم کی پانی سے شرابور ٹہنیوں سے بوندیں آہستہ آہستہ ٹپکے جا رہی تھیں اور زمین میں جگہ جگہ ریٹھے کی گولی کے برابر چھید بن گئے تھے۔ جن میں لبالب پانی بھرا ہوا تھا۔ ہری اور پیلی اَن گنت نمبولیاں نیچے بکھری پڑی تھیں اور ان کی کڑوی کڑوی لیساند سے اس کی طبیعت متلانے لگی۔ وہ جلدی سے پیڑ کے نیچے سے گذر جانا چاہتا تھا لیکن اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کیچڑ میں کہیں اس کا پیر نہ رپٹ جائے اور اگر اس نے کوشش سے اپنے آپ کو سنبھال نہ لیا ہوتا تو ایک دفعہ تو وہ واقعی گر چلا تھا۔ لشٹم پشٹم وہ وہاں سے نکل کر پکی سڑک پر آ گیا جو جگہ جگہ سے اُدھڑ گئی تھی اور صاف ستھرا ہوا پانی بہتا ہوا نالی میں گر رہا تھا اس نے پہلے مٹی میں سنے ہوئے چپل پانی میں دھوئے پھر چپل ہاتھ میں اٹھا کر اور پاجامہ گھٹنوں تک چڑھا کر بیچ پانی میں چلنے لگا۔ اس کے تلووں اور پیروں کی انگلیوں میں اور ان سے اُوپر ٹخنوں تک ایک آسودگی بخش ٹھنڈک محسوس ہونے لگی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اسی طرح پانی میں چلتا رہے مگر تھوڑی دور چل کر صاف سڑک آ گئی۔ دُھلے ہوئے سفید سفید کنکروں والی سڑک۔ وہ اس اُجلی دُھلی سڑک پر کئی قدم پیدل چلا۔ پھر جب اسے ایک جگہ تنکوں ملی مٹی بہتی نظر آئی تو اس نے چپل پہن لئے۔

جب وہ بازار سے گذر رہا تھا تو اسے بہت سی چیزوں کا رنگ نکھرا ہوا نظر آیا۔ بعض چیزوں کا رنگ اترا ہوا بھی دکھائی دیا۔ پیلے پیلے خربوزے

کا رنگ تو بالکل ہی پھیکا سا پڑ گیا تھا اور وہ بھیڑ جو صبح خربوزوں پر تھی اب آموں کے ٹوکروں کے سامنے نظر آرہی تھی۔ ایک کنجڑے کی دکان کے بالکل سامنے ایک اچھا خاصا بڑا تربوز پھٹا پڑا تھا اور اس کے بدرنگ سفید بیج اور گلابی گودا زمین پر بہہ رہا تھا۔ پرچونیوں کی دکانوں پر جہاں جہاں تھالوں میں گڑ رکھا تھا وہاں وہاں مکھیاں بھی بھنک رہی تھیں اور ہر پرچونیا کچھ اونگھتا سا نظر آرہا تھا۔

رگھو پرچونئے کی دکان کے سامنے سے گذرتے ہوئے اِلتو ٹھٹک گیا۔

مارا جھونٹا جب سکھیوں نے جھونٹا لگا سرگ میں جائے

پروا ہوا چلے ساون کی ساری بنا سپتی لہرائے

جھونکا لگ گیا جب پروا کا چونری مچھلا کی اُڑ جائے

گھونگھٹ اوکھڑ گیا رانی کا چہرہ دمک دمک رہ جائے

موتی نے آلھا کھول رکھی تھی اور اتنی بلند آواز سے پڑھ رہا تھا کہ جس وقت وہ گلی میں مڑ رہا تھا اسی وقت اسے پتہ چل گیا تھا کہ آلھا پڑھی جا رہی ہے۔ بھگت جی ہاتھ میں ایک چھوٹا سا گنڈا روحقہ تھامے آنکھیں بند کئے آہستہ آہستہ حقے کے گھونٹ لے رہے تھے۔ کچھ لوگ ان کے برابر دکان کے تختے پر اور کچھ لوگ نیچے ایک جھلنگے پر بیٹھے تھے اور موتی سرکنڈوں کے مونڈھے پر بیٹھا تھا جس کی آدھی پشت ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو چکی تھی زور زور سے جیسے مینہ پڑ رہا ہو یا جھولا جھونٹے لے رہا ہو، پڑھے جا رہا تھا

ایک تو بیٹی ہے راجے کی دوسرے روپ دیا کرتار

تیسرے چوندا ہے جوبن کا چوتھے سولہ کئے سنگار

جیسی دلہن ہے آلھا کی ایسی کسی دیش میں نائے

اسی مچھلاے کے چہرے کا چوندا لگا تمہارے آئے

——اتنی بات سُنی راجہ نے ....

لیکن بادل اس زور سے گرجا کہ مچھلا رانی کا قصہ بھول بھال کر وہ اوپر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ دھواں دھواں سے کالے بادلوں کے دَل کے دَل ریل پیل کرتے جلدی جلدی چل رہے تھے۔ وہ ڈر سا گیا۔ جب اس کی نظر گھٹا سے ہٹ کر نیچے آئی تو بھگت جی کی دکان پر دکان کے سامنے سڑک پر اندھیرا سا پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ بس اب مینہ پڑنا شروع ہوا اور اس کے قدم بے ساختہ گھر کی طرف اُٹھنے لگے چند قدم چلا ہو گا کہ مینہ کا خیال تو زائل ہو گیا اور مچھلا رانی کی اَدھ سُنی کہانی اسے یاد آنے لگی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ مینہ کی تو ایک بوند بھی نہیں پڑی ہے، آخر وہ کیوں کھڑا نہ رہا اور پوری کہانی نہ سُن لی۔ مچھلا رانی کی کہانی وہ بھگت جی ہی کی دکان پر ایک دفعہ پہلے بھی سن چکا تھا مگر اسی لئے تو وہ اسے پھر سُننا چاہتا تھا۔ تھی بھی تو وہ بہت مزے دار کہانی۔ کوئی شعر، کوئی مصرعہ اسے یاد نہیں رہا تھا لیکن کئی نام اس کے ذہن میں گونج رہے تھے —— آلا، اودل، اندل، مچھلا، سب ناموں کی کچھ ایک ہی سی آواز تھی۔ آلا، اودل، اندل —— بالکل بے دھیانی میں اس کا ذہن بوا جی کی طرف منتقل ہو گیا۔ بوا جی کی کانپتی ہوئی آواز موتی کی آواز میں گھل مل رہی تھی اور نام رلنے ملنے لگے۔ ایلا مولا اودل اندل۔ آلا مولا علی اندل ...... یا الا یا ایلیا .... مولا مچھلا ایلا اودل ....

اور جب وہ گھر میں داخل ہو رہا تھا تو مصرعہ قسم کی ایک ٹیڑھی میڑھی چیز اس کے ذہن میں مرتب ہو چکی تھی اور وہ موتی کے لہجہ میں گنگنا رہا تھا۔

الا مولا علی ایلیا اور ول اور مچلیا نار!

الا مولا . . . .

وہ گاتے گاتے یکایک رک گیا۔ اس کی آواز پر ایک اور آواز چھاتی جا رہی تھی۔

نیم کی نبولی پکی ساون کب . . . .

اس نے اچھی طرح سننے کی کوشش ہی نہیں کی بستہ دالان کے طاق میں رکھ کر تیزی سے اوپر کی طرف چلا۔ بڑ جی چلاتی ہی رہ گئیں "اے روٹی تو کھائے پہلے" مگر وہ کہاں سنتا تھا۔ تیزی سے سیڑھیاں طے کر کے تیر کی طرح چھت کے کھلے دالان میں پہنچا جہاں ایک بجلی سی کوندر ہی تھی فضہ جھولے میں بیٹھی تھی اور شاکرہ اور بندو جھولے کو جھوٹنے دے رہی تھیں۔ ہر تیز جھوٹنے کے ساتھ اسے یوں لگتا کہ بجلی چمکتی ہوئی اٹھتی ہے اور کڑیوں کو چھو رہی ہے۔ اسے ڈر لگنے لگا کہ کہیں فضہ کا سر کڑیوں سے نہ ٹکرا جائے۔ لیکن کڑیوں کے قریب پہنچتے ہی فضہ اپنا سر نیچے کی طرف ڈال دیتی ——— ٹانگوں کا رخ کڑیوں کی طرف ہو جاتا اور منہ سے خوشی اور ڈر سے ملی ہوئی ایک ہلکی سی چیخ نکل جاتی۔

جھولا رکا۔ فضہ کے ساتھ شاکرہ بھی جم کر پٹرے پر بیٹھ گئی۔ بندو نے زور کا ایک جھٹکا دیا اور اس کے ساتھ ان کی ملی جلی آواز بلند ہوئی:

نیم کی نبولی پکی ساون کب کو آوے گا

نیم کی نبولی پکی ساون . . . .

مگر وہ کڑیوں کے بیچ میں گردش کرتے اور چٹ چٹ کرتے بیلن کو دیکھ دیکھ کے ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ گر نہ پڑے اور فضہ اور شاکرہ دونوں . . . . .

نیم کی نبولی پکی ساون کب کو آوے گا

جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلاوے گا

لمبے لمبے جھوٹنے۔ جھولا جب نیچے آتا تو بندو پھر اسے جھٹکا دے دیتی اور فضہ اور شاکرہ پھر فضا میں تیرنے لگتیں۔ گلے میں باہیں زیادہ شدت سے پیوستہ ہو جاتیں۔ کالی لٹیں اڑ کر چہروں پہ آ پڑتیں اور . . .

جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلاوے گا

فضہ کی ساری باتوں میں، آوازمیں، گلے میں پڑی ہوئی باہوں میں، رسی کو پکڑی ہوئی مٹھی میں، کپڑوں کی سرسراہٹ میں کتنی تیزی آگئی تھی اور وہ سویا سویا گورا چہرہ جو روز منہ اندھیرے اس پہ جھک جایا کرتا تھا اور کبھی کبھی جس کی کوئی لٹ اس کے ماتھے کو چھو لیا کرتی تھی اس وقت وہ اچانک کیسا دمک اٹھا تھا اور فضا میں کھلے ہوئے بڑے سے پھول کی طرح لہرا رہا تھا۔ وہ اس حرکت میں، روشنی اور ٹھنڈک اور گیت گاتی ہوئی رسیلی آوازوں کے اس بھنور میں گم ہوتا جا رہا تھا۔

جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلاوے گا

نیم کی نبولی پکی ساون کب کو آوے گا

نیم کی نبولی پکی . . . .

جھولا رکا تو اسے یوں لگا کہ وہ خواب دیکھتے دیکھتے یکایک جاگ اٹھا ہے۔ اس نے بے ساختہ پھر مطالبہ کیا "فضہ ہم بھی جھولیں گے!"

فضہ نے اسے ایسی غصے کی آنکھ سے دیکھا کہ اس کا دل ڈوبنے لگا "نام لے گا میرا؟"

اس نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا، بس چپکا کھڑا رہا اور فضہ کو تکتا رہا۔ اسے اپنے کئے پہ ندامت سی ہو رہی تھی۔ فضہ نے آکر اس کا کان پکڑ لیا "اب پھر نام لے گا؟ توبہ کر!"

"نہیں کرتا توبہ" اس نے جھنجھلا کر کہا

"نہیں کرے گا توبہ؟"

"نہیں"

اس نے کان چھوڑ دیا اور طمانچے کے لئے اٹھا ہوا دوسرا ہاتھ نیچے آرہا "نہیں؟ اچھا مت کر۔ دیکھوں گی جھولے میں کیسے بیٹھتا ہے تو"

وہ جھولے میں پھر جا بیٹھی۔ اس مرتبہ بندو اور فضہ جھولے میں بیٹھیں اور شاکرہ نے انہیں جھلانا شروع کیا۔

وہ تھوڑی دیر گم سم کھڑا رہا۔ ایک گرم غبار سا اس کے ذہن میں منڈلا رہا تھا۔ وہ کھڑا کھڑا جھونٹے کھاتے ہوئے جھولے کو دیکھتا رہا، پھر وہاں سے نکل کر دالان کی طرف چل پڑا۔ بوا جی اچار کے لئے امبیاں چھیل رہی تھیں۔ وہ ٹھنکنے لگا "بوا جی! بھوک لگ رہی ہے"

"بھوک لگ رہی ہے تو روٹی کھالے"

بوا جی نے اسے باورچی خانے میں جاکر کھانا دیا۔ اس نے کئی نوالے کھائے مگر اس کے منہ میں روٹی چلی نہیں۔ وہ اُلٹے سیدھے دو تین نوالے نگل، پانی کا گلاس چڑھا، پھر بوا جی کے پاس گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اس نے امبیوں پر دست درازی کی کوشش کی تھی لیکن بوا جی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "نا بیٹا رہنے دے۔ اتنی مشکل سے تو امبیاں ملی ہیں۔ کچی کھانے کے لئے نہیں ہیں اچار کے لئے ہیں"

امبیاں کاٹتے کاٹتے بوا جی چونکیں "اے ہے بالکل کچی امبیا ہے گٹھلی بھی نہیں پڑی ہے"

"بوا جی! بجلی، بجلی میں لوں گا"

بوا جی نے امبیا سے بجلی نکال کر اسے دے دی چکنی چکنی سفید چمکتی ہوئی بجلی۔ اس کی نڈھال طبیعت پھر بحال ہونے لگی "بجلی بجلی میرا بیاہ کدھر؟" اس نے چٹکی سے بجلی کو دبایا اور وہ اُچٹ کر دور جا پڑی۔ اس نے بڑھ کر بجلی کو اٹھا لیا اور کرتے کے دامن سے صاف کیا۔ بوا جی کے پاس بیٹھے بیٹھے اس کا جی اُکتا گیا تھا۔ اب وہ پھر زینے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

جب وہ اوپر پہنچا تو خالی جھولا ہل رہا تھا اور فضہ، بندو اور شاکرہ کھڑی ہوئی جوش میں زور زور سے باتیں کر رہی تھیں اور کھلکھلا رہی تھیں۔ فضہ کے قریب پہنچ کر اس نے بجلی کو پھر چٹکی میں رکھا اور دباتے ہوئے بولا "بجلی بجلی میرا بیاہ کدھر؟" بجلی اُچٹ کر فضہ کی ٹھوڑی سے ٹکرائی "ہا" اسو کھلکھلا پڑا۔ بندو اور شاکرہ بھی ہنس دیں۔ فضہ کا منہ غصہ سے لال ہوگیا "بد تمیز" اور تڑاخ سے ایک چانٹا اس کے گال پہ پڑا۔ اسو آواز سے رونے لگا مگر ایک ساتھ وہ چپ ہوگیا اور فضہ کی طرف رخ کر کے بولا "فضہ کی بچی دال کھلائے کچی"

"ٹھہر تو سہی" فضہ چلائی، مگر اسو باہر نکل چکا تھا۔

"بوا جی ہمیں فضہ نے مارا" اسو ٹھنک ٹھنک کر کہہ رہا تھا

"ہیں، بڑی بہن کا نام لیوے ہے" بوا جی سمجھاتے ہوئے بولیں۔

"نہیں میری بڑی بہن نہیں ہے" وہ جھلا کر بولا۔

"اچھا پٹ گیا تو تو جھوٹے گی کہ تم میری کچھ لگتے نہیں ہو"

بوا جی کی بات نے اس کا منہ بند کر دیا مگر اندر ہی اندر اسے بوا جی پہ سخت "تاؤ" آ رہا تھا۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ بوا جی اگر پھوپھو ہیں تو فضہ بڑی بہن ہوئی۔ اور فضہ کو بڑی بہن نہ مانو تو بوا جی پھوپھو نہیں رہیں گی۔ بوا جی فضہ کی اتنی طرفداری کیوں کرتی ہیں۔ وہ اندر ہی اندر تپتا رہا اور پھر اچانک بڑبڑا اٹھا "اللہ کرے فضہ مر جاوے"

"ہیں!" بوا جی نے ڈانٹا "بہن کو کوستا ہے۔ آنے دے اپنے باپ کو، کیسا پٹواؤں ہوں تجھے"

"ہاں پٹوا دیجو" اسے اور تاؤ آیا "کیوں مارا تھا ہاں ہم تو ایسے ہی کہیں گے۔ اللہ کرے فضہ مر جاوے، ہیضے کی گلی آوے"

"باپ سے تو بعد میں کہوں گی، پہلے تو میں تیری چنکلی کروں گی" بوا جی اٹھنے لگی تھیں مگر اسّو بھاگ کر باہر نکل گیا۔

دروازے کے دونوں طرف چوڑی دہلیز پر دو اونچی چوکیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک چوکی کو اپنے کرتے کے دامن سے صاف کیا اور جب اس کی سُرخ پتھر کی سطح چمکنے لگی تو وہ پہلے چوکھٹ پہ کھڑا ہوا اور پھر وہاں سے اُچک کر چوکی پہ بیٹھ گیا۔ ٹپ........ٹپ........ٹپ....... جیسے بوا جی مکئی کے دانے بھون رہی ہوں اور ٹھیکری میں کوئی دانہ چاخ سے کھلے اور سفید تاشہ سی کھیل اُچٹ کر باہر آ پڑے۔ ٹپ.....ٹپ.....ٹپ.....ٹپ۔ بوندیں بہت آہستہ آہستہ گرنی شروع ہوئی تھیں مگر اب ان کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے چوکی پہ بیٹھے بیٹھے اپنا ہاتھ باہر پھیلا دیا۔ اِدھر اُدھر بہت سی بوندیں گر رہی تھیں مکئی کی اُچٹتی سفید کھیلوں کی طرح۔ مگر اس کی ہتھیلی اب تک خشک تھی۔ اس نے ہاتھ اور آگے بڑھا دیا۔ ایک بڑی سی بوند ٹپ سے اس کی ہتھیلی پر پڑی اور اس کی ساری ہتھیلی بھیگ گئی۔ ٹپ ٹپ کی آواز اچانک بد بد کی سی آواز بن گئی اور سامنے والے مکان کے چوبارے کے ٹین پر ایسا شور ہو رہا تھا جیسے دُلدل نکل رہا ہو اور ماتم کے ساتھ ساتھ دھڑ دھڑ تاشہ بج رہا ہو۔ یا موتی گلے کے پورے زور سے آلھا پڑھ رہا ہو۔ سڑک پر پانی ہی پانی تھا اور تیزی سے گرتی ہوئی بوندیں ایسی لگ رہی تھیں جیسے کڑھائی کے کڑکڑاتے ہوئے تیل میں فضہ پھلکیاں توڑ رہی ہے۔ پھر بوندیں صاحب کا ٹپ بنتیں۔ صاحب کے بہت سے ٹپ بنتے اور تیرتے چلے جاتے اور اچانک پٹ سے ٹوٹ جاتے۔ پھر اچانک اس کی چوکی کے بالکل برابر پانی کا تریڑا دھاڑ دھاڑ گرنے لگا۔ اس نے باہر جھانکتے ہوئے ادھر کی طرف دیکھا۔ چھت کی دیوار سے باہر نکلا ہوا وہ ٹین کا پرنالہ جو جانے کب سے بالکل خشک پڑا تھا اور زنگ کی وجہ سے کچھ بھورا اور کچھ کالا ہو گیا تھا اس وقت ایک ساتھ بہہ نکلا تھا اور پانی کی سفید چمکتی ہوئی دھار تیزی سے چلتی ہوئی نیچے اینٹوں کے کھرنجے پر گر کر مینہ کے شور سے الگ اپنی آواز پیدا کر رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دھار کے بیچ میں اپنی ہتھیلی کر دی اور پانی نے صرف اس کی ہتھیلی اور اس کی آستین ہی کو نہیں بھگویا بلکہ چھینٹوں سے اس کا منہ بھی بھیگ گیا۔ اس نے ہاتھ اندر کر لیا اور اپنے کرتے کے دامن سے جو چوکی صاف کرنے میں میلا ہو چکا تھا سارا ہاتھ اور پھر منہ پونچھا۔ مینہ خوب زور شور سے برس رہا تھا اور چوبارے کے ٹین پر تاشوں کے شور کے ساتھ ساتھ بھیگا بھیگا دھواں سا بھی اڑ رہا تھا۔ مینہ کا شور جیسے موتی زور زور سے آلھا کی لڑائی کا حال پڑھ رہا ہو یا مچھلا رانی اودل پہ برس رہی ہو۔

ندی نربدا کا جل گرجے اور.......

پورا مصرعہ اس کے ذہن میں گونج رہا تھا مگر الفاظ یاد نہیں آتے تھے۔ ندی نربدا کا جل گرجے اور گنگا....... ندی نربدا کا جل گرجے اور گرجے دھار....... مصرعہ اسے یاد نہ آنا تھا نہ آیا۔ مچھلا جل گئی........ اگل پڑی تلوار........ ندی نربدا کا جل گرجے اور گنگا......

اسے شعر یاد نہیں آ رہا تھا۔ چند الفاظ ذہن میں گونج رہے تھے اور وہ فضا، مچھلا رانی کا غصہ۔ مینہ کا زور ٹوٹ چلا تھا۔ بوندوں کا شور دھیما ہوتا جا رہا تھا۔ اور نالے کا شور اونچا ہو گیا تھا۔ نیم کی نبولی پکی........ نیم کی........ پکی........ گیت کی دور سے آتی ہوئی مدھم آواز سنائی دیتی تھی اور سنائی دیتے دیتے ٹوٹ جاتی تھی۔ فضہ کی آواز۔ فضہ، جھولا، نیم کی نبولی والا گیت ـــــ اس کی طبیعت مچلنے لگی۔ چوکی سے وہ نیچے اتر پڑا اور اس کے

قدم اندر کی طرف اُٹھ گئے۔

جب وہ زینہ چڑھ کر چھت پہ پہنچا تو مینہ ختم ہو چکا تھا، بس بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں بوندیں ہولے ہولے گر کر فضہ کی چوڑیاں سی بنتیں اور پھیلتی چلی جاتیں اور پھر گم ہو جاتیں۔ نتھرے ہوئے پانی کی ایک سفید چمکتی ہوئی جھلّی جیسی دھار اوپر کے کوٹھے کی نالی سے پھسل پھسل کر ہلکے شور کے ساتھ نہائی دھوئی سُرخ اینٹوں پہ گرتی ہوئی ایک پھیلتی ہوئی دھار بنتی اور سامنے والی نالی کے سوراخ میں گم ہوتی چلی جاتی۔ اس نے چپل اتار کر ہاتھ میں لے لئے اور نالی کے سوراخ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا سفید پانی، ہولے ہولے شور کرتی ہوئی دھیرے دھیرے بہتی ہوئی پتلی دھار جیسے ابھی صبح ہوئی ہو اور بوا جی جانماز پہ بیٹھی منقبت پڑھ رہی ہوں۔ یا علی یا ایلیا یا....... چکنی سفید دیوار پہ پھیلتا ہوا جھلّی جیسا پانی دھیمے شور کے ساتھ نہائی دھوئی سُرخ اینٹوں پہ گرتا ہوا شفاف پانی میٹھا میٹھا شور کرتا جیسے کٹوریاں بج رہی ہوں یا بُوا جی یا علی یا ایلیا کا ورد کر رہی ہوں اور پھر اس کے پیروں کے قریب، بہت سا پانی جمع ہو کر غڑاپ کی سی آواز پیدا کرتا...... یا بوتراب ــــ چکنی سفید دیوار سے پھسلتی ہوئی دُھلی ہوئی اینٹوں پہ گر کر گذرتی ہوئی پتلی دھار جو اس کے پاؤں کے بیچ میں آ کر غڑ غڑ کی آواز پیدا کرتی۔ یا علی یا ایلیا یا ابوالحسن یا بوتراب۔ یا علی یا ایلیا یا ابوالحسن... یا بوتراب۔ اسے اچانک اپنا مصرعہ یاد آ گیا

آلا مولا علی ایلیا او ول اور مچھلیا نار

اس نے دل ہی دل میں اپنا مصرعہ دُہرایا۔ الا مولا علی ایلیا او ول اور مچھلیا....... جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلاوے گا۔ جیوے میری...... شاکرہ اور بندو کی آوازوں کے ساتھ مل کر فضہ کی آواز کتنی تیز اور سریلی ہو گئی تھی۔ نالی کے سامنے سے ہٹ کر۔ اس نے جلدی جلدی چپل پہنے اور جھُولے کی طرف جانے لگا۔ وہ بھی اب ترنگ میں آ گیا تھا۔ فضہ کی چوٹ پہ اس نے بھی ایک مصرعہ بنا لیا تھا۔ چھت کی کڑیوں تک بلند ہوتے اور زمین تک نیچے آتے جھُولے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے بیرا کی طرح زور زور سے گانا شروع کر دیا۔

آلا مولا علی ایلیا او ول اور مچھلیا نار

آلا مولا ....

جھُولا اچانک رُک گیا۔ فضہ جھُولے میں سے اُتر کر جھپاک سے آئی اور اس کے گال پہ چٹاخ سے ایک آواز ہوئی۔ وہ ہکّا بکّا رہ گیا۔ یہ کیا ہوا، تڑاخ سے ایک چانٹا، کیوں، خواہ مخواہ۔ وہ رونے کی بجائے حیرت سے فضہ کو تک رہا تھا۔ فضہ سر سے پیر تک کانپ گئی تھی اور منہ سُرخ ہو گیا تھا۔ بندو اور شاکرہ بھی سہمی سی کھڑی تھیں۔ بندو کہہ رہی تھی "اسو تو تو بالکل ڈوب گیا۔ ایسی بے ادبی کی باتیں کاں سے سیکھ کے آوے ہے؟" فضہ غصے میں کہنے لگی "عذاب پڑے گا کم بخت پہ مولا کا۔ دوزخ کی بھوبھل میں جلے گا"

مولا کا عذاب، دوزخ کی بھوبھل، وہ سہم گیا۔ اس کا جی چاہا کہ خوب بلک بلک کر رو دے اور مولا سے اپنے گناہ کی معافی مانگے لیکن بندو شاکرہ اور پھر فضہ اسے تکے کھڑے ہیں۔ اس نے امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کر لیا۔ ہاں دل ہی دل میں وہ رو رو کے توبہ کئے جا رہا تھا جھُولے کے پاس سے ہٹ کر وہ دالان کے دروازے پہ آ کھڑا ہوا تھا۔ چھت کی نالی سے گرتے ہوئے پانی کی دھار اب کچھ اور دھیمی اور کچھ اور زیادہ پتلی ہو گئی تھی۔ پیچھے سے فضہ، بندو اور شاکرہ کی باتوں کی آوازیں آئے چلی جا رہی تھیں۔ جھُولے کی رسی بیلن سے اتر کر کنڈے میں پھنس گئی تھی اور تینوں اسے پھر سے بیلن پہ لانے میں جُتی ہوئی تھیں۔

"اسے بھئی کوئی لمبی سی لکڑی ہو، اس سے یہ ٹھیک ہو گی" بندو کہہ رہی تھی۔

فضہ نے فوراً جواب دیا "اری ہاں وہ بانس رکھا ہے باہر، وہ اٹھا لا"

بندو لپک جھپک تیزی سے اس کے پاس سے نکل گئی۔ منڈیر کے ساتھ لگا کر رکھا ہوا بانس اٹھایا اور اک ذرا جھانک کے نیچے آنگن میں دیکھا مگر فوراً ہی پیچھے ہٹ گئی اور لپک کر اس کے بالکل برابر سے نکلتی ہوئی دالان میں چلی گئی "اری فضہ، او فضہ" اس نے اتنی دبی دبی اور بھید بھری آواز میں یہ الفاظ کہے کہ فضہ اور شاکرہ تو الگ رہیں وہ خود باوجود اس قدر خفگی کے مڑ کے دیکھنے پہ مجبور ہو گیا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ اس کی سمجھ میں تو کچھ نہ آیا مگر ان میں ایک کھلبلی سی پڑ گئی تھی اور کانوں میں کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ فضہ کا چہرہ لال ہوا جا رہا تھا مگر یہ اس طرح کی لالی نہیں تھی جو اسے تھپڑ مارتے اور ڈانٹتے وقت اس کے چہرے پہ آجایا کرتی تھی۔ اس میں نوڑی زمی اور گھلاوٹ سی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ دہلیز سے اٹھ کر ان کے بیچ میں جا کھڑا ہو اور کان لگا کے ساری بات سن لے مگر اسے پھر فضہ کا خیال آگیا اور اس نے تنک کر ادھر سے گردن موڑ کر پھر باہر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ لیکن اتنے میں اچانک کسی نے پیچھے سے آکر اسے دبوچ لیا "اِستو ذرا نیچے دیکھ کے آ، کون بیٹھا ہے؟"

فضہ کا لہجہ اب بالکل بدل گیا تھا لیکن اس نے تنک کر منہ پھیر لیا۔

فضہ نے خوشامد شروع کر دی "میرا بھیا کیسا۔ دیکھ تجھے جھولا جھلاؤں گی بس ذرا جھانک کے دیکھ کہ کون ہے"

"اب دکھوانے سے کیا ہوتا ہے" بندو ہنسنے لگی "اس نے تیرا گیت خوب سنا ہے"

"چل مٹی، آئی بڑی مذاقیائی" فضہ نے اسے ڈانٹا۔

بندو اور بندو کے ساتھ شاکرہ جواب میں ہنس پڑیں۔

اس نے فضہ کی بات نہ ماننے کا تہیہ کر لیا تھا لیکن جب اس نے اپنی گردن میں اس کی باہوں کی زمی محسوس کی تو اس کا دل آہستہ آہستہ دھڑکنے لگا اور اس کا پکا ارادہ کچا پڑنے لگا۔ پھر بھی اس نے فضہ کی خوشامدوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور اسی طرح گم سم بت بنا کھڑا رہا۔ مگر فضہ تو اسے منانے پر تُلی ہوئی تھی۔ اس نے چٹاخ سے اس کا گال چوم لیا "اب تو چلا جا.......جا.......نئیں تو پھر نئیں بولوں گی تجھ سے"

اس کے قدم بے آواز اُٹھ گئے۔

جب وہ زینے سے نیچے اُترا اور دالان میں جھانک کر دیکھا تو بُوا جی نے املیوں کا تسلا ایک طرف کر کے پٹاری سامنے رکھ لی تھی اور بڑے پیار کے ساتھ پان لگا رہی تھیں۔ سامنے کرسی پہ ایک نوجوان سا آدمی چپ بیٹھا تھا۔ یہ جوان سا آدمی کون تھا، یہ تو وہ نہیں جانتا تھا بس بے جانے ہی اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔ جب چاہے جب آنکلتا اور بُوا جی اسے اسی پیار سے پان لگا کر دیتیں اور فضہ اس کی آہٹ سنتے ہی لپک جھپک کہیں اندر گھس جاتی یا ادھر چلی جاتی اور اس کے گالوں پہ ایک گھلی گھلی سی لالی تیرنے لگتی۔ اسے سخت غصہ آیا کہ آخر وہ اس وقت کیوں آیا ہے۔ دالان سے وہ اُلٹے پاؤں پلٹ پڑا۔ پہلے اس کا رُخ زینے کی طرف ہوا مگر چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد اس کے قدم رُکنے لگے۔ اوپر ابھی تک کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ وہ پھر نیچے اُتر گیا اور دالان کی طرف نگاہ اٹھائے بغیر صحن میں سے ہوتا ہوا باہر کے دروازے کی طرف چل پڑا۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اسے خیال ہو رہا تھا کہ بُوا جی نے اسے ضرور دیکھ لیا ہے اور اب وہ چلائیں گی "ارے استو میںنہ بوندی میں کہاں باہر جا رہا ہے"

لیکن ایسی کوئی آواز اسے نہیں آئی۔ ہاں آہستہ آہستہ سرونہ چلنے کی آواز ضرور آرہی تھی۔

پت نالا بہنے کی طرح پھر خاموش ہو گیا تھا مگر اب وہ خشک نہیں تھا بلکہ اتنی دور سے بھی وہ اسے گیلا گیلا دکھائی دے رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک بڑی سی بوند اس میں سے ٹپکتی اور نیچے ایک چھوٹے سے گڑھے میں جس میں دُھلے ہوئے سُرخ سُرخ ٹھیکرے اور ایک دو سفید سرمئی کوڑیوں کے

ٹکڑے پڑے تھے ٹپ سے گرتی اور ننھا منا سا دائرہ بن کر پانی میں گھل جاتا اور پانی پھر ٹھہر جاتا۔ وہ کھڑا کھڑا دیکھتا رہا۔ ایک سیپی ٹھیکروں کے نیچے پڑی چمک چمک کر اسے للچا رہی تھی مگر اسے اٹھانے کو اس کا مطلق جی نہ چاہا۔ وہ اسے تکتا رہا، تکتا رہا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ اس کا جی ڈھے رہا تھا اور ذہن میں کچھ غبار سا، گرم دھندسی پھیل رہی تھی۔ نہ جانے کیا کرنے کو، شاید رو پڑنے کو اس کا جی چاہ رہا تھا مگر کوئی بات، کوئی ارادہ اس کے ذہن میں واضح نہ تھا۔

چلتے چلتے بھگت جی کی دکان نے اسے پھر روک لیا۔ وہ چھوٹا سا گنوار و گٹکا اب موتی کے ہاتھ میں تھا۔ شاید وہ پڑھتے پڑھتے تھک گیا تھا۔ جب ہی تو کتاب اب چھی کے ہاتھ میں تھی اور وہ پڑھنا شروع کر رہا تھا:

ہاں آں . . . . . .

چندا کا بیری دل بادل ہے پانی کا بیری ارے سوال
مچھلی کا بیری رے دھیوز ہے دشمن نت اٹھ گھیرے جال

مچھلا کا بیری جوالا سنگھ ہے دشمن جھکا سامنے آئے
سیتا کا بیری لنکا پت ہے جو چھل کر لے گیا چرائے

چھی ابھی آہستہ آہستہ پڑھ رہا تھا اور سب پوری طرح متوجہ نہیں تھے۔ بھگت جی نے برابر میں پڑی ہوئی میلی سی مور چھلی اٹھا کر گڑ کی تھال پر ماری۔ بہت سی مکھیاں تھال سے اڑ کر فضا میں بھنبھنانے لگیں۔ بھگت جی بڑبڑائے "بڑی اوس ہے۔ مینہ پھر پڑے گا ———" کتاب پھر موتی نے ہاتھ میں لے لی۔

ہاں جی وہ ہا ہے کہ:-

ایک تو دھکا اس کو لگ جا جس کا گھر ساون میں گر جائے
دوسرا دھکا اس کو لگ جا جس کی بین بھینس مر جائے

تیسرا دھکا اس کو لگ جا جس کی بھری چلم . . . .

اس نے سوچا تھا کہ وہ اب مچھلا رانی کی کہانی سن کر ہی جائے گا مگر اس کا جی اندر ہی اندر بیٹھتا جا رہا تھا۔ وہ کئی منٹ تک چپکا کھڑا رہا، سنتا رہا۔ لیکن موتی کی بے رس آواز اس کے خاک پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ اس نے ٹھکرے جما ہی لی اور پھر دوسری گلی میں مڑ گیا۔

نئے سال کی آخری رات

کشمیری لال ذاکر

گاڑی تین گھنٹے لیٹ تھی۔

اسے اس بات کا احساس تھا کہ ریوا تین گھنٹوں سے اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ صبح جلدی جاگنا ویسے ہی اس کے لئے بڑی کٹھن بات تھی۔ اور پھر جاگ کر اسٹیشن جانا اور تین گھنٹے بے مقصد پلیٹ فارم پر چکر کاٹنا، وہ بھی اس کڑکڑاتے جاڑے میں جب دُھند کی ایک گھنی تہہ فضا میں بھر کر ہر چیز کو نظر سے اوجھل کر رہی تھی۔ اسے ریوا کے متعلق یہ سوچ کر بہت کوفت ہونے لگی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ریوا سردی کے معاملے میں بہت ویسی ہے۔ ذرا سی ٹھنڈ لگی اور زکام ہوا۔ اور پھر زکام بھی اس شدّت کا کہ انگ انگ ٹوٹ کے رہ جاتا۔ اگر وہ اسے اسٹیشن پر آنے کو نہ کہتا تو کیا بُرائی تھی۔ اس سے پہلے بھی تو وہ کئی بار وہاں آیا تھا۔ ریوا کبھی اسٹیشن پر اس کا استقبال کرنے نہیں گئی تھی۔ وہ خود ہی تانگے میں بیٹھ کر اس کے گھر آ جاتا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹاتا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے کی تو خیر نوبت بھی نہ آتی تھی۔ وہ خود ہی دروازے پر اپنی مسکراہٹ میں تمام تر لطافتیں سموئے کھڑی ہوتی تھی۔

"ہیلو شیکھر!" فضا میں ایک راگنی سی گونجتی اور ریوا کا نرم ہاتھ اس کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیتا اور اپنی تمام ملائمت اور نرماہٹ اس کے کھُردرے ہاتھوں میں بھینچ جاتی جیسے کسی بُت کے پتھریلے ہاتھ پھول کی پنکھڑیوں کو بھینچ رہے ہوں۔

"ریوا ڈارلنگ!" وہ جذبات سے بھاری آواز میں کہتا اور اس کی آنکھیں ریوا کی گہری آنکھوں میں ڈوب جاتیں۔

آج بھی وہ پہلے کی طرح خود ہی اس کے گھر جا سکتا تھا۔ پر جانے کیوں، اس بار اس نے ریوا کو لکھا کہ وہ اسٹیشن پر اس کا سواگت کرنے ضرور آئے نہیں تو وہ رُوٹھ جائے گا۔ آج پہلی ہی بار اس نے اسے سواگت کے لئے بُلایا تھا اور آج ہی گاڑی لیٹ تھی۔ دُھند کے بادل کھڑکی سے ٹکرا کر وہیں منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ نمی کی ایک موٹی سی تہہ شیشوں پر جم گئی تھی اور فضا میں رچی ہوئی دُھند، اس کی نمی، اور اس نمی میں تحلیل ہوتا ہوا صبح کا اُجالا، کچھ بھی تو نظر نہیں آ رہا تھا۔ تمام کائنات جیسے اپنے گرد ایک سفید چادر اوڑھ کر سو گئی تھی۔ تمام ماحول پر عجیب طرح کی بے حسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ پل بھر نم آلود شیشوں کو گھورتا رہا اور پھر اس نے انہیں نیچے گرا دیا۔ گاڑی تیزی سے جا رہی تھی، اور سامنے کے کھیت اور درخت، گڑھے اور ٹیلے، پگڈنڈیاں اور راستے بے نیازی سے دُھند کے ریلوں کو چوم رہے تھے، جیسے سال کے اس آخری دن کے ہر لمحے پر اپنی محبت اور خلوص کے آخری نشان مرتسم کر رہے ہوں۔ جیسے انہیں اپنے سینے سے بھینچ بھینچ کر جُدا کر رہے ہوں اور ان کی بے نور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوں اور دن کا اُجالا انہیں پی رہا ہو۔

انجن کی تیز سیٹی سے وہ چونک پڑا۔ وہ گاڑی کے پہلے ڈبوں میں تھا اس لئے سیٹی کی آواز زیادہ بلند اور واضح تھی جیسے بے حس کائنات کے

سینے میں کوئی تیز دھار والا بھالا اُتار رہا ہو۔ اس نے اپنے ڈبے میں نگاہ ڈالی، مسافروں نے اپنا اپنا سامان سنبھالنا شروع کر دیا تھا۔ اسٹیشن آرہا تھا۔ اس کی منزل نزدیک تھی جہاں ریوا نہ جانے کتنے گھنٹوں سے اس کا انتظار کر رہی تھی، جہاں پہلی بار اس نے اسے سواگت کرنے کو بلایا تھا۔ یہ کیا پچھتایا تھا اسکا کہ اس نے ریوا کو صبح سویرے ناحق پریشان کیا تھا۔ پر ریوا ہی کو تو پریشان کیا تھا اور کسی کو تو نہیں۔ ریوا پر اس کا حق تھا، اس کی زندگی پر، اسکی موت پر، اس کے جسم پر بھی۔ وہ چاہتا تو اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس سے حاصل کر سکتا تھا، چھین سکتا تھا اور اگر وہ نہ دیتی تو اس سے جھگڑ سکتا تھا۔ اور اگر اس نے ریوا کو صبح سویرے اسٹیشن پر آنے کو کہا تھا تو کون سی آفت ٹوٹ پڑی تھی۔ اسے آنا چاہیئے تھا۔ کیوں وہ ہر بار خود ہی لاوارثوں کی طرح اسٹیشن پر اُترے اور اس کا گھر کھوجتا پھرے۔

ایک اور اونچی اور مسلسل سیٹی گونجی۔ ڈبے میں زندگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اب تک وہاں قبر ایسی خاموشی تھی۔ اس سیٹی نے گویا اس پر نئے خون کی بوچھاڑ کر دی تھی جس میں گرمی تھی، ہلچل تھی، حرکت تھی۔ باہر کی دھند بھی ہلکی ہونے لگی تھی۔ شاید اس میں بھی زندگی آگئی تھی، حرارت آگئی تھی۔

اس کے اپنے جسم میں بھی ایک انوکھی سی پھرتی بھرنے لگی تھی، ایک نئی تازگی، جیسے کائنات کا ہر ذرّہ جاگ اٹھا ہو، اپنی تمام تھکن اور بے حسی چھوڑ گیا ہو۔ نئی زندگی پا رہا ہو۔

ہر چیز زندگی پا رہی تھی، ہر شے جاگ رہی تھی، ہر لمحہ پگھلنے لگا تھا!

اس کی منزل جو آگئی تھی!

اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ مسافروں کی ایک بھیڑ گاڑی کے استقبال کو پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ اور پھر گاڑی رُک گئی اور اس کی نظریں ایک جگہ جم کر رہ گئیں جیسے کسی نے نگاہوں کو باندھ لیا ہو۔

سامنے ریوا کھڑی تھی چیک ڈیزائن کا کوٹ پہنے، سر پر اسکارف لپیٹے، کوٹ کے اوپر اٹھائے ہوئے کالر اور اسکارف میں چھپے ہوئے چہرے کی ایک نامکمل سی جھلک نظر آتی تھی اسے، جیسے دھند اور کہرے سے ڈھکی پہاڑیوں کی اوٹ سے نئی صبح جھانک رہی ہو۔ ایک ہلکی سی مسکان اس کے گلابی ہونٹوں پر کھیل رہی تھی جیسے صبح کی پہلی تازہ نکھری ہوئی کرنیں شفق پر رقص کر رہی ہوں۔ شیکھر کے ذہن میں ایک دم ہزاروں افق اُجالے کی لہروں میں ڈولنے لگے۔

وہ اپنے ڈبے کا سب سے پہلا مسافر تھا جو پلیٹ فارم پر اُترا۔ اس کا سامان ڈبے میں بکھرا پڑا تھا اور وہ ڈبے کے سامنے کھڑا تھا۔ اور ریوا بھیڑ کو چیرتی ہوئی باہیں پھیلائے اس کی طرف لپک رہی تھی اور پھر پل بھر کو اس کے ہاتھوں کو اپنے نیم گرم ہاتھوں میں لینے کے بعد ریوا نے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا تھا اور اس کی آوازیں راگنیاں بن کر لہرا اٹھی تھیں۔ کتنا اچھا لگا تھا اسے یوں بھیڑ سے بھرے پلیٹ فارم پر ریوا کو اپنے سینے سے چمٹانا۔ پر انہیں بھیڑ کا احساس ہی کہاں تھا۔ وہ تو اکیلے کھڑے تھے۔ اپنی منزل پر، پہاڑ کی ایک چوٹی پر، اور ان کے گرد ہلکی ہلکی خواب آلود دھند تھی اور اجالا ان کو افق کے درمیچوں سے جھانکتا ہوا تھپک رہا تھا۔

اور پھر ایک دم اجالا پھوٹ پڑا۔

دھند چھٹ گئی!

تمام کائنات روشنی میں شرابور ہو گئی!

"تمہارا سامان؟" ریوا نے پوچھا۔

"ڈبے میں ہے!" شیکھر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"نکلواؤ گاڑی جا رہی ہے" ریوا کی آواز میں بے حد گھبراہٹ تھی اور شیکھر اسی طرح سکون سے مسکرا رہا تھا اور جب قلی نے بکھرے ہوئے سامان کو ایک ڈھیر سا بنا کر پلیٹ فارم پر پٹکا تو گاڑی چل دی۔ اس کی منزل ابھی آگے تھی۔ جانے ہر مسافر ہر منزل پر کیوں نہیں رُک سکتا، جانے ہر منزل ہر مسافر کو کیوں پناہ نہیں دے سکتی! جانے کیوں!

"آج تم نے قیامت کا انتظار کرایا" تانگے میں بیٹھتے ہوئے ریوا نے کہا۔

شیکھر نے ہنستے ہوئے شعر پڑھ ڈالا ؎

حشر کے بعد بھی دیوانے ترے پوچھتے ہیں — وہ قیامت جو گذرنی تھی کہاں گذری ہے

"اور اگر میں اسٹیشن پہ نہ آتی تو؟" ریوا نے پوچھا

"تو میں یہاں اُترتا ہی نہیں"

"اسی لئے سامان نہیں اُتارا تھا؟"

"ہوں!"

"کیوں کوئی اچھی صورت ڈبے میں تھی؟"

"بہت اچھی، تم نے آکر کھیل بگاڑ دیا"

"تو اب اسٹیشن پر چھوڑ آؤں؟"

"اب تو گاڑی چھوٹ چکی ہے" شیکھر نے جواب دیا۔

"ہر سفر میں کوئی نہ کوئی عورت تمہیں مل ہی جاتی ہے"

"نہیں میں ہی ہر سفر میں کسی نہ کسی عورت سے ٹکرا جاتا ہوں"

"اس کا انجام؟"

"تم!" شیکھر نے ایک بھرپور نظر ریوا کے چہرے پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں رات کی نیند کا خمار ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے نظریں جھکائیں۔ اور اس کے ہونٹ ایک اُدھ کھلی کلی کی طرح سکڑ گئے۔ شیکھر نے اپنے سرہانے میں ریوا کی پتلی پتلی گرم انگلیوں کو دبایا اور اس کے جسم میں گرمی کی ایک نہایت ہی ہلکی سی رَو دوڑ گئی۔

اور پھر وہ ریوا کو اس کرسچین لڑکی کی باتیں سُنانے لگا جس نے رات اس کے ساتھ سفر کیا تھا۔ وہ کسی امریکن فرم میں ٹائپسٹ تھی اور اس کے والدین لکھنؤ میں تھے اور وہ سال کی آخری رات ان کے ساتھ گذارنے جا رہی تھی۔ کرسمس کے یہ تمام دن اور راتیں اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ گذاری تھیں۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتی تھی، صرف آخری رات اپنے گھر والوں کے ساتھ گذارتی تھی۔ اس کا نام ربھا تھا، وہ خوب سگرٹ پیتی تھی اور بڑی اچھی سیٹی بجاتی تھی اور اس کی آنکھوں میں ایک عجیب پُراسرار سی گہرائی تھی جس میں گذرتے ہوئے سال کا ایک ایک لمحہ گہری نیند سو رہا تھا اور ان سب لمحوں پر اس نے سگرٹ کے ہلکے ہلکے مرغولوں کا گھنا سا سایہ بکھیر رکھا تھا۔ اس نے رات بھر میٹھی میٹھی باتیں کر کے

اسے سفر کی کوفت سے بچایا تھا اور جب کچھ دیر کے لئے اس کی آنکھ لگ گئی تھی تو اس کا سر اُٹھا کر اس نے اپنی ران پر رکھ لیا تھا اور اس کا ماتھا دباتی رہی تھی۔ اور جب وہ جاگا تھا تو ربھا نے کہا تھا کہ اگر وہ چاہے تو اس بار وہ اس سال کی آخری رات بجائے گھر والوں کے ساتھ گذارنے کے اس کے ساتھ گذار سکتی تھی۔ وہ جہاں چاہے ایک روز کے لئے اسے ساتھ لے جا سکتا تھا۔ وہ واپس جا کر گھر والوں کو لکھ دے گی کہ مصروفیت کی وجہ سے وہ اس بار ان کے پاس نہیں آ سکی، وہ ناراض نہ ہوں گے۔ ربھا نے اسے پسند کیا تھا اور اسے ڈارلنگ، کہہ کر پکارا تھا اور جب اس نے اسے یہ لفظ استعمال کرنے سے روکا تھا تو وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی اور پھر پوچھا تھا:۔

"تو کیا تم کسی سے پیار کرتے ہو؟"

"ہاں!"

"کتنا پیار؟"

"جتنا، جتنا، جتنا ——" اور وہ کچھ نہ کہہ پایا تھا اور وہ زور سے ہنسنے لگی تھی اور اس کے چھوٹے چھوٹے سفید دانت جگمگا اٹھے تھے "جتنا ایک مرد ایک عورت سے کرتا ہے" اس نے طنزاً کہا تھا۔

"نہیں جتنا ایک عورت ایک مرد سے کرتی ہے،" شنکھر نے تردید کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں بھی ایک عورت ہوں اور میں ہر روز ایک نیا پیار خریدتی ہوں اور پھر اسے بیچ ڈالتی ہوں"

"یہ جھوٹ ہے، عورت کبھی ایسا نہیں کرتی" اس نے غصہ سے کہا تھا اور اس کمسن لڑکی نے جی بھر کر قہقہے لگائے تھے اس کی حماقت اور سادہ لوحی پر اور پھر سگرٹ کا ایک بڑا سا بادل اس کی طرف اُڑا دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہ دیکھا تھا۔ اسے اس لڑکی کی باتوں سے نفرت ہو گئی تھی۔

"پھر آخر میں یہ سب صفائی پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" ریوا نے اسے کھجاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری قسم ایسا ہی ہوا تھا" شنکھر نے سنجیدگی سے جواب دیا اور ریوا ہنس دی۔

"میں خوب سمجھتی ہوں!" وہ بولی۔

اور پھر تانگہ رُک گیا۔ وہ دونوں سڑک پر کھڑے تھے۔ ریوا کے گھر کا ادھ کھلا پھاٹک، ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ صبح اسٹیشن جاتے وقت اسے بند کرنا بھول گئی تھی۔

"ممی کچھ روز سے بیمار ہیں، دو روز سے تو بالکل نہیں سو سکیں" گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے ریوا نے اس سے کہا۔

"پر اب تک تم نے کیوں نہیں بتایا؟" شنکھر نے شکایت بھرے لہجہ میں کہا

"یہ اتنی ضروری بات نہیں تھی کہ گاڑی سے اُترتے ہی تمہیں سنا دیتی"

"اور جو باتیں ہم نے کی ہیں، وہ زیادہ ضروری تھیں؟"

"شاید!" ریوا نے جواب دیا اور اس کی آنکھوں کے دریچوں پر چھائے ہوئے پلکوں کے حریری پردے پل بھر کو لرز گئے جیسے کسی گذرنے والے کی نازک انگلیاں انہیں چھو گئی ہوں۔

کچھ دیر وہ ریوا کی ماں کے پاس بیٹھا رہا، اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اپنی نئی پینٹنگز کی باتیں، اور اس نمائش کی باتیں جہاں اس کی

تصویریں بھی دکھائی گئی تھیں اور انہیں سراہا گیا تھا۔ پھر وہ کھانا کھا کر سو گیا اور جب جاگا تو دوپہر ڈھلے دیر ہو گئی تھی۔

شام کے قریب ریوا اسے گھمانے لے گئی۔ ماں کی حالت کچھ بہتر تھی، اس نے خود ہی ریوا کو تھوڑی دیر گھوم آنے کو کہا تھا۔ ان کا گھر شہر کے بیرونی حصے میں واقع تھا۔ تھوڑی ہی دور جا کر آبادی ختم ہو جاتی تھی، اور گرجا گھر کی خوبصورت عمارت آجاتی تھی۔ شیکھر کو گرجا گھر جانے کیوں پسند تھے۔ گرجا گھر کی چوٹی پر لگا ہوا صلیب کا نشان اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ صلیب اس کے نزدیک، سچائی اور امن کا ترجمان تھی۔ صلیب کو دیکھ کر اسے ہر بار یہ احساس ہوتا تھا کہ انسانی اور انیائے کا یہ اندھیرا ایک دن ضرور چھٹے گا اور ایک خوبصورت صبح ایسی آئے گی جب اجالے کی کرنیں صلیب کی عظمت کو سلام کر کے سارے سنسار کو منور کر دیں گی۔

کتنی عیاں ہو گی وہ صبح!

کچھ دیر گھومنے کے بعد وہ گرجا گھر کے باغ میں داخل ہو گئے۔ چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں موسم سرما کے پھول کھل رہے تھے چنبیلی اور بوگن ویلیا کی بیلیں عجیب انداز سے اپنا سرمایہ لٹا رہی تھیں۔ سرخ پتھر کا بنا ہوا گرجا گھر کا مینار دھوپ کی روشنی میں بڑا پیارا لگ رہا تھا۔ کچھ لمحے باغ میں گھومنے کے بعد ریوا نے چنبیلی کی بیل سے دو ادھ کھلی کلیاں توڑیں اور انہیں شیکھر کے کوٹ میں لگا دیا۔

"کلیاں لگا رہی ہو میرے کوٹ میں؟" شیکھر نے کہا۔

"جانتے نہیں آنے والی صبح نئے سال کی پہلی صبح ہو گی اور رات بھر میں یہ کلیاں کھل کر پھول بن جائیں گی"

"کیسے؟"

"میرے سپنوں کا خمار انہیں چوم کر نکھار دے گا"

اور پھر وہ دونوں چند لمحے چپ چاپ چلتے رہے اور پھر باغ کے ایک کونے میں سنگتروں کے ایک جھنڈ میں رکھے ہوئے بنچ پر بیٹھ گئے۔ پاس ہی گلاب کے پودے میں سبز سبز پتیوں کی اوٹ سے ایک سرخ پھول اپنی تمام رعنائیوں سمیت مسکرا رہا تھا۔

"یہ پھول اس طرح کیوں مسکرا رہا ہے ریوا؟"

"پھول اسی طرح مسکراتے ہیں!"

"کیوں مسکراتے ہیں یہ پھول؟"

"کہ تم ان کی مسکراہٹوں کو اپنی تصویروں میں بھر کر انہیں امر کر ڈالو۔ ان کے رنگوں کو اپنے خاکوں میں منتقل کر کے انہیں کبھی نہ مرجھانے دو"

"ٹھیک ہی کہتی ہو تم"، یہ کہہ کر شیکھر نے اپنی آنکھیں ریوا کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"اس طرح کیوں گھور رہے ہو مجھے؟"

"مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے تمہارا رنگ، تمہاری ملائمت اور تمہاری ہی مسکراہٹیں لے کر یہ پھول اترا رہے ہیں" ریوا یہ سن کر ہنس دی۔ اس کی بھرپور ہنسی نے جیسے ان گنت کلیاں بکھیر دی ہوں، سنگتروں سے گھرا ہوا وہ سارا کنج ان کلیوں سے بھر گیا، سارا باغ ان کی خوشبو سے مہک اٹھا سورج کی سادی کرنیں ان کے بوجھ سے جھک گئیں۔

"کتنا ترنم ہے تمہاری ہنسی میں ریوا" شیکھر نے کہا اور ریوا ایک بار پھر ہنس دی اور شیکھر کو یوں لگا جیسے برف کے سفید سفید گالوں نے اسے اپنے غیر محسوس بوجھ کے نیچے دبا لیا ہو۔ اور پھر ہوا کا ایک تیز سا جھونکا آیا اور درختوں کے نیم زرد پتے ٹہنیوں سے جدا ہو کر فضا میں بکھر گئے اور ایک پتا

اُڑ کر ریوا کے بالوں میں اُلجھ گیا۔ ریوا نے اسے الگ نہیں کیا۔ شیکھر اسے بالوں میں سے نکالنے لگا تو ریوا نے کہا۔

"اس بے چارے کو پل بھر کا ٹھہراؤ ملنے دو"

"ان کی قسمت میں سکون کہاں؟" اور شیکھر نے شبنم کا وہ نیم زرد پتّا ریوا کے بالوں سے نکال کر اپنے کوٹ میں لگا لیا جہاں چنبیلی کی دو اَدھ کھلی کلیاں لگی تھیں۔

"یہ کیوں؟" ریوا نے حیرت سے پوچھا۔

"کلیوں کی مدہوش کن چھاؤں میں بے چارہ رات بھر آرام کر لے گا"

"بڑے ہمدرد ہوتے جا رہے ہو"

"نہیں ہمدردی پانے کی چاہ زیادہ بڑھنے لگی ہے"

کچھ لمحے دونوں خاموش رہے۔ دھوپ ڈھلتی جا رہی تھی۔ بنچ پر بھی چھاؤں پھیلنے لگی تھی۔ اس بڑھتی ہوئی چھاؤں اور بڑھتی ہوئی دھوپ میں ریوا شیکھر کے ہاتھ کی پشت کو اپنی پتلی پتلی خوبصورت انگلیوں سے سہلا رہی تھی۔

"میرے لئے نئے سال کا کیا تحفہ لائے ہو؟"

"اپنی نئی تصویر!"

"کون سی؟"

"جس پہ مجھے نمائش میں انعام ملا ہے"

"تمہاری تصویریں دیکھ کر لوگ کیا کہتے تھے؟" کتنا پیار، مان اور اشتیاق تھا اس کی آواز میں۔

"پوچھتے تھے مجھے یہ مرکزی خیالات کہاں سے ملتے ہیں؟"

"اور تم نے کیا جواب دیا تھا؟"

"میں نے کہا تھا کہ میری انسپی ریشن کا سورس بہت عظیم ہے"

"سچ!!" ریوا کی آواز میں زمانے بھر کا اضطراب تھا۔

"ہاں!" شیکھر کی آواز اُبھری جس میں جذبات کا بھاری پن تھا اور اس کی مخمور نگاہوں نے ایک دم ریوا کو اپنی شخصیت میں تحلیل کر کے اس کا اپنا انفرادی وجود ختم کر دیا۔

"کہاں ہے تمہاری انسپی ریشن کا وہ سورس؟" ریوا نے پوچھا۔

شیکھر نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، خاموش ہی رہا۔ اس کی مخمور نگاہوں کی وسعت میں ہلکی ہلکی لہریں تیرتی رہیں اور ان میں ریوا ڈولتی رہی۔ اور پھر اچانک اس نے ریوا کو اپنے بازو کے حلقے میں لے کر اپنے قریب کر لیا۔ ریوا کا سر اس کے کندھے پہ ٹک گیا جیسے چنبیلی کی بیل نے اپنی کلیوں کے تمام بوجھ سمیت کسی شکستہ محراب کا سہارا لے لیا ہو۔ ریوا نے آنکھیں موند لیں، کلیوں کو جیسے نیند آ گئی ہو۔ شیکھر کی انگلیاں ریوا کے گال سہلا رہی تھیں اور اس کے کوٹ میں لگا ہوا شبنم کا زرد پتّا کلیوں کے لمس سے سرشار ہو رہا تھا۔

"تم کیا تحفہ دے رہی ہو مجھے؟" شیکھر نے پوچھا۔

ریوا نے اس کے کندھے سے سر نہیں اٹھایا صرف اپنی آنکھیں کھول دیں جن میں ہلکے ہلکے گلابی ڈورے پھیل گئے تھے جیسے جھیل کے پانی میں شفق تیر رہی ہو اور پھر اس نے سر گھما کر آنکھیں اوپر کیں۔ اس کی آنکھیں شیکھر کی آنکھوں سے مل گئیں اور اس نے دونوں ہاتھوں سے شیکھر کے سر کو نیچے جھکا لیا اور اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پہ رکھ دئے اور پھر اس کے گال سُرخ سُرخ ہو گئے جیسے گلاب کے پھولوں نے اپنی رنگت چنبیلی کی کلیوں میں سمو دی ہو اور کلیاں اس سُرخی سے دہک اٹھی ہوں۔

سائے اور پھیل گئے تھے۔ باغ میں جیسے ہلکا سا دھندلکا بھر گیا تھا۔ گرجا گھر کی صلیب پر سورج کی کرنیں چمک رہی تھیں، وہ بینچ پر سے اُٹھے۔ ریوا نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور شیکھر نے چلنے سے پہلے گلاب کا وہ پھول جوا نہیں دیکھ کر اب تک مسکرا رہا تھا ٹہنی سے توڑ کر ریوا کے بالوں میں لگا دیا۔

"شکریہ!" ریوا نے کہا

"اب اسے تمہاری جُدائی کا دُکھ نہ ہوگا"

"تمہیں یا پھول کو؟" وہ شیکھر کا جواب سُنے بغیر ہی ہنس دی۔ اس کی ہنسی کی مدھر لہریں فضا میں تھرک گئیں چنبیلی کی بیلیں کلیوں سے جھولیاں بھر کر اس کے تعاقب کو لپکیں، پر وہ باغ کے احاطے سے باہر آ چکے تھے۔

کلیاں مُرجھا کر بکھر گئیں۔

گرجا گھر کی صلیب سورج کی آخری کرنوں میں مسکرا رہی تھی۔

وہ، ریوا اور اس کی چھوٹی بہن رنجنا ماں کے کمرے میں دیر تک بیٹھے رہے۔ کھانا انہوں نے وہیں کھایا۔ ماں کی طبیعت اچھی تھی صرف اسے نیند نہ آ رہی تھی اور وہ سونا چاہتی تھی۔ سوپزل کی گولیاں تپائی پر رکھی تھیں جنہیں کھا کر وہ رات آرام سے سو جائے گی۔ دو راتیں اس نے جاگ کر کاٹی تھیں، آج وہ نہیں جاگے گی۔ آج وہ ضرور سوئے گی تاکہ نئے سال کی پہلی صبح کو وہ تازہ دم ہو کر اُٹھے اور نئے سفر کا آغاز کرے سفر جو چلنے ہی سے کٹتا ہے، منزلیں جو مشکلوں سے ہی ملتی ہیں —— آتش دان میں لکڑیاں جل رہی تھیں، ان کے شعلوں کی ہلکی ہلکی رنگت کمرے کی سفید دیواروں پر اُبھرتے ہوئے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ رنجنا دیر تک اپنے سکول کی باتیں سُناتی رہی، اپنی سہیلیوں اور اُستانیوں کے قصے، ان پر وہ سب جی بھر کر ہنسے اور پھر ریوا نے اپنے کلچرل فورم کی مصروفیات کا ذکر کیا اور پھر شیکھر انہیں کرسمس کے گیت اور لوک کتھائیں سُناتا رہا اور رات دبے پاؤں سرکتی رہی۔

"گھر میں کچھ موم بتیاں ہوں گی ریوا؟" شیکھر اچانک کہہ اُٹھا

"کیوں؟" ماں نے پوچھا

"جلانے کے لئے"

"بجلی کی روشنی جو ہے" ماں نے جواب دیا۔

"اس کی روشنی چھت کی منڈیروں اور احاطے کی دیواروں کو تو نہیں جگمگا سکتی"

"دیپ مالا کرنا چاہتے ہو؟"

"جی!" شیکھر نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"دیوالی کو کچھ کسر رہ گئی ہوگی" ریوا نے مسکراتے ہوئے کہا

"یہ بات نہیں ریوا، آج کی رات اس سال کی آخری رات ہے، پھر یہ رات لوٹ کر نہ آئے گی، یہ لمحے واپس نہ پلٹیں گے۔ یہ ماضی کے عمیق خلا میں جذب ہو کر سدا کے لئے اپنا وجود کھو دیں گے۔ میں چاہتا ہوں ان گذرتے ہوئے لمحوں کو آخری بار روشن کر دوں تاکہ اندھیرے میں جانے سے پہلے یہ ایک بار مسکرا اٹھیں۔ ان کے ساتھ سال بھر کی یادیں وابستہ ہیں۔ ان کے ساتھ جانے کتنے قہقہوں اور آنسوؤں کا تعلق ہے۔ انہیں سلیقے سے الوداع کرنا چاہتا ہوں" شیکھر خاصا جذباتی ہو گیا تھا اور جب وہ جذباتی ہو جاتا تھا تو اس کی آواز میں ایک ملائم سا بھاری پن بھر جاتا تھا، ایک پیارا سا ٹھہراؤ، ایک لطیف سی گمبھیرتا اس پر خواہ مخواہ پیار آنے لگتا تھا۔

"تو میں ابھی بھیجتی ہوں نوکر کو" ماں نے کہا

"عجیب جھکی ہوتے ہیں یہ لوگ" ریوا نے جیسے ماں کی بات نہیں سُنی تھی "اس لئے کہ انہیں سدا روشنی کی چاہت رہتی ہے، اس لئے کہ وہ اندھیرے سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے، اس لئے کہ وہ ماحول کو چمکانے کے لئے اپنا خون بھی جلانے سے گریز نہیں کرتے۔ یہ پاگل پن ہی تو ہے۔ ہم سب دیوانے ہی تو ہیں جو اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی ایک حسین صبح کی اُمنگ بھرپور روشناش رکھتے ہیں" اور پھر وہ آپ سے آپ ہنس دیا جیسے سچ مچ ہی پاگل ہو گیا ہو۔

"تم اس کی بات کا بُرا نہ ماننا کرو بیٹا یہ ایسی ہی ہے" ماں کہہ رہی تھی اور ریوا دھیرے دھیرے مسکرا رہی تھی۔

"میں بُرا نہیں مانتا ماں جی" اس نے جواب دیا

"تم ریوا کے دوست ہو مجھے اس کی خوشی ہے، ایک فن کار کی قربت کسی شخص کی انفرادیت کو کتنا نکھارتی ہے یہ میں جانتی ہوں میرا وشواش ہے کہ جو باتیں یہ دیوانے اپنے سنکی پن کی رَو میں کہہ جاتے ہیں وہ دنیا کے لئے بیش قیمت سچائیاں بن جاتی ہیں۔ ایسی سچائیاں جنہیں زمانے بھر کے عقلمند مل کر بھی نہیں گھڑ سکتے۔ بعض اوقات یہ پاگل ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ بڑے سے بڑا پیغمبر بھی نہیں کہہ سکتا اور جو ایسی باتیں کہہ سکتا ہے وہی پیغمبر ہے۔ دراصل یہی دیوانے پیغمبر ہیں شیکھر جنہیں انسان کی عظمت پر وشواش ہے"

شیکھر خوشی سے جھوم اٹھا۔ ریوا کی بیمار ماں کے منہ سے آج اس نے وہ بات سُنی تھی جو اس نے کسی تندرست انسان سے بھی نہیں سُنی تھی۔ اس نے کرسی سے اُٹھ کر اس بیمار مُورت کے پاؤں چھو لئے۔

"خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو" اور ریوا کھلکھلا اٹھی تھی اور پھر اسی طرح ہنستے ہنستے کمرے سے باہر نکل گئی تھی اور اسکی ہنسی کی گونج دیر تک فضا میں تھرکتی رہی۔

جب شیکھر ماں کی پائینتی سے اُٹھا تو نوکر موم بتیوں کا بنڈل لے آیا تھا۔

اور پھر اس نے، ریوا نے اور رنجنا نے مل کر چھت پر اور دیواروں کی منڈیروں پر موم بتیاں جلائی تھیں۔ سال کے ان آخری گذرتے ہوئے لمحوں کو پیار اور خلوص سے وداع کیا تھا، اس نے ماضی کے اندھیروں کو خلا میں ڈوبنے سے پہلے مستقبل کے نور سے روشن کر ڈالا تھا۔ ماں بستر سے نہ اُٹھ سکی تھی پر اس نے وہیں سے موم بتیوں کی جھلملاتی ہوئی لوؤں کو دیکھا تھا۔ اسے بہت اچھا لگا تھا یہ لرزتا ہوا اجالا جس سے ایک دیوانہ سپنا رے زمانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ دیر تک ان کانپتی ہوئی لوؤں کو دیکھتی رہی اور پھر اس نے سوینل کی دو گولیاں پانی سے کھا لیں جیسے ان ڈھیر ساری موم بتیوں کے اُجالے سے اپنی نیند اُجالنا چاہتی ہو۔

پھر ریوا اور وہ اور رنجنا اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ اس کا موڈ ایک دم بگڑ گیا تھا۔ ریوا جانتی تھی کہ بدلنے سے وہ اور چڑے گا، اس لئے وہ بھی خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ کمرے میں آ کر پلنگ پر گر گیا اور سرہانے رکھی تپائی پر پڑے ٹیبل لیمپ کو جلا لیا۔ ٹیبل لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی کمرے میں پھیل رہی تھی۔

منڈیروں پر موم بتیاں جل رہی تھیں، سال کے آخری لمحے تیزی سے گذرتے جا رہے تھے۔

"ٹھنڈ زیادہ ہے کہو تو کمبل دے جاؤں؟" ریوا اس کے کمرے میں آئی تھی۔

وہ آنکھیں چھت پر گاڑے لیٹا تھا۔

"نہیں!" اس نے بے رُخی سے کہا۔

"اس پتلی سی رضائی میں تمہیں سردی لگے گی"

"تمہاری بلا سے" اس نے بظاہر ناراضگی سے جواب دیا۔

"اچھا تو حضور ناراض ہو گئے" ریوا اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔

شیکھر خاموش پڑا رہا

"کہو معاف کیا" ریوا نے کہا

"کس قصور پر؟"

"یونہی! میرا معافی مانگنے کو جی چاہ رہا ہے"

ریوا کی بات سُن کر وہ مسکرا اُٹھا۔ کتنی عجیب لڑکی تھی وہ بھی۔

"اچھا تو اب آرام سے سو جاؤ۔ یہ کھڑکی بند کر دوں؟" وہ سرہانے سے اُٹھی۔

"نہیں کھڑکی کھلی رہنے دو۔ مجھے ابھی اس بجھتے ہوئے اُجالے کو دیکھنا ہے"

"جھکی!" وہ دھیرے سے مسکرائی اور جھک کر ایک ہلکی سی چپت اس کے گالوں پر لگا دی اور اس کے بالوں میں اٹکا ہوا وہ گلاب کا پھول شیکھر کے بستر پر گر گیا۔ پیشتر اس کے کہ وہ ریوا کا ہاتھ پکڑ کر اسے چوم لیتا وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی

وہ گلاب کے پھول کو اپنے ہاتھ میں لئے دیکھتا رہا اور پھر اسے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس نے ٹیبل لیمپ بجھا دیا اور آنکھیں بند کر کے پھول کو ہونٹوں پر رکھے کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

اور پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔

منڈیروں پر موم بتیوں کی روشنی ہلکی ہونے لگی تھی۔

اور پھر ایک دم اس کی نیند ٹوٹ گئی۔

گرجا گھروں میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

گذرتے ہوئے سال کے آخری لمحوں کی کوکھ سے ایک نیا سال جنم لینے والا تھا۔ ماضی کے سینے سے مستقبل کا چشمہ پھوٹنے والا تھا۔ رات کے اس اندھیرے سے ایک نئی صبح کا اُجالا اُبھرنے والا تھا۔

منڈیر پہ جلتی ایک آخری موم بتی کسی آخری لمحے کو الوداعی بوسے دے رہی تھی۔
گھنٹیوں کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔
کھلی ہوئی کھڑکی سے اس کی گونج اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی، لمحات کا ایک بہت بڑا قافلہ سفر کا آغاز کرنے والا تھا۔
اسے ٹینی سن کی ایک نظم کی یہ سطریں یاد آنے لگیں:۔

Ring out wild bells, to the wild sky
The flying cloud, the frosty light
The year is dying in the night
Ring out, wild bells, and let him die.
Ring out the old, ring in the new.,
Ring happy bells across the snow.,
The year is going, let him go;
Ring out the false, ring in the true.

گھنٹیاں بج رہی تھیں اور شنکھر ٹینی سن کی نظم گنگنا رہا تھا۔ اسے یہ نظم بڑی پیاری لگتی تھی۔
اچانک ہی گھنٹیاں بجنا بند ہو گئیں۔
فضا میں ایک گہرا سکوت رچ گیا، جیسے کائنات کا ذرّہ ذرّہ خاموش ہو گیا ہو۔
نئے سال کا آغاز ہو چکا تھا۔ رات نے تاروں کے اُجلے پھول اس کے قدموں میں بکھیر دئے تھے۔ دیوار پر لگا کلاک ٹک ٹک کہہ رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ نئے سال کے قدموں کی مدھر چاپ سن رہا ہو۔ منڈیر پہ جلتی ہوئی آخری موم بتی اس کا سواگت کر رہی تھی۔
شنکھر اپنے پلنگ سے اُٹھا۔ فرش پر کھڑے ہو کر اس نے ایک انگڑائی لی اور پھر دروازہ کھول کر ریوا کے کمرے کی طرف چل دیا اس کی دھڑکنیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں اور اندھیرا جیسے سانس لے رہا تھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ ساتھ والے کمرے سے ریوا کی ماں کے خرّاٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ ریوا کے پلنگ کے قریب جا کر وہ پل بھر کو رُکا۔ ریوا آرام سے سو رہی تھی، کمرے میں رچے ہوئے گھنے اندھیرے کے باوجود وہ ریوا کے چہرے کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کے نقوش کا خاکہ اس کی آنکھوں کے سامنے تیر رہا تھا۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور اپنا دایاں ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھ دیا۔ ریوا گہری نیند سو رہی تھی اسے اس کا احساس ہی نہ تھا۔ پل بھر کو وہ اسے سہلاتا رہا اور پھر ریوا اچانک چونکی۔
"کون ؟" اس کی آواز میں گھبراہٹ تھی جیسے اس کا کوئی حسین سپنا ٹوٹ گیا ہو۔
"تمہارا سپنا" شنکھر نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
"تم !" کتنی حیرت اور گھبراہٹ تھی اس کی آواز میں۔

"ہاں!"

"کیوں آئے ہو اس وقت؟" اس نے قدرے غصہ سے کہا

"تمہارا گلاب وہاں رہ گیا تھا دینے آیا ہوں" شیکھر نے نرمی سے جواب دیا

"نہیں مجھے نہیں چاہئے گلاب کا پھول، تم اپنے کمرے میں چلے جاؤ" رلیا کی آواز میں اب غصے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

"نئے سال کا آغاز ہو چکا ہے رلیا"

"مجھے معلوم ہے۔ تم چلے جاؤ میرے کمرے سے" اور اس نے شیکھر کا ہاتھ ماتھے سے اُٹھا کر پرے جھٹک دیا۔ شیکھر کے دل پر جیسے کسی نے ٹھوکر ماری ہو۔ پر وہ درد کو پی گیا۔ چیخا نہیں!

"تم نے پہلو کیوں بدل لیا ہے، میرا پل بھر کا بیٹھنا بھی گوارا نہیں؟"

"نہیں" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا

"لیکن ——" شیکھر نے کچھ کہنا چاہا پر رلیا کے تیز نشتر نے اس کی زبان کاٹ ڈالی۔

"اگر تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں تو میری عزت کا ہی کچھ خیال کرو"

شیکھر نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی زبان جو کٹ گئی تھی وہ بولتا کیسے۔ خون کا ہلکا ہلکا ذائقہ اس کے منہ میں گھلنے لگا۔ وہ ایک دم رلیا کے سرہانے سے اُٹھا، دروازے کی طرف لپکا اور اندھیرے میں دروازے کی بجائے دیوار سے ٹکرا گیا اور پھر اپنی چوٹ کو سہلاتا ہوا اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

پلنگ پر دھم سے گرتے ہوئے لمحہ بھر کو اس کی نگاہوں نے منڈیر پر جلتی ہوئی آخری موم بتی کا لرزتا ہوا سہارا ڈھونڈا۔ پر وہ بجھ چکی تھی۔ وہ سہارا بھی ٹوٹ چکا تھا۔ اس کی روشنی کو نئے سال کے پہلے لمحوں نے بے دردی سے روند ڈالا تھا۔

کلاک کی ٹک ٹک جیسے اس پر تیز نکیلی کنکریاں پھینک رہی تھی۔ رلیا نے اسے دیوار سے ٹکراتے دیکھا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ ضرور آئے گی اس کی چوٹ سہلانے، پر وہ نہیں آئی۔ وہ رضائی کو اپنے گرد لپیٹے دیوار کے سہارے پیٹھ ٹکا کر بیٹھا رہا اور اپنی چوٹ کو خود ہی سہلاتا رہا، سہلاتا رہا اور سوچتا رہا، سوچتا رہا اور جلتا رہا جیسے بجھی ہوئی موم بتیوں نے اپنی ساری جلن اسے بخش دی ہو۔

لمحات کے ریلے اسے دبوچ رہے تھے۔

اور اسے وہ شام یاد آ رہی تھی جب وہ رلیا سے پہلی بار ملا تھا۔

وہ جموں کے راستے سری نگر جا رہا تھا۔ اس نے صبح کی پہلی بس پکڑی تھی۔ اس خیال سے کہ شام تک سری نگر پہنچ جائے گا۔ وہ پہر کے قریب وہ کُد پہنچے اور پھر پتنی ٹاپ کے موڑوں میں گھومتی ہوئی بس آخری موڑ پر رکی جس کے بعد اُترائی شروع ہو جاتی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے سب مسافر بس سے باہر نکل آئے۔ وہ بھی اتر کر ایک طرف چل دیا جس طرح کہ بل کھاتے ہوئے موڑوں میں سے بس گذر کر آئی تھی ویسے ہی موڑ اس کے سامنے پھیل رہے تھے اور پھر نیچے سیڑھیوں کی شکل میں نکونے، چوکور اور مستطیل شکل کے کھیت چھوٹے موٹے جزیروں کی طرح چمک رہے تھے اور بہت نیچے وادی میں کسی نالے کی ہلکی سی لکیر اُبھر رہی تھی۔ کچھ لمحے وہاں کھڑا رہنے کے بعد وہ پتنی ٹاپ کے میدان کی طرف چل دیا۔ چیل کے درختوں سے گھرا ہوا وہ مختصر سا میدان کتنا سُندر لگ رہا تھا۔ سرسبز گھاس کا فرش اور اس پر چیل کے درختوں سے

چھن چھن کر آتی ہوئی کرنوں کا رقص، کتنا من موہنا نظارہ تھا! وہ اس خوبصورتی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا اور یوں اس سارے ماحول میں کھو گیا جیسے کسی نے اس پر جادو کر دیا ہو۔ وہ اس کا اسکیچ بنائے گا، اس نے سوچا، اور ماحول کی ساری جزئیات اس نے اپنے ذہن میں محفوظ کرنا شروع کر دیں۔

بس کا ڈرائیور زور زور سے ہارن دے رہا تھا۔ سب مسافر بس میں بیٹھ چکے تھے، صرف اسی کا انتظار تھا۔ وہ ہارن کی آواز سن تو رہا تھا پر تھا وہ کسی دوسری دنیا میں۔ وہ چیل کے ایک درخت کے سہارے کھڑا سارے ماحول کو بنا پلک جھپکے دیکھے جا رہا تھا۔

"بابوجی! آئیے نا، مسافر آپ کا انتظار کر رہے ہیں" کلینر اس کے سامنے کھڑا تھا اور اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ کوئی اس طرح ڈھٹائی سے اپنے کرخت الفاظ کا بھالا لے کر اس تُندر نا بھری خاموشی کو مجروح بھی کر سکتا ہے۔

وہ کچھ نہیں بولا صرف کلینر کو دیکھتا رہا۔

"اگر آپ نے نہ جانا ہو تو اپنا سامان اُتروا لیجئے" کلینر نے پھر اپنے طبقہ کے مخصوص اکھڑپن سے کہا۔

"تو اُتار دو میرا سامان" شنکھر نے کھیج کر جواب دیا اور کلینر کے پیچھے پیچھے نیچے سڑک پر آ گیا۔

"آپ کو یہیں رہنا ہے کیا؟" اب کی ڈرائیور نے رعب جمایا تھا

"ہاں!" شنکھر نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"پر یہاں رات کاٹنے کا کوئی انتظام نہیں" ڈرائیور نے مخلصانہ چتاونی دی۔

"میں دیکھ لوں گا"

اور سب مسافر حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے جس نے آدھے سے بھی کم سفر میں ہی اپنا سامان اُتروا لیا تھا اور کلینر سے کہہ رہا تھا "دیکھ جانے یہ جگہ کب سے میرا انتظار کر رہی تھی" اور کچھ مسافر ہنس پڑے تھے، محض ہنسنے کے لئے۔

بس اسٹارٹ ہو گئی تھی اور اس کا بستر اور اٹیچی کیس سڑک کے کنارے پڑے تھے اور وہ انہیں بڑے پیار سے دیکھ رہا تھا۔ اور پھر اس نے قلیوں کی طرح دونوں چیزیں اُٹھائی تھیں اور ٹاپ پر بنے ریسٹ ہاؤس کی طرف چل پڑا تھا۔

اس نے اپنا سامان ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں رکھ دیا اور خود اس حسین ماحول کا ہی ایک جزو بن گیا۔

ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار حسب اپنے تین میل دور گاؤں سے حسب معمول گشت پر آیا تو شنکھر اس وقت اکڑوں بیٹھا اٹیچی کیس پر کاغذ رکھے اس حسین منظر کا اسکیچ بنا رہا تھا۔ چوکیدار نے کچھ دیر خاموش کھڑا رہنے کے بعد پوچھا

"آپ کون ہیں؟" شنکھر نے حیرت بھری نظروں سے اس بوڑھے پہاڑی کی طرف دیکھا۔ اس کے ماتھے پر بے شمار لکیریں آپس میں اُلجھ رہی تھیں۔

"ایک مسافر ہوں بھائی" شنکھر نے کاغذ پر سے اپنا ہاتھ اُٹھا لیا تھا۔

"آپ کی لاری فیل ہو گئی ہے کیا؟"

"نہیں میں نے خود ہی یہاں سامان اُتروا لیا ہے"

"بہت دنوں کے بعد کوئی مسافر خود یہاں اُترا ہے" چوکیدار برآمدے میں بیٹھ گیا تھا۔

"یہاں مسافر ٹھہرتے نہیں کیا؟"

"خوشی سے کوئی نہیں ٹھہرتا۔ لاری فیل ہو جانے پر تو خیر ٹھہرنا ہی پڑتا ہے" اور وہ مسکرا دیا تھا اور اس کی داڑھی کے سفید گھنے بالوں میں یہ سادہ مسکراہٹ بڑی سکون پرور لگ رہی تھی جیسے برفیلی چوٹیوں پر ڈوبتے ہوئے سورج کا آخری اُجالا تھرک رہا ہو۔

"سنسان جگہ ہے نا اس لئے"

"جی!"

"سُندرتا اپنی انتہا پر پہنچ کر ایک دم سنسان ہو جاتی ہے، بالکل الگ، سُونی اور دسترس سے دُور،" شیکھر کے ان الفاظ کا مطلب چوکیدار کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ وہ اسے صرف دیکھتا ہی رہا تھا۔

"آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"تصویر بنا رہا ہوں"

"آپ ہاتھ سے بنا لیتے ہیں تصویریں" بوڑھے چوکیدار نے حیرت سے پوچھا تھا اور اس کے چہرے پر بڑا معصوم سا اشتیاق اُبھر آیا تھا۔ اور پھر اس نے اُٹھ کر کمرہ صاف کیا تھا، کرسیاں اور میز پونچھا تھا، پلنگ جھاڑا تھا، دری بچھائی تھی اور شیکھر کا بستر لگا دیا تھا اور اس کے بیٹھنے کے لئے برآمدے میں کرسی ڈال دی تھی۔

شیکھر کافی دیر اپنے اسکیچ میں مصروف رہا اور پھر برآمدے سے اُتر کر میدان میں گھومنے لگا۔ لمبے لمبے سانس لے کر جیسے وہ پہاڑ کی اس چوٹی پر چلتے ہوئے ہوا کے آزاد جھونکوں کو پی جانا چاہتا ہو۔ وہ ایک ایک درخت کے پاس کھڑا ہوتا جیسے ان کی باتیں سُن رہا ہو، ان سے اپنے من کی بات کہہ رہا ہو۔ انہیں کوئی پیغام دے رہا ہو۔

چوکیدار اس کے لئے کھانا تیار کروانے کے لئے واپس گاؤں میں چلا گیا۔ وہ بہت دیر تک میدان میں گھومتا رہا۔ جب شام ہونے لگی اور فضا میں خنکی بڑھنے لگی اور چیل کے درختوں نے اپنی ہلکی ہلکی راگنیاں چھیڑ دیں تو وہ واپس ریسٹ ہاؤس میں آیا۔ کمرے میں آ کر اس نے لیمپ جلایا۔ کچھ دیر کمرے کا جائزہ لینے کے بعد بیٹھ گیا۔ چوکیدار نے بڑے سلیقے سے آتشدان میں لکڑیاں چُن رکھی تھیں۔ پاس ہی لکڑیوں کو جلانے کے لئے کچھ سُوکھی گھاس بھی رکھی تھی۔ آتش دان میں لکڑیاں جلا کر قریب بیٹھنا، کچھ پڑھنا یا سوچنا یا خواب دیکھنا اس کی ایک بہت بڑی آرزو تھی۔ اس کی رومانٹک طبیعت کا یہ بھی ایک جزو تھا۔ آتش دان کے قریب بیٹھ کر وہ فوراً ہی عام سطح سے اُوپر اُٹھ جاتا تھا۔ اس کی سوچ میں آپ سے آپ ایک لطیف سی بلندی آجاتی تھی۔ اس کے تخیّل میں پرواز کی وسعتیں پھیل جاتی تھیں اور وہ شعلوں کی اس ہلکی سی سُرخی سے لاتعداد بہاروں کی تخلیق کر ڈالتا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر کے توقف کے بعد آتش دان میں بڑی لکڑیوں میں آگ لگا دی اور کرسی کو آگ کے نزدیک کھینچ کر ٹانگیں تپائی پر پھیلائے اپنے ہی خیالوں میں کھو گیا۔ سُوکھی لکڑیوں نے فوراً ہی آگ پکڑ لی تھی اور سُرخ سُرخ شعلوں کی پرچھائیاں کمرے کی دیواروں پر ناچ رہی تھیں۔

اور پھر ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تھی۔

اس نے سُنا دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔

"اندر آ جاؤ چوکیدار!" ذرا سا پہلو بدلتے ہوئے اس نے کہا

"چوکیدار نہیں ہم ہیں" دروازہ کھٹ سے کھلا اور دو جوان لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ گھبرا کر کرسی سے اٹھا جیسے اس پُراسرار ماحول میں کہیں سے دو جادوگرنیاں آ گئی ہوں۔

"آپ ——؟"

وہ کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ ایک لڑکی نے جواب دیا۔

"ہم سری نگر جا رہے تھے، ہماری کار فیل ہو گئی ہے" شیکھر نے لڑکی کی طرف نظر اٹھائی، سفید اونی شال میں اس کے کالے گھنگریالے بال بہت اچھے لگ رہے تھے۔

"بیٹھئے!" اس نے کہا اور وہ دونوں بیٹھ گئیں اور پھر لمحہ بھر بعد ادھیڑ عمر کی ایک خوبصورت عورت ڈرائیور سے سامان اٹھوائے اندر داخل ہوئی۔ شیکھر نے اٹھ کر اپنی کرسی اسے پیش کر دی۔ وہ بیٹھ گئی۔

"معاف کیجئے گا، ہم نے آپ کو تکلیف دی ہے" عورت نے کہا۔

"نہیں جی میں بھی آپ کی طرح ایک مسافر ہوں"

"تو کیا آپ کی کار بھی فیل ہو گئی ہے؟"

"جی نہیں کار رکھنے کی تو مجھ میں توفیق نہیں، بس میں جا رہا تھا، نظارہ اچھا لگا یہیں اتر گیا" شیکھر نے جواب دیا۔

سفید شال والی لڑکی نے میز پر پڑے ہوئے اس اسکیچ کو دیکھنا شروع کر دیا تھا "تو کیا آپ پینٹنگ کرتے ہیں؟" اس نے شیکھر سے پوچھا۔

"جی!"

"آپ کا نام؟"

"شیکھر!"

"کچھ روز پہلے "دیپک" میں آپ ہی کی تصویر چھپی تھی؟"

"جی!"

"بہت اچھی تھی وہ تصویر۔ میں نے تو اسے فریم کروا کر اپنے کمرے میں لگا لیا ہے!"

"شکریہ!" شیکھر نے کہا اور اس نے ایک بار جی بھر کر لڑکی کو دیکھ لیا۔ دوسری لڑکی کی موجودگی کا اسے احساس ہی نہ ہوا۔ اس کے وہ کالے گھنگریالے بال، ان پر پھسلتی ہوئی سفید شال، لمبی پلکوں کے سائے میں چمکتی ہوئی شفاف آنکھیں، پتلے پتلے گلابی ہونٹ اور گالوں کی وہ ہلکی سی ملائم چمک، شیکھر نے جیسے انجانے میں ہی ان سب کو اپنا لیا تھا "مے آئی سیک یور انٹروڈکشن؟"

"میرا نام ریوا ہے، یہ میری فرینڈ پورنیما ہے، اور آپ ہیں میری ممی" شیکھر نے یہ نہیں کہا تھا کہ اسے ان سے مل کر بے حد خوشی ہوئی تھی۔ وہ خاموش ہی رہا تھا۔ اور پھر ان تینوں نے اپنی اپنی کرسیاں آتش دان کے قریب کھینچ لی تھیں اور شعلوں کی گرمی اور روشنی نے ریوا کی شخصیت کو اور بھی دلکش بنا دیا تھا، مسحور کُن ہونے کی حد تک خوبصورت۔

چوکیدار جب شیکھر کے لئے کھانا لے کر آیا تو اتنے لوگوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"میں نے تمہارے جانے کے بعد کچھ اور مسافروں کو بھی روک لیا ہے"، شیکھر کی بات سن کر وہ سب ہنس دیئے تھے اور چوکیدار بھی ہنس دیا تھا۔ اس کھانے کو سب نے مل کر کھایا، ریوا نے اپنی تھرموس سے سب کو کافی پلائی اور پھر آتش دان میں لکڑیاں ڈال کر دیر تک آگ تاپتے رہے۔

اچانک، بارش ہو جانے سے سردی کافی بڑھ گئی تھی۔

کمرے میں صرف دو پلنگ تھے۔ تھا تو ایک پلنگ اور بھی، پر اس کا ایک پایہ ٹوٹ گیا تھا اس لئے کام نہ آ سکتا تھا۔ بہت بحث مباحثے کے بعد شیکھر نے ان سب کو پلنگوں پر سونے کو راضی کر لیا اور خود نیچے فرش پر اپنا بستر لگا لیا اور جب ریوا نے اپنے بستر کا گدا نکال کر شیکھر کے بستر کے نیچے ڈال دیا تو شیکھر نے کوئی مدافعت نہ کی، خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔ اور پھر سب اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ ریوا اور لپو رینا ایک پلنگ پر اور اس کی ماں دوسرے پلنگ پر۔ کچھ دیر تک لمپ جلتا رہا اور پھر تیل نہ ہونے کے کارن خود ہی بجھ گیا، پھر کچھ دیر آتش دان میں پڑی لکڑیاں چٹختی رہیں، پھر کوئلے دہکتے رہے اور پھر ان پر بھی راکھ جم گئی اور کمرے میں مکمل اندھیرا چھا گیا۔ پر اسرار خاموشی بھر گئی اور پھر کمرہ ریوا کی ماں کے خراٹوں سے گونجنے لگا اور ٹین کی چھت پہ گرتی ہوئی ہلکی ہلکی بوندوں کا شور ابھرنے لگا۔ شیکھر کے لئے فرش پر سونے کا شاید یہ پہلا موقع تھا۔ شاید اسے کچھ تکلیف محسوس ہوتی پر ریوا نے بستر کے نیچے اپنا گدا ڈال کر اسے بہت زیادہ آرام دہ بنا دیا تھا اور اب وہ آرام سے لیٹا تھا اور سونا چاہتا تھا پر خراٹوں کی آواز اس کی آنکھ نہ لگنے دیتی تھی۔ پھر دیر تک وہ ریوا سے اس ملاقات کے متعلق سوچتا رہا۔ پھر اپنے اسکیچ پر غور کرتا رہا، پھر آتش دان میں بجھتے ہوئے کوئلوں پر اپنی توجہ مرکوز کی، پھر اس خوبصورت ادھیڑ عمر کی مطمئن عورت کے متعلق سوچا اور پھر اس کی سوچ ریوا کی سندر، چمکتی ہوئی شفاف آنکھوں کے گرد گھوم گئی اور وہ ان گہرائیوں میں ہی نہ جانے کب کہیں کھو گیا۔

صبح جب چوکیدار نے دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ ابھی سو رہا تھا۔ اور جب کچھ دیر بعد ریوا، اس کی ماں اور لپو رینا ہاتھ منہ دھو کر تیار ہو گئیں تو وہ ابھی بستر میں پڑا کھڑکی سے نظر آتے ابھرتے ہوئے سورج کو ہی دیکھ رہا تھا۔ بارش سے دھلے ہوئے آکاش کی نیلاہٹ بے حد گہری ہو گئی تھی۔

"اوہو! آپ کو تو اپنا گدا چاہئے ہو گا سامان بندھوانے کے لئے!" وہ رضائی کو پھینک کر ایک دم اٹھ بیٹھا۔ ڈرائیور نے کار کو ٹھیک کر لیا تھا اور وہ لوگ جا رہے تھے۔

"آپ نے یہیں ڈیرا ڈالنا ہے کیا؟" ریوا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں شاید جلدی تیار نہ ہو سکوں۔ اور پھر بس بھی تو دوپہر سے پہلے نہ ملے گی"، شیکھر نے جواب دیا اور بستر میں سے ریوا کا گدا نکالنے لگا۔

"آپ ہمارے ساتھ کار میں چلئے نا" ریوا نے خود گدا نکالنا شروع کر دیا اور شیکھر اسے چھوڑ کر الگ کھڑا ہو گیا۔

اور پھر ریوا اور اس کی ماں نے ڈرائیور سے شیکھر کا بستر بندھوایا، اس کا سامان پیک کرایا اور جب وہ ریسٹ ہاؤس سے باہر نکلنے لگے تو شیکھر نے دس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے چوکیدار سے کہا۔

"میرا اسکیچ مکمل نہیں ہو سکا، میں پھر آؤں گا، میرا انتظار کرنا"

"ہم سب بھی آئیں گے"، ریوا نے کہا، سب ہنس دیئے اور چوکیدار نے تعظیم سے سر جھکا دیا۔

وہ ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور کار اسٹارٹ ہوگئی اور اس کی نگاہوں کے سامنے بے شمار اسکیچ لہرانے لگے اور پھر اسے مہاکوی ٹیگور کی ایک سطر یاد آگئی :-

The world has kissed my soul with its pain asking for its return in songs.

"کیا گنگنا رہے ہیں آپ؟" ریلا نے پوچھا اور شنکر نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ آگے کو جھک کر اور قریب ہوگئی اور جب اچانک کار نے موڑ کاٹا تو دونوں کے سر آہستہ سے ٹکرا گئے۔ پورنیما خاموش رہی لیکن ریلا کی ماں ہنس دی۔

یوں ہوئی تھی ان کے سفر کی ابتدا۔

غیر متوقع، پرکشش اور ناقابلِ فہم۔

ان لوگوں نے پہلے ہی سے ایک ہاؤس بوٹ کرائے پر لے رکھا تھا۔ شنکر نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ کہیں اور ٹھکانہ کرے اور ان کے ساتھ نہ رہے۔ سری نگر میں رہ کر الگ رہنا بھی اسے کچھ اچھا نہ لگا۔ چنانچہ اس نے پہلگام جانے کا ارادہ کر لیا اور جب وہ ان سے جدا ہونے لگا تو ریلا کی ماں ناراض ہوگئی اور اسے ان کے ساتھ ایک رات کے لئے ان کے ہاؤس بوٹ میں آنا پڑا۔ وہ پورے چاند کی رات تھی۔ یہی ایک ایسی رات تھی جب شنکر بے حد بے چین اور اشانت ہوتا تھا۔ یہی ایک رات تھی جب وہ اپنے پر قابو نہ رکھ سکتا تھا، بالکل بے بس ہو کر اپنے آپ کو لمحات کے حوالے کر دیتا تھا۔ پورنیما کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ اس لئے وہ سر منہ لپیٹ کر بستر میں پڑ گئی تھی۔ اس کی طبیعت واقعی خراب تھی یا وہ خواہ مخواہ بن رہی تھی اس پر غور کرنے کے لئے شنکر کے پاس وقت نہیں تھا۔ چاندنی کی خنک لہروں میں بھلا جلن کا کیا کام! وہ، ریلا اور اس کی ماں ہاؤس بوٹ کی چھت پر بیٹھے ہاؤس بوٹ کو جہلم کے پانی سے نکال کر ڈل جھیل میں لے آئے اور پھر ڈل کی لہروں میں ڈھلتے ہوئے چاند اور اس کی کرنوں کا نظارہ کرتے رہے۔

پورنیما نیچے بستر میں پڑی رشک رہی تھی۔

اور ریلا مہادیوی ورما کے گیت سنا رہی تھی۔ کتنی پرسوز تھی اس کی آواز جیسے چاند کی لہریں آپس میں تحلیل ہو رہی ہوں۔ وہ ان لہروں کے اتار چڑھاؤ میں ہکورے لیتا رہا اور چاند کو ڈل کے پانی میں چھنتے دیکھتا رہا۔

پھر ریلا کی ماں نے ستار پر بھاگیشوری بجائی۔ بھاگیشوری اس کا محبوب راگ تھا۔ اس کی انگلیوں میں اب بھی سوئی ہوئی زندگی کو جگانے کی اہلیت موجود تھی۔

اور پھر وہ تینوں وہیں چھت پر ہی سو گئے۔ ریلا اور اس کی ماں تو بخبر واقعی سو گئے تھے پر وہ صرف لیٹا رہا تھا اور آسمان کی وسعت میں تیرتے ہوئے چاند کو دیکھتا رہا تھا اور ارد گرد چھائے ہوئے پہاڑوں کی بلندیوں کو سلام کرتا رہا تھا جیسے ان بلندیوں کا احترام کرنا جیون کی مہانتا کو تسلیم کرنا تھا۔ جیون بھی تو ان پہاڑوں کی طرح ٹھوس اور قدیم تھا۔ اس میں سے نغمہ بکھیرتے ہوئے چشمے بھی پھوٹ نکلتے تھے اور اس کے سینے سے کبھی کبھی ابلتا ہوا مواد بھی بہہ نکلتا تھا اور وہ زندگی کا متوالا تھا، حسن کا جیا تھا اور پورے چاند کی یہ رات بے حد حسین تھی اور اس کی گود میں آرام کرتی ہوئی ریلا کہکشاں کی طرح چمک رہی تھی۔

اس کا جی چاہا کہ وہ اس دھلی ہوئی شفاف رات میں خیام کی رباعیاں گنگنائے۔ وہ اپنے اٹیچی کیس سے کتاب نکالنے کے لئے نیچے اترا

اس نے دیکھا پورنیا بستر سے نکل کر باہر بیٹھی سسک رہی تھی۔ ہائی ہاؤس بوٹ کو ایک طرف لگا کر سو گئے تھے۔ خاموش رات خنکی کا لبادہ اوڑھے اونگھ رہی تھی اور ایک کنواری لڑکی آدھی رات کو نڈھال پڑی رو رہی تھی۔

"آپ رو رہی ہیں، آپ کی تو طبیعت اچھی نہیں" شیکھر نے اس پر جھکتے ہوئے کہا۔

اور پورنیا نے کوئی جواب نہ دیا اور ایک دم اس کے پاؤں میں گر پڑی اور اپنے سرد ہاتھوں سے انہیں دبوچ لیا۔ شیکھر گھبرا گیا اور جب اس نے جھک کر پورنیا کو اُٹھایا تو اس نے اپنا سر اس کے سینے پر ٹکا دیا اور اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

شیکھر نے ملائمت سے پورنیا کو الگ کیا اور کتاب لئے بغیر ہی واپس چھت پر آگیا اور رات بھر چاندنی کے اُبلتے ہوئے سیلاب میں جلتا رہا اور جب رات بھی اس تپش میں جل کر راکھ ہو گئی تو وہ اُٹھا۔ اس نے اپنا سامان سنبھالا اور بنا کسی سے کچھ کہے سُنے کہیں غائب ہو گیا۔

پورنیا کے گالوں پر جمی ہوئی آنسوؤں کی وہ نمی اور ریوا کی آنکھوں میں ڈولتی ہوئی شفق دونوں، دیر تک اس کے ذہن میں محفوظ رہیں ریوا نے دوبارہ جب اسے پکڑ لیا تو پھر وہ اس کے بندھن کو نہ توڑ سکا۔ اس نے اسے اپنے گھر میں ایک عزت، پیار اور خلوص کی جگہ دے دی، اسے اپنی زندگی کا ایک حصہ بنا لیا۔ جب شیکھر کا جی چاہتا وہ خود ہی اس کے پاس آجاتا تھا اور جب ریوا کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی وہ اسے بلا لیتی تھی۔

رضائی کو اپنے گرد لپیٹے دیوار کے سہارے پیٹھ ٹکائے وہ سوچے جا رہا تھا، لمحات کی لہروں سے اُلجھ رہا تھا، اپنی زندگی کے واقعات پر نگاہیں ڈال رہا تھا، اپنے زخم کرید رہا تھا اور پھر اچانک اس کی سوچ کی شمعیں دُھندلا گئیں، لہروں کا تناؤ کم ہو گیا۔ اس کی نگاہیں تھکنے لگیں اور زخموں کی کسک اُونگھنے لگی۔

وہ دیوار کے ہی سہارے سو گیا اور پھر اکبلانے ہی میں ایک بار لڑھک کر پلنگ پر گر گیا۔

اس سمے کلاک نے کمرے کی خاموش فضا پر چھ بھرپور چوٹیں لگائیں۔

اچانک اس کی نیند ٹوٹ گئی۔

اسے یوں لگا جیسے قریب ہی کوئی سسک رہا ہو۔ اس نے پہلو بدل کر دیکھا۔ ریوا اپنا سر پلنگ کی پٹی پر رکھے رو رہی تھی۔ کچھ لمحے اسی طرح دیکھتے رہنے کے بعد اس نے کہا:۔

"مجھے کیوں شرمندہ کر رہی ہو ریوا؟"

"میں اپنے رات کے رویّے پر پشیمان ہوں" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"میں بھی ہوں" شیکھر نے کہا۔

"تمہارے کمرے سے چلے آنے کے فوراً بعد ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور تمہاری چوٹ ـــــ" اس نے زور سے اپنا سر پٹی پر گرا دیا۔

"رجنی سہلانے آئی تھیں؟"

"آج نئے سال کی پہلی صبح ہے شیکھر، پچھلی باتیں بھول جاؤ" اس نے منت بھرے لہجہ میں کہا۔ آنسو اس کی پلکوں پر تھرا رہے تھے۔

"میرے لئے یہ نئے سال کی آخری رات ہے ریوا، میں گذری ہوئی باتوں کو نہیں بھول سکتا، میرا ماضی ہی میری زندگی ہے" شیکھر نے کہا۔

"میری ہی خاطر بھول جاؤ" شیکھر نے ریوا کی طرف دیکھا۔ اس کے گال آنسوؤں سے بھیگ رہے تھے اور ہونٹ بُری طرح کپکپا رہے تھے۔ اس کے دل میں ایک طوفان سا اُبل پڑا۔

"تمہاری ہی خاطر اسے نہیں بھول سکتا ریوا، میرا ماضی تمہیں سے آباد ہے" اس نے اپنی بھرپور نگاہیں ریوا کے چہرے پر گاڑ دیں اور ریوا نے ایک دم بے بس ہو کر اپنے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے گال شیکھر کے خشک ہونٹوں پر رکھ دئے۔ کھُلی ہوئی کھڑکی سے نئی صبح کا اُجالا کمرے کے دھندلکے میں تحلیل ہو رہا تھا۔

نئے سال کی آخری رات
اور اس کی پہلی صبح
دونوں گلے مل رہی تھیں

لیمپ اور یاقوت

انور عظیم

ادریس چونک گیا!

کیا بات ہے۔ یہ آواز کہاں سے آئی۔ کون بول رہا ہے اس رات کے سناٹے میں۔ مجھ سے اتنا قریب اتنے دوستانہ انداز میں۔ بالکل شانے پر ہاتھ رکھ کر، اتنی بے تکلف، اتنی پیاری، اتنی ٹالے نہ ٹلنے والی سرگوشی کے ساتھ۔

اس نے سُرخ روشنائی سے بھیگے ہوئے قلم کو لوہے کی میز پر رکھتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ اس کی نظر پھل کی آڑھت کا طواف کرکے لیمپ پر جم گئی۔

"اچھا دوست تم ہو! بس ابھی سے تھک گئے۔ آنکھیں بوجھل، سانس اُکھڑی اُکھڑی۔ ابھی تو چند صرف گیارہ ہی بجے ہیں" معلوم ہوا کہ لیمپ اپنے یار کی بات سُن کر ایک ٹھنڈی سانس لے رہا ہے اور اس کی چمنی سے اُداسی کا دھواں سنہری چمک کے ساتھ اُوپر اٹھ رہا ہے۔

اس کے لبوں میں ہلکا سا پھیلاؤ پیدا ہو گیا۔ ایسا لگا کہ ہونٹوں پر جمی ہوئی راکھ کی سطح کھرچ دی گئی ہے اور اس میں سے ہلکی ہلکی نمی چھلکنے لگی ہے۔ اس نے اپنی زبان کو لبوں پر پھیر کر ایک بار پھر آڑھت کا جائزہ لیا۔ چوکیدار آہستہ آہستہ باہر ٹہل رہا تھا۔ اس کے موٹے تلے والے بُوٹوں کی کھٹ کھٹ اس کی پہریداری کی گواہ بن کر اُبھر رہی تھی۔ کیلے، سنگترے، مسمّی، سیب، ناخ اور بہت سے دوسرے پھلوں کے ڈھیر الگ الگ خانوں میں بٹے ہوئے خراٹے لے رہے تھے۔ پھلوں کے انبار دن بھر کی الٹ پلٹ کی تھکن اتار رہے تھے۔ ادریس کی سُرخ جالوں سے بھری ہوئی آنکھیں جاگ رہی تھیں، لیمپ جاگ رہا تھا اور چوکیدار کے جوتے جاگ رہے تھے۔ ان کی آواز اُبھرتی اور ایسا لگتا جیسے رات کے سیاہ سینے میں کیلیں پیوست کی جا رہی ہیں۔ جب چوکیدار کے بُوٹ کی کھٹ کھٹ ذرا دُور ہو گئی تو پھر دوبارہ وہ قلم اٹھا کر زرد کھاتوں پر جھک گیا۔ اس نے اپنی عینک کی کمانی کو کریدنا شروع کیا اور ساتھ ہی گنتی کی بڑبڑانے کی آواز پھل کی آڑھت میں اُبھرنے لگی۔

"دو سو دس، دو سو دس، ایک ہزار پچیس......!"

لیمپ کی آواز پھر اُبھری۔ وہ اپنی گنتی بھول گیا۔ اس نے اب کے جھنجھلا کر قلم کو میز پر پٹک دیا "میں تو تنگ آ گیا۔ کیا بکواس ہے" لیمپ اپنی تھکی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا "نسیمہ تمہاری پھٹی ہوئی قمیص میں پیوند لگا رہی ہے۔ انتظار کی وجہ سے اس کی آنکھیں سُوج گئی ہیں۔ تمہارے دونوں بچے ایک دوسرے سے لپٹ کر سو چکے ہیں۔ نسیمہ بار بار میلے دسترخوان میں چھپی ہوئی روٹی کی پلیٹ اور دال کی طرف دیکھ رہی ہے۔ دسترخوان کے نیچے دبی ہوئی اس نعمت کو بھی تمہارا انتظار ہے۔ تم جانتے کیوں نہیں۔ تم جانتے کیوں نہیں۔ گلی کے نکڑ پر پاگل کتا بڑی رقت کے ساتھ گا رہا ہے اور تمہاری نسیمہ کتنا ڈر رہی ہے۔ تم جانتے کیوں نہیں۔ نسیمہ کہہ رہی ہے، کتا رو رہا ہے۔ خدا پناہ۔ اس کا دل سینے سے اُچھل کر دونوں بچوں کے پاس پہنچ گیا ہے اور کہہ رہا ہے۔ ان کو ہر آفت سے بچائیو!"

آڑھت کا دروازہ کھلا اور چوکیدار اندر آ گیا۔ وہ بہت قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ڈنڈے پر ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ اس کی نیپالی مونچھیں جھکی ہوئی تھیں اور اس کی نیلی نیکر پر اس کا نیپالی چھرا آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔

"کیوں منشی جی تم کو بھوک لگی ہے ؟"

اتنے دنوں میں پہلی بار بیرنیپالی چوکیدار اس سے اتنی محبت کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ وہ اس کو حیرانی اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتا رہا۔

"کیوں منشی جی پھل کھاؤ گے ؟"

ادریس نے ایک بار پھر اپنے لبوں کو زبان سے ترکیا اور کھانستے ہوئے بولا "نہیں" اور ایک تنگڑی سی جماہی آتے آتے رُک گئی۔

چوکیدار واپس چلا گیا۔ اس کے بُوٹوں کی کھٹ کھٹ دُور ہوتی چلی گئی۔ اور ادریس پھل کے ڈھیروں کو دیکھتے دیکھتے اونگھنے لگا۔

لیمپ پھڑکنے لگا۔ ادریس نے کان مروڑ کر اسے بُجھا دیا۔ لیکن چمنی سے سنہری زبان کا سرا اب تک تھرتھراتا نظر آرہا تھا جس کا رنگ آہستہ آہستہ سُرخی مائل ہوتا جا رہا تھا۔

"اچھا، اچھا دوست میں اب جاتا ہوں نسیمہ واقعی انتظار کر رہی ہے۔ گلی میں سناٹا ہے اور پاگل کتا رو رہا ہے اور وہ ڈر رہی ہے"

وہ باہر نکلا تو چوکیدار آڑھت کا دروازہ بند کرنے لگا۔ اس نے بڑے تالے کے دانت کو جھٹکتے ہوئے کہا:

"بیڑی بھی نہیں پیو گے ؟"

اس نے بیڑی لے لی اور اس کے کش لگاتا ہوا ٹرام کی پٹڑیوں سے آگے تیز تیز چلنے لگا۔

★

نسیمہ کی آنکھیں بار بار چندھیا جاتی تھیں اور نگاہوں میں دُھند سی بھر جاتی تھی۔ اس نے کئی بار چراغ کی مریل روشنی میں سوئی میں تاگا پرونے کی کوشش کی لیکن ہر بار تاگے کی نوک سوئی کے سُوراخ کے پاس سے پھسل پھسل گئی۔ آخر تنگ آ کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور زرد قمیص کو اٹھا کر دیکھنے لگی۔ ابھی تو قمیص مرمت کرنا تھا۔ لیکن اب کل صبح۔ توبہ ہے میری۔ ادریس اب رات بھر کیا کرتا رہتا ہے۔ کیا ہو گیا ہے اسے چند دنوں سے۔ صبح جاتا ہے اور رات گئے منہ دکھاتا ہے۔ گھر میں بھی جتنی دیر رہتا ہے گھبرایا گھبرایا۔ بالکل رونی صورت نکالے ہوئے۔ کیا ہو گیا ہے اسے۔ بچوں سے بھی بات کرتا ہے تو بالکل بہکے بہکے انداز میں۔ اس کا بچوں سے کھیلنا، قہقہے لگانا اور کبھی میری رانوں میں، کبھی میرے گالوں میں میری چٹکیاں بھر لینا — اب تو وہ یہ سب کچھ بھول گیا ہے۔ اس کی عادت بدلتی کیوں جا رہی ہے۔ پہلے بھی تو یہی غربت تھی، یہی بیماری، یہی کوفت لیکن اس کا منہ تو کبھی میلا نہیں ہوا۔

اس نے اپنی بڑی بڑی غم زدہ آنکھوں سے ایک بار پھر دروازے کی طرف دیکھا۔ لیکن وہاں تو آہٹ بھی نہیں تھی۔ ادھر چار پانچ رات سے لگاتار جب دُور سے کتے کے بھونکنے کی آواز آتی تھی تو وہ سمجھ جاتی تھی کہ اب ادریس تھکا ماندہ آرہا ہے۔ لیکن آج تو ابھی کتا بھی بھونک نہیں رہا ہے۔ کیا گڑبڑ ہوئی۔

اس نے ایک بار بچوں کی طرف دیکھا۔ ربو اور جیلانی دونوں ایک ہی پلنگڑی پر ایک دوسرے پر ٹانگیں پھیلائے اور ہتھیلیوں کے درمیان منہ کو دبائے سو رہے تھے۔

جب نسیمہ نے چراغ اٹھایا اور دروازے سے گردن نکال کر گلی کے تاریک سناٹے میں گھورنا شروع کیا تو اس کی غم زدہ آنکھوں میں چراغ کی پھڑکتی ہوئی لَو آہستہ سے زمی کے ساتھ لہرانے لگی۔ اس کی کھڑی ناک کا ترچھا سایہ اس کے بائیں گال پر پھیل کر نکیلی پلکوں پر سے ہوتا ہوا کنپٹیوں تک پہنچ گیا تھا۔ اس کی کلائیاں ننگی تھیں۔ لیکن بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی میں ایک چاندی کا چھلا پڑا ہوا تھا۔ اس کا بلاؤز بہت ڈھیلا تھا جس سے اس کے دُبلے اور کمزور جسم کا ڈھیلا پن اور بھی ظاہر ہو رہا تھا۔ چراغ کی لَو اور زور سے پھڑپھڑانے لگی۔ چراغ بجھ گیا تو غضب ہو جائے گا۔ گھر میں ایک تیلی بھی نہیں۔ اوہ ادریس اب آ کیوں نہیں چکتا۔ آج میں اس سے لڑ جاؤں گی۔ چپ کیسے کب تک اس طرح دُکھ سہتی رہوں گی۔ پاگل آدمی گھن لگائے دے رہا ہے اپنی جان کو!

کہنے کی ہمت ابھری لیکن وہ کہہ نہ سکی۔ وہ اپنے خیال میں بالکل کھوئی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں اس وقت اپنے بچوں پر گڑی ہوئی تھیں اور اس وقت اس کا پورا دل اچھل کر اس کی آنکھوں میں آ گیا تھا۔ اس دل میں بڑی حسرت تھی، بڑی تلخی، بڑی نامرادی۔

ادریس کمرے میں داخل ہوتے ہی چپکے سے اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ چارپائی کی چرخ چوں سے وہ چونک گئی۔ لو ادریس تو یہ رہا۔

"کیوں جی یہ تم نے کیا دھندا شروع کیا ہے۔ اتنی دیر کہاں اٹک جاتے ہو آج کل۔ کون سے پہاڑ ڈھائے جا رہے ہیں۔ کچھ میں بھی پوچھ سکتی ہوں؟"

نسیمہ نے اپنی آواز میں واقعی غصہ پیدا کرتے ہوئے ذرا تلخ لہجے میں پوچھا۔

ادریس نے نسیمہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور آہستہ آہستہ اس کی ہتھیلی کو اپنی ہتھیلی سے سہلانے لگا۔ نسیمہ کو اس کی ہتھیلی گرم معلوم ہوئی۔ وہ فوراً اس پر جھک گئی۔ اور اپنے آنچل سے اس کی پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگی جس پر بخار کی وجہ سے رگیں تن گئی تھیں۔ اس کا منہ ادریس کے منہ پر اتنا جھک آیا تھا کہ اس کی پلکیں اس کے نتھنوں کی آگ میں جھلس رہی تھیں۔

وہ دونوں دیر تک خاموش رہے۔ ادریس نے اپنی آنکھیں اتنے زور سے بند کر رکھی تھیں کہ اس کی آنکھوں کے دونوں کناروں پر جھریاں بھنور کی طرح تڑپ رہی تھیں اور اس کے ہونٹ بار بار زبان پھیرنے کے باوجود خشک ہو جاتے تھے۔

کمرے میں ایک طرف بجھا ہوا چولہا اونگھ رہا تھا۔ وہیں پر بچوں کے کچھ مٹی کے کھلونے رکھے تھے۔ کھانے کے برتن میں ادریس کا کھانا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

"نسیمہ تم کھانا کھا لو۔" ادریس نے اسی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے کہا۔

"نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔ صبح سے پیٹ میں میٹھا میٹھا درد ہو رہا ہے"

ادریس نے فوراً اپنی آنکھیں کھول دیں "دیکھو یہ چار سو بیسی نہیں چلے گی۔ میٹھا میٹھا درد ہو یا کڑوا کڑوا درد ہو! کھانا تو کھانا ہی پڑے گا۔ نہیں تو میں کھا لوں گا کھانا اور جانتی ہو پھر ایسا پلنگ سے لگوں گا، ایسا پلنگ سے لگوں گا کہ مہینوں کے لئے اچھا خاصا نواب بن جاؤں گا"

ادریس نے زبردستی دھکیل کر نسیمہ کو کھانے پر بٹھا یا۔ جس طرح سے نسیمہ کھا رہی تھی اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ زبردستی زہر مار کر رہی ہے۔

"کیوں جنید آج بھی غائب ہے اب تک؟"

"ہاں!" نسیمہ نے ہاتھ روکتے ہوئے اور ایک نظر اپنے بچوں پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"لونڈا بالکل لوفر نکل گیا۔ سنا ہے وہ اب سینما میں بلیک مارکٹ میں ٹکٹ بیچ کر منافع کمانے لگا"

"تو وہ کیا کرے۔ اسکول کا انتظام نہیں۔ تو وہ کیا کرے۔ لیکن کل وہ آ گیا تو اسے سمجھاؤں گی۔ لڑکا بڑا پیارا ہے لیکن......"

"بالکل پیارا نہیں۔ نہایت آوارہ ہے۔ میں تو اس کی ہڈی توڑ دوں گا، ذرا ہتھے تو چڑھے" ادریس نے دانت پیس کر کہا۔

وہ آنکھیں بند کئے اسی طرح جنید کے بارے میں سوچتا رہا اور دانت پیستا رہا۔

نسیمہ اس کے سرہانے بیٹھی اس کا سر دباتی رہی۔ وہ سر دباتے دباتے اونگھ جاتی اور اپنا منہ ادریس کے منہ پر رکھ دیتی اور اس کی پلکیں اس کے تپتے ہوئے رخساروں میں چبھنے لگتیں۔ یہاں تک کہ دور سے اذان کی آواز آئی، اور صبح کی شفٹ میں کام کرنے والے کلاتھ ملز کے مزدوروں کی ٹولیوں کے چلنے اور زور زور سے بونس اور ہڑتال کے بارے میں گفتگو کرنے کی آواز سڑک پر تیرنے لگی۔

صبح کی ہوا میں نکلتے اکتوبر کی خنکی نے بڑی لطافت پیدا کر دی تھی۔

بچوں نے کروٹ لی اور ایک دوسرے کی طرف سے منہ پھیر کر سو رہے۔ ادریس نے بھی کروٹ بدل لی تھی اور اب نسیمہ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر

بے خبر سو رہی تھی۔ البتہ ادریس اپنی ہتھیلی سے اس کی ہتھیلی کو سہلا رہا تھا۔ اس وقت اسے خاصی سردی لگ رہی تھی اور وہ آہستہ آہستہ لرز رہا تھا۔

★

نسیمہ اور ادریس کی زندگی دس سال سے ایک ساتھ گذر رہی تھی۔ اس زندگی میں بہت کم تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ شروع میں تو اس کے اندر رفتار کا اندازہ ہوتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ رفتار دھیمی پڑتی گئی یہاں تک کہ ایک زمانہ ایسا آیا جب ان کی زندگی ایک ٹھہری ہوئی برف کی جھیل کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا لیکن یہ سب اوپر سے نظر آتا تھا۔ اندر ہی اندر جھیل کے سینے میں ایک بے چینی اور تڑپ محسوس ہوتی تھی۔ دونوں اسے محسوس کرتے تھے لیکن خاموش رہتے تھے۔ پہلے ادریس کبھی کبھی نسیمہ کو چھیڑتا تھا "کیوں نسیمہ! مجھ میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ تم نے اس امیر اور شریف آدمی کو چھوڑ کر مجھ سے شادی کر لی؟"

"اس لئے کہ مجھے نکمے آدمی پسند ہیں" وہ اس کی طرف بڑے پیار سے دیکھ کر کہتی۔

پانچ سال تک نسیمہ کی گود ہری نہیں ہوئی۔ اسے فکر ہونے لگی۔ ایک دن کہنے لگی "سنتے ہو میں ذرا ایک دن بڑے پیر کی درگاہ پر جا کر سوچتی ہوں کچھ نذر نیاز کراؤں"

اس وقت ادریس ایک پرانا اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ اپنی چارپائی پر پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا اور سرہانے سے اپنا سر باہر نکال کر اور اخبار کو میلے فرش پر پھیلا کر اشتہار کے کالم دیکھ رہا تھا۔

"میں سوچتا ہوں کیا میری زندگی ساری کی ساری اسی اناپ شناپ بینک میں بیت جائے گی۔ میں تو یہاں کے کام سے اُکتا گیا ہوں۔ کیوں نہ جوگی بن کر کسی جنگل کی طرف نکل جاؤں"

"اور میں نے جو کہا کچھ سنا تم نے؟" نسیمہ نے اپنی دونوں کہنیاں اس کی کمر پر اس طرح ٹکا دیں کہ وہ اُچھل کر بیٹھ گیا۔ ادریس نے اس کی گردن پکڑ لی اور آہستہ آہستہ دبانے لگا۔

"مار دو۔ مجھے مار دو۔ بیوقوف ——" وہ کہتی جاتی تھی اور ساتھ ہی گردن کی گدگدی سے دوہری ہوئی جاتی تھی۔

"اچھا تو میں بے وقوف ہوں۔ بے وقوف نہ ہوتا تو پھر" سانس روک کر اور اس کی گردن کو ہلکا سا جھٹکا دے کر کہتا "یہ ڈھول اپنی گردن میں کیوں ڈال لیتا؟"

"دیکھو جی میں ایسے طعنے برداشت نہیں کر سکتی" نسیمہ نے واقعی منہ پھلا لیا اور فوراً فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹ گئی۔

ادریس دوبارہ اشتہار کے کالم دیکھنے لگا "میں چاہتا ہوں کہیں اسکول کی ماسٹری مل جائے بس کام ہی بن جائے۔ یہ بینک کی نوکری۔ اُف! جنگل بھی اتنا بھیانک نہیں ہوتا" اس نے دل ہی دل میں بات کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب نسیمہ نے دیکھا کہ ادریس پر اس کی ناراضگی کا کوئی اثر نہیں ہوا تو وہ اور بے چین ہوئی۔ وہ پھر اسے مخاطب کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اپنی شکست کا اعلان کرتے ہوئے وہ ہچکچا رہی تھی۔ اسی زمانے میں اس کے چہرے کی رونق کافی بجھ چکی تھی۔ لیکن ابھی اس میں ایک ملیح نرمی باقی تھی اور لبوں کی نیم وا کیفیت میں بڑی کشش تھی۔ جب وہ آنکھیں بند کرتی تو معلوم ہوتا کہ سیاہ ریشم کی چمکیلی جھالر اس کے رخساروں پر اُترتی چلی آ رہی ہے۔

لیکن اس وقت اسے اس احساس سے بڑی کوفت ہو رہی تھی کہ ادریس نے اس کے اتنے اہم سوال کو خاموشی سے ٹال دیا تھا اور اب اتنے مزے میں اخبار پڑھ رہا تھا۔ جیسے اس کا وجود ہی نہیں، جیسے اب اس کے گالوں کی معصوم شگفتگی میں کوئی بات ہی نہ رہ گئی ہو، جیسے کہ اب اس کے لب تبسم وا نہ ہوں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے ہوں جیسے قبر کا منہ جس پر دستک بھی کوئی اثر نہ ڈال سکے۔ اور میری پلکیں۔ اور میری پلکیں —— ادریس نے اپ

زندگی میں سب سے پہلا بوسہ ان پلکوں ہی پر تو ——— اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور اس کی پلکیں ریشم کی سیاہ جھالر کی طرح رخساروں پر آ گئیں جن کا رنگ ہلدی کی طرح زرد اور افسردہ تھا۔

"آگ لگے اس اخبار کو،" نسیمہ نے کروٹ بدلتے ہوئے اخبار پر آگ برسا دی۔

"خاتون! کیا آپ کو بہت سخت زکام ہو رہا ہے؟"

"نواب صاحب! کیا آپ کا دماغ خراب ہو رہا ہے؟" نسیمہ بالکل لڑنے کے موڈ میں اُٹھ بیٹھی۔

ادریس اسی طرح اخبار پر جھکا رہا۔ اب اس کی آنکھیں فلمی اشتہار پر ناچ رہی تھیں۔ ننگی ٹانگیں، ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ پر اڑتا ہوا گھوڑا، عورت کو گود میں اٹھائے ہوئے ڈاکو، اکیلا سینکڑوں تلواروں میں گھرا ہوا تلوار کا دھنی ہیرو ——— وہ تصویریں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"نواب تم میری بات کا جواب بھی نہیں دیتے۔ میں اتنی بری ہوں نا! کیوں نہیں کتنا پچھتاوا ہے بے چارے کو۔ ہائے کیا منہ نکل آیا اتنا سا اس غریب کا!"

ادریس بالکل سنجیدہ ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی ٹھوڑی کو اپنی انگلی سے کھجلاتے ہوئے کہا "نسیمہ! تم بہت پیاری ہو۔ لیکن اب تمہاری باتوں میں اتنا زہر کیوں گھلتا جا رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا بات ہے تم مجھ سے لڑنے پر کیوں تلی رہتی ہو!"

"میں لڑنے پر تلی رہتی ہوں۔ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے"

ادریس نے اپنی چھوٹی مگر شرارے کی طرح سُلگتی ہوئی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

"تم مجھ سے تھک تو نہیں گئی ہو۔ ٹھیک ہے میرے پاس ہے ہی کیا۔ میری غربت کا کانٹا ذرا تیز چبھتا ہوگا۔ برساتی نالے کا بہاؤ برسات کے بعد کم ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی تو گرمیوں میں بالکل خشک ہو جاتا ہے۔ پھر تو پانی کا نہیں دھول کا دریا بہتا ہے۔ دھول کا دریا!"

نسیمہ کے زرد چہرے کا رنگ اور زرد ہو گیا۔ پیپل کا خشک پتہ۔ خزاں کی آگ میں جھلسا ہوا۔ بے رنگ، بے چمک۔ ادریس نے اپنی زندگی میں پہلی بار اتنی تکلیف دہ بات اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتار دی تھی۔ نسیمہ کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور وہ ادریس کی جھنجھلاتی ہوئی آنکھوں کو گھورے جا رہی تھی۔ اس کا جسم لرز رہا تھا اور آہستہ آہستہ ادریس کا چہرہ دھندلا کر آنسوؤں کے کہرے میں چھپ گیا۔

وہ رات ان کی زندگی میں پہلی بار ڈراتی ہوئی تلوار کی طرح اتر گئی تھی۔ تلوار کے زنگ کی طرح ان کی یادوں کا زنگ بھی اس رات لہو میں بہہ گیا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش، تھکے ہوئے، گھٹے ہوئے ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ صدمہ یاد کے شیشے میں بجلی کی چمک پیدا کر دیتا ہے۔ یادیں وہ جو خوبصورت تھیں اور دودھ کی طرح جھاگ پھینک رہی تھیں اور وہ یادیں جو کالی اور بکروہ تھیں۔ دونوں پر چھائیاں اُبھر رہی تھیں، ڈوب رہی تھیں۔

★

دس سال پہلے، جب گاؤں سے خزاں کی زردی رخصت ہو رہی تھی اور ہواؤں میں بہار کی خوشبو بس گئی تھی اور پوکھر کے منڈیروں پر اداس پیڑ ہرے پتوں کا لباس پہننے لگے تھے۔ آسمان دھلا ہوا تھا اور رات کے سناٹے میں جھینگر کے گیت گونج رہے تھے اور آکاش کے نیلے سمندر میں سونے کا غبار اڑ رہا تھا، ادریس اپنے خیال میں مگن تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا، بچھڑی ہوئی پگڈنڈیوں پر لپک رہا تھا۔ اس کے بستر اور ایک ٹین کے بکس کا بوجھ لئے ہوئے بیگار بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ ادریس اب گاؤں کی سرحد میں تھا اور کہیں کہیں روشنی کے بے قاعدہ داغ لرزتے ہوئے نظر آ رہے تھے اور ساتھ ہی کسی کے للکارنے اور پکارنے کی آواز بھی بلند ہو رہی تھی۔

"ہوا ہو ہو ہو —"

ادریس کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے ململ کے کُرتے کی آستین سے اپنی گردن کا پسینہ پونچھا اور بیگار کا انتظار کرنے لگا۔ بیگار بڑھا تھا اور وہ ہلکا پھلکا سا سامان بھی اس کی طاقت سے زیادہ تھا۔ وہ ایک ہیولے کی طرح ایک اونچے ٹیلے سے اتر رہا تھا اور اب وہ جھکے جھکے کھجور کے درختوں سے آگے نکل آیا تھا۔ ادریس گھر پہنچنے کے لئے بے چین تھا۔ اس کا دل گلے میں آ آ کر اٹک جاتا تھا۔

جب وہ گھر پہنچا تو اندر سے بہت سی چہ میگوئیوں کی آوازیں آ رہی تھیں وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ البتہ امام باڑے سے ان کے شریفہ اور کیلے کے پیڑ اندھیرے میں بہت بھیانک اور ڈراؤنے نظر آتے تھے کسی گھر میں بڑی روشنی ہو رہی تھی۔ اس نے اس کا کوئی خاص خیال نہ کیا۔ قلی کے پیسے دے کر چھٹی ہوئی تو اس نے ایک بار اور اپنے کرتے کی آستین سے اپنی گردن اور چہرے سے نمکین سی نمی دور کی اور بے دھڑک اندر گھس گیا۔

اس کی ماں آنگن میں چارپائی بچھا کر چند بڑی بوڑھیوں میں بیٹھی اس کی بہن سکینہ کو ڈانٹ رہی تھی۔

"اری! یہ باتیں کنواریوں کے سُننے کی نہیں۔ کان میں پھوڑے نکل آتے ہیں کم بخت۔ ان پھوڑوں میں شیطان کا گھر بن جاتا ہے نیک بخت!" وہ از سرِ نو گاؤں کی دوسری ہم عمر عورتوں سے مخاطب ہو کر اپنی باتوں میں لگ گئی —— "ایسا تو اس گاؤں میں آج تک نہیں ہوا تھا۔ ناک کٹ گئی۔ ہائے سانپ کے پاؤں پیٹ میں ہوتے ہیں، سُنا تھا، آج دیکھ لیا بہن۔ سکینہ لالٹین پاس رکھ کر کچھ کروشیا کا کام کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پتلیوں پر تھیں لیکن اس کے چہرے کی کڑواہٹ سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اندر ہی اندر کڑھ رہی ہے۔ اس کی ماں کی نظر جب اپنے لال پر پڑی تو بالکل پاگل کی طرح وہ اُچھل پڑی اور لپکتی ہوئی ادریس کی طرف بڑھی۔ اس کی سفید ساری کا پلّو زمین پر جھاڑو پھیرتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے گھسٹتا رہا۔ سیم کی بیلوں میں سے کوئی چیز اُڑی اور پھڑکارتی ہوئی چھپر کے اُوپر سے کھیت کی طرف نکل گئی۔

دوسری عورتوں نے بھی لالٹین قریب لاکر اس کو اپنی گہری آنکھوں سے دیکھا، دعائیں دیں اور ادریس کی ماں پر رشک کی نظر ڈالتی ہوئی اپنے اپنے گھر چل دیں۔

روغنی روٹی اور انڈہ کھا کر وہ اپنی بہن سکینہ کی کجلائی ہوئی آنکھوں میں نیند بھری دیکھ کر کہنے لگا "میری بہن بے چاری تھک گئی بالکل، کچی لکڑیوں نے تو اس کی آنکھوں کو گلابی کر دیا۔ بڑا دھواں ہوتا ہے اماں!"

"دھت بھیا بھی بناتے ہیں۔ کہاں کا دھواں کہاں کی نیند۔ آج تو لطیفے سُناؤ بھیا۔ بہت دن ہو گئے پیٹ میں بل پڑے ہوئے" سکینہ بالکل اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کے منہ سے اتنا قریب کہ انڈے کی بو اس کے نتھنوں میں رینگنے لگی۔

"تو بیٹے اب تو بی اے پاس ہو جائے گا۔ کب نتیجہ نکلے گا۔ تو ابھی سے کہیں نوکری کے لئے عرضی کیوں نہیں بھیج دیتا!" بٹیا سُنے یا نہ سُنے وہ اپنے مشوروں سے باز نہ آئی۔ سکینہ نے دو تین لطیفے سُنے، خوب ہنسی "لیکن بھیا آج تم جی لگا کر لطیفے نہیں سُنا رہے ہو۔ پھیکے، بالکل پھیکے" اور اس نے اُدھر کو کروٹ لے لی اور اسی کروٹ اس کی صبح ہو گئی۔

صبح تک ادریس کو نیند نہ آئی، اسے بار بار خیال آ رہا تھا کہ نسیمہ کی برات صرف اس لئے واپس چلی گئی کہ جہیز میں کمی کر دی گئی تھی اور لڑکی والے چالیس ہزار سے کم مہر پر اپنی بیٹی بیاہنے کو تیار نہ تھے۔ کتنی بے وقوفی کی بات ہے۔ جہالت اور بدتمیزی کی بات۔ چاند کا رنگ سفید ہوتا جا رہا تھا۔ چھپر پر سیم کی بیلوں میں کچھ سرسراہٹ سی ہو رہی تھی۔ اس وقت ہوا تیز ہو گئی تھی۔ ادریس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں لیکن اس وقت اس کی آنکھوں میں نسیمہ کی پچھلی ملاقات کی تصویر اُبھر رہی تھی۔ چھوٹی سی لڑکی، نو دس سال کی۔ آنکھیں پھڑپھڑاتی اور دانت سے آستین کی کف نوچتی ہوئی اور شریفہ کھا کر بیج اسکی طرف

پھینکتی ہوئی اور ادریس کے غرّانے پر آنکھیں میچ کر اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتی ہوئی اور اس وقت اس کی دُم کٹی چوٹی ہوا میں گلہری کی دم کی طرح لہراتی ہوئی، یہی آخری تصویر تھی جو بار بار اس کی آنکھوں میں اُبھر رہی تھی۔ اس کے بعد وہ شہر چلا گیا تھا اور ٹیوشن کر کر کے بڑی تکلیف سے اپنی تعلیم کے دن پورے کر رہا تھا اور جب وہ تعلیم کا سفر ختم کر کے گھر آیا تھا تو دس سال کے بعد نسیمہ کی جوانی کی کوئی تصویر، کوئی خاکہ اس کی آنکھوں میں جلا پانے سے انکار کر رہا تھا۔ اس دوران میں وہ پردہ کرتی رہی تھی۔ آخر کار وہی نو دس سال پہلے کی تصویر اپنی آنکھوں میں بسائے ہوئے وہ سو گیا۔ لیکن ادھر اسے نیند آئی اور اُدھر ڈربے سے ایک جوانمرد مرغے کی بانگ نے پورے ماحول میں نئی لہری دوڑا دی۔ لیکن یہ بانگ اس جوانمرد کی آخری بانگ تھی۔ اس لئے کہ اس دن سورج نکلتے ہی ادریس کی ماں نے اپنے بیٹے کے آنے کی خوشی میں اسے بڑی دھوم دھام سے سفرِ آخرت پر روانہ کر دیا تھا۔

نتیجہ نکلنے کے بعد جب بڑی مشکل سے اسے ایک بینک میں کلرکی مل گئی تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے دوسرے ہی مہینے ضد کر کے نسیمہ سے شادی کر لی۔ اسے اپنے ساتھ ہی کلکتہ چلا آیا۔ سال میں ایک دوبارہ گاؤں چلا جاتا۔ ساتھ ہی نسیمہ بھی جاتی۔ کچھ دنوں بعد سکینہ کی شادی ایک تاڑی باز بوڑھے کاشتکار سے ہو گئی جس کی ایک بوڑھی بیوی موجود تھی اور جو بانجھ ہونے کی وجہ سے اپنے شوہر کی گالیوں کی بوچھاڑ سہا کرتی تھی۔ اس کے بعد ہی گاؤں میں کالرا نے اس کی ماں کو اس سے چھین لیا اور اس کا رشتہ گاؤں سے کٹ گیا۔

کلکتے کی مشینی گھٹی ہوئی زندگی میں وہ بھی اپنی بیوی کے ساتھ مشینی زندگی گذار رہا تھا۔ پانچ سال کے بعد ان کے ایک لڑکی پیدا ہوئی اور اس کے ایک سال بعد ایک لڑکا۔ ان کے علاوہ ایک یتیم بھتیجے کی دیکھ بھال بھی اس کے ذمہ تھی۔ اس کا کام بازار سے سودا لانا اور دوڑ دھوپ کا کام کرنا تھا۔ اور جب نسیمہ کھانا پکاتی ہوتی یا کپڑے دھوتی ہوتی تو بچوں کو قلابازیاں کھا کھا کر بہلانا اور ہنسانا!

★

رات بھر کے بخار کے بعد جب اس دن ادریس نے آنکھ کھولی تو سویرا ہو رہا تھا اور اب تک نسیمہ عجیب طرح سے مڑی ہوئی اس کے سینے پر سر رکھے ہوئے بھاری بھاری سانس لے رہی تھی۔ بچے اسی طرح سوئے ہوئے تھے۔ کھڑکی سے باہر کی دنیا جاگتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ہر طرف سے دھوئیں کی ہلکی اور بھاری تہیں پھیل اور سمٹ رہی تھیں۔

ادریس نے بڑی محبت سے نسیمہ کے چہرے کو پلٹ کر سامنے کیا۔ اس کے منہ سے رال کی ایک لکیر لپکی اور گردن تک دوڑتی چلی گئی۔ اس نے آہستہ سے اس کی پیشانی کو چوم لیا اور چپکے سے اُٹھ بیٹھا تاکہ نسیمہ کی نیند خراب نہ ہو۔ اس کا بچہ جاگ گیا تھا اور کچھ کھانے کے لئے رو رہا تھا۔ جب ادریس نے رات کی بچی ہوئی روٹی کا ایک ٹکڑا اسے دیا اور اسے پیار کرنے کے لئے جھکا تو بچہ ہنسنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ لیکن وہ بے تحاشا ہنس رہا تھا اور کہے جا رہا تھا "ابا! ابا!"

ادریس کی گردن میں ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہوئی اور کھانسی کی خلش ہوئی۔ وہ لپک کر کونے میں مٹکے کے پاس بیٹھ گیا جہاں چھوٹی سی نالی کے پاس برتن دھوئے جاتے تھے۔

چائے کی باسی خشک پتیوں پر اس کے بلغم کے ساتھ خون کا ایک ڈھیلا بھی جم گیا۔ اس ہفتے میں یہ تیسرا حادثہ تھا۔ وہ یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ ہو سکتا ہے گردن کی رگ پھٹ گئی ہو۔ زکام کے بعد اکثر ہوتا ہے۔ لیکن جب تیسری بار خون آیا تو اس کا سر چکرا گیا۔ اسے پچھلے دنوں زکام بھی تو نہیں ہوا۔ جیسے جیسے وہ سوچتا جاتا تھا اس کے چہرے پر ایک بھیانک اندھیرا پھیلتا جاتا تھا۔ آنکھیں بجھتی جاتی تھیں اور اب اس نے محسوس کیا کہ اس کے سینے میں درد کے بگولے اُٹھ رہے ہیں اور ہزاروں سوئیوں کی طرح پھیپھڑے میں ڈوبتے تیرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس نے اپنے

اطمینان کے لئے پھر ایک بار تھوک کر دیکھا۔ جلے ہوئے خون کی رگیں بلغم کی چکناہٹ پر کھر کھرا رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ارے صبح ہی صبح منہ دھوئے بغیر روٹی چبانے لگا شریر!" اس کی بیوی کی نیند کی ماتی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی بچے کے ہنسنے کی

"میرے بچے! تیری ہنسی بہت جلد بیتیم ہو جائے گی ـــ اور تم میری نسیمہ! اب تم کبھی مجھے چوڑیاں نہ خریدنے پر ٹھنے نہ دو گی ـــ!"

اس نے جلدی سے گھڑے کا سارا پانی نالی کے آگے انڈیل کر چائے کی پتیوں کے ساتھ بلغم کے ڈھیلے بہا دئیے۔ جو پانی بچا منہ پر ڈال کر پھر کمرے میں آ گیا۔ اب وہاں سورج کی روشنی بھر گئی تھی اور روشنی کی پچکاری میں گرد اڑتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

نسیمہ نے انگڑائی لی اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ ادریس نے اس کے پلّو سے منہ پونچھ کر اس کی طرف یوں دیکھا جیسے سمندر میں ڈوبتا ہوا آدمی ساحل کو دیکھتا ہے۔

"کیوں تم نے ننھے کو باسی روٹی کیوں دے دی۔ بڑے آئے پیارے سے ابا کہیں کے۔ تم نے اس کا منہ بھی نہیں دھلایا۔ چھ ہوا!"

"منہ بھی باسی، روٹی بھی باسی!" ادریس نے اپنے دانت نکال دئیے۔

"آج تم دفتر تو نہیں جاؤ گے نا۔ رات کتنا بخار تھا۔ ایک دن کی چھٹی لے لو" نسیمہ نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیوں کو دوڑاتے ہوئے کہا۔

"دفتر تو جانا ہی پڑے گا" ادریس نے ایک گھٹی ہوئی مسکراہٹ کو ابھارتے ہوئے کہا

"تم ہمیشہ اسی طرح اپنی صحت کا خون کرتے رہے ہو۔ آخر تم اپنی چھٹیوں کا اچار تو نہیں ڈالو گے"

"ہاں چھٹیوں کا نہیں تو اپنا اچار تو ضرور ڈالوں گا"

یہ کہہ کر اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ قہقہہ کیا تھا پتیل کے ٹوٹے ہوئے برتن کی جھنکار تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ کچھ عجیب طرح کانپ گیا اور اس کی بیوی کو اس کا چہرہ کچھ مڑتا ہوا اور ٹوٹتا ہوا نظر آیا۔ نسیمہ سہم گئی۔ اس نے ادریس کی آنکھوں میں اتنی گھٹن اور لبوں کی مسکراہٹ میں اتنی پسپائی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اپنا آنچل ہاتھ میں لئے اسے کھڑی دیکھتی رہ گئی۔ جیسے دعا مانگ رہی ہو اور جب ادریس اسی طرح مسکراتا ہوا پر وہ اٹھا کر باہر چلا گیا تو دیر کے بعد اسے یاد آیا کہ اس نے ادریس کو شام کے وقت سبزی لانے کے لئے تو کہا ہی نہیں۔ آج تو تنخواہ ملے گی۔ ایک شام تو کھانا اچھا پک جائے آج میرے ادریس کی طبیعت بھی بری ہو رہی ہے۔ اگر آج وہ گوشت لے آئے تو اور اچھا ہو۔ لیکن اس کی آنکھوں میں اتنا اندھیرا کیوں تھا۔ اس کے لب اتنے پچڑے پچڑے، اتنے خشک کیوں تھے۔

اس کا جیلانی روتا ہوا آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"کیوں بیٹے ٹیلے، کلیجے کے ٹکلے ٹیلے تو کیوں لو لہا ہے؟"

"اوں، میں اڑنے والا گھو لا لوں گا ـــ" اس نے تتلاتے ہوئے اور اپنی بھری ناک کا گھی اس کی ساری میں چپڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں ابا تیلے لائیں گے اڑنے والا گھولا" نسیمہ نے جیلانی کو اٹھا کر اپنے کندھے پر بٹھا لیا۔

"نہیں میں لال پلی بھی لوں گا"

"ہاں میرا منا لال پلی بھی لے گا ـــ ابا آئیں گے لال پری لائیں گے"

اس نے جیلانی کو کندھے سے اتار کر سینے سے لگا لیا اور اپنی ناک سے اس کے پیٹ کو اس طرح گدگدایا کہ وہ کبوتر کی طرح چہچہانے لگا۔ اس کو دیکھ کر ربو بھی تالی بجا کر ناچنے کودنے لگی۔

گلی میں پھل والے نے آواز دی۔ نسیمہ دروازے کی طرف لپکی اور پردہ اٹھا کر گلی میں دیکھنے لگی۔ اس کے دونوں بچے اس کی ساری سے لپٹے ہوئے تھے۔

ہاں آج پھل لے لوں۔ ادریس بالکل ہوا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اب کے میری ساری نہیں آئے گی تو کیا ہوگا۔ زندگی ساری سے زیادہ قیمتی ہے ———

"اے پھل والے یہاں آؤ ———"

اس کی آواز بہت ہی گھٹی ہوئی اور بے سکون تھی۔

★

ادریس روز کی طرح اپنے بینک کے پاس سے خاموش گذر گیا۔ پچھلے ہی مہینے پہلی تاریخ کو وہ اس زینے پر اس امید کے ساتھ چڑھا تھا کہ اس کی جیب گرم ہو جائے گی اور شام کے وقت جب اس کی جیب گرم ہو گئی تھی اس نے ایک سگریٹ پی تھی پاسنگ شو۔ اور اس کے ساتھ ایک پان چبایا تھا اور اس طرح چبایا تھا کہ اس کی سٹھی بھی حلق سے پار سیر کو اتر گئی تھی۔ اس دن اس نے بہت لڑنے جھگڑنے کے بعد اپنی بچی کے لئے ایک ریڈی میڈ فراک خریدا تھا اور اپنی بیوی کے لئے ایک سیاہ کنگھا۔ گھر پہنچ کر اس نے خوب دھوم مچائی تھی اور بالکل بھول گیا تھا کہ دوسرے دن اس کو ٹرام کے لئے بھی قرض لینا پڑے گا۔

کولو ٹولہ سے نکلتے ہی لوور سرکلر روڈ پر اس کی ملاقات بنرجی بابو سے ہو گئی وہ اپنی چھتری بغل میں دبائے اور نسوار ناک میں سڑکتے ہوئے اس کے پاس سے گذر رہے تھے۔

"کہئے بنرجی بابو! کیسی بیت رہی ہے؟"

"ارے تم! بتاؤ کہیں نوکری ملی؟"

اس وقت ادریس کے سینے کا درد بہت بڑھ گیا تھا اور گلے میں سرسراہٹ بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے سڑک پر بہتے ہوئے پریشان حال ہجوم کو گھورتے ہوئے بنرجی بابو کو ہوں ہاں کہہ کر جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

اس دن وہ روز کی طرح شہر کے چکر لگاتا رہا۔ لیکن اب اس میں دم خم باقی نہیں رہا تھا۔ وہ اب کسی دوکان کے سامنے ٹھہرتا بھی نہیں سرکلر روڈ، دھرم تلہ، پارک اسٹریٹ، ان سب سڑکوں پر سے چکر لگاتا ہوا وہ میدان میں اتر کر بیٹھ گیا۔ بڑا سا میدان اور اس میں بادامی رنگ کا مینار بہت سربلند معلوم ہوتا تھا۔ وہ اسی سربلند مینار کے نیچے بیٹھ گیا۔

ابھی بیس ہی دن پہلے اسی مینار کے نیچے ایک بہت بڑا جلسہ ہوا تھا۔ اس جلسے میں ہزاروں کے درمیان وہ بھی تھا۔ بوڑھے اور جوان سب ہی قسم کے لوگ تھے اور ان میں وہ بھی تھا۔ پورا جلسہ ایک ناقابلِ شکست احتجاج کی طرح سانس لیتا رہا لیکن اس کی ملازمت اسے واپس نہ ملی۔

اسی دن اس کی ملاقات اپنے گاؤں کے اس بوڑھے شخص سے ہو گئی جو تھے تو بہاری مگر کہلاتے کشمیری تھے۔ ان کی ایک بڑی سی پھل کی آڑھت تھی اس لئے انہیں کشمیری کہلانے کا حق بھی تھا۔ اس نقلی کشمیری نے اسے پکار کر اپنے پاس بلایا "کیوں ادریس میاں کیا حال ہے کبھی آڑھت کی طرف نہیں آتے" کشمیری اس وقت فٹن میں بیٹھا ہوا تھا اور اپنے جیکٹ کے سنہرے بٹن سے کھیل رہا تھا۔ اس کی گردن میں پڑی ہوئی سنہری زنجیر میں ایک خنجر نما چاندی کا خلال لٹک رہا تھا۔ اس نے ایک دو بار خلال کرتے ہوئے کہا "اچھا اس وقت تو میں کاروبار سے جا رہا ہوں۔ آؤ تو آڑھت پر ——— ایں!"

دوسرے دن آڑھت پر کشمیری ملا۔ وہ حقہ پی رہا تھا۔ اس کے آگے نوٹوں کی گڈیاں پڑی تھیں۔ اس نے مسکرا کر اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس کے لئے چائے منگوائی۔ سیب اور سنگترے کی پلیٹ بھی اس کے سامنے رکھ دی گئی۔

بات چیت کے دوران میں ادریس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "بات یہ ہے کہ اب میری نوکری ختم ہو گئی ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ اگر کوئی ملازمت نہیں مل گئی تو ——" اس کی آنکھوں میں نسیمہ اور بچوں کے چہرے ناچ گئے تھے۔

کشمیری کے چہرے کا رنگ اس طرح بدل گیا کہ اس کے بعد ادریس کی ہمت پھل کھانے کی نہیں ہوئی اور وہ اٹھ کر وہاں سے چلنے لگا۔

"نہیں بیٹھو۔ پھر ایک کام کیوں نہیں کرتے۔ اب کے حساب کتاب میں گڑبڑ ہو رہی ہے۔ اپنا منیم بے ایمان ناک میں دم کر رہا ہے۔ اگر تم روز رات کو آڑھت میں بیٹھ کر ——"

ادریس نے یہ ساری باتیں نسیمہ سے چھپا دیں۔ نسیمہ سمجھتی تھی کہ وہ روز صبح بنک چلا جاتا ہے۔ بلکہ اب اسے اس کی شکایت تھی کہ رات کو وہ اتنی دیر کیوں کرتا ہے۔

اس روز میدان میں بھی بار بار اس کا سر چکراتا رہا اور آنکھوں میں اندھیرا چھاتا رہا۔

چار پانچ بار کافی کافی خون آیا۔ ہر بار ایسا لگتا کہ زندگی کی آگ پر جاڑے کی اوس پڑتی جا رہی ہے۔ اس کے بیٹھے بیٹھے دو بار بوٹ پالش والے لڑکے نے اس کو گالیاں دیں —— "خون تھوکتا ہے۔ اپنے باپ کا ہسپتال سمجھ رکھا ہے" اس نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور دونوں ہتھیلیاں میں سر رکھ کر کھانستا رہا۔

شام ہو گئی۔ ہر طرف جگمگاہٹیں اور خوشبوئیں اپنی فوج لے کر نکل پڑیں۔ چورنگی کی پیشانی پر اشتہار کی رنگین بجلیاں لہرانے لگیں۔ اس وقت ہزاروں بیکاروں کا سمندر مینار کے نیچے موجیں مار رہا تھا۔ سربلند مینار جہاز کے مستول کی طرح اس وقت بھی نظر آ رہا تھا جب اس نے ٹرام کی پٹریاں کے واڑے سے نکلنے کے بعد پلٹ کر دیکھا تھا۔ اسے واپس جانا تھا۔ اسے پھل کی آڑھت میں پہنچنا تھا۔ جب دوبارہ وہ کولوٹولہ اور سرکلر روڈ کے سنگم پر سے گذرا تو اسے یاد آیا کہ اس بنک میں وہ امیدوں اور امنگوں کے ساتھ داخل ہوا تھا۔ اس کے اندر گرمی اور تڑپ تھی۔ اور اب وہ اس بنک سے اس طرح نکل رہا تھا جیسے چولھے سے راکھ نکلتی ہے۔ ٹھنڈک، برفیلی ٹھنڈک، زندگی میں کوئی حرارت نہیں تھی۔

جب وہ پہلی بار اس بنک میں داخل ہوا تھا تو ہنرجی بابو نے اس کا بہت مذاق اڑایا تھا "بابا تم کیا سوچا رہتا ہے۔ تم تو بابا ہر دم آسمان میں اڑتا رہتا ہے۔ یہ بنک ہے بنک۔ لاکھوں کا لین دین آسمان میں اڑنے سے نہیں ہوتا"

حالانکہ وہ اس وقت آسمان میں نہیں اڑتا تھا۔ وہ ان دنوں نسیمہ کے بارے میں بہت سوچا کرتا تھا۔ ہر وقت وہ اس کے ذہن پر سوار رہتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ مطمئن زندگی گذار رہی تھی۔ لیکن جب وہ گلی در گلی گذر کر اپنے گھٹے ہوئے اور دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرے میں پہنچتا اور اپنی بیوی کو روٹی بیلتے ہوئے دیکھتا اور اس کی آنکھیں، جو دھوئیں کی تلخی سے سرخ ہو جاتیں اور جن میں پیازی رنگ کے آنسو بھر جاتے، اس کی آنکھوں سے ملتیں تو اس کا دل بھر آتا۔ وہ یوں ہی دل رکھنے کو ہنس دیتا۔

"نسو! گلکتے میں مکان کا بڑا توڑا ہے۔ اچھا اب کے مہینے میں کسی اور جگہ اٹھ چلیں گے۔ اس کمرے میں سے تو دھواں باہر نکلتا ہی نہیں۔ بھیگے ہوئے لباس کی طرح چمٹ جاتا ہے ——"

کتنی دلچسپ بات تھی کہ وہ جب ہزاروں روپے اپنی ہتھیلی میں دبا کر گننے لگتا تو نسیمہ بے تحاشا اس کی آنکھوں میں روٹی بیلتی ہوئی ابھر آتی

وہ بار بار کہتا "نسو پیاری! اس وقت چلی جاؤ۔ میں روپے نہیں گن سکوں گا" نسو جاتی اور پھر واپس آجاتی اور بنرجی بابو اپنی عینک ناک پر سرکا کر کہتے "لعنتی ان نوٹوں کا آٹا کیوں بنا رہے ہو۔ آسمان سے اترو۔ زمین پر چلو۔ زمین پر۔"

ایک دن تو باضابطہ اس نے لکچر دے دیا تھا۔ اس نے اپنی عینک کے نیچے اپنی گول گول آنکھوں کو چکر دے کر کہا "نسوار لوگے نہیں لوگے اف کیا چیز ہے۔ میں بھی جب آیا تھا اس بنک میں تو بس تمہاری طرح آسمان میں اڑا کرتا تھا۔ دماغ کیا تھا رنگین غبارہ تھا۔ زمین پر پیر ٹکتے ہی نہ تھے۔ کیا کرتا۔ لیکن جب نوکری کے لالے پڑے ——— تو ایک دوست نے بتایا، نسوار سڑکا کرو۔ اس سے دماغ قابو میں رہتا ہے اور پاؤں زمین پر۔"

اور میں نے بنرجی بابو کی باتوں کی بالکل پروا نہیں کی۔ لیکن واقعی اب حالات کی تلخی اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ خود فراموشی کی تہہ کے نیچے نسیمہ کی یاد اور اپنے کمرے کی گھٹن کو دبا کر مزے میں بنک کے نوٹوں کو گننے لگا تھا۔

ہر زمانے میں وہ اس ملازمت سے بیزار رہا۔ ہر لمحہ ایمان کا امتحان ہوتا رہتا ——— یہ کوئی بات ہوئی۔ لیکن اسے کوئی اور ملازمت نہ ملی۔ پھر رفتہ رفتہ بنک کے دوسرے رفیقِ کار اس سے اپنی اجنبیت کھو بیٹھے۔ وہ اس سے ہنسنے بھی لگے، اسے لطیفے بھی سنانے لگے اور اپنی بیویوں کی فرمائشوں اور ان کے نازنخروں کے لطیف راز بھی بتانے لگے۔ رومنٹ کو ہی سہی لیکن وہ سب روزانہ اکٹھے ہو جاتے اور ہنس لیتے، گنگنا لیتے، ایک دوسرے کو آنکھیں مار لیتے اور جسے اس کی توفیق نہ ہوتی وہ کہنی ہی مار کر دل کی بھڑاس نکال لیتا۔ اسی مارا ماری میں ایک بار ادریس نے بنرجی بابو کے کہنی مار دی تھی۔ انہوں نے پورے بنک کو سر پر اٹھا لیا۔

"یہ کل کا چھوکرا مجھے کہنی مارتا ہے!" کل کا چھوکرا اس کے منہ سے بہتی ہوئی پان کی پیک پونچھتا ہوا اس سے معافی مانگتا رہا اور اپنی معصومیت کا اظہار کرتا رہا۔

پہلی تاریخ کو بنک میں ایک پراسرار تیزی پیدا ہو جاتی۔ ہاتھ تیز چلتے، آنکھیں تیز چلتیں، سانس تیز چلتی۔ خیال تیز چلتا، آرزوئیں تیز چلتیں۔ البتہ اس دن سامنے دیوار پر بڑے سے کچھوے کی طرح سیاہ گھڑی بہت سست چلتی۔ تمنائیں خرگوش بن جاتیں اور وقت کچھوا۔ اس کی وجہ سے ایک طرح کی دبی دبی جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی۔ تنخواہ لے کر سب ہوا کی طرح نکلتے۔ صرف بنرجی بابو کے پیر بہت ڈگمگاتے۔ وہ سب سے آخر میں بنک کے زینے سے اترتے۔ وہ اپنے نوٹوں کو انگلیوں سے چھوتے رہتے جیسے اپنے چھوٹے سے بچے کے گال چھو رہے ہوں۔ زینے سے اترتے ہی ایک کابلی اپنا ڈنڈا بجاتا ہوا بنرجی بابو کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا۔ اس کا پورا وجود ڈنڈا بن جاتا۔ بنرجی بابو قرض کا سود ادا کرتے۔ کابلی نوٹ گنتا جاتا اور اپنا ڈنڈا اپن ختم کرتا جاتا۔ یہاں تک کہ اس کے لب بھی کھل جاتے اور وہ اتنے زور سے ہنستا کہ سڑک کے راہ گیر مڑ کر دیکھنے لگتے اور اس کی زبان سانپ کی زبان کی طرح لپکتی ہوئی نظر آتی۔ سرخ اور چمکیلی۔ وہ کہتا "بانرجی بابو تُوم بوت اچا بابو ہے" بنرجی بابو اس کی داد کا شکریہ ادا کئے بغیر گلی میں کھو چکے ہوتے۔

زندگی کے اس معمول میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوتی۔ ہاں کبھی معلوم ہوتا کہ کسی کی بچی کالرا سے مر گئی۔ کسی کو مالک مکان نے نکال دیا۔ کسی کی بیوی بھاگ گئی۔ کسی کے ماموں نے خودکشی کر لی۔ کسی کے بچہ اپریشن کے بعد پیدا ہوا اور اس کے لئے کابلی سے قرض لینا پڑا۔ اس طرح کی باتوں سے تالاب کے پانی کی سطح ٹوٹ جاتی۔ لہریں اٹھتیں۔ لیکن جلد ہی سطح کے لب مل جاتے۔ لہریں ٹھنڈی پڑ جاتیں۔ زندگی کی سطح آئینے کی طرح برابر ہو جاتی۔ اس سے بحث نہیں کہ اس آئینے پر کتنی تہیں گرد کی جمی ہوتیں اور جو ہمیشہ موٹی ہی ہوتی چلی جاتیں۔

پھر پچھلے دنوں مینجر نے کلرکوں کو بری طرح بال کی کھال نکال کر ڈانٹنا شروع کر دیا۔ بے بات کی ڈانٹ۔ وہی مینجر جس کی شرافت کی تعریف

بنک کا ہر ملازم کیا کرتا بالکل بھوت بن گیا۔ ہر شخص اس کی نظر سے بچنے لگا۔ اس کی آواز کی سرحد سے نکلنے کے لئے بہرا بننے کی کوشش کرنے لگا۔
ان ہی دنوں ہر دیو جیسا بے پروا اور زندہ دل کلرک بھی ایک دم سے سنجیدہ اور فکر مند ہو گیا۔ اس نے فلمی پریوں کی بات کرنا اور چھپے چوری کاؤنٹر کے شیشے میں اپنے بالوں کے تموج کا لطف اٹھانا بھی چھوڑ دیا۔ بلکہ ایک دن تو وہ اتنا بدحواس ہوا کہ اس نے ادریس کو مسکرا کر دیکھا اور پھر اس کے قریب آ کر اور اس کا بازو پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور بغیر کچھ کہے سُنے چلا گیا۔

اس دن ادریس کو معلوم ہوا کہ ہر دیو، جو اسے ہمیشہ چغد بنایا کرتا تھا اور ہر بات پر ولی اللہ اور صوفی ہونے کا طعنہ دیتا تھا، اپنے اندر بڑی محبوبیت رکھتا ہے۔ اس وقت اس کی آنکھیں کتنی بڑی بڑی دکھنے لگی تھیں اور ان کی نیلی چمک میں کتنی گہرائی پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت پہلی بار وہ ایک ایسا نوجوان نظر آیا تھا جسے فلمی پریوں سے کوئی دلچسپی نہیں، جو اپنی ماں، اور بیوہ بہن اور اس کے بچوں پر اپنی آمدنی کا نوے فی صدی خرچ کر رہا تھا۔ اس کے لئے گھر میں گھٹن تھی اور فلم میں فرار اور اس فرار میں تسکین۔ زندگی کے ناسوروں کو بھول جانے کا فریب!

ادریس بنک کی دیواروں پر ہر وقت ایک آسیبی خطرے کو رینگتے ہوئے دیکھتا لیکن اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ آخر ایک دن بم پھٹ پڑا۔ یہ صرف ایک دھماکا تھا۔ کوئی مجروح ہوا اور نہ کوئی مرا۔

بنرجی بابو نے اپنی چھتری کو بنک کے اندر ہی کھول لیا۔ حالانکہ اس روز گلیوں میں بھی دھوپ کا اُجالا پھیلا ہوا تھا اور بنک کی سبز سائبان سے ٹرام کی چھتیں چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

زینے کے پاس دروازے میں بنرجی بابو کی چھتری پھنس گئی اور وہ پلٹ آئے۔

ادریس کو دیکھ کر انہوں نے نسوار سڑکنا شروع کر دیا۔ لیکن ان کے ہاتھ اس طرح تھر تھرا رہے تھے کہ اس کی چٹکی ناک کے بجائے منہ میں گھسی چلی جا رہی تھی۔

"ادریس بابو! بہت مصیبت، بہت مشکل۔ کیا ہو گا۔ چھ بابوؤں کی چھٹی۔ چھٹی۔ اُف بہت مصیبت!"

تھوڑی دیر میں ساری باتیں ادریس کی سمجھ میں آ گئیں۔

اس دن شام سے لے کر رات کے بارہ ایک بجے تک ادریس شہر کے چکر لگاتا رہا۔ زینے سے لے کر سڑکوں تک، سڑکوں سے لے کر اکلی اپنی گلی تک وہ دلدل میں تیرتا رہا تھا، ڈوبتا رہا تھا ——— اور دوسرے دن اس دلدل کی سطح برابر ہو گئی۔ جو چھ بابو یا بھدر لوگ بنک سے نکالے گئے تھے ان میں بنرجی بابو اور ہر دیو بھی تھے۔

بنرجی بابو نے اس دن زندگی میں پہلی بار چھتری بنک ہی میں چھوڑ دی اور ہر دیو زندگی میں پہلی بار جب زینے سے اُترا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور گلے میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار سامنے فلم کے اشتہار کا بورڈ دیکھ کر اس میں فلم دیکھنے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی اور نہ ایکٹرس کے نیم عریاں اور دعوتی سینوں میں اسے کوئی کشش محسوس ہوئی اور نہ اس نے فلمی دنیا کی رومانی فضا کے تصور میں ایک ہیرو بننے کا خواب دیکھا۔ سارے خواب شام کی اداسی میں تھک کر بے جان ہو چکے تھے۔

بنرجی بابو نے گلی کی طرف مڑتے ہوئے ادریس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "تم ابھی جوان ہو تمہارا خون گرم ہے۔ تم کو زندہ رہنا چاہئے۔ میرے لئے ہگلی کا منہ کھلا ہوا ہے۔ میں ایک بیکار آدمی ہوں۔ جلی ہوئی رسی ——— !"

ادریس اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ہر دیو نے اس کے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ آج اس کے بالوں میں تموج کی وہ آرائش

نہیں تھی جس کو آئینے یا بینک کے شیشے میں دیکھ کر وہ اپنے آپ کو فلمی ہیرو سمجھنے لگتا تھا۔ کنگھے سے بیگانہ وہ آہستہ آہستہ دونوں کانوں کے پاس گھونسلوں کی طرح لٹکے ہوئے لرز رہے تھے۔ ان کے اندر تیل کے بغیر چمک بھی غائب تھی۔ وہ چمک جو بالوں کی لہروں سے شروع ہوتی تھی اور اس کی آنکھوں اور ہونٹوں میں لو دینے لگتی تھی، راکھ کی آندھی میں کھو گئی تھی۔

"کبھی ادریس صاحب! آپ تو ٹاپ کرنا بھی جانتے ہیں"

"جی ہاں ——" رندھی ہوئی آواز میں سر ہلاتے ہوئے اور ہردیو کی آنکھوں سے بچتے ہوئے ادریس نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ کو کہیں نہ کہیں نوکری مل جائے گی۔ میں تو ایسا چکنا گھڑا ہوں کہ ——" پھر وہ خود بخود ہنسنے لگا۔

اس نے اپنے بالوں کو ایک بار چھو کر دیکھا اور اس کے چہرے میں ایک حیرانی اور کرب کی کیفیت پیدا ہوئی اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے بالوں کی بے ترتیبی سے ناراض تھا اور اسے اس وقت اپنی بے بسی اور ذلت کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ چلا گیا۔ لیکن جانے سے پہلے اس نے ادریس کے ہاتھ کو زور سے دبایا "دوست جب تک ہم ایک ساتھ کام کرتے رہے ہم ایک دوسرے کے دوست نہ بن سکے۔ آپ مجھے آوارہ اور اٹھائی گیرہ سمجھتے رہے اور میں آپ کو ایک بیوقوف —— جو اپنی ماں کے بجائے عورت کے تلوے کے نیچے جنت ڈھونڈتا ہے!"

"ہردیو! میں نے تو کبھی تمہیں آوارہ ——"

ہردیو نے اس کی بات درمیان سے کاٹ دی "اچھا! اب تو شاید ہم کبھی نہیں ملیں گے" شام کی جھلملاہٹ کھو گئی اور ادریس اکیلا رہ گیا ہجوم میں تنہائی کا یہ احساس اس کے لئے حد درجہ اجنبی تھا۔

★

نیپالی چوکیدار نے تالے کو ایک بڑی گالی دی اور آڑھت کا دروازہ کھول دیا۔

اب آہستہ آہستہ خاموشی رینگنے لگی تھی۔ ہاں کبھی کبھی ٹراموں کی گھڑگھڑاہٹ اس خاموشی کو بیچ سے چیر کر رکھ دیتی تھی۔

دو تین گھنٹے تک ادریس پیلے کھاتوں پر جھکا رہا۔

"دو ہزار پینتیس، دو ہزار اکتالیس ......"

نیپالی اس کے پاس آکر جھک گیا "آج تم بیمار معلوم ہوتے ہو منشی جی؟" اس نے اپنی پچکی ہوئی ناک کو انگلی سے کریدتے ہوئے پوچھا۔ ادریس نے سر بھی نہ اٹھایا۔ نیپالی اسی طرح جھکا رہا۔ اس کے مٹیالے چہرے میں دردمندی کی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ ادریس اپنے سینے کے درد کو چھپانا چاہ رہا تھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ چوکیدار اس کا سر نہ کھائے اور واپس چلا جائے۔ لیکن وہ تو جھکا ہوا تھا "پھل کھاؤ گے۔ بھوک لگی ہے؟" وہ اس طرح پوچھ رہا تھا جیسے پھل کی آڑھت اس کے باپ کا اجارہ ہو۔ ادریس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پیلے کھاتوں پر جھکا رہا۔ چوکیدار واپس چلا گیا۔ لیکن اس کے بوٹوں کی کھٹ کھٹ سنائی نہ دے رہی تھی۔ وہ آڑھت کے باہر چپ چاپ کھڑا تھا۔ پھل خاموش ڈھیروں میں پڑے خراٹے لے رہے تھے۔ ہوائیں تیزی اور خنکی پیدا ہو رہی تھی۔ لیمپ آنکھ جھپکے بغیر پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لئے ادریس کے زرد اور بجھے ہوئے چہرے کو گھورے جا رہا تھا۔ ٹراموں کی گھڑگھڑاہٹ بھی اب مر چکی تھی۔

ادریس کی کھانسی نے لیمپ کی لو کو بھی کپکپا دیا۔ اس نے قلم چھوڑ کر اپنی ہتھیلی منہ پر رکھ لی۔ لیکن کھانسی بڑھتی گئی۔ ایک طوفان تھا جو غراغرا کر

سینے سے باہر نکلنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔

چوکیدار پھر اندر آ گیا۔ اس نے ادریس کو بڑی رحم بھری نظروں سے دیکھا۔

"تم گھر کیوں نہیں چلے جاتے۔ تمہارا ماتھا جل رہا ہے" چوکیدار نے اس کی پیشانی کو اپنے کھردرے ہاتھ سے چھوتے ہوئے کہا "تم بڑے ضدی معلوم ہوتے ہو۔"

"ہاں میں ضدی ہوں" ادریس کی تھکی ہوئی آنکھیں یہی کہہ رہی تھیں لیکن وہ خاموش تھا۔

نیپالی چوکیدار نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیمپ کی روشنی میں ادریس کی انگلی میں چھپی ہوئی ایک چاندی کی میلی انگوٹھی چوکیدار کی آنکھوں میں چمکنے لگی۔

"یہ انگوٹھی کیسی ہے۔ کون سا پتھر ہے۔ ہمارے سیٹھ جی بھی تو یہی پتھر ———" اس نے بڑی حیرانی سے پوچھا

"نہیں وہ تو یاقوت ہے اور یہ تو رنگین شیشہ ہے۔ نقلی پتھر"

چوکیدار اس طرح مسکرایا جیسے کہہ رہا ہو کیوں دھوکا دیتے ہو۔ کیا میں اصلی اور نقلی چیز کو نہیں پہچانتا۔ تم سمجھتے ہو میں چھرا مار کر تمہاری انگوٹھی لے بھاگوں گا۔ ہت بے وقوف۔ کیا میں نیپال کی تراٹی سے اپنی بیوی، ماں اور بچوں کو ——— پہاڑی تراٹی کی پتھریلی زمین اور برفیلی ہوا کو چھوڑ کر اسی لئے یہاں آیا ہوں۔ میں کیوں آیا ہوں، تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے۔ لعنتی رہ گئے منشی کے منشی، چھبیس روپے بارہ آنے ماہوار اور سال میں دو بار خاکی کپڑے کوئی مذاق نہیں۔

چوکیدار جھنجھلا کر پھر باہر چلا گیا۔ اب کے اس کے بوٹوں کی آواز صاف آ رہی تھی۔ آواز تیز تھی۔ سڑک کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ شہر کی نیند نے اس آواز کو اور تیز بنا دیا تھا۔

★

ادریس کو چوکیدار کی جھنجھلاہٹ کا پتہ بھی نہ چلا۔ وہ تو کاغذ کی ناؤ کی طرح یادوں کے دریا میں بہہ رہا تھا۔

گاؤں اُبٹن اور عطر کا بازار بن گیا ہے۔ قہقہے اور گیت اونگھ رہے ہیں۔ مذاق اور دل لگیاں تھک کر اپنے آنچل، اپنے پیرہن سے بے خبر آنگن میں، صحن میں، دالان میں دراز ہو چکی ہیں۔

"بوبو۔ تمہارا لاڈلا کلیجے سے لگتا ہی نہیں مونڈی کاٹا ———" کسی کی ایک آخری پکار آتی ہے اور سناٹا چھا جاتا ہے۔

لیکن دمکتی پیشانی پر چپکی ہوئی چمکیاں بات کر رہی ہیں۔ بند آنکھوں کی پلکیں جو کبھی کبھی لرز جاتی ہیں۔ کاجل کے پردے سے نکل کر پکار رہی ہیں میرا گلا خشک ہو رہا ہے۔ لیکن میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ کمرہ بند ہے اور کوئی مجھے دیکھ نہیں سکتا۔ میری انگلیوں میں بجلی دوڑ جاتی ہے۔ ایک گدگدی اور پھر اُبٹن کی خوشبو میں سوئی ہوئی رعنائی جاگ جاتی ہے۔ اس کی چمکیاں اُڑنے لگتی ہیں۔ رات جتنا ڈھلتی جاتی ہے زلفوں کا انتشار بڑھتا جاتا ہے۔

صبح ہو رہی ہے اور نسیمہ اپنی کاجل بھری آنکھوں سے اسے پٹ پٹ دیکھتی جاتی ہے، مسکراتی جاتی ہے۔

"لو یہ انگوٹھی ایک نقلی شیشے کی انگوٹھی ہے۔ میں نے تمہارے لئے بنوائی ہے۔

ادریس جھپٹ کر اس کے سرخ لب چوم لیتا ہے۔

"اور یہ یاقوت؟"

لیمپ ٹمٹک رہا ہے۔ ادریس کی یادیں بھی بھٹکنے لگی ہیں، دماغ میں دھند بھرنے لگی ہے۔ اب قریب سے آتی ہوئی چوکیدار کے بوٹوں کی آواز بھی دور کے قبرستان سے نئی قبر کھدنے کی دھمک معلوم ہوتی ہے۔

اس کی کھانسی نے ایک بار اور اس کے پورے جسم میں گرم لاوا بھر دیا ہے۔

میری نسو! تم تنخواہ کے انتظار میں کھڑی ہو۔ تم آج پھر میری قمیص مرمت کر رہی ہو۔ تمہارے بچے انتظار کر کے سو گئے ہیں۔ لیکن میں آ نہیں سکتا۔ میری جیب خالی ہے۔ آج فریب بھی آخری رات ہے۔ تم سے میں سچی بات کہہ نہ سکا۔ لیکن اب —— ہاں یہ میرے جھوٹ کی آخری رات ہے!

اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ رات ایک سیاہ کپڑے کے تھان کی طرح کھلتی چلی گئی۔ ایک سیاہ جلوس گذرنے لگا۔ سیاہ پرچھائیوں کا جلوس، ریشمہ کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اتنی سیاہ کیوں ہیں۔ بنرجی بابو! تم اتنے کالے کب سے ہو گئے۔ ہردیو اس سیاہی کے ساتھ تو تم بالکل حبشی معلوم ہوتے ہو۔ تم اب فلم کے ہیرو کیسے بن سکتے ہو۔ سکینہ، میری بہن کیا تم اپنے نمازی شوہر کے جوتے کھا کھا کر اتنی سیاہ ہو گئی ہو۔ میرے ربو اور جیلانی کا رنگ اتنا سلیٹی کیسے ہو گیا۔ کیا سب رات کا دودھ پی رہے ہیں —— اور لو اب تو کتا بھی بھونکنے لگا —— اف! یہ کتنا سیاہ، کتنا بھیانک ہے"

اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ لیمپ سامنے جل رہا تھا۔ لیکن اسے کچھ نظر نہ آیا۔

تم بھی دغا دے گئے میرے لیمپ!

اس کی کھانسی نے لیمپ کی لو کو کپکپا دیا۔ لو اور تیز ہو گئی۔ لیکن اس کی روشنی رات کے مٹتے ہوئے ملگجے رنگ میں پھیکی اور تھکی ہوئی نظر آنے لگی۔

بنرجی بابو آج آپ نے اپنی چھتری زینے پر ہی کیوں کھول لی۔

اس کے بعد اس کے دماغ میں بھی اندھیرا چھا گیا۔ اس نے اپنا سر میز پہ رکھ دیا۔

چوکیدار پھر اندر آ گیا۔ لیمپ کی روشنی میں اس کے کالے جسم کا لمبا عکس پھل کے ڈھیر پہ پھیل گیا۔

"صبح ہو گئی۔ اس وقت تو پھل کھا لو"

خاموشی۔

چوکیدار خود اپنی آواز سے ڈر گیا۔ اس کا ہاتھ اپنے چہرے پر پہنچ کر رک گیا۔ مٹھی جکڑ گئی۔ اس کے دانت بھنچ گئے اور وہ درندے کی طرح ظالم نظر آنے لگا۔

"تم نے سیٹھ کی انگوٹھی کے اصلی پتھر کا کیا نام بتایا تھا؟"

خاموشی۔

اس نے ادریس کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا اور اس کا سر کرسی پہ ٹکا دیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور تالاب سے نکالے ہوئے تازہ سنگھاڑے کی طرح ٹھنڈی تھیں۔ چوکیدار نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا اور انگوٹھی کے سرخ شیشے کو دیکھنے لگا۔ بالکل وہی۔ بالکل وہی۔ اس کی نظر میز پر گئی۔ کھانے پر ایک بڑا سا سرخ پتھر چمک رہا تھا اور اس میں سے لو نکل رہی تھی۔ ارے! بالکل سیٹھ کی انگوٹھی کا پتھر —— منشی جی! بتاؤ نا کیا نام تھا ——" ادریس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو گئیں۔ چوکیدار نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ سردی میں ٹھٹھر کر مرے ہوئے کبوتر کی طرح اس کا ہاتھ نیچے گر گیا۔

لیمپ کی پھیکی لو اور تیز ہو گئی تھی اور کھانے کے پیلے کاغذ پہ یاقوت کی چمک بجھتی چلی جا رہی تھی......

دوسری شادی

شوکت تھانوی

"کل میرا نکاح ہے۔"

اسلم سے میں یہ سننے کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ حیران ہی تو ہو گیا اُس سے یہ سُنکر کہ کل اُس کا نکاح ہے۔ صاحب یہ حیرت کی بات ہی ہے کہ اسلم ایسا بزدل جس کو اُس کی بیوی نے برسوں کے ریاض کے بعد ایسا مسلّم الثبوت بزدل بنایا ہو ایک دم ایسی جرأت کر گذرے۔ صرف یہی نہیں کہ وہ بزدل تھا بلکہ بیوی بھی ایسی پرانے زمانے کی تھانیدار قسم کی پائی تھی کہ خود میں آج چوتھا برس ہے کہ اُس کے گھر کا رُخ کرنے کی ہمت اپنے میں پیدا نہ کر سکا اور جس وجہ سے اس کے گھر کا راستہ چھوڑا ہے وہ قصہ اب بھی یاد آجاتا ہے تو ایک کپکپی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہوا یہ کہ میں اسلم کے گھر بیٹھک میں بیٹھا بازار سے آئے ہوئے پان چبا چبا کر اسلم کی تازہ نظم سُن رہا تھا بمشکل ابھی وہ چوتھے شعر کے پہلے مصرع تک پہنچا ہوگا کہ چلمن کے پیچھے سے ایک نسوانی مگر نہایت دبنگ آواز آئی:-

"میں نے تو سُنا تھا آپ بہت معقول آدمی ہیں۔"

میں حیران کہ مخاطب کون ہے اور اسلم کا یہ عالم کہ بیاض ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی، چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا اور ابھی وہ اپنے کو سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ اُسی آواز نے مجھ کو سمجھا دیا کہ مخاطب دراصل میں ہوں:-

"مگر مجھے تو یقین آتا نہیں۔ اگر کوئی معقول آدمی ہے تو ان سے تعلقات کیوں رکھے گا بھلا؟"

اب میں نے بیوقوفوں کی طرح چپ سادھ کر بیٹھنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے ایک تجاہلِ عارفانہ کے ساتھ عرض کیا "میں آداب عرض کرتا ہوں۔ غالباً آپ مجھ سے کچھ فرما رہی ہیں۔"

کرختگی میں طنز ملا کر بولیں "جی ہاں آپ ہی کی خدمت میں عرض کر رہی ہوں کہ کیا آپ کو بھی ان کی طرح دُنیا جہان کا کوئی کام نہیں ہے۔ دنیا بھر کے تمام بیفکروں کا اڈّہ یہی گھر تو ہے ——"

اور میں نے دیکھا کہ اسلم چپکے چپکے ہاتھ جوڑ کر مجھ کو خاموش رہنے کا اشارہ کر رہا ہے وہ اشارہ نہ بھی کرتا تو شاید میں چُپ ہی رہتا اس لئے کہ اس قسم کی باتوں کا اگر کوئی جواب ہو سکتا ہے تو مجھ کو اس کی مشق نہ تھی بلکہ شاید یہ زندگی کا پہلا تجربہ تھا کہ کسی کے گھر جا کر اپنی ایسی عزت افزائی کرائی ہو۔ میرا دماغ تو ایسا ماؤف ہوا کہ پھر میں اُن محترمہ کے اُس طویل قصیدے کو ذرا بھی نہ سمجھ سکا، جو تھا تو شوہر نامدار ہی کی شان میں مگر گریز میری طرف بھی تھا صرف اتنا یاد ہے کہ میں وہاں سے عرق عرق اُٹھا تھا اور باوجود کوشش کے یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ ہُوا کیا آخر۔ مگر رفتہ رفتہ یہ بوجھ وہ احباب اُتارتے رہے جو مجھ سے پہلے اس امتحان سے گذر چکے تھے۔ اجمل نے جب یہ قصّہ سُنا تو قہقہہ لگا کر بولا "تو گویا آپ بھی سرفراز کر دیئے گئے۔ صاحب میری شامت تو بہت پہلے آچکی ہے اور اپنی اس بے تکلّفی کی سزا بھگت چکا ہوں کہ ملازمہ سے کہیں یہ کہہ دیا تھا کہ بھابی سے پان بنوا لاؤ۔ اس کا جواب براہِ راست مجھ کو بھی دیا گیا تھا کہ کان کھول کر ہمیشہ کے لئے سُن لیجئے کہ یہ کوئی تنبولی کی دکان نہیں ہے۔"

احسن نے سُنا تو وہ بھی اس طرح خوش ہوئے گویا ان کو بڑی تقویت حاصل ہوئی کہنے لگے "ارے صاحب اُس دروازے پر تو وہ جائے جس کو عزت اُتروانے کی اور کوئی ترکیب نہ آتی ہو۔ میرے ساتھ تو وہ ہوئی ہے کہ یاد رکھوں گا زندگی بھر۔ بابا میں تو خود بھی نہیں گیا تھا مجھے تو چائے پر بُلا یا گیا تھا۔ کوئی پوچھے اس مسخرے سے کہ جب جورو تیرے دوستوں کے لئے جُوتی پر دھار رکھے پھر رہی ہے تو آخر کیا شوق ہے تجھے کہ احباب کو بُلا بُلا کر ذلیل کرتا ہے۔"

میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا "آخر ہُوا کیا تھا تمہارے ساتھ؟"

کہنے لگے "ہونا کیا قیامت برپا کر دی تھی اُس عورت نے اندر سے اُس کے چیخنے برتنوں کے ٹوٹنے اور کچھ عجیب دھما چوکڑی کی آوازیں آتی رہیں پھر اسلم گھبرایا ہُوا باہر آیا اور مجھ سے کہا کہ چلو کسی ہوٹل میں پئیں گے چائے۔ مگر چلتے چلتے ان مسماۃ کا یہ فقرہ میں نے بھی سُن لیا تھا کہ مفت خورے کہیں کے آگئے وہاں سے کنگلوں کی طرح ——"

میں نے کہا "میرے خیال میں تو پاگل ہے۔"

جاوید نے کہا "نہیں صاحب پاگل واگل کچھ نہیں ہے بڑے باپ کی بیٹی ہے اور شوہر خرید اگیا ہے اس کے لئے صاحب اس نے اسلم کو پہلے رشتہ داروں سے چھوڑایا پھر باپ کا گھر چھوڑ کر علیحدہ مکان لیا گیا اس کے بعد تمام دوستوں کو ایک ایک کر کے اُس نے چھین لیا۔ کبھی خود اس کے بڑے بھائی اکرم صاحب سے تو پوچھو آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں بیچارے۔ مگر سعادت مند شوہر ہو تو اسلم جیسا کیا مجال کہ یہ حضرت بیوی کے سامنے چوں تو کر جائیں اس طرح اُسکی بوٹی بوٹی کانپتی ہے بیوی کے نام سے کہ جیسے یہ قربانی کا بکرہ قصائی بیاہ لایا ہے۔"

پھر باقی دوستوں سے عجیب عجیب حالات سُننے کہ ایک مرتبہ یہ حضرت سینما سے بھاگے تھے کہ بیوی کی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔ ایک مرتبہ شکار پر ان کو لے جانے کے لئے ایک وفد گیا تھا ان کے گھر اور وفد کے ہر رکن کی وہ گت بنی تھی کہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بھاگے تھے سب۔ سراج کی شادی سے بغیر کھانا کھائے بھاگ گئے تھے کہ کھانا تو میں بیوی کے ساتھ کھاتا ہوں۔ نتیجہ یہ کہ یہ تمام حالات سُنکر مجھ کو جو اپنی عزت آبرو میں شک پیدا ہو گیا تھا اور خود اعتمادی میں جو ایک تنزل کی کیفیت تھی وہ دُور ہو گئی اور میں نے بھی تمام احباب کے ساتھ مل کر اسلم کے لئے دعائے مغفرت کو ہاتھ اُٹھا دیئے تھے۔ اس کے بعد اسلم اس واقعے کی معذرت کے لئے بھی آیا۔ اور کبھی کبھی یوں بھی آتا رہا۔ مگر ہمیشہ ہوا کے گھوڑے پر سوار کبھی بیوی کی قمیص درزی کے یہاں سے لیتا ہُوا میری طرف سے نکل گیا۔ کبھی بیوی کے اختلاج قلب کا نسخہ بندھوانے آیا اور کھڑے کھڑے دو باتیں کر لیں کبھی بازار میں بیوی کے لئے ایک خاص قسم کے نیس پاؤڈر کی تلاش میں سرگرداں مل گیا اور ایک آدھ بات ہو گئی مگر وہ تفصیل سے بیٹھنا وہ جماؤ کی محفل وہ رُت جگے اور وہ بزم آرائیاں کب کی ختم ہو چکی تھیں۔ ہائے کیسا جانِ محفل دوست تھا یہ بھی۔ وہ اُسکی بذلہ سنجیاں۔ وہ بات سے بات پیدا کرنے میں اُسکی بے ساختگی۔ ایسا حاضر جواب کہ بڑے بڑے پناہ مانگتے تھے۔ طبیعت ایسی ہنگامہ پرست کہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مل بیٹھنے کے بہانے تلاش کرتا تھا۔ آج پکنک ہے اور آپ انتظام الدولہ بنے ہوئے ہیں۔ آج تھیٹر کا پروگرام ہے اور آپ دوستوں کو سمیٹے پھرتے ہیں۔ آج مشاعرہ ہے اور آپ پورے انہماک کے ساتھ بزم آراستہ کر رہے ہیں سچ تو یہ ہے کہ احباب کی شیرازہ بندی اُسی کے دم سے تھی مگر اب وہ سب کچھ چھوڑ کر صرف اپنی بیوی کا سہاگ بنکر رہ گیا ہے نہ وہ زندگی نہ وہ زندہ دلی ایک عجیب آسیب زدہ سی کیفیت میں ہر وقت مبتلا نظر آتا ہے۔ وہ ذہانت جو اُس کے خد و خال میں شامل تھی اب اُس کے آس پاس بھی نظر نہیں آتی اور کبھی کبھی تو واقعی دوستوں کی محفل میں اُس کا ذکر اس طرح ہوتا ہے جیسے کوئی مرا ہوا دوست یاد کیا جائے۔ اُس کی اس کیفیت پر جی کڑھتا ہے دل دُکھتا ہے اُس پر ترس بھی آتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے یہ تو کچھ مشیتِ ایزدی کے قسم کی چیز ہے جس میں کوئی چارہ ہی نہ ہو۔

اب آپ ہی فرمائیے کہ ان حالات میں یکایک اُس کا آنا اور تفصیل کے ساتھ بیٹھنے کے انداز سے ٹوپی اُتار کر ٹائی ڈھیلی کر کے اور کوٹ

کے بٹن کھول کر بیٹھتے ہوئے یہ کہنا کہ "کل میرا نکاح ہے"، پاگل بنا دینے والی بات ہے یا نہیں۔ میں تو حیرت سے مُنہ کھول کر رہ گیا اور یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ کیا تم نے وہی کہا ہے جو میں نے سُنا ہے۔ مگر اُس نے میری اس حیرت کو خاطر میں لائے بغیر کہنا شروع کیا۔ "یہ بات بس میرے اور تمہارے درمیان رہنا چاہیئے فی الحال مصلحت یہی ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو ورنہ سخت گڑبڑ پیدا ہو جائے گی۔"

میں نے اسی عالمِ حیرت میں کہا۔ "مگر یہ تم کہہ کیا رہے ہو کیسا نکاح۔ کس سے نکاح کچھ بتاؤ تو سہی۔"

اسلم نے اس طرح گویا مجھے سب معلوم ہے کہنا شروع کیا۔ "تمہیں سب معلوم ہے۔ بس تمہارے لئے صرف اتنا ہی سمجھنا کافی ہے کہ کل میرا نکاح ہے جس میں میری طرف سے صرف تم شرکت کرو گے۔ نکاح کے بعد شادی کے موقع پر دیکھا جائیگا پھر جیسے حالات ہوں گے ویسا ہی بند و بست کر لیں گے۔"

میں نے کچھ نہ کچھ معلوم کرنے کے شوق میں کہا۔ "مگر یہ تم کو سوجھی کیا۔"

اسلم نے بہت ہی دردناک لہجہ میں کہا۔ "تم بھی یہ کہہ رہے ہو کہ مجھے سوجھی کیا۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ تم یہ پوچھو گے کہ یہ بات اب تک کیوں نہ سوجھی تھی۔ تم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کیسی قابلِ رحم زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میرا اس دنیا میں اب کوئی نہیں ہے۔ میرے والدین۔ میرے عزیز۔ میرے دوست سب مجھ سے چھینے جا چکے ہیں۔ مجھ کو ذہنی طور پر نکمّا بنایا جا چکا ہے۔ میری حیثیت اب صرف اُس کُتّے کی رہ گئی ہے جس کی زندگی کا واحد مشغلہ دُم ہلانا رہ جائے۔"

میں نے اور بھی تعجب سے کہا۔ "کیا یہ باتیں تم خود بھی محسوس کر رہے ہو؟"

اسلم نے اپنے کو کھول کر سامنے رکھ دینے کے انداز سے کہا۔ "میں نے یہ باتیں اب محسوس نہیں کی ہیں ہمیشہ محسوس کرتا رہا ہوں مگر مجھ کو امید تھی کہ میری شرافت سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کا سلسلہ کبھی نہ کبھی ختم ضرور ہوگا۔ میں تصادم سے ہمیشہ ڈرا۔ میں نے گھریلو عافیت پر بہت سی قربانیاں دیں۔ میں نے ہمیشہ یہ چاہا کہ جو گھر میں نے بسایا ہے وہ اُجڑنے نہ پائے مگر اس کا مطلب میری بیوی نے ہمیشہ یہ سمجھا کہ میں ہوں ہی اس قابل کہ وہ مجھ کو موم کی ناک کی طرح جس طرف چاہیں موڑ دیں۔"

میں نے بھی اب صاف صاف باتیں کرنا مناسب سمجھ کر براہِ راست سوال کیا۔ "گویا تمہارا مطلب یہ ہے کہ تم دراصل بُزدل نہ تھے۔"

اسلم نے اعتراف کیا "محبت انسان کو بُزدل بھی بنا دیتی ہے۔ میں نے ایک پجاری کی طرح اپنی بیوی کو پوجا اور وہ سچ مچ احساسِ برتری میں مبتلا ہو کر غلط فہمی کا ایسا شکار ہوئیں کہ وہ مجھ کو مسلسل احساسِ کمتری میں مبتلا کرتی رہیں۔"

میں نے کہا۔ "مگر حیرت ہے کہ اس کے باوجود تم اپنی اس ہمّت اور جُرأت کو کیونکر محفوظ رکھ سکے کہ عقدِ ثانی کا ایک دم حوصلہ کر بیٹھے۔"

اسلم نے سچائی سے کہا۔ "مجھ میں یہ حوصلہ اب بھی نہیں ہے اگر یہ حوصلہ ہی ہوتا تو شاید تم کو بھی نکاح کے بعد ہی خبر ہوتی۔ یہ جرأت میں اُس وقت کر رہا ہوں جب میرے لئے سوائے خودکشی کے کوئی چارہ نہیں ہے۔ میری گھریلو زندگی اس حد تک تلخ بن چکی ہے کہ میں اپنا دماغی توازن کھوئے بیٹھا ہوں۔ مجھ کو اب پوری طرح یقین ہو چکا ہے کہ ان کو مجھ سے محبت نہیں ہے اور جب محبت نہ ہو تو عزت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بڑی بڑی باتیں میں جھیل گیا میں نے ان کے لئے دنیا بھر کو چھوڑ دیا پھر بھی ان کو نہ پا سکا ان کے اور میرے مزاج میں متوازی خطِ مستقیم کی سی کیفیت ہے جو کبھی نہ مل سکا۔ میں تم کو کیسے بتاؤں کہ ان کی زیادتیاں برداشت کرنے میں اپنی روح کو میں نے کس حد تک کچلا ہے اور اب چھوٹی چھوٹی باتیں برداشت کرنے کی بھی مجھ میں سکت نہیں ہے اگر اب میں زندگی کا کوئی اور سہارا نہیں ڈھونڈھتا تو خدا جانے کب کونسا جذبہ مجھ کو بجلی کے ننگے تار سے لپٹ جانے پر مجبور کر دے۔ خدا جانے کب میں ریل کی پٹری پر سر رکھ کر جان دے دوں۔"

میں نے گھبرا کر کہا۔ "پاگل نہ بنو میں تمہارے عقدِ ثانی کی مخالفت نہیں کر رہا ہوں۔ پوچھنا صرف یہ ہے کہ تم نے نتائج پر غور کر لیا ہے؟"

اسلم نے کہا۔ "نتائج بہرحال خودکشی سے تو بہتر ہی ہوں گے اور اگر بدتر بھی ہوں تو حرام موت سے حلال زندگی بہرحال بہتر ہے۔"

میں نے اُسکی تائید کی۔ "یقیناً بہتر ہے۔ میں تو صرف اس لئے پُوچھ رہا ہوں کہ مجھ کو تمہاری جُرأت اور ہمّت میں شک ہے۔"

اسلم نے کہا " بے شک۔ تو خود مجھ کو بھی ہے میں جرأت اور ہمت سے اتنے دن بیگانہ رہ چکا ہوں کہ اس ارادے کا میرے آس پاس گذر بھی ناممکن تھا مگر جب صورتِ حال موت اور زندگی کا سوال بن گئی تو میں بمشکل اپنے کو اس جیتی جاگتی خودکشی کے لئے آمادہ کر سکا۔

میں نے کہا " یعنی تم اس عقدِ ثانی کو بھی جیتی جاگتی خودکشی سمجھتے ہو "

اسلم نے بڑے وثوق سے کہا " یقیناً۔ اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ اس کے نتائج میرے لئے کس حد تک ہولناک ہوں گے۔ تم یہ نہ سمجھو کہ اس عقد میں میرے لئے کوئی تلذذ ہے۔ یہ بھی دراصل ایک آزمائش ہے کہ شاید اسی طرح مجھ کو میری زندگی کے کچھ حقوق مل سکیں۔ اگر یہ تجربہ بھی ناکام ثابت ہوا تو پھر میرے سامنے وہی موت رہ جاتی ہے جس سے میں نے یہ آخری موقع مانگا ہے "

میں نے کہا " ٹھیک ہے۔ مگر وہ جو تم ابھی کہہ رہے تھے کہ اگر تم میں حوصلہ ہوتا تو شاید مجھ کو بھی نکاح کے بعد ہی خبر ہوتی اس سے تمہارا کیا مطلب تھا "

اسلم نے کہا " ہاں مجھ کو تم سے بہت بڑا کام لینا ہے اور میں صرف اس اُمید پر تمہارے پاس آیا ہوں کہ تم ہی میرے ایک ایسے دوست ہو جو انکار نہ کروگے۔ میں نے اپنی ہونے والی سُسرال میں سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے کہ میری پہلی بیوی موجود ہے اور اُس سے میرے تعلقات اس قسم کے ہیں۔ وہاں میں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ اگر میرے عقدِ ثانی کی میرے گھر خبر پہنچ گئی تو وہ ہنگامہ برپا ہوگا کہ شاید میں بھی اسکی تاب نہ لا سکوں۔ لہذا پہلے صرف نکاح ہو اور انتہائی رازداری کے ساتھ۔ وہ لوگ بہت معقول ہیں میرے حالات کی نزاکت کا ان کو پورا پورا احساس ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ ان حالات میں کیا لڑکی اُن پر ایسی بھاری ہے کہ وہ پھر بھی شادی کئے دیتے ہیں۔ قصّہ دراصل یہ ہے کہ وہ خود ایک قسم کا ثواب خرید رہے ہیں ان کو میری اس قابلِ رحم حالت کا اسی طرح علم ہے جس طرح تم کو ہے۔ بھئی تم زیادہ نہ اُلجھو میں تم کو صاف صاف بتائے دیتا ہوں کہ جاوید مدّت سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ میں لعنت بھیجوں اس زندگی پر اور اگر اپنی موت کو خود مدعو کرنا نہیں چاہتا تو عقدِ ثانی کر لوں۔ اُس نے مہینوں مجھ میں ہمت پیدا کرنے کی کوشش کی اور آخر خود اپنی بہن سے میری نسبت طے کر دی "

میں نے تعجب سے کہا " یعنی یہی اپنا جاوید ؟ "۔

اسلم نے کہا " ہاں ہاں اپنا جاوید۔ اور نہیں تو کس کو غرض پڑی تھی کہ وہ ان حالات کو دیکھتے ہوئے مجھ پر ایسا اندھا اعتماد کر لیتا کہ لڑکی اُٹھا کے حوالے کر دیتا۔ بہرحال چھوڑو یہ قصّہ اب تم صرف میری اتنی مدد کر دو کہ چلو تو میرے نکاح میں مگر دُولہا بننے کے لئے تیار ہو کر "

صاحب میں بالکل بوکھلا کر رہ گیا کہ یہ اس شخص نے کیا کہہ دیا ایک دم سے مگر میں ابھی پوری طرح سٹپٹانے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے اپنی پوری اسکیم مجھ کو سمجھا دی کہ وہ جا تو رہا ہے یقیناً اپنے نکاح کے لئے مگر اس طرح جانا چاہتا ہے کہ کسی کو اس پر دُولہا ہونے کا شبہ تک نہ ہو سکے ورنہ اُسکی جان نکل رہی تھی اس خیال سے کہ شیطان کے کان بہرے اگر کسی نے اس کو دُولہا بنا دیکھ لیا اور خبر ہو گئی بیوی کو تو کیا ہوگا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس طرح جاؤں کہ محفل میں اگر کسی کو دولہا سمجھا جا سکے تو مجھ کو۔ کہنے لگا " میں اس کے لئے تو تیار ہوں کہ نکاح کی منظوری قاضی کو خود دیدونگا مگر محفل میں دُولہا کی حیثیت سے مسلسل بیٹھے رہنا یہ میرے امکان میں نہیں ہے تم جانو ہزار دشمن ہو سکتے ہیں نہ جانے کون یہ خبر وہاں پہنچا دے "

میں نے کہا " مگر برادرم یہ خبر آخر کب تک چھپی رہے گی۔ بیوی سے اگر ایسا ہی ڈرتے ہو تو یہ ارادہ ہی غلط ہے "

کہنے لگے " نہ نہ۔ تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ میں بس نکاح کی حد تک ڈرتا ہوں۔ جاوید سے میرا پروگرام یہ طے ہوا ہے کہ نکاح کے بعد ہی اس نکاح کی خبر میں خود ایک نہایت تفصیلی خط کے ذریعے ان کو پہنچا دونگا۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ ایک حشر برپا ہوگا۔ میں جاوید کی طرح تم سے بھی وعدہ کرتا ہوں کہ اس حشر کا مقابلہ کرونگا اور جب حالات معمول پر آجائیں گے میں باقاعدہ شادی کر لونگا "

میں نے صاف صاف کہا " بھائی میرے معاف کرنا میں جاوید نہیں ہوں کہ تمہاری یہ بات میری سمجھ میں بھی آجائے۔ جس شخص کی ہمت اور حوصلے کا

عالم یہ ہو کہ وہ اپنے نکاح کی محفل میں دُولہا کسی اور کو بنا کر بٹھائے وہ حشر کا مقابلہ خاک کریگا۔"

اسلم نے کہا "پھر وہی۔ صاحب میں اس موقع پر بھی اپنی ہمّت کا ثبوت دے سکتا تھا مگر میں نہیں چاہتا کہ نکاح کی محفل میں کوئی دوسرا ہی تماشہ شروع ہو جائے اگر نکاح سے قبل میری بیوی کو خبر ہو گئی تو وہ خدا جانے کیا کر گذریں۔ نکاح کے بعد حالات بدل جاتے ہیں کہ اب تو بہر حال نکاح ہو چکا۔ بس میں تو جاوید کے گھر کو نکاح کی محفل کو تماشہ گاہ بنانا نہیں چاہتا ورنہ اب تو میں ہر صورتِ حال کے لئے اپنے کو آمادہ کر چکا ہوں۔"

بات کچھ عجیب ضرور تھی مگر اسلم سے انکار نہ کیا جاسکا اور اس کو دعدہ کرکے مطمئن کر دینے کے بعد جب رخصت کر دیا تو میں مسلسل اسی بات پر غور کرتا رہا کہ جاوید کی بہن کو میں دیکھ چکا ہوں پڑھی لکھی۔ صورت شکل کی اچھی نہایت باسلیقہ اس کو بہتر سے بہتر شوہر مل سکتا تھا آخر یہ جاوید کو سوجھی کیا کہ اسکی نظرِ انتخاب کا مرکز یہ حضرت بنے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر ایک طرف اسلم دوست تھا تو دوسری طرف جاوید بھی کوئی غیر نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ اپنے تمام دوستوں کو بیحد عزیز ہے اُسکی زندگی جس طرح المناک بن چکی ہے اس کا احساس بھی جاوید سے کم مجھ کو نہیں ہے مگر میں جاوید کی جگہ ہوتا تو اپنی بہن کی شادی اسلم سے ہرگز نہ کرتا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ اگر میں اس وقت جاوید کے پاس جاکر اس کو خطرناک اقدام سے باز رہنے کا مشورہ نہیں دیتا تو یہ میرے اُس خلوص کی بد دیانتی ہوگی جو مجھ کو اُس سے ہے۔ چنانچہ میں سیدھا جاوید کے گھر پہنچا جو واقعی نکاح کے انتظامات میں مصروف تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی بولا ۔

"آئیے آئیے مولانا۔ بھئی معاف کرنا۔ میں تم سے اس باب میں اب تک اس لئے کچھ نہ کہہ سکا کہ اسلم کی سخت ممانعت تھی اور یہ چونکہ اُس کا راز تھا لہٰذا مجھے کوئی حق نہ تھا کہ میں اُسے کسی پر ظاہر کرتا۔ ابھی وہ حضرت کہہ گئے ہیں کہ اب اس راز میں تم بھی شامل ہو لہٰذا اب میں بھی آزاد ہوں کہ تم سے کچھ مشورہ کروں سوال اس وقت یہ درپیش ہے کہ نکاح عصر کے بعد ہو یا مغرب کے بعد۔ یعنی چائے نکاح کے بعد ہو یا نکاح سے پہلے۔"

میں نے کہا "میں یہ بیہودہ مشورے دینے نہیں آیا ہوں۔ مجھے جناب سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ غریب بہن سے آخر کیا شکایت تھی کہ اُس کو زندگی بھر کے اس جھگڑے میں پھنسا رہے ہو۔"

جاوید نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا "نا بابا۔ مجھے اس سلسلے میں قصوروار نہ ٹھہرائیے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ میں ضرور چاہتا تھا کہ اسلم کی جان کسی طرح بچ جائے۔ میں اُس کو عقدِ ثانی کے لئے حق بجانب بھی سمجھتا تھا مگر یہ تو میرے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ شکیلہ سے اُسکی شادی ہو سکتی ہے، میں اُس کو دوسری شادی کر لینے پر اُکسا ضرور رہا تھا اور شکیلہ بھی میرے ساتھ اُس پر زور ڈال رہی تھی کہ ان حالات میں اسلم کو دوسری شادی کر لینے کا حق ہے۔ مگر ایک دن میں خود حیران رہ گیا جب شکیلہ نے مجھ کو ایک لفافہ بھیجا جس میں اس نے لکھا تھا کہ میں اسلم صاحب کو عقدِ ثانی پر آمادہ کر چکی ہوں اور اُس سے وعدہ کر چکی ہوں کہ ان کی یہ دوسری شادی مجھ ہی سے ہوگی۔ میں خود یہ خط پڑھ کر سناٹے میں رہ گیا پھر میں نے اس بیوقوف لڑکی کو بہتیرا سمجھایا مگر اُس نے صاف صاف مجھ سے کہہ دیا کہ اسلم صاحب آپ کے صرف دوست ہیں اور میرے پسندیدہ مصنّف، میرے لئے ایک معیاری شریف انسان ہیں ان کو اپنے لئے ہلاکت سے بچانا چاہتی ہوں اور اگر یہ میری غلطی ہے تو اسکی ذمہ دار میں خود ہوں۔"

اب مجھ کو بھی اطمینان ہو گیا اور میں صرف یہ کہہ سکا "بس تو پھر ٹھیک ہے۔"

جاوید نے مجھ کو شکیلہ کا پہلا خط بھی دکھا دیا اور آخری خط بھی جس میں اُس نے قطعی طور پر لکھ دیا تھا کہ اگر میں نے اسلم سے شادی نہ کی تو اسکی موت یقینی ہے اور اس کے خون کے دھبّوں سے ہمارا دامن بھی نہ بچ سکے گا۔ جاوید نے یہ خطوط دکھا کر کہا "اب فرمائیے سوائے اس کے کیا چارہ تھا کہ شادی کر دی جائے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ اب میں مطمئن ہو گیا۔ میں اسلم کو جتنا بدنصیب سمجھے ہوئے تھا وہ اتنا ہی خوش نصیب نکلا۔"

جاوید نے کہا "یہ فیصلہ بھی قبل از وقت ہے میرے نزدیک۔"

بہر حال جو ایک بار سا تھا ذہن پر وہ اُتر گیا اور میں جاوید کے گھر سے نہایت مطمئن واپس آیا اور اسلم کے لئے اپنے کو اس بات پر بھی آمادہ کر لیا کہ بجائے ان کے اہلِ محفل مجھ کو دولہا سمجھیں چنانچہ دوسرے دن بیوی سے کہکر اپنے نکاح کی کمخواب والی شیروانی بھی نکلوائی۔ پاپوش بھی وہ نکالی جس میں بات کو لاجواب کرنے کے لئے آفتاب کی کرن لگائی جاتی ہے۔ بیوی نے پوچھا بھی کہ بوڑھے مُنہ کو یہ مہاسوں کا شوق کیوں ہوا ہے مگر چونکہ یہ اسلم کا راز تھا لہذا ان سے صرف یہ کہدیا کہ ایک فینسی ڈریس بال میں جانا ہے اور مقررہ وقت پر اسلم کے ساتھ واقعی اس طرح بن سنور کر چلے کہ خود دولہا نظر آتے تھے اور دولہا میاں حسبِ معمول سائیس نظر آرہے تھے۔ جاوید کے گھر پہنچے تو اس مسخرے نے واقعی اُس مسند پر بٹھا دیا جو دولہا کے لئے مخصوص تھی۔ خود اسلم کا عالم یہ تھا کہ خون کی دو چار چھینٹیں جو رُخِ روشن پر باقی رہ گئی تھیں وہ بھی اس وقت غائب تھیں۔ ہر آنے جانے والے کو دیکھ کر اس طرح بھڑک رہے تھے گویا بیوی ہی بھیس بدل کر آگئی ہوں دولہا کی حیثیت سے نہیں براتی کی حیثیت سے بھی جو ہار ان کے گلے میں ڈالا گیا تھا وہ بھی اس نے میرے ہی گلے میں ڈال دیا شکر ہے کہ نکاح کے وقت اس ذمہ داری کو البتہ خود ان حضرت نے قبول کر لیا باقی تمام ذمہ داریاں میرے ہی سر رہیں۔ نکاح ہو جانے کے بعد میں نے اسلم کے کان میں کہا ”تم کو اقدام خود کشی سے بچانے کے لئے شکیلہ خود کشی کی مرتکب ہو گئی“۔

اور اس تقریب سے رخصت ہو کر جب میں گھر پہنچا ہوں تو ہوش اُڑ گئے میرے بیوی کو لخلخے سنگھائے جا رہے تھے اُن کی بہنیں اپنے اپنے ڈوپٹے میں مُنہ چھپائے رو رہی تھیں۔ بمشکل تمام پتہ چلا کہ اب تک یکے بعد دیگرے تین علینی شاہد گذر چکے ہیں جو مجھ کو دولہا بنا ہوا دیکھ کر آئے ہیں خود بیگم کی خالہ زاد بہن نے اپنی آنکھوں سے مجھ کو دولہا بنا ہوا دیکھا ہے اور اندر یہ بھی سُنا ہے کہ لڑکے کی یہ دوسری شادی ہے پہلی بیوی موجود ہے جس سے تعلقات خراب ہیں۔ میں نے ایک قہقہہ بلند کیا کہ یک نہ شد دو شد۔ سب سے چھوٹی سالی نے ہچکیاں لیکر کہا ”جی ہاں دو شد۔ کیوں نہ ہو آپ کو تو چار تک کی اجازت ہے۔ مگر قصور کیا تھا باجی کا ــــ

میں نے کہا ”باجی کی بچی پہلے میری بات تو سن لے“ اور پھر تمام قصہ سب کو سُنانا چاہا مگر اب معلوم ہوا کہ قصہ سُنانے سے کام نہ چلے گا لہذا جا رہے ہیں خود شکیلہ کو لینے جو یہاں آکر اعلان کر سکے کہ میرا چچا یہ نہیں بلکہ اسلم ہے ــــ
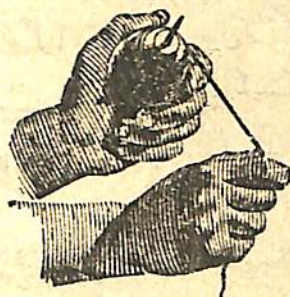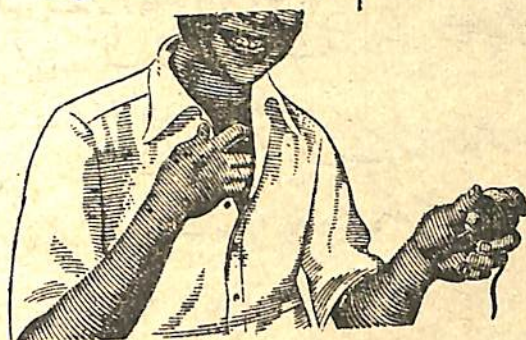
شخصیات

۱— عصمت چغتائی

۲— بلونت سنگھ

۳— حیات اللہ انصاری

۴— شوکت تھانوی

عصمت

اخلاق احمد دہلوی

ضدی بیٹی، سعادت مند بہو، مارے خلوص کے بات بات پر میاں سے لڑنے والی بیوی، مامتا ظاہر نہ ہونے دینے والی ماں اور اسم بامسمّیٰ
ـــــ یہ ہیں عصمت جنہیں لوگ عصمت چغتائی کے نام سے بھی جانتے ہیں اور عصمت شاہد لطیف کے نام سے بھی۔ عصمت نہ خوبصورتوں میں شمار ہو سکتی ہیں اور نہ بدصورتوں میں، درمیانے درجے کا دُہرا ڈیل، طویل القامت اور متناسب الاعضا۔ عام طور پر بیمار رہنے اور علاج نہ کرنے کی قائل۔ کھلتا ہوا گیہواں رنگ جو اب بمبئی میں رہتے رہتے زیادہ سنولا گیا ہے۔ موتی کی لڑی سے دانت، جو پان کھاتے رہنے کے باوصف کتھے چونے کا اثر قبول نہیں کرتے، پتلے پتلے ہونٹ، مختصر سی ناک، اور بھرے بھرے رخسار، جتنے سلجھے ہوئے خیالات سر پر اُتنے ہی اُلجھے ہوئے بال، متجسّس آنکھیں اور آنکھوں پر سونے کے فریم کی محدّب شیشوں کی عینک، مجموعی طور پر چہرے سے ذہانت اور طبّاعی کے آثار نمایاں، ہنس مکھ اور تند مزاج۔ لکھنے پڑھنے میں جتنی بے باک، بات چیت میں اُتنی ہی محتاط۔ بقول بڑی بوڑھیوں کے پہننے اوڑھنے سے اچھی معلوم ہو سکتی ہیں۔ لیکن عام طور پر صرف تن ڈھانکنے کے لئے کپڑے پہنتی ہیں، آرائش یا زیبائش کے خیال سے نہیں۔ گہنے پاتے اور بناؤ سنگھار سے کتراتی ہیں۔ کبھی کبھی غرارہ یا شلوار بھی پہنتی ہیں۔ لیکن اُن کا من بھاتا لباس ساڑھی ہی ہے۔ بھڑکیلے اور قیمتی لباس خود پہنیں، نہ دوسروں کو پہنے دیکھ سکیں۔ کھانے پینے کی شوقین کم، اور کھانے پکانے کی زیادہ۔ گھر گرہستی کے کاموں میں اتنا انہماک برتتی ہیں کہ اگر آپ اِن کے گھر جائیے تو کچھ نہ کچھ سیتا پروتا ہی پائیے۔ لیکن اس کے باوجود کبھی انہیں سڑک پر یا کسی اور پبلک مقام میں ہاتھ میں اُون کے گولے یا سلائیاں لئے نہیں دیکھا گیا۔ مطالعہ کرتے آج تک نہیں پکڑی جا سکیں۔ انہیں کتابیں پڑھنے کا کم اور زندگیاں پڑھنے کا زیادہ شوق ہے۔ جہالت سے نفرت کرتی ہیں۔ لیکن جاہل اور مفلوک الحال عورتوں میں گھس گھس کر بیٹھنے اُن کے رنڈ رونے سننے اور اُن کے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھنے کا جنون ہے۔ حتّی الامکان اُن کی ہر ممکن مدد بھی کرتی ہیں۔ اور موجودہ معاشرے کی غلط قسم کی بندشوں سے اُنہیں آزاد کرانے کی کوشش بھی۔

خود اپنے میاں سے جاہل عورتوں کی طرح لڑتی ہیں۔ اور شاید اُن سب جاہل عورتوں کا بدلہ شاہد لطیف صاحب سے لیتی ہیں جو بعض غلط قدیم روایات کے دباؤ سے بے بس کہ اپنے جائز حقوق کے لئے بھی اپنے اپنے شوہروں سے لڑنے پر قادر نہیں، میاں سے لڑ کر عام طور پر میکے کا رُخ کرتی ہیں اور جب تک میاں خود منانے نہ آئیں روٹھی ہی رہتی ہیں۔ اگر آپ کسی موضوع پر اِن سے کوئی بحث چھیڑ بیٹھیں تو پھر جب تک آپ کو قائل نہ کر لیں یا خود قائل نہ ہو جائیں۔ بحث ختم نہیں کرتیں۔ لیکن خود کسی بحث کا آغاز بہت کم کرتی ہیں اور

شاعروں سے زیادہ نثر نگاروں سے بحث کرنا پسند کرتی ہیں۔

پیدل چلنے سے گھبراتی ہیں۔ لیکن اگر چلنا ہی پڑے تو پھر میلوں کی مسافت باتوں باتوں میں طے کر جاتی ہیں۔ اپنی تحریروں کا معاوضہ خود طلب نہیں کرتیں، ہاں اگر کوئی معاوضہ دینے پر اُتر ہی آئے تو پھر اس پر کبھی کبھی ناراض بھی ہو لیتی ہیں کہ معاوضہ کم ہے۔ اور جز بز ہو کر کم ہی معاوضہ قبول کر لیتی ہیں۔ جاہل اور پسماندہ عورتوں کی حالت پر خود کڑھتی رہتی ہیں۔ لیکن اُنہیں خود اپنی حالت پر کڑھتے نہیں دیکھ سکتیں۔ اُنہیں بغاوت ہی کی تلقین کرتی ہیں۔

سب سے زیادہ تصنع سے جلتی ہیں۔ بلا کی فضول خرچ۔ لیکن اگر تنگدستی ہو تو اُسی درجہ کی صابر و شاکر۔ پلیسہ جب ہوتا ہے تو پانی کی طرح بہاتی ہیں۔ نہیں ہوتا تو غم غلط کرنے کے لئے افسانے اور ناول لکھتی ہیں۔ لکھتی عام طور پر فرش پر اوندھی لیٹ کر ہیں۔ یا پھر اسی دھج سے پلنگ پر تکئے پر کاغذ رکھ کر۔ میز کرسی کا استعمال کم کرتی ہیں۔ لباس عام طور پر جلدی جلدی تبدیل کرتی ہیں اور بہت عجلت میں۔ کپڑوں میں سادگی کے باوجود کسی نہ کسی حد تک COLOUR - SCHEME کا خیال رکھتی ہیں۔

جب لکھنے بیٹھ جاتی ہیں بے تکان اور قلم برداشتہ لکھتی چلی جاتی ہیں اور جب تک لکھنے سے دل برداشتہ نہ ہو جائیں لکھتی رہتی ہیں، لکھتے وقت بظاہر گردوپیش سے بے نیاز ہو جاتی ہیں۔ اور بالعموم ایک نشست میں ایک افسانہ یا کسی ناول کا مکمل ایک باب لکھ کر دم لیتی ہیں، کبھی اپنے لکھے پر نظر ثانی نہیں کرتیں۔ اور ایک دفعہ کوئی لفظ یا کوئی فقرہ لکھ کر بہت کم قلمزد کرتی ہیں۔ افسانوں اور ناولوں میں افراد کے نام اور واقعات عام طور پر اصلی اور صحیح لکھتی ہیں۔ اِسی لئے اپنے جانب کار حلقوں میں "سعد اللہ" بن کر رہ گئی ہیں۔ سچی بات سعد اللہ کہیں، سب کے مُن سے اُترے رہیں۔ عورتوں کو دماغی اعتبار سے مردوں سے کم تر نہیں سمجھتیں اور اپنے ملک کی عورتوں کے نکمے پن کی ذمے داری مردوں پر نہیں خود اُن عورتوں پر رکھتی ہیں جو بلا وجہ مردوں سے دبی جاتی ہیں۔

اُردو ادب میں جتنی جلدی اور جتنا اہم مقام عصمت نے پیدا کیا، اُسی طرح ہندوستانی فلم میں بھی کم و بیش وہی اہمیت حاصل کر لی۔ فلم کے لئے بھی عصمت نے اُتنی ہی کامیاب کہانیاں لکھیں جیسے ریڈیو کے لئے ڈرامے۔ لیکن چونکہ بہت جلد ہر چیز سے اُکتا جاتی ہیں، اس لئے اب کچھ عرصے سے فلم کے لئے بھی لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ بہر حال عصمت اگر آئندہ کچھ بھی نہ لکھیں تب بھی اُنہوں نے اتنا ضرور لکھ دیا ہے کہ چاہے آپ اُردو ادب کا ذکر کریں یا ریڈیو اور فلم کا، عصمت کا نام لئے بغیر چارہ نہیں۔ پھر بھی یہ ممکن نہیں کہ عصمت لکھنا بند کر دیں، وہ بغیر کھائے رہ جائیں بغیر لکھے نہیں رہ سکتیں۔ اور کیونکہ زندگی کے بارے میں اُن کا ایک مستقل زاویۂ نظر ہے اِس لئے جب تک پورا معاشرہ اُس زاویے پر نہ ڈھل جائے اُن کا کام ختم نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

یہ بلونت سنگھ ہے!

میں نے اسے چاہا ہے۔ اس سے محبت کی ہے۔ اس کے ساتھ زندگی کے بعض بہترین لمحے گزارے ہیں۔ اور اس طرح مجھے اس کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ لیکن آپ صرف اس کا تصور کر سکتے ہیں۔ اسے دیکھ نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ تو بہت کم نظر آتا ہے۔ اور اگر کبھی نظر آبھی جائے تب بھی نظر نہیں آتا۔ کیونکہ وہ آپ کی نگاہ سے بچ کر چلتا ہے اور کسی حالت میں بھی آپ کو اپنے وجود کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ یا یوں کہئے کہ وہ آپ کو نہیں دیکھتا۔ نگاہ بچا کر چلتا ہے اور اس کی یہ کوشش نہیں ہوتی کہ وہ آپ کے وجود کو محسوس کرے۔ اس لئے آپ صرف اس کی ایک جھلک ہی دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس کو بھی غنیمت ہی سمجھنا چاہئے کیونکہ وہ تو جھلک دکھانے کا بھی قائل نہیں۔ لیکن آپ کو اس کی جھلک کہیں نہ کہیں نظر ضرور آجائے گی۔ اور اس کی جھلک دیکھ کر آپ کو اس سے ملنے کا خیال بھی ضرور آئے گا۔ لیکن اس سے ملنا تو جوئے شیر کا لانا ہے۔ وہ ملنے کے باوجود کسی سے نہیں ملتا اور آپ ملنے کے باوجود اس سے نہیں مل سکتے۔ یوں ملاقات تو اس سے ایسی کچھ مشکل نہیں ہے لیکن ملاقات کے بعد آپ دیر تک یہ سوچتے رہیں گے کہ آیا بلونت سنگھ سے ملاقات ہوئی بھی یا نہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ ملاقات کا قائل ہی نہیں ہے۔ آپ اس سے ملنے جائیں تو وہ سٹ پٹا جائے گا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ کیا کرے۔ آپ اس سے مزاج پوچھیں گے وہ چپ رہے گا۔ آپ اس سے ملاقات پر مسرت کا اظہار کریں گے وہ چپ رہے گا ایک آدھ فقرہ گھبراہٹ میں ڈوبا ہوا اس کے منہ سے نکل جائے تو غنیمت سمجھئے۔ ورنہ وہ ان لوگوں کے سامنے بولتا ہی کب ہے جن سے اس کی واقفیت نہیں ہوتی۔ اس لئے ایسی ملاقاتوں میں جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے اس کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار بڑھتے جاتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ اس عالم میں اس پر ترس کھانے کو جی چاہتا ہے۔ ہمدردی کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ سب کچھ اسی طرح ممکن ہے کہ آپ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر وہاں سے رخصت ہولیں۔ اور اس کو اس کے حال پر چھوڑ دینا اس پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو اسی وقت ہوگا جب آپ اس سے رخصت ہونے لگیں گے۔ آپ کو اس کے سر سے ایک بوجھ سا اترتا ہوا محسوس ہوگا۔ اس کی سنجیدگی پر تولتی ہوئی نظر آئے گی۔ اس کے جسم میں زندگی کے آثار نمایاں ہوتے ہوئے دکھائی دیں گے اور آپ کے جانے کے بعد وہ صحیح معنوں میں اپنے آپ کو سمیٹنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن آپ اس سمٹنے کے منظر کو دیکھ نہیں سکیں گے کیونکہ یہ کیفیت تو آپ کے رخصت ہو جانے کے بعد اس پر پوری طرح رونما ہوگی۔

میں جب اس سے دلّی میں پہلی بار ملا تو مجھے اسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب دلّی ایک دفعہ اجڑ کر از سر نو بس چکی تھی اُردو کے بہت سے ادیب اور شاعر وہاں سے رخصت ہو کر پنجاب اور سندھ پہنچ چکے تھے اور پنجاب سے کچھ ادیب اور شاعر مشرقی پنجاب اور دلّی آگئے تھے۔

اس اعتبار سے دلّی اب پنجاب ہوگئی تھی۔ لیکن پہلے اس میں جو پنجاب کا سا حسن تھا وہ اب بقول شخصے ملتان بہہ گیا تھا ؎

تھا ذوقؔ پہلے دلّی میں پنجاب کا سا حسن
پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہہ گیا

آدمی ان دنوں دیکھنے کو نہیں ملتا تھا۔ ادیبوں اور شاعروں کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ادبی محفلوں کے لئے آنکھیں ترستی تھیں۔ ادب و شعر پر بات کرنے والوں کو جی ڈھونڈتا تھا۔ آزادی اپنے ساتھ ایک سیلاب بلا لائی تھی۔ ویسے ایک ہنگامہ تھا۔ چپّے چپّے پر انسان ہی انسان تھے۔ آبادی کئی گنی زیادہ ہوگئی تھی لیکن ہم مذاق انسان کا ملنا ایک معجزہ تھا۔ میں ادیبوں اور شاعروں سے زیادہ ملنے کا قائل نہیں —— بلکہ میں تو ان سے اکثر دامن بچا کر نکل جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن اس دور پر آشوب میں ایک ایسی تنہائی کا احساس ہوتا تھا جو اس سے قبل میری زندگی میں کبھی بھی نہیں آئی تھی۔ اس تنہائی نے مجھے اس دلّی میں اجنبی بنا دیا تھا جہاں مجھے کبھی اجنبیت کا خیال بھی نہیں گزرا تھا۔ جہاں کی ہر چیز سے مجھے بوٹے اُنس آتی تھی —— اب وہی دلّی میرے لئے اجنبی ہوگئی تھی۔ اس کی ایک ایک چیز میں مجھے غریبت کا احساس ہوتا تھا۔ اس ماحول میں ایسے لوگوں کو آنکھیں ڈھونڈتی تھیں جو اپنے ہم مذاق اور ہم مشرب ہوں۔ اور اس کے حصول کی تمنا نے مجھے ادیبوں اور شاعروں کے کچھ زیادہ ہی قریب کر دیا تھا۔ ورنہ میں کہاں، اور کہاں ان کی رنگا رنگ صحبتیں!

پریم ناتھ درؔ کی ذات ان دنوں میرے لئے ایک بہت بڑا سہارا تھی۔ اس نے اس زمانے میں ادب و شعر کی اس شمع کو فروزاں رکھا جو آندھیوں کی زد پر تھی۔ ادبی محفلوں کو منعقد کرنا اور بچے کھچے ادیبوں اور شاعروں کو جمع کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ حلقۂ ارباب ذوق کے جلسے اس زمانے میں بھی اس کے مکان پر ہوتے رہے تھے جب دلّی میں خون کا مینہ برس رہا تھا۔ یہ جلسے اخبارات میں اعلان کے ساتھ ہوتے تھے۔ دیکھنے والوں کو حیرت تھی کہ دلّی میں ابھی تک اس حلقے کے لوگ کس طرح موجود ہیں؛ انہیں تو ہجرت کر جانا چاہئے تھا —— لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جلسے ہوتے رہے۔ انہیں کوئی نہ روک سکا کیونکہ ان کے پیچھے پریم ناتھ درؔ کی شخصیت تھی۔ اس زمانے میں ایک جلسہ ایسا بھی ہوا جب صدر اور سیکرٹری تو موجود تھے لیکن حاضرین میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔ ایسی صورت میں ایک جانور کو سامنے بٹھا کر جلسے کی کارروائی مکمل کی گئی —— اس مستعدی کا اثر بڑا خوشگوار ہوا۔ جیسے جیسے حالات بہتر ہوتے گئے، لکھنے والوں نے جلسوں میں زیادہ پابندی اور مستعدی سے شریک ہونا شروع کر دیا۔ ان دنوں جو ادیب بھی دلّی میں آتا ان جلسوں میں ضرور شریک ہوتا۔ اسطرح ہر اتوار کو تقریب ملاقات نکل آتی تھی۔

بلونت سنگھ چونکہ دلّی آگیا تھا، اس لئے خیال تھا کہ وہ بھی ان جلسوں میں ضرور شریک ہوگا لیکن وہ نہیں آیا۔ پیغام بھی بھجوائے گئے لیکن اس نے اس طرف رُخ نہیں کیا۔ طرح طرح سے ٹالنے کی کوشش کی —— حقیقت یہ ہے کہ وہ جلسوں کی دنیا کا انسان نہیں تھا۔ میں نے اس کو کبھی کسی جلسے میں نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ دلّی میں اسوقت ادبی جلسے کچھ کچھ ہونے لگے تھے۔

اس طرح کئی مہینے گزر گئے لیکن بلونت سنگھ سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں نکلی۔ اس کی اس روپوشی نے آتش شوق کو اور بھی بھڑکایا۔ وقت کے ساتھ یہ خواہش بھی تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔

جوشؔ صاحب ان دنوں دلّی آگئے تھے اور ان کی ادارت میں "آجکل" باقاعدگی سے نکلنے لگا تھا۔ جوشؔ صاحب کے ساتھ آجکل کے ادارے میں عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد اور بلونت سنگھ بھی شامل تھے۔ ان کا دفتر علی پور روڈ پر تھا۔ یونیورسٹی وہاں سے ایسی کچھ دور نہیں تھی۔ میں جب وہاں سے پڑھانے کے بعد واپس ہوتا تو فلیگ سٹاف روڈ کی پہاڑی سے نیچے اتر کر جوشؔ صاحب سے ملنے کی غرض سے علی پور روڈ پر "آجکل" کے دفتر پہنچ جاتا تھا

جوش صاحب سے جب دلچسپ باتیں شروع ہوتی ہیں تو اپنا بھی ہوش نہیں رہتا۔ اس لئے کئی دن تک پہلے سے ارادہ کر لینے کے بعد بلونت سنگھ سے ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔

ایک دن ایسا ہوا کہ میں دفتر پہنچا تو جوش صاحب غائب تھے۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس کمرے میں پہنچا جہاں عرش ملسیانی بیٹھتے تھے۔ میں نے ان سے کہا "بلونت سنگھ دلی میں ہے لیکن اب تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ملنے کو جی چاہتا ہے" کہنے لگے "آئیے آپکی ملاقات کرائیں۔ قریب ہی بیٹھتا ہے"

ہم دونوں بلونت سنگھ کے کمرے میں پہنچے۔ کمرہ تاریک تھا۔ برقی لیمپ کی روشنی ہو رہی تھی اور اس لیمپ کی روشنی میں ایک بڑا خوبصورت سا سکھ میز پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے انداز میں ایک شانِ بے نیازی تھی ——— ایک ایسی بے نیازی جو انہماک کی آغوش میں پرورش پاتی ہے۔ جس میں ایک بے پایاں سکون ہوتا ہے۔ ایک بے اندازہ گیرائی ہوتی ہے۔ اس بے نیازی کا اظہار صرف اس کے انداز ہی سے نہیں ہو رہا تھا۔ مجموعی طور پر اس کی ساری شخصیت سے یہ خصوصیت ٹپک رہی تھی ——— اس کی سنجیدگی نے اس خصوصیت کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ اس کی سادگی اس خصوصیت کی کچھ اور بھی غمازی کر رہی تھی۔ اس کے بھرے بھرے جسم پر سادہ سا لباس تھا۔ ایک پتلون کے ساتھ ایک کوٹ اس کے جسم پر تھا۔ لیکن اس کوٹ کے ساتھ گلے میں ٹائی نہیں تھی۔ قمیص کا کالر کوٹ کے کالر کے نیچے دبا جا رہا تھا۔ قمیص کے بٹن تک ٹھیک سے لگے ہوئے نہیں تھے اور اس کے نتیجے میں بنیان قمیص کے اندر سے باہر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لباس میں اگر کہیں باقاعدگی کا احساس ہوتا تھا تو پگڑی میں۔ اس کی پگڑی بڑے فنکارانہ انداز میں بندھی ہوئی تھی۔ پگڑی کا رنگ بھی اپنے اندر ایک دلکشی رکھتا تھا۔ اس رنگ میں افشاں کی جو چمک تھی اس نے اس دلکشی میں چار چاند لگا دئے تھے۔ اس کے کھلتے ہوئے رنگ پر یہ پگڑی بہت ہی کھل رہی تھی۔ باقاعدگی سے گندھی ہوئی داڑھی نے اس کے رنگ کو نکھار دیا تھا۔ اس کی ذہانت نے آنکھوں میں ایک چمک پیدا کر دی تھی ——— یہ باتیں اس وقت مجھے اس کی شخصیت میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آئیں ——— لیکن خود بلونت سنگھ کو اس کا احساس نہیں تھا۔ بات یہ ہے کہ ان خصوصیات کو پیدا کرنے میں اس کی شعوری کوشش ذرا بھی شامل نہیں تھی تکلف سے اس کا حسنِ ذاتی بالکل بری تھا۔ اسی لئے باوجود سکھ ہونے کے اس میں ایک ایسا حسن تھا اور اس حسن میں ایک ایسی دلکشی تھی جو بے تکلفی ہی کے سہارے پیدا ہو سکتی ہے۔

جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو بلونت سنگھ نے کھڑے ہو کر ہمارا استقبال کیا۔ ہم نے اس سے قبل ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود ہمیں ایک دوسرے سے متعارف ہونے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ قبل اس کے کہ عرش صاحب رسمی تعارف کراتے ہم دونوں ایک دوسرے سے اس طرح بغلگیر ہوئے جیسے برسوں کے پرانے ساتھی ہیں۔ پھر ہم بیٹھ گئے اور باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ عرش صاحب تو تھوڑی دیر میں معذرت کر کے چلے گئے لیکن ہم دونوں اس پہلی ملاقات میں بلا مبالغہ تین گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔

یہ باتیں کتنی دلچسپ تھیں۔ ان میں کیسی رنگا رنگی تھی۔ ان میں کس درجہ تنوع تھا ایسی باتیں تو میں نے طالب علمی کے زمانے میں کی تھیں۔ بین الاقوامی سیاسی اور ادبی تحریکات سے لے کر عورت کے حسن اور اس کے سینے کی جاذبیت تک ہم بے شمار موضوعات پر باتیں کرتے رہے تھے اس گفتگو میں مجھے یہ اندازہ ہوا کہ بلونت سنگھ کو سیاست اور ادب سے کہیں زیادہ عورت کے حسن اور اس کے سینے سے دلچسپی ہے۔ لیکن اس دلچسپی میں جنسی بھوک اور تعیش پسندی کو دخل کم ہے۔ انسانی زندگی اور اس کے حسن کے جمالیاتی احساس کو دخل زیادہ ہے۔ یہ احساس ہمیشہ میں نے اس کی شخصیت پر محیط ہی دیکھا۔ اسی ملاقات میں اس نے کئی بار اس خیال کا اظہار کیا کہ ہم سب پڑھتے لکھتے ہیں، ادب کی تخلیق کرتے ہیں لیکن زندگی کو بسر کرنا نہیں جانتے ———

انسانی زندگی کتنی حسین ہے، اس میں کس درجہ دلکشی ہے۔ اس کی مسرتوں کا صحیح احساس ہمیں نہیں ہوتا۔ ہم تو مسرتوں کا خون کرتے رہتے ہیں ——— اس زندگی میں اس سے بڑی بات بھلا کیا ہوگی کہ انسان کے پاس رہنے کے لئے ایک خوبصورت سا مکان ہو۔ محبت کرنے کے لئے ایک بڑی خوبصورت سی لڑکی ہو جس کے سہارے وہ اطمینان اور سکون کی ایسی بزمِ نشاط کو آراستہ کرے جس میں زندگی کی اُلجھنوں اور پریشانیوں کا گذر ہی نہ ہو سکے ——— انسانی زندگی میں مسرتوں کو بہم پہنچانے میں عورت کو کتنی اہمیت حاصل ہے لیکن عورت کا مطلب تعیش نہیں ہے۔ وہ تو صحیح اور صحت مند زندگی بسر کرنے کے لئے ایک سہارا ہے ——— اس طرح کی بے شمار باتیں وہ مجھ سے کرتا رہا۔

میں ابتدائی ملاقاتوں میں ذرا کم کھلتا ہوں۔ اس لئے مختلف موضوعات پر جو گفتگو ہوئی اس میں میں نے اپنے خیالات کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی اور اس کی سُنتا رہا۔ اس طرح بلونت سنگھ نے اپنے آپ کو پوری طرح مجھ پر ظاہر کر دیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ دلّی کے دورانِ قیام میں جس طرح میں اسے سمجھتا تھا اتنا اور کوئی نہیں سمجھتا تھا۔ اور شاید اسی وجہ سے اس کے کسی اور سے اتنے گہرے تعلقات بھی نہیں ——— اس حقیقت کو اس نے بھی اسی پہلی ملاقات ہی میں محسوس کر لیا تھا۔ بار بار وہ یہ کہتا تھا کہ میں ذہنی طور پر تم سے کتنا قریب ہوں۔ ہم دونوں کتنی جلد گھُل مل گئے ہیں میرے آس پاس کتنے لوگ بیٹھتے ہیں لیکن میری ان سے اتنی گاڑھی نہیں چھن سکتی۔ میں آج تک ان سے بے تکلف نہیں ہوا ——— لیکن میں نے تمہارے سامنے اپنے آپ کو پوری طرح بے نقاب کر دیا ہے۔

اور یہ ایک حقیقت تھی جس کو میں بھی برابر شدت کے ساتھ محسوس کرتا رہا!

دیر ہو گئی تھی، اس لئے میں بلونت سنگھ سے پھر ملنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوا ——— اور پھر ہم برابر ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ ناممکن تھا کہ میں یونیورسٹی سے واپسی پر بلونت سنگھ سے ملنے کے لئے "آجکل" کے دفتر نہ جاؤں۔ اگر کبھی میں دو تین دن نہ پہنچا تو وہ شکایت کرتا۔ "تم آتے نہیں ——— میں تمہارا منتظر رہتا ہوں۔ مجھے دن کو فرصت نہیں ہوتی ورنہ میں خود تمہارے ہاں پہنچ جایا کرتا ——— میں کسی سے نہیں ملتا۔ میرا یہاں کوئی ہم مذاق نہیں ہے ——— کسی سے اپنے دل کی بات نہیں کر سکتا ——— اور تم جانتے ہو میں بہت کم لوگوں سے ملتا ہوں"

شاید ہی کوئی ملاقات ایسی ہوگی جس کا آغاز ان باتوں سے نہ ہوا ہو!

اس لئے تقریباً میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ یونیورسٹی کے بعد اس کے پاس ضرور جاتا۔ کمرے میں داخل ہو کر سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کرتا تو وہ کہتا ——— "یار، ادھر بیٹھیں گے" دفتری میز سے ہٹ کر ایک لمبی سی آرام کرسی پڑی تھی وہ اصرار کرکے مجھے اس پر بٹھا دیتا اور دوسری کرسی پر خود بیٹھ کر باتیں کرنے لگتا ——— چائے آجاتی۔ اس کا دور چلتا رہتا ——— اور بعض بعض دن تو ہم شام تک باتیں کرتے رہتے ———

اکثر ایسا ہوا ہے کہ شام ہو گئی ہے۔ اور پھر ہم نے یہ طے کیا ہے کہ اب بجائے اپنی اپنی جائے قیام پر جانے کے سیدھے 'کناٹ پلیس' چلیں گے اور کسی اچھے سے ریسٹوران میں بیٹھ کر شام گذاریں گے ——— چنانچہ ہم اس طرح کبھی 'والگا' میں بیٹھ جاتے۔ کبھی 'ایلیسی' میں شام گذارتے۔ کبھی 'نرولا' میں جا بیٹھتے اور کبھی 'دینگر' اور 'پکاڈلی' کی سیر کرتے۔ غرض شاید ہی نئی دلّی کا کوئی ریسٹوران ایسا ہو جس میں ہم نے شام نہ گذاری ہو۔ ان ریسٹورانوں میں بیٹھ کر ہم خوش گپیاں کرتے۔ آنے والے لوگوں کو دیکھ کر ان کا نفسیاتی تجزیہ کرتے۔ عورتوں کے حُسن سے محظوظ ہونے کی کوشش کرتے۔ اس طرح ان شاموں میں بڑی دلآویزی پیدا ہو جاتی تھی۔ ہم اپنے آپ کو ایک نئی دنیا میں محسوس کرتے تھے۔

بلونت سنگھ کے پاس ان دنوں مکان نہیں تھا۔ وہ اپنے کسی عزیز کے پاس پہاڑ گنج میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس لئے اس کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ کھانا بھی کناٹ پلیس ہی سے کھا کر جائے قیام پر واپس جائے ——— چنانچہ کھانا بھی وہ اکثر کناٹ پلیس ہی میں کھا لیتا تھا۔ اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ مجھے بھی اس کا

ساتھ دینا پڑا ہے۔

انسانی زندگی میں کھانے کو — اور خصوصاً شام کے کھانے کو وہ بڑی اہمیت دیتا تھا۔ میں نے اسے صرف کھاتے ہوئے ہی نہیں دیکھا ہے، اچھے کھانے کی تلاش میں سرگرداں بھی دیکھا ہے۔ نئی دلّی کے ریستورانوں میں اچھا خاصا کھانا مل جاتا تھا لیکن اسے ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش رہتی تھی چنانچہ یہ خوب تر کی تلاش ہمیں بعض اوقات 'ونگر،' 'پکاڈلی،' 'وانگا،' 'ایلپس' اور 'امیسی' کی فضا سے ان دوکانوں میں بھی لے گئی ہے جہاں ظاہری آرائش وزیبائش کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ جہاں دوکان کا مالک خود ہی پکاتا، خود کھلاتا اور دوکان کے قریب سے گزرنے والوں کو خود ہی آواز دے دے کر بلاتا ہے۔ دلّی میں تقسیم کے بعد اس طرح کی دوکانیں بے شمار کھل گئی تھیں۔ جگہ جگہ اس طرح کے کھانے پینے کی چیزوں کے بازار بن گئے تھے۔ گوشت تو اس طرح بکتا تھا کہ اس کو دیکھ کر مقامی ہندو کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ یہ کون سی مصیبت آ گئی ہے — بہر حال یہ سلسلہ رُکنے والا نہیں تھا — کناٹ سرکس میں بھی اس طرح کی بہت سی دوکانیں کھل گئی تھیں۔ مرغ، تیتر، بٹیر اور نہ جانے کون کون سے بھُنے ہوئے پرند ان دوکانوں پر لٹکے رہتے تھے — بلونت سنگھ کبھی کبھی ان دوکانوں پر بھی کھانا کھاتا تھا اور اصرار کے ساتھ کھاتا تھا۔ میں ہمیشہ اس کو ایسا کرنے سے روکتا بھی تھا لیکن میری کچھ بھی پیش نہیں جاتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مرغ جیسا ان دوکانوں پر مل سکتا ہے ویسا بڑے ریستورانوں میں نہیں مل سکتا۔ مرغ تو خالص ہندوستانی انداز میں پکنا چاہیئے۔ اور اس کے لئے ایک ہندوستانی فضا کی ضرورت ہے۔ یہ فضا ان ریستورانوں میں نہیں ہوتی۔ اس لئے کبھی کبھی ہمیں ان دوکانوں کا مزہ بھی چکھنا چاہیئے — اور وہ بے دھڑک ان دوکانوں میں داخل ہو جایا کرتا تھا۔ میں کھانے میں تو اس کا ساتھ نہیں دیتا تھا کیونکہ لٹکے ہوئے پرندوں کی وجہ سے جو ہیبت ناک فضا پیدا ہوتی تھی وہ مجھے ایسا کرنے سے باز رکھتی تھی۔ شاید میں اس ماحول کا انسان نہیں تھا۔ لیکن بلونت پر یہ کیفیت کبھی بھی طاری نہیں ہوئی۔ وہ میرے لئے ہلکی سی کوئی آلو وغیرہ کی چیز منگوا دیتا — اور خود اپنے لئے مرغ، تیتر، بٹیر، انڈے اور نہ جانے کیا کیا لانے کا آرڈر دیتا۔ اور پھر کھانے کے دوران میں ان سب کی ایسی تعریفیں کرتا کہ زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا۔ کھانے کے دوران میں اس پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی۔ اور وہ کہتا "یار! یہ سب زندگی کی نعمتیں ہیں۔ یہ سب اسی لئے بنائی گئی ہیں کہ انسان ان سے لطف اندوز ہو۔ ان سب کو کھانے سے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے — افسوس ہے تم ان سے محروم ہو — کھایا کرو — یار، زیادہ سے زیادہ کھایا کرو! — کہ کھانا زندگی کی بڑی اہم، بلکہ سب سے اہم حقیقت ہے — میں تو حیران ہوں کہ تم زندہ کیسے ہو؟"

اور واقعی مجھے ان لمحوں میں اپنی بے بضاعتی کا شدید احساس ہوتا تھا!

کھانے کے بعد کافی یا چائے پینے کی غرض سے ہم کسی اچھے سے ریستوران میں جا بیٹھتے تھے اور اس ریستوران کی سہانی فضا میں گھنٹوں گپ رہتی تھی بلونت کی طبیعت میں بڑی نفاست تھی۔ اچھا ماحول ہو تو وہ کھلتا تھا۔ اس کی طبیعت رواں ہو جاتی تھی۔ وہ بڑے عمدہ فقرے چُست کرنے لگتا تھا۔ لطیفے اس کے ذہن میں ڈھلنے لگتے تھے۔ اس کے باغ و بہار ہونے کا اندازہ اسی عالم میں ہوتا تھا — بعض اوقات تو اس کی طبیعت اس ماحول میں اس حد تک رواں ہو جاتی تھی کہ اسے طرح طرح کی شرارتیں سُوجھنے لگتی تھیں — بالکل ایسی شرارتیں جو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انڈر گریجایٹ طالب علموں سے سرزد ہوتی ہیں۔

ایک دن کا واقعہ میں کبھی نہیں بھُول سکتا!

کھانا کھانے کے بعد یہ طے پایا کہ آج کافی پی جائے گی۔ چنانچہ ہم کافی پینے کے خیال سے "وانگا" میں جا بیٹھے۔ بلونت سنگھ نے کہا "آج میں کریم کی کافی پیوں گا" — مجھے کریم کی کافی پسند نہیں۔ کیونکہ کریم کافی کے مزے کو خراب کر دیتی ہے۔ اس لئے میں نے جواب دیا کہ "تم کافی کے بجائے

کریم پیئو ـــ" میں نے یہ بات مذاق میں کہی تھی۔ لیکن وہ اس پر تیار ہو گیا۔ کہنے لگا "پھر آج میں کریم ہی پیوں گا ـــ اور دیکھو ساتھ ہی تمہیں تماشا بھی دکھاؤں گا ـــ"

میں نے کہا "تماشا کیسا؟"

وہ کہنے لگا "ابھی شروع ہوتا ہے!"

اور اس نے بیرے کو آواز دی اور دو کریم کافی لانے کا آرڈر دیا۔ بیرا تھوڑی دیر میں کافی اور کریم لے آیا اور ہم کافی بنا کر پینے لگے۔ دس منٹ نہیں گزرے ہوں گے کہ اس نے پھر بیرے کو بلایا اور کریم لانے کے لئے کہا۔ بیرا یہ سن کر سٹ پٹا سا گیا اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔

بلونت سنگھ نے اس سے پھر کہا "کریم لاؤ!"

اس نے جواب دیا "کریم تو میں ابھی دے کر گیا تھا"

"مجھے کریم اور چاہیئے" بلونت سنگھ نے کہا۔

بیرے نے پروپرائٹر کو اطلاع دی، اور کریم کا ایک اور جگ لا کر رکھ دیا۔ تیسری دفعہ اس نے پھر کریم منگوائی۔ بیرا پھر کریم کا ایک جگ لایا۔ اور اس طرح بلونت سنگھ کافی کی کوئی تین چار پیالیاں پی گیا جس میں کافی کم اور کریم زیادہ تھی۔

بیرا جب بل لایا تو اس کے ساتھ کریم کا ایک بل علیٰحدہ بھی تھا۔ بلونت سنگھ نے اس سے پوچھا کہ یہ کریم کا بل علیٰحدہ کیوں ہے؟ بیرے نے جواب دیا کہ کریم علیٰحدہ آئی تھی ـــ اس نے کہا۔ لیکن "پر ہیڈ" کا تو یہ اصول ہوتا ہے کہ جس قدر اور جتنی بار بھی چائے یا کافی پی جائے بل پر ہیڈ کے حساب ہی سے دینا پڑتا ہے" بیرے کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کیونکہ بلونت سنگھ بات اصولی طور پر صحیح کہہ رہا تھا۔ 'والگا' کے پروپرائٹر ایک سردار صاحب تھے جب بیرے نے انہیں یہ روداد سنائی تو وہ خود آئے اور انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ بلونت سنگھ کا جو خیال ہے وہ بالکل صحیح ہے اور وہ کریم کا بل علیٰحدہ دینے کے مجاز نہیں۔ لیکن آج تک یہ بات ان کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔

اپنی بات تسلیم کرا لینے کے بعد اس نے کریم کا بل بھی ادا کر دیا۔ تھوڑی دیر 'والگا' میں خاصی دلچسپی رہی۔ ہر شخص کو اس بات کا علم ہو گیا اور یہ بات تھوڑی دیر کے لئے ہر میز پر موضوعِ بحث بنی رہی۔

اس طرح کی حرکتیں وہ کبھی کبھی ضرور کرتا تھا۔

یہ دیکھ کر کہ بلونت سنگھ کو کھانے پینے سے حد درجہ دلچسپی ہے، میں نے اس کو ایک دن کھانے پر بلایا۔ میں ان دنوں دلّی میں بڑی ہی بے سروسامانی کے عالم میں تھا۔ فسادات میں سب کچھ لٹ چکا تھا۔ بیٹھنے تک کی جگہ میرے پاس نہیں تھی لیکن خیر ان دنوں ایک ملازم مل گیا تھا جو میرا کھانا پکا دیتا تھا۔ ہر چند کہ وہ کچھ بے وقوف سا تھا لیکن اس بے سروسامانی میں ایک بہت بڑا سہارا تھا ـــ خیر، تو میں نے بلونت سنگھ کو کھانے پر بلا لیا اور یہ طے پایا کہ کھانا کھانے کے بعد دن میں کوئی اچھا سا فلم دیکھا جائے گا۔

جس دن بلونت سنگھ کو آنا تھا، اس دن میں نے ملازم کو ہدایت کر دی تھی کہ سب چیزیں پکا کر رکھ لے لیکن روٹی کھانے کے وقت تیار کرے، تاکہ وقت پر گرم مل سکے۔ اتوار کا دن تھا۔ بلونت سنگھ وقت سے بہت پہلے آ گیا۔ کھانے کے وقت تک ہم لوگ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ لیکن اس دوران میں اسے برابر بھوک لگ رہی تھی۔ اس کا اظہار وہ بار بار کرتا جاتا تھا۔ میں وقت سے پہلے کھانا نہیں کھاتا اس لئے میں نے اس کو چھیڑا۔

"کیا تم ناشتہ کر کے نہیں آئے؟"

"صبح کو پورے سیر بھر دہی کی لسی پی ہے"

"اور انڈے ؟"

"انڈے تو صرف آج چار ہی کھا سکا ہوں"

"اور توس ؟"

"توس تو آج نہیں ملے لیکن چار پراٹھے کھا لئے تھے"

میں نے کہا "اللہ تم پر اور تمہارے پیٹ پر رحم کرے" اور ملازم کو آواز دی کہ کھانا لگا دے۔

کھانا لگا دیا گیا اور گرم روٹی ایک ایک کر کے آتی رہی۔ بلونت سنگھ اس وقفے کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ روٹی آنے سے قبل سالن پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیتا۔ روٹی آجاتی تو روٹی اور سالن دونوں پر دست درازی کرتا۔ روٹی اور سالن کی آمیزش کو اس وقت اس نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ روٹی آئی تو سالن نہیں، سالن آیا تو روٹی نہیں۔ غرض یہ کہ روٹی اور سالن کا یہ چکر دیر تک چلتا رہا۔ میرا ملازم منہ چھپا کر ہنستا اور مسکراتا رہا۔ اور میں بھی محظوظ ہوتا رہا۔ بلونت سنگھ کھانے کے دوران میں کھانے کی تعریف ضرور کرتا ہے۔ اس دن تو اس نے تعریفوں کے اتنے پل باندھے کہ میرے ملازم نے اپنا دماغ خراب کر لیا کیونکہ وہ اس کے بعد اپنے آپ کو بہت بڑا خانساماں سمجھنے لگا۔ حالانکہ وہ جتنے پانی میں تھا، اس کو میں ہی خوب جانتا تھا۔ بلونت سنگھ نے اس کی تعریفیں کیں۔ اسی وجہ سے بلونت سنگھ سے زیادہ عزیز ان دنوں اس کے لئے اور کوئی نہیں رہا۔ پیٹھ پیچھے بھی یہی کہتا کہ سردار صاحب کو کھانے کا شوق ہی نہیں۔ وہ اس فن کو بھی سمجھتے ہیں"۔ من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو والا معاملہ تھا۔

کھانے کے بعد ہم سینما کی طرف چل دئے۔

بلونت سنگھ کو سینما دیکھنے کا خبط تھا۔ ہفتے میں تین چار فلموں کا دیکھنا اس کے لئے ضروری تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ وہ ہر طرح کا فلم دیکھ سکتا ہے، اس کے لئے کتنا ہی بور کرنے والا فلم ہو لیکن وہ اس کو بڑے انہماک کے ساتھ دیکھتا رہے گا ——— بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ وہ جان بوجھ کر ایسے فلم ضرور دیکھتا ہے جو بور کرنے والے ہوں۔ فلم دیکھنے سے قبل اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کون سا فلم دیکھے گا۔ پہلے وہ نئی دلی کے تمام سینماؤں کا طواف کرے گا۔ تصویریں دیکھے گا۔ پھر کچھ سوچے گا اور اس کے بعد کسی سینما میں بھی جا بیٹھے گا۔ اور نہایت ہی انہماک اور خلوص کے ساتھ بڑے غور سے اس فلم کو دیکھے گا جس کو دیکھنے کا اسے کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔

اس دن بھی پہلے اس نے مجھے نئی دلی کے سارے سینماؤں کی سیر کرائی۔ سب سینماؤں میں تصویریں دیکھیں۔ ہر ایک پر اظہارِ خیال کیا۔ کسی کی ہیروئن اس کو پسند آئی۔ کسی کے ہیرو نے اس کا دل لبھایا۔ کسی کے حسن کی دلآویزی اس کو بھائی ——— اور پھر سب فلموں پر مجموعی طور پر تبصرہ کرنے کے بعد اس نے ایک ایسا فلم دیکھنے کا فیصلہ کیا جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ مہمل ہوگا۔ اس فلم کا نام میں بھول گیا ہوں۔ کوئی امریکی فلم تھا جس میں ہیرو اور ہیروئن ساری زندگی مداری کا تماشا کرتے ہیں اور طرح طرح کے کرتب دکھاتے ہیں۔ بلونت سنگھ نے ٹکٹ خرید لئے۔ ابھی فلم شروع ہونے میں چند منٹ باقی تھے اس لئے ہم ادھر ادھر گھومتے رہے۔ واپس آکر جب ہال میں داخل ہوئے تو سارے ہال میں اپنے سوا کسی اور کو نہ پایا۔ میں اور بلونت سنگھ بس صرف دو آدمی تھے جو اس دن اس فلم کو دیکھنے آئے تھے۔ ہمارے انہماک پر سینما کے ملازموں تک کو تعجب ہو رہا تھا۔ ہم آخر وقت تک اس فلم کو دیکھتے رہے۔ اور ختم کر کے اٹھے ——— میں نے کئی بار درمیان سے اٹھنے کا ارادہ کیا لیکن بلونت سنگھ نے مجھے روک روک لیا۔ درحقیقت مجھے اس فلم کو دیکھ کر قے آنے لگی تھی۔ نہ اس میں کوئی کہانی تھی۔ نہ کوئی اداکاری تھی۔ نہ کوئی اور دلچسپی تھی۔ بس کرتب ہی کرتب تھے ——— اور کرتب بھی خاص امریکی انداز کے، جن سے

کم از کم میں کوئی ذہنی مناسبت نہیں رکھتا۔ لیکن بلونت سنگھ برابر اس کا اظہار کرتا رہا کہ وہ اس فلم سے صحیح معنوں میں محظوظ ہو رہا ہے۔ فقرے چست کرتا قہقہے لگاتا، مجھے چھیڑتا۔ وہ جانتا تھا کہ میں 'بور' ہو رہا ہوں۔ لیکن میرے اس 'بور' ہونے سے وہ لطف لے رہا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ 'بور' وہ خود بھی ہو رہا تھا لیکن اس کو پوری طرح ظاہر کرنے کی اس میں سکت نہیں تھی۔

فلم ختم ہو گیا تو ہم باہر نکلے۔ بلونت سنگھ نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور کہا "کہو بھئی کیسی رہی؟"

میں نے کہا "مجھے تو قے آ رہی تھی"

کہنے لگا "یار! اگر آج ہم یہ فلم دیکھنے نہ آتے تو پھر ہال میں کوئی بھی نہ ہوتا"

میں نے کہا "تو کیا ہم نے ٹھیکہ لیا ہے؟"

اس نے کہا ——"کبھی کبھی زندگی میں ایسے تجربے بھی ہونے چاہئیں"

اور حقیقت یہ ہے کہ وہ زندگی میں تجربات کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔ زندگی کے ہر پہلو کو دیکھنے کی خواہش اس کے اندر حد درجہ شدید تھی۔ وہ اسی لئے اس طرح کے لایعنی فلم بھی دیکھ لیتا تھا۔ اسے فلم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ زندگی اور اس کی رنگا رنگی کو دیکھنے کی غرض سے یہ سب کچھ کرتا تھا اور اس طرح اسے بہت سی ایسی چیزیں حاصل ہو جاتی تھیں، جن کا کسی کو خیال بھی نہیں آتا۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ جہاں تک صرف اس طرح کے فلموں کا تعلق ہے وہ ان کو خوشی کے ساتھ نہیں دیکھتا —— ان کو دیکھ کر وہ خاصا 'بور' ہوتا ہے لیکن وہ فلم دیکھنے کب جاتا ہے، اسے تو اس ماحول کو دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے جو ان فلموں سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ تو اس ردِ عمل کو دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے جو اس طرح کے فلم پیدا کرتے ہیں —— اسی لئے وہ ان فلموں کے تلخ گھونٹ بھی چڑھا لینے سے باز نہیں رہتا۔

شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی تنہائی بھی اس معاملے میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتی تھی۔ وہ تن تنہا اور اکیلا بھی سینما جا سکتا تھا۔ بلکہ اکثر و بیشتر تو وہ فلم اکیلا ہی دیکھتا تھا۔

وہ شام مجھے اب تک یاد ہے۔ کئی گھنٹے گھومنے پھرنے کے بعد ہم کناٹ پلیس میں فوارے کے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ مجھے اس دن مغرب سے قبل ایک جگہ پہنچنا تھا۔ اس لئے میں بلونت سنگھ کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے کہا "میں کوئی فلم دیکھ لوں گا —— تم چلے جاؤ"

میں نے کہا "کون سا فلم دیکھو گے"

کہنے لگا "کوئی بھی دیکھ لوں گا —— میرے لئے سب ایک سے ہیں"

اور میں نے اسے ایک سینما تک پہنچا دیا۔ اس نے ٹکٹ خرید لیا —— اور وہ مجھے رخصت کر کے سینما ہال میں چلا گیا —— بڑی گھٹیا سی فلم اس سینما میں چل رہی تھی۔ اس نے وہ فلم دیکھا اور دوسرے دن آ کر اس شام کی ساری روداد سنائی —— لیکن اس روداد میں فلم سے زیادہ ان حالات کی تفصیل، اس ماحول کا بیان اور اس فضا کا ذکر تھا جس میں یہ فلم دیکھا گیا۔ بلونت سنگھ کے لئے یہ حالات، یہ ماحول اور یہ فضا ان پھولوں کی طرح تھی۔ جن سے شہد کی مکھی رس جمع کر کے شہد بناتی ہے۔ بلونت سنگھ شہد کی مکھی کی طرح ان سے اپنے فن کا شہد جمع کرتا تھا۔ اور اسی لئے اس کی بے چین روح ان کی تلاش میں ہر لمحہ اور ہر گھڑی سرگرداں رہتی تھی۔ اس میں اس کی شعوری کوشش کو دخل نہیں تھا —— یہ خصوصیت تو اس کی زندگی کا ایک جزو تھی جس کو وہ کسی حال میں بھی اپنے آپ سے الگ نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے اس کو اکثر تنہا دیکھا ہے لیکن اس کی زندگی میں مجھے تنہائی کبھی بھی نظر نہیں آئی ہے۔ وہ خلوت کو انجمن سمجھتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ

اس کی خلوت انجمن سے کسی طرح کم نہیں۔ وہ تنہا گھوم پھر سکتا ہے، تنہا سیر کر سکتا ہے، تنہا کھا پی سکتا ہے، تنہا خرید و فروخت کر سکتا ہے، تنہا سینما دیکھ سکتا ہے ——— ہر کام میں یہ تنہائی اس کی مونس و دمساز ہوتی ہے۔ تنہائی ہی میں اس کے جوہر کھلتے ہیں۔ تنہائی اسے شاندار بنا دیتی ہے اسی لئے وہ تنہائی کو ڈھونڈتا ہے۔ اس کے پیچھے بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ کیونکہ جب وہ تنہا ہوتا ہے تو اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے محفل جما لی ہے ——— اور حقیقت یہ ہے کہ وہ تنہائی میں کسی محفل کو جما لیتا ہے۔

اگر آپ اسے تنہا دیکھیں ——— اور آپ اسے تنہا ہی دیکھیں گے ——— تو آپ کو اس کے چہرے پر ایک آسودگی نظر آئے گی۔ ایک ایسی آسودگی جو کسی چیز کو پالینے سے حاصل ہوتی ہے ——— ایک ایسی آسودگی جو منزل سے ہمکنار ہو جانے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے ——— تنہائی کے عالم میں وہ اس منزل سے ہمکنار نظر آتا ہے۔

تنہائی کے عالم میں، ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہے، کسی خیال میں ڈوبا ہوا ہے۔ کچھ مسائل ہیں جن کو سلجھانے کی کوشش کر رہا ہے اس کی گہری سنجیدگی اس احساس کو شدید سے شدید تر کر دیتی ہے اور اس طرح وہ دیکھنے والوں کو بھی ایک انجمن نظر آتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بلونت سنگھ کو تنہا دیکھ کر آپ کے ذہن کا اس طرف پہنچنا ناگزیر ہے کہ بلونت سنگھ تصورات کی نہ جانے کتنی دنیاؤں کو لئے پھرتا ہے ——— بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ بلونت سنگھ انہی دنیاؤں کے مجموعے کا نام ہے۔

بلونت سنگھ کی شخصیت میں جس تنہائی کی کارفرمائی میں نے دیکھی وہ کوئی ذہنی الجھن نہیں ہے۔ وہ اس کے کردار کا لازمی جزو ہے اور اس کی صحت مندی کا یہ ثبوت ہے کہ بلونت سنگھ کی تنہائی پسندی آپ پر بوجھ نہیں بن سکتی۔ اس سے آپ پریشان بھی نہیں ہو سکتے۔ اس سے آپ کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچ سکتا۔ برخلاف اس کے آپ فوراً اس کی تنہائی کا جواز اس کی ذات میں تلاش کرنے کی کوشش کریں گے ——— اور اس میں آپ کو کامیابی ہوگی۔ کیونکہ اس سے واقف ہوئے بغیر بھی آپ پر یہ روشن ہو جائے گا کہ بلونت اس تنہائی میں بھی مصروف ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ کر رہا ہے ——— کم از کم مجھے یہ احساس ہمیشہ ہوا ہے ——— یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ اس کی تنہائی میں ایک ہمہ گیری دیکھی ہے جس کے لئے اگر میں "گمبھیرتا" کا ہندی لفظ استعمال کروں تو زیادہ صحیح ہے۔

یہ تنہائی بلونت سنگھ کا مزاج ہے۔ یہ اس کے کردار کی بنیادی خصوصیت ہے۔ یہ اس کی شخصیت کا لازمی حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجلسوں اور انجمنوں کا انسان نہیں ——— وہ بہت کم لوگوں سے ملتا ہے ——— اس کے بے تکلف دوست دو ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ میں نے اسے لوگوں سے کتراتے ہوئے دیکھا ہے۔ لیکن اس کترانے میں احساسِ برتری نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کی خواہش نمایاں ہوتی ہے۔

دلّی میں ہم اکثر شام کو ایک ساتھ نکلتے تھے۔ کبھی کبھی کناٹ پلیس میں چند ایسے جاننے والوں سے ملاقات ہو جاتی تھی جو بلونت سنگھ کو نہیں جانتے تھے۔ اس وقت اس کی حالت دیکھنے والی ہوتی تھی۔ وہ انہیں چھوڑ کر آگے نکل جاتا، اس ڈر سے کہ کہیں ان سے تعارف نہ ہو جائے۔ کیونکہ اس کے بعد جب بھی وہ اس کو دیکھیں گے تو ملنے کی کوشش کریں گے اور یہ بات اس کے لئے ایک مستقل دردِ سر بن جائے گی ——— اور یہ ہے بھی حقیقت۔ اجنبیوں سے ملنا واقعی ایک دردِ سر ہوتا ہے۔

لیکن ایسے موقع پر مجھے ہمیشہ شرارت سوجھتی تھی ——— اور میں بلونت سنگھ کو چھیڑنے کے لئے تعارف کی رسمی منزلیں ضرور طے کرا دیتا تھا۔ جب میں کہتا کہ "آپ سے ملئے ——— آپ ہیں سردار بلونت سنگھ!" تو اس کی کسمساہٹ دیکھنے والی ہوتی تھی ——— ملنے والے صاحب سے تو وہ تکلف برتتا لیکن میری طرف وہ ایسی قہر آلود نظروں سے دیکھتا جیسے مجھے کھا لے گا۔

جب وہ صاحب رخصت ہو جاتے تو وہ مجھ پر برس پڑتا — لیکن اس برس پڑنے میں ایک ایسی معصومیت ہوتی جس پر مجھے ہمیشہ پیار آجاتا۔
اور واقعی بلونت پیار کرنے ہی کی چیز ہے۔

بلونت سنگھ بڑا پیارا آدمی ہے۔ اس کی محبت بے پایاں ہے۔ اس کا خلوص بے اندازہ ہے۔ وہ بہت کم لوگوں سے ملتا ہے لیکن جن سے ملتا ہے ان سے صحیح معنوں میں ملتا ہے۔ ایسے لوگوں سے اس کی بے تکلفی ہوتی ہے۔ بے تکلفی کے بغیر وہ کسی سے نہیں مل سکتا۔ رسمی طور پر تو وہ ملنے کا قائل ہی نہیں وہ کم آمیز ضرور ہے لیکن اس کم آمیزی کا سبب یہ ہے کہ وہ دوسروں میں بھی اس بے پایاں محبت اور بے اندازہ خلوص کو تلاش کرتا ہے جو آجکل ناپید ہے۔

اکثر اس نے مجھ سے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس دنیا میں انسان بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ اور چونکہ اچھا انسان نہیں ملتا اس لئے اچھا دوست بھی ناپید ہے کیونکہ اچھا انسان ہی اچھا دوست ہو سکتا ہے — اور اس کی یہ تمام باتیں سُن کر میں ہمیشہ یہ سوچتا رہا ہوں کہ انسانیت اور خلوص کی تلاش میں یہ شخص کس طرح سرگرداں ہے۔ انسانی محبت اسے کس قدر عزیز ہے — ان قدروں کی اس کے نزدیک کس درجہ اہمیت ہے — وہ تنہائی کو گوارا کر سکتا ہے لیکن خلوص اور محبت کے بغیر انجمنوں کی بھی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ میں نے ہمیشہ اسے محبت اور خلوص کی تلاش میں دیکھا ہے اس کی نگاہیں ایسے لوگوں کو ڈھونڈتی رہتی ہیں جن میں یہ خصوصیات ہوں۔ ایسے ہی لوگ اس کے دوست بن جاتے ہیں۔

دلی کا وہ واقعہ مجھے اب تک نہیں بھولا۔

اگرچہ گاندھی جی کی وفات کے بعد دلی میں فساد کی آگ بجھ گئی تھی لیکن اس کے باوجود دل ابھی پوری طرح صاف نہیں ہوئے تھے اور کچھ شرپسند عناصر کبھی کبھی کوئی نیا شگوفہ کھلاتے رہتے تھے۔ بعض اوقات انفرادی اور ذاتی واقعات کو فرقہ وارانہ رنگ دے دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ چنانچہ ان دنوں اسی قسم کا ایک واقعہ ہو گیا تھا جو اگرچہ ایک خاص محلے تک محدود رہا لیکن اس سے لوگ پریشان اور ہراساں ہو گئے۔

بلونت سنگھ کو بھی اس کی خبر ملی۔ ان دنوں وہ شہر سے باہر کینٹونمنٹ میں اپنے کسی عزیز کے ساتھ رہتا تھا۔ اس واقعے کے دوسرے ہی دن کیا دیکھتا ہوں کہ بجائے دفتر جانے کے، پھاٹک میں داخل ہو رہا ہے۔ میں نے پوچھا "اس وقت کیسے آ گئے؟"
کہنے لگا "تمہاری خیریت لینی تھی۔ سُنا ہے شہر میں کچھ فساد ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا چل کر اپنے دوست کی خیر خبر لوں"

میں نے کہا "میں تو ابھی تک زندہ ہوں — اور زندہ ہی رہوں گا — کیونکہ ۴۷ء کے ہنگاموں کو جھیل چکا ہوں — اب اس سے بڑا ہنگامہ بھلا کیا ہو گا؟"

اس نے کہا "میں تو آج اسی خیال سے آیا تھا کہ تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گا۔ اور جب تک یہ فساد کی فضا ختم نہیں ہوتی تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا"

اس طرح کے نہ جانے کتنے واقعات ہیں جن سے اس کی بے پایاں محبت اور بے اندازہ خلوص کا پتہ چلتا ہے۔

یہ محبت اس کی ایک ایک بات میں جھلکتی ہے۔ اور اس خلوص کا احساس اس کے ملنے والوں کو قدم قدم پر ہوتا ہے۔

مجھے وہ واقعہ بھی یاد ہے جب اس نے ایک بہت قیمتی سا کیمرہ خرید لیا تھا۔ جب بھی ملاقات ہوتی وہ اس کیمرے کا تذکرہ مجھ سے ضرور کرتا۔ اس کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ ابھی حضرت کو فوٹوگرافی کا نیا نیا شوق چرایا ہے اسی وجہ سے اس کی گفتگو ہر لمحہ اور ہر گھڑی ہوتی رہتی ہے لیکن یہ بات نہیں تھی۔ درحقیقت وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ اس کیمرے سے وہ میری تصویریں کھینچنا چاہتا ہے۔ مجھے تصویریں کھنچوانے سے الجھن ہوتی ہے۔ اس لئے میرا ذہن اس طرف گیا ہی نہیں۔ لیکن ایک دن اتوار کو جب وہ مع کیمرے کے میرے ہاں آ گیا اور یہ اصرار کیا کہ وہ تصویریں ضرور کھینچے گا، تب مجھ پر حقیقت کھلی۔ اور وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھا جب تک پوری بارہ تصویریں نہیں کھینچ لیں۔ شاید ہی کوئی زاویہ ایسا ہو جس سے اس نے تصویر نہ کھینچی ہو۔ میں نے اس سے

بہت کہا کہ اپنا قلم کیوں ضائع کرتے ہو لیکن اس نے ایک نہ مانی ــــ اور یہ کہہ کر اس بات کو ختم کر دیا کہ "ہم کب ہر ایک کی تصویریں کھینچتے ہیں"
اور واقعہ یہ ہے کہ بلونت سنگھ ہر ایک کی کیا، کسی کی بھی ایک وقت میں بارہ تصویریں نہیں کھینچ سکتا تھا ــــ اور بلونت سنگھ ہی پر کیا منحصر ہے کوئی بھی نہیں کھینچ سکتا۔ بے پایاں محبت اور بے اندازہ خلوص کے بغیر یہ کس طرح ممکن ہے۔

بلونت سنگھ کو مردم شناسی میں کمال حاصل ہے۔ وہ صورت دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ انسان کتنے پانی میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر شخص کے بارے میں ایک رائے رکھتا ہے اور اس کی یہ رائے سو فیصدی صحیح ہوتی ہے اور اس رائے کے اظہار کرنے میں اسے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اس رائے کا اظہار ضرور کرتا ہے ــــ کبھی وضاحت کے ساتھ اور کبھی اشاروں اور کنایوں میں ــــ لیکن لطف اسی وقت آتا ہے جب یہ اظہار اشاروں اور کنایوں کی صورت میں ہو ــــ اور یہ لطف تو اس وقت دوبالا ہو جاتا ہے جب یہ اظہار اس کے یہاں عملی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اس اظہار کی عملی شکل میری نظر سے بھی گزری ہے۔

ایک دن میں اس کے دفتر میں پہنچا تو خاصا وقت ہو چکا تھا اور مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ اس لئے میں نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس سے کہا "چائے منگواؤ"

"لیکن چائے تو آج ہم اردو کے فلاں افسانہ نگار کے ساتھ پئیں گے" بلونت سنگھ نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

"کب ــــ کس وقت؟"

"بس ابھی چلتے ہیں!"

"لیکن میں بن بلائے اس کا مہمان کیسے ہو سکتا ہوں؟"

"اس نے تمہیں بھی دعوت دی ہے ــــ بار بار کہتا ہے ڈاکٹر صاحب سے مفصل ملاقات ہونی چاہئے۔ آج ہو جائے گی"

مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا وہ صاحب قریب ہی کے کمرے میں بیٹھتے تھے۔ ہم دونوں ان کے یہاں پہنچے۔ بلونت سنگھ نے بیٹھتے ہی کہا "لو بھئی ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ میں نے کہا آج مفصل ملاقات ہو ہی جانی چاہئے۔ چائے منگواؤ۔ مفصل ملاقات کے لئے چائے بھی مفصل ہونی چاہیے۔"

میں نے دل میں کہا "اللہ رحم کرے۔ آج یہ بڑے جارحانہ موڈ میں ہے"

خیر اس نے چپراسی کو بلایا اور "مفصل چائے" کا آرڈر دیا ــــ یہ "مفصل چائے" پورے ایک گھنٹے میں آئی ــــ لیکن جب آئی تو وہ واقعی "مفصل" تھی۔ ہم تینوں دیر تک باتیں کرتے اور چائے پیتے رہے ــــ

جب وہاں سے رخصت ہو کر باہر نکلے تو میں نے کہا "یہ تم نے کیا حرکت کی۔ میری ان کے ساتھ بے تکلفی نہیں ہے۔ میں اس کا بڑا لحاظ کرتا ہوں۔ اس کی داڑھی اور بالوں نے مجھے خاصا مرعوب کر رکھا ہے ــــ تمہیں اس طرح بے تکلفی سے چائے کے لئے نہیں کہنا چاہئے تھا ــــ خاص طور پر میری موجودگی میں"

بلونت نے جواب دیا "میری اس سے بے تکلفی ہے ــــ یہ چائے تو میں نے اس سے آج انتقاماً پی ہے" یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی میں نے کہا وہ "کیسے"۔

بلونت سنگھ نے کہا "کل دفتر کے بعد یہ اصرار کر کے مجھے اپنے ساتھ لے گیا ــــ کناٹ پلیس پہنچا تو کہنے لگا "بہت تھک گئے ہیں۔ آؤ بھئی یہاں پارک میں بنچ پر بیٹھیں" میں بیٹھ گیا ــــ پھر اس نے کہا "بڑی گرمی ہے ــــ بہت پیاس لگی ہے" ــــ اور یہ کہہ اس نے پانی والے کو آواز دی جو بغیر گلاس کے پانی پلاتا ہے ــــ پانی پینے کے بعد دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اور پھر جب رات ہونے لگی تو ہم دونوں جدا ہو گئے۔"

بلونت سنگھ کہنے لگا "میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھے کناٹ پلیس کیوں لے گیا تھا۔ کیوں اس نے ویزنک مجھ سے گفتگو کی تھی۔ بہر حال مجھے اس کے پانی پینے پر رحم آیا ـــــ مجھے خود پانی پینے کی خواہش نہیں تھی۔ میں تو کناٹ پلیس آنے کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ کسی خوبصورت سے ریستوران میں بیٹھ کر تھوڑی دیر کے لئے ساری دنیا سے بے خبر ہو جانا چاہئے ـــــ لیکن اس دن ایسا نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس کو اس کا احساس ہی نہیں تھا اس لئے میں نے اس سے انتقام کا یہ ذریعہ نکالا"

بات یہ تھی کہ وہ کسی ریستوران میں بیٹھنے کا قائل نہیں تھا ـــــ اور اس نے کبھی کسی کو بھولے سے بھی چائے نہیں پلائی تھی۔ بلونت سنگھ اسے اس بات کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ اور اس سے بہتر اس کی عملی شکل نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ بات اس کی خوش مزاجی اور بذلہ سنجی پر بھی دلالت کرتی ہے۔ بذلہ سنجی اس کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بظاہر وہ سنجیدگی کا سمندر نظر آتا ہے۔ لیکن اس سنجیدگی کے سمندر کی تہہ میں ظرافت اور بذلہ سنجی کی اَن گنت لہروں کا بسیرا نظر آتا ہے کبھی کبھی ان لہروں میں ایسے مدوجزر کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ یہ لہریں جب بیدار ہوتی ہیں تو سارے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ ہر طرف بلونت سنگھ ہی بلونت سنگھ نظر آتا ہے۔

بلونت سنگھ کی ہر بات ایک لطیفہ ہوتی ہے۔ اسے بے شمار لطیفے یاد ہیں۔ ہر بات میں اسے کوئی نہ کوئی لطیفہ یاد آجاتا ہے اور وہ اس لطیفے کو سُنا کر دوسروں کو ہنساتا ہے اور خود بھی ہنسنے لگتا ہے ـــــ اگر کسی موقع پر اسے کوئی موزوں لطیفہ یاد نہ آئے تو پھر وہ لطیفے کی تخلیق بھی شروع کر دیتا ہے ـــــ اور پھر لطیفے ڈھلنے لگتے ہیں ـــــ بے شمار لطیفے ـــــ اَن گنت لطیفے ـــــ جن سے فضا معمور ہو جاتی ہے اور ایک ایسا ماحول پیدا ہو جاتا ہے جہاں زندگی خود ایک لطیفہ معلوم ہونے لگتی ہے۔

بات لطیفے کی ہو اور سکھ درمیان میں نہ آئے۔ یہ بھلا کس طرح ممکن ہے۔ سکھ اور لطیفہ تو لازم و ملزوم ہیں۔ بات اگر سکھوں کی چھڑ جائے تو بلونت سنگھ سکھ نہیں رہتا یا یوں کہئے کہ سب سے بڑا سکھ ہو جاتا ہے۔ سکھ کا نام آتے ہی اس کی طبیعت رواں ہو جاتی ہے اور وہ ایک ہی سانس میں سکھوں کے بے شمار لطیفے سُنا دیتا ہے۔ اور سُناتا چلا جاتا ہے۔ رُکتا ہی نہیں۔ کئی کئی گھنٹے اس نے مجھے سکھوں کے لطیفے سُنائے ـــــ اَن گنت، لاتعداد لطیفے ـــــ شاید سکھوں کے اتنے لطیفے مجھے کسی اور نے نہیں سُنائے۔ اور دوسروں کی زبانی سُن کر اتنا لطف بھی نہیں آیا۔ لطف تو جب ہے جب خود ایک سکھ سکھوں کے لطیفے سُنانے پر اُتر آئے ـــــ اور سُناتا ہی چلا جائے ـــــ اور پھر ان میں خود اس کی تخلیقی کاوش بھی شامل ہو۔

بلونت سنگھ ہی مجھے ایسا سکھ نظر آیا۔

اس نے مجھے بے شمار لطیفے سُنائے ہیں۔ وہ سب تو میں آپ کو سُنا بھی نہیں سکتا لیکن ان کی لطافت کا اندازہ اس ایک لطیفے سے لگا لیجئے۔

ایک دن بات فلموں میں عریانی کے موضوع پر چل نکلی تھی۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا "لطیفہ سنو ـــــ" میں نے کہا "سُناؤ!" کہنے لگا ـــــ ایک سردار صاحب کسی فلم کا ہر شو روزانہ دیکھتے رہے۔ اس فلم میں ایک سین ایسا تھا جس میں ایک عورت دریا میں نہانے کے ارادے سے اپنے کپڑے اتارنا شروع کرتی تھی لیکن قبل اس کے کہ وہ کپڑے اتارنے کا کام ختم کر چکے ایک ریل گاڑی سامنے سے گزر جاتی تھی، اور اس طرح وہ سین ختم ہو جاتا تھا سردار صاحب کو جب لوگوں نے کئی روز تک متواتر اس فلم میں آتے ہوئے دیکھا تو سینما کے ملازموں میں ایک صاحب سے نہ رہا گیا اور وہ بالآخر پوچھ ہی بیٹھے کہ "سردار صاحب! شاید آپ کو یہ فلم بہت پسند آیا ہے" ـــــ سردار صاحب کہنے لگے "فلم تو خیر ایسا ہی ہے میں تو یہ دیکھنے آتا ہوں کہ گاڑی کسی دن لیٹ بھی ہوتی ہے یا نہیں، وہ کسی دن بھی لیٹ نہیں ہوتی"

اس طرح کے بے شمار لطیفے ہیں جو بلونت سنگھ مجھے کئی سال تک سناتا رہا ہے ——— اور میں نے اتنے لطیفے سن لئے ہیں کہ اب مجھے بلونت سنگھ کے ساتھ لطیفے کا خیال آتا ہے اور لطیفے کے ساتھ بلونت سنگھ کا ——— بلونت سنگھ واقعی خود بھی ایک لطیفہ ہے ——— ایک ایسا لطیفہ جو انسان کو مسحور بھی کر دیتا ہے اور محصور بھی!

لطیفہ گوئی اور لطیفہ سنجی کے ساتھ ساتھ جس چیز کی سب سے زیادہ کارفرمائی اس کی زندگی میں نظر آتی ہے وہ عورت اور اس کا ذکر ہے۔ شاید اپنے وقت کا تین چوتھائی حصہ وہ عورت کے خیال اور اس کے تذکرے میں ضرور صرف کرتا ہے۔ میں نے اس کے ذہن پر عورت کو مسلط دیکھا ہے۔ وہ مجھے اس کے اعصاب پر سوار نظر آئی ہے۔ عورت کے ذکر کے بغیر اس کی کوئی بات مکمل نہیں ہوتی۔ اور اس کی ہر بات کی تان اسی عورت کے ذکر پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ عورت کا ذکر ہو تو اس کی کلی کلی کھل جاتی ہے۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ دوڑ جاتا ہے۔ اس پر ایک سرخوشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور یہ کیفیت ایک خاص وقت تک اسے ایک بدلا ہوا انسان بنائے رکھتی ہے ——— بلونت سنگھ عورت اور اس کے ذکر کا عاشق ہے۔ وہ عورت کا ذکر اور اس کی ہستی انسانی زندگی میں جو رنگ بھرتی ہے، اس کا تذکرہ مزے لے لے کر کرتا ہے ——— اور اگر اس تذکرے اور بیان میں کوئی اور بھی شریک ہو جائے تو اس سے زیادہ بلونت سنگھ کو کوئی اور عزیز نہیں ہو سکتا۔ جو عورت کا ذکر کرے اور عورت کی ذات میں دلچسپی لے وہ بلونت سنگھ کا سب سے بڑا دوست ہے۔

عورت کا ذکر چھڑ جائے تو بلونت سنگھ پر شعر کی دیوی اپنے شہپر پھیلا دیتی ہے۔ یوں اسے شعر و شاعری سے کوئی خاص لگاؤ نہیں لیکن جب عورت درمیان میں آ جائے تو وہ شعریت میں ڈوب جاتا ہے اور بڑی شاعرانہ باتیں کرنے لگتا ہے۔ عورت کو زندگی کی حسین ترین تخلیق ثابت کرنے کے لئے وہ کبھی اسے پھول سے تعبیر کرے گا، کبھی اسے آسمان کا ٹوٹا ہوا تارہ کہے گا ——— اور اس طرح کی بے شمار تشبیہیں اور استعارے اس کے ذہن سے نکل کر فضا میں بکھرتے جائیں گے۔ اور وہ اس ذکر سے ایک ایسی فضا قائم کر دے گا جس میں بد ذوق سے بد ذوق انسان کا گم ہو جانا بھی یقینی ہے۔ بلونت سنگھ کی قائم کی ہوئی اس فضا میں کھو کر ہر شخص اس حقیقت کو محسوس کرتا ہے کہ اس نے خود اپنے آپ کو پا لیا ہے۔ زندگی کی حلاوت اور شیرینی اسے محسوس ہونے لگتی ہے اور وہ اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں دور دور تک سرمستی اور سرخوشی کے سوا اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

لیکن عورت اور اس کی باتوں سے بلونت سنگھ کی یہ والہانہ وابستگی نری جذباتیت پر استوار نہیں ہے۔ بلونت سنگھ تو اس کو انسانی زندگی کی بڑی اہم بلکہ سب سے اہم حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی باتوں میں اس سلسلے کی ساری تفصیل اسی بنیادی خیال کے گرد گھومتی ہے۔ یہی اس کا محور رہتا ہے۔

شاید اسی وجہ سے عورت کے ساتھ یہ والہانہ وابستگی اس کے یہاں خیالی سے زیادہ عملی صورت میں رونما ہوتی ہے اور اس کے لئے وہ جن راہوں پر گامزن ہوتا اور جن منزلوں میں قدم رکھتا ہے ہم ان سب کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اس کی تفصیل اب میں بھلا آپ کو کیا بتاؤں!

بلونت سنگھ کے مزاج میں بڑی صاف گوئی اور بے باکی ہے۔ وہ کسی بات کو دل میں نہیں رکھ سکتا۔ کسی چیز کو چھپا نہیں سکتا۔ اس کے دل کی بات ہمیشہ زبان پر آ جاتی ہے ——— اور مجھ سے تو شاید اس نے کوئی بات بھی نہیں چھپائی ہے۔ جن حالات سے بھی وہ دوچار ہوا ہے، جو کچھ بھی اس پر بیتی ہے، زندگی میں اسے جن منزلوں سے بھی گزرنا پڑا ہے، ان سب کی تفصیل اس نے مجھے سنا دی ہے ——— نجی اور ذاتی معاملات تک کو مجھ سے نہیں

چھپایا ہے۔ اپنے معاشقوں تک کی ایسی ایسی داستانیں مجھے سُنائی ہیں کہ میں ان کو سُن کر دنگ رہ گیا ہوں ——— اور میں نے ان کو سُن کر یہ اندازہ لگایا ہے کہ اس طرح کے معاشقوں کی دنیا میں وہی شخص قدم رکھ سکتا ہے جو صاف گو، نڈر، بے باک اور زندہ دل ہو ——— بلونت سنگھ کی شخصیت میں ان تمام خصوصیات کو میں نے یکجا دیکھا ہے ——— وہ انہیں خصوصیات کا مجموعہ ہے۔

لیکن ان خصوصیات کے دوش بدوش میں نے اس کی شخصیت میں ایک ایسی سادگی اور معصومیت کی جھلک دیکھی ہے جو بلونت سنگھ ہی کا حصہ ہے۔ اس کے انداز میں، چال ڈھال میں، ہنسنے بولنے میں، ملنے جلنے میں، کھانے پینے میں، غرض یہ کہ اس کی ہر بات میں مجھے ایک سادگی اور معصومیت کی جھلک نظر آتی ہے ——— اس کے موٹے تازے، لمبے تڑنگے اور بھاری بھرکم جسم کے پیچھے میں نے ہمیشہ ایک ایسے بچے کو دیکھا ہے جو ہر وہ بات کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے جس کی اس کے دل میں لہر اُٹھتی ہے جو بات بات پر مچل جاتا ہے، جو اپنے دل کو نہیں مارتا اور جو کچھ بھی اس کے دل میں سما جائے اس کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے ——— جس کو زندگی میں پیدا ہونے والی ہر بات پر حیرت ہوتی ہے، جو زندگی کے ایک ایک واقعہ پر حیران رہ جاتا ہے لیکن اس حیرانی کے باوجود جو زندگی کا شدید احساس رکھتا ہے، جسے زندگی کی ہر بات اور ہر پہلو سے محبت ہوتی ہے، جو اس کی مسرتوں کو حاصل کرنے کے لئے، اس کی شادمانیوں سے اپنے سینے کو بھر لینے کے لئے ہر گھڑی اور ہر لمحہ تمتماتا رہتا ہے۔ یہی اس کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔ بلونت سنگھ کی زندگی کا بھی یہی مقصد ہے ——— اس کے سوا وہ اور کچھ بھی نہیں ہے ——— لیکن اس کے لئے یہی سب کچھ ہے۔

میں نے بلونت سنگھ کو عقل کی باتیں کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اس کے اندر مجھے علم کی پیاس بھی نظر آتی ہے۔ میں نے اس میں پڑھنے کا ایک جنون بھی پایا ہے۔ ہر روز کم از کم دو گھنٹے کتابوں کی دکانوں کا چکر لگانا اور اپنی پسند کی کتابوں کا خریدنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ کناٹ پلیس کی کتابوں کی دکانوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو بلونت سنگھ کو نہ جانتا ہو، جس سے بلونت سنگھ نے کتابیں نہ خریدی ہوں اور جس کے یہاں بلونت سنگھ کا حساب نہ کھلا ہوا ہو۔ دلی کی شاید ہی کوئی ایسی لائبریری ہو جس تک اس نے پہنچنے کی کوشش نہ کی ہو۔ میرے پاس کالج میں نہ جانے کتنی بار وہ صرف کتابیں لینے کی غرض سے آیا ہے ——— اور مختلف موضوعات پر اس نے نہ جانے کتنی کتابیں حاصل کی ہیں، اور ان سب کو پڑھا ہے۔ میں نے اس کو پڑھتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اسی انہماک اور خلوص کے ساتھ جو اس کی شخصیت کا نمایاں ترین وصف ہے ——— لیکن وہ اس کے باوجود وہ عالم نہیں بن سکا ہے۔ اس کے یہاں وہ خشکی اور وہ سنجیدگی نہیں پیدا ہو سکی ہے جو تبحر علمی سے پیدا ہوتی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ وہ علمی تبحر کے خیال سے نہیں پڑھتا۔ وہ عالم نہیں بننا چاہتا۔ وہ تو زندگی کو سمجھنے کے لئے، اس کے نشیب و فراز کو محسوس کرنے کے لئے، اس کی مسرتوں سے سینہ بھر لینے کے لئے، اس کی شادمانیوں سے زندگی میں رنگ بھرنے کے لئے پڑھتا ہے ——— اس کا پڑھنا ذریعہ ہے، مقصد نہیں ہے ——— یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں زندگی کا شدید احساس نظر آتا ہے، اس کو برتنے کی ہمہ گیر تمنا دکھائی دیتی ہے ——— اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اسی میں اس کی بڑائی کا راز مضمر ہے ——— اگر وہ زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کے سلسلے میں ایک فلسفی کا روپ اختیار کر لیتا تو یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی بدقسمتی ہوتی۔ پھر وہ زندگی کو محسوس نہ کر سکتا۔ اس کو برت نہ سکتا ——— اس سے دل نہ لگا سکتا ——— اور اس طرح اس کی وہ صلاحیتیں موت کی نیند سو جاتیں جو اس کی شخصیت کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ اور جس کا اثر اس کے فن میں بھی جھلکتا ہے ——— بلکہ جن سے اس کا فن عبارت ہے۔

بلونت سنگھ انسان ہے اور اسی لئے وہ انسانی زندگی کا فن کار ہے ——— انسانی زندگی جو اس کے آس پاس موجود ہے۔ اسے عام طور پر "پنجاب نگار" کہا جاتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ "پنجاب نگار" ہے بھی ——— کیونکہ وہ خود پنجابی ہے اور اس نے پنجاب کی فضا میں سانس لی ہے وہ پنجاب کے ماحول میں پروان چڑھا ہے ——— پنجاب سے اسے والہانہ وابستگی اور مجنونانہ شیفتگی ہے اس لئے پنجاب کی ترجمانی کو زندگی کی ترجمانی سمجھتا ہے

پنجاب کا ذکر آئے تو اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ وہ حسین فضاؤں میں پہنچ جاتا ہے، رنگین آسمانوں میں پرواز کرنے لگتا ہے، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے اور اس پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

ایک دن بات پنجاب پر چل نکلی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے اس کے سامنے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ پنجاب مجھے بہت پسند ہے وہاں کی فضاؤں میں کتنی دلکشی ہے؛ وہاں کے ماحول میں کیسی دلآویزی ہے؛ وہاں کی ہواؤں میں کس درجہ رعنائی ہے؛ وہاں کے دریاؤں میں کتنا رومان ہے، وہاں کے پہاڑوں میں کس قدر رنگینی ہے؛ وہاں کے لوگ کتنے زندہ دل ہیں؛ وہاں کے مردوں میں کتنا شکوہ ہے؛ وہاں کی عورتوں میں کس بلا کا حسن ہے؛ کشمیر میں تو لوگ خواہ مخواہ حسن کو تلاش کرتے ہیں اور بیکار اس کی تعریفوں کے پُل باندھتے ہیں، حسن تو پنجاب میں ہے اور پھر اس حسن میں کتنی لطافت ہے، کس درجہ نفاست ہے؛ اور اس لطافت اور نفاست کے ساتھ اس میں کیسی طرح داری ہے؛ کس غضب کی توانائی ہے؛" تو اس پر رقت سی طاری ہو گئی تھی، اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے، اس کے دل میں اشکوں کی ایک لہر سی انگڑائیاں لینے لگی تھی، اس کے سینے میں اُداسی اور غم انگیزی کا ایک طوفان سا اُمڈنے لگا تھا اور رنج و مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ رقت بھری آواز میں وہ دیر تک کچھ اس طرح کی باتیں کرتا رہا تھا کہ پنجاب کی سرزمین واقعی اپنا جواب آپ ہے۔ اس میں حسن ہے، دلکشی ہے، رنگینی ہے، رعنائی ہے، طرح داری ہے، توانائی ہے، زندگی ہے، زندہ دلی ہے، وہاں کی زمین سونا اُگلتی ہے، وہاں کی ہواؤں میں شراب کی تاثیر ہے۔ وہاں تو ہر شخص بغیر پئے مست رہتا ہے۔ نازنینانِ کشمیر کے حسن کی تعریف میں تو یونہی زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے گئے ہیں، حسن تو گل رخانِ پنجاب میں ہے۔ کیونکہ حسن، صحت اور توانائی کا نام بھی ہے، جذب و شوق بھی اس کی خصوصیت ہے، رندی و سرمستی بھی اس کا وصف ہے ـــ اسی لئے پنجاب میں آج بھی ہیر اور رانجھا، سوہنی اور مہینوال، مرزا اور صاحباں کی کمی نہیں ہے۔ افسوس ہے اب وہ پنجاب نہیں رہا۔ اب تو وہ "دو آب" اور "سہ آب" ہی رہ گیا ہے۔ پنجاب اب کہاں؟

پنجاب اسی لئے تو اس کے فن کا موضوع ہے۔ اسی وجہ سے تو اس نے پنجاب نگاری کی ہے۔ زندگی کو اس نے پنجاب میں دیکھا ہے اور پنجاب میں اسے زندگی نظر آئی ہے۔ پنجاب اور زندگی اس کے نزدیک لازم و ملزوم ہیں۔ اور اسی کا یہ اثر ہے کہ اس کی "پنجاب نگاری" میں زندگی ہے اور زندگی میں 'پنجاب نگاری'!

میں نے اسے چاہا ہے۔ اس سے محبت کی ہے۔ اس کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کے بہترین لمحے گزارے ہیں۔ اس کے ساتھ اَن گنت یادیں وابستہ ہیں، اور یہ یادیں میری زندگی کا اگر سب سے بڑا نہیں تو بہت بڑا سرمایہ ضرور ہیں ـــ یہی وجہ ہے کہ اس کی دل موہ لینے والی شخصیت آج بھی میرے دل میں محمل نشین ہے۔ اس کے خیال سے میری دنیا میں آج بھی انجمن آرائی ہے۔ اس کے حسین تصور سے آج بھی بزمِ طرب آراستہ ہے اور اگرچہ حالات نے مجھے اس سے بہت دور کر دیا ہے، درمیان میں ایک آہنی دیوار سی حائل ہے لیکن اس کے باوجود وہ رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے ـــ لیکن جذبۂ دل کی تاثیر اُلٹی ہی ہوتی ہے۔ آجکل اس "اندازِ محبوبی" اور "طرزِ دلربائی" میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے۔ ضرور اس میں کسی "جمالِ ہمنشیں" کا اثر ہو گا۔ ورنہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آجکل اس کا خیال آتے ہی اس کی حسین یاد دھیمے سُروں میں یہ شعر کیوں گنگنانے لگتی ہے:-

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

———

حیات اللہ انصاری

مکین احسن کلیم

حیات اللہ انصاری کی زندگی اور شخصیت ایک عجیب و غریب معجون مرکب ہے۔ وہ ایک منفرد افسانہ نگار ہیں۔ روزنامہ "قومی آواز" (لکھنؤ) کے مدیر اعلیٰ ہیں جسے اُردو صحافت کی تاریخ میں عصر آفرینی کا مرتبہ ملنا چاہئے۔ یو۔ پی لیجسلیٹو کونسل (ایوان بالا) کے رکن ہیں، گاندھی بھگت اور اہنسا کے علم بردار ہیں، جواہر لال کے چہیتے ہیں اور ان کی ہر بات کی حمایت ضروری سمجھتے ہیں۔ علماء فرنگی محل کے مشہور خاندان کے چشم و چراغ ہوتے ہوئے بھی ملاگردی کے مخالف ہیں۔ کانگرس کے کٹر حامی ہیں اور فرقہ پرستوں سے خواہ وہ کانگرسی ہوں یا غیر کانگرسی ہمیشہ برسرِ پیکار رہے ہیں۔ ہندوستان میں اردو کو اس کا جائز منصب واپس دلانے کے لئے جنگ کرنے والوں کے ہراول دستے کے ایک جانباز سورما ہیں۔ کچھ دن ہوئے ہندی شاہی کے حامیوں نے ان پر قاتلانہ حملہ بھی کرنا چاہا تھا۔ ان کا یہ اجمالی خاکہ ان کی بعض ذاتی خصوصیات کے بغیر نامکمل رہ جائے گا۔ وہ ایک خوش انتظام صاحب خانہ ہیں اور منتظم بھی ایسے کہ ان کے قرینے اور سلیقے کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ اپنے معمولات کے سختی سے پابند ہیں۔ تنظیم اور باقاعدگی ان کے مزاج میں مراق کی حد تک موجود ہے۔

زندگی کے اتنے تقاضے بیک وقت پورے کرنے کی سعی میں مصروف رہنے والے لوگ بالعموم نہ تو اپنے ہی رہ جاتے ہیں نہ دوسروں کے، وہ جذبات سے عاری ہو کر یا ان کی رو میں بہہ کر دن رات مشین کی طرح اپنی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ کام ان کے لئے فطرت ثانیہ بن جاتا ہے۔ ان کی ظاہری شدت احساس ان کی ناقابل مفر بے حسی کی غمازی کرتی ہے۔ حیات اللہ انصاری کو سرسری نظر یا دور سے دیکھنے کے بعد ان کے متعلق بھی یہی شک ہوتا ہے کہ وہ آنکھ بند کئے ایک راستے پر چلے جا رہے ہیں لیکن ان کے متعلق بہت جلد کوئی رائے قائم کرنا بہت مشکل ہے۔ ان کی سرگرمیوں کی تعداد دیکھ کر ان کی شخصیت کا عاد اعظم اور ذو اضعاف اقل نکالنے کی کوشش کی جائے گی تو جواب ہمیشہ غلط اور گمراہ کن ہوگا۔ کیونکہ حیات اللہ انصاری نے اپنی راہِ حیات بہت غور و فکر کے بعد متعین کی ہے اور اپنی شخصیت کی تعمیر انتہائی ہوشمندی سے کرتے آئے ہیں۔ اپنا تمام وسیع المشربی بلکہ کثیر المشربی کے باوجود وہ سیماب صفت یا منتشر خیال نہیں ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک راستہ کبھی دوسرے راستے کو کاٹنے نہیں پاتا۔ وہ ہر کام بہت سوچ سمجھ کر اور ہر بات خوب ناپ تول کر کرتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ گاندھی کے سچے پیرو ہیں۔ وہ عوامیت کو پسند کرتے ہیں لیکن عمومیت سے دور بھاگتے ہیں۔ وہ دوسروں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اپنی اثرپذیری کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ خواب بھی دیکھتے ہیں اور حقیقت کے پرستار بھی ہیں۔ ان کا مزاج کبھی گرم ہوتا ہے کبھی سرد اور کبھی معتدل، لیکن بحیثیت مجموعی صرف گرم، صرف سرد یا صرف معتدل نہیں ہے۔ ان کی طبیعت میں بے قراری ہے لیکن ٹھہراؤ کے ساتھ وہ جذبات سے عاری نہیں ہیں۔ لیکن کبھی انہیں تنہا چھوڑنے کے بھی قائل نہیں ہیں۔ عدم تشدد کو وہ عصر حاضر کی سب سے بڑی طاقت سمجھتے ہیں اور یہی ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ وہ دل کو دماغ کا یا دماغ کو دل کا تابع بنانے کے مخالف ہیں لیکن ان کے متعلق یہ شک بار بار ہوتا ہے کہ ان کے دل و دماغ نے ایک دوسرے سے جگہ بدل لی ہے۔

حیات اللہ انصاری نے اپنی زندگی کے ہر شعبے اور ہر پہلو کے لئے اصول بنا رکھے ہیں اور وہ ان پر بہت سختی سے عمل کرتے ہیں۔ ہر نیا قدم اٹھانے سے پہلے وہ گرد و پیش اور حالات و امکانات کا مکمل جائزہ لیتے ہیں۔ اپنے حلیفوں اور حریفوں کی طاقت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ آنے والی دشواریوں اور

آزمائشوں کے لئے پہلے سے تیاریاں کرتے ہیں اور تمام مبادیات کی تکمیل کے بعد بھی مناسب وقت اور موقع کے بغیر اپنی جگہ سے نہیں آگے بڑھتے اور جب وہ کچھ کر گزرتے ہیں تو اپنے مقصد کے حصول میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے، کبھی ہمت نہیں ہارتے اور دشواریوں سے ہراساں ہوئے بغیر اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ قدم آگے بڑھا کر پیچھے ہٹنا وہ جانتے ہی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں فرقہ پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے سلسلہ میں ان کی مساعی کا نتیجہ خاطر خواہ نہیں نکلا۔ لیکن اس کے باوجود وہ بددل نہیں ہوئے یا کم از کم اپنی زبان پر وہ اس کا اظہار نہیں آنے دیتے اور وہ اس سلسلہ میں مجبور بھی ہیں، جہاں گاندھی اور نہرو کی آواز کو سننے سے برابر انکار کیا جاتا ہو وہاں اس آواز کی بازگشت کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ حیات اللہ انصاری کی اس ناکامی کا بھی بنیادی سبب در اصل ان کی اصول پرستی ہے۔ زندگی کا کوئی بہت بڑا مسئلہ ہو یا کوئی بالکل ہی معمولی اور غیر اہم بات ہو وہ اپنے سوچے سمجھے ہوئے اور طے شدہ راستے سے ہرگز انحراف نہیں کرتے اصول کے سامنے وہ دلیل کو نہیں مانتے۔ اسی لئے جو لوگ انہیں اچھی طرح نہیں جانتے یا جنھوں نے ان سے صرف چند بار متنازعہ امور پر تبادلہ خیال کیا ہے بڑی آسانی سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کے مزاج میں یبس اور پھیکا پن موجود ہی نہیں ہے بلکہ وہ اپنی انتہائی حدود تک بھی پہنچ گیا ہے۔ لیکن ذرا قریب سے دیکھنے کے بعد ان کے متعلق رائے نہ صرف بدلنی پڑتی ہے بلکہ قرب میں اضافے کے تناسب سے وہ برابر بدلتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ دوستوں اور بے تکلف احباب سے مل کر وہ بالکل دوسرے ہی حیات اللہ انصاری نظر آتے ہیں۔ مزاج کی یک رخی اور یک رنگی دیکھتے ہی دیکھتے بڑی بے ساختگی کے ساتھ رنگینی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ طنز و مزاح کے سوتے پھوٹ نکلتے ہیں۔ وہ ہنستے بھی ہیں اور ہنساتے بھی ہیں۔ گدگداتے ہیں لیکن صرف اتنا کہ ہنسی آئے آنسو نہ نکلنے پائے۔ خود ان کو بھی ہدف بنایا جائے تو اس سے بھی محظوظ ہوتے ہیں اور تمام دلچسپیوں میں دل کھول کر حصہ لیتے ہیں۔ لیکن ان کی خوش مزاجی کا کنول عام طور پر آہستہ ہی آہستہ کھلتا ہے۔ اچانک روشن ہو کر آنکھوں کو خیرہ کر دینے یا بھڑک کر بجھ جانے والی کیفیت ان میں نہیں ملتی۔

خاندانی روایات کے مطابق حیات اللہ انصاری کی تعلیم کا آغاز مشرقی علوم سے ہوا۔ وہ لکھنؤ کے مشہور عالم اور مجتہد مولانا علی نقی صاحب کے شاگرد رشید ہیں۔ عربی فارسی میں کافی اچھی استعداد حاصل کرنے کے بعد انگریزی تعلیم انھوں نے خود شروع کی اور مسلم یونیورسٹی سے اس کی تکمیل کی۔ شعر و شاعری کا مطالعہ بھی کافی وسیع ہے لیکن شعر ان کو ہمیشہ غلط یاد رہتا ہے۔ شعر پڑھنے میں کبھی اس کی ٹانگ توڑ دیتے ہیں کبھی اس کے کان یا ناک کاٹ لیتے ہیں اور کبھی شاید اس کی تکمیل کے لئے کچھ اپنی طرف سے اضافہ بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ لاشعوری طور پر، قرآن کے علاوہ انجیل اور گیتا کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ اوائل عمری ہی میں ان کی انفرادیت نے ان کو روایتی ماحول سے برگشتہ کر دیا تھا۔ ممکن ہے کسی حد تک اس میں ان کی انفرادیت بھی کارفرما رہی ہو۔ سیاسی اور ذہنی آزادی کی تحریک سے متاثر ہو کر حیات اللہ انصاری نے بھی فکر و خیال کی بندشوں کو توڑنے کی کوشش کی۔ ماحول سازگار نہیں تھا۔ مزاحمت نے بغاوت کے شعلے اور بھی مشتعل کر دئے۔ ان پر ضلالت و دہریت اور گمراہی و لادینی کے الزام لگائے گئے۔ مقاطعے کی کوشش کی گئی۔ تضحیک و تمسخر، طعن و تشنیع، تنبیہ و سرزنش اور زجر و توبیخ کے ذریعہ ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی گئی۔ ہر طریقہ اور ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ انہیں اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔ وہ "اقربا" سے دور اور "اغیار" سے قریب تر ہوتے گئے۔ لیکن اس وقت تک ان کی شخصیت کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ جس مٹی سے ان کا خمیر بنا تھا اسے نئے سانچے میں تو ڈھالا جا سکتا تھا لیکن اس کے عناصر ترکیبی میں کوئی رد و بدل ممکن نہیں تھا۔ پودا لگ چکا تھا، دوسری زمین اور آب و ہوا میں اس کو پروان چڑھانے یا اس میں پیوند لگانے کی کوشش تو ممکن تھی لیکن اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لئے حیات اللہ رفتہ رفتہ گاندھیائی اصولوں اور نظریات سے قریب تر ہوتے گئے۔ فرنگی محل سے بھاگ کر انہیں اماں ملی بھی تو کہاں — سیواگرام میں۔

حیات اللہ انصاری گاندھیائی فلسفے کو سب سے زیادہ ترقی پسند اور عصر حاضر کا عظیم ترین فلسفہ سمجھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ

انسان کی کایا اب صرف اسی فلسفہ اور اسی قوت کی مدد سے پلٹ سکتی ہے۔ اسی لئے وہ فلمی کہانیوں میں، طبع زاد افسانوں میں، روزنامے کے اداریوں میں، تحریروں اور تقریروں میں، سفر اور حضر میں، خلوت میں اور جلوت میں ہر جگہ اور ہر موقع پر کسی نہ کسی انداز اور زاویے سے اہنسا کا پرچار وہ اپنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ وہ گاندھی جی کے آخری مرن برت کو عدم تشدد کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت اور اسکی قوتوں کا عظیم تر مظہر سمجھتے ہیں۔ اس دعوے نما دلیل یا دلیل نما دعوے کے جواز میں وہ گلیلیو کی مثال پیش کرتے اور اسی کا اتباع کرتے ہیں جس نے کشش ارض کی طرف نشان دہی کرنے کے لئے ایک مینار سے تین گولے پھینکنے کے بعد بار تردید اپنے مخالفوں پر ڈال دیا تھا۔ اس منطق واستدلال کو اپنے عقیدے کی بنیاد بنانے کے بعد وہ فلسفہ، سائنس، سیاست اور روحانیت کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس دوران میں وہ مارکس اور گاندھی میں تقابل کرتے ہیں۔ گاندھی جی کے آخری مرن برت کے بعد دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام اچانک بند ہو جانے کی مثال دیتے ہیں۔ کمیونسٹوں اور ترقی پسندوں پر بے خبری اور قدامت پسندی کا الزام لگاتے ہیں۔ لیکن عام طور پر سلجھانے کی کوشش میں یہ گتھی اور بھی الجھتی جاتی ہے۔ بات سے بات نکلتی جاتی ہے اور اصل معاملہ اپنی جگہ پر رہ جاتا ہے۔ حیات اللہ انصاری نے ایک زمانے میں گاندھیائی فلسفے کے مطالعے اور اس کی تدوین واشاعت کے لئے ایک انجمن بھی قائم کرنے کی کوشش کی تھی جس کے لئے بعض لوگوں نے انجمن گاندھی پسند مصنفین کا نام تجویز کیا تھا۔

"قومی آواز" سے طویل وابستگی کے دوران میں کبھی اخبار کی پالیسی پر تبادلۂ خیال کے وقت، کبھی کسی علمی یا عالمی مسئلہ پر بحث کے سلسلہ میں کبھی شعر وادب پر اظہار رائے کرتے کرتے کسی نہ کسی طرح اور گھوم پھر کر عدم تشدد کا موضوع ضرور چھڑ جاتا۔ بارہا پہلے سے وقت مقرر کر کے اس پر خاص طور سے بحث کی گئی، گھنٹوں باتیں ہوتی رہیں لیکن ان کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکل سکا۔ کوئی کسی کو قائل نہ کر سکا۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ حیات اللہ انصاری کی تلاش وانکشاف حق کی بنیاد کچھ استنباط پہ ہے کچھ تاثرات پہ اور بہت کچھ جذبات پر۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کے نظریات نے بڑی تیزی اور آسانی کے ساتھ عقاید اور dogma کی شکل اختیار کر لی ہے اور ان کے جذبات واحساسات میں کچھ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ وہ ان پر کسی اعتراض یا نکتہ چینی کو برداشت ہی نہیں کر سکتے حتیٰ کہ اختلاف رائے پر اتفاق رائے کے لئے بھی آمادہ نہیں ہوتے۔ کوئی شخص ان سے نظریاتی طور پر متفق نہ ہو تو وہ اسے بے خبر یا رجعت پسند کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ کمیونسٹوں سے ان کی خفگی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ عدم تشدد کو علانیہ طور پر ایک ڈھونگ کہتے اور سمجھتے ہیں۔ ترقی پسندوں سے ان کی ناراضگی کا بنیادی بلکہ واحد سبب یہ ہے کہ انہوں نے اہنسا کا مطالبہ اس طرح نہیں کیا جیسے وہ درست اور ضروری سمجھتے ہیں۔ ملک کی تقسیم کے متعلق ان کا رویہ ہمیشہ غیر مصالحانہ رہا ہے اور اس کے کسی حامی کو انہوں نے کبھی معاف نہیں کیا۔ آج بھی وہ کانگرس کو ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کا سب سے بڑا علمبردار اور محافظ سمجھتے ہیں۔ گاندھی کے بعد جواہر لال اور شیخ عبداللہ ان کے سب سے بڑے ہیرو اور ملک کی تمام ترقی پسند تحریکوں کیلئے علامت بن گئے تھے۔ ان کے خیال میں جواہر لال کے ہر اقدام کی حمایت ضروری ہے۔ ان کی ہر پالیسی کا خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو وہ کوئی نہ کوئی جواز ضرور تلاش کر لیتے ہیں۔ پنڈت نہرو کے بعد شیخ عبداللہ کو وہ مسلمانوں کا سب سے بڑا محسن کہتے ہیں لیکن معلوم نہیں سابق شیر کشمیر کے متعلق اب ان کی کیا رائے ہے۔

حیات اللہ انصاری اپنی تحریروں میں اور اپنے روزنامے کے اداریوں میں اپنے نظریات کو انتہائی شدومد کے ساتھ پیش کرتے ہیں، بلکہ اسی رو میں وہ اعتدال کی حد سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے ایک بار کفایت شعاری کی تعلیم وتبلیغ کے سلسلہ میں سگریٹ نوشی کے خلاف لگاتار تین روز تک دو دو کالم کے اداریے لکھ مارے۔ کافی ہاؤس میں اس اداریے کا ذکر چھڑا ہوا تھا کہ مجاز بھی آگئے۔ بذلہ سنجی اور فقرے چست کرنے میں مجاز اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کی بھی رائے دریافت کی گئی۔ انہوں نے انتہائی متانت کے ساتھ کہا کہ بھئی حیات اللہ نے

سگرٹ نوشی کے خلاف اتنے زبردست دلائل پیش کئے ہیں کہ میں انہیں ماننے پر مجبور ہو گیا۔ اس تحریر کا مجھ پر اتنا اثر ہوا ہے کہ آج سے میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ سگرٹ نوشی چھوڑ دوں اور شراب دوبارہ شروع کر دوں۔ حیات اللہ کی اس انتہا پسندی کا لوگ اکثر مذاق اڑاتے ہیں جن میں ان کے دوست بھی ہیں اور دشمن بھی لیکن وہ ان کا کوئی اثر نہیں لیتے اور اپنی بات پر اسی ثابت قدمی سے قائم رہتے ہیں کہ اصول پرستی کے بجائے ان پر ہٹ دھرمی کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ ان کی رفاقت کے دوران میں ان سے کئی بار انتہائی تلخ اور ترش باتوں کی نوبت آگئی، جو ذاتیات تک بھی پہنچ گئیں۔ لیکن ان کے ضبط اور تحمل کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے سخت سے سخت بات کو بھی ہنس ہنس کر سن لیا اور ان کی پیشانی پر کبھی بل تک نہیں آیا۔ نہ کبھی غصے یا خفگی کا اظہار کیا اور انتہائی ٹھنڈے دل سے باتیں کرتے رہے۔ کوئی انہیں گالیاں بھی دے تو وہ اسے بڑی خاموشی سے سن لیں گے۔ کوئی ان پر اعتراض کرنا چاہے تو وہ اس کی بات سننے سے انکار نہیں کرتے لیکن کرتے وہ ہمیشہ وہی ہیں جو ان کے خیال میں صحیح یا مناسب ہوتا ہے۔

آخر ۱۹۴۵ء میں لکھنؤ سے روزنامہ قومی آواز جاری ہوا۔ میں اس زمانے میں شملے میں تھا اور سرکاری ملازمت سے بیزار ہو چکا تھا۔ تمام احباب کو معلوم تھا کہ میں وہاں سے بھاگنا چاہتا ہوں۔ ایک دن جذبی کا تار ملا کہ قومی آواز نکلنے جا رہا ہے۔ فوراً لکھنؤ پہنچ جاؤ۔ بہت سے ناواقفوں کی طرح میں بھی اس زمانے میں اسی غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ صحافت دنیا کا بہترین اور معزز ترین پیشہ ہے۔ اس اتفاق کو میں نے اپنی زندگی کا بہترین موقع تصور کیا اور فوراً لکھنؤ پہنچ گیا۔

حیات اللہ انصاری سے اس سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن بہت سے احباب سے ان کا ذکر سن چکا تھا۔ ان کی کہانیاں بھی پڑھتا رہتا تھا۔ ان سے مل کر ان کی صاف گوئی اور سادگی سے کافی متاثر ہوا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اب تم کو نہیں جانے دوں گا۔ میں نے بھی جواب دیا کہ میں اتنی دور سے صرف واپس جانے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ میں نے لکھنؤ میں ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کسی قسم کی کاروباری گفتگو سے پہلے ہی۔ اس زمانے میں قومی آواز سے جتنے لوگ وابستہ تھے یہ ان سب کی زندگی کا ایک عجیب و غریب دور تھا۔ سب کے سامنے ایک مقصد تھا۔ اردو صحافت کو نئے معیار اور نئی روایتوں سے روشناس کرانے کی دھن تھی۔ روز نئے منصوبے بنتے، نئے تجربے ہوتے، ادارے کے تمام اراکین ایک خاندان کے افراد کی طرح مل جل کر رہتے تھے۔ ہر شخص ہر کام ہر وقت کرنے کیلئے تیار رہتا تھا باقاعدہ تقسیم کار کے بغیر بھی تنظیم و ترتیب قابل دید تھی۔ تمام لوگ ایکدوسرے کا ہاتھ بٹاتے تھے، دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ تفریحوں اور دلچسپیوں میں مشترکہ طور پر حصہ لیتے تھے۔ طبائع میں اختلاف ضرور تھا۔ مزاج جدا جدا تھے لیکن اس نے تفریق یا اختلاف پیدا کرنے کے بجائے ایکدوسرے کے لئے اور بھی کشش پیدا کر دی تھی کامیابی جلد اور توقع سے زیادہ ہوئی۔ یہ ہم آہنگی ابتدا کے چند برسوں کے بعد کم ضرور ہو گئی تھی اور اس کے اسباب کچھ سیاسی اور نظریاتی تھے، کچھ ذاتی اور معاشی لیکن اس ادارے میں کبھی کوئی سازش یا ساز باز نہیں ہوئی، کبھی کسی نے ایک دوسرے کی جڑ کاٹنے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی کسی کے دل میں کینہ اور عناد نہیں پیدا ہونے پایا۔ حالانکہ قومی آواز کے انگریزی اور ہندی "بھائیوں" کے یہاں اس سے بالکل مختلف فضا تھی۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ حیات اللہ انصاری سے نظریاتی اختلاف پیدا ہو جانے کے بعد بھی کوئی شخص اخبار کو نقصان پہنچانے کا خیال تک نہیں کر سکتا تھا۔ خود حیات اللہ انصاری نے بھی ہمیشہ اس کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ کئی مہینے تک صرف ایک روپیہ ماہوار علامتی تنخواہ لیتے رہے۔

حیات اللہ انصاری کی زندگی میں بارہا نشیب و فراز آئے۔ آلام روزگار نے ان پر پیہم یورشیں کی ہیں۔ انہوں نے زندگی کو برت کر اور اس سے دست و گریباں ہو کر اسے سمجھا، پایا اور اپنایا ہے۔ اس کی سرکش تلخیوں اور جابرانہ کلفتوں کے پے در پے حملوں نے انکو سعی پیہم اور جہد مسلسل کا سبق دیا ہے۔ انہوں نے زخم کھا کر مسکرانا اور بہر نوع اپنا سر اونچا رکھنا سیکھا ہے۔ روپوشی اور بیکاری سے خوشحالی تک کسی دور میں انہوں نے اپنے آپکو ایک خاص سطح سے نہیں گرنے دیا انہوں نے اپنے رہن سہن کا جو معیار قائم کر لیا ہے اس میں کسی حالت میں بھی سر مو فرق نہیں آنے دیا ہے لیکن اس معیار کا تعلق تنظیم، ترتیب، شائستگی اور ستھرے پن سے زیادہ ہے۔ ظاہری شان و شوکت سے بہت کم بلکہ بالکل نہیں۔ ان کے کپڑوں میں خود اپنے ہاتھوں سے لگے ہوئے پیوند ہو سکتے ہیں لیکن ڈھونڈھنے سے بھی ان پر کوئی شکن نہیں مل سکتی۔ کوئی داغ یا دھبہ نہیں نظر آ سکتا۔ جوتے کی مرمت سے لے کر کپڑے دھونے یا سینے اور کھانا پکانے تک کوئی کام ایسا نہیں جو وہ خود نہ کر سکتے ہوں یا ضرورت پڑنے پر جسے انہوں نے خود نہ کیا ہو۔ وہ بیک وقت بوریا نشین درویش بھی ہیں۔ تمام آسنوں سے

واقف لیڈی گی بھی اور جانباز مرد مجاہد بھی۔ وہ اپنے معالج بھی آپ ہی ہیں۔ تزکیۂ نفس کے ساتھ وہ تنقیۂ جسم کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ طویل فاقہ ان کے لئے اکسیرِ اعظم کا حکم رکھتا ہے۔

حیات اللہ انصاری غذا کے معاملے میں گاندھی جی اور برنارڈ شا کا تتبع کرتے ہیں لیکن اپنی حدوں کے اندر رہ کر۔ معدے تک پہنچنے سے پہلے ان کی غذا کو ان کے دماغ کی کمی پُرپیچ راہوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کا معدہ بھی ان کے شعور و فہم کا تابع ہے۔ وہ صرف حیاتین کھاتے ہیں مقدار کا تعین calories کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ وہ لذت پر افادیت کو ترجیح دیتے ہیں اور غذا برائے غذا کے بجائے غذا برائے صحت وحیات کے قائل ہیں یا انہوں نے اپنے معدے کو کام و دہن کی عیاشی یا بے راہ روی کا وسیلہ نہیں بننے دیا۔ بلکہ وہ ہمیشہ کفایت و افادیت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہر مہنگی چیز کا ارزاں بدل معلوم کر لیا ہے سیب، انگور اور انار وغیرہ کی کمی آم، امرود اور اسی طرح کے دیسی پھلوں سے پوری کرتے ہیں۔ ان کے یہاں کھانے کی میز پر وقت اور موسم کے اعتبار سے کچی مونگ پھلی، خشک آملہ، کاڈلیوریا، ہیلیبٹ آئل، ساگ پات اور اُبلی ہوئی سبزیاں، مولی گاجر، کھیرا ککڑی، بھیگے ہوئے چنے اور اسی طرح کی حیات کُش، لیکن لذت کُش چیزیں ملتی ہیں۔ وہ ان کڑوی کسیلی چیزوں پر افادیت کی شکر لپیٹ کر اور مزہ لے لے کر کھاتے ہیں اور دوسروں کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ بھی انہیں جزوِ زندگی بنائیں۔ لیکن وہ اپنی عادت کے غلام نہیں ہیں۔ کوئی لابدی چیز ان کے لئے ناگزیر نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے دُور رس عزائم اور عظیم تر مقاصد کے حصول کے لئے سنیاسیوں اور راہبوں جیسی یکسوئی کے ساتھ کوشاں رہتے ہیں۔

حیات اللہ انصاری کی نظریاتی انتہا پسندی کا پرتو ان کے اندازِ بیان اور اسلوبِ تحریر پر بھی پڑتا ہے لیکن انکی مبالغہ آرائی ہوتی بڑی دلچسپ ہے۔ جب وہ الفاظ کو اپنے تیز رو جذبات کے ساتھ گھسیٹنے کی کوشش کرتے ہیں یا اپنے وجدانی دلائل پیش کرتے ہیں تو ان کی باتوں میں بڑا لطف آتا ہے۔ ایک بار ایک جلسے میں انہوں نے اُردو کی عظمت اور اس کے ادب کی آفاقیت بیان کرتے ہوئے اقبال کا یہ شعر پڑھا ؎

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی　　جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اور کہنے لگے کہ یہ شعر ایٹم بم سے بھی زیادہ طاقتور ہے اور مٹانیوالے خود مٹ جائیں گے لیکن یہ کبھی نہیں مٹ سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ ایٹم بم بے انتہا تباہی اور بربادی پھیلا سکتا ہے لیکن اس کا اثر محض تخریبی اور منفی ہوتا ہے۔ مگر اقبال کا یہ شعر۔ اس کی طاقت کا اندازہ ہندی والے نہیں لگا سکتے۔ ایٹم بم گرتے رہیں گے، قومیں مٹتی اور اُبھرتی رہیں گی لیکن یہ شعر اور اسکا پیغام آنیوالی نسلوں کے دل ہمیشہ گرماتا اور ان میں نئی رُوح پھونکتا رہے گا۔ یا جب وہ گاندھی جی یا ان کے مرن برت کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے الفاظ کا سارا خزانہ نکال کر سُننے والے کے سامنے ڈھیر کر دیں گے۔ گرمی اور شدّت کے ساتھ ان کے لہجے میں عقیدت اور وارفتگی بھی ہوتی ہے اور کچھ ان کی گم گشتگی اور از خود رفتگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔

یہی وارفتگی اور گم گشتگی حیات اللہ انصاری کے بیشتر افسانوں میں پہنچ کر ان کی نمایاں خصوصیتیں بن گئی ہیں وہ اپنے موضوع کو اپنی رُوح میں اسطرح سمو لیتے اور جذب کر لیتے ہیں کہ وہ خود اپنی تخلیق کا حصہ بن جاتے ہیں۔ آخری کوشش یا اُلجھی مصیبت میں جسکا موضوع بھی کچھ کم اُلجھا نہیں، وہ تمام شدت موجود ہے جو افسانے کو واقعیت سے ممیّز کرتے ہوئے بھی اسے حقیقت سے زیادہ حقیقی بنا دیتی ہے۔ "ہانرت" میں بھی موضوع پرانی ہی سخت گرفت نظر آتی ہے فسادات پر انہوں نے جو افسانے لکھے ہیں ان میں بھی عریاں انسانیت کے انتہائی قرب کی مؤثر عکاسی کے باوجود سرسامی یا ہذیانی کیفیت کا انداز نہیں ملتا بلکہ کان لگانے پر انسانیت کے زخم خوردہ دل کی دھڑکنیں برابر سُنائی دیتی ہیں۔ عدم تشدّد پر حیات اللہ کے ذاتی احساسات بہت شدید ہیں اور انہیں ان پر قلم اٹھانے کا پورا پورا حق حاصل ہے لیکن نظریاتی اختلاف سے قطع نظر ان افسانوں کو پڑھ کر یہ شک بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے فن کو اپنے موضوع پر قربان کر دیا ہے عملی زندگی میں عدم تشدّد کے اصول کو آجکل نبھانا ممکن ہے یا نہیں، اس بحث میں یہاں اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ اصول تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ افسانوں میں واقعات کو من وعن بیان کر دینا ضروری نہیں ہے، عدم تشدّد پر انکے افسانے پڑھ کر ایک تشنگی سی محسوس ہوتی ہے۔ ہر کامیاب افسانہ نگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے حسیاتی یا واقعاتی تجربے کو آفاقی احساس کا جزو بنائے اس کے بغیر افسانہ حقیقت کا چربہ تو بن سکتا ہے لیکن ادب اور فن میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتا۔ یہ کوئی ایسا نکتہ نہیں ہے جو حیات اللہ انصاری کی نظروں سے نہاں ہو لیکن جب وہ عدم تشدّد پر افسانہ لکھتے ہیں تو نہ جانے کیوں اسے برتنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ٭

شوکت صاحب

محمد طفیل

شوکت تھانوی کی شخصیت بڑی دلکش اور بڑی پیاری ہے۔

مگر عجیب و غریب بھی۔

قبل اس کے کہ میں زبان کھولوں۔ کیوں نہ پہلے آپ اُن کی رائے خود اپنے بارے میں سُن لیں۔ اس سے کچھ اور فائدہ ہو یا نہ ہو مجھے یہ فائدہ ضرور پہنچے گا کہ شوکت صاحب مجھ سے ناراض نہ ہوں گے۔ اور آپ بھی مجھے یہ کہہ کر بخش دیں گے کہ جب خود "مابدولت" کی اپنے متعلق یہ رائے ہے تو پھر کسی اور پہ کیا دوش، جبکہ دوسرے رائی کا پہاڑ بنانے کے بھی عادی ہوں۔ میں اپنے اُوپر ہزار تہمتوں کو بہ خوشی قبول کر سکتا ہوں، سوائے اس کے کہ میرا شمار رائی کا پہاڑ بنانے والوں میں ہو۔ مجھے علیٰ خوشی ہوگی کہ میں اس مضمون کے سلسلے میں رائی کی رائی اور پہاڑ کا پہاڑ بنا کر پیش کر سکوں۔

ہاں صاحب، مولانا شوکت تھانوی اپنی ذات کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

اس سے[1] بڑھ کر اور حماقت کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں کو پیش کر دیں۔ اب یہ کہنے والا کوئی بھی نہ ہوگا کہ خدا نے اس کو سچ بولنے کی توفیق عطا کی۔ کوئی کہے گا "سُن لیا آپ نے یہ جو آپ کے شوکت تھانوی ہیں۔ اعلیٰ درجے کے جواری واقع ہوئے ہیں"

کسی طرف سے آواز بلند ہوگی "بدمعاشیوں کے سوا اور کچھ کیا ہی نہیں"

اور اب ذرا فن کے بارہ میں بھی ان کی رائے معلوم ہو جائے تو بہتوں کا بھلا ہوگا۔

بچو![2] یہ شاعر بھی ہیں۔ جب سنجیدہ کلام رو رو کر پڑھتے ہیں۔ تو سُننے والوں کو ہنسی آجاتی ہے۔ خدا کے لئے ان کو سمجھاؤ کہ یہ ترنم سے کلام سُنانا چھوڑ دیں۔ اور اگر شاعری ہی ترک کر دیں۔ تو تم سب مل کر یوم نجات مناؤ۔

بچو! ان کے مزاحیہ مضامین پڑھ کر اگر تمہیں ہنسی نہ آئے تو اپنے کو سمجھدار سمجھنا۔ اور اگر ہنسی آجائے۔ تو کسی فقیر سے اپنے لئے تعویذ لکھوانے کی کوشش کرنا۔ بعض لوگ شوکت تھانوی کو مزاح نگار کہتے ہیں۔ اور بعض طنز نگار اور اس قسم کے لوگ

---

[1] مابدولت صفحہ ۱۱، ۱۲، [2] نقوش نمبر ۳۱، ۳۲، صفحہ نمبر ۶

بہت کم ہیں جو طنز اور مزاح کا فرق سمجھ سکیں۔ فرق سمجھتے ہوتے تو نہ انہیں طنز نگار
کہتے اور نہ مزاح نگار"۔

سن لی آپ نے اِن کی رائے خود اپنے بارے میں، اب اگر ہم نے یہ طے بھی کر رکھا ہو۔ کہ ہم شوکت صاحب کے خلاف ہی مضمون لکھیں گے۔ پھر بھی اُس سے زیادہ کیا کہیں گے۔ جو خود انہوں نے اپنے متعلق فرما رکھا ہے۔ لہٰذا ہمیں اُن کی رائے سے بھٹکنا نہیں چاہیئے۔ ورنہ یہ مضمون دو کوڑی کا نہ رہے گا۔

جہاں تک ان کے مزاح نگار ہونے کا تعلق ہے۔ میں اس پر ایمان رکھتا ہوں۔ اگر آپ اِن کی اِس خصوصیت سے بھی منکر ہیں۔ تو یہ بڑی زیادتی ہے۔ آپ کی رائے اپنی جگہ پر برحق بھی ہو۔ تو بھی میری بات مان لیجئے۔ کہ یہ مزاح نگار ہیں۔ اگر آپ نے میری یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ تو میری اور اِن کی دلشکنی ہو گی۔ اور دلشکنی کسی بھی صورت میں اچھائی کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ لاکھ کہیں کہ میں مزاح نگار نہیں ہوں۔ لیکن یہی بات اگر آپ نے بھی دُہرا دی۔ تو شوکت صاحب ناراض ہو جائیں گے۔ بفرضِ محال وہ ناراض نہ بھی ہوں۔ تو بھی یہ سوچئے کہ اگر شوکت صاحب مزاح نگار نہیں ہیں۔ تو پھر آج کون ہے مزاح نگار ۹ پاکستان اور بھارت میں مزاح نگاروں کا بڑا قحط ہے۔ اگر ہماری حکومت کی مالی حالت اچھی ہوتی۔ تو میں اس سے درخواست کرتا۔ کہ وہ دو چار مزاح نگار امپورٹ کرلے۔ تاکہ ہماری صحتوں پر اچھا اثر پڑے۔ ورنہ ہم تو ایک ہی طرح کی غذا کھاتے کھاتے عاجز آگئے ہیں۔

یوں تو ان میں بے شمار خوبیوں کے ساتھ اَن گنت بُرائیاں بھی ہیں۔ لیکن سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ بے تحاشا لکھتے ہیں۔ یعنی سب کے سب مزاح نگاروں کا کوٹا یہ اکیلے ہی ختم کر ڈالتے ہیں۔ باقی بیچارے منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایک صاحب تو اپنی حق تلفی کے اظہار کے طور پر یو۔ این۔ او میں پڑے ہیں۔ دوسرے علی گڑھ میں ناسمجھوں میں سمجھ پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چند ایک تو کُڑھتے کُڑھتے مر ہی گئے۔ اُن باغیرت حضرات میں عظیم بیگ چغتائی اور فرحت اللہ بیگ کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ اب سرحد پار ایک صاحب کنہیا لال کپور ہیں۔ اُن کا یہ اس لئے کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کہ وہ ہندو ہیں۔ اور خدا کو یہی منظور ہے کہ کوئی لاکھ زور لگالے۔ مگر ہندو اور مسلمان میں سے کسی ایک کو کسی طرح ختم نہیں کیا جا سکتا۔

ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا۔ کہ آپ بے تحاشہ لکھتے ہیں اور سوچنے سمجھنے کا موقع اُنہیں کم ملتا ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں۔ کہ انہیں سوچنے سمجھنے کا موقعہ کم ہی ملے۔ ورنہ یہ صرف سوچتے ہی رہ جائیں گے اور کچھ بھی نہ لکھیں گے۔ اور پھر ہوگا یہ کہ بڑے زوروں سے آبادی کم ہونی شروع ہو جائے گی۔ اس لئے کہ اس دنیا میں ہمارے لئے قدم قدم پر غم کے پہاڑ کھڑے ہیں۔ کوئی آدمی بھی تو مطمئن نہیں۔ بڑوں کو قوم کا غم کھا رہا ہے اور چھوٹوں کو اپنا غم۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بڑے قوم ہی کو کھا رہے ہیں۔ لیکن میں یہ بات سُنی اَن سُنی کر دیتا ہوں۔

اچھے مزاح نگاروں میں ایک پطرس نامی مزاح نگار "گذرے" ہیں۔ انہیں ایک بُری عادت یہ تھی کہ سوچتے زیادہ تھے اور لکھتے کم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نصف صدی کی عمر تک پہنچکر بھی جو کتابچی لکھ سکے۔ وہ بھی شوکت صاحب کی کسی ایک کتاب کی نصف ہے۔ برخلاف اس کے شوکت صاحب کی تصانیف کی تعداد پوری سینچری نہ سہی، نصف سینچری تو ہے۔ بعض لوگوں کے ہاں ہر سال ایک بچہ کی اوسط ہوتی ہے۔ ان کے ہاں ہر سال ایک کتاب کی اوسط ہے۔ کچھ لکھنے والے اپنی تصانیف کو اپنی اولاد ہی سمجھتے ہیں۔ اس لئے یہاں یہ مت پوچھئے کہ ادیبوں کی "تصانیفی اولاد" کے علاوہ جو اولاد ہوتی ہے وہ کس کھاتے میں جائیگی۔

اِن کی شاعری سے میرا بھی ناک میں دم ہے۔ نہ جانے انہیں اللہ نے اِن کی کن بداعمالیوں کی یہ سزا دی کہ شوکت صاحب بھی شعر کہنے لگے۔ شعر موزوں کر لینا ان کا کوئی کمال نہیں ہے۔ یہ تو ہر یو۔ پی میں پیدا ہونے والے کا حصہ ہے۔ البتہ یہ ذرا سے پڑھے لکھے ہیں، اس لئے کبھی کبھی کام کا شعر بھی کہہ نکلتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ یہ اتنے بھی پڑھے لکھے نہ ہوتے تو عین ممکن تھا کہ یہ شعر و شاعری کے معاملے میں اپنا کوئی ثانی پیدا ہونے ہی نہ دیتے۔ اور اس پر ان کا ترنم

نذرِ علی نور۔ بالکل ایسے سمجھئے کہ جیسے کوئی یورپین لیڈی اُردو کی کوئی غزل گانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس پر بھی آپ مشاعروں میں شرکت فرماتے ہیں۔ اس لئے کہ حکیم نے نسخے میں لکھ دیا ہے۔ میں بھی کوئی آٹھ دس مشاعروں میں ان کا کلام ان کے ترنّم سمیت سُن چکا ہوں۔ اور میں نے یہ دیکھا کہ یہ سوائے دو ایک مشاعروں کے باقی سب میں بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہُوٹ ہوئے۔ مجھے چونکہ ان سے ایک دلآویز قسم کی ذہنی وابستگی ہے۔ اس لئے میں نے ہر بار یہ محسوس کیا ہے کہ بھرے مجمع میں مَیں ہی ہوٹ ہُوا ہوں۔ اس لئے مجھے خودکشی کر لینی چاہیئے۔ خدا کی شان دیکھئے۔ کہ اب تک نہ شوکت صاحب نے خودکشی کی ہے اور نہ میں نے۔ نہ وہ شعر کہنے سے باز آئے۔ اور نہ میں انہیں آب تک یہ سمجھا سکا کہ حضور شعر و عر کہنا چھوڑئیے۔ ورنہ ڈر ہے کہ مجھے خودکشی پر راضی ہونا پڑے گا۔

ویسے یہ اتنے بھی گئے گذرے نہیں ہیں۔ کہ شاعری میں استاد امام دین اور ترنّم میں پنڈت آنند نرائن ملّا کو شرمانے لگے ہوں۔ یہ کئی علم کے شاعروں سے اچھا شعر کہتے ہیں۔ پھر بھی اگر یہ شعر نہ کہیں گے۔ تو کونسا شعری ادب ڈوبا جاتا ہے ——— البتہ مجھے ان کی سنجیدہ شاعری سے مزاحیہ شاعری زیادہ پسند ہے۔ اس لئے کہ یہ سنجیدہ شاعری کرتے وقت خواہ مخواہ اپنے اوپر متانت کو طاری کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ اکثر اپنی سرشت کے مطابق آدمی کو آدمی کا بچہ یا آدمچہ کہتے ہی پکڑے گئے ہیں۔ اِس پر بھی سنجیدہ شاعری، بات جچتی نہیں ——— ہزل میں یہ رفیع احمد خاں کے مُربّی ہیں وہ رفیع احمد خان، جن کے شعر سُن کر علامہ اقبال تک کا ٹھوس آدمی پھڑک اُٹھا تھا۔ اگر آپ کی ان سے یاری ہے۔ تو شوکت صاحب سے اِن کے اِس نوع کے شعر سُنئیے۔ مرے آجائیں گے۔ دُنیا بھی سنور جائے گی اور عاقبت بھی۔ اگر ذرا بھکے تو یہ سمجھ لیجئے کہ دُنیا بھی خراب اور عاقبت بھی۔ نہ جانے خود ان کی عاقبت اور دُنیا کا کیا حال ہے۔

مضمون شروع کرنے سے پہلے اگر میں اُن کا حُلیہ بیان کر دیتا۔ تو زیادہ مناسب تھا۔ چونکہ اِس زمانے میں کوئی بات بھی مناسب طریقے سے نہیں ہو رہی۔ اس لئے یہاں عرض کر دوں۔ تو کچھ حرج مت سمجھئے گا۔

اِن کا رنگ تو ہے گہرا گندمی، (اگر میں ہلکا سیاہ کہوں گا۔ تو ان کی ہو گی ہتک)۔ قد اچھا خاصا مردوں جیسا ہے۔ نہ زیادہ اُونچا نہ ناٹا۔ بلکہ خوبصورت قد، ناک کو لمبی کہوں تو بھی بات غلط، چپٹی کہوں تو بھی غلط۔ اِس لئے معاملہ بین بین سمجھئے۔ البتہ ناک ذرا اور شمال جنوب کو پھیلتی تو آپ بے دھڑک چپٹی ناک کا خطاب دے سکتے تھے۔ اب احتیاط لازم، دانت خاصے خوبصورت تھے۔ مگر یہ اِس رفتار سے پان کھانے رہے ہیں کہ آخر کب تک بھلے لگتے رہتے، چہرہ پر عینک، پہلے چہرے پر مونچھیں بھی ہوتی تھیں۔ درمیان میں غائب ہو گئیں۔ اب پھر اپنا جلوہ دکھانے لگی ہیں۔ ویسے ان کے چہرے کی اِس چیز کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ نہ جانے کب غائب ہو جائے اور کب نمودار۔

یہ بلا کی دلفریب اور محبوب مجلسی شخصیّت ہیں۔ ان کی موجودگی میں بڑے سے بڑا فقرے باز بھی نہیں ٹک سکتا۔ نتیجۃً محفل کی محفل زعفرانِ زار بن جاتی ہے۔ یہ بڑے گنہگار ہیں۔ اگر قدرت نے انہیں بخشا۔ تو اِس کا سبب اِن کی شخصیّت کا یہی رُخ ہو گا۔ بات میں سے بات پیدا کر لیتے ہیں۔ لفظی رعایتوں کا جتنا زیادہ فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں نے انہیں دیکھا ہے۔ اور کسی کو نہیں دیکھا۔ طرزِ بیان میں بھی بلا کا حسن۔ اب تو ماشاءاللہ آپ ایکٹنگ بھی فرمانے لگے ہیں۔ سُنا ہے کہ انہوں نے ایکٹنگ بھی خوب خوب کی ہے۔

قاضی جی بھی تو اِن کی ایکٹنگ کی ایک رنگارنگ تصویر تھی۔ کاش وہ تصویر مستقل نہ ٹنگی رہتی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہوائی خدا ان کی صلاحیتوں کا کچھ غلط اندازہ لگا رہے ہیں۔ ورنہ وہ اِن کے ذمّہ کوئی اور کام کر کے اِن کے مزید جوہر دیکھتے۔

ہاں تو بات یہ ہو رہی تھی کہ یہ بلا کی دلفریب مجلسی شخصیّت ہیں۔ ان کے قصّے سُنتے جائیے اور ان کی مغفرت کے لئے دُعا کرتے جائیے۔

سُنا ہے کہ یہ پچھلے دنوں مع اپنی بیگم صاحبہ کے کراچی جا رہے تھے۔ جس ڈبہ میں ان کی سیٹ تھی۔ اُسکی ترتیب کچھ یوں تھی۔ کہ نچلی دونوں سیٹوں میں سے ایک پہ یہ تھے اور ایک پہ ان کی بیگم، بیگم کے اُوپر والی سیٹ ایک بڑے موٹے تازہ آدمی کے حصّے میں آئی تھی۔ جب سب اپنی اپنی سیٹوں پہ براجمان ہوئے اور گاڑی چل دی۔ تو شوکت صاحب اپنی جگہ سے اُٹھے۔ اور اُن صاحب کو بڑے غور سے دیکھنے لگے۔ کبھی نیچے سے کبھی اُوپر سے۔ کبھی سر ہلاتے ہیں۔ اور دونوں ہاتھ جوڑ کر اور منہ چھت کی طرف اُٹھا کر کہتے ہیں ——— "سبحان تیری قدرت، خوب چیز بنائی ہے تُو نے بھی"

اس پر وہ صاحب متوجہ ہوئے اور اِن سے پوچھا ——— "آپ مجھ سے کچھ فرما رہے ہیں؟"

انہوں نے کہا "جی ہاں"

وُہ صاحب "ایں ———"

یہ صاحب "آپ کی نظر میں کوئی لڑکی ہے؟"

وہ صاحب "خیریت؟"

یہ صاحب "میں اُس سے شادی کروں گا"

وہ صاحب "ارے صاحب آپ کی تو بیوی موجود ہے (اور نیچے ہاتھ کر کے) کیا یہ آپ کی بیوی نہیں ہیں؟"

یہ صاحب "ہیں تو"

وہ صاحب "پھر؟"

یہ صاحب ——— سوچتا ہوں کہ جب آپ اُوپر والی سیٹ سے نیچے اُتریں گے۔ تو گریں گے ضرور۔ نتیجتہً میری بیوی شہید ہو جائیگی۔

روایت ہے کہ اِس مرکالمے پر ڈبے کا ڈبہ ہنس دیا۔ لیکن کسی نے اِس طویل سفر میں اُن صاحب کو نیچے اُترتے نہیں دیکھا۔

ایک تو اُنہیں نئی نئی باتیں سوجھتی ہیں۔ پھر باتوں میں بلا کی برجستگی اور بعض اوقات زہر بھی۔

اِن کی ہمشیرہ کی جب شادی ہوئی تو رواج کے مطابق لڑکے والوں نے انہیں خوب خوب بنایا۔ کوئی آکر اِن کے کان میں چپکے سے کہتا ——— "آج آپ کی ہمشیرہ کی شادی ہے نا؟"

شوکت صاحب "جی ہاں"

اُدھر سے ایک اور صاحب آتے اور کہتے "جی آج آپ کی ———"

شوکت صاحب "جی ہاں"

بالآخر دُولہا کی بغل سے بھی ایک صاحب نکل آئے۔ اور فرمانے لگے "آپ ہی دُولہا کے سالے ہیں نا؟"

اس پر شوکت صاحب نے اُن حضرت کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اُونچی آواز میں کہا "آج اِن صاحب سمیت مجھ سے کئی ایک نے پوچھا ہے۔ کہ آج آپ کی ہمشیرہ کی شادی ہے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ آپ سب کے سامنے اقرار کر لوں۔ کہ شادی میری ہی ہمشیرہ کی ہے۔ اور ہمارے ہاں رواج یہ ہے کہ جب لڑکی جوان ہو جاتی ہے۔ تو ہم اسکی شادی کر دیتے ہیں"

یہ بات مجھے ان کے بڑے بھائی ارشاد تھانوی صاحب نے سنائی تھی۔ وہ کہتے تھے۔ کہ شوکت کے اس ریمارک کے بعد

سب کو سانپ سونگھ گیا۔ پھر کسی کی مجال نہ ہوئی کہ کوئی ان کے پاس سے گذر جائے۔

ایسی باتوں سے ان کی زندگی بھری ہے۔ کہاں تک سنئیے گا۔ اگر وہ ساری باتیں سنا بھی دی جائیں تو جو اصل اور نقل میں فرق ہے وہ تو بہر حال رہے گا۔

آپ سوچتے ہوں گے۔ کہ اتنا دلچسپ، اتنا ہنس مکھ اور ایسا باغ و بہار قسم کا انسان کبھی بھی پریشان حال نہ ہوگا۔ لیکن آپ رہتے ہیں پریشان حال۔ میں اس کی وضاحت نہ کروں گا۔ کہ پریشانیاں انہیں گھیرے رہتی ہیں یا یہ پریشانیوں کو گھیرے رہتے ہیں۔ بہر حال ان دونوں باتوں میں سے ایک نہ ایک بات ضرور رہے۔

ان کی طبیعت کی ایک اچھائی یہ بھی ہے کہ یہ بیٹھے بٹھائے ناراض ہو جاتے ہیں، نہ ناراض ہونے کا پلاٹ بناتے ہیں اور نہ کوئی اسکیم، نہ ہی دوسرے کو یہ موقعہ دیتے ہیں کہ وہ بے چارا مدافعت ہی میں کچھ کہہ سکے۔ اگر آپنے اس موقعہ پر کچھ کہہ بھی دیا تو یہ سنتے تھوڑی ہیں بھئی سنیں بھی تو کیسے۔ کوتوال شہر کے بیٹے ہیں۔ اس معاملے میں میں ان کو کم اور ان کے والد بزرگوار کو زیادہ قصوروار ٹھہراتا ہوں ——— یہ دوست برسوں میں بناتے ہیں۔ قطع تعلق ایک منٹ میں کر لیتے ہیں۔

جو ان کے نئے نئے یار ہوتے ہیں۔ وہ بڑے پریشان ہوتے ہیں۔ لیکن جنہیں ان کی دیرینہ دوستی کا شرف حاصل ہے وہ زیادہ پریشان نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ انہیں علم ہے کہ ابھی شوکت صاحب کبھی پھر منہ نہ دیکھنے کا اعلان کر گئے ہیں۔ پھر کسی دن خود ہی اسی پیار اور محبت سمیت آجائیں گے۔ اور اس دن کی ناراضی کا ذکر تک نہ کریں گے۔ پھر ویسی ہی گھٹے گی۔ وہی لطیفے ہوں گے۔ وہی شوکت صاحب ہوں گے۔ شوکت صاحب کی ناراضی ایک دم بلا سبب کا فیوز ہونا ہوتی ہے۔ لیکن اس کے بعد خود ان کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے اندھیرا انہیں چھپا یا دہ سکتا۔ مجھے تو ان کے روٹھنے پر بڑا پیار آتا ہے۔ ایسے لوگ کہاں ملیں گے۔ جن کے روٹھنے میں بھی ایک معصومیت ہو۔ اگر ایسے لوگ ملتے ہیں تو مجھے کیوں نہیں ملتے۔ اگر آپ کو ایسی ہی کسی شخصیت کا علم ہو تو مجھے اس کا سراغ دیجئیے۔ میں اس سے دوستی کر دوں گا۔ میں اس سے محبت کرونگا۔

آپ فرسٹ کلاس قسم کے بزدل ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مزاح نگار ہیں۔ اگر اپنا دل مضبوط ہوتا تو لوگوں کو رلانے پر بھی قادر ہوتے اور پھر آپ شوکت تھانوی نہ ہوتے، علامہ راشد الخیری ہوتے ——— ذرا بادل گرجے، بجلی چمکے، پھر دیکھئیے آپ کا مزا۔ نادری حکم کے ماتحت تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کرا دیں گے۔ اس کے بعد خود اٹھیں گے۔ چٹخنیاں دیکھیں گے کہ کہیں کوئی چٹخنی کھلی تو نہیں رہ گئی۔ پہلے خود اٹھنے کے بجائے دوسروں کو اس لئے حکم دیں گے۔ مبادا بجلی اندر گھس کر تبادلہ خیالات کر ڈالے۔ پورے اطمینان کے بعد پھر لحاف لے کر پڑ رہیں گے خواہ دن کے بارہ ہی کیوں نہ بجے ہوں ——— آپ خدا سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا کہ سانپ سے، سانپ سے ڈرتے تو سبھی ہیں۔ لیکن آپ تو سانپ کے ذکر تک سے ڈرتے ہیں۔ جس رات سونے سے پہلے سانپ کا ذکر آجائے۔ تو پھر سمجھئیے کہ اس رات آپ کو نیند نہیں آسکتی۔ بلکہ لیٹے لیٹے ہر لمحہ یہ سوچتے رہتے ہیں کہ اب آیا سانپ کہ اب، اب کمرے کے فلاں کونے سے نکل رہا ہے۔ اب میری چارپائی کے نیچے پہنچا۔ اب وہ چارپائی پر چڑھ رہا ہے۔ اب ہے میرے بستر پر اور اب ——— اب ——— اسی اب اب میں رات کی صبح کر دیں گے۔

اگر رات کو کہیں کھٹکا ہو۔ تو یہ خود تھوڑی اٹھیں گے۔ الٹا بیگم سے کہیں گے ——— "سنتی ہو۔ ذرا اٹھ کے دیکھنا۔ کیا بات ہے مجھے تو کچھ گڑبڑ نظر آتی ہے۔" اور جب بیگم اٹھ کر دیکھیں گی اور انہیں بتائیں گی۔ کہ بلی تھی۔ تب ان کی گھگی بندھنا بند ہو گی اور لحاف ہی میں پڑے پڑے پھولی ہوئی سانسوں سے کہیں گے ——— ہوں اوں ——— اس کے بعد خاموشی ——— تھوڑی دیر تک ڈاکو کے چلے جانے کا

انتظار کریں گے۔ اس کے بعد سونے کی کوشش کریں گے۔ صرف کوشش!

یہ بات کہنے والی تو نہیں ہے۔ لیکن آپ سُن لیں۔ کہ یہ خدا کے بنائے ہوئے بُتوں کی بڑی پوجا کرتے ہیں۔ کامیابیوں کا حال خدا جانے یا شوکت صاحب جانیں۔ لیکن آپ ہیں "زبان ساز" "بات ساز" "مزاج ساز" اس لئے اپنے مقاصد میں کامیاب ہی ہوتے ہوں گے۔ اس کا علم نہیں ہے کہ خود بُت ان سے دلچسپیاں لیتے ہیں یا یہ بُتوں سے۔ اس ضمن میں ایک قصّہ یہ خود لکھ کر چھپوا چکے ہیں۔ اس لئے اسے دُہرا دینے میں کیا حرج ہوگا۔

"اب وہ ہمارے یہاں مہمان ہو گئیں۔ ایک ہفتہ، دو ہفتے، تین ہفتے، ایک مہینہ، دو مہینے، تین مہینے، اور ایک دن یہ کہہ کر کہ جب میں بھائی صاحب کہتی ہوں تو پھر پردہ کیسا، سامنے آ گئیں۔ نہایت حسین و جمیل نہایت تمیزدار اور نہایت خوش مذاق، اس لئے ہم پر یا بیوی پر ان کا اس قدر جم کر رہنا ہرگز بار نہ تھا۔ آخر ہم کو ایک دن یہی بات لے ڈوبی۔ اُدھر سے پسندیدہ نظریں، اِدھر سے ان کی پذیرائی، شیطان نے دونوں کو اپنی آغوش میں لے کر اس قدر بھینچا کہ دونوں ایک ہو گئے۔"[1]

میں تو اس کو بھی کردار کی ایک بڑائی سمجھتا ہوں۔ کہ یہ جھوٹے تقدّس کے قائل نہیں۔ نہ اپنی لغزشوں پہ نازاں ہیں۔ بلکہ وہ سادہ سے الفاظ میں یہ کہتے ہیں۔ کہ "بھئی میں بھی آپ جیسا ایک انسان ہوں۔ آپ میں اور مجھ میں اتنا فرق ہے۔ کہ آپ جھوٹے تقدس کی آڑ میں وہ کچھ نہیں کہتے۔ جو آپ ہیں۔ میں تو ایک کھُلی ہوئی کتاب ہوں۔ جہاں سے چاہے پڑھ لو۔ اور ایک انسان کی زندگی میں اور میری زندگی میں کوئی فرق نہ پاؤ گے۔

آپ بڑے مذہبی قسم کے آدمی ہیں۔ کسی زمانے میں تو چہرے پہ داڑھی بھی تھی۔ البتہ آپ عام قسم کے مولویوں کی طرح تنگ نظر نہیں ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ روزے کے کم اور افطاری کے زیادہ قائل ہیں۔ آخر انسان ہیں۔ اس لئے بھُول چوک بھی ہو جاتی ہے۔ اس بھُول کی پاداش میں آپ نے پچھلے برس ایک روزہ رکھا تھا۔ روزہ کیا رکھا۔ قیامت ڈھا دی تھی، اوّل تو آپ دفتر نہ گئے۔ بارہ بجے تک تو ٹمپریچر بھی ٹھیک تھا۔ پھر لگے بیگم سے لڑنے۔ کبھی بچوں کو مارنے۔ بیگم نے بچّوں کو چھپا دیا اور خود بھی کوشش کرنے لگیں کہ کہیں چھُپ جائیں۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ گھر کا کوئی آدمی سامنے نہیں آ رہا۔ تو انہوں نے اِس موقعہ کو غنیمت جانا۔ پہلے تو کمرے میں بچھے ہوئے قالین اُٹھائے۔ پھر کرسیاں ایک طرف رکھ کر پانی کی بالٹیاں بھر بھر کے لاتے رہے اور کمرہ دھوتے رہے۔ کوئی پون گھنٹہ تک یہ شغل جاری رکھا۔ جب فرش خوب ٹھنڈا ہو گیا۔ تو آپ لنگوٹ کس کر ٹھنڈے فرش پر لیٹے رہے۔ تاکہ ٹھنڈک پہنچے۔ پھر بار بار گھڑی کی طرف دیکھنے اور گھڑی کمبخت تھی کہ اِن کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ حتیٰ کہ ان کی نیم بیہوشی کے وقت افطاری ہوئی۔ تب انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر خدا کے حضور دعا مانگی۔ کہ تو جسے توفیق دے وہی روزہ رکھ سکتا ہے۔ آج مجھ سے فاش غلطی ہوئی۔ آئندہ کبھی نہ ہوگی۔ لہٰذا تو میری اِس لغزش کو معاف فرما، تُو نے سب گناہگاروں کے گناہ بخشے ہیں۔ ایک میرا بھی سہی! ——— ایک میرا بھی!

بچّوں کی طرح یہ ضد بھی کرتے ہیں۔ اور بڑوں کا سا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ بعض اوقات یہ کسی معمولی سی بات پہ اَڑ جائیں گے۔ اور دنیا جہان ایک کر کے اس بات کو منوا کے رہیں گے۔ کبھی کبھی بڑی سے بڑی بات کو بھی ہنس کر ٹال جائیں گے۔ یہ ایک انسانی کمزوری اور ایک انسانی ہی خوبی ہے۔ سُنا ہے کہ یہ کمزوروں کے معاملے میں اُڑ جاتے ہیں اور شہزوروں کے معاملے میں ہنس دیتے ہیں۔ ہنسنا تو ان کی فطرت ہے۔ لیکن دبنا ان کی فطرت نہیں۔

---

[1] نابدولت صفحہ ۱۴۸

کمزوریاں سب میں ہوتی ہیں لیکن نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ شوکت صاحب جب اپنی کسی کمزوری کا ذکر کرتے ہیں۔ تو اُسے ایک عجیب ڈرامائی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اور اُس پلاٹ میں اتنے ایچ پیچ ہوتے ہیں کہ آپ کی نگاہ اُس پلاٹ کے ہر رُخ کو نہیں دیکھ پاتی۔ اُلٹی آپ کو اِن سے ہمدردی پیدا ہو جائیگی۔ ایسے موقعوں پر یہ دل میں کتنے ہوں گے۔ کہ دیکھا کیسا بیوقوف بنایا۔ یقین کیجیئے کہ یہ اس طرح اپنے سب کے سب دوستوں کو بیوقوف بنا چکے ہوں گے۔ ایسے بیوقوفوں میں میرا نام سرِ فہرست لکھا جا سکتا ہے۔

اِن کی ایک چھوڑ دو بیویاں ہیں۔ اس طرح اُنہوں نے شادی کے معاملے میں اسلام کی آدھی رعایت سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ وہ تو اب تک پوری رعایت سے فائدہ اُٹھا چکے ہوتے۔ بشرطیکہ اِن دو ہی بیویوں نے انہیں کچھ کس کے نہ رکھ دیا ہے۔ اب یہ ہر لمحہ سوچتے ہیں کہ اُدھر اسلامی احکامات کی تکمیل ضروری ہے۔ اِدھر بیویوں کی ستم زدہ یاں ہیں۔ کروں تو کیا کروں ——— جس دن شاہ ابن سعود کے انتقال کی خبر کے ساتھ انہوں نے یہ پڑھا ہوگا۔ کہ موصوف بیویوں کے علاوہ ڈیڑھ سو کے قریب لونڈیاں بھی چھوڑ مرے۔ تو ان کے سینے پر سانپ لوٹ لوٹ گیا ہوگا۔

اس ترقی یافتہ دَور میں کوئی یہ کہہ دے کہ شاہ ابن سعود نے اِس ضمن میں جو کچھ کیا تھا۔ وہ انسانیت کے سراسر خلاف تھا۔ تو اسلام پر حرف آتا ہے۔ اور اُس حدیث کا بھی خیال آتا ہے کہ مرنے کے بعد ہر مسلمان کو اچھائیوں سے یاد کرنا چاہیئے۔ تو مجھے بحیثیت مسلمان کے اس مسئلے میں گنگ ہو جانا چاہیئے۔ لہذا مجھے گنگ سمجھئے آپ کے جی میں جو آئے کہیئے۔

میں نے آج سے بارہ برس پہلے جیسے شوکت صاحب کو دیکھا تھا۔ ویسے ہی یہ آج بھی جوان ہیں۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہم نے جیسا انہیں آج سے بیس برس پہلے دیکھا تھا۔ ویسے ہی آج بھی ہیں۔ تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے اور سوچتا ہوں کہ یہ آج کے بیس برس بعد بھی جب حسب سابق ہوں گے اور ہم بوڑھے، تو ہم انہیں برخوردار کہیں گے تو کیسا عجیب لگے گا۔

آپ بڑا رواں لکھتے ہیں۔ بغیر ایک لفظ یا ایک نقطہ کاٹے لکھتے ہی جاتے ہیں۔ پھر خط اتنا پاکیزہ کہ اُسے پڑھنے کے بجائے چُومنے کو جی چاہتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی لکھنے والے کا اتنا صاف اور خوشخط مسوّدہ نہیں دیکھا۔ یہ عام طور پر لکھنے سے کنّی کتراتے ہیں۔ اور جب لکھنے پر آتے ہیں۔ تو دو تین دن سے لے کر ہفتہ بھر تک ایک ناول لکھ ڈالتے ہیں۔ ان کا ایک واقعہ تو مجھے آج بھی حیرت میں ڈالے دیتا ہے۔ ۱۹۴۵ء کی بات ہے کہ انہوں نے مجھے لکھنؤ سے خط لکھا۔ کہ لکھنؤ آجاؤ میں نے ایک ناول لکھا ہے۔ وہ آکر لے جاؤ۔ ساتھ ہی آم کھا جاؤ۔ جب بھی میرے سامنے کبھی آموں کا ذکر آیا ہے تو میں پھسل پڑا ہوں۔ میری یہی پھسلن مجھے لکھنؤ لے گئی۔ پہنچتے ہی جب میں نے ناول کا ذکر کیا۔ کہ لائیے ناول، تو کہنے لگے۔ جب جانے لگو گے تو لے لینا۔ چنانچہ وہ دن بھی آ گیا۔ جب میں نے ان سے کہہ دیا۔ کہ میں کل لاہور جا رہا ہوں ——— شام کا کھانا کھانے کے بعد انہوں نے قلم، دوات اور کاغذ میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا۔ کہ لکھو ناول۔ تو میں سمجھا کہ مذاق کر رہے ہیں۔ جب میں متواتر چار پانچ گھنٹے لکھتا رہا اور یہ زبانی لکھواتے رہے تو مجھے یقین ہوا کہ یہ مذاق نہیں ہے۔ آخر میں کہاں تک لکھتا۔ لکھتے لکھتے ہاتھ دُکھنے لگے۔ تو میں نے ان سے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ اُس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے لیکن یہ ایک صاحب کو جا کر پکڑ لائے۔ اور اُس سے لکھنے کو کہا۔ وہ بے چارا بھی آنکھیں ملتے ملتے لکھتا رہا۔ جب وہ بھی تین چار گھنٹے کے بعد آؤٹ ہو گیا۔ تو پھر میری باری آئی۔ چنانچہ اس طرح رات بھر شوکت صاحب لکھواتے رہے اور ہم لکھتے رہے۔ اور جب صبح ان کا نوکر چائے لے کر آیا تو ڈھائی سو صفحات کا ناول ختم تھا۔ اس ناول کا نام "بیوی" ہے۔

اِس ناول میں اور ان کے دوسرے ناولوں میں معیار کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ اتنی بڑی خوبی ہے۔ کہ آج اُردو کے کسی بھی لکھنے کو نصیب نہیں۔ وہی پلاٹ میں ربط ہے۔ وہ پیاری پیاری سی رواں زبان ہے۔ وہی شگفتگی ہے۔ جو ان کے دوسرے ناولوں میں ہے۔

آپ کو عجیب عجیب شرارتیں سُوجھتی ہیں اور آئے دن سُوجھتی ہیں۔ ایک بار: ———

ارشد تھانوی صاحب نے یہ بتایا۔ کہ انہوں نے ایک مرتبہ مجھ سے خوب انتقام لیا۔ قصّہ یہ تھا۔ کہ میں ان سے بڑا تھا۔ اس لئے میں انہیں ہر وقت ڈانٹا کرتا تھا ——— کبھی کہتا کہ تم پڑھنے لکھنے کے بجائے کھیل کود میں زیادہ وقت ضائع کرتے ہو ——— کبھی پوچھتا۔ کل رات تم اتنی دیر تک کہاں رہے ——— کبھی ڈانٹ پلاتا کہ خبردار جو کبھی پھر ایسے بال بنائے ——— میری انہی باتوں سے شوکت مجھ سے چڑے ہوئے تھے۔

فلاں سنہ کی بات ہے، کہ میں لکھنؤ سے بھوپال جا رہا تھا۔ یہ حضرت مجھے گاڑی پر چھوڑنے آئے۔ میں باہر پلیٹ فارم پر ٹہلتا رہا۔ اور یہ میرا بستر بچھانے کے بعد، قریب بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے کہہ گئے۔ کہ باہر جو فلاں صاحب ٹہل رہے ہیں۔ ان کا دماغ خراب ہے۔ اس لئے بھوپال کے اسٹیشن تک ان کا خیال رکھنا۔ ایک تو ان کے قریب نہ آئیے گا۔ دوسرے انہیں کھڑکی کی طرف نہ جانے دیجئے گا۔ مبادا چھلانگ لگا دیں۔ ویسے تو ان کا علاج معالجہ کیا گیا ہے۔ اور پہلے سے کافی افاقہ بھی ہے۔ پھر بھی اُس عارضہ کے بعد یہ اُن کا پہلا سفر ہے۔ لہٰذا ان کا پورا پورا خیال رکھئے گا۔ اور ان کی کسی حرکت پر بُرا بھی نہ منائیے گا ——— ذرا دُور ہٹ کے بیٹھ جائیے گا۔ مبادا تھپڑ وپڑ رسید کر دیں۔

جب گاڑی چلنے کا وقت آیا۔ تو میں ڈبہ میں آ کر بیٹھا۔ تو سب مجھ سے کافی کافی فاصلے پر ہو کر بیٹھ گئے۔ دو تین منٹ میں خاموش رہا پھر ذرا بڑھ کے جو میں ایک صاحب کے ہاتھ سے اخبار لینے لگا۔ تو وہ یہ سمجھے کہ یہ لگے ہے تھپڑ ملنے۔ لہٰذا انہوں نے مجھے بڑے زور سے ڈانٹ دیا۔ خبردار جو ہاتھ بڑھایا۔ میں سمجھا کہ یہ صاحب پاگل ہیں۔ لہٰذا خاموش ہو گیا۔

پھر دو ایک اسٹیشن گذرنے کے بعد میں بکس میں سے کتاب نکالنے کے لئے اُٹھا تو دو ایک آدمیوں نے آ کر مجھے تھام لیا۔ اور کہا۔ کہ "خبردار جو اپنی جگہ سے ہلے"۔ میں بڑا پریشان ہوا کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ نہ جانے یہ سب کے سب چور ہیں۔ ڈاکو ہیں۔ یا پاگل ہیں ——— میں ان سے لاکھ کہتا کہ بھئی آپ لوگ مجھے کیوں پریشان کر رہے ہیں۔ تو وہ مجھے جواب میں یہی کہتے۔ کہ بس خاموشی سے سو جاؤ۔ یا چُپ چاپ بیٹھے رہو۔ خبردار جو کوئی حرکت کی۔

آخر میں گھنٹوں چُپ چاپ بیٹھا رہا۔ اور وہ سب کے سب میری طرف ٹکٹکی باندھے، میری تمام حرکات وسکنات کا بغور مطالعہ کرتے رہے۔ یوں تنہا تماشہ بنے بنے میں کافی پریشان ہو چکا تھا۔ اس لئے سوچا کہ ذرا سر ہی کھڑکی سے باہر نکال دیکھوں۔ اِدھر میں نے سر باہر نکالا۔ اُدھر دو تین آدمی مجھ پر جھپٹے کہ جیسے میں چھلانگ ہی لگانے والا تھا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ میں اب چھلانگ نہیں لگاؤں گا۔ تو وہ اپنی اپنی جگہ پر آ کر بیٹھے۔ آخر جب میں نے اُن سے رونی سی صورت بنا کر کہا کہ "آپ حضرات مجھے کیوں پریشان کر رہے ہیں تو اُن میں سے ایک صاحب بولے "ہمیں سب معلوم ہے"۔

ارشد صاحب نے پوچھا "آخر کیا معلوم ہے؟"

وہ صاحب "کہ آپ پاگل ہیں"

"میں پاگل ہوں"

"جی ہاں"

"بھئی یہ آپ سے کس نے کہہ دیا"

"انہی صاحب نے جو آپ کو اسٹیشن پر چھوڑنے آئے تھے"

آپ کو اپنی ظاہری آن بان کا بڑا شوق ہے۔ اچھا سے اچھا کپڑا پہننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر طرف ان کی عزّت اور شہرت ہے اگر کہیں عزّت اور شہرت نہیں بھی ہے۔ تو بھی یہ چاہتے ہیں۔ کہ وہاں بھی مجھے اُسی نظر سے دیکھا جائے۔ اور لوگ میری ہر ہر بات پر آمنّا صدّقنا کہیں۔ اور واہ واہ کے ڈونگرے برسائیں۔ یہ بڑے خوش قسمت ہیں کہ انہیں زندگی میں اچھے اچھے چانس ملے۔ اور انہوں نے خوب ٹھاٹھ سے زندگی گذاری۔ ورنہ آجکل کے ادیبوں کی جو حالت ہے۔ وہ خدا کسی کو نہ دکھائے۔

شوکت صاحب کی شخصیت بڑی دلکش اور بڑی پیاری ہے۔

مگر عجیب وغریب بھی۔
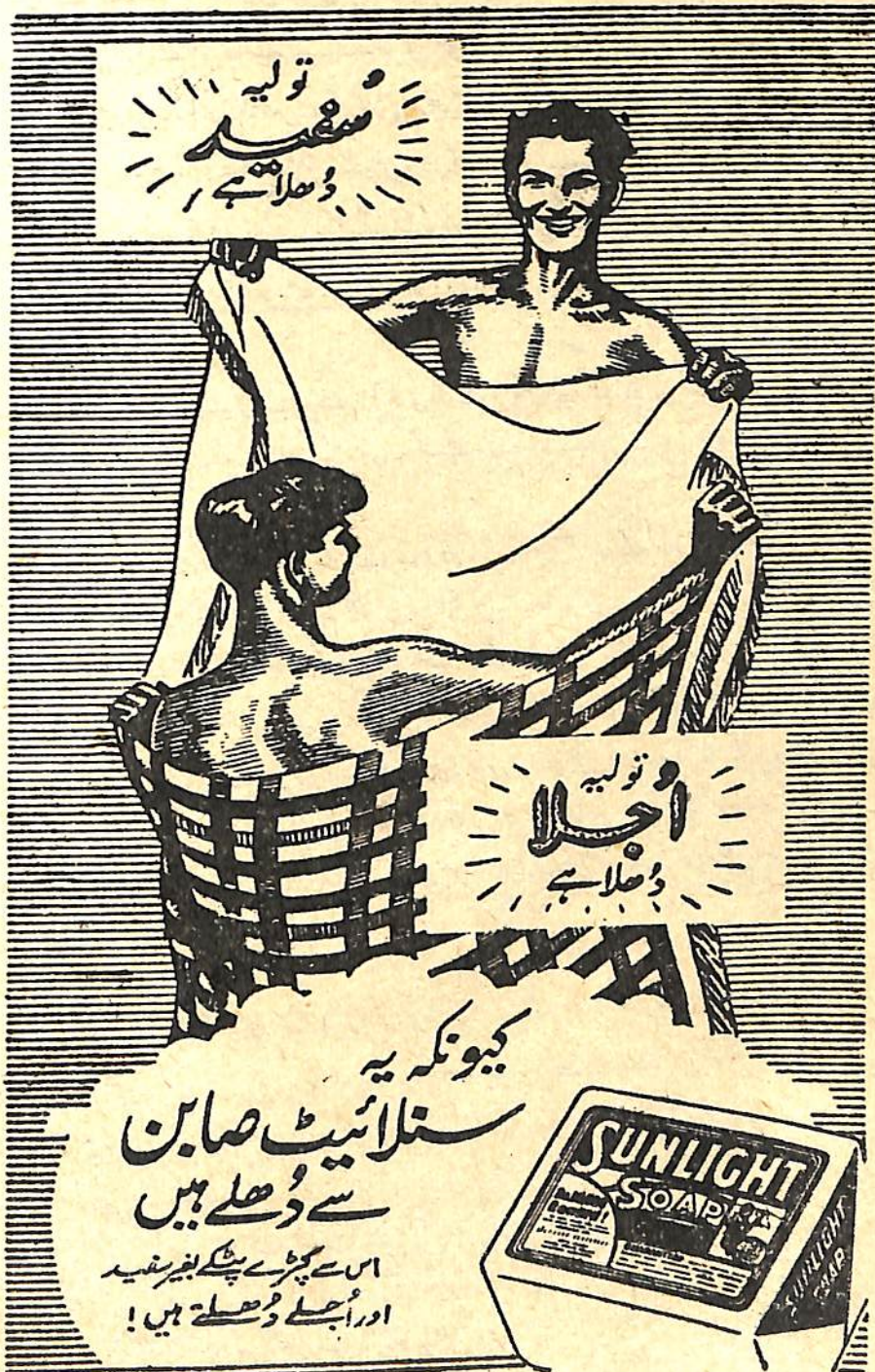
بُوفے

صادق حسین

بلا کی چہل پہل تھی ——— مرد، عورتیں، بہترین لباس زیب تن کئے چٹاگانگ کلب کی رومانی فضاؤں میں تیر رہے تھے ——— کہا جاتا ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے یہ کلب افرنگیوں کے لئے مخصوص تھا — لیکن وہ تو غلامی کا زمانہ تھا، اب ہم آزاد ہیں، اب اس کلب میں پاکستانیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اب یہاں ریشمی غراروں، ساٹن کی چمکیلی شلواروں، جارجٹ کی رنگ برنگی ساریوں اور کالی شیروانیوں کی بہار ہے۔

اس رات ایک وسیع پیمانے پر بوفے کی تیاریاں کی گئی تھیں۔ برقی قمقموں سے جگمگاتے ہوئے بڑے ہال کے وسط میں میزوں پر انواع واقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے، صدر دروازے کے بائیں جانب دیوار سے لگی ہوئی ایک میز پر خالی پلیٹیں، چھریاں، کانٹے ترتیب سے دھرے تھے۔ بغلی دروازے کے قریب ایک گول میز پر پانی سے بھرے جگوں اور خالی گلاسوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں، مقابل کی دیوار سے لگی ہوئی ایک اور میز پر گلدستوں کے ارد گرد فرنی اور پڈنگ کی بڑی بڑی پلیٹیں سجی ہوئی تھیں۔

کھانے کا اعلان ہوا، اور لوگ گروہ در گروہ اندر آنے لگے۔ چھریوں، کانٹوں اور چمچوں سے کھانے کی میز پر ہر طرف سے دھاوا بول دیا گیا، اُدھر خالی پلیٹوں والی میز پر افراد کا ایک بادل سا چھایا ہوا تھا۔ کچھ لوگ پلیٹیں ہاتھوں میں لئے کھڑے تھے اور کھانے کی میز تک ان کی رسائی نہ ہو رہی تھی۔ چند لوگ مجبوراً تماشہ دیکھ رہے تھے۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ پلیٹوں والی میز تک پہنچتے ہی پہنچتے کھانے کا صفایا ہو جائے گا ——— حفیظ انہی لوگوں میں شامل تھا۔ تنہائی کی تاریکیوں سے نکل کر دفعتاً اس رنگ و بو کی دنیا میں پہنچ کر وہ متحیر کھڑا تھا۔ پلیٹوں سے چھریاں اور کانٹے ٹکرانے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں اور سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں چل رہی تھی۔ ہجوم کا یہ عالم تھا کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ لپ اسٹک، پاؤڈر اور روج سے آراستہ نسوانی چہرے انسانوں کے اس ریلے میں چاروں طرف بہتے چلے جا رہے تھے اور حفیظ ابھی پلیٹوں والی میز تک بھی نہ پہنچ پایا تھا۔

گذشتہ اتوار کو حفیظ نے کل پاکستان انجمن خواتین کی ایک رکن سے پانچ روپے میں ایک ٹکٹ خرید لیا تھا۔ بوفے کا انتظام خواتین ہی نے کیا تھا۔ اس کی طرح اور بے شمار لوگ پانچ روپے کے عوض چٹاگانگ کلب کی زیارت کرنے چلے آئے تھے۔

اس ہنگامے کا مقصد فقط انجمن کے لئے روپیہ اکٹھا کرنا تھا اور اس سلسلے میں بوفے شروع ہونے سے پہلے باہر لان پر قناتوں کے تلے لاٹری ڈال کر بھی کچھ روپیہ سمیٹا جا چکا تھا، برآمدے میں ڈائس کا رنگ رچا کر جیبوں کو ہلکا کر دیا گیا تھا اور چائنا کشن کے ذریعے بھی خاصی بڑی رقم بٹوری جا چکی تھی۔

اب حفیظ پلیٹ ہاتھ میں تھامے میز کے ارد گرد انسانوں کی متحرک دیوار کے پیچھے کھڑا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص خود ہی مہمان ہے اور خود ہی میزبان، کھانے کے ساتھ ساتھ تعارف بھی کرائے جا رہے تھے۔ گفتگو زیادہ تر انگریزی زبان میں ہو رہی تھی ——— نقرئی آوازیں، مترنم قہقہے، چھیڑ چھاڑ، آپس میں ہنسی مذاق، عورتیں نہایت پُرتکلف انداز میں چست چست فقروں سے دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟“ ——— قبل اس کے کہ حفیظ اچھی طرح سُن پاتا، دو گورے گورے نسوانی ہاتھوں نے ایک تنوری روٹی اور دو شامی کباب اس کی پلیٹ میں رکھ دئیے۔

”آگے بڑھئے صاحب! مرغ سے شوق فرمائیے“ ——— ایک سانولے رنگ کی جوان عورت نے ایک طرف کو ہٹتے ہوئے حفیظ کو دعوت دی۔ وہ میز کے قریب چلا گیا۔ سانولی عورت نے جھٹ شوربے کے دو چمچے حفیظ کی پلیٹ میں ڈال دیئے۔ حفیظ نے شکریہ ادا کیا اور سانولی عورت اپنی سفید جارجٹ کی ساری کمر میں کستے ہوئے ایک انگریز سے باتیں کرنے لگی۔

حفیظ سوچنے لگا کہ کلب کی زندگی ہے تو بڑی دلچسپ، یہاں ہر شخص دوسرے سے کھلم کھلا بات چیت کر سکتا ہے۔ یہاں دو گورے گورے نسوانی ہاتھ بغیر کسی جھجک کے ایک اجنبی کی پلیٹ میں روٹی اور شامی کباب رکھ سکتے ہیں، یہاں ایک سانولی حسینہ مسکراہٹیں برساتی ہوئی اسے مرغ پیش کر سکتی ہے۔ شاید اس زندگی کو وہی لوگ بُرا سمجھتے ہیں جن کی یہاں تک پہنچ نہیں، مثلاً اگر وہ خود چاہتا بھی تو اس کلب کا ممبر نہیں بن سکتا تھا اس لئے کہ ممبر ہونے کیلئے روپے کی ضرورت تھی اور اسکے اقتصادی حالات اسکی اجازت نہ دیتے تھے۔

”چٹنی پسند ہے آپ کو؟“ پھر انہی گورے گورے ہاتھوں نے حفیظ کی پلیٹ میں ایک چمچہ چٹنی ڈال دی، اور شاید یہ ان ہاتھوں کی آخری پیشکش تھی، اس لئے کہ یہ ہاتھ چلتے پھرتے ہجوم میں گم ہو گئے اور حفیظ سرکتا ہوا پانی کی میز کے قریب جا پہنچا۔ جہاں اُجلی اُجلی وردیاں پہنے ہوئے بیرے کمال پھرتی سے پانی پلا رہے تھے۔ میز کے قریب ہی ایک گوری چٹی دراز قد عورت سپید سپید انگلیوں میں گلاس تھامے ایک ایک گھونٹ کر کے پانی پی رہی تھی اور ایک انگریزی فرم کا منیجر اس سے باتیں کر رہا تھا۔ ایک قہقہے کے ساتھ دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور آئندہ اتوار کو پک نک کا پروگرام طے پا گیا ——— حفیظ بالکل نہ سمجھ سکا کہ اس عورت نے

اپنے سفید چہرے پر اسقدر پاؤڈر اور روج کیوں لیپ پوت رکھے تھے؟ اس نے ابرو صاف کرکے ان کی جگہ سیاہ مصنوعی کمانیں کیوں کھینچ ڈالی تھیں۔ حفیظ کو ایسا محسوس ہوا کہ اس عورت کو برسوں سے گہری نیند نصیب نہیں ہوئی۔ حفیظ نے پلیٹ ایک بیرے کے ہاتھ میں تھما دی، پانی پیا اور پھر دوسروں کے ساتھ بہتا ہوا فرنی اور پڈنگ کی میز پر جا پہنچا۔

"ارے حفیظ! اچھے تو ہو؟" ایک پختہ عمر کے وکیل صاحب نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"منوّر! تم تو حفیظ کو پہچانتی ہونا؟ اپنے گاؤں کا ہے، تم دونوں تو ایک ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے ہو" وکیل صاحب نے اسی سانولی عورت سے مخاطب ہوکر کہا جس نے کچھ دیر پہلے حفیظ کو مرغ پیش کیا تھا۔ منوّر نے فرنی سے بھری پلیٹ حفیظ کے ہاتھوں پر رکھ دی اور پھر لانبے لانبے پالش کئے ہوئے ناخنوں والی انگلیوں سے ساڑی کا پلو تھام کر اونچے کٹے ہوئے سر کے بالوں کو ڈھانپنے کی کوشش کرنے لگی۔ وکیل صاحب ان دونوں کے خاندانوں کی تعریفیں کرنے لگے اور حفیظ کی آنکھوں کے سامنے چھوٹی سی منوّر مشرقی بنگال کے ایک دور افتادہ گاؤں، کالی پور کے کچے رستوں پر گھومنے لگی۔ وہی منوّر جو پیلا گمچھا باندھے، سُرخ کرتہ پہنے پان کے کھیتوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں کبھی اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی۔ وہی منوّر جو سپاری اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر ٹوٹے پھوٹے دیہاتی نغمے گایا کرتی تھی۔ وہی منوّر جو بندریا کی طرح کھجور کے درخت پر چڑھ جاتی اور رس سے بھری ہوئی ٹھلیا کو رسی سے کھول کر دھم سے زمین پر دے مارتی۔ وہی منوّر جس نے ایک دن کھلیان میں بچوں کے معصومانہ انداز میں حفیظ سے کہا تھا "مجھ سے شادی کرو گے؟" اور پھر دھان کے ڈھیر میں اپنا منہ چھپا لیا تھا۔ آج حفیظ اسی منوّر کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی۔

"تم سچ مچ حفیظ ہو؟" منوّر نے اتنے قریب سے کہا کہ اس کی سانس حفیظ کے گالوں کو چھونے لگی۔

"ایں۔ ہاں! تم، منوّر!" حفیظ گویا نیند سے چونک گیا۔

وکیل صاحب کہیں کے کہیں جا پہنچے تھے اور منوّر و حفیظ چھوٹی پلیٹیں ہاتھوں میں تھامے پڈنگ والی میز سے کافی دور تھے۔ زندگی کے دو مسافروں کی اچانک پندرہ برس بعد ملاقات ہوئی تھی —— کالی پور کے ہرے ہرے لہلہاتے ہوئے دھان کے کھیتوں سے دور، ایک اونچی پہاڑی پر جِپا گانگ کلب کے جگمگاتے ہوئے ہال میں، ایک نئی دنیائے رنگ و بو کے بیچ!

"ہیلو، مسز جمیل! آپ تو عید کا چاند ہوگئی ہیں؟" ایک لانبا چوڑا مرد جو شکل و صورت سے پیرِ مغاں معلوم ہوتا تھا، منوّر سے مخاطب ہوا۔

"آپ نے کلب آنا جو بند کردیا" —— منوّر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"مسز ناصر اچھی تو ہیں ——؟" منوّر نے پوچھا۔

"ابھی یہیں تھیں، کہیں مسٹر جمیل سے رومانس نہ لڑا رہی ہوں" پیرِ مغاں نے چٹکلہ چھوڑا، اور پھر آس پاس کے لوگوں نے قہقہے لگا کر اس برجستہ فقرے کی داد دی۔

"مسز جمیل! گھنٹوں سے تمہیں ڈھونڈھ رہی ہوں" —— ایک ساٹن کی شلوار والی نے منوّر کی کلائی پکڑتے ہوئے کہا۔

"خیریت تو ہے؟" منوّر نے پوچھا۔

"آئندہ سنیچر ہم شکار کھیلنے دوہزاری جا رہے ہیں۔ وہاں ہرنوں کے غول کے غول ملیں گے، محکمہ جنگلات کے ڈاک بنگلہ میں ٹھہرنے کا انتظام ہوگیا ہے" —— ساٹن کی شلوار والی نے سب کچھ ایک سانس میں کہہ ڈالا۔

"بھئی، مجھے تو ہرنوں کا شکار قطعی پسند نہیں" —— منوّر نے شانے اوپر کو اٹھاتے ہوئے کہا —— "ہرن زخمی ہوکر آنسو بہاتا ہے۔ مجھ سے وہ منظر دیکھا نہیں جاتا اور پھر مجھے تو اڑتے ہوئے سنائپ پر گولی چلانے میں بڑا مزہ آتا ہے"

حفیظ کو چار سو زندگی موجیں مارتی نظر آرہی تھی —— خوش و خرم چہرے، خوبصورت لباس، گھنگھروں کی چھوٹ، سینٹ کی خوشبو، قہقہے، مسکراہٹیں، اور منوّر سے ایک عرصۂ دراز کے بعد اچانک ملاقات ہوجانے سے تو اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس نے صدیوں کی کھوئی ہوئی زندگی از سرِ نو پالی۔

ہجوم کے رُخ کے ساتھ ساتھ وہ بھی صدر دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ دوسروں کی طرح وہ بھی پلیٹ میز پر رکھ کر برآمدے میں چلا گیا۔ وہاں کچھ من چلے نوجوان کرسیوں پر بیٹھے سگریٹ کے کش لگا لگا کر ہوا میں دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے حلقے بنا رہے تھے۔ یارانِ طریقت پرچھا رہتے ہوئے ڈانس ٹیبل کی طرف امڈے چلے آرہے تھے۔ ایک گھسا ہوا ممبر ڈانس ٹیبل پر پیانو سے الٹ پلٹ کرتا ہوا "ٹرائی یو رلاک" کی صدائیں لگا رہا تھا۔ دو قدم پرے ایک مرد کھڑا ایک یوریشین لیڈی سے باتیں کر رہا تھا۔ مرد بایاں ہاتھ برآمدے کے ستون سے ٹیکے، دائیں ہاتھ سے دانتوں میں پائپ دبائے دھوئیں کے بادل اڑا رہا تھا۔ یوریشین لیڈی کے ایک ہاتھ میں شیری سے لبریز جام اور دوسرے ہاتھ کی دو انگلیوں میں سلگتا ہوا سگریٹ تھا۔ کبھی وہ شیری کی ایک چُسکی لگا لیتی اور کبھی سگریٹ کا ایک کش۔

"مسٹر جمیل! نمبر چار خالی ہے" —— ڈانس کھلانے والے نے ٹرنسٹ کھینچ کر دائیں لگانے کی عزت دی۔

"شکریہ، مجھے اس سے دلچسپی نہیں" مسٹر جمیل نے پائپ کو دانتوں کی گرفت سے علیحدہ کرکے جواب دیا۔

"جمیل صاحب! تو آئیے، پھر دل ہی کی بازی سہی" فلیٹ ہیٹ کے سامنے بیٹھی ہوئی خاتون نے ایک شاعرانہ انداز میں مصرع طرح چھوڑا اس پر ڈائس کھلوانے والے نے استادانہ رنگ میں طبع آزمائی کی، اور پھر ایک ٹھنگنی عورت نے ایڑیاں اٹھا کر ایسی گرہ لگائی کہ ڈائس ٹیبل کے اردگرد قہقہوں پر قہقہے بلند ہونے لگے۔ مسٹر جمیل مسکرائے اور پھر پائپ دانتوں میں دبا کر دھوئیں کے حلقے ہوا میں اڑانے لگے۔ گولڈ فلیک کے خالی ٹین میں پانسے زور زور سے ہلا کر میز پر پھینک دئے گئے۔ ایک شور ہوا، کوئی جیتا، کوئی ہارا۔

حفیظ ڈائس ٹیبل کے قریب کھڑا دیکھ رہا تھا —— سن رہا تھا —— سوچ رہا تھا!

"حفیظ!" دفعتاً عقب سے منوّر نے حفیظ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پکارا۔ اور قبل اس کے کہ حفیظ کے ہونٹ ہلتے، منوّر اسے بازو سے پکڑ کر مسٹر جمیل کے پاس جا پہنچی جو مسز ہیملٹن سے باتیں کر رہے تھے

"جمیل! آپ سے ملئے —— یہ ہیں میرے پرانے دوست مسٹر حفیظ —— مسز ہیملٹن!"

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی" جمیل نے حفیظ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"واقعی بہت خوشی ہوئی" مسز ہیملٹن نے چٹکی سے جلتے ہوئے سگریٹ کو ہوا میں اچھال کر حفیظ سے ہاتھ ملایا۔

"حفیظ میرے بچپن کے ساتھی ہیں، آج میں بہت خوش ہوں، برسوں کے بعد ہماری اچانک ملاقات ہوئی ہے" منوّر نے ہوا میں اس انداز سے باہیں پھیلاتے ہوئے کہا کہ جیسے وہ ابھی حفیظ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لے گی۔

حفیظ ایک عجیب بیچارگی کے عالم میں تھا، جیسے ابھی کوئی اس پر وار کر بیٹھے گا، اگر جمیل اس سے پوچھ بیٹھے کہ آپ کا کیا شغل ہے تو پھر؟ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے۔

"جمیل! کل رات حفیظ ہمارے یہاں کھانا کھائے گا" منوّر نے حفیظ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"مسز ہیملٹن! معاف کیجئے گا، جمیل! اب میں حفیظ کے ساتھ وہاں بنچ پر بیٹھ کر باتیں کروں گی" منوّر نے باہر قناتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اور پھر جمیل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے اُدھر بڑھ گئی۔

بال روم میں مردوں اور عورتوں کے جوڑے والٹز کے دھیمے دھیمے سُروں پر رقص کر رہے تھے۔ ڈائس ٹیبل پر سکوں اور نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی۔ بٹلر نہایت مستعدی کے ساتھ چھوٹے بڑے پیگ تقسیم کر رہے تھے۔ جمیل بدستور پائپ دانتوں میں دبائے دھوئیں کے مرغولے ہوا میں اُڑا رہا تھا۔ مسز ہیملٹن بال روم میں پہنچ چکی تھیں، اور اب ایک فربہ عورت جمیل کو گذشتہ شب کی برج اور پوکر کے دلچسپ قصے سنا رہی تھی۔

"حفیظ! آج میں بہت خوش ہوں" منوّر نے حفیظ کے پاس بنچ پر بیٹھتے ہوئے سرگوشی کی۔

حفیظ کوئی جواب نہ دے سکا۔ ایک طویل مدت کے بعد منوّر سے اچانک اور اس ماحول میں ملاقات ہو جانے پر اس کے دل میں جہاں خوشی کی لہریں دوڑ رہی تھیں، وہاں اضطراب کا ایک طوفان بھی موجزن تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے لرزتے ہوئے ہاتھ چوری کے لئے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔

"تم چپ کیوں ہو؟" منوّر نے حفیظ سے اور قریب ہو کر پوچھا۔

"منوّر!" حفیظ نے ایک عجیب گھبراہٹ کے عالم میں کہا "میں ڈر رہا ہوں"

منوّر کھلکھلا کر ہنس پڑی، حفیظ کھسیانا سا ہو گیا۔ "تم ڈر رہے ہو؟ آخر کیوں؟" منوّر نے پرے سرکتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

اتنے میں ایک میم اور صاحب کا جوڑا باہوں میں باہیں ڈالے بہکے بہکے قدم رکھتا ہوا، بنچ سے کچھ فاصلہ پر رک گیا۔ "سکاچ اور تمہارے بغیر میں اس دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا" صاحب نے تیز سانسوں کو مجتمع کر کے ڈرامائی انداز میں کہا، اور پھر اس کا ایک ہاتھ میم کے ننگے سڈول بازوؤں پر رینگتا ہوا نکلس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

حفیظ کو یکایک محسوس ہوا کہ لعل و گہر کے بے بہا خزینوں کو لوٹ لینے کے لئے اس کے ہاتھوں میں نئی قوت عود کر آئی ہے "منوّر ——!" حفیظ نے منوّر کی ساڑی کے پلّو کو دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے چھوتے ہوئے کہا۔

"شاید تم بدل گئے ہو" منوّر بولی۔ "جب ہم پان کے کھیتوں میں آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے تو کسی کو ڈر نہ لگتا تھا" منوّر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اب کیا ہو گیا ہے؟ یہی نا کہ ہم جوان ہو گئے ہیں، تو پھر کیا ہوا؟ کیا ہم اب ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر باتیں بھی نہیں کر سکتے؟"

منوّر کے اندازِ گفتگو میں محبت تھی، معصومیت تھی، خلوص کی مہک تھی۔

جیسے کسی نے حفیظ کے شانے پکڑ کر اسے زور سے جھنجھوڑ دیا، اس کے دل کا اضطراب آناً فاناً کافور ہو گیا "منوّر! آج میں بہت خوش ہوں!" وہ دفعتاً پکار اٹھا

"اور ڈر بھی رہے ہو؟" منوّر نے پھر قریب سرکتے ہوئے پوچھا

"نہیں، اب میں صرف خوش ہوں ——" حفیظ نے پہلی مرتبہ جوان منوّر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا —— ان دو بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کالی کپور کی حسین وادیاں مسکرا رہی تھیں۔

ڈائس ٹیبل سے نمبر ۲ کا نعرہ بلند ہو کر رمبا ناچ کی شور شوں میں گم ہو گیا۔ بال روم میں انسانی خون تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ قدموں میں لغزشیں آنے لگی تھیں۔ زبانیں آداب محفل کی قیدوں سے آزاد ہوتی جا رہی تھیں۔

"جینا تو یہ لوگ جانتے ہیں" حفیظ نے ناچنے والوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، یوں کہو کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دینا جانتے ہیں ——" منوّر نے بنچ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے؟" حفیظ نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"ان میں شاید ہی کوئی خوش ہو" منوّر نے آہستہ سے کہا، جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو "میری ہی مثال لے لو، میں امیر ہوں، لیکن مجھ سا غریب کوئی نہیں" منوّر اپنے ہاتھ کو پیشانی پر رکھے یوں بول رہی تھی، جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ حفیظ سوچنے لگا کہ منوّر کیسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہے کلب کی پرکیف زندگی، موٹر کاریں، شاندار بنگلے، رمبا ناچ، ننگے سڈول بازوؤں پر رینگتے ہوئے ہاتھ، اگر یہ لوگ بھی خوش نہیں تو کون خوش ہے؟

"شاید اس دنیا میں کوئی بھی خوش نہیں، اور اگر خوش ہے تو وہ خوشی کی حقیقت سے واقف نہیں" منوّر نے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے ایک جماہی لی۔

"منوّر! میں تمہاری باتیں نہیں سمجھ سکا" حفیظ نے نہایت سادگی سے کہا۔

"نمبر ایک، نمبر ایک، وہ مارا" ڈائس ٹیبل سے شور بلند ہوا۔

"حفیظ ——!" منوّر نے حفیظ کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا "تم جانتے ہو نمبر ایک انسان کی زندگی میں کتنی اہمیت رکھتا ہے؟"

حفیظ خاموش رہا —— "خدا ایک ہے، انسان کا دل ایک ہے، محبت ایک ہے" منوّر نے رُک رُک کر کہا۔

یکایک جیسے فضا میں ایک ٹھہراؤ سا پیدا ہو گیا، اور کلب کی تیزی سے دوڑتی ہوئی زندگی نے ایک جھپکی سی لے لی حفیظ کا ہاتھ اس کے پرانے کوٹ کی جیب میں سکے ٹٹولنے لگا۔ ایک، دو، تین —— اٹھنّی، چونّی، دونّی —— اسی میں کل کا ناشتہ اور دن کا کھانا —— لنگے میں بہنے والا صاحب ایک دوسری میم کی بغل میں ہاتھ ڈالے لڑکھڑاتا ہوا بنچ سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر رُک گیا —— "سکاچ اور تمہارے بغیر میں اس دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا ——" اس نے پھر تیز سانسوں کو مجتمع کر کے ڈرامائی انداز میں کہا اور پھر اس کا ایک ہاتھ میم کے ننگے شانوں پر رینگتا ہوا اس کے سنہری بالوں سے کھیلنے لگا۔

"حفیظ! تمہیں یاد ہو گا" منوّر بولی "جب میں سپاری اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر گایا کرتی تھی تو تم چپ چاپ بیٹھے سُنا کرتے تھے۔ تمہارے ہونٹوں کو جنبش تک نہ ہوتی تھی۔ اس لئے کہ جب تم بولتے تھے تو میں گانا بند کر دیتی تھی چپ سادھنا شاید تمہاری عادت ہو گئی ہے، مگر آج میں گا تو نہیں رہی ہوں"

"تمہاری باتوں میں بھی میرے لئے گیتوں کا رس ہے" حفیظ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"نہ جانے کیوں" —— منوّر نے بھرّائی ہوئی آواز سے کچھ کہنا چاہا —— حفیظ حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔

"میں صرف تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں" —— منوّر نے بیحد دردانگیز آواز میں کہا۔

"کیا؟" —— حفیظ گھبرا گیا۔

"میری زندگی گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چکر کاٹ رہی ہے" —— منوّر نے تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا —— "مجھے ہر روز وقت پر ناشتہ کرنا ہوتا ہے، دن کے ٹھیک ایک بجے لنچ، ٹھیک چار بجے شام کی چائے —————— ٹھیک نو بجے رات کا کھانا، اور پھر ایک معیّن وقت پر، چپاتلا، ٹھنڈا، مکینیکل، خاوند کا پیار، برتھ ڈے پر پھولوں کے ساتھ قیمتی تحفے، ہر عید پر ایک جڑاؤ زیور!"

"منوّر!" ایک آواز آئی، مسٹر جمیل سامنے کھڑے رسٹ واچ کی سوئیوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ "ہمیں پندرہ منٹ میں گھر پہنچ جانا چاہئے" جمیل صاحب نے کہا۔

لوگ یار سے جھومتے جھامتے باہر نکل رہے تھے۔ بال روم میں ایک عجیب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ڈائس ٹیبل برآمدے سے ہٹائی جا چکی تھی۔ تمام مرد اور عورتیں کلب کی سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہے تھے —— مسٹر اور مسز جمیل خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوئے حفیظ اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے سوچ رہا تھا کہ اتنی رونق، چہل پہل اور گہما گہمی کے ٹھیک بعد تیزی سے چھاتی ہوئی خاموشی کتنی بھیانک معلوم ہوتی ہے۔

اس کی آنکھوں کے سامنے دو گورے گورے ہاتھ، تنوری روٹی اور شامی کباب تھامے رقص کرنے لگے، اسے پھر ایک سانولی حسینہ مرغ بسمل کرتی نظر آئی۔

کاش! وہ اب بھی اڑ کر کالی پور پہنچ سکتا اور وہاں کی مسکراتی ہوئی وادیوں کو منوّر کی دُکھ بھری داستان سُنا سکتا ——!

تقدیر زند خندہ

چاند بی بی

شام کے ساڑھے سات بجے تھے۔ یونیورسٹی کے امتحان سر پہ تھے۔ وہ کالج کے ہوسٹل کے ایک کمرے میں لکھنے کی میز کے سامنے بیٹھی "انگریزی ب پر نشاۃِ ثانیہ کا اثر" کے عنوان سے جواب مضمون لکھ رہی تھی۔ ٹیبل لیمپ کے دودھیا رنگ کے گلوب میں سے چھن چھن کر آتی روشنی اس کے بصورت چہرہ پر پڑ رہی تھی اور وہ اس وقت زمانۂ قدیم کے کسی ماہر اطالوی مصور کا شاہکار معلوم ہو رہی تھی۔ یکایک پیچھے سے قدموں کی آواز سنائی ی۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ نوشابہ اس کی عزیز سہیلی اس کے سامنے تھی۔ وہ وفورِ مسرت سے اچھل پڑی اور دوڑ کر اس سے ٹ گئی —

"نوشابہ میری پیاری!"

"عذرا میری جان!"

"لو بیٹھو!" اس نے کرسی نوشابہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "تم اس وقت کیسے آگئیں؟ ننھا ہمایوں کیسا ہے؟ اسے کیوں نہیں لائیں؟"

"وہ آپا کے پاس اسٹیشن ویٹنگ روم میں ہے" نوشابہ نے جواب دیا "نعیم کا تبادلہ کوہاٹ کا ہو گیا ہے۔ میں آج ہی شام یہاں پہنچی ہوں اور گیارہ بجے کی ٹرین سے روانہ ہو جاؤں گی۔ تم سے ملنے کے لئے دل بے چین تھا۔ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ ہوسٹل کی وارڈن اجازت نہیں دیتی تھیں۔ بڑی مشکل سے تمہاری پرنسپل سے اجازت لے کر آئی ہوں۔"

"میری نوشابہ کس قدر اچھی ہے" اس نے تشکرانہ لہجے میں کہا "اچھا بتاؤ اس وقت تمہاری کیا خاطر کروں؟ اورینج اسکواش پیوگی؟"

س نے الماری کھولی اور راسبیری ٹوفی کا ڈبا نکال لائی جس پہ شوخ اور چمکدار رنگوں میں موسم بہار کا ایک سین بنا ہوا تھا۔ زمین پہ پھولوں اور سبزے ی بہتات تھی اور نیلے آسمان پر روپہلی پروں والے بگلوں کی قطاریں اُڑ رہی تھیں —

"لو یہ کھاؤ!" اور وہ اورینج اسکواش بنانے جا رہی تھی کہ نوشابہ نے منع کیا "میں ٹافی کھا رہی ہوں عذرا تم اسکواش مت بناؤ۔ میں نہیں پیوں گی۔ ادھر میرے پاس آکر بیٹھو۔ تم سے کچھ نہایت ضروری باتیں کرنا ہیں"

وہ رُک گئی اور نوشابہ کی کرسی کے بازو پہ آکر بیٹھ گئی "نوشابہ مجھے کس قدر خوشی ہو رہی ہے تم آئی ہو"

"اور خود مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے کیا بتاؤں" اس نے عذرا کا خوبصورت ملائم سفید ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "میری عذرا م بچپن کی سہیلیاں ہیں۔ ہم میں کس قدر محبت ہے۔ عذرا خدا ہمیں ایک دوسرے سے اور قریب کر دے تو تم ناپسند تو نہ کرو گی؟"

"آج تو تم بہت دور دور کی باتیں سوچ رہی ہو" وہ جھینپ گئی۔

"میری عذرا مجھے کہنے دو" نوشابہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "تم شہر یار بھائی کو تو جانتی ہو۔ میرے بھائیوں میں ب سے اچھے اور سب سے لائق وہ ہیں، عذرا! شہر یار میرے بھائی ہیں۔ میرے منہ سے ان کی تعریف کرنا اچھا نہیں لگتا۔ شاید دوسرے

لوگ خیال کرتے ہوں کہ میں بہن ہوں، ان کی تعریف کرنے میں مبالغہ سے کام لیتی ہوں۔ عذرا بے شک تم ایک نہایت ہی اعلیٰ و ارفع چیز ہو ——— ایک انمول ہیرا ہو۔ لیکن عذرا! شہریار بھائی بھی میرے خیال میں ہر طرح تمہارے لائق ہیں۔ تم دونوں کا مزاج، عادتیں اور پسند سب ایک ہے۔ شاید خدا نے تم دونوں کو پیدا ہی ایک دوسرے کے لئے کیا ہے۔ وہ بھی تمہاری طرح علم و ادب کے شیدائی اور انسانیت کے پرستار ہیں اور دل درد مند رکھتے ہیں۔ اِن ڈور اور آؤٹ ڈور گیمیں میں بھی تم دونوں کی پسند ایک ہے۔ انہیں بھی تمہاری طرح لان ٹینس کا بے حد شوق ہے۔ عذرا! شہریار بھائی جنس لطیف کی صحبت میں بہت رہے لیکن انہوں نے آج تک کسی میں دلچسپی نہ لی۔ ہم نے سینکڑوں ہی لڑکیاں بتائیں لیکن انہیں کوئی بھی پسند نہ آئی سوائے تمہارے! وہ کہتے ہیں "ہاں بے شک عذرا میں وہ سب کچھ ہے جس کی مجھے تلاش تھی" مجھ سے ہر وقت تمہاری باتیں پوچھتے ہیں۔ بولو عذرا پھر ہم تمہارے والدین کے پاس اس معاملہ میں سلسلہ جنبانی کریں۔ تم اپنی مرضی بتاؤ۔ کیا شہریار بھائی کو قبول کر لوگی؟ بولو، جواب دو"

عذرا گہری سوچ میں غرق تھی اور بالکل خاموش ———

آخر بولی "نوشابہ تم نے ایک بہت اہم معاملہ چھیڑا ہے۔ اتنی جلدی میں کوئی فیصلہ کیسے کر سکتی ہوں۔ مجھے سوچ لینے دو"

"اچھا یہ تو بتاؤ شہریار بھائی کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟" نوشابہ نے سوال کیا۔

"میں اب سے نہیں ہمیشہ سے ان کی بے حد مدّاح ہوں۔ اور میرے دل میں ان کے لئے بے اندازہ احترام ہے" عذرا کا جواب تھا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ عذرا یہ کافی ہے" نوشابہ نے کہنا شروع کیا۔ عزت ہی سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ پسندیدگی ہی گہری ہو کر محبت کی شکل اختیار کر لیتی ہے"

"شاید نوشابہ تم ٹھیک کہتی ہو" عذرا بولی "ہماری پرنسپل بھی ادب ٹریکٹس کرتے ہوئے یہی کہتی تھیں کہ جذباتی محبت ایک ناپائیدار چیز ہے لیکن وہ محبت جس کی بنیاد باہمی احترام اور عزت پر ہو، ہمیشہ قائم رہتی ہے"

وہ ابھی باتیں کر ہی رہی تھیں کہ وارڈن نے دروازہ پر دستک دی "وقت ہو چکا ہے۔ پرنسپل صاحبہ نے آپ کو صرف نصف گھنٹہ کی اجازت دی تھی"

نوشابہ کرسی سے اٹھ بیٹھی "اچھا تو میری پیاری عذرا! اب میں خوش خوش واپس جا رہی ہوں۔ تمہاری پسندیدگی کا علم ہو گیا"

نوشابہ کو گیٹ تک پہنچا کر وہ واپس اپنے کمرہ میں آئی اور جواب مضمون مکمل کرنے کے لئے میز پر بیٹھی۔ لیکن اب پہلے کی طرح وہ اس پر اپنے خیالات مرتکز نہ کر سکتی تھی۔ وہ ایک اضطراب سا محسوس کر رہی تھی۔ خیالات منتشر ہو چکے تھے۔ اس نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور سوچنے لگی "شہریار ——— یہ شہریار جس کے متعلق اس نے اتنا کچھ سنا تھا اور جسے وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ بیدار مغز انسان جس نے آکسفورڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ جو سول سروس پاکستان کا ایک رکن تھا اور جس ضلع میں بھی رہا ہر دلعزیز رہا۔ کیونکہ اس کا اصول زندگی حکومت کرنا نہیں خدمت کرنا تھا۔ وہ بہت خدا ترس انسان تھا اور اپنے آپ کو عوام کا خادم سمجھتا تھا اور ہر معاملہ میں حق و انصاف کو مدِ نظر رکھتا تھا۔ جو اپنی بعض مصروفیات کے باوجود علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لئے وقت نکال لیتا تھا۔ اور افسانہ نگار بھی تھا اور ادب کا نقاد بھی۔ اس کی تحریریں ملک کے بہترین رسائل میں شائع ہوتی تھیں اور ہر چند کہ اس نے زیادہ نہیں لکھا تھا لیکن پھر بھی ادبی حلقوں میں کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی اس کے افسانے، پڑھنے والے میں نئی بصیرت پیدا کر دیتے تھے اور آنکھوں سے بہت سے پردے ہٹا دیتے تھے۔ عذرا کو اس کا اسٹائل بے حد پسند تھا اور وہ شہریار کے مضامین اور افسانے نہایت شوق سے پڑھا کرتی تھی۔ اور ان سب خوبیوں کے ساتھ شہریار والدین کا خدمتگزار بیٹا تھا اور بھائی بہنوں کا چاہنے والا بھائی۔ یقیناً ایک فرض شناس انسان ہی بہترین شوہر ثابت ہو سکتا ہے۔ نوشابہ کے کمرے میں ٹیبل پیس پر

رکھی ہوئی شہریار کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آگئی۔ دراز قد، موزوں خدوخال اور چہرے پر ذہانت کا نور —— وہ کچھ عرصہ سے ایک ناقابل بیان اُداسی اور اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس کر رہی تھی۔ اس کے دل میں اکثر تمنّا پیدا ہوتی تھی۔ ایک ہم خیال ساتھی کی۔ ایک ایسے رفیق کی جو اس کی طبیعت کو سمجھ سکے۔ اس کے خیالات کی قدر کر سکے۔ شہریار اس کے معیار پر پورا اُترتا تھا۔ بلکہ عذرا کا منتہائے آرزو اس سے زیادہ نہ ہو سکتا تھا اور اب اسے ایسا محسوس ہوا —— جیسے اس کی کشتیٔ حیات بحرِ ناپیدا کنار میں بہتے بہتے بالآخر خود بخود ساحلِ مراد پر پہنچ گئی ہے۔

عذرا امتحان سے فارغ ہو کر گھر آگئی تھی اور آج کل آرام کی نیندیں سویا کرتی تھی۔ ان دنوں اس کی سہیلی زبیدہ اسی کے شہر اپنے ماموں کے ہاں آئی ہوئی تھی اور آج عذرا نے زبیدہ کے اعزاز میں اپنی چند سہیلیوں کو شام کی چائے پر بلایا تھا۔ صبح سے وہ چائے کے انتظام میں مصروف تھی اس نے خود ہی بجلی کے تنور پر کیک بنائے تھے اور ان پر خوبصورت آئسنگ کی تھی۔ اور آم اور اسٹرابری کی دو طرح کی آئس کریم تیار کی تھی۔ گرمی کی وجہ سے نشست کا انتظام باہر لان میں قالین بچھا کر اور اس کے چاروں طرف ہلکے قسم کے صوفے رکھ کر کیا تھا۔ درمیان کی میز پر ایک ہلکے نیلگوں رنگ کے شیشے کی باسکیٹ میں پانی کے اندر بیلے کے پھول رکھے تھے جن کی دلکش خوشبو روح میں تازگی پیدا کر رہی تھی۔ چائے کا سامان خوبصورت دو منزلہ ٹی ٹرولی میں لگایا ہوا تھا۔ کونے کی ایک میز پر گراموفون مشین اور ریکارڈ رکھے تھے۔ پانچ بجے تک زبیدہ، نسیم، فرحت، طاہرہ، پروین رضیہ سب کی سب آگئیں۔ عذرا اور اس کی دونوں چھوٹی بہنوں تہمینہ اور نجمہ نے چھوٹی چھوٹی تپائیوں پر چائے سرو کی اور ریکارڈ لگائے۔ کیک، بنگالی مٹھائیاں، سموسے اور آئس کریم سب نے بہت پسند کی۔ زبیدہ کو بہت حیرت ہوئی جب پتہ چلا کہ کیک، سموسے اور آئس کریم عذرا نے خود بنائے تھے۔ وہ بولی "عذرا تم اس قدر انٹیلیکچوئل قسم کی لڑکی ہو کہ مجھے امید نہ تھی کہ گھرداری کے کاموں میں بھی مہارت رکھتی ہو"

چائے کے بعد لڑکیاں بیڈمنٹن، پنگ پونگ، کیرم اور رنگ ٹیبل کھیلنے لگیں۔ کالج کے دنوں کا ذکر ہوتا رہا۔ لڑکیوں کے نقرئی قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔ اب شام گہری ہو چلی تھی۔ ہوا میں قدرے خنکی آگئی تھی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی نارنجی شعاؤں میں لڑکیوں کے کاسنی، گلابی، چمپئی اور آسمانی رنگ کے لباس چمک رہے تھے۔ زبیدہ اور عذرا رنگ ٹیبل کھیل رہی تھیں۔ یکایک زبیدہ نے کیو ہاتھ سے رکھ دیا اور بولی "عذرا تم نے کیرو کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ اور میں نے سُنا ہے تمہیں ہاتھ دیکھنا خوب آتا ہے۔ بھئی نجومی صاحب! آج میرا بھی ہاتھ دیکھ کر قسمت بتا دو"

"نہیں زبیدہ" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "لڑکیاں یونہی کہتی ہیں۔ مجھے ہاتھ دیکھنا کہاں آتا ہے۔ ایسے ہی اٹکل پچو کچھ بتا دیا کرتی ہوں"

سب لڑکیاں کھیل چھوڑ کر عذرا اور زبیدہ کے گرد جمع ہو گئیں۔

"لیکن نفیسہ کا ہاتھ دیکھ کر تم نے جو باتیں بتائی تھیں وہ بالکل درست نکلیں" فرحت اور طاہرہ نے بیک زبان ہو کر کہا "اس کی نسبت میں کتنے جھگڑے پڑے ہوئے تھے۔ سب حالات ٹھیک ہو گئے اور گذشتہ ماہ اس کی شادی بھی ہو گئی اور وہ اپنے میاں کے ساتھ سرکاری کام سے کینیڈا گئی ہوئی ہے"

نسیم بولی "بھئی عذرا دیکھو بھی زبیدہ کا ہاتھ، ہم بھی دیکھیں اس کی قسمت میں کیا ہے؟ اور ہاں شادی کا بھی بتانا کہ جلد ہے یا دیر میں؟"

"اچھا لاؤ ہاتھ!" عذرا بولی۔

زبیدہ نے ہاتھ بڑھایا۔

"زبیدہ!" عذرا اپنے لہجے میں مصنوعی سنجیدگی پیدا کر کے بولی "لڑکی تیری قسمت بہت شاندار ہے۔ سونے میں پیلی، موتیوں میں سفید رہے گی حسن، دولت، عزت آرام سب کچھ تجھے ملے گا۔ تو ایک سال کے اندر اندر کسی کا کاشانۂ دل اُجاگر کرنے والی ہے"

فرحت نے سوال کیا "اور یہ تو بتاؤ ان کے شوہر بہادر کیسے ہوں گے ؟"

"زبیدہ!" عذرا نے کہنا شروع کیا "تمہارے شوہر اعلیٰ دماغی قابلیت کے مالک ہوں گے۔ وہ ادیب، سیاستدان، مورخ، جرنلسٹ، یا سائنسدان، ان میں سے ضرور کچھ ہوں گے اور بہت نام پیدا کریں گے۔ عزت اور شہرت ان کے قدم چومے گی۔"

"عذرا! عذرا!" نسیم بے تابی سے بولی "یہ تو بتاؤ میاں بیوی میں عشق بھی ہو گا یا نہیں"

"نہیں عشق تو نہیں ہو گا۔ بس اچھے میاں بیوی ہوں گے" عذرا نے بتایا۔

"اور میں سمندر پار کا سفر کروں گی یا نہیں ؟" زبیدہ نے سوال کیا۔

"ہاں! تم کئی سمندری سفر کرو گی" عذرا نے کہا۔

زبیدہ نے خوش ہو کر عذرا کو گلے لگا لیا "میری عذرا! تم نے کتنی اچھی اچھی باتیں بتائی ہیں۔ خدا کرے یہ سب سچ ہوں"

"آمین!" عذرا نے کہا۔

شہریار آج دیر سے دفتر سے واپس آیا تھا۔ کام زیادہ تھا۔ کلب جانے کو جی نہ چاہا۔ لائبریری میں آ گیا اور وہیں چائے منگوا لی۔ اس کے سامنے والا فرانسیسی دریچہ کھلا تھا جس میں سے باغ کا منظر نظر آ رہا تھا اور خنک ہوا کے جھونکے نرگس کے پھولوں کی تیز خوشبو کمرے میں لا رہے تھے۔ وہ صوفے پر نیم دراز ہو گیا اور تصویروں والے رسالوں کی ورق گردانی کرتے کرتے اختر الایمان کی سونیٹ شکست خواب گنگنانے لگا۔ شاعر کے کلام میں وہ اپنے دل کی آواز پاتا تھا۔ عمر کے تیس سال اس نے اپنی زندگی کو بنانے میں صرف کر دیے تھے اور ابھی تک شادی نہ کی تھی۔ لیکن اب کچھ عرصے سے تنہائی کا احساس بہت گہرا ہو گیا تھا اور وہ اپنی زندگی میں ایک زبردست کمی محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کی تشنۂ محبت روح کو ایک مرکز کی جستجو تھی جس پر وہ اپنی محبت اپنی عقیدت نچھاور کر سکے۔ جس کو وہ اپنا کہہ سکے۔ اسے عورتوں کی سوسائٹی میں بیٹھنے کا بہت اتفاق ہوا تھا لیکن اپنی مرضی کی لڑکی کہیں نظر نہ آئی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ بیوی کے معاملے میں اس کا معیار بہت بلند تھا لیکن وہ حسن کا اتنا جویا نہ تھا۔ جو چیز وہ چاہتا تھا وہ اعلیٰ کردار اور خیالات و مزاج کی ہم آہنگی تھی۔ شوخ و شنگ، زندہ دل، بشاش، سطحی خیالات رکھنے والی لڑکیاں جن کا اصول زندگی EAT DRINK AND BE MERRY کھاؤ پیو اور مزے اڑاؤ ہوتا ہے اور جن کی گفتگو کے موضوع صرف لباس، جوئلری، سیر و تفریح، دعوتیں، پارٹیاں اور سینما تک محدود ہوتے ہیں، اور جو سوشل بہبودی کے کاموں میں حصہ بھی لیتی ہیں تو محض نام و نمود کے لئے، اسے ناپسند تھیں۔ ہر چیز اپنی حد سے بڑھ کر برائی بن جاتی ہے۔ وہ حد سے بڑھی ہوئی شوخی اور ظرافت سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اس کے دل کو ایک ایسے وجود کی تلاش تھی جس میں درد ہو، وفا ہو، گہرائی ہو۔ جس پر وہ تکیہ کر سکے۔ ایسی لڑکی اس کو صرف ایک ہی نظر آئی تھی —— اور وہ اس کی چھوٹی بہن نشابہ کی سہیلی عذرا تھی۔ اس وقت وہ عذرا کے متعلق سوچ رہا تھا ——

عذرا —— وہ نیک دل، خوبصورت لڑکی جس کی ذات میں سنجیدگی اور بشاشت کا حسین امتزاج ہے۔ وہ طالب علمی کے زمانے سے کتنے اچھے افسانے لکھ رہی ہے۔ اس کے افسانوں میں انسانی جذبات اور احساسات کی حسین مصوری نظر آتی ہے اور اس کے باوجود انفاع زندگی کے امکانات بھی پائے جاتے ہیں۔ وہ آگے چل کر کس قدر ترقی کرے گی۔ اس کے خیالات کس قدر اعلیٰ و ارفع ہیں۔ وہ دوسروں کی مدد کرنے والی محبت کیش اور خلوص پرور ہے۔ وہ اقبال کی شاعری کی دلدادہ ہے اور اس کے پیغام "اعلیٰ انسانیت" کی پرجوش مبلغ۔ اسے قدرت کی طرف سے ہر چیز کا کتنا بہترین اور پاکیزہ ذوق عطا ہوا ہے۔ آہ! اس کے دل میں زندگی کی تڑپ بھی ہے اور غم کا احساس بھی۔ یا خدا! کیا میں اس قدر خوش قسمت ہو سکتا ہوں کہ اس "گوہر نایاب" کو پا لوں ؟

وہ انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ کمرے کے دروازے پر کسی نے دستک دی "آ جائیے!" اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دروازے کا آسمانی رنگ کا

پردہ ہلا اور شہریار کے بڑے بھائی شاہد اور ان کی نئی نویلی دلہن رعنا داخل ہوئے۔ یہ دونوں رات سے شہریار کے مہمان آئے ہوئے تھے۔ شام کو کسی جگہ چائے پر مدعو تھے اور وہاں سے ابھی واپس آئے تھے۔ رعنا اس وقت گہرے سُرخ و سنہری رنگ کی ٹشو کی ساڑھی میں ملبوس تھی اور یاقوتی نگینوں کا سیٹ پہنا ہوا تھا اس نے بہت تیز میک اپ کر رکھا تھا اور لمبے لمبے ناخنوں پر سُرخ شیڈ کا کیوٹیکس لگا ہوا تھا۔ وہ دراز قد، صندلی رنگت اور معمولی خدوخال کی لڑکی تھی لیکن بیش قیمت لباس اور سنگھار نے اس میں بے حد چمک دمک پیدا کر دی تھی اور پہلی نظر میں دیکھنے والوں کو وہ بہت حسین نظر آتی تھی۔ شاہد اپنی دلہن پر بہت نازاں تھا۔ ان کی شادی کو ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے۔

"آئیے بیٹھئے بھابی جان اور بھائی جان" اس نے تعظیماً کھڑے ہوتے ہوئے کہا "آپ چائے سے واپس آگئے؟"

"ہم لوگ ابھی آئے ہیں" رعنا نے شہریار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیسے طبیعت تو اچھی ہے؟ تھکے تھکے نظر آ رہے ہیں؟"

"جی ہاں آج دفتر میں کام زیادہ تھا۔ دیر سے واپس آیا ہوں" شہریار نے جواب دیا۔

"شہریار!" شاہد نے کہنا شروع کیا "اِدھر چند دنوں سے تم کچھ افسردہ نظر آتے ہو۔ دوست بس اب اپنی تنہا زندگی ختم کرو۔ یاد رکھو شیلے کہتا ہے، عورت مرد کا بہترین حصہ ہے۔ مرد جب تک شادی نہیں کرتا اُدھورا اور نامکمل رہتا ہے۔ اب تمہارا گھر آباد ہونا چاہئے"

"جی ہاں بھائی جان!" رعنا شوخی سے بولی "یہ خدمت میرے سپرد کیجئے۔ ایسی خوبصورت، چندے آفتاب، چندے ماہتاب دلہن لاؤں گی کہ آپ پرستشِ جمال پر مجبور ہو جائیں گے"

"شکریہ بھابی جان! لیکن آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا تو میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ وہ کون ہو گی؟" شہریار نے شگفتگی سے کہا۔

"اخاہ شہریار!" شاہد نے ایک قہقہہ لگایا "میں اب سمجھا، تم تو چھپے رستم نکلے۔ بیمارِ محبت ہو۔ جبھی یہ حلیہ بنا رکھا ہے۔ بتاؤ تو سہی وہ خوش نصیب کون ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟"

"عذرا" شہریار نے جواب دیا۔

"اچھا!" رعنا حیرت سے بولی "وہ نوشابہ کی سہیلی عذرا۔ میں تو سمجھی تھی کہ آپ کی پسند بہت زیادہ اونچی ہے۔ عذرا اچھی خوبصورت ہے لیکن ایسی نہیں جسے دیکھ کر عشق ہو جائے۔ آپ کو عذرا سے بدرجہا اچھی لڑکیاں مل سکتی ہیں۔ عذرا خوبصورت ہی ہے نا، اور تعلیم یافتہ بھی لیکن ان لوگوں کی مالی حالت بالکل اوسط درجہ کی ہے۔ ہم تو اپنے شہریار بھائی کی شادی نہایت دھوم دھام سے کریں گے۔ ہزار ڈیڑھ ہزار کی برات لے کر دلہن بیاہنے جائیں گے۔ عذرا کے ابا کی کوٹھی کا تو احاطہ ہی چھوٹا سا ہے۔ اس میں تو تین چار سو سے زیادہ آدمی آ بھی نہیں سکتے۔ نہ وہ ہم لوگوں کی پوزیشن کے مطابق شاندار جہیز دے سکتے ہیں۔ آپ نے بھی کیا گھر ڈھونڈا۔ اپنے اسٹیٹس کے مطابق گھر دیکھئے۔ آپ کو تو حسن و دولت، تعلیم اور شاندار جہیز سب کچھ مل سکتا ہے"

"لیکن بھابی جان!" شہریار نے بُرا مانتے ہوئے سنجیدگی سے کہا "دولت اور پوزیشن کی میرے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔ میرا درجہ خود قطعی اونچا نہیں۔ ہم لوگ تو عوام کے خادم ہیں۔ عذرا نہایت اعلیٰ کردار کی مالک ہے۔ اس کے خیالات بلند ہیں اور سونے پر سہاگہ یہ کہ بے حد ذہین اور خوبصورت بھی ہے۔ مجھے اس سے زیادہ کی خواہش نہیں۔ شاندار جہیز وغیرہ لے کر مجھے کیا کرنا ہے، یہ سب فضولیات ہیں۔ خدا کے فضل سے میں اس قابل ہوں کہ اپنے قوتِ بازو کی کمائی سے بیوی کو اعتدال کی حد تک آرام و آسائش سے رکھ سکوں اور میں اسے کافی سمجھتا ہوں"

"شہریار!" شاہد نے کہنا شروع کیا "تمہاری خشک طبیعت سے مجھے یہ امید نہ تھی۔ اب تک تو تم نے کبھی صنفِ نازک میں دلچسپی ہی نہ لی تھی مجھے حیرت ہے کہ تمہارے جیسا وحشت زدہ اور رم کھانے والا انسان کسی سے محبت کرنے لگا۔ تم تو بُری طرح عذرا کے عشق میں مبتلا ہو"

" خیر عشق ہی سہی " شہریار بولا " لیکن شاہد بھائی میری محبت جذبات پر مبنی نہیں۔ بلکہ ہم دونوں کی پسند ایک ہے۔ خیالات ایک ہیں اس لئے وہ نہ صرف میرے مشاغل میں حصہ لے سکتی ہے بلکہ بسا اوقات میری رہنمائی کر سکتی ہے۔ ہماری ازدواجی زندگی نہایت شاندار ہوگی "

" لیکن سُنئے تو سہی شہریار بھائی " رعنا کہنے لگی " کیا آپ نے عذرا کو دیکھا ہے؟ اس سے ملے ہیں؟ اس کے ابا تو پردہ ہی بہت سخت کراتے ہیں "

" نہیں بھابی! وہاں تو فرشتوں کے بھی پَر جلتے ہیں " شہریار بولا " میں نے عذرا کو صرف ایک بار دیکھا ہے اور وہ بھی بچپن میں۔ کیونکہ میں تو تعلیم کے سلسلہ میں ہمیشہ دور کے ہوسٹلوں میں رہا ہوں۔ وہ چھ سات سال کی ہوگی۔ سُرخ و سفید گول مول چینی کی گڑیا، بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں۔ سُرخ فراک اور بالوں میں سُرخ ہی ربن لگا ہوا تھا۔ کسی تقریب کے سلسلے میں اس دن اپنی امی کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھی۔ اور ہاں ابھی کچھ عرصہ ہوا اس کی تصویر دیکھی تھی۔ میں نوشابہ کی رائٹنگ ٹیبل کی دراز میں ایک لفافہ ڈھونڈھ رہا تھا کہ ایک تصویر نظر پڑی۔ بڑے تیکھے نقش اور غزالی آنکھوں والی لڑکی جس کے چہرے پر ذہانت برس رہی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے نوشابہ نے وہ تصویر میرے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ کیونکہ عذرا نے اسے اپنی تصویر یہ وعدہ لے کر دی تھی کہ نوشابہ کسی کو نہیں دکھائے گی "

" بھئی شہریار " شاہد نے پھر قہقہہ لگایا " تمہارا عشق تو اطالوی شاعر دانتے کے عشق سے ملتا جُلتا ہے۔ دانتے نے بیٹرس کو شاید نو سال کی عمر میں دیکھا تھا اور تم نے عذرا کو سات سال کی عمر میں۔ بیٹرس کی محبت ڈیوائن کمیڈی کی تصنیف کا باعث ہوئی اور دانتے زندہ جاوید ہوگیا۔ دیکھیں عذرا کی محبت تم سے کیا کارہائے نمایاں کرواتی ہے "

" لیکن بھائی جان! " شہریار نے صوفے پر پہلو بدل کر کہا " دانتے محبت میں ناکام رہا تھا۔ اسے زندگی میں بیٹرس نہ مل سکی۔ آپ دعا کریں میری محبت کو خدا کامیاب کردے اور مجھے میری عذرا مل جائے! "

" اچھا بھئی خدا کرے " شاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" ہاں شہریار بھائی " رعنا بولی " یہ ٹھیک ہے عذرا خوبصورت ضرور ہے اور سادگی میں بھی اس میں بے حد کشش اور جاذبیت پائی جاتی ہے لیکن آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ سیّد ہے اور اس کے ابا ذات پات کے معاملے میں بہت کٹّر ہیں۔ کیا وہ راجپوتوں میں بیٹی دے دیں گے؟ مجھے امید نہیں۔ میری خالہ زاد بہن وسیمہ جو عذرا کے خاندان کو اچھی طرح جانتی ہے بتاتی تھی کہ اس کے لئے بہت اچھے اچھے پیغام آچکے ہیں لیکن انہوں نے صرف غیر سیّد ہونے کی بنا پر مسترد کر دئے "

شہریار کا رنگ یہ سُن کر ایک دم سفید ہو گیا۔

" اتنا گھبرائیں نہیں شہریار بھائی " رعنا پھر بولی " چھوڑیں عذرا کا خیال۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں وہ شجرِ ممنوعہ ہے، آپ کو نہیں مل سکتی یہ لڑکی جو میں بتا رہی ہوں کسی لحاظ سے بھی عذرا سے کم نہیں بلکہ بڑھ کر ہے۔ وہ روایتی شہزادیوں کی طرح حسین ہے اور وہ اور عذرا ایک ہی کالج کی پڑھی ہوئی ہیں۔ وہ ماں باپ کی تنہا اولاد ہے۔ اس کے والد کی پوزیشن بہت اونچی ہے۔ باپ کی وسیع جائداد اور املاک کی صرف وہی وارث ہوگی "

" نہیں بھابی ایسا نہ کہئے " شہریار نے کہا " میں عذرا کو حاصل کرنے کی امکان بھر کوشش کروں گا۔ عذرا عذرا ہی ہے۔ عذرا کے سوا دنیا کی کوئی لڑکی مجھے خوش نہیں رکھ سکتی۔ کسی کے حسن اور دولت میں میرے لئے کوئی کشش نہیں۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں "

" جذباتی نہ بنو شہریار۔ یہ سب وقتی خیالات ہیں۔ رفتہ رفتہ عذرا کا خیال جاتا رہے گا۔ شادی ہو جائے تو پھر کوئی بھی لڑکی ہو اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ تم یہ معاملہ ہم پر چھوڑ دو " شاہد نے کہا۔

" لیکن شاہد بھائی آپ غلطی پر ہیں " شہریار نے کہا " میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ خدا کے لئے آپ جلد بازی میں میرے متعلق کوئی قدم

نہ اٹھائیں۔ مجھے اپنی قسمت آزمانے دیں۔ میں اتنی جلدی ہار نہیں مان سکتا"
اتنے میں ملازم نے دروازہ پر دستک دی "صاحب کھانا تیار ہے" اور سب کھانے کے لئے اُٹھ بیٹھے۔

وہ اوپر کی منزل میں اپنی خوابگاہ میں دریچے کے سامنے ایک آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ سامنے آم کے جھنڈ کے پیچھے ابتدائی دنوں کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ آموں کے بُور کی بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی اور دور کہیں کوئل کوک رہی تھی۔ کمرے کے ایک گوشے میں ایک تپائی پر منروا یونانی فہم و فراست کی دیوی کا چھوٹا سا مجسمہ اپنے ہاتھ میں جلتی ہوئی موم بتی تھامے ہوئے تھا۔ ہوا کی دھیمی سرسراہٹ نے فضا کو اور بھی خوابناک بنا دیا تھا۔ پچھلے چند ماہ جیسے پریشان کن گذرے تھے، اس کے برعکس وہ اس وقت خوش تھی، بے حد خوش اور بشاش! گذشتہ دنوں کے واقعات ایک ایک کرکے اس کی آنکھوں کے سامنے آرہے تھے۔ کیسے شہریار کے والدین نے اس کے ابا اور امی کے پاس شادی کی درخواست کی۔ بار بار اصرار کیا۔ رضامند کرنے کی بے حد کوشش کی۔ متعدد ذرائع سے کہلوایا۔ عاجزی اور التجائیں کیں لیکن اس کے ابا صاف انکار کئے گئے۔ ان کے انکار کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ شہریار یا ان کے گھرانے کو ناپسند کرتے تھے۔ یہ سب ان کی خواہش کے عین مطابق تھا۔ لیکن ان کے درمیان جو ناقابلِ عبور خلیج حائل تھی وہ ذات پات کی تھی۔ شہریار راجپوت تھا اور راجپوت کیونکر سیّد لڑکی سے شادی کر سکتا تھا۔ اور جب اس کے ابا کو پتہ چلا کہ عذرا یہ جانتے ہوئے کہ شہریار راجپوت ہے اس رشتے کے حق میں ہے تو ان کے غیض و غضب کی کوئی حد نہ رہی۔ اور عذرا کا وقت دن رات روتے گذرتا تھا۔ اس کے چھوٹے چچا اور چچی جو ملازمت کے سلسلہ میں مشرقی بنگال میں تھے، عرصہ سے اسے بنگال بلا رہے تھے اور اس مرتبہ جب وہ دو سال کے بعد رخصت پر آئے تو ان کے بے حد اصرار سے مجبور ہو کر وہ ان کے ساتھ کچھ عرصہ کے لئے مشرقی بنگال چلی آئی۔ انہوں نے اس کے دل بہلانے کی بیحد کوشش کی۔ آئے دن پک نک اور سیر پر لیجاتے تھے۔ مشرقی بنگال کے اچھے اچھے مقامات دکھائے۔ لانچ میں سندربن کی وادی کی سیر کرائی لیکن خوش رنگ بادلوں، بہتے ہوئے دریاؤں اور سرسبز مرغزاروں کو دیکھ کر بھی اس کی رُوح پر بدستور اُداسی چھائی رہی۔ لیکن آج اور آج صبح —— ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی قسمت خوشگوار پلٹا کھانے والی ہے۔ اس کے منجھلے چچا جو سال بھر سے کسی سرکاری کام پر اپنی بیوی بچوں کے ہمراہ انگلینڈ گئے ہوئے تھے، پاکستان آ رہے تھے اور عنقریب کراچی پہنچنے والے تھے۔ منجھلے چچا کا خط اس کے چھوٹے چچا کے نام تھا۔ انہوں نے شہریار کے پیغام کا ذکر کرتے ہوئے اپنے بڑے بھائی کے انکار پر حیرت اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا کہ کتنے اچھے لڑکے کو جواب دے رہے ہیں۔ وہ شہریار کو بذاتِ خود جانتے تھے اور ان کے خیال میں وہ بیحد شریف اور قابل لڑکا تھا اور عذرا کے لئے اس سے اچھا شوہر اور کیا ہو سکتا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ "اچھا ہوا میں جلد واپس آرہا ہوں۔ میں بھائی جان کو رضامند کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا" اور عذرا جانتی تھی کہ منجھلے چچا اپنی دُھن کے پکے ہیں۔ وہ جس کام کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں اس کو تکمیل تک پہنچا کر دم لیتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ ابا پر ان کا کس قدر اثر ہے۔ اور اب وہ پُر امید تھی اور خوش۔ پرسوں چھوٹے چچا کسی سرکاری کام سے کراچی جا رہے تھے اور عذرا ان کے ساتھ واپس مغربی پاکستان جا رہی تھی۔

منجھلے چچا اور چچی اور ان کے دو چھوٹے چھوٹے بچے منصور اور زینت مقررہ تاریخ پر انگلینڈ سے آگئے۔ وہ اپنے چھوٹے چچا کے ساتھ ان کے استقبال کے لئے کراچی ڈرگ روڈ ایروڈروم پر موجود تھی۔ یوں تو عذرا کو خاندان میں سبھی بہت اچھا سمجھتے تھے لیکن منجھلے چچا اور چچی کی تو وہ خاص طور پر بہت لاڈلی تھی۔ چار روز انہوں نے کراچی میں قیام کیا اور خوب سیریں کیں۔ گاندھی گارڈن، کلفٹن اور ایک دن موٹر بوٹ میں جزیرۂ ریت بھی دیکھنے گئے اور وہاں پک نک منائی۔
اور اب وہ اکٹھے پاکستان میل سے اپنی جائے مستقر پر جا رہے تھے۔ عذرا کے چہرے سے بشاشت اور زندہ دلی پھوٹی پڑتی تھی۔

ایک تو اسے اتنے عرصے کے بعد اپنے چچا اور چچی کے آنے کی خوشی تھی۔ دوسرے وہ چچا کی طبیعت سے واقف تھی کہ وہ دھن کے پکے ہیں اور ابا ان کی بات بھی بہت مانتے ہیں مجھلے چچا شہریار کا رشتہ منظور کروا کر رہیں گے۔

وہ مستقبل کے حسین خوابوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے اپنی سنسان اور اُداس زندگی آباد اور شگفتہ ہوتی نظر آ رہی تھی۔

حیدر آباد کے اسٹیشن پر دو خواتین کمپارٹمنٹ میں آئیں۔ وہ بالمقابل کی کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جب ٹرین چل پڑی تو اس نے کمپارٹمنٹ پر نگاہ ڈالی۔ آنے والی خواتین میں سے ایک زرتار لباس میں ملبوس، زیوروں سے لدی ہوئی اسکی سہیلی زبیدہ تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں مہندی رچی ہوئی تھی اور وہ بالکل نئی دلہن معلوم ہو رہی تھی۔

"ارے عذرا تم!" اور وہ دوڑ کر عذرا کے گلے سے لپٹ گئی۔

"زبیدہ تمہاری شادی ہو گئی۔ بھئی مبارک ہو! دلی مبارکباد" اس نے مسکراتے ہوئے پرجوش لہجہ میں کہا۔

"شکریہ! عذرا تم تو بڑی ماہر نجومی ہو۔ تمہاری ایک ایک پیشین گوئی درست نکلی" زبیدہ نے کہا۔

"اچھا تو بھئی کیا نام ہے ہمارے دولھا بھائی کا اور وہ کس شعبۂ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں؟" عذرا نے دریافت کیا۔

"وہ پاکستان سول سروس میں ہیں" زبیدہ نے جواب دیا "اور واقعی عذرا وہ اعلیٰ دماغی قابلیت کے مالک ہیں۔ علم و ادب کے شیدائی۔ انہوں نے تو گھر میں بڑی بھاری لائبریری بنا رکھی ہے اور اسکالر ہیں۔ لیکن عذرا ان سب باتوں کے باوجود ان کی طبیعت میں بہت سادگی ہے اور سنجیدہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہیں"

"اور تم سدا کی کھلنڈری لکھنے پڑھنے کو وبالِ جان سمجھنے والی، سیر و تفریح اور دعوتوں پارٹیوں کی عاشقِ زار۔ پھر اب کچھ سنجیدگی سیکھو" عذرا نے شرارت سے کہا۔

"نہیں میں تو ان کی سنجیدگی ہٹاؤں گی چہ جائیکہ خود سنجیدہ بن جاؤں۔ لیکن عذرا سول سروس کے افیسر سے شادی کرنے میں شان بہت ہے۔ اس قدر عزت اور حکومت ہوتی ہے۔ ان کی یہی بات مجھے پسند ہے" زبیدہ کہہ رہی تھی۔

"واقعی! لیکن زبیدہ اپنے میاں کا نام تو بتاؤ" عذرا کا دل کسی ناقابلِ فہم خوف کے احساس سے دھڑک رہا تھا۔

"شہریار!" زبیدہ نے کچھ شرماتے ہوئے کہا۔

یہ الفاظ نہ تھے ایک بجلی تھی جس نے عذرا کے خرمنِ حیات کو پھونک ڈالا۔ اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ کلیجے میں شدت کا درد اٹھا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے سنبھلنے کی ہرچند کوشش کی اور کھڑکی سے سر باہر نکال دیا لیکن ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور عذرا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

ڈالڈا استعمال کرنے سے سب گھر خوش ہے
آپ کے بچے کیسے تندرست ہیں!
انہیں آپ کیا دیتے ہیں؟
ڈالڈا... وہی قوت بخش چکنائی جو روزمرہ کی خوراک میں انکے لئے ضروری ہے
اس مہر بند ڈبہ میں خریدا ہوا ڈالڈا اپنی قیمت کا بہترین بدل ہے
میں ڈالڈا میں کونسے کھانے پکا سکتی ہوں؟
سبھی، یہ ہر قسم کے کھانے کو مزیدار بناتا ہے
یہ حقیقت ہے کہ جب سے میں نے ڈالڈا استعمال کرنا شروع کیا۔ گھر میں سب صرف تندرست ہی نہیں بلکہ زیادہ خوش بھی نظر آتے ہیں۔
ڈالڈا نہایت قوت بخش اور خالص ترین چکنائی ہے
یاد رکھیے ڈالڈا بہترین اجزاء سے بنایا جاتا ہے اور بنتے وقت یہ ہاتھوں سے ہرگز چھوا نہیں جاتا۔ یہ ایک خالص چکنائی ہے جس کا ہماری روزانہ غذا میں شامل ہونا ڈاکٹروں کے نزدیک بیحد ضروری ہے۔
مہر بند ڈبہ میں آپ اسے تازہ، خالص اور مفید صحت پائینگے۔
DALDA
VANASPATI
डालडा
वनस्पति
ڈالڈا
وناسپتی
HVM. 193-193 UD
ڈالڈا وناسپتی

”میں جانتی ہوں
لکس ٹائلیٹ صابن آپکی جلد
زیادہ دلکش بنائے گا“
— سُمِترا
سُمِترا کہتی ہیں ”اس
خالص وسفید صابن کی دلفریب
خوشبو میری جلد میں بس جاتی ہے
آپ بھی اپنی جلد نہایت ملایم
اور خوبصورت بنانے کیلئے لکس
ٹائلیٹ صابن استعمال کیجئے“
LUX
TOILET SOAP
لکس
ٹائلیٹ صابن
فلمی ستاروں کا
حسن بخش صابن
کتنا سفید، کتنا خالص، کتنا خوشبودار
LTS. 393-X30 UD

اردو افسانے
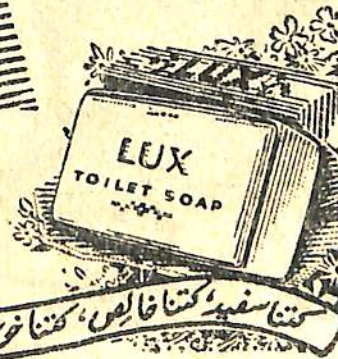
میں

روایت اور تجربے

حصہ لینے والے :-

- سیّد وقار عظیم
- ڈاکٹر عبادت بریلوی
- سعادت حسن منٹو
- احمد ندیم قاسمی
- ہاجرہ مسرور
- خدیجہ مستور
- انتظار حسین
- حمید اختر
- شوکت تھانوی

یہ بحث تین نشستوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

پہلی نشست لارنس گارڈن میں پہاڑی کے نیچے جمی۔ جہاں چائے کی چسکیوں کے ساتھ ساتھ بحث کا آغاز ہوا۔

سب سے پہلے بہن ہاجرہ مسرور تشریف لائیں۔ اُنہوں نے آتے ہی کہا "اچھا سب سے پہلے میں ہی آکر بے وقوف بنی ہوں"۔ اس پر میں نے اُن سے عرض کیا۔ کہ "سب سے بڑا بے وقوف تو میں ہوں۔ جو وقتِ مقررہ سے بھی آدھ گھنٹہ پہلے آیا" —— اس کے بعد برادرم سیّد وقار عظیم اور ڈاکٹر عبادت بریلوی تشریف لائے۔ اور یوں گویا ہوئے "واہ وا! کیا عمدہ موسم ہے۔ بحث میں خوب مزا آئے گا" —— پھر بہن خدیجہ مستور آئیں۔ جو فقرہ اُن کی زبان سے سب سے پہلے ادا ہوا، وہ یہ تھا "کمبخت تانگے والے نے بڑی دُور اُتار کر پریشان کیا" —— اس کے بعد شبیر محمد اختر اور مکین احسن کلیم آئے۔ اختر صاحب نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "طفیل تو بہت بڑا ایڈیٹر ہے"۔ مجھے اُن کا چھ فٹ کا قد اور جسامت دیکھ کر کہنا پڑا "حضور میں تو اُونٹ کے منہ میں زیرے کی حیثیت رکھتا ہوں" —— اتنے میں انتظار حسین آتے دکھائی دیئے۔ انہیں دیکھ کر سب نے کہا "آگیا، آگیا، نئی نسل کا نمائندہ" —— تھوڑی دیر کے بعد منٹو صاحب اور اے حمید تشریف لائے۔ منٹو صاحب نے السلام علیکم کے بعد کہا "یار یہ کیا کھنڈ بازی ہے" —— پھر برادرم احمد ندیم قاسمی آئے۔ اور انہوں نے آتے ہی کہا "بھئی معاف کرنا مجھے ذرا دیر ہو گئی۔"

کچھ لوگ دُور کھڑے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ساتھ ہی ہوٹل میں چائے پینے والوں کی بھی نظریں ہماری طرف اُٹھ رہی تھیں۔ اُوپر پہاڑی پر کچھ لوگ کھڑے تھے۔ اُن میں سے جب ایک نے مرغے کی سی بلند آواز نکالی۔ تو برادرم وقار عظیم نے کہا —— "لیجیئے مرغا بول دیا۔ اب بحث شروع ہونی چاہیئے۔ اس پر قہقہہ پڑا اور بحث شروع ہو گئی —— صدارت سیّد وقار عظیم نے فرمائی۔

رات ہو گئی مگر بحث ختم نہ ہوئی۔

طے ہوا کہ دوسری نشست بہن ہاجرہ مسرور کے ہاں ہو گی۔ جب پھر بھی آئی نہ ٹلی، تو تیسری نشست برادرم سیّد وقار عظیم کے گھر ہوئی۔ اس طرح کامل دس بارہ گھنٹوں میں جو گفتگو ہوئی۔ وُہ پیشِ خدمت ہے۔

اس بحث میں جن دوستوں کی ضرورت سے زیادہ تعریف ہو گئی ہے یا جن کی ضرورت سے کم تعریف ہوئی ہے۔ اُن سے مجھے بحث میں حصّہ لینے والے احباب کے خلوصِ نیّت کی خاطر معذرت کرنا ہے۔

میں ان سب دوستوں کا ممنون ہوں، جنہوں نے میری درخواست پر اس بحث میں حصّہ لیا اور اس طرح مجھے ایک بڑے کام کی چیز پیش کرنے کی سعادت بخشی۔

آخر میں مجھے برادرم ملک اسلم اور فرہاد زیدی کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ جنہوں نے اِس ساری بحث کے نوٹس لئے اور مجھے احباب کی خدمت میں پان اور سگریٹ پیش کرنے کے لئے وقت دے دیا۔

محمد طفیل

اردو افسانے میں روایت اور تجربے

(انڈکس)

—— : ★ : ——

اُردو افسانے میں روایت اور تجربے

مدیر نقوش نے کہا — آج کی نشست کا مقصد یہ ہے کہ ہم "اُردو افسانہ میں روایت اور تجربے" کے عنوان کے ماتحت گفتگو کریں۔

احمد ندیم قاسمی۔ پہلے وہ صاحب بولیں۔ جنہیں اس کا تجربہ ہو۔

سعادت حسن منٹو۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ کو افسانے سے بحث ہے یا افسانہ نگار سے، دوسری بات یہ کہ افسانے کی روایت کو تو بہت دُور سے TRACE کرنا پڑے گا۔

عبادت بریلوی۔ ہم ان افسانوں کی روایت سے بحث کریں گے جو اُردو میں لکھے گئے ہیں۔

ندیم۔ منٹو صاحب کا یہ کہنا کہ ہر افسانہ نگار کی ایک روایت ہے صحیح ہے لیکن یہی روایت آگے چل کر افسانے کی روایت بن جاتی ہے۔ موجودہ دَور کے افسانوں سے پہلے جو اُردو افسانے لکھے گئے ہیں اُن کی ہیئت کے اعتبار سے جو صورت مرتب ہوتی ہے ہم اسی کو بنیاد بنا کر بحث کریں گے۔ ذاتی اسٹائل کو بھی اسلوب اور روایت کہہ سکتے ہیں۔"

وقار عظیم۔ "بنیادی طور پر ہر صنفِ ادب کے کچھ فنّی لوازم ہوتے ہیں۔ یہی لوازم اُس صنف اور دوسری اصناف میں فرق و امتیاز پیدا کرتے ہیں۔ یہی صورت افسانے کی ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ جب ہمارے پہلے افسانہ نگار نے افسانہ لکھا تو کن چیزوں کو بنیاد بنایا۔ اور پھر آگے چل کر نئے تجربوں کے ذریعہ اس میں کیا اضافے ہوئے۔

منٹو۔ لیکن پُرانے زمانے میں جو لوگ افسانے لکھتے تھے کیا وہ ان روایات پر قائم رہتے تھے —— ؟ میرے خیال میں تو ان کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنا مشکل ہے۔

وقار عظیم۔ ہر تجربہ آگے چل کر روایت کا جزو بن جاتا ہے اور جب وہ روایت بن جاتا ہے تو آگے آنے والے وقت کے تقاضوں کی بنا پر نئے تجربے کرتے ہیں اور ہوتے ہوتے یہ بھی روایت کا حِصّہ بن جاتے ہیں۔

ندیم۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اُردو افسانے کی ابتدا کہاں سے ہوئی، اور کیا اُردو افسانے کی روایت اتنی وسیع ہے کہ ہم اس پر بحث کر سکیں، غالباً اُردو افسانے کی ابتدا اسی صدی میں ہوئی ہے اور ہمارے ابتدائی افسانہ نگاروں میں سلطان حیدر جوش، پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، اور نیاز فتحپوری شامل ہیں —— اور ہمیں ان کے ساتھ آج کے افسانہ نگاروں کا تعلق قائم کرنا ہے۔

وقار عظیم۔ اس طرح بات یہاں آکر ٹھہری کہ ہمارے ابتدائی افسانہ نگار سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم، اور نیاز فتحپوری ہیں ——

منٹو۔ سجاد حیدر کو میں افسانہ نگار نہیں مانتا کیونکہ وہ سب ترجے کرتے رہے ہیں۔

وقار عظیم۔ انہوں نے ترجمے ضرور کئے ہیں لیکن طبعزاد افسانے بھی لکھے ہیں۔

ندیم۔ تو سب سے پہلے ہمیں یہ متعین کر لینا چاہیئے کہ اُردو افسانے کی روایت وہیں سے شروع ہوتی ہے یا اس سے بھی پہلے۔

منٹو۔ افسانے کی روایت تو وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے قصّے کہانیاں شروع ہوئیں،

وقار عظیم۔ لیکن ہماری بحث کا تعلق اُردو افسانے سے ہے اور خاص کر مختصر افسانے سے ہے۔

منٹو۔ پھر میں یہ جاننا چاہوں گا کہ افسانہ ہوتا کیا ہے؟

انتظار حسین۔ غالباً پریم چند سے افسانے کی باقاعدہ روایت قائم ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان کے زمانے میں افسانے کا کیا تصوّر تھا — اور پھر اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ بعد کے لکھنے والوں نے اس سے کیا انحراف کیا۔

عبادت بریلوی۔ یوں تو افسانہ ہر کہانی کو کہتے ہیں لیکن مختصر افسانے کے چند فنی لوازم ہوتے ہیں۔ مثلاً وحدتِ تاثر، رمزیت، ایمائیت اور مواد کی فن کارانہ ترتیب وغیرہ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ افسانے کی یہ روایت کب سے قائم ہوئی۔ پریم چند سے یا اس سے پہلے، میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ مختصر افسانہ خود یورپ میں بھی بہت بعد کی پیداوار ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے دورِ آخر سے قبل اس کا وجود باقاعدہ ایک صنف کی صورت میں نہیں ملتا۔ البتہ اسکی روایات دوسری اصنافِ ادب میں

نظر آتی ہیں ـــ مثال کے طور انگریزی شاعری میں BALLAD کی جو صنف ہے اس میں مختصر افسانے کا سا انداز مل جاتا ہے۔ اسی طرح اردو میں جو داستانیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی جگہ جگہ ایسے حصّے ہیں جن میں مختصر افسانے کی روایات تلاش کی جا سکتی ہیں مثلاً سرشار کے فسانۂ آزاد میں اور میر امّن کی باغ و بہار میں یہ چیز ضرور موجود تھی۔ بعد میں اس پر مغرب کا اثر ہوا جس کی وجہ سے مختصر افسانے نے تیزی سے ترقی کی اور موجودہ ہیئت تک پہنچ گیا۔ اس عرصے میں مختصر افسانہ بیسیوں تجربات کی منزلوں سے گزرتا گیا اور اس طرح اس میں روایات صورت پذیر ہوتی گئیں۔ آج بھی روایات اردو مختصر افسانے کا سرمایہ ہیں ـــ انہیں کو سامنے رکھ کر ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مختصر افسانہ کیا ہے اور اسکی بنیادیں کن اصولوں پر قائم ہیں!

منٹو ۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ مختصر افسانہ کے دو ٹوک اصول کیا ہیں؟

وقار عظیم ۔ ہمارے افسانے نے موجودہ ہیئت مغرب کے اثر کے تحت حاصل کی لیکن اس میں ہماری قدیم کہانیوں اور داستانوں کی خصوصیات بھی شامل ہیں۔ اور ان دونوں کے امتزاج سے ہمارا افسانہ بنا ہے۔ مغرب کا افسانہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ افسانہ میں ایک چیز کے متعلق کوئی بات کہی جائے اور اس کا ایسا تأثر ہو کہ اس میں انتشار نہ ہو۔ یہ چیز ہم نے مغرب سے لی ہے۔ ایک واحد تجربہ یا تأثر افسانہ کا اصل موضوع ہے۔

منٹو ۔ ایک تأثر کو خواہ وہ کسی کا ہو اپنے اوپر مسلّط کر کے اسے اس انداز سے بیان کر دینا کہ وہ سُننے والے پر بھی وہی اثر کرے یہ افسانہ ہے۔

وقار عظیم ۔ جی ہاں! ـــ جب افسانے کی ایک تعریف متعیّن ہو گئی تو اسے سامنے رکھ کر یہ دیکھنا ہے کہ ابتدائی افسانہ نگار کس حد تک اس بنیادی بات کو پورا کرتے ہیں اور کس حد تک داستانوں سے متأثر ہیں۔

عبادت بریلوی ۔ پریم چند کے یہاں افسانے کی جو روایت ملتی ہے اس میں ابتداً داستانوں کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ پریم پچیسی، پریم بتیسی، اور پریم چالیسی کے بیشتر افسانے اسی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ اور مختصر افسانے کی تکنیک کے بنیادی اصولوں کا پوری طرح لحاظ نہ رکھنا اسی داستانوں کی تکنیک سے متأثر ہونے کا ثبوت ہے۔ ان کے بعد کے افسانوں میں یہ بات نہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ مختصر افسانے کی خصوصیات کو برتنے لگتے ہیں۔

وقار عظیم ۔ لیکن پریم پچیسی اور پریم بتیسی کے افسانے پریم چند کے ابتدائی افسانے نہیں۔ حقیقت میں اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوزِ وطن" نہ صرف ان کی افسانہ نگاری کی بلکہ ہمارے افسانے کی بنیاد ہے۔ اس میں پانچ افسانے ہیں جو تمام کے تمام داستانوں کے رنگ میں گہری مقصدیت کے حامل ہیں۔ کرداروں کے ناموں تک میں بھی رنگ موجود ہے۔ ہیرو اور ہیروئن کا وہی تصوّر ہے جو داستانوں میں تھا۔ اندازِ بیان شروع سے آخر تک شاعرانہ ہے لیکن اس کے باوجود ان کے ہر افسانے میں ایک واحد مقصد ہے جسے بڑی کامیابی سے داستانی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ پسِ منظر بالکل داستانوں کا سا ہے۔ افسانہ نگار کے پیشِ نظر ایک خاص مقصد ہے جسے وہ ناظر تک پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ بار بار اس کی تکرار کرتا ہے۔ کبھی یہ اعادہ بُرا معلوم ہوتا ہے اور کبھی اس میں لطف آجاتا ہے۔ لیکن افسانہ نگار کو اپنا مقصد اتنا عزیز ہے کہ وہ تکرار کے بوجھ کو محسوس بھی نہیں کرتا۔

عبادت ۔ لیکن یہ بات تو یقینی ہے کہ پریم چند کی یہ مقصدیت جو سوزِ وطن کے افسانوں میں ملتی ہے وہ مغرب کے اثرات کا نتیجہ نہیں تھی۔ اس میں ایک انفرادیت ہے۔ بہر حال ان افسانوں کی تکنیک پر بھی داستانوں کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔

ندیم ۔ میرے خیال میں اردو افسانہ جو داستانوں سے الگ ہوا ہے تو اس میں افسانہ نگاروں کے دو گروہ تھے ـــ ایک وہ جو یونانی اور ہند اساطیر کو پیش کرتے تھے دوسرے وہ جو پریم چند کی طرح سوسائٹی کی خرابی کی طرف اشارہ کرتے اور ان کے اصلاحی پہلو پیش کرتے تھے۔ ہمیں اس اصلاحی پہلو کو ہی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کا نتیجہ تھے۔

وقار عظیم ۔ سلطان حیدر جوش اور پریم چند دونوں کا سیاسی ماحول ایک سا تھا۔ لیکن مسلمانوں پر سرسید کی تحریک کا ردِ عمل یہ تھا کہ وہ انگریزی تعلیم اور مغربی معاشرت سے متنفر نظر آتے تھے اور ہندوؤں کا زاویۂ نظر خالص سیاسی تھا۔ مثلاً پریم چند کا پہلا افسانہ "دُنیا کا سب سے انمول رتن" اسی سیاسی رُجحان کا حامل ہے۔ اس افسانہ کی ابتدا، خاتمے، اور اس کے دوسرے حصّوں کا انداز بالکل داستانوں کا سا ہے۔ یہی رنگ اس مجموعہ کے دوسرے افسانوں کا ہے۔

اس کے برعکس سلطان حیدر جوش کے افسانوں میں مسلمان تعلیم یافتہ لڑکیوں اور مغرب زدہ نوجوانوں کی معاشرتی اور اخلاقی زبوں حالی کا کوئی نہ کوئی پہلو پیش کیا گیا ہے۔ پریم چند اور سلطان حیدر جوش دونوں کے افسانے مقصدی ہیں لیکن دونوں میں یہی بنیادی فرق ہے۔

عبادت بریلوی - اب ایک سوال یہ ہے کہ پریم چند نے جو روایت قائم کی اس میں انہوں نے مغرب سے اثر لیا ہے یا نہیں۔

وقار عظیم - پریم چند نے خود بھی لکھا ہے کہ اُن کے ابتدائی افسانوں میں داستانوں کا رنگ ہے ــــ وہ بچپن میں چھُپ چھُپ کر طلسم ہوش رُبا پڑھتے تھے۔ بڑے ہو کر ٹالسٹائی کا مطالعہ کیا اور اسکی سادگی اور سلاست کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ دوسروں نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے زیادہ تر قیاس آرائی پر مبنی ہے۔

عبادت بریلوی - ان کے افسانوں کے مطالعہ سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔

منٹو - کیا طلسم ہوش رُبا میں مقصدیت اور افادیت نہیں تھی۔

وقار عظیم - ضرور تھی۔

منٹو - ایچ - جی - ویلز اور طلسم ہوش رُبا میں کیا فرق ہے؟

عبادت بریلوی - یہ الگ سوال ہے۔

منٹو - ہم مقصدیت پر زور دیتے ہیں۔ اور دوسری چیزوں کو بکواس کہتے ہیں لیکن ایچ - جی - ویلز نے سائنس کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس کا جھوٹ تخلیقی جھوٹ تھا - اور افسانے سے جھوٹ نکالا نہیں جا سکتا۔

ندیم - ایچ - جی - ویلز اور طلسم ہوش رُبا میں FANTASY ایک قدر مشترک ہے صرف دور کا فرق ہے۔

وقار عظیم - یہ بحث ہے تو بڑی دلچسپ لیکن ہمارے دائرہ گفتگو سے باہر ہے۔ میں نے جو طلسم ہوش رُبا کا نام لیا وہ محض اس لئے لیا کہ پریم چند نے اس سے اثر قبول کیا۔

ندیم - اب ہمیں پریم چند کے "سوز وطن" سے افسانے "کفن" تک یہ طے کرنا ہے کہ اس سے کیا اثرات مرتب ہوئے۔

وقار عظیم - پہلے مقصد اصلاحی تھا اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سے انحراف کس نے کیا اور اس کے کیا اثرات ہوئے۔ اور مقصدیت کے نقطۂ نظر سے سجاد حیدر یلدرم، جوش اور پریم چند میں کچھ فرق ہے یا نہیں۔

ندیم - سجاد حیدر ان سے الگ ہیں۔

عبادت بریلوی - خود پریم چند کے افسانوں میں یہ بات ہے کہ وہ خالص مقصدیت کے حامل نہیں بلکہ ان کے ہر دور کے افسانوں میں زندگی کو سمجھنے، اس کو برتنے اور اس کو بہتر بنانے کا خیال بھی ملتا ہے خصوصاً ان کے بعد کے افسانوں میں یہ سماجی اور اصلاحی پہلو کچھ اور بھی نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

وقار عظیم - یہ چیز بعد کے افسانوں میں آتی ہے۔

عبادت بریلوی - البتہ انسانی زندگی کے بنیادی تقاضوں کو سب سے پہلے سجاد حیدر یلدرم نے پیش کیا ہے۔ مثلاً "خیالستان" کے بعض افسانوں میں ہمیں یہ بات ملتی ہے۔ خارا اور نسرین نوش کی کہانی اگرچہ ایک رومانی فضا رکھتی ہے لیکن اس کا موضوع انسانی زندگی کی ایک نفسیاتی حقیقت ہے ــــ یعنی مرد اور عورت کا جذباتی اور جسمانی رشتہ!

وقار عظیم - سجاد حیدر پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ خیال عام کیا کہ اصلاحی مقصد افسانے کے فن کو مجروح کرتا ہے۔ آگے چل کر پریم چند نے بھی مقصدیت اور اصلاح کے ساتھ فن پر پوری توجہ کی۔

عبادت بریلوی - شاید اسکی وجہ یہ ہے کہ سجاد حیدر یلدرم کے افسانے انقلاب سے قبل کے ترکی افسانے کے زیر اثر لکھے گئے ہیں، اس دور کے ترکی ادب اور خصوصاً افسانے پر جذباتیت اور رومانیت کا دور دورہ تھا۔ یہ رومانیت یلدرم کے یہاں بھی ملتی ہے۔ تقریباً ہر افسانے میں انہوں نے ایک رومانی فضا قائم کی ہے جو ان کی تکنیک کا ایک بنیادی جزو بن گئی ہے ــــ اس کو نکال لیجئے تو سجاد حیدر یلدرم کے یہاں کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔

وقار عظیم - کیا نیاز فتحپوری اور یلدرم کی رومانیت میں کوئی مماثلت ہے؟

ندیم - یلدرم نے افسانے کی ہیئت میں بڑی تبدیلی کی ہے اس وقت تک افسانے میں پلاٹ کا التزام تھا۔ لیکن انہوں نے کردار نگاری کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھایا۔ اور ایسے SKETCHES کھینچے جس میں صرف ایک کردار ہے۔

وقار عظیم - یہ صحیح ہے ــــ موضوع کے اعتبار سے جو سب سے اہم چیز ہے وہ یہ کہ سلطان حیدر جوش اور پریم چند نے معاشرتی اور سیاسی پہلو لئے ہیں لیکن یلدرم نے ایسے موضوع اپنائے جو زندگی سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے زیادہ تر عورت اور مرد

کی محبت پر افسانے لکھے ہیں اور اس طرح موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے نئے تجربے کئے۔

انتظار حسین - بہرحال ان میں ایک بات مشترک تھی کہ وہ زندگی کے تسلسل کے قائل تھے۔ اور موجودہ مختصر افسانے کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے تسلسل کی منکر ہے۔ اس میں ایک الگ حادثہ ہے جیسے زندگی سے کوئی ربط نہیں،

عبادت بریلوی - سوال یہ ہے کہ یہ جو روایت یلدرم نے قائم کی اس کے بعد نیاز فتحپوری اور ل احمد نے اس میں کوئی اضافہ کیا یا نہیں۔؟

وقار عظیم - نہیں —— یہ لوگ اور مجنوں گورکھپوری نے افسانہ کسی مقصد کی خاطر نہیں بلکہ اُسے کہانی سمجھ کر لکھا۔

ندیم - لیکن اس سے پہلے پریم چند کے آخری افسانے کامیاب ٹکنیک پر کیسے پہنچے میرے خیال میں انہوں نے مغربی افسانوں سے اثر قبول کیا۔

عبادت بریلوی - پریم چند کی کہانی "کفن" میں ان کے ابتدائی افسانوں کی ٹکنیک سے بڑا انحراف ہے اور اس میں مغربی افسانوں کی ٹکنیک کا اثر پایا جاتا ہے۔

وقار عظیم - "کفن" افسانہ نگار کے مخصوص رجحانات کے ذہنی ارتقا کی ایک شکل ہے اس لئے ہمیں اس کے بعد کے افسانوں پر غور کرنا چاہیئے۔

عبادت بریلوی - "انگارے" ۳۶ء میں شائع ہوئی ہے اور اس میں شامل ہونے والے افسانہ نگاروں پر بھی پریم چند کا خاصا اثر معلوم ہوتا ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک خود پریم چند جہاں تک تکنیک کا تعلق ہے بڑی حد تک بدل چکے تھے۔

ندیم - اثر کیوں نہ ہو —— اگر ہم اس سے انکار کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمیں روایت کے تسلسل سے انکار ہے۔

انتظار حسین - ہمیں یہ دیکھنا نہیں ہے کہ انہوں نے پریم چند سے کتنا اثر قبول کیا بلکہ یہ کہ انہوں نے اس سے انحراف کس طرح کیا۔

وقار عظیم - "انگارے" کے افسانوں میں ہندوستانی زندگی کی مسلّمہ قدروں کو توڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ چیز پریم چند کے یہاں نہیں،

عبادت بریلوی - "انگارے" کے افسانوں میں جو شدت ہے وہ انقلابی ہے لیکن اس میں کسی نہ کسی حد تک پریم چند کا اثر ضرور ہے —— ویسے ایک بات یہ بھی ہے کہ "انگارے" کے افسانہ نگار نوجوان تھے۔ ان کے خون میں گرمی تھی۔ بغاوت ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنے فن میں ایک شدت کو پیدا کیا —— لیکن ان کی اس انتہا پسندی نے فن کو ٹھیس پہنچائی۔

وقار عظیم - لیکن یہ ایک تجربہ تھا اور خود اس کے مصنّف آگے چل کر بہت کچھ سنبھل گئے۔

ندیم - جی ہاں، بعض تو بالکل ہی بدل گئے۔

وقار عظیم - پھر بھی "انگارے" کے ان مصنّفوں نے جہاں جہاں روایت سے شدت سے انحراف کیا وہ آگے چل کر فن کے لئے مضر ثابت ہوئی۔

عبادت بریلوی - لیکن یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ "انگارے" کے لکھنے والوں نے اُردو کے افسانہ نگاروں کو بے جھجک نشتر زنی کا انداز سکھایا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ بعد کے افسانہ نگاروں نے اپنے فن میں شدت اور بے باکی پیدا کی۔ شاید ہی سوسائٹی کا کوئی ایسا پہلو ہو جس پر انہوں نے شدت اور بے باکی کے ساتھ قلم نہ اٹھایا ہو۔ مثال کے طور پر ہم اس سلسلے میں سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کو پیش کر سکتے ہیں۔

وقار عظیم - لیکن منٹو "انگارے" کی شدت سے متاثر نہیں ہوئے۔

منٹو - میں نے "انگارے" پڑھی بھی نہیں۔

انتظار حسین - "انگارے" نے ایک غلط روایت کی طرح ڈالی، بعد میں آنے والوں نے یہ سمجھا کہ افسانہ میں سنسنی کی ضرورت ہے۔

عبادت بریلوی - بات یہ ہے کہ وہ زمانہ سیاسی دہشت پسندی کا زمانہ تھا اور ان افسانوں میں جو شدت پیدا ہوئی۔ اس میں ماحول کی اس کیفیت کا بھی اثر ہے۔ ویسے ہر تجربے میں شروع شروع شدت اور انتہا پسندی ہوتی ہے —— بعد کے لکھنے والوں نے اس شدت اور انتہا پسندی میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔

ندیم - میرے خیال میں "انگارے" کی سنسنی کی روایت غلط ہے، کیونکہ بعد میں لکھنے والوں نے اسے روایت کا جزو نہیں بنایا اور اس سے انکار کیا، ممکن ہے اکّا دکّا مثالیں مل جائیں لیکن بہ حیثیت مجموعی نہیں۔ عصمت منٹو وغیرہ کسی نے بھی شعوری طور پر یہ کوشش نہیں کی۔

انتظار حسین - لیکن ہم افسانے میں آج بھی شدّت

INTENSITY

ڈھونڈھتے ہیں۔ جو مختصر افسانے کی خوبی نہیں۔

منٹو۔ شدّت کس چیز کی؟

وقار عظیم۔ شدّت احساس کی۔

منٹو۔ یہ تو افسانے کی بنیادی چیز ہے۔

عبادت بریلوی۔ غالباً انتظار صاحب کا مقصد یہ ہے کہ "انگارے" میں سماجی موضوعات پر جارحانہ انداز میں جو روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کو پیش کرتے ہوئے طنز اور نشتر زنی کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے۔

وقار عظیم۔ جی ہاں ـــ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ کن باتوں کا ذکر ضروری ہے اور کن کا نہیں ـــ مثلاً جنس کے بارے میں خاصی بے اعتدالی کا ثبوت دیا گیا ہے۔

منٹو۔ جنس کے بارے میں تو اس سے پہلے بھی کافی کچھ لکھا جا چکا تھا مثلاً داستانوں میں۔

عبادت بریلوی۔ لیکن داستانوں میں جن جنسی موضوعات کا تذکرہ ہے ان کی نوعیت مختلف ہے۔ یہاں تو ایک طرح کی لذت پرستی اور تعیش پسندی کا نتیجہ ہے۔ "انگارے" کے افسانوں میں یہ بات نہیں۔ ان میں جنسی موضوعات کا ذکر زیادہ ہے۔ لیکن "انگارے" کے افسانوں کے موضوعات صرف اسی حد تک محدود نہیں ہیں۔ ان میں سماجی زندگی کے بہت سے دوسرے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے آگے چل کر تنوع کے اس رجحان کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

وقار عظیم۔ ایک طرف "کفن" دوسری طرف "انگارے"۔ ـــ دونوں کو سامنے رکھ کر ہمیں آگے بڑھنا ہے ـــ پریم چند نے ہمیں یہ بتایا کہ ہمیں زندگی کے متعلق کس طرح لکھنا چاہیئے۔ ہیئت کے اعتبار سے اس مجموعہ نے ہمیں یہ سبق دیا کہ فرسودہ طریقوں کو چھوڑ کر نئی راہوں کو اپنانا چاہیئے۔ اور یہ کہ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے موضوع پر بڑے سے بڑا افسانہ لکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہم ۳۵-۳۶ء تک پہنچ چکے ہیں۔ بعد میں بھی رجحان منٹو، کرشن چندر، اور ندیم میں پیدا ہوا کہ وہ جس معاشرے میں رہتے بستے ہیں اس کے متعلق لکھیں۔

ندیم۔ روایت کی بحث یہاں ختم تو نہیں ہو جاتی!

وقار عظیم۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔

عبادت بریلوی۔ نئے لکھنے والوں نے خاصے تجربے کئے ہیں۔ ہیئت اور موضوع دونوں کے اعتبار سے۔ نئے لکھنے والوں نے اپنے ذہنوں میں کشادگی پیدا کی ہے اور زندگی کی کشمکش کو نئے زاویوں سے دیکھا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی انہوں نے تکنیک کو نکھار دیا ہے۔ اور یہ چیز پڑھنے والوں پر زیادہ اثر کرتی ہے۔ "انگارے" کا کینوس زیادہ وسیع نہیں اور اس میں ایک قسم کی جھنجھلاہٹ پائی جاتی ہے بعد میں آنے والوں نے "انگارے" کے افسانوں کے مقابلے میں اپنے ماحول کی زیادہ وسیع اور باشعور ترجمانی کی ہے۔ جذباتی رومانیت کی تحریک نے جو رجحان پیدا کیا تھا وہ اور زندگی کی باشعور ترجمانی کا رجحان دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ رومانیت کی اہمیت سے بھی ہم انکار نہیں کر سکتے۔ خصوصیت کے ساتھ جب یہ رومانیت ہمارے یہاں جذباتیت کی حدود سے باہر نکلتی ہے تب تو اسکی اہمیت کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی کے ابتدائی افسانے رومانیت کے اس نئے رجحان کو پیش کرتے ہیں۔

ندیم۔ اردو افسانہ ۳۵ء تک جو تھا اس میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان میں دو لکھنے والے بہت نمایاں ہیں عصمت اور منٹو۔

وقار عظیم۔ اس میں احمد علی۔ حیات اللہ انصاری۔ بیدی اور ندیم بھی شامل ہیں۔

ندیم۔ ان پر اگر ایک نظر ڈال لی جائے تو یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اس دور تک افسانہ کہاں پہنچ چکا ہے۔

عبادت بریلوی۔ حیات اللہ انصاری اور احمد علی کے ہاں ایک خاص قسم واقعیت اور حقیقت نگاری REALISM ہے۔

وقار عظیم۔ یہ رجحان تو ہر افسانہ نگار کے ہاں ہے کہ وہ زندگی کو ایک خاص قسم کی حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھتا ہے ـــ مثلاً کرشن چندر کے افسانے کشمیر اور بمبئی سے متعلق ہیں ـــ منٹو بمبئی کے متعلق لکھتے ہیں ـــ ندیم پنجاب کی عکاسی کرتے ہیں۔ بیدی کے افسانوں کے کردار لاہور میں سانس لیتے ہیں۔

انتظار حسین۔ اس طرح دو گروہ پیدا ہو جاتے ہیں کرشن، ندیم، جن کا انداز تحریر شاعرانہ ہے۔ دوسرے احمد علی، منٹو۔

ندیم۔ مجھے احمد علی اور منٹو میں بڑا فرق نظر آتا ہے، مثلاً احمد علی کے "ہماری گلی" اور "قید خانہ" میں بڑی مجرد قسم کی انفرادیت ہے۔

وقار عظیم - لیکن ان سب نے ایک محدود دائرے میں رہ کر یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ بین الاقوامی حالات کا اثر ہمارے ماحول پر کیا ہے۔ خصوصاً منٹو اور کرشن نے۔ یہ بات پہلے نہیں تھی۔

عبادت بریلوی - احمد علی اور حیات اللہ انصاری کی حقیقت نگاری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔؟

وقار عظیم - وہ ایک خاص ماحول سے باہر نہیں نکلتے، عصمت بھی ایک خاص ماحول کی عکاسی کرتی ہیں ——— وہ ماحول جس کی تفصیلات کا انہیں اچھی طرح علم ہے۔

عبادت بریلوی - لیکن منٹو اور ندیم کے ابتدائی افسانوں میں بین الاقوامی حالات اور سیاسی شعور کا کوئی گہرا اثر نہیں ہے۔

وقار عظیم - یہ ممکن ہے، ندیم کے انداز بیان میں شعریت گھُلی ہے اور وہ دیہاتی فضا کو سیدھے سادے رنگ میں پیش کرتے ہیں، لیکن جہاں وہ سپاہی کا ذکر کرتے ہیں وہاں الیبر جنگ کے اثرات ضرور واضح ہیں۔

ندیم - سوال یہ ہے کہ منٹو کے ابتدائی افسانوں میں بھی جو وسعت اور بین الاقوامیت کی فضا ہے اس کا وجود کیسے ہوا۔ ان کے فن کے ابتدائی زمانہ میں موضوع اور مواد کے اعتبار سے وسعت کیسے پیدا ہوئی۔

منٹو - اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو افسانہ نگار سمجھا ہے، میں نے بہت سے تجربے کئے ہیں جس میں سے کچھ میں تو ناکام رہا ہوں اور کچھ میں کامیاب ———

ندیم - میرے خیال میں اس کے کچھ مادّی وجوہ بھی ہیں مثلاً مطالعہ ——— مغربی افسانوں کے تراجم ——— وغیرہ۔

عبادت بریلوی - اصل بات تو یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کے متنوع پہلوؤں سے قریبی تعلق بھی رکھا ہے اور ان میں گھل مل کر انہیں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہی زندگی سے قربت ہے اور اسکی ترجمانی کا سبب بھی یہی ہو سکتا ہے۔

منٹو - لیکن میں زندگی کو جیسے دیکھتا ہوں اس کا ویسا اظہار نہیں کرتا بلکہ میں زندگی کو جیسے دیکھنا چاہتا ہوں اس کا اظہار کرتا ہوں ——— اور یہی آرٹسٹ کا نقطۂ نظر ہونا چاہیئے۔ میں نے اپنے افسانے "خوشیا" میں ایک بھڑوے کی کہانی لکھی ہے، اشک نے کہا بھڑوا ایسا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے جواب دیا کہ ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو لیکن یہ ضرور ممکن ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد تم بھڑوے بن جاؤ ——— یا یہ بھی ممکن ہے کہ بھڑوا میں ہی ہوں ———؟

افسانہ نگار کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ ایک چیز لکھے اور وہی آپ کو زندگی میں بھی مل جائے ——— وہ ہر کمی کو FILL UP کرتا چلا جاتا ہے ———

وقار عظیم - اب تک ہم نے اپنے افسانہ کے ارتقا کی ان ابتدائی منازل کا جائزہ لیا ہے جن سے اُردو افسانہ گذرا ہے۔ اس وقت تک بعض رجحانات واضح طور پر نمایاں ہو چکے تھے۔ مثلاً واقعیت کی طرف توجہ، اور یہ چیز سب سے پہلے پریم چند نے شروع کی، پریم چند کے اثر سے لکھنے والوں نے اس اسلوب کو اپنایا ——— اس کی مثالیں ہمیں اعظم کریوی، علی عباس حسینی اور پھر احمد ندیم قاسمی کے ابتدائی افسانوں میں نمایاں طور پر ملتی ہیں۔

اس کے علاوہ انہیں میں کچھ لوگ ایسے ہوئے جنہوں نے دیہاتوں کو چھوڑ کر شہروں کو اپنا موضوع بنایا مثلاً حامد اللہ افسر اور دا منشا الخیری وغیرہ لیکن ان میں سب سے نمایاں نام عظیم بیگ چغتائی کا ہے، ان سب افسانہ نگاروں کے یہاں ہمیں زندگی سے گہرا ربط نظر آتا ہے۔

دوسرا گروہ سجاد حیدر یلدرم اور اُن کے متبعین کا ہے، ان کے افسانے زندگی سے متعلق ضرور ہیں لیکن زیادہ تر رومانی کیفیات کے ترجمان ہیں ——— مثلاً حجاب امتیاز علی اور ل احمد اکبر آبادی۔ یہ زندگی اور رومان دونوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

بعض لوگ ان دونوں گروہوں سے متاثر ہوئے مثلاً سدرشن کے ہاں پریم چند اور یلدرم دونوں کا اثر ہے۔

تیسرا گروہ جو ان سے الگ ہے ترجمہ کرنے والوں کا ہے ان لوگوں نے رومانی رجحان کو دور کرنے کی کوشش کی۔ یہ زندگی کو فن کے ساتھ لے چلنے کے قائل تھے۔ مثلاً خواجہ منظور۔ (ان کا کوئی مجموعہ نہیں چھپا)۔ اس اثر کے تحت بعض لوگوں نے موپساں کے اور بعض نے چینی افسانوں کے ترجمے کئے ——— ان میں مولانا ظفر علی خاں، منٹو، حامد علی خاں، منصور احمد جیسے لوگ شامل ہیں۔

اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ موجودہ روایت پر پریم چند کی روایت، یلدرم کی روایت اور ترجمے کرنے والوں کا انداز مجموعی طور پر اثر انداز ہوا۔

پریم چند اور یلدرم کے بعد والے دور میں اعظم کریوی اور علی عباس حسینی کے نام بہت نمایاں ہیں اس لئے ہمیں انہی سے بحث

کا آغاز کرنا چاہیئے۔

عبادت بریلوی۔ علی عباس حسینی اور اعظم کریوی نے پریم چند کے انداز کو اپنایا ہے، لیکن حسینی کے افسانوں میں انسانی نفسیات کے نمونے بھی ملتے ہیں۔

وقار عظیم۔ پریم چند اور حسینی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پریم چند کا نقطۂ نظر سیاسی تھا۔ حسینی کی راہ اس سے مختلف ہے۔

عبادت بریلوی۔ اسی طرح اعظم کریوی کے ہاں زندگی کی ترجمانی میں نفسیات کی گہرائی شامل نہیں، ان کے پاس ایک سیدھا سادا بیان ہے۔

حمید اختر۔ پریم چند کا اندازِ فکر ایک خاص قسم کا تھا حسینی کے یہاں بعض اور چیزیں بھی ملتی ہیں مثلاً محبت کی FRUSTRATION اور ازدواجی زندگی کی ناکامی۔

عبادت بریلوی۔ حسینی نے وقت کے بدلتے ہوئے رجحانات کا بڑا ساتھ دیا ہے۔ موجودہ دور میں بھی وہ افسانے لکھ رہے ہیں اور آج کے مسائل کو برتنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے ہاں خالص رومانی نقطۂ نظر کے علاوہ واقعیت اور حقیقت نگاری کے رجحان نمایاں ہیں ان کے افسانوں میں جو شدت ہے (گو یہ بعد میں پیدا ہوئی ہے) سیاسی نہیں لیکن اس میں سماجی درد اور کسک ضرور ہے۔

وقار عظیم۔ ایک چیز اور بھی ہے اور وہ یہ کہ پریم چند نے اپنے فن کے ہر دور میں راہنما کی حیثیت قائم رکھی۔ علی عباس حسینی ایسا نہیں کر سکے۔ لیکن یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ وہ ہر صنف کا ساتھ دیتے رہے۔

عبادت بریلوی۔ ایک بات اور علی عباس حسینی کے ہاں یہ محسوس ہوتی ہے کہ ان کے پاس زندگی کے بارے میں کوئی بہت واضح اور قطعی نقطۂ نظر نہیں ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ ایک طرح کے انسانیت پرست (HUMANIST) اور اصلاح پسند ہیں۔

وقار عظیم۔ اصل میں ان کی نظر ان مسائل پر ہے جو بالکل ان سے قریب ہیں۔ وہ یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ ان حالات کے پیچھے کیا حقائق کام کر رہے ہیں۔

عبادت بریلوی۔ حسینی صاحب کو میں ذاتی طور پر بھی جانتا ہوں وہ چونکہ سرکاری ملازم رہے ہیں اس لئے کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکے جو قابلِ گرفت ہو۔ شاید اسی وجہ سے ان کے افسانوں میں وہ شدت نظر نہیں آتی اور وہ جارحانہ انداز نہیں ملتا جس کی تخلیق انقلابی شعور کے ہاتھوں ہوتی ہے۔

حمید اختر۔ حسینی اور پریم چند میں فنی اعتبار سے بھی بڑا فرق موجود ہے۔ حسینی کے پاس قاری کو ساتھ MOVE کرنے کی اپیل نہیں ہے پریم چند کے ہاں یہ بات پائی جاتی ہے۔

عبادت بریلوی۔ حسینی صاحب کے بعض افسانے ہیئت اور ٹکنیک کے اعتبار سے بڑے مکمل ہیں مثلاً "انسپکٹر کی عید" بڑا ترشا ہوا افسانہ ہے، اور اس طرح کے بہت سے افسانے انہوں نے لکھے ہیں۔

ندیم۔ یہی بات "میلہ گھومنی" میں ہے۔

وقار عظیم۔ ایک اور افسانہ "رفیقِ تنہائی" بھی مجھے بہت پسند ہے۔ اس میں غالباً اردو میں جانوروں کے بارے میں بالکل نئی چیز ہے۔ اس میں بیان، ادبیت اور شعریت ہے —— اس کے مقابلے میں پریم چند فن کے معاملہ میں شروع شروع میں بڑے لاپروا ہیں۔ پھر انہیں بیان پر بھی اتنی قدرت نہیں تھی۔ اس معاملے میں علی عباس ان سے بہت آگے ہیں۔

عبادت بریلوی۔ حسینی صاحب کو ہیئت پر پوری قدرت ہے، وہ ٹکنیک اور دوسرے فنی لوازمات کو سمجھتے ہیں اور میرے خیال میں تو وہ ایک باشعور لکھنے والے ہیں۔ شاید اسکی وجہ ان کا گہرا مطالعہ ہے اسی مطالعہ نے انہیں افسانے کا نقاد بھی بنا دیا ہے —— مغربی افسانے کی روایات کو اسی وجہ سے وہ پوری طرح سمجھتے ہیں۔ اس کا اثر ان کے افسانوں کی ٹکنیک میں بھی جھلکتا ہے۔

وقار عظیم۔ حسینی صاحب کو ہر پرانی چیز سے محبت ہے۔ اور انہوں نے زندگی کے آداب، اور آپس کے تعلقات کو افسانوں میں بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔

عبادت بریلوی۔ ایک اور بات یہ ہے کہ ساری ٹکنیک کو سمجھنے کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ہر ایک کی بات سنتے اور مانتے ہیں۔ ٹکنیک کے تنوع کا جو شعور ان کے ہاں ملتا ہے وہ اسی صورتِ حال کا نتیجہ ہے۔

وقار عظیم۔ اس وقت فن کا واضح شعور لکھنے والوں میں پیدا ہو گیا تھا اور اس وقت افراد کی طرف توجہ شروع ہو گئی تھی۔

عبادت بریلوی۔ حسینی صاحب کے ساتھ ہی دوسرا نام اعظم کریوی کا آتا ہے۔ ہمیں ان کے فن کا بھی جائزہ لینا چاہیئے۔

وقار عظیم۔ ان کے افسانوں میں رومانی کیفیت زیادہ غالب ہے، مثلاً وہ دیہات کے متعلق لکھتے ہیں تو انہیں زیادہ کشش اس چیز میں معلوم ہوتی ہے کہ ساون میں عورتیں کیا لباس پہنتی ہیں۔ کون سے گانے

گاتی ہیں۔ وغیرہ۔

ندیم - انہوں نے تاریخی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔

وقار عظیم - اسکی وجہ پریم چند کا اثر ہے،

عبادت - اعظم کریوی کے ہاں فن کے ارتقا کا پتہ نہیں چلتا ——— وہ زندگی کو جس طرح دیکھتے ہیں اسی طرح بیان کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک فطرت نگار NATURALIST کہے جا سکتے ہیں۔

حمید اختر - زندگی کے بارے میں پریم چند کا جو نقطۂ نظر ہے وہ نہ حسینی کے پاس ہے نہ اعظم کریوی کے پاس۔ پریم چند تو اکثر اوقات انقلابی مصنفین کی طرح لکھتے ہیں۔

وقار عظیم - اور یہ چیز نئے لکھنے والوں کو روایت کی طرح ورثہ میں ملی ہے۔ پھر نئے لکھنے والوں کو مغربی ادب سے بڑا تعلق ہے مثلاً احمد علی اور کرشن چندر کے افسانوں میں مشرقی روایت اور مغربی اثر دونوں کا نمایاں اثر نظر آتا ہے۔

عبادت بریلوی - اس دور کے لکھنے والوں میں ہم نے ابھی تک عظیم بیگ چغتائی کا مرتبہ متعین نہیں کیا۔ حالانکہ اردو افسانے کو جذباتی رومانیت سے نکالنے اور حقیقت و واقعیت سے ہمکنار کرنے میں وہ بہت نمایاں رہے ہیں۔

حمید اختر - چغتائی نے افسانوں میں سے رومانیت ——— پسندی کو کم کیا ہے۔

وقار عظیم - ایک خاص بات جو طرزِ بیان سے متعلق ہے ہمارے ہاں ہمیشہ سے بڑی اہم روایت رہی ہے یہ ہے کہ کہانی کو کہانی سمجھنا چاہیئے، اس روایت کو نئے دور میں عظیم بیگ نے زندہ کیا ہے۔

عبادت بریلوی - مجموعی طور پر ان کے پاس مختصر افسانہ کے فنی لوازم پوری طرح نہیں ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے بہت واضح ہیں۔ ان میں وحدتِ تاثر کا احساس بھی کم ہوتا ہے، لیکن سماجی حالات کی ترجمانی میں انہوں نے اپنے طنزیہ انداز سے جو ایک جارحانہ انداز پیدا کیا ہے وہ بالکل نیا ہے۔ اور اس نے اردو افسانے میں نئی راہیں کھولی ہیں۔

وقار عظیم - ٹھیک ہے۔ ہم انہیں فن کار کی حیثیت سے بڑا افسانہ نگار نہیں سمجھتے لیکن عظیم بیگ کا یہ بڑا احسان ہے کہ انہوں نے لکھنے والوں کو محض اصلاح کے راستے سے ہٹا کر نئے طریقے سے سوچنے کا اسلوب دیا۔ بعد کے افسانہ نگاروں کے ہاں ظرافت اور طنز کا جو عنصر ہے وہ چغتائی کے اثر کا نتیجہ ہے۔

عبادت بریلوی - اس کا مطلب یہ نکلا کہ عظیم بیگ کے اثرات دانستہ یا نادانستہ طور پر ہمارے نئے لکھنے والوں پر نمایاں ہیں۔ عظیم بیگ کے بعد جو نئے افسانہ نگار آئے وہ سب کے سب کسی نہ کسی حد تک چغتائی کی فن کاری کے جارحانہ انداز سے متاثر نظر آتے ہیں۔

وقار عظیم - اب ہمیں بات کو آگے بڑھانا چاہیئے۔

عبادت بریلوی - جی ہاں، اب تو ہمیں منٹو، عصمت، بیدی، اشک، کرشن چندر، احمد علی اور حیات اللہ انصاری میں سے ہر ایک کی خصوصیات کے ساتھ یہ دیکھنا چاہیئے کہ انہوں نے نئے تجربوں سے ہماری روایت میں کیا اضافے کئے۔ مثلاً سب سے پہلے منٹو کو لیجئے۔ اُن کے یہاں موضوعات میں تنوع ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ صرف دو تین موضوعات پر پوری طرح حاوی ہیں۔ دوسرے موضوعات میں وہ لشارت نہیں۔

مثلاً طوائف کی زندگی کی انہوں نے ایسی جزئیات پیش کی ہیں جس سے گھن آتی ہے۔ اور یہ ایک سماجی خدمت ہے۔ لیکن بعض جگہ جنسی موضوعات پر لکھتے وقت وہ بھٹک گئے ہیں ——— مثلاً ٹھنڈا گوشت ———

وقار عظیم - یہ بعد کا ہے اس لئے ابھی اس کا ذکر بے محل ہے۔

ندیم - میرے خیال میں ان کی تخلیقات اتنی ہیں کہ انہیں بھی دو ادوار میں تقسیم کر لیا جائے تو بہتر ہے۔

حمید اختر - اختر حسین رائے پوری کس دور میں آتے ہیں۔ ؟

وقار عظیم - وہ عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

عبادت بریلوی - افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کا کوئی بڑا مرتبہ نہیں۔ ان کے بیشتر افسانے یا تو ترجمے ہیں یا مغربی افسانوں سے ماخوذ ہیں ——— زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں ایک رومانی سی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس سے قبل بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ انہوں نے اس میں کوئی جدت نہیں کی۔

ہاجرہ مسرور - میرزا ادیب کس دور میں رکھے جائیں گے ؟

وقار عظیم - ان کا انداز یلدرم اور حجاب امتیاز علی کا ہے۔ ان میں ایسی رومانیت ہے جو کھوکھلی ہے بلکہ اس رومانیت کو بھی آگے لے جانے کی بجائے پیچھے لے گئے ہیں۔

ہاجرہ مسرور - کرشن چندر کے کونسے افسانے ہیں جن میں ذہنی لذتیت

ہے ؟

عبادت بریلوی - ابھی ہم ان کا ذکر نہیں کر رہے ہیں۔

انتظار حسین - میرے خیال میں منٹو صاحب اور قاسمی صاحب کے تقسیم کے بعد کے افسانوں پر ہمیں الگ بحث کرنی ہو گی۔

ندیم - انتظار صاحب کی بات ٹھیک ہے۔ تقسیم کے بعد لکھنے والوں میں بعض بڑی نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس لئے پہلے یہ متعین کر لینا چاہیئے کہ ۱۹۴۷ء تک افسانے میں کیا تجربے ہوئے اور اس وقت روایت نے کیا شکل اختیار کی تھی۔

عبادت بریلوی - ۱۹۴۷ء کے بعد جو کچھ ہوا اس کا جائزہ بعد میں لیں گے۔ اس وقت تو صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان اُردو افسانہ کن منزلوں سے گزرا اور اس میں کون کون سے تجربے ہوئے ؟ (ہاجرہ مسرور سے مخاطب ہو کر) آپ کی منٹو کے بارے میں کیا رائے ہے ؟

ہاجرہ مسرور - آپ حضرات فرمائیں۔ مجھے تو ان کے بارے میں سوچتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔

وقار عظیم - مجھے منٹو کی تکنیک میں جو چیز شروع سے کھٹکتی ہے یہ کہ وہ ہمارے سیاسی اور سماجی عقائد اور ہماری اخلاقی قدروں کے خلاف ایسی بات کہنا چاہتے ہیں جو پڑھنے والے کو SHOCK دے۔ وہ نئی بات کے بجائے غیر متوقع بات کہتے ہیں۔ اور چونکہ آدمی ذہین ہیں اس لئے وہ بات پیدا بھی کر لیتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی یہ بات اتنی غیر متوقع ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن اس سے بغاوت کرتا ہے۔

انتظار حسین - ان کی تخلیق کا تصوّر یہ ہے کہ جو چیز ہے اسے کہا جائے کہ نہیں ہے، ـــــ یہ رویّہ تخلیق کے لئے بہت مہلک ہے۔ چیزوں سے انکار کرنے سے بات نہیں بنتی۔

ندیم - وہ FANTASY اور جھوٹ دونوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔

حمید اختر - یہاں تک کہ اب ان کا مقصد صرف چڑھانا رہ گیا ہے۔ شروع کے افسانوں میں یہ بات نہیں ہے۔ پہلے انہوں نے بڑے پیارے رومانی افسانے بھی لکھے ہیں۔ یہ چیز انہوں نے آہستہ آہستہ DEVELOPE کی ہے۔

وقار عظیم - یہاں مجھے ایک لطیفہ یاد آیا ـــــ ایک دن منٹو اور اشک اپنے اپنے فن پر بحث کر رہے تھے، ایک صاحب ثالث بنے اور انہوں نے بتایا کہ یوں تو دونوں میز پر رکھی ہوئی دیا سلائی کے متعلق لکھتے ہیں لیکن اشک کی نظر دیا سلائی پر سیدھی جاتی ہے اور منٹو میز کے نیچے سے نظر گھما کر دیا سلائی کو دیکھتا اور اُس پر لکھتا ہے۔

اصل میں منٹو پڑھنے والے کو حیرت زدہ کرنا چاہتا ہے۔

حمید اختر - یہ بات کبھی بہت بڑی ہو جاتی ہے اور کبھی کچھ نہیں رہتی۔

عبادت بریلوی - شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ منٹو کے ہاں زندگی کی کشمکش کا کوئی صحیح اور واضح شعور نہیں۔

ندیم - میرے خیال میں اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ شدید قسم کے انفرادیت پسند ہیں۔ اور ایسے شخص میں غصّہ، ضد اور جھنجھلاہٹ ہوتی ہے۔ اُنہوں نے ہمیشہ ضد میں لکھا ہے اور مقدمے چلائے جانے کی وجہ سے لکھا ہے، اور کہتے ہیں کہ تم اگر "کالی شلوار" سے چڑھتے ہو تو میں "ٹھنڈا گوشت" لکھ کر پریشان کرونگا۔

وقار عظیم - انہوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ زندگی طرح طرح کی اُلجھنوں میں پھنسی ہوئی ہے، انہیں گرد و پیش کی زندگی کا صحیح احساس نہیں ہے، وہ فرد سے آگے بڑھ کر سوچنا نہیں چاہتے۔

عبادت بریلوی - ان کے افسانوں میں دو چیزیں خاص طور سے نمایاں ہیں ایک تو افراد کی مصوّری دوسرے سماج کے بعض خاص پہلوؤں کا ذکر۔ لیکن ایسے نقطۂ نظر سے جس کے اندر زندگی کا کوئی طبقاتی اور تجزیاتی شعور نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ان کے افسانوں میں ایک ایسی حقیقت نگاری ملتی ہے جس میں فوٹوگرافی نظر آتی ہے مصوّری نہیں۔

وقار عظیم - یہ رجحان اس دور میں عام ہے کہ کردار کی ذہنی کیفیت اور جزئیات کے ذریعے فضا پیدا کی جائے مثلاً اشک خاصی تفصیل سے لکھتے ہیں اور افسانے کو خوبی کے ساتھ ختم کر دیتے ہیں۔ منٹو ماحول سے پوری طرح واقف ہیں اور ان جزئیات سے وہ خاص چیزیں نکال لیتے ہیں، جو قاری کو متاثر کرتی ہیں۔

ہاجرہ مسرور - آخر وہ قاری کو تاثر کیا دیتے ہیں۔

عبادت بریلوی - انسانی زندگی کی بدحالی اور سماجی مذموماتـــ کا تاثر، ان کے افسانوں میں بڑا گہرا اثر ہوتا ہے ـــــ مثلاً طوائف کی زندگی کا دوسرا رُخ ـــــ اس سے قبل تو طوائف کو صرف تعیش کے زاویے سے دیکھا جاتا تھا۔

منٹو اس کے انسانی پہلو کو پیش کرتے ہیں اور اس سے پڑھنے والے کو نفرت نہیں پیدا ہوتی، بلکہ ہمدردی کا جذبہ جاگتا ہے۔ اور یہ صورتِ حال اسے ایک غلط سماجی نظام کی پیداوار نظر آتی ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ سارے دَور کی کیفیت ہے۔ اس میں دو طبقے ہیں EXPLOITED اور EXPLOITER طوائف اول اول ایک مظلوم کی حیثیت سے پیش کی گئی ہے۔

حمید اختر ۔ آپ دس سال کا عرصہ ملا رہے ہیں، ان کے ابتدائی افسانوں کے پڑھنے سے جو ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے CONVINCING ہے لیکن آخری کہانیوں میں ضد وغیرہ کی وجہ سے گھن پیدا ہوتی ہے۔

عبادت بریلوی ۔ گھن پیدا کرنا مقصد براری ہے۔ یہاں منٹو مقصدی ہو جاتا ہے۔ یہ اس کا بڑا CONTRIBUTION ہے۔ اگر اس سماجی شعور کے ساتھ طبقاتی احساس بھی پیدا ہو جاتا تو وہ اس دَور کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہوتا۔ لیکن وہ ان مسائل کا کوئی حل نہیں پیش کر سکا۔ وہ اس کا شعور بھی پوری طرح نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں ان مسائل پر جھنجلاہٹ تو ہے لیکن سائنٹیفک زاویۂ نظر نہیں ہے۔

حمید اختر ۔ منٹو گندگی کو اُچھالتے ہیں لیکن اس کا کوئی مداوا نہیں پیش کرتے۔

وقار عظیم ۔ ان کا تعلق موضوع کے ساتھ جذباتی نہیں ذہنی ہے۔

شوکت تھانوی ۔ کیا ان کے افسانوں کو پڑھ کر یہ تاثر نہیں ہوتا کہ ایک سرجن نے آپریشن کر کے چھوڑ دیا ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار بدرو ہو گیا ہو۔

عبادت بریلوی ۔ یہ تو ان کی بڑائی ہے اس طرح وہ پڑھنے والے کو اپنی طرف زیادہ متوجہ کرتے ہیں۔ اور اس سے ان کا مقصد بھی پورا ہوتا ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ طوائف کے بارے میں تو ہُوا لیکن "بو" اور اسی قبیل کے دوسرے افسانوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟

وقار عظیم ۔ یہ ایک ذہنی تعیش اور بے بسی کی نشانی ہے۔

ناصر حلیم ۔ ان کی کہانی "پھاہا" کیا اس صف میں آتی ہے؟

انتظار حسین ۔ "پھاہا" اُن کا ابتدائی افسانہ ہے اور اس کے رجحان کی مذمت نہیں کی جا سکتی۔

عبادت بریلوی ۔ اس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ منٹو کا فن دو رجحانات کا حامل ہے۔ ایک رجحان تو وہ ہے جس میں سماجی مذمومات کا بیان ہے لیکن ذہنی تعیش نہیں ——— دوسرا وہ جس کی نوعیت نفسیاتی ہے اور جس میں وہ جنسی موضوعات کو پیش کرتے ہیں ——— دوسرے رجحان میں صحت مندانہ کیفیت نہیں ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ چیزیں شروع میں ہیں لیکن آگے چل کر ختم ہو جاتی ہیں۔

عبادت بریلوی ۔ منٹو صاحب "ٹھنڈا گوشت" وغیرہ نہ لکھتے تو یہ ان کی بڑائی ہوتی۔

ہاجرہ مسرور ۔ یہ تو تقسیم کے بعد کا افسانہ ہے۔

وقار عظیم ۔ ایک بات منٹو میں مستقل ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے افسانے کو پیش اس طرح کیا ہے کہ ہر جگہ فن کے لوازمات کا خیال رکھا ہے۔ تکنیک کی پابندی، افسانہ کے مختلف اجزا کا ربط اور مجموعی تاثر ہر منزل پر اس کا احساس ان کے ہاں ملتا ہے۔ فن کے لحاظ سے یہ بڑی کامیابی ہے۔

انتظار حسین ۔ مختصر افسانے کی تکنیک پر منٹو پوری طرح حاوی ہیں لیکن ادب محض تکنیک بھی تو نہیں اس سے باہر نکل کر دیکھیں تو ان کے افسانوں کی اتنی وقعت نہیں رہتی۔

وقار عظیم ۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اچھی فنی تخلیق کے لئے جس انہماک، کاوش اور جد و جہد کی ضرورت ہوتی ہے وہ منٹو کے پاس نہیں ہے۔

محمد طفیل ۔ اب تو وہ کہتے ہیں کہ آپ ایک فقرہ لکھ دیجئے میں افسانہ آگے چلا کر مکمل کر دونگا۔ اس طرح ایک افسانہ تو لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن فن کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔

عبادت بریلوی ۔ ہاں وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ انہیں زندگی کا بڑا گہرا تجربہ ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میری زندگی میں افسانے بھرے پڑے ہیں۔ یہ خود اعتمادی زندگی کے وسیع تجربے ہی کا نتیجہ ہے۔

ندیم ۔ اس دَور کے افسانوں کے تین CONTRIBUTIONS ہیں۔

۱ ۔ اچھوتے موضوعات کو فن کا موضوع بنانا۔

۲ ۔ افسانے کی تکنیک۔

۳ ۔ سلاستِ بیان۔

میں منٹو کے ساتھ بیدی کو بھی اس زمرے میں رکھتا ہوں۔

وقار عظیم ۔ بیدی بعض حیثیتوں سے منٹو سے آگے ہے بیدی فنکار کی

حیثیت سے لغزش کرنا گناہ سمجھتا ہے۔

انتظار حسین۔ ایک اور فرق بھی ہے، منٹو نے روسی افسانوں سے زیادہ اثر نہیں لیا۔ امریکی افسانوں سے لیا ہے، مثلاً O. HENRY بیدی نے روسی افسانوں سے اثر لیا ہے۔ روسی افسانہ امریکی افسانے سے بہت آگے ہے اسی طرح بیدی کی ادبی وقعت منٹو سے بڑھ جاتی ہے۔

عبادت بریلوی۔ منٹو بعض وقت زندگی کے حقائق کا مضحکہ بھی اُڑاتے ہیں۔ اس کا اثر اچھا نہیں ہوتا۔ اگر وہ سماجی نظام کو سمجھتے اور اس کی بنیاد طبقاتی شعور پر ہوتی تو شاید وہ ایسا نہ کرسکتے۔

وقار عظیم۔ یہ تو وہی ضد والی بات ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ لوگ بیدی کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں حالانکہ وہ بہت بڑے افسانہ نگار ہیں۔

وقار عظیم۔ نہیں صاحب یہ نہ کہیئے کم از کم میں نے تو مختلف وقتوں میں جتنی ان کی تعریف کی ہے کسی مسلمان نے کسی سکھ کی کم ہی کی ہوگی،

(قہقہہ)

عبادت بریلوی۔ ایم اسلم کا بھی افسانہ میں کوئی مقام ہے یا نہیں؟

انتظار حسین۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم آگے سے پیچھے کی طرف چلیں۔

وقار عظیم۔ اگر ایم اسلم کا ذکر کرنے لگیں تو بہت سے اور لوگوں کا ذکر کرنا ہوگا۔ ایم اسلم اصل میں بنیادی طور پر ناول نگار ہیں۔

محمد طفیل۔ لیکن انہوں نے تقسیم سے پہلے زیادہ تر افسانے لکھے ہیں ناول بعد میں لکھے ہیں۔

شوکت تھانوی۔ صاحب میرے خیال میں تو پارٹیشن کی وجہ یہی ہے۔ (قہقہہ)

عبادت بریلوی۔ ایم اسلم کے ساتھ یہ بہت زیادتی ہے کہ ہم افسانوں میں ان کا ذکر نہیں کرتے۔ ہم ان کے رطب و یابس کو (جو میر کے کلام میں بھی ہے) نکال دیں تو ان کے پاس بھی ایسے افسانے ملیں گے جو تکنیک کے اعتبار سے اور فطرت نگاری کے اعتبار سے خاصے ہیں، ان کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ بسیار نویس اور زود نویس ہیں۔ اور اسی نے انہیں نقصان پہنچایا ہے۔

انتظار حسین۔ لیکن روایت اور تجربے کی بحث میں ان کا ذکر غالباً بے محل ہے۔

ندیم۔ اگر اردو کی مختصر افسانہ نگاری کا جائزہ مدِنظر ہوتا تو ایم اسلم کا نام ضرور ہوتا لیکن روایت اور تجربے کے سلسلہ میں ان کا ذکر بر محل نہیں۔

وقار عظیم۔ انہوں نے ایسے وقت کہ روایت بہت آگے بڑھ چکی ہے پرانی روایت کو برتا اس لئے آج کی گفتگو میں اُن کا تذکرہ بے محل ہے۔

شوکت تھانوی۔ اُن کی حیثیت اس گھڑی کی ہے جو پچھلی صدی میں بند ہو گئی۔ (قہقہہ)

محمد طفیل۔ عبادت صاحب اُس بند گھڑی کو پھر چالو کرنے کی کوشش میں ہیں، معلوم ہوتا ہے تحریری گناہ بخشوائے جا رہے ہیں۔

وقار عظیم۔ میرے خیال میں اب ہمیں بیدی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ مجھے خود بیدی اتنا پسند ہے کہ اگر میں اُردو کے پانچ چھ افسانوں کا انتخاب کروں تو اس میں بیدی کا افسانہ ضرور آئے گا۔ ان کے پاس بڑی تعداد ایسے افسانوں کی ہے جنہیں عظیم کہا جاسکتا ہے۔

عبادت بریلوی۔ وہ ہمارے اندر گھل مل کر ہماری جذباتی اور ذہنی اُلجھنوں کی اعلیٰ درجہ کی تصویریں پیش کرتا ہے۔ اس کے پاس انقلابی رجحان نہیں ہے۔ لیکن وہ ان چھوٹے چھوٹے موضوعات کو لیتا ہے۔ جنہیں ہم نظر انداز کر دیتے ہیں اور اس کے افسانوں میں HUMAN TOUCH بھی بڑا شدید ہے۔

وقار عظیم۔ اس کے یہاں فنی اعتبار سے بڑی بلندی ہے، منٹو تخیل اور فکر کو موضوع میں رچاتا نہیں، یہ چیز بیدی کے یہاں بدرجہ اُتم ہے۔ وہ اس غور و فکر کے ساتھ دل نشین زاویے اور شکلیں پیش کرتا ہے کہ صرف بیان کی قدرت کے علاوہ اس کے پاس کوئی خامی نظر نہیں آتی۔

عبادت بریلوی۔ اس کے پاس نکھرا ہوا انداز اور ترشا ہوا فن ہے بیان پر قدرت نہ ہونے کے باوجود وہ اپنے موضوع میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس موضوع کو مختصر افسانے کے سانچے میں ڈھالنا اس کے لئے مشکل نہیں ہوتا۔

خدیجہ مستور۔ بیدی کا فن یہ ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹا موضوع اس چابکدستی اور گہرائی سے پیش کرتا ہے کہ قاری چونک اُٹھتا ہے۔

وقار عظیم۔ مجیب صاحب جو روسی ادب کے بہت اچھے طالب علم اور افسانہ نگار بھی ہیں۔ جب بیدی کے افسانوں کا مجموعہ "دانہ و دام" چھپا تو بغل میں دبائے پھرتے تھے اور کہتے تھے میں نے آج تک اُردو میں اتنا اچھا مجموعہ نہیں دیکھا، روسی افسانہ نگاروں کا جتنا گہرا اثر

بیدی کے ہاں ہے اور کسی کے یہاں نہیں۔

انتظار حسین - اس کے لہجے کی آہستگی بہت متاثر کرتی ہے منٹو کا افسانہ پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نقارہ بج رہا ہے، بیدی کے افسانے میں عام اپیل کم ہے اور منجھے ہوئے ادبی ذوق کی زیادہ ضرورت ہے۔

ہاجرہ مسرور - یہ عجیب بات ہے کہ بیدی سے زیادہ مقبولیت کرشن چندر نے حاصل کی۔

خدیجہ مستور - یوں تو ایم اسلم کرشن چندر سے زیادہ مقبول ہیں۔

انتظار حسین - کرشن چندر اور منٹو کا انداز ایک سا ہے وہ عام قاری کو زیادہ متاثر کر سکتے ہیں۔

عبادت بریلوی - بیدی کے مقابلے میں کرشن چندر کی مقبولیت کا سبب اور بھی ہے - اگرچہ بیدی کا انداز اور لہجہ کی آہستگی صحیح ہے۔ لیکن گہرے سماجی روابط کا شعور بیدی کو کم ہے - ان کے ہاں زندگی کی عکاسی ضرور ہے لیکن زندگی کی تنقید کم۔ کرشن چندر کے یہاں باوجود رومانیت کے یہ شعور زیادہ ہے۔

ہاجرہ مسرور - سوال یہ ہے کہ کیا مختصر افسانہ زندگی پر تنقید ہے۔

حمید اختر - ایک چیز اور بھی ہے کہ کرشن چندر اور منٹو نے بیدی سے بہت زیادہ لکھا ہے۔

عبادت بریلوی - یہ تو ایم اسلم کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔

انتظار حسین - "یہ سماجی روابط کے شعور" کا فقرہ ذرا گمراہ کن ہے۔ بیدی کے پاس سماجی روابط کا تانا بانا زیادہ مضبوط ہے۔

حمید اختر - کرشن چندر واضح بات کرتا ہے جس سے تھوڑا پڑھے ہوئے بھی متاثر ہو جاتے ہیں اس طرح اس کے قارئین کا حلقہ بڑھ جاتا ہے۔ اعلیٰ ادبی ذوق والے کم ہیں جو بیدی سے متاثر ہو سکیں۔

عبادت بریلوی - بیدی کے ہاں انداز بیان میں اُلجھن ہے اور ان کے افسانوں میں زیادہ حرکت نہیں ہے۔ بلکہ ایک سست روی ہے۔ یہ حرکت کرشن چندر کے یہاں بہت زیادہ ہے۔ اس لئے اس کے افسانوں کا اثر بیدی کے مقابلے میں گہرا ہوتا ہے۔

انتظار حسین - یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی — او۔ ہنری بڑا سادہ نگار ہے - چیخوف نہیں ہے۔ لیکن چیخوف زیادہ بڑا فنکار ہے۔

عبادت بریلوی - شگفتگی اور روانی تاثر کو گہرا کرتی ہے۔ بیدی کے افسانوں کی مقبولیت میں شگفتگی اور روانی کی یہ کمی حائل نظر آتی ہے۔

وقار عظیم - اس کے بجائے بیان کی قدرت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

انتظار حسین - کرشن چندر کے ہاں صحافتی انداز پیدا ہو گیا ہے اس لئے وہ قاری کے ذہن کو جلدی گرفت میں لے لیتا ہے۔

عبادت بریلوی - یہ بات غلط ہے۔ کرشن چندر کے پاس بڑا خوبصورت انداز بیان ہے۔ اس اعتبار سے وہ علی عباس حسینی کو چھوڑ کر اردو کے باقی تمام افسانہ نگاروں سے آگے ہے۔ اس کے پاس صحافت کو بھی ادب بنا دینے کا جادو ہے۔

وقار عظیم - بیدی کے موضوع اتنے متنوع نہیں جتنے کہ کرشن چندر کے ہیں۔ لیکن جتنا کچھ انہوں نے لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس مشاہدہ کی گہرائی ضرور ہے۔ کرشن چندر کی مقبولیت میں ان کے طرز بیان اور طرز بیان کی شاعری کو بڑا دخل ہے۔ اس سے قطع نظر بیدی بڑا افسانہ نگار ہے۔

عبادت بریلوی - میرا مطلب یہ ہے کہ بیدی محدود ہو کر سوچتے ہیں، ان کے یہاں احساس کی شدت ہوتی ہے لیکن گہرائی نہیں ہوتی۔ وہ جن مسائل کے بارے میں لکھتے ہیں ان کے افسانوں میں ان کا کوئی حل نہیں ملتا۔

وقار عظیم - کرشن چندر باتیں زیادہ کہتے ہیں - پھیل کر کہتے ہیں۔ گہرائی تو بیدی کے پاس ہے البتہ وسعت نہیں۔ انہوں نے اپنے گرد و پیش کی زندگی کو دیکھا ہے اور اسی کو اتنا کافی سمجھا ہے کہ وہ اور چیزوں کے محتاج نہیں۔ کرشن چندر جس چیز کو سماجی شعور کہتے ہیں وہ کہیں کہیں پروپیگنڈا بن گئی ہے۔

انتظار حسین - اسکی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک خاص تحریک کی طرف سے اپنے اوپر ایک فرض عائد کر لیا ہے۔

مدیر - یوں تو ہر افسانہ نگار نے اپنے اُوپر کچھ نہ کچھ فرائض عائد کر لئے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ آواز اس کے دل کی آواز ہے یا خارجی تحریک کا اثر۔

عبادت بریلوی - کرشن چندر کا خلوص اس سے ظاہر ہے کہ وہ رومانی ہے اگر پراپیگنڈسٹ ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔

انتظار حسین - یہ بحث ختم کیسے ہوگی۔

شوکت تھانوی - مزید بحث سے پہلے مجھے اجازت دیجئے۔

عبادت بریلوی - کچھ اشک کے بارے میں!

وقار عظیم - وہ پریم چند کے مقلد ہیں۔ تفصیلات اور جزئیات میں زیادہ جاتے ہیں۔

خدیجہ مستور۔ ان کے افسانوں میں بڑی ناپختگی ہے۔

وقار عظیم۔ انہیں یہ اندازہ نہیں کہ تفصیلات میں سے کون سی چیزیں منتخب کرکے کام میں لانی چاہئیں۔ وہ ONE ACT PLAYS اچھے لکھتے ہیں۔

محمد طفیل۔ اتنے اچھے کہ اردو کا کوئی بڑا سے بڑا افسانہ نگار بھی اُن کے مقابل کھڑا ہوتے ہوئے ہچکچائے گا۔

عبادت بریلوی۔ اس دور کے لکھنے والوں میں تیسرا نام عصمت چغتائی کا ہے۔ ان کے افسانوں میں دو رجحان ملتے ہیں۔ ایک تو جنسی زندگی کے ایسے پہلو جن کی کوئی سماجی اہمیت نہیں مثلاً نوجوان لڑکیوں کے ایسے مسائل جو ذہنی اُلجھنوں کے پیدا کردہ ہیں اور جن کو پیش کرتے ہوئے کہیں کہیں خالص رومانی اور جذباتی سی فضا بھی پیدا کرتی ہیں —— دوسرے وہ افسانے جن میں انہوں نے متوسط طبقے کی نوجوان لڑکیوں کے جنسی اور جذباتی مسائل کو موضوع بنانے کی کوشش کی ہے دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں رجحانات نے اردو افسانے میں کیا اضافے کئے ہیں؟

وقار عظیم۔ عصمت کا فن اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ صرف ایک عورت ہی اسے پیش کر سکتی ہے۔ عصمت کا بڑا اضافہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں بتایا کہ عورت کے بھی اپنے مسائل ہیں۔ دوسری بڑی بات سماجی شعور ہے۔ انہوں نے یو۔پی کے متوسط طبقے کے خاندانوں کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اور اس میں جو پیچیدگی اور گھٹن ہے اسے بڑے لطیف اور انشترزنی کے انداز میں پیش کیا ہے۔

عبادت بریلوی۔ لیکن انہوں نے بعض ایسی کہانیاں بھی لکھی ہیں جس میں ایک سستی قسم کی رومانیت پیدا ہو گئی ہے۔

وقار عظیم۔ اس کی وجہ کچھ یہ بھی ہے کہ ان کے مزاج میں تمسخر کا رنگ ہے۔

عبادت بریلوی۔ اس میں ان کا اپنا جذبہ اور خواہش بھی شریک دکھائی دیتی ہے۔ اور یہ اس معاشرہ کا تمسخر معلوم ہوتا ہے جس نے انہیں گھٹن اور مجبوری میں رکھا۔ لیکن ان باتوں کو موضوع بنانے میں کیا ان پر رشید جہاں کے افسانوں کا اثر نہیں ہے۔

وقار عظیم۔ رشید جہاں اور عصمت میں بڑا فرق یہ ہے کہ رشید جہاں نے ماحول کی عکاسی زیادہ نہیں کی۔

انتظار حسین۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے افسانہ نگار خواتین کا گروپ ممتاز شیریں کو چھوڑ کر یو۔پی میں پیدا ہوا۔ اور یہ لغاوت یو۔پی میں ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ انہیں اپنے معاشرتی ماحول کا پورا احساس ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ خدیجہ مستور اور قرۃ العین حیدر اسی کڑی میں آتی ہیں۔

عبادت بریلوی۔ قرۃ العین حیدر کا مزاج ان سب سے الگ ہے ان کا نام ان کے ساتھ نہ لیجئے۔

انتظار حسین۔ ہاں ان کی کچھ دوسری شکل ہے۔

محمد طفیل۔ بھیا، تم کس پھیر میں پڑ گئے یہاں بات شکلوں کی نہیں، افسانوی تخلیقات کی ہو رہی ہے۔ (قہقہہ)

عبادت بریلوی۔ عصمت چغتائی نے مختصر افسانے کی تکنیک کو اچھی طرح سمجھا اور اسے توازن اور ہم آہنگی سے پیش کیا۔ اس سلسلے میں ان کا اندازِ بیان خاصے کی چیز ہے۔ انہیں زبان پر بڑی قدرت ہے۔ بے ساختگی اور روانی نے ان کی تکنیک پر بڑا اچھا اثر ڈالا ہے۔ وہ تصویریں جو انہوں نے پیش کی ہیں بڑی واضح ہیں۔ ان میں معنویت اور مقصدیت بھی ہے۔ اور وہ بڑی دلآویز اور دلنشیں بھی ہیں۔

وقار عظیم۔ ایک اور بات یہ کہ وہ بڑی بے جھجک ہیں۔ انہیں کسی کے عتابِ تعزیر کا خوف نہیں۔

عبادت بریلوی۔ لیکن ان کی یہ شدت، تیزی، جارحانہ کیفیت اور بے باکی کہیں کہیں حد سے گزر جاتی ہے اور متوازن قسم کے انسان پر اچھا اثر نہیں کرتی۔

وقار عظیم۔ یہ تو عمر کا تقاضہ بھی ہوتا ہے۔ سنجیدگی کی کمی توازن کی کمی کا سبب بن جاتی ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ عبادت صاحب نے جو حد سے گزرنے کی بات کی ہے تو میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ وہ حدود کیا ہیں؟

وقار عظیم۔ حدود تو کوئی نہیں لیکن لکھنے والے کے پاس ایک مقصد ہوتا ہے۔ اب اگر وہ بیان میں اتنی شدت پیدا کر دے کہ ہمدردی کے بجائے جھنجھلاہٹ پیدا کرنے لگے تو ٹھیک نہیں۔

انتظار حسین۔ غالباً عبادت صاحب کے ذہن میں یو۔پی کا قاری ہے۔

ندیم۔ میرے خیال میں عبادت صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ہر گھرانے اور ملک میں چند سماجی قدریں ہوتی ہیں جن کا توڑنا گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

ہاجرہ مسرور۔ میں نے یہ بات اس لئے کی کہ ہم نے پہلے منٹو پر بحث کی تھی۔ اُن کا انداز کہیں زیادہ خطرناک اور پھیلاؤ ان کے ہے۔

عبادت بریلوی۔ منٹو کا انداز مختلف ہے، سماجی مذموات کے

بیان میں ان کی اپنی ذہنی کیفیت شامل نہیں لیکن عصمت کے ہاں ان کی اپنی کیفیت شامل ہو جاتی ہے۔ عصمت کے فن کا جو مجموعی تصور ہمارے سامنے ہے اس میں اگرچہ زندگی کی بڑی اچھی عکاسی ہے لیکن کہیں کہیں ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ دانستہ سے ہٹ کر ایک والہانہ جوش اور جذبے میں انہوں نے جگہ جگہ ایسی باتیں بھی کہہ دی ہیں جس سے فن کے کارگہہ شیشہ گری کو ٹھیس لگتی ہے۔ شاید اس کی وجہ ان کی نوجوانی اور نوجوانی کی ذہنی جذباتی کیفیات ہیں جن کو ایک مخصوص ماحول نے دبا کر ابھرنے کے لئے مجبور کر دیا ہے۔

انتظار حسین۔ یہ بات تو کرشن چندر اور اس دور کے دوسرے لکھنے والوں پر بھی عائد ہو سکتی ہے۔

وقار عظیم۔ بچہ فطری طور پر شرارت پسند ہوتا ہے، آپ اسے روکتے ہیں تو وہ اور راستے ڈھونڈھ لیتا ہے۔ چیخنے سے منع کئے جانے پر وہ دیواریں سیاہ کرنے لگتا ہے۔

عبادت بریلوی۔ عصمت باشعور انقلابی نہیں ہیں۔ ان کے یہاں ایک باغی کی جھنجلاہٹ ہے۔ یہ خصوصیت ان کے ہر افسانے میں جھلکتی ہے۔

وقار عظیم۔ بہر حال آپ انہیں روکتے ہیں تو وہ چٹکیاں لینے لگتی ہیں۔

ندیم۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اردو افسانہ کی جوش ملیح آبادی ہیں۔ (قہقہہ)

ہاجرہ مسرور۔ عصمت چغتائی نے جن مسائل پر لکھا ہے ان کے لئے یہ انداز لازمی ہے، مثلاً انہوں نے مردوں کے رانیں کھجانے کا ذکر کیا ہے۔ اب اس کے لئے وہ اور کیا لکھ سکتی ہیں۔ اور یہ بات تہذیب کے دائرے میں کس طرح لائی جا سکتی ہے۔

عبادت بریلوی۔ اسے جانے دیجئے اور ان کی فقرہ بازی اور پھبتیاں اچھالنے کو پیش نظر رکھیئے۔

وقار عظیم۔ ان کی فقرہ بازی میں بڑی تلخی محسوس ہوتی ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ اس سلسلے میں "لحاف" کا ذکر ضرور ہونا چاہیئے۔ عصمت نے اس میں بنیادی غلطی یہ کی ہے کہ اسے بچے کی زبان سے پیش کیا ہے اسی لئے وہ گھناؤنا سا ہو گیا ہے۔ اندازِ بیان غلط تھا لیکن موضوع ضروری تھا۔

عبادت بریلوی۔ اس کا مجموعی تاثر فن کار کی اپنی دلچسپی اس معاملے میں ضرور ظاہر کرتا ہے۔ اور یہ اس افسانے کی سب سے بڑی خامی ہے۔ اور اس کا بنیادی مقصد اس طرح فوت ہو جاتا ہے۔

انتظار حسین۔ میرے خیال میں تو عصمت نے صحیح انداز اختیار کیا NARRATOR بالغ ہوتا تو یہ بات زیادہ گھناؤنی ہوتی۔ یہ INDIRECT ہے۔ بچے کے بیان سے یہ بات ہم تک پہنچ گئی اور اس میں عریانی نہیں رہی۔

عبادت بریلوی۔ عریانی بالکل نہ سہی لیکن مجموعی تاثر میں مذموم کیفیت کا اظہار نہیں ہو سکا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پڑھنے والا اس میں خود لذت محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور یہ خصوصیت اس افسانے کو خاصا خطرناک بنا دیتی ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ اس میں لذت نہیں محسوس ہوتی۔

ندیم۔ قاری لذت محسوس کرتا ہے۔ اگر وہ بچے کے بجائے بالغ NARRATOR کے ذریعے پیش کرتیں تو افسانہ کامیاب ہوتا۔

خدیجہ مستور۔ اور جس عورت کے ساتھ یہ واقعات ہو رہے ہیں اس سے ہمیں ہمدردی نہیں ہوتی افسانے میں چٹخارا ہے —— یقین نہیں آتا کہ "چوتھی کا جوڑا" کا افسانہ نگار ایسا افسانہ بھی لکھ سکتا ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ میں نے تو موضوع سے بحث کی تھی۔

عبادت بریلوی۔ اس افسانے کے موضوع کی اہمیت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ خرابی ہماری معاشرت میں موجود ہے۔ کاش عصمت اس اہم موضوع کو اس طرح پیش کرتیں کہ اس کا اثر اس سے نفرت کی صورت میں نمایاں ہوتا۔ لیکن اس افسانے نے تو اس موضوع سے دلچسپی لینے کی ترغیب دی ہے۔ عصمت کا وار اس طرح خالی جاتا ہے۔ وہ خود اس کا شکار ہو جاتی ہیں۔

انتظار حسین۔ احمد ندیم قاسمی کے ذریعے اردو افسانے میں ایک نئی چیز آئی اب تک یو۔پی کے علاقے کی ترجمانی ہوتی تھی لیکن اردو داں حلقہ پنجاب کے کرداروں سے واقف نہیں تھا۔ اب یہ بات اور ہے کہ ندیم صاحب نے اسے DEAL کیسے کیا۔ ان میں خامی یہ ہے کہ وہ پنجاب کی فضا پر شاعری کا پردہ ڈال لیتے ہیں۔ وہ حقائق کو رنگین عینک سے دیکھتے ہیں۔

عبادت بریلوی۔ جس چیز کو انتظار صاحب خامی کہتے ہیں میں اسے ان کے فن کا ضروری جزو سمجھتا ہوں، یو۔پی اور پنجاب کی

فضا میں بڑا فرق ہے۔ پنجاب کے دیہات کی فضا رومانی ہے۔ یہاں کے پہاڑوں میں رومان ہے، دریاؤں میں رومان ہے، کھیتوں میں رومان ہے۔ غرض یہ کہ ساری فضا پر رومانی کیفیت چھائی ہوئی ہے ندیم صاحب جب اس فضا کو پیش کرتے ہیں تو رومان کا رنگین پردہ از خود ان کے فن پر پڑ جاتا ہے۔ یہ شعوری نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکھڑی اکھڑی سی نہیں معلوم ہوتی —— اس رومانی فضا میں تو وہ پنجاب کی روح کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان کی یہ رومانیت فن کو حقیقت سے قریب کرتی ہے۔

انتظار حسین ۔ لیکن خود ندیم صاحب کے بعض افسانے ایسے ہیں جن میں یہ پردہ نہیں ہے۔ بلونت سنگھ کے افسانے بھی ایسے ہیں۔ اور اس پردہ کے بغیر ہم چیزوں کو زیادہ قریب سے دیکھ سکتے ہیں۔

عبادت بریلوی ۔ ابتدائی دور میں ان کے افسانوں کی خاصی تعداد ایسی ہے جن کا نقطۂ نظر تمام تر رومانی ہے۔ شاید ان کی نوجوانی نے اس خصوصیت کو پیدا کیا ہے، بعد میں حقیقت نگاری کی طرف ان کا رجحان بڑھنے لگا ہے۔

ہاجرہ مسرور ۔ ابتدائی دور سے آپ کی کیا مراد ہے۔ ان کے مجموعے "بگولے" کے افسانے "خربوزے" میں تو کوئی رومان نہیں۔

محمد طفیل ۔ یہ افسانہ "بگولے" میں نہیں، "آنچل" میں ہے۔

عبادت بریلوی ۔ ان کا پہلا مجموعہ "چوپال" ہے۔ اس کے بیشتر افسانوں میں رومانی فضا ہے۔

وقار عظیم ۔ یہ دور ہی حقیقت نگاری اور رومانی ادوار کے بین بین ہے۔ اس وقت یہ دونوں چیزیں ہماری روایت کا جزو بن چکی ہیں۔ بعد میں ندیم صاحب کے افسانوں میں واقعیت رومان پر غالب آگئی ہے۔ وہ ایک خاص حد تک اس فضا کا ذکر کرتے ہیں اس کے بعد نہیں۔

عبادت بریلوی ۔ ان کے شعور میں ارتقائی کیفیت ہے، اب ان کے پاس حقیقت نگاری REALISM کا بڑا رچا ہوا انداز ملتا ہے، جس کو ان کے بڑھتے ہوئے سماجی شعور نے پیدا کیا ہے۔

وقار عظیم ۔ لیکن اس سماجی نوعیت کے باوجود وہ اس رومانی فضا کو نظر انداز نہیں کرتے۔

عبادت بریلوی ۔ آج سے سات آٹھ سال پہلے وہ یہ فضا قائم نہ کرتے تو ان کے یہ افسانے اجڑے اجڑے سے نظر آتے۔ اس فضا نے ان کے فن میں بڑی جان پیدا کی ہے۔ اس فضا نے ان کے افسانوں کو واقعیت سے قریب کیا ہے۔

انتظار حسین ۔ لیکن احمد علی نے اسی زمانے میں اور قسم کے رنگ میں افسانے لکھے ہیں۔

محمد طفیل ۔ کیا ہم اسے خرابی کے بجائے ایک اسلوب کا درجہ نہیں دے سکتے؟

ندیم ۔ اس سلسلے میں میں انتظار صاحب اور وقار صاحب سے متفق ہوں۔ ابتدا میں رومانیت اتنی شدت اختیار کر گئی کہ واقعیت دب گئی ہے۔

وقار عظیم ۔ اس میں لطف ضرور آتا ہے لیکن مجموعی تاثر دب گیا ہے۔ دوسرے لکھنے والوں نے زندگی سے گہرا ربط ضرور رکھا ہے لیکن فن سے شاید نہیں۔ ندیم صاحب اس دور کے واحد افسانہ نگار ہیں جنھوں نے فن اور زندگی کو ساتھ ساتھ چلایا ہے۔

عبادت بریلوی ۔ ان کے ہاں بڑا توازن اور مسلسل ارتقائی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ کہیں بہکے نہیں ہیں۔ انھوں نے زندگی اور فن کے امتزاج کی ایک صحت مند روایت قائم کی ہے۔

ندیم ۔ اُردو افسانے کی ساری روایت مجھ پر بیت چکی ہے۔ میں نے ابتدا داستانوں سے کی ہے۔ فنی حیثیت متعین کرنا آپ لوگوں کا کام ہے۔

انتظار حسین ۔ قاسمی صاحب کے فسادات کے بارے میں افسانوں میں خامی یہ ہے کہ وہ بڑے جذباتی ہو گئے ہیں۔

وقار عظیم ۔ یہ بات تو فسادات کے بارے میں جتنے لوگوں نے لکھا ہے سب میں موجود ہے۔ وقت گذرنے پر ہی اس میں اعتدال پیدا ہو سکا۔ یہ خرابی کرشن چندر، بیدی، عصمت اور حیات اللہ انصاری میں بھی ہے۔

عبادت بریلوی ۔ ندیم صاحب نے تفصیل اور جزئیات کو مختصر افسانے میں بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ اس سے ایک فضا بھی پیدا ہوئی ہے ایک ماحول بھی وجود میں آیا ہے۔ ندیم صاحب اسی فضا اور ماحول کے افسانہ نگار ہیں۔

وقار عظیم ۔ اسکی وجہ یہ بھی ہے کہ افسانہ نگار کو قدرت ہے کہ وہ دس جملوں کی بات کو ایک جملے میں ادا کر سکتا ہے۔

محمد طفیل ۔ اور یہ بھی کہ ایک جملے کی بات کو دس جملوں میں بھی ادا کر سکتا ہے۔

وقار عظیم ۔ خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور دونوں کے ابتدائی دور میں

عصمت چغتائی کا اثر ضرور ہے شعوری یا غیر شعوری طور پر۔ یہ شاید احساسِ کمتری کا نتیجہ ہو۔ لیکن عصمت کا ماحول ان سے مختلف ہے، عصمت کا ماحول علی گڑھ کے آس پاس ہے۔ اور ان کے پاس لکھنؤ کا ماحول ہے۔ عصمت میں جو انتقام کا جذبہ ہے وہ ان کے یہاں نہیں ہے۔

عبادت بریلوی۔ ابتدائی دَور کے افسانوں میں ان کے یہاں ایک طرح کا احساسِ شکست بھی ہے اور اس میں عصمت والی بلندی نہیں ہے۔

وقار عظیم۔ اسکی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ عصمت نے اپنے آپ کو گھریلو شکنجوں سے نکال لیا تھا اور یہ ایسا نہیں کر سکی تھیں۔

ہاجرہ مسرور۔ میرے خیال میں اگر ہم دونوں بہنوں پر صرف اس لئے ایک ساتھ بات کی جاتی ہے کہ ہم بہنیں ہیں۔ تو بڑی زیادتی ہے۔

ندیم۔ ان دونوں کے فن میں بھی بڑا فرق ہے، خدیجہ کے افسانوں میں آہستہ روی اور سہج سہج قدم رکھنے کا انداز ہے، ہاجرہ کے افسانوں میں عصمت کی تیزی اور شوخی بھی ہے۔

وقار عظیم۔ یہ تو مزاجوں کا فرق ہے۔

انتظار حسین۔ خدیجہ کے یہاں مرثیہ کی فضا ہے۔ لیکن ہاجرہ کے یہاں طنز ہے۔

عبادت بریلوی۔ ان دونوں کو زبان پر بڑی قدرت ہے۔ ان کے بیان کی روانی اور طرزِ ادا کی بے باکی نے ان کے افسانوں میں زندگی پیدا کی ہے۔

وقار عظیم۔ قرۃ العین میں اور ان میں یہ فرق ہے کہ ایک نے مسوری میں زبان سیکھی ہے اور انہوں نے لکھنؤ میں۔

انتظار حسین۔ قرۃ العین کے پاس امام باڑے کی زبان نہیں بلکہ نئے لکھنؤ اور وہ بھی کافی ہاؤس کی زبان ہے۔

عبادت بریلوی۔ لیکن اب مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہاجرہ اور خدیجہ کے پاس موضوعات ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے انداز میں بھی اب وہ شگفتگی نہیں رہی۔

ندیم۔ میرے خیال میں موجودہ دور میں ان کا فن زیادہ وسیع اور بلند ہو گیا ہے۔

عبادت بریلوی۔ میں بالکل ابتدائی دَور سے مقابلہ نہیں کر رہا ہوں بلکہ کچھ عرصے پہلے کی بات کر رہا ہوں۔

وقار عظیم۔ بیان وغیرہ کی حد تک تو آپ کی بات ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن زندگی کی باشعور ترجمانی تو اب ہی ہے۔ ایک کمی ضرور ہے کہ پہلے بیان کا انداز بے ساختہ تھا۔ اب اسے بنانے سنوارنے کی کوشش میں روانی میں کمی آ گئی ہے۔ اور تھوڑا سا تصنع پیدا ہو گیا ہے۔

عبادت بریلوی۔ میرے خیال میں اب ان کے یہاں لکھنے کی URGE اس شدت کے ساتھ نہیں ہے۔ زندگی کا شعور ضرور ہے۔ لیکن جب URGE ہی نہیں ہو گی تو شعور تخلیق میں کس طرح معاونت کر سکے گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے موضوعات ختم ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

انتظار حسین۔ ہر دَور میں ایک مزاج ہوتا ہے، پہلے وہ INNER URGE کے تحت لکھتی تھیں اب ایک خاص تحریک کے ماتحت لکھتی ہیں تو وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔

ندیم۔ ہاجرہ مسرور کے دو افسانے "صدمہ" اور "بجالو" تازہ ترین اور بڑے کامیاب افسانے ہیں۔

عبادت بریلوی۔ انتظار صاحب نے یہ بات ایک تعصب کے تحت کہی ہے۔ کسی تحریک کے ماتحت ہو کر لکھنا تو بڑی اچھی بات ہے۔ بشرطیکہ اس تحریک کا ذہن و شعور پر خاطر خواہ اثر ہو۔

ندیم۔ خدیجہ مستور کا افسانہ "بینوں لے چلے بابلا" مختصر اور بڑے DISPASSIONATE انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ان دونوں کی تخلیق کی رفتار میں کمی آ گئی۔ اور شاید اسی کے باعث خامیاں پیدا ہو گئیں۔

عبادت بریلوی۔ میرا خیال یہ ہے کہ زندگی میں اگر فن کار کو سکون مل جائے تو تخلیقی صلاحیتیں سونے لگتی ہیں —— ہاجرہ اور خدیجہ آج اسی سکون سے دوچار ہیں۔ ان کے موضوعات ختم ہو گئے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے افسانوں میں جان نظر نہیں آتی۔ اب ان کے فن کو زندہ کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ وہ بچوں کے بارے میں لکھیں۔ کیونکہ آج وہ زندگی کی انہیں منزلوں سے دوچار ہیں۔

ہاجرہ مسرور۔ صاحب بڑی مشکل ہے کہ آپ لوگ ہماری گھریلو زندگی دیکھ لیتے ہیں اور پھر نسخہ تجویز کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔

وقار عظیم۔ اس سے پہلے جو نام ہم نے لئے ہیں ان میں دیوندر ستیارتھی اور خواجہ احمد عباس کے نام رہ گئے ہیں۔ ہمیں ایک نظر ان پر بھی ڈال لینی چاہیئے۔ دیوندر ستیارتھی میں ایک بات ہے جو کسی افسانہ نگار میں نہیں۔ دوسرے افسانہ نگار فضا سے متاثر ہیں یا انہوں نے

پریم چند کی پیروی کی ہے لیکن ستیارتھی نے لوک گیتوں کے سلسلے میں سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور ان گیتوں کے تانے بانے سے کہانیاں تیار کی ہیں اس طرح ان کی کہانیوں میں بڑی رنگا رنگی ملتی ہے۔ انہوں نے اس رنگینی کو بڑے تنوع کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا موضوع افسانے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ البتہ انہوں نے فنی لوازمات کا زیادہ خیال نہیں رکھا ہے۔

عبادت بریلوی۔ "لال دھرتی" افسانہ انہوں نے کافی چابکدستی سے لکھا ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ میرے خیال میں تو اس میں بڑا تصنع ہے انہوں نے خواہ مخواہ لال رنگ سے لڑکی کی بلوغت کو تعبیر کیا ہے، یہ چیز غیر قدرتی سی لگتی ہے۔ فنی حیثیت سے یہ کامیاب افسانہ نہیں ہے۔

وقار عظیم۔ جی ہاں فنی نقطۂ نظر سے ان کا انداز عموماً بڑا لااُبالی ہوتا ہے۔

عبادت بریلوی۔ وہ جس پس منظر کے متعلق لکھ رہے ہیں شاید اسے ہم یہاں بیٹھ کر اچھی طرح محسوس نہیں کر سکتے لیکن انہوں نے جس ماحول کے بارے میں لکھا ہے اُس پس منظر میں وہ خاصا مؤثر نظر آتا ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ لیکن وہ اسے کسی اور انداز سے بیان کر سکتے تھے۔ انہوں نے ایک جگہ لڑکی کے کھڑاؤں پر گھوم جانے کا ذکر کیا ہے۔ یہ بات بڑی مصنوعی ہے۔

عبادت بریلوی۔ یہ اصل میں اس بات کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ماحول سے یہ ماحول قدرے مختلف ہے۔

انتظار حسین۔ لیکن ہم ایسے افسانے بھی تو پڑھتے ہیں جن کا ماحول ہم نے نہیں دیکھا لیکن افسانہ نگار ہمیں پوری طرح CONVINCE ضرور کرتا ہے۔ مثلاً ڈی ایچ لارنس کے میکسیکو کے بارے میں افسانے۔

عبادت بریلوی۔ مجھے اس سے اختلاف نہیں لیکن یہاں بات فن کی نہیں رہ جاتی یہ تو ماحول کی عکاسی کی بات ہے۔ ستیارتھی اس عکاسی میں کامیاب ہیں۔

وقار عظیم۔ لکھنے والے کا کمال یہی ہے کہ وہ ایسی فضا پیدا کرے کہ پڑھنے والا اجنبیت محسوس نہ کرے اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو یہ اسکی کمزوری ہے۔ ہاں یہ ستیارتھی کی خصوصیت ہے کہ انہوں نے مختلف دیہاتوں کی فضا کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانے میں رنگوں کی بڑی اہمیت ہے۔ جہاں کہیں انہوں نے بسنت میں یو۔ پی کے دیہاتوں کا ذکر کیا ہے تو زردی کا ذکر بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے اور رنگ ہی سے پس منظر بنایا ہے۔ ان کے اندازِ بیان اور سوچنے پر ٹیگور کا گہرا اثر ہے اور وہ اپنے کرداروں سے بڑی محبت کا اظہار کرتے۔ ان میں ہر ایک کو اپنانے کی خواہش بدرجۂ اُتم ہے۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں مجھے بڑا تصنع محسوس ہوتا ہے۔ دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں انداز بدلتا رہتا ہے مثلاً کرشن چندر پہلے رومانی تھے پھر بدل گئے۔ لیکن احمد عباس کا زندگی کے متعلق ایک خاص قسم کا نکتۂ نظر ہے جو سیاسی ہے وہ ایک خاص قسم کی قومیت کے حامی ہیں اور اس طرح وہ جو فضا بناتے ہیں اس میں تصنع کا احساس ہوتا ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ قومی احساس بُری بات نہیں ہاں اسے پیش کرنے میں خامی رہ سکتی ہے۔

وقار عظیم۔ فن کا اصل مقصد یہ نہیں کہ آپ اس کے محاسن سے لطف اندوز ہوں فن کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہمارا احساس دوسرے کا احساس بن جائے۔ اگر یہ تصنّع معلوم ہونے لگے تو مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

عبادت بریلوی۔ خواجہ احمد عباس اپنے افسانوں میں زیادہ حقیقت نگار ہو جاتے ہیں اور اسی وجہ سے ہم شاید اسے محسوس کرتے ہیں کہ وہ کافی بے باک ہیں۔ افسانے کے بنیادی اصولوں کا کم خیال رکھا ہے ـــــ شاید اس لئے بھی کہ وہ صحافی ہیں اور ان کی تحریروں پر صحافت کا خاصا اثر ہے۔ اسے ہم تصنع نہیں کہہ سکتے۔ صاف گوئی کہہ سکتے ہیں۔ بے باکی کہہ سکتے ہیں۔ سیدھا سادا انداز کہہ سکتے ہیں۔

وقار عظیم۔ ہم کسی نتیجے پہنچنے کے لئے ایک منطق قائم کرتے ہیں جب تک یہ بات نہ ہو ہماری بات سے کوئی متأثر نہ ہوگا۔ افسانہ کی منطق اس سے کچھ مختلف ہے جو چیز زندگی میں حقیقت ہے وہ افسانے میں تصنّع بن جاتی ہے۔ افسانوی حقیقت کے لئے ہمیں بڑے جوڑ توڑ کرنے پڑتے ہیں۔ احمد عباس اس میں پورے نہیں اُترتے شاید اس لئے کہ صحافی ہیں۔

محمد طفیل۔ ان کا صحافی ہونا کوئی عیب نہیں ہونا چاہیئے۔ بعض افسانہ نگار

صحافی نہیں ہیں۔ لیکن ان کی تحریروں میں صحافتی رنگ جھلکتا ہے —
اس سلسلے میں کسی حد تک کرشن چندر تک کا نام لیا جا سکتا ہے۔
ہاجرہ مسرور۔ مجھے ان کا ایک افسانہ یاد آتا ہے۔ ایک آدمی یادداشت
کھو چکا ہے اور ریل میں سفر کر رہا ہے۔ ہندو اس سے پوچھتے ہیں کہ
وہ کون ہے۔ مسلمان بھی یہی پوچھتے ہیں — یہ بڑا مصنوعی لگتا ہے۔
کیونکہ اس زمانے میں تو لوگوں نے قومیت اور مذہب معلوم کرنے کے
بڑے انوکھے ڈھنگ ایجاد کر رکھے تھے۔
وقار عظیم۔ اصل میں اس وقت یہ رجحان تھا کہ فسادات کے بارے
میں جو لکھا جائے اُس میں ہندو اور مسلمان دونوں کے ساتھ پورا انصاف
کیا جائے۔ کرشن چندر نے بھی ایسا کیا ہے لیکن ان کے بیان کا لوچ
اس پر پردہ ڈال دیتا ہے۔
محمد طفیل۔ میرے خیال میں اس موقعہ پر اختر اورینوی کا بھی ذکر
ہونا چاہیئے۔
عبادت بریلوی۔ ان کے ساتھ اختر انصاری کا بھی۔
وقار عظیم۔ ان کا ذکر شروع میں ہونا چاہیئے تھا۔ یہ دونوں افسانہ نگار
مظلوموں کی حمایت کرتے ہیں۔ اختر اورینوی کے ہاں کسانوں اور
شہروں کے متعلق افسانے ہیں۔ یہ افسانے انہوں نے ایسے دَور میں
لکھے ہیں جب لوگ فیشن کے طور پر ان کا ذکر کرتے تھے۔ ان کے پاس
صحیح ہمدردی اور محبت ہے۔
عبادت بریلوی۔ اختر انصاری کے افسانوں کو بڑے غور سے
دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اُن کے افسانے اُردو میں نفسیاتی تجزیے
کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں ایک فضا کا قیام اور ایک سماں بندی
ملتی ہے۔ ان کے پاس عوام سے ہمدردی کا عنصر تو نہیں ہے البتہ
متوسط طبقہ کی ذہنی اُلجھنوں کا خاص طور پر ذکر ہے۔ اس سے
جو نتائج نکل سکتے ہیں اس کو انہوں نے بڑی مہارت سے لکھا ہے۔
وقار عظیم۔ اختر انصاری نے ایسی کہانیاں لکھی ہیں جن میں افراد
کی ذہنی کیفیتوں کی عکاسی ہے (مثلاً ان کے مجموعۂ "نازو" میں) اُنہوں
نے اس بات پر زور دیا ہے کہ حالات سے ان پر کیا اثر پڑتا ہے اور
اس کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے۔ یہ بات اس دَور کے لکھنے والوں میں
نہیں تھی۔
عبادت بریلوی۔ ان کے کردار پریشان، سراسیمہ اور کٹھ پُتلیوں
کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں کے ہاتھوں وہ ایک فضا قائم کرتے
ہیں۔ لیکن یہ فضا پڑھنے والے پر کس انداز میں اثر انداز ہوتی ہے۔
کاش انہیں اس کا بھی اندازہ ہوتا! ان کی قائم کی ہوئی فضا بہاؤ
اور تھکی ہوئی سی نظر آتی ہے اور اس بات کا احساس وہ اتنی
شدت سے دلاتے ہیں کہ پڑھنے والا اس میں پھنس جاتا ہے۔
وقار عظیم۔ شاید اسکی وجہ یہ ہے کہ جب سے انہوں نے زندگی کی
گہما گہمی میں قدم رکھا ہے FRUSTRATED رہے ہیں۔
چونکہ ان کی اپنی زندگی میں مایوسی ہے اس لئے وہی مایوسی ان
کے کرداروں پر حاوی ہے۔ وہ کسی مصیبت سے نکلنے کی کوشش
نہیں کرتے ہاں اس طرح کی زندگی میں انسان کو جن کیفیتوں سے
سابقہ پڑتا ہے ان کی عکاسی بڑی صفائی سے کرتے ہیں۔
ندیم۔ اُردو افسانے کی تکنیک میں اختر انصاری کی CONTRIBUTION
اتنی ہے کہ ان کا نثر لکھنے کا انداز بڑا خوبصورت سلیس اور سادہ ہے۔
منٹو کے مقابلے میں ان کا اندازِ بیان بڑا دلکش ہے، ان کے چند
افسانے (مجموعہ نازو) خاصے مشہور اور کامیاب ہیں۔ لیکن ان کا
کوئی اسلوب DEVELOPE نہیں ہو سکا۔ اور مجھے یہ محسوس
ہوتا ہے کہ وہ صرف متوسط طبقے کے نوجوان کی زندگی ہی پیش نہیں
کرتے بلکہ ایسے موضوعات پر لکھتے ہیں جن کے بارے میں انہیں
علم نہیں ہوتا۔ ایسا کرشن چندر نے بھی کیا ہے۔
عبادت بریلوی۔ جس ترقی پسندی کی طرف اُنہوں نے پلٹا کھایا ہے
وہ اصل میں ان کا مزاج نہیں ہے۔
وقار عظیم۔ یہ بعد کا دَور ہے ترقی پسندی کا CRAZE اس
کی وجہ ہے۔
عبادت بریلوی۔ ان کے افسانہ "دریا کی سیر" میں کئی کردار ہیں
اس میں انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ
کیا ہے۔ اور یہ ان کا مخصوص انداز ہے۔
وقار عظیم۔ یہ وہ زمانہ ہے جب پریم چند کا اثر بہت گہرا ہے حتیٰ کہ
حسینی بھی اس سے متاثر ہیں۔ اس زمانے میں اختر انصاری نے
انفرادیت پسندی کا ثبوت دیا اور اپنا رنگ الگ رکھا۔
عبادت بریلوی۔ ہر چند کہ ان کا نقطۂ نظر صحت مندانہ نہیں ہے
لیکن انہوں نے ایک نئے انداز کی بنیاد ضرور رکھی ہے۔ اختر اورینوی
نے زندگی اور معاشی کشمکش پر بڑے عمدہ افسانے لکھے ہیں۔
مثلاً "کلیاں اور کانٹے"۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ وہ نتیجہ کوئی نہیں
نکال پاتے، اس معاملہ میں اگر اسی دَور کے دوسرے افسانہ نگاروں
کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بہت آگے بڑھ گئے ہیں

لیکن اختر اورینوی جس فلسفۂ حیات کے قائل ہیں وہ انہیں آگے بڑھنے
کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ ان پر بلا مقصد مذہب کا اثر ہے۔
ندیم۔ اختر اورینوی کے افسانوں میں حقیقت پسندی اور تصنّع کا
بڑا عجیب امتزاج ہے۔
عبادت بریلوی۔ جب تک انسان کے پاس زندگی کی کشمکش کا صحیح
شعور نہ ہو وہ اسی طرح بھٹکتا ہے۔ اختر اورینوی اس سے محروم
نہیں۔ اگر طبقاتی آویزش کا شعور ان کے پاس ہوتا تو اُن کے فن
میں یہ خامی نہ باقی رہتی۔
وقار عظیم۔ لیکن اس کے باوجود طویل مختصر افسانے کی روایت کو آگے
بڑھانے میں اختر اورینوی کا بڑا حصّہ ہے۔
عبادت بریلوی۔ اب ہم اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں یہ پتہ
لگانے کی ضرورت ہے کہ ان افسانہ نگاروں نے کون کون سے نئے
تجربے کئے اور کون کون سی نئی روایات قائم کیں۔
نئے افسانہ نگار پریم چند سے کچھ آگے بڑھتے ہیں۔ ان کی
حقیقت نگاری انقلابی رُجحان کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وقت کے
ساتھ ساتھ ان کا شعور بھی بڑھا ہے۔ اس میں ترقی پسند تحریک
کا اثر بھی شامل ہے۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے
حقیقت نگاری اور واقعیت کے اس رُجحان کے ساتھ ساتھ اپنے
افسانوں میں حقیقت و رومان کا ایک سنگم بنانے کی کوشش بھی کی
ہے۔ اس کی بہترین مثال کرشن چندر کا فن ہے۔ کرشن چندر نے
اپنے تقریباً تمام افسانوں میں حقیقت و رومان کا یہ سنگم بنایا ہے۔
اور اس طرح اس نے جنّت اور جہنّم کو یکجا کر دیا ہے۔ اس اعتبار
سے وہ منفرد ہے۔
ندیم۔ پریم چند کے زمانے میں افسانہ زیادہ تر عکسِ حیات تک محدود
رہا ہے۔ لیکن اب عکّاسی میں تنقیدِ حیات بھی شامل ہو جاتی ہے۔
محبّت کے بارے میں بھی جو کہانیاں لکھی گئی ہیں ان میں بھی سماجی
عوامل کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔
عبادت۔ پریم چند کے یہاں محبّت کا جو تصوّر ہے وہ خادمت کا
تصوّر ہے، یلدرم اور نیاز اس محبّت کو حسن و ناز کا مجسمہ بنا کر
پیش کرتے ہیں۔ لیکن موجودہ دَور میں محبّت کی نفسیاتی نوعیت کو
پیش کرنے کا رُجحان عام ہے۔ اس سماجی کشمکش میں محبت کا کیا رُخ
ہو سکتا ہے ان چیزوں کے متعلق بھی افسانے لکھے گئے ہیں۔ اس
طرح گویا محبت کو وسیع مفہوم میں پیش کیا گیا ہے جو پہلے محبت جذباتی
یا اصلاحی تھی اب اس کا ایک پس منظر ہے جو اس کا محرک بنتا ہے۔
وقار عظیم۔ یہ بات صرف محبت کے لئے مخصوص نہیں حقیقت میں
اب عام اندازِ بیان جذباتی نہیں رہا۔ اور افسانہ نگار کسی مسئلے کو زندگی
سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔
ندیم۔ محبت ہمارے شعری اور افسانوی ادب کا بہت بڑا موضوع
رہا ہے، اس لئے اس میں تبدیلی بھی واضح ہے۔ تیسری چیز جو اُردو
افسانوں میں موجود ہے بین الاقوامیت ہے۔
وقار عظیم۔ اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں ہمارے افسانہ نگاروں
کی نظر ساری دنیا کے ادب پر ہے۔
عبادت بریلوی۔ بین الاقوامیت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ
اس میں زندگی کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر ہے جس کو ایک سائنٹیفک
تجزیے کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تجزیہ ہمیں بین الاقوامیت کی
طرف لے جاتا ہے، اس نقطۂ نظر کے قیام سے ایک خاص بات یہ
پیدا ہو گئی ہے کہ اب ہم چیزوں کو تاریخی شعور کے تحت دیکھتے ہیں۔
یہ شعور جذباتی نہیں۔ اس میں زندگی سے دلچسپی اور اس کا گہرا احساس
ہے۔ اس سے پہلے انسانیت پرستی یا انسان دوستی —
HUMANISM کے جو تصورات تھے اس میں چیزوں کو ایک
محدود دائرے میں رہ کر دیکھا اور سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب ایک عالمگیر
انسانی برادری کا خیال پیدا ہوا ہے۔ اور میں تو یہ کہونگا کہ ہمارے
افسانے میں یہ کرشن چندر کا پیدا کردہ ہے۔ اس معاملہ میں ان کا کوئی
ثانی نہیں۔
ندیم۔ بین الاقوامیت اور آفاقیت دو الگ الگ چیزیں ہیں
انہیں ملانا نہیں چاہیئے۔
عبادت بریلوی۔ بین الاقوامیت کی بنیاد آفاقیت پر ہے۔
وقار عظیم۔ سوچنے کا یہ انداز اس وجہ سے ہے کہ ہم چھوٹے چھوٹے
مسائل کا تجزیہ کر کے اُن کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں۔ اور جب
ان چھوٹے چھوٹے مسائل کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے
پیچھے بین الاقوامی مسائل ہیں۔
عبادت بریلوی۔ چھوٹے چھوٹے مسائل کے بارے میں بھی جو کچھ
لکھا گیا ہے اس میں بھی آج کے افسانہ نگاروں کا تصوّر بدل گیا ہے۔
بیدی کے ہاں اس کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ زندگی سے گہری دلچسپی
اور اس دلچسپی کا احساس پہلے اتنا شدید نہیں تھا۔ پہلے ان مسائل
کو پیش کرتے ہوئے ماحول سے جھنجھلاہٹ اور بیزاری پیدا ہو جاتی

تھی۔ اب اس میں اس زندگی کی دلکشی کا خیال شامل ہو گیا ہے۔

وقار عظیم۔ یہ چیز ایک خاص شکل میں پریم چند کے ہاں بھی موجود تھی۔

ندیم۔ اس زمانے میں مثالی تھی اب REALISTIC ہے۔

عبادت بریلوی۔ زیر بحث دور کے لکھنے والوں کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ ان لوگوں نے تکنیک اور فنی اعتبار سے اضافے کئے ہیں اور افسانے کی روایت کو بعض نئے پہلوؤں سے آشنا کیا ہے۔ انہوں نے اظہار و بیان، سماں بندی، کردار نگاری اور نفسیاتی تجزیے کے نئے میدان تلاش کئے ہیں، اس لحاظ سے میں کرشن چندر کو بہت بڑا اختراع سمجھتا ہوں۔ انہوں نے شعوری طور پر اردو مختصر افسانے کی تکنیک کو فن کی نئی راہوں سے آشنا کیا ہے۔ مثلاً "ان داتا" کو لے لیجئے، اس میں فن کا انداز ہی بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اس سے پہلے ہم افسانے میں اس طرح کی ہیئت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

وقار عظیم۔ لیکن کرشن چندر کے ہاں ایسے نمونے بھی ہیں جنہیں دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ افسانے کو پیچھے لے گئے ہیں، لیکن مجموعی طور پر اس کی ناکامیاں کم ہیں۔ اور نیا لکھنے والا ان سے بچ سکتا ہے۔

عبادت بریلوی۔ ہر تجربہ اپنے اندر شدت اور کسی حد تک انتہا پسندی ضرور رکھتا ہے۔ یہ منزلیں فن کے لئے بڑی کٹھن ہوتی ہیں۔ اس لئے خامیاں اور فروگزاشتیں اس دور کے فن کاروں میں بھی موجود ہیں۔ کرشن چندر اور بیدی تک ان سے اپنا دامن نہیں بچا سکے ہیں۔

ایک اور بات۔ اس زمانے میں طویل مختصر افسانے کی تکنیک کا تجربہ بھی کیا جاتا ہے۔ **ندیم۔** کرشن اور اختر انصاری نے اس کی بنیاد ڈالی ہے، پھر دوسرے لوگ بھی میدان میں آئے جنہوں نے اسے آگے بڑھایا۔

ندیم۔ اس بحث کو سمیٹنے سے پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ کوئی بات رہ تو نہیں گئی۔

وقار عظیم۔ ناول کی طرح کینوس کی وسعت اور وہ بھی اس طرح کہ بوجھ نہ بن جائے اس دور کے افسانوں کی خصوصیت ہے۔ یہ لوگ تفصیلات کو زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ کردار کا تصور گہرا کرتے ہیں۔ ان کے افسانہ بڑے کینوس پر پھیلا ہوا ہونے کے باوجود وحدت تاثر قائم رہتی ہے۔ حیات اللہ انصاری کا افسانہ "آخری کوشش" اس دور میں اس کی نمایاں مثال ہے۔ اس کے پیچھے ایک وسیع دنیا ہے۔ اس کی ساری ہنگامہ آرائیاں میں جو پڑھنے والے پر خود فراموشی کی کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔

ندیم۔ ان لکھنے والوں کا ایک CONTRIBUTION یہ بھی ہے کہ انہوں نے FANTASY کے انداز کو نکھارا ہے مثلاً غلام عباس کا افسانہ "آنندی"۔

انتظار حسین۔ یہ بعد کی بات ہے ابھی ہم وہاں تک نہیں پہنچے۔

عبادت بریلوی۔ میں سمجھتا ہوں کہ داستانوں کا اثر بتدریج کم ہوتا گیا۔

وقار عظیم۔ حقیقت نگاری کے رجحان کے پھیلنے کے بعد کمی لازمی تھی، اب شاعرانہ ماحول اور فضا سے مدد ضرور لی جاتی ہے۔ لیکن محض تخیل اور تصور ہی پر افسانہ کی بنیاد نہیں رکھی جاتی۔

انتظار حسین۔ عبادت صاحب نے داستانوں کے اثر کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے مجھے اختلاف ہے۔ داستانوں میں صرف FANTASY ہی نہیں۔ بلکہ جہاں کہیں ان میں حقیقت پسندی کا اظہار ہوا ہے وہ آج کل کے افسانوں سے بہت قریب ہے۔ "قصہ چہار درویش" میں جہاں کھانے، لباس اور دوسری چیزوں کی تفصیل ہے وہ بالکل آج کل کے افسانوں کی ہے۔

عبادت بریلوی۔ اس سے مجھے اتفاق ہے، لیکن رومانی فضا جو داستانوں نے دی ہے اس کو ان لوگوں نے اس انداز میں پیش نہیں کیا بلکہ ان کا انداز اس کی نفی کرتا ہے ـــ پریم چند کے ہاں جو بات ہے وہ آج کے افسانوں میں نہیں ملتی۔ اب افسانہ نگار رومانی فضا بھی قائم کرتے ہیں تو اس میں نری جذباتیت نہیں ہوتی ہے۔

وقار عظیم۔ یہ رنگ تو خود پریم چند کے آخری افسانوں میں بھی نہیں ملتا۔ لیکن داستانوں کے اثر سے انکار ممکن نہیں۔ یہ اصل میں مشرقی مزاج کی ایک کیفیت ہے۔

عبادت بریلوی۔ غالباً کرشن چندر پر مغربی رومانیت کا اثر زیادہ ہے۔

وقار عظیم۔ اگر غور کیجئے تو یہ انداز داستانوں میں مغرب کے رنگ سے بھی زیادہ ہے۔

عبادت بریلوی۔ لیکن داستانوں میں جو رومانیت ہے اس میں تصنع کی فضا قائم رہتی ہے، لیکن نئے افسانہ نگاروں کے رومانی انداز میں بڑی زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ اسی لئے اس میں زیادہ جان ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اب تک جو روایات قائم ہوئی ہیں ان کی روشنی میں نئے لکھنے والوں نے کیا کیا تجربے کئے۔

حسن عسکری، بلونت سنگھ، ممتاز مفتی، قرۃ العین حیدر اور ممتاز شیریں وغیرہ اس دور میں آتے ہیں۔

حسن عسکری نے اُردو افسانے کو بعض نئی چیزیں اس اعتبار سے دی ہیں کہ انہوں نے نفسیاتی تجزیے کے رجحان پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس کے علاوہ افسانے کی تکنیک میں اسکیچ کا تجربہ بھی کیا ہے۔ مثلاً "کالج سے گھر تک" وغیرہ وغیرہ۔ نفسیاتی تجزیے کے رجحان کو ان کا افسانہ "چائے کی پیالی" بڑی خوبی سے پیش کرتا ہے۔

وقار عظیم۔ اس طرح کا سب سے پہلا افسانہ "دو فرلانگ لمبی سڑک" کرشن چندر نے لکھا ہے۔

عبادت بریلوی۔ یہ تو ماخوذ ہے۔ جس کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ اور اس طرح انہوں نے ادبی دیانت داری کا خیال پوری طرح نہیں رکھا۔

وقار عظیم۔ یہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے اعتراف نہ کر کے ایک اخلاقی غلطی کی ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ اس نے اُردو میں لکھا ہے اُس سے افسانہ کی روایت میں ایک اضافہ ضرور ہُوا۔

انتظار حسین۔ اس نقطۂ نظر سے یہ اعتراض تو بیدی پر بھی کیا جا سکتا ہے ان کا افسانہ "گرم کوٹ" غیر زبان سے لیا گیا ہے۔

عبادت بریلوی۔ حوالہ دیئے بغیر ایسا کرنا ایک معیوب بات ہے۔

وقار عظیم۔ میں اخلاقی پہلو سے آپ سے بھی زیادہ اس کی مذمت کرتا ہوں لیکن اس سے انکار کرنا ممکن نہیں کہ اس ترجمہ سے ہماری افسانوی روایت میں ایک مفید اضافہ ہُوا ہے۔

عبادت بریلوی۔ عسکری کے افسانے کالج سے گھر تک میں ایک اپج ہے، اس میں سماجی شعور بھی ملتا ہے۔ یہاں وہ اپنی یا فرد کی ذات میں گم ہونے کی کوشش نہیں کرتے دوسری چیز ان کے افسانوں میں یہ ہے کہ وہ سماں یا فضا پیدا کرتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں، "چائے کی پیالی" بڑا خوبصورت افسانہ ہے۔ یہ رجحان ان کے یہاں دو راستوں سے آیا ہے۔ جوائس اور پروسٹ کا ان پر اثر ہے۔ انہوں نے ان دونوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے انداز کو برتنے کی کوشش کی ہے۔

تیسری چیز عسکری کے ہاں وہ ہے جو "پھسلن" میں ہے۔ یہ عصمت کے "لحاف" کی ایک دوسری شکل ہے، اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ خواہ مخواہ لکھا گیا ہے۔

وقار عظیم۔ تجزیے کے سلسلے میں جو چیز عسکری کی خصوصیت ہے اس کا اندازہ ان کے مجموعے "جزیرے" کے عنوان سے چلتا ہے۔ اس میں ایک الگ دُنیا آباد کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ ہر شخص اپنی ذات کو فکر کا محور و مرکز سمجھتا ہے۔ یہ رجحان اس روش کا ترجمان ہے کہ جب افسانہ نگار کو اجتماعی زندگی میں موضوع نہیں ملتے تو وہ فرد کو افسانہ کا موضوع بناتا ہے۔ اور اُس کی ذہنی کیفیت کی مصوّری کرتا ہے ——— اس رجحان کی بدولت "شعور کی رو" کی تکنیک ہمارے افسانے میں داخل ہوئی۔ ملحوظ۔ جب "چائے کی پیالی" اور "حرام جادی" چھپے تو بعض حلقوں کی طرف سے یہ کہا گیا تھا کہ یہ مغربی افسانوں سے ماخوذ ہیں۔

انتظار حسین۔ یہ بات تو عسکری صاحب نے "جزیرے" کے دیباچہ میں لکھی ہے کہ انہوں نے کون کونسا افسانہ کس کس افسانہ سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔

عبادت بریلوی۔ اس کے باوجود عسکری کے فن میں بڑی انفرادیت ہے، انہوں نے زیادہ سے زیادہ دس بارہ افسانے لکھے ہیں لیکن اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔ ان کی بڑائی تو اس میں ہے کہ انہوں نے مغربی اثرات کے باوجود اپنے فن میں ایک اپج پیدا کی ہے۔ ان کے ہر افسانے میں ایک اچھوتا پن نظر آتا ہے۔

وقار عظیم۔ حسن عسکری نے جس خاص ماحول کو اپنے افسانوں کا پس منظر بنایا ہے وہ بھی اُن کے لئے مخصوص ہے۔

عبادت بریلوی۔ اور وہ اس تمام زندگی میں گھلے ملے معلوم ہوتے ہیں۔ اس زندگی کا کتنا گہرا احساس ان کے فن میں نظر آتا ہے۔

انتظار حسین۔ وہ بلند شہر کے علاقے کی زندگی کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔

وقار عظیم۔ فن کے نقطۂ نظر سے یہ بات بڑی اہم ہے کہ افسانہ نگار جس ماحول سے پوری طرح واقف ہو اُسی کی عکاسی کرے۔

انتظار حسین۔ حقیقت میں حسن عسکری اور اس طرح کے دوسرے لوگ افسانہ نگار نہیں تھے، مختصر افسانے کی مجمل تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی ایسا واقعہ یا تاثر لیا جائے جو فرد کی زندگی پر پوری طرح سے اثر انداز نہ ہو ——— لیکن حسن عسکری کے افسانوں میں مسلسل واقعات ملتے ہیں وہ DETERMING FACTOR ہوتے ہیں، ان کا انداز طویل مختصر افسانوں کا سا ہے۔

عبادت بریلوی - عسکری صاحب نے طویل مختصر افسانے لکھنے کا بہت بڑا تجربہ کیا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ انہوں نے مختصر افسانے نہیں لکھے ٹھیک نہیں ہے۔ انہوں نے بعض بڑے اچھے مختصر افسانے بھی لکھے ہیں۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ ان کے جوہر طویل مختصر افسانے ہی میں کھلتے ہیں۔ شاید یہ مواد اور ہیئت کی ہم آہنگی کے شعور کا نتیجہ ہے۔

انتظار حسین - میرا کہنا یہ ہے مختصر افسانے کی تکنیک اُسکی متحمل نہیں ہوسکتی کہ آپ تفصیل تلاش کریں۔

عبادت بریلوی - آپ "چائے کی پیالی" کو لے لیجئے۔ اس میں وہ تمام واقعات کو بڑی خوبی سے یکجا کرتے ہیں، اس میں ایک شخص کی ذہنی کیفیت کی ساری تفصیل موجود ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس افسانے میں ایک مکمل وحدت نظر آتی ہے۔ اور یہ مختصر افسانے کی تکنیک ہے۔

انتظار حسین - مختصر افسانے کے تصوّر میں صرف وحدت شامل نہیں، ان کے افسانوں میں بہت سے واقعات کو ملا کر ایک شکل مرتب ہوتی ہے جو فرد کی شکل کو بدل دیتی ہے،

وقار عظیم - مختصر افسانہ کی جو تعریف آپ نے کی وہ بہت محدود ہے۔ افسانہ کے فن میں جو بے شمار نئے نئے تجربے ہوئے ہیں اُنہوں نے افسانہ کی ہیئت ہی بدل دی ہے۔ اور اب جس چیز میں آپ کو جدّت محسوس ہوتی ہے وہ حقیقت میں فن کی روایت بن چکی ہے۔ افسانہ کے نئے فن میں بڑی تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ ہمارا مرکزی تصوّر اب واقعات کے بجائے کرداروں کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔

عبادت بریلوی - ساری دنیا میں مختصر افسانہ میں تجربے کا تسلسل نظر آتا ہے۔ تکنیک کا جتنا تنوع اس صنف ادب میں ملتا ہے شاید ہی کسی اور صنف میں ملے۔ اُردو میں عسکری نے اس تسلسل کو باقی رکھا ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ ایک امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے ہمارے مختصر افسانے کی تکنیک میں بڑی تبدیلی پیدا کی ہے۔ البتہ ایک بات ہے وہ یہ کہ عسکری صاحب ان نفسیاتی تجزیوں کے ساتھ سماجی شعور کا اظہار بھی کرتے تو افسانہ نگار کی حیثیت سے اُن کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا۔ اس کمی نے ان کے یہاں ایک گھٹن سی پیدا کر دی ہے۔

وقار عظیم - لیکن جس چیز کو ہمارا جی چاہتا ہے اس کا مطالبہ ہر افسانہ نگار سے کرنا زیادتی ہے۔

عبادت بریلوی - لیکن صرف زندگی کی عکاسی ہی میں تو عظمت نہیں ہے۔ عظمت تو زندگی کے مسائل کی گہرائی تک پہنچنے میں ہے۔ ہم ذاتی یا انفرادی طور پر اس کا تقاضا نہیں کرتے۔ خود زندگی اسکی متقاضی ہے۔

وقار عظیم - مگر جب کوئی فن کار صرف عکاسی کو اپنا مطمح نظر جانتا ہے تو آپ اُس کا مسلک کیسے بدل سکتے ہیں —— لیکن اس کمی کے باوجود عسکری نے فن کی حیثیت سے افسانہ کو آگے بڑھانے میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔

ندیم - عسکری صاحب کے افسانے ایک فرد کے تأثرات کی عکّاسی کرتے ہیں، لیکن انہوں نے ایک فرد کے اتنے بہت سے تاثرات یکجا کر دیئے ہیں کہ مختصر افسانہ اس کا متحمّل نہیں ہوسکتا۔

عبادت بریلوی - مجھے اس سے اختلاف ہے، میرا خیال تو یہ ہے جزئیات سے اثر زیادہ گہرا ہوتا ہے، اور بات زیادہ دلکشی سے ذہن نشین ہوتی ہے۔ عسکری صاحب نے یہی تکنیک استعمال کی ہے۔ اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔

وقار عظیم - ایک بات البتہ ہے کہ اس طرح کہانی پن باقی نہیں رہتا۔

عبادت بریلوی - ان کا نقطۂ نظر صرف فضا کو پیش کرنا ہے مختصر افسانے کی تکنیک میں جو لچک ہے وہ اسکی اجازت دیتی ہے۔

وقار عظیم - یہ صحیح ہے۔ لیکن اس کے باوجود فن کے ارتقاء کا جب ذکر آئے گا تو عسکری کا نام نمایاں طور پر لیا جائے گا۔

عبادت بریلوی - عسکری صاحب کا نقطۂ نظر انفرادی ہے۔ ممتاز مفتی کا نقطۂ نظر بھی انفرادی ہے لیکن وہ لاشعور اور تحلیلِ نفسی کی گہرائیوں میں چلے جاتے ہیں "آپا" اور "بڑھا" ان کے بڑے اچھے افسانے ہیں جو مختصر افسانے کی تکنیک کو بڑی اچھی طرح سے پیش کرتے ہیں لیکن عسکری صاحب کی طرح وہ بھی ایک بیمار سی فضا پیدا کرتے ہیں۔

وقار عظیم - انہوں نے جنس کو محض لذت کی خاطر نہیں بلکہ علمی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔

عبادت بریلوی - مجھے اس میں شبہ ہے۔ ان کے سارے کردار بیمار معلوم ہوتے ہیں، یہ سب لاشعور کی بھول بھلیوں میں کھوئے ہوئے

ہیں اور خارجی اثرات کا احساس نہیں رکھتے۔ سماجی محرکات کا ان کے
یہاں کوئی شعور نہیں اس لئے جو شخص ان کے قریب رہتا ہے وہ بھی
بیمار ہو جاتا ہے۔ لاشعور کی دُنیا میں رہنے والا انسان آخر کب تک
ذہنی اور جذباتی طور پر صحت مند رہ سکتا ہے۔

ندیم۔ لیکن یہ ان کا اپنا زاویۂ نظر ہو سکتا ہے۔ وہ خارجی حقیقت
کے تو قائل ہی نہیں۔

عبادت بریلوی۔ لیکن افسانے کے جائزے میں ہم اس کے
اثرات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مفتی نے اپنے آپ کو بہت محدود
کر رکھا ہے۔ ان کے افسانوں میں بڑی گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔
وہ قاری کو ایک ایسی جگہ پھنسا دیتے ہیں جہاں دنیا کی ہمہ گیری
اور دلکشی کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اور اعصاب مفلوج
معلوم ہوتے ہیں۔

ندیم۔ اس نقطۂ نظر میں بے بسی تو قدرتی ہے، وہ خارجی حسن
کا احساس نہیں رکھتے اور میرے خیال میں وہ محض اس لئے اپنے
لاشعور کی عکاسی کرتے ہیں کہ خود خارجی دُنیا میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے
اور اب تو ان کے افسانوں میں تکرار یا تھکن کا احساس بھی ہونے
لگا ہے۔

عبادت بریلوی۔ وہ فرائڈ کو اپنا امام ملتے ہیں اسی لئے ان
کے افسانوں میں یکسانیت اور تھکن سی پیدا ہو گئی ہے —— فرائڈ
کے سہارے انسان آخر کب تک چل سکتا ہے؟

ندیم۔ لاشعور کی تمام گہرائیوں اور بھول بھلیوں کا جائزہ لیتے ہوئے
فنکار کو زبان پر پورا عبور ہونا چاہیئے یہ قدرت مفتی میں نہیں ہے۔

عبادت بریلوی۔ فرائڈ کے لکچر پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا
ادبی مطالعہ بہت وسیع ہے۔ لیکن ممتاز مفتی کے ہاں یہ بات بھی نہیں۔
انہوں نے فرائڈ کو ضرور پڑھا ہے لیکن اس کے بعد اس سلسلے میں
جو کام ہوا ہے اسے نہیں دیکھا —— شاید اسی وجہ سے وہ ان
موضوعات پر بھی مفصل نہیں لکھ سکتے۔

ندیم۔ اب تو وہ خارجی حقیقتوں کے بھی سرے سے قائل نہیں۔

عبادت بریلوی۔ ان کے علاوہ اس دور کے دو اور افسانہ نگار
اہم ہیں بلونت سنگھ اور غلام عباس۔

بلونت سنگھ نے ہمیں بہت سی نئی چیزیں دی ہیں، بظاہر
وہ دیہات کے ترجمان ہیں لیکن وہ اس ترجمانی سے آگے بڑھ کر
دیہاتی زندگی میں جو زندگی اور توانائی ہے اس کو بھی محسوس کرتے ہیں۔
مولانا صلاح الدین نے انہیں "پنجاب نگار" کہا ہے۔ میں انہیں
"حیات نگار" کہتا ہوں، وہ پنجاب پر اس لئے نہیں لکھتے کہ پنجابی
ہیں بلکہ اس لئے کہ انہیں پنجاب میں زندگی نظر آتی ہے۔ اس زندگی
میں جو حسن اور توانائی ہے اس نے بلونت سنگھ کو متأثر کیا ہے۔
وہ اس زندگی میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہیں اس زندگی
سے ایک والہانہ دلچسپی ہے —— جو افسانے انہوں نے فسادات
پر لکھے ہیں ان میں بھی اسی زندگی کا احساس ہے۔ مثلاً "کالے کوس"
میں یہ بات نظر آتی ہے۔ یہ ایک بڑی معرکتہ الآرا کہانی ہے۔
تقسیم پر بڑی ہیجان انگیز چیزیں لکھی گئیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا
نہیں کہ ہیجان انگیز چیزیں ہی لکھی گئی ہیں۔ بلونت سنگھ نے یہ دیکھنے
کی کوشش کی ہے کہ تقسیم کے وقت لوگ کس طرح محسوس کر رہے
تھے۔ کس طرح زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہجرت کے بارے میں
ان کا کیا خیال تھا۔

"کالے کوس" میں ایک ماں اور اس کا بیٹا مشرقی پنجاب
سے ہجرت کی غرض سے پاکستان کی طرف چل دیتے ہیں۔ اور چلتے
چلتے جب منزل پر پہنچتے ہیں تو وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں
کہ کیا ہم پہنچ گئے۔ یہاں بھی زندگی ویسی ہے جیسی کہ وہاں تھی۔
وہی سبزہ ہے، وہی کھیت ہیں، ہر چیز ویسی ہی ہے ——
اس سے پتہ چلتا ہے کہ بلونت سنگھ ہر موضوع پر لکھتے ہوئے انسانی
زندگی کی دلکشی اور دلآویزی کو اپنے پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ وہ
اسی کے افسانہ نگار ہیں۔

انتظار حسین۔ ان کے وہ افسانے جو پنجاب کے فسادات کے بارے
میں لکھے گئے ہیں مختصر افسانے کے حدود سے باہر نکل جاتے ہیں۔
ان کے افسانوں میں ایک ایسا ربط جو یکسانی کی حد تک پہنچ
جاتا ہے، یہ تکنیک ناول کی ہے۔

عبادت بریلوی۔ جس چیز کی طرف انتظار صاحب نے اشارہ کیا
ہے وہ بلونت سنگھ کی خامی نہیں ہے، بلکہ یہ تو ان کی خوبی
ہے —— ان کے ایسے افسانے فنی اعتبار سے مربوط ہیں۔
—— ان میں وحدت ہے۔ تسلسل ہے —— اور یہ وحدت اور
تسلسل در حقیقت زندگی کے شدید احساس کا نتیجہ ہے۔ ناول
کی تکنیک اس میں نہیں ہے —— ان افسانوں میں تفصیل ضرور
ہے، لیکن اس کے باوجود وہ COMPACT ہیں۔ اور یہی

ان کی خوبی ہے ۔

وقار عظیم ۔ یہ بات ہر اس افسانہ نگار میں ہوتی ہے جو زندگی کو جامد نہیں سمجھتا اور اس کے تسلسل کا قائل ہوتا ہے ۔

انتظار حسین ۔ ایسے لوگوں کے افسانے ناول اور طویل مختصر افسانے کے تحت آتے ہیں ۔ یہ ان کی کاہلی ہے کہ مختصر افسانے لکھتے ہیں ۔

ندیم ۔ میرے خیال میں یہ بحث تکنیک کی ہے ۔

عبادت بریلوی ۔ مختصر افسانے کی تکنیک کو اتنا محدود نہیں کیا جا سکتا کہ جس افسانے میں تفصیل ہو اس کو افسانہ ہی نہ کہا جائے ۔ یہ تفصیل اور پھیلاؤ اگر وحدت کے روپ میں سامنے آئے تو اس کو مختصر افسانہ کیوں نہ کہا جائے — پھر افسانے کی تکنیک اس وقت تجربے کے دور سے گزر رہی ہے ۔ طویل مختصر افسانہ، مختصر افسانے کی تکنیک میں ایک اہم تجربہ ہے ۔ بلونت سنگھ نے بھی ایسا ہی ایک تجربہ کیا ہے ۔

وقار عظیم ۔ اس دور میں سوائے منٹو کے تمام اچھے لکھنے والوں کے یہاں افسانے کا آخری حصہ نکتہ کی طرف مائل کرتا ہے ۔ اس سے قبل یہ عیب ہو سکتا تھا ۔ لیکن اب یہ عیب نہیں رہا ۔

انتظار حسین ۔ بلونت سنگھ اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ انہوں نے پنجاب کی زندگی میں سکھوں کے طبقے کی ترجمانی کی، ندیم صاحب نے پنجاب کے دیہاتوں کی ترجمانی کی تھی لیکن سکھوں کو پیشِ نظر نہیں رکھا تھا ۔

عبادت بریلوی ۔ بلونت سنگھ ہی کی طرح اس دور میں ایک اور چابکدست فنکار غلام عباس نظر آتے ہیں ۔ غلام عباس بڑے ہوشیار افسانہ نگار ہیں ۔ وہ افسانہ نگاری کے فن اور اسکی تکنیک کا بڑا گہرا شعور رکھتے ہیں — فن کی لطافتوں اور نزاکتوں کا احساس ایک لمحے کو بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا ۔ ان کے موضوعات مختلف ہیں لیکن ان موضوعات میں جو چیز سب سے زیادہ متوجہ کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ موضوع کی تہہ تک پہنچتے ہیں ۔ اسکی تمام باریکیاں تلاش کرتے ہیں اور ان تمام پہلوؤں پر ان کی نظر بڑی گہری پڑتی ہے ۔ انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی جس لطیف انداز میں انہوں نے کی ہے، اردو افسانے میں اس کی صرف چند مثالیں مل سکتی ہیں — البتہ وہ ان تمام باتوں کو تفصیل اور وضاحت سے بیان نہیں کرتے ۔ ان کے انداز میں رمزیت ہے — اور یہ رمزیت ان کے افسانوں میں بڑی گہرائی اور گیرائی پیدا کر دیتی ہے — مختصر افسانے کی یہی خصوصیت ہے — غلام عباس نے اپنے فن میں اس کو بڑی خوبی سے برتا ہے ۔

وقار عظیم ۔ غلام عباس نے فن سے بڑی وفاداری برتی ہے ۔ ان کے فن میں مستعدی نظر آتی ہے ۔ اکثر افسانہ نگار سہل انگاری دکھاتے ہیں ۔ اور یہ بات افسانہ نگاری کے فن کو بڑا نقصان پہنچاتی ہے ۔ غلام عباس سہل انگار نہیں ہیں ۔ وہ دس سطروں کے افسانوں میں ناول کی سی جگر کاوی کرتے ہیں ۔ ایک ایک لفظ پر غور کرنا ۔ چول پر چول بٹھانا، اور سوچنا، فن کے لوازم ہیں اور یہ لوازم غلام عباس کے پاس موجود ہیں ۔

انتظار حسین ۔ راجندر سنگھ بیدی نے افسانے کو جہاں چھوڑا تھا غلام عباس افسانے کو اس سے آگے لے گئے ہیں ۔ ان کا اسٹائل بڑا منجھا ہوا ہے ۔ لفظوں کی وہ دروبست اور فقروں کی چستی جو مختصر افسانے کے لئے ضروری ہے وہ غلام عباس کے پاس موجود ہے ۔ وہ افسانے کا TEMPO متوازن رکھتے ہیں ۔ نقارہ نہیں بجاتے ۔

عبادت بریلوی ۔ ان کے فن کی یہ آہستہ روی اور متوازن کیفیت درحقیقت ان کی شخصیت کا پرتو ہے ۔ وہ بڑے دھیمے آدمی ہیں ۔ ان کی شخصیت میں بڑا توازن ہے ۔ اور یہی چیز ان کے فن پر اثر انداز ہوتی ہے ۔

ندیم ۔ شاید اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خاصے معمر ہیں ۔ اور انہوں نے بہت بعد میں افسانے لکھنے شروع کئے ہیں ۔

وقار عظیم ۔ شروع میں انہوں نے بچوں کے لئے بھی کہانیاں لکھی ہیں ۔ جن کے لئے بڑی احتیاط اور سنبھلی ہوئی کیفیت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس چیز نے بھی ان کے فن کو متاثر کیا ہے ۔

محمد طفیل ۔ یہاں قرۃ العین اور شفیق الرحمٰن کا ذکر ہونا چاہیئے ۔

عبادت بریلوی ۔ شفیق الرحمٰن اور قرۃ العین حیدر نے اونچے طبقے کی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ شفیق الرحمٰن کے یہاں کوئی سنجیدہ فضا نہیں ہے ۔ وہ زندگی کے ہلکے پھلکے پہلوؤں کو دیکھتے ہیں ۔ ان کا فن ایک خوش وقتی کے احساس کی پیداوار ہے ۔ زندگی ان کے نزدیک ایک سنہرا خواب ہے ۔ جس میں قہقہے ہیں ۔ شوخیاں ہیں ، اٹکھیلیاں ہیں، چہلیں ہیں — ظاہر ہے ۔ زندگی کے ان پہلوؤں میں گہرائی اور گیرائی نہیں ہے لیکن یہ زندگی کے کچھ پہلو ہیں ضرور! یہی وجہ ہے کہ شفیق الرحمٰن کو لوگ دل خوش کرنے کے لئے پڑھتے ہیں ۔ — ان کا تاثر گہرا نہیں ہوتا — لیکن قرۃ العین اس زندگی کو نسبتاً زیادہ قریب سے دیکھتی ہیں — ان کے یہاں زندگی صرف ایک سنہرا

خواب ہی نہیں ہے —— وہ مسرتوں کے ساتھ اونچے طبقے کی تلخیوں کو بھی شدت کے ساتھ محسوس کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں قہقہوں کے ساتھ آنسو بھی ملے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مسرتوں کے ساتھ غموں کا احساس بھی ہوتا ہے۔ مسوری اور نینی تال کی فضاؤں میں زندگی کی تلخیاں محسوس ہوتی ہیں۔ اور وہ ان سب کی بڑی فنکارانہ تصویر پیش کرتی ہیں۔ اس اعتبار سے وہ شفیق الرحمن کے مقابلے میں ایک بڑی فنکار ہیں۔

انتظار حسین۔ شفیق الرحمن گدگدا نہیں دیتے۔ گدگدی سی بات کرتے ہیں —— قرۃ العین تھوڑا سا گدگدا بھی دے دیتی ہیں۔

وقار عظیم۔ دونوں نے زندگی کے ایک ہی طبقے کی عکاسی کی ہے لیکن شفیق الرحمن کے مقابلے میں قرۃ العین کے یہاں اس طبقے کی زندگی کا شعور زیادہ ہے۔

عبادت بریلوی۔ قرۃ العین کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ اس اونچے طبقے کی ساری تفصیل پیش کرتی ہیں۔ اور اگرچہ ان کی قائم کی ہوئی فضا تمام تر رومانی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ افسانے ہمیں متأثر کرتے ہیں۔ رومانی فضا میں اس زندگی کا کھوکھلا پن کچھ زیادہ ہی واضح ہوتا ہے —— اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں آپس میں ایک ہم آہنگی رکھتے ہیں۔

وقار عظیم۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اس طبقے کی زندگی کے گھناؤنے پن پر پردہ نہیں ڈالتیں، بلکہ اس کو اُجاگر کرتی ہیں۔

ندیم۔ انہوں نے زندگی کی خوبیاں اور خامیاں بغیر کسی قصد کے پیش کردی ہیں۔ البتہ ان کے پاس سماجی رشتوں کا شعور نہیں ہے۔ لیکن جہاں ان کے افسانوں میں دوسرے طبقوں کا ذکر آیا ہے وہاں ان کے ساتھ ایک ہمدردی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔

عبادت بریلوی۔ قرۃ العین کے فن میں سب سے زیادہ جو چیز اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، وہ ان کی تخیل ہے —— وہ اس تخیل کے سہارے بہت اونچا اُڑتی ہیں —— یہ پرواز تمام رومانی ہوتی ہے —— ان کے ساتھ اُڑنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ لیکن اس اُڑان میں کبھی کبھی ایسی منزلیں بھی آتی ہیں جہاں ان کے ساتھ اُڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ان کا پڑھنے والا ایک دم سے زمین پر آجاتا ہے —— اسی جگہ جہاں سے اس نے اُڑنا شروع کیا تھا۔

وقار عظیم۔ جس طرح عصمت نے بعض افسانہ نگار خواتین کو متأثر کیا ہے اسی طرح قرۃ العین حجاب امتیاز علی سے ایک حد تک متأثر ہوئی ہیں —— البتہ حجاب کی طرح ان کے یہاں زندگی سے بے تعلقی باقی نہیں رہتی۔

عبادت بریلوی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی رومانی پرواز انہیں زندگی سے کسی حد تک دُور ضرور لے جاتی ہے۔ بعض اوقات تو ان کی یہ رومانی پرواز اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ ہم ان کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اور وہ ہمیں مبہم معلوم ہونے لگتی ہیں —— یہ ابہام ان کی تکنیک میں بہت واضح ہے —— درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی تخیل کو پوری طرح اپنے قابو میں رکھنے پر قادر نہیں ہیں۔ تخیل کی یہ گرفت جس جگہ بھی ان کے یہاں ڈھیلی ہو جاتی ہے ان کا فن ایسی اَن جان گھاٹیوں میں بہہ نکلتا ہے جہاں ہم اجنبی ہو جاتے ہیں۔

وقار عظیم۔ ان کی فطرت میں مشرقیت اور مغربیت کا اتنا میل ہے کہ ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے والدین سے مشرقی روایت کا احترام اور مغربیت کا اثر بھی لیا۔ اور یہ تصادم ان کی تحریروں میں بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ وہ کبھی اُردو میں سوچتی ہیں اور کبھی انگریزی میں۔ اور اس طرح ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔

ندیم۔ قرۃ العین نے منظر نگاری کے سلسلے میں کرشن چندر کی طرح بڑے گہرے مشاہدے کا ثبوت دیا ہے۔

عبادت بریلوی۔ قرۃ العین کے یہاں مناظر کا بڑا شدید احساس ہے۔ اس کا بیان وہ دلنشین انداز میں کرتی ہیں لیکن کرشن چندر کا احساس ان سے کہیں زیادہ شدید اور اس کا مشاہدہ کہیں زیادہ تیز ہے۔ اس کا انداز بھی پختہ ہے۔ اس لئے وہ بڑا فنکار ہے۔

انتظار حسین۔ بہرحال قرۃ العین نے اُردو افسانے میں کچھ نہ کچھ اضافے ضرور کئے ہیں۔

عبادت بریلوی۔ ایک اور بات جو اس دور کے لکھنے والوں میں نئی ہے، وہ یہ کہ اس زمانے میں گھریلو ماحول کی عکاسی کا شعور بھی خصوصاً بعض خواتین افسانہ نگاروں میں پیدا ہوا ہے۔ گھریلو ماحول میں جو دلکشی ہوتی ہے اس کو ہماری افسانہ نگار خواتین نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اس زمانے میں ممتاز شیریں نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اس سے قبل افسانہ نگار خواتین کے موضوعات ایک FRUSTRATION سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ افسانہ نگار خواتین نارمل نہیں تھیں۔ انہیں گھریلو ماحول کی دلکشی نصیب ہی نہیں ہوئی تھی۔ پھر وہ اس کو موضوع کس طرح بناتیں۔ ان کا موضوع تو چند ناآسودہ خواہشات کے سوا اور یہ

کچھ نہیں تھا ــــ ممتاز شیریں نے ان کے برخلاف گھریلو ماحول کی ترجمانی بڑی کامیابی سے کی۔ ان کے مجموعے "اپنی نگریا" میں اس موضوع پر اچھے افسانے ملتے ہیں۔

وقار عظیم۔ ممتاز شیریں نے جنوبی ہند کی زبانوں کے افسانوں سے اثر قبول کیا ہے۔ ان زبانوں کے افسانوں میں فن اور زندگی کا جو امتزاج ہے اس سے بعض اچھی باتیں لی ہیں۔ انہوں نے ان زبانوں سے بعض افسانوں کے ترجمے بھی کئے ہیں۔

عبادت بریلوی۔ ممتاز شیریں کے افسانوں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ان کے پاس مختصر افسانے کی تکنیک کا بڑا گہرا شعور ہے۔ افسانے میں تکنیک کا جو تنوع ہے اس کو انہوں نے بڑی خوبی سے برتا ہے لیکن تنوع کا یہ شعور ان کے یہاں تکنیک کے ایک SYNTHESIS کی صورت میں نمایاں ہے۔ ان کی شخصیت میں یہ شعور رچا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

انتظار حسین۔ خواتین افسانہ نگاروں نے جو روایت قائم کی تھی اس کو کس حد تک ممتاز شیریں نے اپنایا ہے اور کس حد تک توڑا ہے۔؟

عبادت بریلوی۔ میرے خیال میں ممتاز شیریں نے ہماری دوسری خواتین افسانہ نگاروں کے مقابلے میں زندگی کے صحت مندانہ پہلوؤں کی ترجمانی کی۔ دوسری افسانہ نگار خواتین نے اس صحت مندانہ پہلوؤں کو نظر انداز کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان پہلوؤں سے انہیں تعلق ہی نہیں تھا۔ وہ تو ایک گھٹن کی پیداوار تھیں۔ ممتاز شیریں کے حالات مختلف تھے۔ اس لئے وہ اس ڈگر پر نہ چل سکیں جو ان سے قبل کی افسانہ نگار خواتین نے نباہی تھی۔ بہرحال ممتاز شیریں کے ہاں دوسری خواتین افسانہ نگاروں سے ایک انحراف ملتا ہے۔

انتظار حسین۔ اس میں صحت مند اور غیر صحت مند ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ عصمت وغیرہ زندگی کو ایک اور زاویے سے دیکھتی ہیں اور ممتاز شیریں کا زاویہ نظر مختلف ہے۔

عبادت بریلوی۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ عصمت کے ابتدائی دور کے افسانوں میں وہ آسودگی کا احساس نہیں جو ممتاز شیریں کے یہاں ملتا ہے ــــ عصمت وغیرہ کے یہاں ایک تشنج کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ میں ان کے فن کی حقیقت و واقعیت سے انکار نہیں کرتا۔ نہ ان کے فن کو کم مرتبہ سمجھتا ہوں۔ البتہ یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں ایک نارمل کیفیت کم ہے۔

انتظار حسین۔ تعجب ہے عبادت صاحب کو یہ احساس کیسے ہوا؟ ہاجرہ اور خدیجہ کے افسانوں میں بھی تو زندگی ہنستی کھیلتی نظر آتی ہے۔

ندیم۔ ہاجرہ، خدیجہ اور عصمت نے ہندوستان کی عورتوں کی اکثریت کی ترجمانی کی ہے۔ اور شیریں نے آسودہ طبقے کی۔

عبادت بریلوی۔ یہ شاید صحیح نہیں، ممتاز شیریں نے ایک خاصے بڑے طبقے کی نمائندگی کی ہے۔ پھر انہوں نے متوسط طبقے کی گھریلو زندگی پیش کی ہے جس کو خواتین افسانہ نگار نے اس سے قبل اہمیت نہیں دی۔ شاید اسکی وجہ یہ ہے کہ ہماری خواتین افسانہ نگار کو اس سے قبل گھریلو زندگی کا صحیح احساس ہی نہیں تھا۔ ممتاز شیریں نے اس کی ابتدا کی۔

وقار عظیم۔ اصل میں دونوں کے ماحول کا فرق ہے۔ ہاجرہ اور عصمت وغیرہ نے یو۔ پی کی مسلمان عورت کو دیکھا ہے جہاں تعلیم کا چرچا ابھی ہوا ہے، اور وہاں ماحول سے بغاوت زیادہ نمایاں ہے، شیریں کے افسانوں کی عورت ان منزلوں سے گزر چکی ہے۔ اُس نے اپنے ماحول سے پوری طرح مطابقت پیدا کر لی ہے۔ اُس نے آزاد ہو کر بھی گھر کو جنت سمجھنا سیکھا ہے۔

عبادت بریلوی۔ آزاد ہونے کے باوجود گھریلو زندگی کا احساس تو بڑا مستحسن ہے۔ اس میں ایک صحت مندانہ کیفیت ہے۔ ہماری افسانہ نگار خواتین نے اس کو اہمیت نہیں دی۔

وقار عظیم۔ یقیناً ــــ حقیقت نگاری دونوں طرح کی لکھنے والیوں کے یہاں ہے۔ عصمت، شیریں کے ماحول میں ہوتیں تو غالباً اس سے زیادہ اچھے افسانے لکھتیں اور شیریں لکھنؤ میں ہوتیں تو شاید اس سے کہیں تلخ لکھتیں۔

انتظار حسین۔ غالباً اب تقسیم کی لائن آگئی ہے۔

عبادت بریلوی۔ تقسیم کے بعد افسانے میں ایک طرح کا انحطاط پیدا ہوتا ہے، میرا خیال ہے کہ اس وقت تک لکھنے والوں میں سے بیشتر اپنا کام کر چکے تھے، تقسیم کے بعد ان کے موضوعات ختم ہو گئے ــــ بات یہ ہے کہ جن راہوں پر یہ چل رہے تھے وہ سب تاریکی میں گم ہو گئیں۔ انہوں نے جو کچھ چاہا تھا وہ نہ ہو سکا۔ جس چیز کی تمنا تھی وہ نہ ملی۔ اس لئے ایک احساس شکست FRUSTRATION عام ہوا۔ ان پر ایک مایوسی طاری ہو گئی۔ مایوسی کبھی کبھی انتہا پسند بھی بنا دیتی ہے۔ مثال کے طور پر کرشن چندر جو بہت بڑا فنکار ہے اسے تقسیم نے بڑا نقصان پہنچایا۔ اسے اپنے مقام کا احساس تک نہیں رہا۔ مثلاً اس نے اپنے اُوپر مقصدیت اور افادیت کو اتنا طاری کر لیا ہے اور ایک تحریک کے ساتھ ایسی جذباتی وابستگی کا اظہار کیا ہے کہ کہیں کہیں

اس کا فن لڑکھڑا جاتا ہے۔

ندیم۔ یہ کیفیت تو تقسیم کے بعد دونوں قسم کے افسانہ نگاروں کے ہاں موجود ہے۔ ترقی پسند اور غیر ترقی پسند، ترقی پسند اگر زوال پر آتے ہیں تو رجعت پسند بھی اچھا ادب نہیں پیش کرتے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ترقی پسند کچھ اور توقعات رکھتے تھے لیکن FRUSTRATE ہونے کی وجہ سے وہ فن کو سنبھال نہ سکے۔ دوسرے افسانہ نگاروں نے ان حالات سے فرار کا اثر لیا اور موجودہ حالات کا ذکر نہ کرنے میں ہی بڑائی سمجھنے لگے۔ اکثر اوقات انہوں نے انسانیت کا مذاق اڑایا۔ اس طرح دونوں افراط و تفریط کا شکار ہوئے۔

انتظار حسین۔ یہ گروہ ایک خاص سیاسی ماحول میں پیدا ہوا تھا۔ جب تقسیم ہوتی ہے تو ایک بریک سا آجاتا ہے نیا دور آتا ہے تو وہ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ اب کیا ہو۔ اور چیزوں کو کس انداز سے لکھا جائے؟

عبادت بریلوی۔ مجھے اس سے اختلاف ہے، ہمارے افسانہ نگاروں نے جو نقطۂ نظر قائم کیا تھا بڑا باشعور تھا، وہ انگریز کے خلاف صرف جذباتی ردِ عمل نہیں تھا بلکہ اس میں طبقاتی آویزش اور سماجی شعور کا صحیح احساس بھی تھا۔ اور یہ شعور تقسیم کے بعد بھی قائم رہا ہے۔ انگریز چلا گیا تو ہمارے افسانہ نگاروں نے سمجھا کہ ہمارا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا ہے۔ یہ احساس زیادہ بڑھا یہاں تک کہ لوگ اسے پیش کرنے میں انتہا پسند ہوگئے اور اس طرح فن کا خون ہوا۔

ندیم۔ ڈاکٹر تاثیر نے بھی یہی بات کہی تھی جو انتظار صاحب نے ابھی بیان کی ہے کہ ترقی پسند تحریک کا ایک خاص نقطۂ نظر تھا جو تقسیم کے ساتھ ختم ہوگیا، یہ تحریک BRITISH IMPERIALISM کی تماز کے خلاف ایک چھاتے کی حیثیت رکھتی تھی، انگریز چلا گیا۔ اب اسکی ضرورت نہیں رہی، میں نے انہیں بتایا کہ یہ تحریک بہتر زندگی کی قائل تھی اس لحاظ سے نقطۂ نظر اب بھی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ توقعات کے مطابق نتیجہ نہیں نکلا اور لیڈروں نے اسے جس طریقے سے نظر انداز کیا ہے اس سے لکھنے والے کچھ مبہوت سے ہوگئے ہیں۔

انتظار حسین۔ تقسیم کا اثر ہمارے ذہنوں پر بہت گہرا پڑا ہے، سماجی فضا اور سیاسی ماحول یکلخت بدل گیا۔ انگریزوں کا اثر ضرور رہا لیکن انگریز حاکم سامنے سے ہٹ گئے ادھر ہمیں یہ احساس دلایا گیا کہ اب قومی حکومت ہے، اس طرح ہم اپنے طریقِ کار تعین نہیں کر پائے، پہلے ہندو، سکھ اور مسلمان اکٹھے تھے۔ سماجی تانا بانا تھا، استحکام تھا۔ زندگی میں تسلسل تھا۔ اب یہ لوگ بٹ گئے اور ایک طرح کا SOCIAL DISINTEGRATION کا دَور آگیا۔ اور ان نئے حالات میں لکھنے والوں کو بڑی دقت پیش آتی ہے۔

عبادت بریلوی۔ یہ بات بڑی پتے کی ہے، طبقاتی کشمکش میں کوئی فرق نہیں پڑا لیکن سماجی انتشار کا اثر ذہنوں پر بہت گہرا ہے۔ اس لئے ہماری جو روایت تھی اور جس کا ہم نے تجزیہ کیا ہے اس پر اس ردّوبدل کا اثر یقیناً ضرور ہوا ہے۔ بعض افسانہ نگاروں کا ماحول یکسر بدل گیا۔ ان کے لئے یہ دشواری پیدا ہوگئی ہے کہ برسوں سے وہ جس ماحول کا گہرا اثر رکھتے تھے اب اس کے متعلق وہ صرف تصوّر سے کام لیتے ہیں، اس طرح بہت سوں نے تو لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ مثلاً حسن عسکری۔ انہوں نے پاکستان آنے کے بعد یہ کہا کہ اب میں آخر کس چیز کے بارے میں لکھوں۔ میرا مانوس ماحول جس سے میں جذباتی ربط رکھتا تھا اب پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے میں نے لکھنا ترک کردیا ہے۔

وقار عظیم۔ تخصیص خاص طرح کے سوچنے والے کی نہیں ہے۔

انتظار حسین۔ خاص ماحول میں پرورش پانے والے کی ضرور ہے، آپ تصوّر کیجیئے دلی کے کوچۂ چیلان میں ایک لڑکی رسم و رواج کی کتنی پابند ہوتی تھی، لیکن وہ کراچی پہنچنے کے بعد ضابطہ اخلاق اور روایات کو توڑ دیتی ہے تو احمد علی کے لئے جو اسے کوچۂ چیلان میں جانتے تھے اب اُس کے متعلق کیا لکھیں کیسے لکھیں۔

عبادت بریلوی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ جو اتنی بڑی ردّوبدل ہوئی ہے اس کے متعلق ہمارے افسانہ نگاروں نے کیوں کم سوچا ہے۔ اس پر تو بڑی EPIC لکھی جاسکتی ہے۔ یہ ہماری تاریخ کا کتنا بڑا سانحہ ہے۔

ندیم۔ اسکی وجہ وہی ہے جو انتظار صاحب نے بتائی کہ وہاں کے لکھنے والے نئے حالات سے ناواقف ہیں اور یہاں کے رہنے والے آنے والوں سے اجنبی ہیں۔

عبادت بریلوی۔ تو ہمارے لکھنے والے ان VALUES کو متعین کیوں نہیں کرتے شاید یہ وجہ ہے کہ یہ ایک بحرانی دَور ہے اور ابھی اتنا ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوا کہ اس پر سوچا جاسکے۔ سوائے انتظار حسین کے کسی نوجوان افسانہ نگار نے اس موضوع پر توجہ نہیں کی، حالانکہ یہ تمام کیفیات اکثر پر بیت چکی ہیں۔

انتظار حسین۔ پہلے یہ متعین کر لیجئے کہ اس کے متعلق کون لکھے،

وقار عظیم۔ ہمیں تو اس وقت ان نئے حالات میں افسانہ نگار ہی شروع

کرنے والوں کا جائزہ لینا ہے ___ اور دیکھنا ہے کہ اس کی ادبی قدر و قیمت کیا ہے۔

عبادت بریلوی۔ پرانے لکھنے والوں میں بھی بعض ایسے ہیں جنہوں نے اس دور میں بہت اچھے افسانے لکھے ہیں مثلاً ندیم، اور ان میں بڑا صحت مندانہ زاویۂ نظر ہے۔ لیکن اب چونکہ CONCENTRATION نہیں اس لئے اچھی تخلیقات نہیں ہو سکیں، اس سے ہم جمود کا اندازہ نہیں لگا سکتے، ہاں یہ دیکھنا ہے کہ تقسیم کے بعد جو افسانہ نگار پیدا ہوئے ہیں انہوں نے کون سے نئے تجربے کئے ہیں جس سے افسانے کی روایت آگے بڑھی ہے۔

اس نقطۂ نظر سے انتظار حسین کے افسانوں کو میں خاص اہمیت دیتا ہوں انہوں نے زندگی کی متزلزل اقدار اور تقسیم کے اثرات کا بیان بڑی خوبی سے کیا ہے، اس میں ایک انسانی نقطۂ نظر ملتا ہے۔ انہوں نے زندگی کے منتشر پہلوؤں کو بڑی اچھی طرح پیش کیا ہے۔

محمد طفیل۔ ان کے افسانوں کی یکسانیت عیب بن گئی ہے۔

عبادت بریلوی۔ اس یکسانیت کو میں ان کی خوبی سمجھتا ہوں، ان پر روسی حقیقت پسندی کا بڑا گہرا اثر ہے خصوصاً ٹالسٹائی اور ترجنیف کا۔ یہ یکسانیت اصل میں تکنیک کا دھیما پن ہے، یہ زندگی کو ایک خاص طرح سے محسوس کرنے کا انداز ہے۔

ندیم۔ میرے خیال میں انہوں نے موضوع کی تخصیص کر لی ہے جو ہر بڑے افسانہ نگار کو کر لینی چاہیئے، انہوں نے جس خاص ماحول اور خاص طبقے کو دیکھا ہے اسی کی عکاسی کی ہے۔

عبادت بریلوی۔ طبقے کی وضاحت کیجئے۔

ندیم۔ نچلا درمیانی طبقہ، چھوٹے دکاندار، ملازم پیشہ لوگ وغیرہ۔ ان کے ہاں ایک عجیب و غریب چیز یہ ہے کہ سماجی شعور تو ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کے بھرپور اظہار سے کترا کر نکلنا چاہتے ہیں۔

عبادت بریلوی۔ طبقے کے بارے میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے صرف معمولی دکانداروں کی نہیں بلکہ یو۔ پی کے خاص اضلاع کے متوسط طبقے کی ترجمانی کی ہے یعنی بلند شہر کے آس پاس کا علاقہ، انتظار کے ہاں درحقیقت دو قسم کے ماحول ہیں، ایک تو وہ جو وہاں موجود تھا دوسرا اس تبدیلی کے بعد جسے وہ سوچ سکتے ہیں۔ وہ سماجی شعور تو وہ اس کے قائل نہیں۔ ان کا تعلق درحقیقت اسی سکول سے ہے جس کے تحت ہم نے بیدی اور غلام عباس کو دیکھا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ انہوں نے اپنے موضوع کی تخصیص کر لی ہے، ان کے پاس ماحول کے المیے کا اظہار زیادہ ہے اور ان مسائل پر اس سے اچھے افسانے کسی نے نہیں لکھے۔

ندیم۔ ان کا نام بیدی اور غلام عباس کے ساتھ لینا زیادتی ہے لیکن ایک چیز انتظار کے بارے میں اور ہے وہ یہ کہ یہ چیخوف کی طرح جزئیات کو پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں لیکن تکنیکی طور پر ان کے افسانوں میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ پلاٹ کو بالکل ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔

وقار عظیم۔ اس حد تک اس دور کے کسی افسانہ نگار نے اس اصول کی پابندی نہیں کی۔ رہی موضوع کی تخصیص جس سے تکرار کا احساس ہوتا ہے تو اس کا احساس انہیں خود ہوا ہے۔ اب وہ اپنے مانوس کردار کو نئے ماحول میں چھوڑ دیتے ہیں اور اس بدلے ہوئے ماحول میں اس کے احساس کی شدت کو بیان کرتے ہیں اس طرح اب تکرار کا احساس کم ہو گیا ہے۔ یہ چیز آگے بڑھی تو ان کے افسانوں میں یقیناً وسعت پیدا ہو گی۔ اس طرح یہ ایک نئی راہ ہے جو انہوں نے نئے لکھنے والوں کو سجھائی ہے۔

عبادت بریلوی۔ اس نے ان کی تکنیک اور اندازِ بیان میں شدت پیدا کی ہے یا اسے شدت کہنے کے بجائے صحیح طور خلوص کے ساتھ پیش کرنا کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً "رما نجھ بھئی چوندیں" میں ایک شخص پاکستان سے ہندوستان واپس جاتا ہے تو ریل میں جمنا کے پل پر سے گزرتے ہوئے جب وہ ہندوؤں کو پیسے پھینکتے نہیں دیکھتا تو خود بے اختیار ہو کر پیسے پھینکنے لگتا ہے۔ یہ اور اس طرح کے چھوٹے چھوٹے واقعات کے جذباتی بیان سے ان کے افسانوں میں بڑا گہرا اور مستقل تاثر پیدا ہوتا ہے۔

ندیم۔ فسادات کے بعد جو افسانے لکھے گئے ہیں ان میں سے اکثر ناکام ہیں، موجودہ تبدیلیوں کے بارے میں سب سے پہلے انتظار حسین نے لکھا ہے، اور ان کے افسانے کافی اچھے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ پلاٹ اور کردار کی روائتی ہم آہنگی سے انہوں نے بڑا انحراف کیا ہے۔

عبادت بریلوی۔ انہیں معاشرت کی اہمیت کا احساس زیادہ ہے، اور یہ چیز قارئین پر اسی طرح زیادہ واضح کی جا سکتی ہے۔ اگر کردار کے مد و جزر حرکات ___ و سکنات سے واضح کئے جا سکیں تو یہ کامیابی کی دلیل ہے۔

وقار عظیم - اس پورے ماحول میں صرف نچلے طبقے کی عکاسی نہیں بلکہ متوسط طبقے کی بھی ہے - ان چیزوں سے انتظار کو بڑا گہرا لگاؤ ہے۔ لیکن اس میں جب کوئی خامی نظر آتی ہے تو وہ اتنی تلخی سے اس کا ذکر کرتے ہیں کہ ماحول سے الگ معلوم ہوتے ہیں یہاں تک کہ کہیں کہیں تو ایک بڑے CYNIC کا سا انداز ہو جاتا ہے۔ یہ نشتر کی کیفیت معلوم نہیں کس وجہ سے ہے۔

ندیم - انتظار حسین نئے لکھنے والوں میں نمایاں ترین ہیں۔

عبادت بریلوی - ان کی تمام چیزوں میں وہی کیفیت ہے جو بلونت سنگھ کے یہاں ہے، وہی حیات نگاری ہے، ان کو پڑھنے کے بعد اس زمانے کی زندگی کا بڑا شدید احساس ہوتا ہے۔ اس معاشرت کے ساتھ ان کا اندازِ بیان پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ محاوروں اور لہجے کا استعمال کرداروں کی ذہنی سطح کے مطابق ہونا بڑی خوبی ہے، ان کے یہاں محاورہ ڈپٹی نذیر احمد کی طرح ٹھونسا ہوا نہیں ہے۔ وہ خیال کی روانی کے ساتھ آتا ہے۔ ماحول کی وضاحت میں بھی اس سے مدد ملتی ہے۔ لیکن انہیں یہ بھی محسوس کرنا چاہیئے کہ اس زندگی کو باقی رکھنے کے لئے جس سے انہیں اتنی دلچسپی ہے، اب کون سی راہ اختیار کرنی چاہیئے، انہیں لہجے کے دھیمے پن میں ذرا سی شدت پیدا کرنی چاہیئے۔

وقار عظیم - میں اس سے متفق نہیں۔ اس میں مزاج کو دخل ہے۔ اور اگر اس سلسلے میں کوئی شعوری کوشش کی گئی تو تصنّع پیدا ہو جائے گا۔

محمد طفیل - اگر یہ بقدرِ ضرورت پلاٹ پر بھی توجہ دینے لگیں تو ان کے افسانے زیادہ جاندار ہو جائیں گے ـــ پھر ان کے افسانوں میں محاوروں کی جو بھرمار ہوتی ہے وہ بُری طرح کھلتی ہے۔

وقار عظیم - ان کے افسانوں میں جو محاورے آتے ہیں۔ وہ ضرورت کے تحت آتے ہیں۔ چنانچہ ان کے حال کے افسانوں میں محاورے نہیں ہیں۔

محمد طفیل - اگر ان کے حال کے افسانوں میں محاورے نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ وہاں انہوں نے ضرورت نہیں سمجھی بلکہ یہ کہ ان کے ہاں محاوروں کا اسٹاک ختم ہو گیا ہے۔

عبادت بریلوی - اب نئے لکھنے والوں میں اشفاق احمد رہ جاتے ہیں، یہ بہت ذہین افسانہ نگار ہیں اور اسی سکول کے نمائندہ ہیں جس سے بلونت سنگھ اور انتظار حسین متعلق ہیں۔

وقار عظیم - مجھے اس سے اختلاف ہے، بلونت سنگھ اور انتظار حسین نے موضوع کی تخصیص کر لی ہے، لیکن اشفاق نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے کئی افسانے بچوں کے متعلق ہیں جن میں انہوں نے ان کے نرم و نازک احساسات کی بڑی فنکارانہ ترجمانی کی ہے۔ بعض افسانوں میں وہ رومان پیش کرتے ہیں، ان کی یہ نمایاں خوبی ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو کو بڑی شگفتگی سے پیش کرتے ہیں۔

بچوں کے لئے ان کے دل میں بڑی محبت ہے، وہ انہیں انسانیت کے مستقبل کی امانت سمجھتے ہیں، ان کا احترام کرتے ہیں۔ اور یہ پوری انسانیت کی خدمت ہے۔ ہمارے اور کسی افسانہ نگار کے یہاں یہ بات نہیں۔

ندیم - اشفاق کے تمام افسانوں کا ایک فنی معیار ہوتا ہے، وہ باشعور افسانہ نگار ہیں انہوں نے پاکستان کی ثقافتی تبدیلی پر بھی کہانی لکھی ہے۔

وقار عظیم - ان کی نظر ایک جگہ ٹھہری ہوئی نہیں ہے۔ لیکن جہاں ٹھہرتی ہے وہاں تمام جزئیات کا جائزہ لیتی ہے انہوں نے پرانے ادب اور شعر کو بڑے حسن سے اپنے افسانوں میں رچایا ہے۔ غالب، حافظ اور میر درد ان سب کا کلام ان کے سامنے ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باقی طرزِ بیان میں بھی اس کی مطابقت کا خیال رکھنا پڑتا ہے، جس سے ان کے افسانوں میں بڑی ہمواری اور روانی پیدا ہو جاتی ہے، وہ مخلص فنکار ہیں اور ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

انتظار حسین - پنجاب کے افسانہ نگار نادانستہ طور پر پنجابی الفاظ لاتے ہیں لیکن اشفاق احمد اس امر کی شعوری کوشش اور اہتمام کرتے ہیں۔ اس سے تاثر کہیں بڑھ جاتا ہے۔

عبادت بریلوی - اس سے انتظار حسین، بلونت سنگھ اور اشفاق سب کام لیتے ہیں۔

وقار عظیم - ایک فرق البتہ ہے، انتظار حسین کو اس خاص طرح کے انداز سے فطری لگاؤ ہے۔ اشفاق اور بلونت سنگھ کے یہاں ہر جگہ اس کا انداز شعوری ہے۔ اس سے بعض اوقات خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لیکن اشفاق احمد کی اس شعوری کوشش میں ہر جگہ یہ احساس موجود ہے کہ بیان کو فنی تخلیقات کے حسن و تاثیر میں بڑا دخل ہے اور اس لئے وہ ہمیشہ اس کے بنانے سنوارنے پر پوری توجہ صرف کرتے ہیں۔

محمد طفیل۔ انہوں نے پنجاب کی دیہاتی زندگی کے بارے میں بھی کئی کامیاب افسانے لکھے ہیں۔

وقار عظیم۔ وہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے۔ کہ انہوں نے اپنے آپ کو ایک خاص قسم کے افسانے لکھنے کے لئے نہیں چُنا۔

عبادت بریلوی۔ نئے لکھنے والوں میں لے دے کر جمیلہ ہاشمی [؟] کا نام بھی رہ گیا۔

وقار عظیم۔ نام تو کئی اور ہیں، مثلاً دیوندر اسّر کا ذکر ضرور ہونا چاہیئے، کیونکہ ہماری موجودہ زندگی میں جو انتشار پیدا ہوا ہے اس کا ذکر تو افسانہ نگاروں نے کیا ہے لیکن اس کی ذمہ داری کس پر ہے اس کے اظہار میں عموماً جھجک محسوس کی ہے اسّر نے عام انداز کے خلاف اس معاملہ میں پوری جرأت کے ساتھ اسکی ذمہ داری ارباب سیاست پر رکھی ہے۔

عبادت بریلوی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے متعلق ایک واضح نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔

وقار عظیم۔ ایک وجہ یہ ہے اور دوسری یہ کہ جس ماحول میں اسّر رہتے ہیں وہاں اظہار پہ اتنی پابندیاں نہیں ہیں۔ ہمارے لکھنے والوں کو غالباً یہ اندیشہ بھی ہے کہ پڑھنے والے اتنے جذباتی ہیں کہ وہ لکھنے والے کے نقطۂ نظر کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے ——

جی ہاں! میں دیوندر اسّر کا ذکر کر رہا تھا اور بتانا مقصود یہ تھا کہ نئے لکھنے والوں میں صرف دو ہی نام نہیں بلکہ کئی نام توجہ کے مستحق ہیں لیکن ابھی اُن کے کارناموں پر انفرادی حیثیت سے گفتگو شاید قبل از وقت ہے اس لئے بہتر ہے کہ ہم ان لکھنے والوں کی ایسی خصوصیات کا ذکر کر لیں جو سب میں مشترک ہیں اس سلسلہ میں بعض چیزیں نمایاں ہیں مثلاً ایک عام رُجحان یہ ملتا ہے کہ کسی افسانہ نگار نے اپنے آپ کو فسادات کے موضوع سے ملوث کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسکی وجہ غالباً ان لکھنے والوں کے نزدیک یہ تھی کہ اگر اپنے لئے جگہ پیدا کرنی ہے تو نئے موضوع تلاش کرنے چاہئیں۔ پھر یہ کہ یہ سب نئے لکھنے والے فن کی روایات کی پابندیوں کو بے حد ضروری سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس انتشار کے دَور میں بھی روایت کو ٹھیس نہیں پہنچی اور نہ وہ پیچھے کی طرف گئی۔ موجودہ حالات میں یہ بھی فن کی بڑی خدمت تھی۔ دوسری چیز جو ان سب افسانہ نگاروں میں مشترک ہے، وہ زندگی کا احساس ہے۔ ہر ایک نے اپنے آپ کو کسی نہ کسی خاص زندگی سے وابستہ کیا ہے اور اُسی کو اپنا موضوع بنایا ہے مثلاً شوکت صدیقی کے وہ افسانے زیادہ کامیاب ہیں جن میں انہوں نے لکھنؤ کے نوابوں اور بیگموں وغیرہ کی زندگی کی مصوّری کی ہے —— نئے لکھنے والوں میں صرف انہی نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔ اور اسے ایک نئے رنگ سے پیش کیا ہے۔ ان کے اس طرح کے افسانوں میں زندگی کے مسائل کا احساس نچلے طبقے کے لوگوں کو بھی ہے اور نوابوں اور بیگموں کو بھی۔

ندیم۔ شوکت صدیقی بالکل نئے لکھنے والے نہیں ہیں۔ وہ کافی عرصے سے لکھ رہے ہیں شروع میں معمولی درجے کے افسانے لکھے ہیں لیکن اس دَور میں اچھے افسانے بھی لکھے ہیں۔

عبادت بریلوی۔ نئے افسانہ نگاروں نے جو روایت قائم رکھی ہے اس میں ان افسانہ نگاروں کی کوششوں کے علاوہ اس روایت کی عظمت کو بھی بڑا دخل ہے، ہمارے افسانے نے بڑی عظیم روایت قائم کی ہے، اسے برقرار رکھنا ان لوگوں کے لئے ضروری تھا۔ نئے لکھنے والوں میں کوئی بھی ایسے CALIBRE کا نہیں ہے جیسے ان کے پیش رو تھے۔ ان کی سطح اپنے پیشروؤں سے بہت نیچی ہے۔ ان کے احساس میں بھی وہ شدت نہیں جو پہلے افسانہ نگاروں میں تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کو نسبتاً کم دیکھا ہے۔ ان کے احساس میں شدت بھی نہیں ہے۔ شعور میں بیداری بھی نہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں وہ عظمت نہیں ہے جو ان کے پیشروؤں کے فن میں نمایاں نظر آتی ہے۔

وقار عظیم۔ ابھی یہ افسانہ نگار اپنی تخلیقی زندگی کی اُس منزل تک نہیں پہنچے کہ ہم اُن کے کارناموں پر کوئی قطعی حکم لگا سکیں لیکن ان کی تحریروں میں اس عظیم روایت کی موجودگی اور اس کی پابندی کا احترام ایسی چیزیں ہیں جنہیں مستقبل کے لئے نیک فال کہا جا سکتا ہے۔

عبادت بریلوی۔ ان سب کے یہاں اس رُجحان کا احساس بھی ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر رومانیت بلکہ کہیں کہیں سستی جذباتیت کی طرف مائل ہیں۔

وقار عظیم۔ یہ صحیح ہے لیکن اسکی وجہ یہ ہے کہ ابھی ہمارے پورے ماحول میں وہ ہمواری پیدا نہیں ہوئی کہ کسی چھوٹے سے واقعے کو موضوع بنا کر اُس پر کچھ لکھا جا سکے، اور اس لئے یہ لکھنے والے رومانیت کے سہارے ہی آگے بڑھ رہے ہیں۔

عبادت بریلوی۔ ان میں سے بیشتر کے مزاجوں میں ایک فراری

کیفیت ہے۔ زندگی کا کوئی بہت واضح نقطۂ نظر بھی ان کے یہاں نہیں ہے اور جب تک کوئی واضح نقطۂ نظر سامنے نہ ہو فن یونہی بھٹکتا ہے اس کو منزل سے ہمکنار ہونا نصیب نہیں ہوتا۔ ہمارے نئے افسانہ نگاروں میں سے بیشتر کے فن کا یہی عالم ہے۔

وقار عظیم - اس فرار کی ایک شکل بعض لکھنے والوں کے ہاں نمایاں ہے اور وہ اس طرح کہ ان کے تقریباً آدھے ایسے ہیں جن میں قہوہ خانوں کا ماحول ہے۔ یہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے آنکھ چراتے ہیں۔ ان میں اس کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں اور اس لئے سختیوں سے بھاگ کر ایسی جگہ جانا چاہتے ہیں جہاں وہ چھپ کر تلخیوں کا مذاق اڑا سکیں۔

عبادت بریلوی - اے حمید ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے یہاں یہ رجحان ملتا ہے۔ ان کے افسانوں کی جذباتی اور رومانی فضا اس کو ظاہر کرتی ہے۔ انہیں زندگی کی تلخیوں کا احساس ضرور ہے لیکن وہ ان تلخیوں کو برداشت کرنے کی سکت ان میں نہیں ہے۔ اگر یہ سکت ان کے ہاں ہوتی تو ان کے فن میں بڑی توانائی پیدا ہو سکتی تھی۔

وقار عظیم - ایک وجہ اور بھی ہے کہ ان لوگوں نے (اشفاق اور انتظار کو الگ کر کے) جہاں زندگی کا مشاہدہ نہیں کیا دوسری طرف ادب اور فلسفہ کا بھی مطالعہ نہیں کیا۔ کہ خیال میں وسعت پیدا ہوتی۔

عبادت بریلوی - لیکن اے حمید کے ہاں ایک چیز ہے۔ یعنی زندگی کے مظاہر سے دلچسپی —— ہر چند کہ اس دلچسپی میں بچپن کی سادگی اور معصومیت کو دخل ہے لیکن یہی ان کے فن کی جان ہے۔ وہ زندگی کی سنگین حقیقتوں سے دامن بچا کر چلنے کے باوجود ان کے ہاں زندگی سے دلچسپی کا رجحان ضرور ملتا ہے۔ جس کا اظہار وہ موسموں، پہاڑوں اور دریاؤں کے بیان میں کرتے ہیں۔ نئی پود کے افسانہ نگاروں میں اے حمید کا فن اس اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

ندیم - لیکن خرابی یہ ہے کہ وہ اس میں توازن قائم نہیں رکھتے۔ بجائے اس کے کہ وہ حقیقت پسندی کی راہ پر چلتے انہوں نے رومانیت کا سہارا لیا۔

انتظار حسین - اصل میں ان کے ہاں COMMON MAN کا زاویۂ نظر ملتا ہے۔ مصنف عام آدمی سے الگ نہیں دکھائی دیتا۔

عبادت بریلوی - ان کے یہاں مطالعہ کا فقدان اور شعور کی سطحیت ہے اس لئے وہ ہر چیز کو رومان کی عینک سے ضرور دیکھتے ہیں۔ لیکن ان کی رومانیت میں جو سادگی اور معصومیت ہے وہ اپنے اندر بلا کی دلکشی رکھتی ہے۔

محمد طفیل - آپ حضرات مذاکرہ ختم کر چکے لیکن میری ناچیز رائے ہے کہ اگر ہم تین چار افسانہ نگاروں کا ذکر اور کر لیتے تو اچھا تھا میری مراد چودھری محمد علی ردولوی، قدرت اللہ شہاب، تسنیم سلیم اور ابوالفضل صدیقی سے ہے۔

عبادت بریلوی - اس میں شبہ نہیں کہ ہم نے اپنی گفتگو میں بے شمار نام لئے ہیں لیکن یہ نام محض اس لئے نہیں لئے گئے کہ ہم انفرادی طور پر ان کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرنا چاہتے تھے۔ اصل مقصود یہ تھا کہ ہم ناموں کے ساتھ ساتھ یہ دیکھتے چلیں کہ ان کے انفرادی فن نے ہمارے افسانہ کی روایت کو آگے بڑھانے میں کیا حصّہ لیا ہے۔

وقار عظیم - عبادت صاحب کا خیال بالکل صحیح ہے۔ لیکن طفیل صاحب کا مقصد بھی غالباً یہی ہے کہ ان افسانہ نگاروں نے بھی ہمارے افسانہ کی روایت کو کوئی نہ کوئی چیز دی ہے اس لئے روایت اور جدّت کے تسلسل کے تذکرہ میں ان کا تذکرہ آنا ضروری ہے۔

محمد طفیل - جی ہاں! میرا یہی خیال ہے۔

وقار عظیم - تو پھر آیئے ان افسانہ نگاروں کے فن کے ان پہلوؤں پر گفتگو کر لیں جن کی بدولت ہماری افسانوی روایت کسی نہ کسی جدّت سے آشنا ہوئی ہے۔ سب سے پہلے چودھری صاحب کے افسانوں کو لیجئے۔

عبادت بریلوی - چودھری صاحب خاصے پرانے افسانہ نگار ہیں اور بڑی مدّت سے خاموشی کے ساتھ لکھ رہے ہیں اور اسی خاموشی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جو خدمت ہمارے افسانے کی انہوں نے کی اس کی داد بعد میں آنے والوں کو ملی۔

وقار عظیم - آپ کا اشارہ شاید ان خاص طرح کے افسانوں کی طرف ہے جن میں چودھری صاحب نے جنسی مسائل کو بڑے لطیف اور نازک فنی انداز میں پیش کیا ہے۔

عبادت بریلوی - جی ہاں! بالکل انہیں افسانوں کی طرف۔ جنسی مسائل کو افسانہ کا موضوع بنانے کی جو روش متوسط دور کے لکھنے والوں میں نظر آتی ہے اور جس کی مختلف صورتیں ہمیں منٹو، عصمت اور ممتاز مفتی کے افسانوں میں نظر آتی ہیں اس کی ایک نکھری ہوئی شکل چودھری محمد علی کے افسانوں میں ہے۔

وقار عظیم - جو بات ممتاز مفتی کا ذکر کرتے وقت ندیم صاحب نے فرمائی تھی وہ اس وقت یاد آ رہی ہے۔

ندیم - مجھے یاد نہیں رہی وہ بات۔

وقار عظیم - آپ نے فرمایا تھا کہ جنسی مسائل اور خاص کر ان مسائل کے

نفسیاتی پہلو کی عکاسی کرنے کے لئے بیان پر جس قدرت کی ضرورت ہے وہ مفتی کو میسّر نہیں —— چودھری محمد علی کا امتیاز بیان کی یہی قدرت ہے۔

ندیم - اور اس کے ساتھ ساتھ ایک خاص طرح کے ماحول اور اس کے کرداروں سے پوری طرح واقفیت اور بے تکلفی۔

وقار عظیم - چودھری صاحب کے بعض افسانے پڑھ کر تو مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ موضوع سے پوری واقفیت اور بیان پر پوری قدرت ہو تو سیدھی سادی کہانی میں بھی ایک طلسم کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔

انتظار حسین - یوں اس طرح کے طلسم تو قدرت اللہ شہاب نے بھی بہت باندھے ہیں۔

وقار عظیم - آپ کی اجازت سے میں آپ کے بیان میں تھوڑی سی ترمیم کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ قدرت اللہ شہاب نے طلسم باندھنے کی کوشش تو ضرور کی ہے لیکن طلسم باندھنے میں انہیں کامیابی ذرا کم ہی ہوئی ہے۔

انتظار حسین - مجھے اس معاملہ میں آپ سے اتفاق نہیں "یا خدا" ایک مکمل طلسم ہے۔

وقار عظیم - "یا خدا" کی حد تک تو سب آپ سے متفق ہوں گے لیکن یہاں ذکر مختصر افسانوں کا ہے۔ اور شہاب کے مختصر افسانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ جب جنسی پہلو کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو ایک پست قسم کی لذتیت اُن کے پورے افسانے پر چھا جاتی ہے۔

محمد طفیل - لیکن انھوں نے سارے افسانے جنسی پہلوؤں ہی پر تو نہیں لکھے؟ پھر اُن کے ہاں اظہار کی جرأت بھی ہے۔ جرأت کے بجائے شاید جرأت کا لفظ مناسب ہے۔ بعض اوقات تو حیرانی ہوتی ہے کہ ایک گزیٹڈ آفیسر اس طرح بھی سوچ سکتا ہے۔

وقار عظیم - جی ہاں! یہ صحیح ہے شہاب کے موضوع متنوع ہیں اور ان متنوع موضوعات میں نفس مضمون اور طرز بیان کے اعتبار سے دو چیزیں مشترک ہیں۔ نفس مضمون کے اعتبار سے تو یہ کہ وہ ہماری معاشرتی زندگی کے کسی ایسے پہلو کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں (اور اس میں اُن کے جنسی افسانے بھی شامل ہیں) جس میں بھرپور طنز اور بے دردانہ تنقید کی گنجائش ہو اور اظہار کے نقطۂ نظر سے یہ کہ اس بات کو وہ پوری دلیری سے بیان کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُس میں پستی یا سوقیت کے پیدا ہو جانے کی بھی پروا نہیں کرتے۔

عبادت بریلوی - اور اس طرح وہ توازن ختم ہو جاتا ہے جسے ہم فن کے حسن اور تاثیر سے تعبیر کرتے ہیں۔

وقار عظیم - اس کے باوجود ہمارے افسانہ میں جرأت اظہار کی جو روایت بہت عام نہیں ہے اور عصمت، منٹو اور ہاجرہ مسرور کے علاوہ وہ بہت کم کہیں دکھائی دیتی ہے اُسے شہاب نے ایک نئی شکل دے کر اس روایت کو وسعت دی ہے اور یہ اُن کی خدمت ہے۔

محمد طفیل - تسنیم صاحبہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

وقار عظیم - یہ بات پہلے ندیم صاحب بتائیں گے۔

ندیم - صاحب! میں تسنیم کو کئی حیثیتوں سے مکمل افسانہ نگار سمجھتا ہوں —— پہلی تو یہ کہ وہ موضوع کے انتخاب کے لئے اِدھر اُدھر کبھی نہیں بھٹکی۔ اب آس پاس کی زندگی میں اُس نے ایسے بے شمار موضوع تلاش کر لئے ہیں جن میں اچھا افسانہ بننے کی صلاحیت ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ تسنیم کا کوئی افسانہ پڑھ کر پڑھنے والا اپنے ذہن پر کسی طرح کا بوجھ نہیں محسوس کرتا۔ ہلکی پھلکی، سیدھی سادی شگفتہ فضا ہے اور اُسے ہلکے پھلکے، سیدھے سادے شگفتہ انداز میں پیش کر دیا گیا ہے —— نہ کہیں افسانہ کی رفتار میں بوجھل پن ہے، نہ اُس کے بیان میں۔

عبادت بریلوی - لیکن اس کی وجہ آخر کیا ہے؟

وقار عظیم - صاحب! مجھے تو ان ساری باتوں کی ایک ہی وجہ معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ہماری دوسری افسانہ نگار خواتین کی طرح تسنیم کسی طرح کے COMPLEX میں مبتلا نہیں ہیں۔ عصمت، ہاجرہ، خدیجہ، قرۃ العین حیدر سب کے ذہن بظاہر کسی نہ کسی نفسیاتی اُلجھن میں پھنسے ہوئے ہیں اور ان اُلجھنوں سے اُن کے فن میں جا بجا صاف گرہیں پڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ تسنیم کا ذہن ان اُلجھنوں سے خالی ہے اور اس لئے اُس کا فن ہموار اور مُصفّا ہے —— اُس کے ہاں زندگی کے مسائل آتے ضرور ہیں لیکن وہ پڑھنے والے کے پیر میں بیڑیاں ڈال کر نہیں بیٹھ رہتے۔ اور اس طرح ہمیں ان کہانیوں سے فن کا ایک بڑا اچھا سبق یہ ملتا ہے کہ افسانہ نگار کچھ بھی لکھے، اگر وہ خلوص اور سادگی سے لکھتا ہے تو اُس میں تاثیر ضرور ہو گی۔

ندیم - تسنیم کو اپنے ماحول اور کرداروں سے جو لگاؤ ہے اُس نے بھی افسانوں میں بے تکلف روانی کی یہ فضا پیدا کی ہے۔

محمد طفیل - ان کے ہاں جتنا خلوص ہے۔ وہ کسی افسانہ نگار میں نہیں

ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ قاری پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وقار عظیم۔ ہاں صاحب یہ تو حقیقت ہیں ہماری افسانہ نگاری کا ایک اہم رجحان بن گیا ہے کہ ہمارے اکثر افسانہ نگار اُسی ماحول اور اُنہیں کرداروں کے متعلق لکھتے ہیں جس سے وہ اچھی طرح مانوس ہیں۔

محمد طفیل۔ اور اس لحاظ سے مجھے ابو الفضل صدیقی میں جو بات نظر آتی ہے کسی اور میں نہیں دکھائی دیتی۔ جس خاص طرح کے ماحول کی عکاسی اُس نے اپنے افسانوں میں کی ہے کسی اور افسانہ نگار نے نہیں کی۔ اُس کی زبان اور بیان بھی اُس کا اپنا ہے۔ اُسے اس ماحول کی جزئیات کا اتنا علم ہے اور وہ اس علم کو اس نئے انداز میں اس بے تکلفی اور خوبصورتی سے بیان کرتا ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے موضوع پر خاصا طویل افسانہ لکھ سکتا ہے۔

عبادت بریلوی۔ اور اس طرح پڑھنے والوں کو بور بھی کر سکتا ہے،

وقار عظیم۔ طوالت اور بوریت میں ایک قریبی تعلق ہے اور اس لئے اگر ابو الفضل صدیقی کسی طرح اپنے آپ کو اختصار اور اعتدال کی طرف مائل کر سکیں تو اُن کی وہ خوبیاں جن کا طفیل صاحب نے ذکر کیا انہیں بڑا کامیاب افسانہ نگار بنا دیں۔

محمد طفیل۔ ہم نے بزعم خود تمام افسانہ نگاروں کا ذکر کر لیا۔ پھر بھی کئی ایک افسانہ نگار چھوٹے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کم از کم انور اور جلیس کا ذکر یہاں ضرور ہونا چاہیئے۔

عبادت بریلوی۔ ابراہیم جلیس کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے۔ انہوں نے افسانے میں کوئی خاص تجربہ نہیں کیا۔ کم و بیش انہیں موضوعات پر انہوں نے افسانے لکھے ہیں جن پر اس دور کے بیشتر افسانہ نگار لکھتے رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے۔ متوسط طبقے کے افراد کی زندگی، ان کی معاشی اُلجھنیں، ان کی اقتصادی پریشانیاں —— جلیس نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔ طبقاتی سماج پر جو کچھ گزرتی ہے اس کا وہ گہرا شعور رکھتے ہیں —— اسی کیفیت کے مختلف پہلوؤں کو انہوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ جلیس کی تکنیک میں ویسے کوئی ایسی بات نہیں جس کو اہم تجربہ کہا جا سکے۔ لیکن اُنہیں واقعات کو کہانی کا روپ دینے کا گر آتا ہے۔ اور وہ اس کو خوبی کے ساتھ برتتے ہیں —— البتہ خاکے کی طرف انہوں نے خاص طور پر توجہ کی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ بعض بہت اچھے خاکے اُنہوں نے لکھے ہیں۔

وقار عظیم۔ انہیں زندگی کا شدید احساس ہے —— اور اس شدید احساس ہی کا یہ اثر ہے کہ انہوں نے بعض اچھے افسانے لکھے ہیں۔

محمد طفیل۔ ان پر کرشن چندر کا اثر معلوم ہوتا ہے۔

عبادت بریلوی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کرشن چندر جو کچھ اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں، اور جس طرح پیش کرتے ہیں اس میں ہمارے نوجوانوں کی ذہنی اور جذباتی کیفیات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے فن کا رنگ نوجوان افسانہ نگاروں پر بہت جلد چڑھ جاتا ہے۔ جلیس کرشن چندر کے انداز میں سوچتے ہیں، اور اس لئے اُسی طرح اس کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ندیم۔ ان کے انداز بیان میں خاصی روانی پائی جاتی ہے۔ اور اس خصوصیت نے ان کے افسانوں میں دلآویزی پیدا کی ہے۔

عبادت بریلوی۔ ابراہیم جلیس کی طرح انور نے بھی افسانے میں کوئی اہم تجربہ نہیں کیا۔ لیکن زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احساس ان کے یہاں بھی شدید ہے۔ اسی لئے وہ ڈوب کر لکھتے ہیں۔ ان کے موضوعات متنوع ہیں لیکن ان متنوع موضوعات میں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ وہ ان سب پر ایک مخصوص زاویۂ نظر سے روشنی ڈال رہے ہیں۔ اس زاویۂ نظر کی نوعیت سماجی ہے۔ البتہ اس میں بڑی گہرائی نہیں ہے۔

محمد طفیل۔ انور کے یہاں جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کی توجہ پوری طرح اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں۔

عبادت بریلوی۔ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں وہ ڈوب کر لکھتے ہیں۔ ان کے فن میں موضوع کے ساتھ ایک خلوص نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے فن میں احساس تاثر کی شدت ہے جو حد درجہ خلوص ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

محمد طفیل۔ اب وہ اسٹیج آگئی ہے۔ کہ ہم اپنی ساری گفتگو کا ایک جائزہ لے سکیں۔ کہ اب تک کے افسانہ نگاروں نے کہاں تک روایت کا ساتھ دیا اور کیا کیا نئے تجربے کئے۔ اب اگر وقار صاحب اس ساری گفتگو کا ماحصل بیان فرما دیں تو یہ گفتگو مکمل ہو جائے۔

وقار عظیم - ہم نے "روایت اور تجربے" کے موضوع پر خاصی طویل گفتگو کی اور اِس طویل گفتگو میں ایک خاص نقطۂ نظر سے اپنے مختصر افسانہ کی تقریباً پچاس برس کی تاریخ کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اس جائزہ کے سلسلہ میں اُردو کے بے شمار افسانہ نگاروں کی فنی تخلیقات اور اُن کی اہم خصوصیات کا تذکرہ آیا۔ بعض لکھنے والوں کا تذکرہ بار بار کیا گیا اور خاصی تفصیل سے کیا گیا، بعض کا ذکر محض سرسری انداز سے ہوا۔ بعض لکھنے والے شاید ایسے بھی ہوں جن کا ذکر بالکل نہیں آیا۔ لیکن چونکہ فرداً فرداً سب افسانہ نگاروں کے فنی مرتبہ اور حیثیت کا تعین اس گفتگو کا مقصد نہیں تھا اس لئے کسی نام کا ہونا یا نہ ہونا اُس کے بڑے یا چھوٹے ہونے کی دلیل ہرگز نہیں۔ گفتگو کا مقصد تو صرف یہ دیکھنا تھا کہ جب ہمارا افسانہ شروع ہوا تو اُس کی اساس کون کون سی ایسی چیزیں تھیں جنہیں ہم اُس کی روایت کہہ سکیں۔ اس اساس میں وقت کے ساتھ ساتھ کیا اضافے ہوئے اور کس طرح افسانہ کی روایت ایک سیدھی سادی روایت سے بڑھ کر اُس بلند مقام تک پہنچی جہاں ہم اُسے آج دیکھ رہے ہیں (یا اب سے چند برس پہلے دیکھ چکے ہیں)

افسانوی روایت کے ارتقا کی اس تاریخ میں بعض ناموں کی اہمیت یقیناً دوسروں سے زیادہ ہے ——— کچھ کی اس لئے کہ اُنھوں نے افسانہ کو اُس کی اساسی حیثیت بخشی، کچھ کی اس لئے کہ انھوں نے اُس اساس پر بلند تعمیریں کیں اور کچھ کی اس لئے کہ انھوں نے کبھی کبھی ایسے مشکل حالات میں جب بڑی سے بڑی اور پختہ سے پختہ روایت کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں اس عمارت کو گرنے اور مسمار ہونے سے بچایا ہے۔ مثلاً ان ناموں میں سب سے اہم نام پریم چند کا ہے ——— ایسا کئی وجوہ سے ہے۔ ایک تو اس لئے کہ پریم چند ہمارے افسانہ کی روایت کے بانی ہیں، دوسرے اس لئے کہ اپنی افسانہ نگاری کے تیس برس کی عمر میں انھوں نے اس روایت میں طرح طرح کی جدتوں اور تجربوں سے بے شمار اضافے کئے۔ افسانہ اپنی زندگی کے ابتدائی تیس برسوں میں روایت اور تجربہ کی جن جن منزلوں سے گزرا ہے وہ ساری منزلیں ہمیں پریم چند کے افسانوں میں نظر آتی ہیں اور اس طرح "دنیا کا سب سے انمول رتن" سے "کفن" تک افسانہ کی روایت کی ابتدا، ارتقا اور عروج کی ساری داستان درج ہے۔ روایت نے ابتدا سے عروج تک پہنچتے پہنچتے جو راہیں طے کی ہیں اُن سب راہوں میں پریم چند کی حیثیت محض رہرو کی نہیں رہنما کی ہے اور یہ چیز اُن کی اہمیت کا تیسرا نمایاں پہلو ہے۔

پریم چند کا افسانہ روایت اور تجربہ کی جن مختلف منزلوں سے گزرا ہے انہیں چھ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ابتدا تو وہ ہے جب اُن کے "سوزِ وطن" کے افسانوں میں ہمیں گہری مقصدیت، شدید قسم کی جذباتیت اور فضا اور طرزِ بیان پر داستانوں کی شعریت، رنگینی اور فوق الفطرت مبالغہ آرائی چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ "پریم پچیسی" اور "پریم بتیسی" کے تاریخی، نیم تاریخی اور رومانی افسانوں میں مقصدیت اور جذباتیت تو موجود ہے لیکن داستانوں کا فوق الفطرت بہت کم ہو گیا ہے۔ ذرا اور آگے چل کر تاریخ کے بجائے زندگی افسانوں کا موضوع بن گئی ہے، مقصدیت میں پھیلاؤ پیدا ہو گیا ہے اور اُس نے معاشرتی اور اخلاقی اصلاح پسندی کی صورت اختیار کر لی ہے، بیان میں داستانی عناصر اب بالکل نہیں رہے لیکن شعریت اور خطابت اب بھی ہے۔ اس سے اگلے دَور میں ماحول اور مسائل کی تخصیص پیدا ہو گئی ہے۔ بیان کی شعریت میں اب بھی دھیما پن ہے۔ پانچویں دَور میں ماحول کی تخصیص کے ساتھ ساتھ نقطۂ نظر میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ اب نظر سماجی اور اخلاقی مسائل سے بڑھ کر سیاست پر بھی جاتی ہے اور باتوں کو دھیمے انداز میں کہنے کی طرف پوری توجہ ہے۔ آخری دَور وہ ہے کہ افسانہ نگار واقعہ سے زیادہ اشخاص کو اپنے افسانہ کا موضوع بناتا ہے، اُس کے خارجی ماحول سے زیادہ اُس کی داخلی کیفیتوں کی عکاسی کرتا ہے، اُس نے اس دَور میں حقیقت اور فن کا مکمل امتزاج بھی کیا ہے اور اپنے فن کو اپنی شخصیت کا مکمل مظہر بھی بنایا ہے۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کے یہ مختلف دور حقیقت میں اُردو افسانہ کی روایت کے ارتقا کی مختلف منزلیں ہیں۔ ان مختلف منزلوں میں پریم چند نے ایک تنہا مسافر کی طرح کبھی سفر نہیں کیا۔ ہر دَور میں اُن کے ساتھ ایسے لکھنے والوں کا ایک کارواں رہا ہے جس کے ہر فرد نے ان کی بنائی ہوئی روایتوں کو اختیار کر کے ان کی پیروی کی ہے۔ پہلے اور دوسرے دور میں سدرشن ان کے ساتھ ہیں۔ تیسرے دور میں علی عباس حسینی اور اعظم کریوی ہیں چوتھے اور پانچویں دَور میں بے شمار لکھنے والے اِن کے رنگ میں ڈوبے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حامد اللہ افسر، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، اختر انصاری، ان میں سے چند ہیں۔

پریم چند نے افسانہ کے بالکل ابتدائی دَور میں اُسے مقصدیت اور داستانی رنگ کی روایت دی۔ تقریباً اسی زمانہ میں سلطان حیدر جوش نے ایک خاص ماحول کی زندگی کے پس منظر میں اصلاحی مقصد سے افسانے لکھے اور اس طرح داستانی رنگ سے بچ کر حقیقت نگاری اور مقصد

نگاری کے امتزاج کی روایت شروع کی۔ تقریباً اسی زمانہ میں سجاد حیدر یلدرم نے افسانہ کو رومانیت کی روایت سے آشنا کیا۔ اور اس طرح اساس کی حیثیت سے روایت کے تین پہلو افسانہ کا جزوِ خاص بنے ——— مقصدیت اور داستانی رنگ، مقصدیت اور حقیقت نگاری، رومانیت اور فنی لطافت کا احساس۔ آنے والے ہر دور میں افسانہ کی روایت انہیں تین راستوں پر چل کر موجودہ دور تک پہنچی ہے۔ حقیقت نگاری کی روایت کو پریم چند کے علاوہ حسینی، حامد اللہ افسر، عظیم بیگ چغتائی، منٹو، بیدی، حیات اللہ انصاری، احمد علی، اختر انصاری، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، عصمت چغتائی، بلونت سنگھ، غلام عباس، ہاجرہ مسرور، اور انتظار حسین نے زندہ رکھا، ترقی کی نئی راہیں دکھائیں اور فن کی بلندیوں تک پہنچایا۔ رومانیت کی روایت سجاد حیدر کے علاوہ نیاز فتح پوری، ل احمد اکبر آبادی، مجنوں گورکھپوری، حجاب امتیاز علی کے ہاتھوں پلی، بڑھی اور پروان چڑھی۔ سدرشن، اعظم کریوی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور قرۃ العین حیدر نے حقیقت اور رومانیت کے امتزاج سے اس روایت کو چار چاند لگائے۔

فن کے حسن ارجحان کا احساس سجاد حیدر یلدرم کے ترجموں نے پیدا کیا تھا اُسے خواجہ منظور، بشیر الدین، منصور احمد، جلیل قدوائی کے روسی افسانوں کے ترجموں اور محمد مجیب کے روسی انداز کے افسانوں نے جلا دی ——— یہاں تک کہ ۳۵ء، ۳۶ء تک ہمارے افسانہ میں حقیقت، رومانیت اور فنی احساس نے ایک عظیم المرتبہ روایت کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ پریم چند کے فن، ترقی پسندی کی تحریک اور "انگارے" کے باغیانہ انداز نے تجربوں کی بے شمار راہیں کھول دیں اور تقسیم سے بہت پہلے علی عباس حسینی، کرشن چندر، بیدی، حیات اللہ انصاری، عصمت، اختر انصاری، احمد علی اور اختر اورینوی نے اور اس کے ذرا بعد حسن عسکری، بلونت سنگھ، غلام عباس، ممتاز مفتی، تسنیم سلیم، دیوندر ستیارتھی اور ہاجرہ مسرور اور قدرت اللہ شہاب نے جو کچھ لکھا اُس سے حقیقت نگاری میں نئے نئے باب کھلے ——— افسانہ کے لئے کسی خاص ماحول کی تخصیص، ایک محدود ماحول کی زندگی میں بین الاقوامی حالات کا عکس، زندگی کے پھیلے ہوئے رشتوں کا احساس، وسیع انسانیت کا تصوّر، واقعات کے بجائے کرداروں پر اہمیت، زندگی کے خارجی مظاہر کے ساتھ ساتھ انسان کی داخلی زندگی کا مطالعہ، فرد کے جذبات کے علاوہ اُس کے لاشعوری کیفیتوں کا تجزیہ، ذہنی گتھیاں اور تحلیل نفسی، زندگی سے متعلق کسی مخصوص زاویہ نظر کی موجودگی، اُس کے مسائل کا اجتماعی شعور ——— یہ سب کچھ حقیقت نگاری کے زمرہ میں شامل ہوگیا اور یہ ساری چیزیں مختلف لکھنے والوں کی شخصیتوں کا جزو بن کر افسانہ میں اس طرح گھُل مل گئیں کہ نہ اُس میں موضوعات کی کمی رہی اور نہ اُس کی وسعتوں کا ٹھکانہ، جو رومانیت کبھی محض ایک شاعرانہ یا جذباتی کیفیت تھی آہستہ آہستہ اپنے سارے خارجی حسن و مظاہر اور داخلی و نفسیاتی لوازم کے ساتھ حقیقت میں شیر و شکر ہوگئی اور اس نے فرد کی بیزاری کا لباس پہنکر فن کو نئی سے نئی شکلیں دیں۔ اظہار و بیان میں بھی نت نئے تجربے ہوئے، کچھ روسی حقیقت نگاروں کے اثر، کچھ فرانسیسی رومانیت کے اثر کے ماتحت اور کچھ فرانس اور انگلستان کے لکھنے والوں کے نئے نفسیاتی فن کی بدولت۔ یہاں تک کہ تقسیم تک ہمارے افسانہ میں وہ سب کچھ آگیا جو مغرب میں افسانہ کی روایت کا بہترین عنصر سمجھا جاتا ہے۔ لکھنے والوں نے اسے کبھی کبھی جوں کا توں اختیار کرکے اور کبھی مشرقی مزاج کے رنگ میں سمو کر اپنے افسانہ کی روایت کو مالا مال کیا اور تقسیم کے بعد لکھنے والوں نے ایک ایسے دور میں جب ہر چیز انتشار کی سخت زد میں تھی اس عظیم روایت کو اپنا کر اُسے زندہ و برقرار رکھا۔ وہ اب تک بظاہر اس میں کوئی اضافہ تو نہ کرسکے لیکن جس دشوار دور میں انہوں نے اس کی حفاظت کی ہے وہ اس لئے بہت اہم اور غنیمت ہے کہ اس طرح روایت کا تسلسل درہم برہم نہیں ہوا۔ ایک سیدھی سادی روایت کو بے شمار فنکاروں نے، نئے نئے تجربوں نے، اُن کی ذہنی کاوشوں نے، اُن کے خونِ جگر نے جو عظیم بالشان شکل دی تھی وہ بگڑنے نہیں پائی۔ حالات سازگار ہوں گے تو یقین ہے کہ اس سے بننے سنورنے کی صورت بھی پیدا ہوگی ——— اور نئے تجربے ہماری عظیم روایت کو عظیم تر بنائیں گے۔

کھانسی
کو خوشگوار طریقہ پر روکنے
کے
لئے
تسکین بخش، خوش ذائقہ
سیرولین "روش"
استعمال کیجئے
SIROLIN
REGISTERED
·ROCHE·
ROCHE
ساختہ "روش"
VB-2889
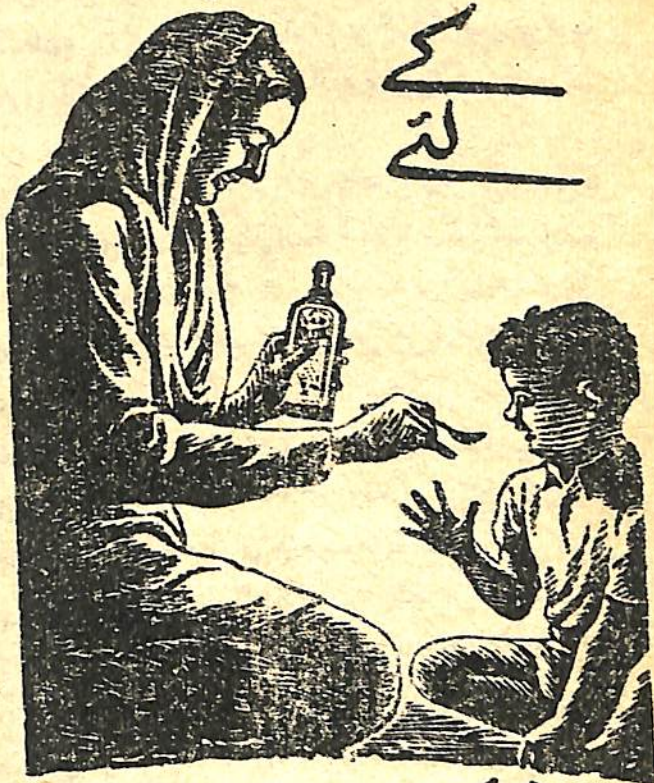
دن بہ دن
ایک نئی شگفتگی
ایک نیا حسن
رکسونا کا کیڈِل آپ کے لئے بھی
یہ کمال کرے گا
کیڈِل آمیز رکسونا صابن ہر روز استعمال کیجئے۔ اس
سے آپ کی جلد دن بہ دن زیادہ خوبصورت
اور نازک بنتی جائے گی۔
Rexona
Rexona
رکسونا
کیڈِل آمیز
واحد صابن
* جلد کو ملایم کرنے والے اور
مقوی جلد تیلوں کے ایک خاص
مرکب کا مکینی نام
RP. 105-172 UD

محمد طفیل پرنٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲

PRINTED AT ASHRAF PRESS, 7, AIBAK ROAD - LAHORE